تفسیر

مطالب الفرقان

کا

علمی و تحقیقی جائزہ

جلد اوّل

پروفیسر حافظ ڈاکٹر

محمد دین قاسمی

ادارہ معارف اسلامی

منصورہ ، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ

(جلد اول)

ادارہ معارف اسلامی

یہ ادارہ، اسلامی علوم و معارف کی تحقیق و تصنیف اور اشاعت و ترویج کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد دور حاضر کے عظیم مفکر اور قائد تحریک اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جولائی ۱۹۶۳ء میں رکھی تھی اور اس کا پہلا مرکز کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۷۹ء میں مولانا مرحوم نے لاہور کو اس کا دوسرا مستقر بنایا۔ اب کراچی اور لاہور میں ادارہ معارف اسلامی کے دونوں مراکز داخلی طور پر خود مختارانہ اور مقصدی اور آئینی طور پر ہم آہنگی سے حسب ذیل مقاصد کے لیے کوشاں ہیں:

- ❑ تحقیق اور علمی جستجو کے بعد اسلامی تعلیمات کو جدید ترین اسلوب اظہار کے ذریعے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دوسرے دائروں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں تلاش کرنا۔
- ❑ علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیب نو، تشریح و توضیح اور اشاعت، اسی طرح قدیم علمی خزانوں تک آج کے طالب علموں کی رسائی ممکن بنانا۔
- ❑ عالم اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کے لیے مسلم ممالک کے بارے میں بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص تحقیقی کام کرنا۔
- ❑ اسلامی موضوعات پر دور حاضر کے مسلم علما کے نمایاں کارناموں کی دنیا کی اہم زبانوں بالخصوص اردو، عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سواحلی میں تراجم اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- ❑ عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن، تاریخ اور مسلم دنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لیے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- ❑ تعلیم کو مثبت اسلامی آہنگ دینے اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظام تعلیم کی راہ ہموار کرنے کے لیے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ

جلد اوّل

......ooo......

مصنف

حافظ محمد دین قاسمی

ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور

نام کتاب	:	تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ (جلد اوّل)
لوازمہ تصنیفات	:	پروفیسر حافظ ڈاکٹر محمد دین قاسمی
باہتمام	:	ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور۔فون: ۵۴۳۲۴۷۶
مطبع	:	عدن پرنٹرز، ۹۔کوپر روڈ، لاہور۔
اشاعتِ اوّل	:	جنوری ۲۰۰۹ء (۱۱۰۰)
صفحات	:	۶۳۲
قیمت	:	-/۶۰۰ روپے

تقسیم کنندہ:

مکتبہ معارفِ اسلامی

منصورہ ملتان روڈ، لاہور۔ پوسٹ کوڈ ۵۴۷۹۰

فون: ۵۴۳۲۴۱۹، ۵۴۳۲۴۷۶، ۲۴-۵۴۱۹۵۲۰

REMARKS OF DR. NOOR MUHMMAD USMANI, (EXTERNAL EXAMINER) INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY, MALAYSIA

It is my great pleasure to go through the thesis of Mr. Haafiz Muhammad Din Qasmey, entitled, "Tafseer Matalibul-Furqan ka Ilmi awr Tahqiqi Ja'izah" by Ghulam Ahmad Parvez. The researcher made a praiseworthy and comprehensive effort in studying the above named tafseer and uncovering the fallacies, contradictions, hidden agendas of Mr. Ghulam Ahmad Parvez, who led the anti-hadith movement in the sub-continent, and through translation even abroad.

The researcher deserves praise and appreciation for this noble task. I really enjoyed reading his scholarly writings and sound analysis of the tafsir, ...

Therefore, the researcher deserves a Ph. D. degree for his scholarly contribution to the field of knowledge and learning, and especially in Tafsir. His works could be considered a strong shield against anti-hadith movement. I give him an excellent grade of 95 out of 100, though he even deserves more.

I strongly recomend to the University of Punjab to publish this master piece in the field of tafseer and hadith in a few volumes. It is worth publishing.

(Evaluation report, Written on 11-01-2006.)

رپورٹ از ڈاکٹر سید سلمان ندوی، بطور بیرونی ممتحن (ساؤتھ افریقہ)

۱- مذکورہ کمزوریوں☆ کی نشاندہی کے باجود پورا مقالہ بڑی محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ اور عموماً بحث عالمانہ ہے اور پرویز صاحب کی اغلاط پر گرفت بالکل صحیح ہے، اس لیے میری سفارش ہے کہ مقالہ، ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے قبول کر لیا جائے۔

۲- علوم اسلامیہ میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری عطا کی جائے۔

۳- مقالہ یقیناً قابلِ اشاعت ہے بلکہ اشاعت بہت بروقت ہوگی۔ البتہ اشاعت سے پہلے ان امور کی طرف توجہ کر لی جائے جن کی نشاندہی مختصر طور پر اوپر کی گئی ہے۔

(پی ایچ ڈی مقالہ کے امتحان کی رپورٹ، مرقومہ مورخہ ۱۵ نومبر ۲۰۰۵ء)

☆ ان کمزوریوں کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

AN APPRECIATION LETTER FROM PROF. DR. MUHAMMAD TAQEE ZAHID BUTT CONTROLER OF EXAMINATION, P. U., LAHORE

Your goodself has passed a Ph. D. examination from this Mother University, which is a great honour for you and also for this University. In fact, you have done a tremendous job by writing such a knowledge based thesis. Your untiring efforts and deep research in the subject have made your thesis, a rare piece of knowledge. In recognition of your out standing research and way of presenting the relevant knowledge, the External and Internal Examinars sent excellent reports, on the basis, which you were, very rightly awarded Ph. D. degree.

(Letter No. 404-899-Ph.D./06 Dated 14-10-2006)

انتساب

دنیا میں جب بھی کوئی شاندار عمارت معرضِ وجود میں آتی ہے تو وہ کسی شاہ جہان کے نام سے منسوب ہو جاتی ہے اور ان ہزاروں مزدوروں اور کاریگروں کو فراموش کر دیا جاتا ہے جن کے پسینے نے پتھر کو موتی کی چمک اور ہیرے کی دمک عطا کی تھی، نہ صرف کاریگر اور مزدور بلکہ وہ اینٹیں بھی دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں جو عمارت کی بنیاد میں نصب ہو کر پوری عمارت کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہوتی ہیں۔

تعلیم و تربیت کے حوالے سے میری شخصیت کی تعمیر میں، اگرچہ بہت سے جید اور قابل اساتذہ نے، سکول کی سطح سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک حصہ لیا ہے اور عام طور پر لوگ انہی اساتذہ کو یاد رکھتے ہیں جن کے سامنے تعلیم کے انتہائی مرحلوں میں زانوئے تلمذ تہہ کیا گیا ہو، لیکن میں اپنے پرائمری سکول کے اس اولین استادِ محترم کو نہیں بھول سکتا جن کی شفقت بھری نگہبانی میں، میں نے پہلے دن قلم پکڑ کر لکھنا سیکھا۔ میری شخصیت کی تعمیر میں وہی استاد وہ اولین معمار تھا جو آج دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن میرے قلب کی نگاہوں میں وہ ہمیشہ میرے سامنے رہا۔ وہ محترم و مکرم استاد، چوہدری فقیر محمد صاحب (ساکن چک ۴، ون آر، اور معلم، میونسپل پرائمری سکول، رینالہ خورد، ضلع اوکاڑہ) تھے۔ ان سے خط و کتابت کا تعلق نہ ہونے کے باوجود بھی، وہ ہمیشہ میری دھڑکنوں میں موجود رہے۔ میں ہر حال میں ان کے لیے دعا گو ہوں اور اپنی اس علمی کاوش کو ان کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کرتا ہوں۔ اللہ ان کے دامن میں دین و دنیا کی حسنات سمیٹ دے (آمین)۔

فہرست

باب ۲: تعارفِ تفسیر مطالب الفرقان

باب ۶: ارکان اسلام اور تفسیر مطالب الفرقان

پیش لفظ

امت مسلمہ کے عقاید ونظریات، عبادات ومعاملات اور جملہ معمولاتِ زندگی کا ماخذِ حقیقی، اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت ہے۔اس بات پر امت کا ہمیشہ سے اجماع رہا ہے کہ سنتِ رسول اسی طرح واجب الاتباع ہے جس طرح قرآن۔سنت کا انکار، حقیقت میں قرآن کا انکار ہے۔مستند مجموعہ ہائے احادیث کا انکار کرنے والے اسی انکار کو بنیاد بنا کر قرآن کا بھی انکار کر سکتے ہیں۔قرآن مجید بھی امت تک انھی ذرائع سے پہنچا ہے، جن ذرائع سے حدیث کا ابلاغ ہوا ہے۔قران مجید کو بھی صحابہؓ نے نہ جبرئیل کی زبان سے براہِ راست سنا، نہ اللہ رب العالمین کی آواز میں اس کی سماعت کی۔جس طرح قران کی ہر آیت، صحابہ نے آنحضور ﷺ کی زبانِ صدقِ مقال سے سنی، اسے حفظ کیا اور آنحضور ﷺ کے حکم کے مطابق اس کی کتابت بھی کر لی، بالکل اسی طرح انھی صحابہ نے آنحضور ﷺ کی زبان سے آپ کے فرمودات سنے، آپ کے اعمال دیکھے اور ان سب کو پوری دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ محفوظ کر لیا۔

امت کی چودہ سوسالہ تاریخ میں بہت سے فتنوں نے سر اٹھایا، جھوٹے مدّعیانِ نبوت بھی پیدا ہوئے اور منکرینِ حدیث بھی وقتاً فوقتاً سر اٹھاتے رہے۔دورِ جدید میں برصغیر میں غلام احمد قادیانی مدعیِ نبوت بن کر انگریزوں کی سرپرستی میں پروان چڑھا اور امت کے لیے بہت بڑا فتنہ چھوڑ گیا۔اس کذّاب کو تاج برطانیہ کی سرپرستی حاصل تھی، اس لیے برصغیر کے باہر بھی بالعموم اور برطانوی مقبوضات کے علاقوں میں بالخصوص، اس کی ذریت پھیلتی چلی گئی۔مرزا غلام احمد قادیانی کا تعلق ضلع گورداسپور سے تھا، اسی ضلعے سے اسی نام سے ایک اور شخص، امت کے لیے فتنہ بن کر ابھرا۔یہ غلام احمد پرویز کے نام سے معروف ہے۔مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح اس نے بھی کئی پینترے بدلے، اس نے کئی جنم لیے اور ہر جنم کے ساتھ اس کی کینچلی تبدیل ہوتی چلی گئی۔جب اس نے کھل کر انکارِ حدیث کا اعلان کیا اور قرآن کو اپنے من مانے معنی ومفہوم میں ڈھالنے کے لیے اپنا اصلی چہرہ دکھایا، تو امت کے اہلِ علم، بغیر کسی اشتباہ کے، اس کی حقیقت کو پا گئے۔

انگریزوں نے اپنے جانے کے بعد مسلمان ملکوں میں اپنے فکری شاگردوں کو مسلط کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کے مطابق پاکستان میں بھی، آزادی کے بعد، گورے انگریزوں کی جگہ کالے انگریزوں کی حکومت رہی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام سے منحرف ہر کردار کو حکومتی سرپرستی حاصل ہوتی چلی گئی، تاکہ وہ اہلِ حق کے مقابلے پر حکومت کی ہاں میں ہاں ملائے اور اسے فکری ونظری معاونت فراہم کرتا رہے۔اس کے بدلے میں حکومتوں نے ان فتنہ پرداز عناصر کی بھرپور سرپرستی کی۔غلام احمد پرویز کی مسموم فکر، سرکاری سرپرستی ووسائل ہی کی بدولت امت کے اندر سرایت کرتی رہی۔غلام احمد پرویز نے اپنے رسالہ طلوع اسلام کو، جو ایک دور میں ماہنامہ تھا، پھر ہفت روزہ ہوا، اپنے فکر کی فروغ وترویج کے لیے استعمال کیا۔صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں بالخصوص پرویزی نظریات کی سرکاری وسائل سے اشاعت وتبلیغ ہوتی رہی۔بعد کے ادوار میں بھی ہر روشن خیال حکمران کو پرویزی نظریات اپنی سوچ اور مفادات کے قریب تر نظر آئے اور انھوں نے بھی کبھی بلند آہنگ انداز میں اور کبھی دھیمے سروں میں اس فتنے کی آبیاری کی۔

فتنہ انکارِ حدیث کے مقابلے پر سب سے اچھی دستاویز مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب سنت کی آئینی حیثیت کے نام سے ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کی جامعیت کے باوجود اس بات کی ضرورت تھی کہ پرویزی افکار کے تارو پود بکھیرنے کے لیے غلام احمد پرویز کی شخصیت اور لٹریچر بالخصوص تحریفات قرآنی کا بے لاگ محاکمہ کیا جائے۔ یہ کام خاصا محنت طلب تھا۔ اللہ نے ایک ایسے شخص کو اس کام کے لیے منتخب کیا جو کافی عرصے تک غلام احمد پرویز کی تحریروں کا مداح اور اس کی ملمع کاری و ادبی چاشنی سے مسحور رہا۔ جس نے اس کی ہر تحریر کو بنظر دقیق پڑھا اور از اول تا آخر طلوعِ اسلام کا پورا ریکارڈ محفوظ کیا۔ اپنے مطالعے کے دوران اس متلاشی حق کو اللہ کی توفیق سے یہ راہ نمائی ملی کہ وہ دجل و فریب کی اس یاوہ نویسی میں محرک کے اصلی چہرے اور حقیقی عزائم کو پالے۔ جب اس پر حقائق منکشف ہونے لگے تو اللہ نے یہ راہ نمائی بھی فراہم کی کہ بہت سارے وہ لوگ جو اسی کی طرح وادیِ تیہہ میں حیران و سرگرداں ہیں، انھیں بھی اس سے نکالا جائے اور جو سادہ لوح مسافر ان اس فتنے سے بے خبر ہیں، انھیں بھی اس سے آگاہ و متنبہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے پرویزی فکر کے مقابلے پر قلم اٹھایا اور دلائل و براہین اور ثبوت و سند کے ساتھ ثابت کیا کہ یہ دینِ حق کے خلاف ایک بہت خطرناک اور گہری سازش ہے، جسے شیطان نے اپنی کمین گاہ بنا رکھا ہے۔ یہ طالب علم پرویزیت پر بلاشبہ ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی نظر اتنی عمیق اور معلومات اتنی بلیغ ہیں کہ اس کی تحریروں میں جھانکنے والا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ پرویزی لٹریچر کا حافظ ہے۔

زیر نظر کتاب اسی عظیم سکالر حافظ محمد دین قاسمی کا وہ تحقیقی مقالہ ہے، جس پر انھیں جامعہ پنجاب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ انھوں نے اپنا یہ مقالہ غلام احمد پرویز کی نام نہاد تفسیر قرآن مطالب الفرقان کا محاکمہ کرنے کے لیے لکھا۔ انھوں نے اپنے مقالے کا عنوان تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ تجویز کیا اور اللہ کی توفیق سے واقعی انھوں نے مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے اور ہر بات کے لیے پرویزیات میں سے سند لائے ہیں۔ اس مقالے کے نگران پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی مرحوم تھے اور بیرونی ممتحن کی ذمہ داری ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور ڈاکٹر نور محمد عثمانی صاحبان نے ادا کی۔ ڈاکٹر حافظ محمد دین قاسمی کا یہ مقالہ ہر صاحب علم کے لیے دورِ جدید کے اس فتنے کو سمجھنے اور آگے لوگوں کو سمجھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ مقالہ ان شاء اللہ ہر علمی لائبریری کی ضرورت اور تحقیق کا کام کرنے والے ہر طالب علم کے لیے راہ نما ثابت ہوگا۔ ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید''۔ ہم اپنے ادارے کی طرف سے بصد مسرت اس تحقیقی کتاب کی جلد اول اپنے قائین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ دوسری جلد بھی تیار ہے جو ان شاء اللہ بہت جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو جائے گی۔ ہم مقالہ نگار کی محنت و مہارت دونوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اتنی عظیم الشان دستاویز تیار کرنے پر انھیں مبارک باد بھی پیش کرتے ہیں اور ان کے لئے خیر و بھلائی کی دعا بھی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ امت کو ہر فتنے سے محفوظ رکھے اور اس کے اہلِ علم کو توفیق دے کہ وہ ان فتنوں کا سدِ باب کرنے کے لیے اپنی پوری استطاعت صرف کر دیں۔

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی، منصورہ

۲۷ ذیقعدہ ۱۴۲۹ھ / ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ء

حرفِ اول

اسلام کے بنیادی مآخذ میں سے، اولین ماخذ، قرآنِ مجید ہے، جو تقریباً تمام مسلم گھرانوں میں پایا جاتا ہے۔ دینِ اسلام کے حوالے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی گھریلو فضا کے باعث، میں اپنے بچپن ہی سے، شوقِ مطالعہ رکھتا تھا۔ ہمارے گھر میں بعض اسلامی کتب اور قرآنِ مجید ہمیشہ موجود رہے ہیں، لیکن کتبِ احادیث میں سے کوئی کتاب مجھے میسر نہ تھی، اس لیے اسلامی تعلیمات کا پہلا اور بنیادی سرچشمہ --- قرآنِ مجید --- ہمیشہ میرے مطالعہ اور دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ قرآنی تعلیمات کے ساتھ میرے اسی ذوق اور دلچسپی نے میرے اندر ایک ایسا اشتیاق پیدا کر دیا جس کی بناء پر، قرآن کے کسی بھی پہلو پر لکھی ہوئی، کوئی بھی کتاب، جو میرے ہاتھ لگتی، محرومِ مطالعہ نہ رہتی۔ اسی مطالعاتی لگن نے مجھے، جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کے قرآنی لٹریچر سے متعارف کروایا، اور ان کی جملہ کتب، وقفوں کے ساتھ، مگر بتدریج، میری نگاہوں سے گزرتی رہیں۔ عبارت کی دلکشی، اُسلوبِ نگارش کی شگفتگی، الفاظ کی جاذبیت اور ادب کی چاشنی پر مشتمل، ان کا لٹریچر، میری آنکھوں کے لیے وجۂ جاذبیت اور قلب و دماغ کے لیے باعثِ مسحوریت بنتا رہا۔ عبارتوں میں جابجا اشعار کی موجودگی، میری جذباتی تسکین کا سبب بنتی رہی، اور میں دھیرے دھیرے، ان کے لٹریچر کا مطالعہ، ایک تسلسل کے ساتھ اس طرح کرتا رہا کہ دورانِ مطالعہ، قرآن کے متعلق، کوئی اور کتاب بھی مل جاتی تو وہ بھی شاملِ مطالعہ ہو جاتی۔ اپنے حصولِ تعلیم کے دور میں بھی، قرآن سے متعلقہ لٹریچر کے ساتھ، میری دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ میں نصابی کتب سے کہیں زیادہ، اسلامی کتب کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ پرویز صاحب کے نوع بنوع اور تازہ ترین افکار سے آگاہ رہنے کے لیے ماہنامہ طلوعِ اسلام کا مسلسل مطالعہ بھی میرا دستور رہا، حتیٰ کہ طلوعِ اسلام کی فائل کے وہ شمارے، جو مجھے میسر نہ آ سکے تھے، ان کے حصول کی بھی شدید خواہش ابھری اور میں اس کی فائل کو، نہ صرف یہ کہ تاحال (Uptodate) مکمل کرنے میں، بلکہ اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ مطالعۂ طلوعِ اسلام کا یہ سلسلہ، پرویز صاحب کی وفات کے ایک سال بعد تک جاری رہا۔ اس کے بعد اس میں انقطاع، صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اس کے مضامین میں کسی جدید اضافۂ فکر کی بجائے، پہلے سے مطبوع شدہ افکار و نظریات ہی کا اعادہ و تکرار تھا۔ لیکن بہر حال، میں، اللہ کے فضل و کرم سے، ایک کھلے دل و دماغ کا فرد ہوں اور مجھے زندگی کے کسی دور میں بھی یہ بات قطعاً پسند نہیں رہی کہ میں کسی خول میں بند ہو کر، یک رخے مطالعہ کے سانچہ میں اپنے دل و دماغ کو ڈھال لوں۔ میں پرویز صاحب کی کتب کے علاوہ، دیگر مصنفین اور اہلِ علم کی کتب سے بھی استفادہ کرتا رہا، اور طلوعِ اسلام کے علاوہ دیگر رسائل کی بھی خوشہ چینی کرتا رہا، حتیٰ کہ مرزا غلام احمد قادیانی، جیسے متنبّی کا لٹریچر بھی، میری نگاہوں سے گزرتا رہا۔ مختلف مکاتبِ فکر کے نقطہ ہائے نظر کے مطالعہ سے، مجھے خلافیات (اختلافی مسائل) سے خاصا شغف پیدا ہو گیا اور میں چار و ناچار ایسے مطالعہ کی راہ پر گامزن ہو گیا، جس کے نتیجہ میں،

اصحابِ اختلاف کے آراء ونظریات کی کھوج کرید، میرے ذوقِ تحقیق وتدقیق کو نکھارنے کا باعث بنی۔ کتبِ احادیث کے وسیع ذخیرے پر، اور پھر ان کی شروح وتعلیقات پر، میری نگاہوں کا حاوی ہونا اتنا آسان نہ تھا، جتنا کہ قرآنی تعلیمات پر، یہ امر، سہل تھا، چنانچہ اس زاویۂ نظر سے قرآن اور اس کی تعلیمات کے مطالعہ کے انہماک میں، مَیں، روز بروز فزوں تر ہوتا چلا گیا، اور میرے حلقۂ احباب میں سے، جن اہلِ علم سے کسی علمی مبحث پر گفتگو ہوتی تو میں اپنے دلائل کو زیادہ تر قرآن ہی سے پیش کرنے کا عادی رہا (اور اب بھی ہوں)۔

جناب پرویز صاحب، اول وآخر، قرآنِ کریم ہی کو حجت وسند قرار دیتے ہیں۔ ان کی دعوت کا بنیادی، بلکہ واحد نکتہ، رجوع الی القرآن اور تمسک بالکتاب ہی ہے۔ قرآن کے سوا، وہ کسی چیز کو دلیلِ شرعی کا مقام نہیں دیتے۔ صحت وسقم کا واحد معیار، ہدایت وضلالت کا تنہا پیمانہ، حق وباطل کی واحد کسوٹی، اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی واحد سند، ان کے ہاں، صرف قرآن ہی ہے، جیسا کہ درجِ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

۱- صحت وسقم کا معیار، میزانِ قرآنی ہے، نہ میرا دعویٰ، نہ غیر کی تردید۔ اس لیے اگر کوئی میری گذارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اسے کہو کہ اس کے لیے قرآن کی بارگاہ سے سند لاؤ وَقُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ ۲:۱۱۱)[۱]

۲- ہمارے نزدیک، دین کا معیار فقط کتاب اللہ ہے، جو عقیدہ یا تصور اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے اور جو اس کے مطابق نہیں وہ بلا تامل وتذبذب غلط اور باطل ہے (خواہ اس کی تائید میں ہزاروں حدیثیں بھی ایسی کیوں نہ پیش کر دی جائیں جن کے راویوں میں جبرائیل اور میکائیل تک کا بھی نام شامل کر دیا گیا ہو)۔[۲]

۳- ہمارے سامنے ہدایت وضلالت کا واحد معیار قرآنِ مجید ہے۔ اگر ہمیں اپنی ہدایت وضلالت کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے لیے ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ اپنے دماغ میں جو اعتقادات ہوں انھیں قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھیں، اور ایسا کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات کا التزام رکھیں کہ اپنے دماغ کے کسی عقیدہ کو قرآن پر اثر انداز نہ ہونے دیں، ورنہ اس طرح ترازو، باٹ اور جس چیز کو تولا جا رہا ہے سب خلط ملط ہو جائیں گے اور ہم فیصلہ نہیں کر سکیں گے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو تمام مذاہب، آراء وافکار، عقائد وخیالات کے بارے میں، اصل ماننا چاہئے، نہ یہ کہ ہم مذاہب وعقائد کو، اصل مان کر، پھر ان پر قرآنِ مجید کو پرکھیں، اور پھر قرآن میں تاویل وتحریف کریں، جیسا کہ ضالّین اور بے توفیق لوگوں کا شیوہ ہوتا جا رہا ہے۔[۳]

۴- پروفیسر کوبن نے کہا تھا کہ صحیح بات وہی ہو سکتی ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ کہ وہ جسے بہت سے لوگ صحیح کہہ دیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی بات کے ''درحقیقت صحیح'' ہونے کا معیار کیا ہے؟ قرآن کی رو سے وہ معیار یہ ہے کہ جو بات، کتابِ

---

[۱] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۲ء، صفحہ ۴۸

[۲] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۷

[۳] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۱

خداوندی کے مطابق ہو، وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہو، وہ غلط ہے۔[1]

۵- کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے لیے، کسی انسان کی سند کافی نہیں ہو سکتی، اس کے لیے سند، صرف خدا کی کتاب کی ہونی چاہیے۔[2]

قرآنِ کریم کے ساتھ (جو پرویز صاحب کے نزدیک واحد سند اور حجت ہے) اپنی مطالعاتی وابستگی کی کیفیت کو، خود انھوں نے بایں الفاظ پیش کیا ہے:

> میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں، میری عمر کا بیشتر حصہ اس پر غور و فکر میں گزرا ہے۔ قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے میرا انداز یہ رہا ہے کہ میں پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کے اندر نہیں جاتا۔ میں ایک سوال کو سامنے رکھتا ہوں اور خالی الذہن ہو کر کوشش کرتا ہوں کہ مجھے قرآن سے اس کا کوئی حل مل جائے۔ جو حل مجھے قرآن سے ملتا ہے، اسے قبول کرتا ہوں، خواہ ساری دنیا کے مسلمات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے، حتیٰ کہ خود میرے اپنے معتقدات اور تصورات کے خلاف کیوں نہ ہو۔[3]

پرویز صاحب نے اپنے دعویٰ کے مطابق، اپنی عمر کا غالب حصہ، قرآن کے بنیادی تصورات کا مفہوم متعین کرنے اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانے میں صرف کیا ہے:

> میں، برادرانِ گرامی قدر! قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں، میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ، اس کتابِ عظیم کی روشنی میں، اپنی بصیرت کے مطابق، اسلام کے بنیادی تصورات کا مفہوم متعین کرنے میں صرف کیا ہے، اور میری اس کوشش کا ماحصل، میری تصانیف کے اوراق میں محفوظ ہے۔[4]

ایک اور مقام پر، وہ اپنی پچاس سالہ قرآنی خدمات کا تذکرہ، ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> مہ و سال کے شمار سے، میں، ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو اپنی عمرِ رواں کے پچھتر (۷۵) سال پورے کر رہا ہوں، یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جس کا خصوصیت کے ساتھ، طلوعِ اسلام کے صفحات میں ذکر کیا جاتا۔ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں، پچاس سال پورے کر رہا ہوں۔ عام اصطلاح میں اسے گولڈن جوبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ پچاس سالہ جوبلی، دنیا کی ہر متاع سے گراں بہا اور اس کی یاد، سب سے زیادہ وجۂ نشاطِ روح ہے۔[5]

تفسیر مطالب الفرقان کی پہلی جلد کے آغازِ سخن میں، جناب پرویز صاحب، فرماتے ہیں کہ

> میں قرآنِ کریم کا ادنیٰ طالب علم ہوں، میں نے اپنی ساری زندگی، اس عظیم کتاب کے سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کی ہے۔[6]

لیکن اس عمر بھر کے کثرتِ مطالعہ اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور کتاب اللہ کے ساتھ ان کی دیرینہ وابستگی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ، علماء امت کو، اپنے مقابلہ میں ہیچ سمجھا کرتے تھے اور انھیں قرآن کے علم سے بے بہرہ قرار دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک

---

[1] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۶
[2] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵۸
[3] نظامِ ربوبیت، صفحہ ۲۲ تا صفحہ ۲۳
[4] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۷
[5] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۶
[6] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ع

مقام پر وہ غرورِ پندارِ علم میں بلند پروازی اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> ہمارا ملاّ ، طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب ، دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا ، (اس لیے کہ وہ دعوت ، قرآن کی دعوت ہے ، اور ملاّ بیچارہ ، قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے) ۔ [۱]

ایک اور مقام پر ، وہ غرورِ علم کے ساتویں آسمان پر محوِ پرواز ہوتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ

> جو کچھ میں قرآن سے پیش کرتا ہوں ، اس کی تردید کے لیے چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے پاس دلائل و براہین نہیں ہوتے ، اس لیے وہ خود بھی مشتعل ہوتا ہے اور عوام کو بھی مشتعل کرتا ہے ۔ [۲]

فکرِ پرویز کے جائزہ کے لیے ، شرطِ پرویز

پرویز صاحب ، اپنے معاصرین و ناقدین کو ، اپنے افکار کے جائزہ کے لیے ، جو بنیادی شرط پیش کیا کرتے تھے ، اسے ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے :

> قرآن تو وحیٔ الٰہی ہے ، جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ، لیکن میں اپنی قرآنی بصیرت کو ، کبھی وحیٔ الٰہی قرار نہیں دیتا ، اس لیے اس میں سہو و خطا ، دونوں کا امکان ہوتا ہے ۔ بنا بریں ، میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے ، اور وحیٔ الٰہی کی طرح منزہ عن الخطا ۔ البتہ مجھے اس پر ضرور اصرار ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس پر آپ قرآن کی روشنی میں غور کریں اور آپ کو جہاں سقم نظر آئے اسے مجھ پر قرآن ہی کی تائید سے واضح کریں ۔ [۳]

پرویز صاحب کی اس شرط کو کہ --- ان کے افکار و نظریات کی صحت و سقم کا جائزہ ، صرف قرآن ہی کی بنیاد پر لیا جائے --- ملحوظِ خاطر رکھنا ، ہمارے نزدیک ، نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ یہ ان کا قطعی مطالبہ ہے ، بلکہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ اسلافِ صالحین نے بھی اپنے معاصر مخالفین کی حجت کو ، خود ان ہی کے اصول و شرائط کی بنیاد پر رد کیا تھا مثلاً جب یونانی فلسفہ سے ، فرزندانِ اسلام متاثر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی نصرت و حمایت اور حفاظت و اشاعت کے لیے ، ایسے علما کو پیدا فرمایا جنھوں نے اس فلسفہ کو خود اسی کے اصول و شرائط کی بنیاد پر رد کیا تھا ۔ اس لیے ، اس مقالہ میں ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ پرویز صاحب کے جملہ افکار و نظریات کا جائزہ ، صرف اور صرف ، قرآن ہی کی بنیاد پر لیا جائے ۔ لیکن چونکہ قرآن ، عربی زبان میں ہے ، اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ کتبِ لغات سے بھی صرفِ نظر نہ کیا جائے ، اور اس کے ساتھ ہی ، پرویز صاحب کی جملہ کتب سے استفادہ کو بھی اساسِ جائزہ میں شامل رکھا جائے ۔ اس طرح ، فی الواقع یہ جائزہ ، قرآنِ مجید ، تصانیفِ پرویز اور کتبِ لغات پر اساس پذیر ہے ۔

---

[۱] طلوعِ اسلام ، مئی ۱۹۵۳ء ، صفحہ ۴۷ [۲] طلوعِ اسلام ، اگست ۱۹۷۳ء ، صفحہ ۳۶ [۳] نظامِ ربوبیت ، صفحہ ۲۳

ملتِ مسلمہ سے شکایاتِ پرویز

امت مسلمہ سے، جناب پرویز صاحب بعض امور میں ہمیشہ شاکی رہے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر، وہ، اپنی قوم سے یوں شکایت کرتے ہیں:

> ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے، وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ ''طلوع اسلام'' کہتا ہے، اسے اس کے الفاظ میں، اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کرکے اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں، وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں اور اسے طلوع اسلام کی طرف منسوب کرکے، گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ [۱]

ہمیں نہیں علم کہ اس طرح کا پراپیگنڈہ کرنے والے کون لوگ ہیں، جو ''اپنی طرف سے ایک بات وضع کرتے ہیں اور اسے طلوع اسلام (یا جناب پرویز صاحب) کی طرف منسوب کرکے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں''۔ ہم نے اس امر کی مقدور بھر کوشش کی ہے کہ طلوع اسلام (یا جناب پرویز صاحب) کے موقف کو، خود انہی کے الفاظ میں پیش کرکے اس کا جائزہ لیا جائے۔ پورے جائزے کے دوران یہ بھی ہماری کوشش رہی ہے کہ انھیں ہمارے خلاف یہ (واقعی یا فرضی) شکایت پیدا نہ ہو۔

اپنی اسی شکایت کے تسلسل میں، دوسری شکایت، وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ

> چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے، اس لیے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، کہ جو کچھ طلوع اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ اس نے کہا بھی ہے یا نہیں۔ [۲]

مجھے سو فیصد یقین ہے کہ میرے اس مقالہ کے قارئین کو قطعاً یہ شکایت لاحق نہیں ہوگی کہ مقالہ نگار، سہل انگار واقع ہوا ہے، اور یہ کہ اس نے طلوع اسلام کے اقتباس کے اصل ماخذ تک رسائی پانے کی کوشش نہیں کی۔

مسلمانانِ پاکستان کی حالت پر، پرویز صاحب کا درد و کرب

عالم اسلام میں پائی جانے والی امت مسلمہ کی تقلید پر بالعموم اور پاکستان کے اہل اسلام کی مقلدانہ روش پر بالخصوص، پرویز صاحب، جس الم و قلق اور درد و کرب میں مبتلا تھے، اس کا اظہار، انھوں نے، ان الفاظ میں کیا ہے۔

> سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر درد و کرب کی ان تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنھوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ سلیم!
>
> میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
> میرے نالہ نیم شب کا نیاز — میری خلوت و انجمن کا گداز
>
> تم نہیں دیکھ سکتے، میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ
>
> نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکار عمیق

---

۱ + ۲ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۵

اور ایک ٹھنڈی سانس سے، یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں، کہ ؎

آہ ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق[1]

لیکن، ان شاء اللہ العزیز، اس مقالے کے قارئین پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ مقالہ نگار، ''محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق'' سے کلی طور پر بیزار ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ تقلید، خواہ قدیم کی ہو یا جدید کی، وہ نفسِ تقلید ہی کے خلاف ہے، اسے اس رویہ سے بھی شدید نفرت ہے کہ تقلید کو، قدیم اور جدید کی دو قسموں میں تقسیم کر کے، ایک قسم کی تقلید کی مخالفت کی جائے اور دوسری قسم کی تقلید کا دم بھرا جائے۔ قارئین کی نگاہیں، خود دیکھ لیں گی کہ مقالہ نویس جس طرح، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ بن حنبل، امام داؤدؒ ظاہری اور سفیان ثوریؒ وغیرھم کی تقلید سے بیزار ہے، بالکل اسی طرح، وہ، کارل مارکس، لینن، ہیگل، ڈارون، اور برگسان جیسے ملاحدہ کی تقلید سے بھی سخت بیزار ہے، اگرچہ اس کے نزدیک، کفر و الحاد کے علمبردار فلاسفہ کی تقلید کی نسبت، ائمہ فقہ کی پیروی لاکھوں درجہ بہتر ہے۔

اقتباساتِ مقالہ کے سلسلہ میں ایک گذارش

کسی بھی کتاب میں سے (خواہ اس کے مصنف جناب پرویز صاحب ہوں یا کوئی اور صاحب) جو حوالہ دیا گیا ہے، حتی الامکان اس کی صحت کا التزام کیا گیا ہے۔ لیکن، بہر حال، چونکہ یہ ایک انسانی کوشش ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ مقدور بھر احتیاط رکھنے کے باوجود بھی، حوالہ و اقتباس کے اندراج میں غلطی ہو گئی ہو، ایسی غلطی (خدا شاہد ہے کہ) دیدہ دانستہ بددیانتی کا نہیں، بلکہ غیر شعوری سہو و لغزش کا ہی نتیجہ ہو سکتی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اگر کہیں ایسی لغزش کا وجود محسوس کریں تو اسے میرے علم میں لا کر شکریہ کا موقع دیں۔

البتہ، بعض مقامات پر، جن کی تعداد چار پانچ سے زائد نہیں ہے، میں غیر شعوری طور پر، طلوعِ اسلام میں مذکور اقتباسات کو، سہواً، پرویز صاحب کی طرف منسوب کر چکا ہوں، لیکن ان میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے، وہ، بہر حال، پرویز صاحب ہی کے آراء و افکار ہیں، کیونکہ الفاظ کی مغائرت کے باوجود، ان کا مفہوم، مفہومِ پرویز ہی ہے، جو دیگر مقامات پر، خود ان کے اپنے الفاظ میں بھی پایا جاتا ہے، اس لیے ایسے اقتباسات کو، اس سہو کے باوجود بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ نیز، ان کا برقرار رکھا جانا، اس لیے بھی موزوں اور مناسب تھا کہ ان کے متعلق طلوعِ اسلام (یا پرویز صاحب) نے اپنی کسی اختلافی رائے کو ظاہر نہیں کیا تھا، اور یہ خود انہی کا اصول ہے کہ کسی چیز کو بلا اختلافی نوٹ کے شائع کرنا، دلیلِ موافقت قرار پاتا ہے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ کے ترجمان القرآن میں، مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب کا اقتباس، جب شائع ہوتا ہے، تو اس پر ترجمان القرآن کی طرف سے،

---

1. سلیم کے نام، جلد ا، صفحہ ۵۱

اختلاف نہ کرنے کی بناء پر، اُسے ترجمان القرآن ہی کے موقف کی موافقت قرار دیتے ہوئے، خود طلوعِ اسلام نے یہ اصول، ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

یہ مضمون مولانا امین احسن اصلاحی کا تھا، لیکن ترجمان القرآن نے بلا اختلافی نوٹ کے شائع کیا تھا۔ [1]

مزید برآں، پرویز صاحب نے اپنی زندگی میں طلوعِ اسلام کے ''لکھاڑیوں'' کو اس مجلّہ میں لکھنے کے لیے، صرف ایک شرط کا پابند کیا تھا اور وہ بھی بقولِ طلوعِ اسلام:

صرف اس پابندی کے ماتحت کہ جو کچھ لکھا جائے، وہ ہماری بصیرت کے مطابق، قرآنی تعلیم کے مطابق ہو۔ وما توفیقی الا باللّٰہ العلی العظیم [2]

چنانچہ ان اقتباسات کا طلوعِ اسلام میں شائع ہونا ہی، اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ یہ طلوعِ اسلام کی قرآنی تعلیم اور اس کی بصیرت کے عین مطابق ہیں اس لیے ان اقتباسات کو برقرار رکھا گیا ہے۔

ابوابِ مقالہ، ایک نظر میں

آغازِ کار میں یہ مقالہ، گیارہ ابواب پر مشتمل تھا، لیکن تحریر و تسوید کے دوران، قلب و ذہن کی کشادگی کے ساتھ ساتھ، موادِ مقالہ میں بھی وسعت پیدا ہوتی چلی گئی اور مجھے اس کے ابواب میں اضافہ کرنا پڑا، چنانچہ اب یہ مقالہ، افتتاحی اور اختتامی گذارشات کے علاوہ، تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں، جناب غلام احمد پرویز صاحب کی پیدائش کے وقت، برصغیر میں امتِ مسلمہ کی اخلاقی، تعلیمی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالت کو پیش کیا گیا ہے۔ نیز، پرویز صاحب کے پیدائش، بچپن، تعلیم و تعلّم، ملازمت اور ان کے مذہبی اور دینی رجحانات کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں، ان کی قلمی مصروفیات، اور پھر رسالہ طلوعِ اسلام کے اجراء و آغاز اور اس مجلّہ کی دلچسپی کے اہم موضوعات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ، ان کی زندگی کے آخری برسوں کے احوال بھی قلمبند کئے گئے ہیں اور آخر میں ان کی کتب کی فہرست دی گئی ہے۔

دوسرے باب میں، تفسیر مطالب الفرقان کا تعارف پیش کیا گیا ہے، اور ان اصولِ تفسیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن کے تحت یہ تفسیر لکھی گئی ہے۔ علاوہ ازیں، ایک مفسرِ قرآن میں، جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، اور اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ پرویز صاحب کی ذات میں ان شروط کا تحقق، کہاں تک پایا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اس باب کی قلمبندی کے وقت تفسیر مطالب الفرقان کی صرف ابتدائی سات جلدیں ہی منصۂ شہود پر آئی تھیں، بقیہ جلدیں بعد میں شائع ہوئی ہیں، اس لیے ان کے حوالے اور اقتباسات اس مقالہ میں شامل نہیں ہیں۔

---

[1] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۶۳

[2] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱۰

تیسرے باب میں، تفسیر مطالب الفرقان کا، علوم القرآن کے مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مثلاً حروفِ مقطعات، شانِ نزول (یا اسبابِ نزول)، آیاتِ محکمات و متشابہات (مع آیاتِ متشابہ الصفات)، اسرائیلیات، اعجاز القرآن اور ناسخ و منسوخ کے حوالے سے تفسیری موقف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں، چند اصولی مباحث کے بارے میں تفسیر مطالب الفرقان کا نقطۂ نظر اور پھر اس پر تبصرہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان اصولی مباحث میں پہلا مبحث، وحی کے بارے میں، دوسرا مبحث منصبِ نبوت و رسالت کے متعلق اور تیسرا مبحث حدیث اور انکارِ حدیث کی بابت ہے جس کی قلمبندی کے دوران، میں نے، شاہ معین الدین ندویؒ کے ایک مقالہ اور مولانا مودودیؒ کے رسالہ ترجمان القرآن کے منصبِ رسالت نمبر، سے بھی استفادہ کیا ہے۔

پانچویں باب میں، اسلام کے ایمانیاتِ خمسہ کی بابت، پرویز صاحب نے الحاد و زندقہ کی جو راہ اختیار کی ہے، ان کی کتب کے حوالہ سے بالعموم اور تفسیر مطالب الفرقان کے حوالہ سے بالخصوص، اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں، ارکانِ اسلام میں سے، ہر رکن میں انحرافاتِ پرویز کا جائزہ، ان کی جملہ تصنیفات، بشمول تفسیر مطالب الفرقان، کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے۔

ساتواں باب، پرویز صاحب کی طرف سے، قصص الانبیاء کے ضمن میں مسخِ واقعات اور تقلیبِ حقائق کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ یہ باب سات مباحث پر محیط ہے۔ پہلے مبحث میں حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت، ان کی خلافتِ الٰہیہ اور ان کی نبوت پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے مبحث میں حضرت نوح علیہ السلام کی درازیٔ عمر میں، پرویز صاحب کو لاحق عقلی استبعاد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے مبحث میں سرگذشتِ ابراہیم کے دو پہلوؤں (نارِ نمرود اور واقعہ ذبحِ پسر) پر، موقفِ پرویز کی تردید کی گئی ہے۔ چوتھے مبحث میں داستانِ یوسفی میں، کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ کی تفسیر میں انحرافاتِ پرویز پر تنقید کی گئی ہے۔ پانچویں مبحث میں، داستانِ موسوی کے دو پہلوؤں (قتلِ ابنائے بنی اسرائیل اور واقعۂ ذبحِ بقرہ) میں موقفِ پرویز کا بطلان پیش کیا گیا ہے۔

آٹھویں باب میں، پرویز صاحب کے اس موقف کا جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے تفسیر مطالب الفرقان میں معجزات کے بارے میں پیش کیا ہے۔ معجزات کے متعلق چند بنیادی امور میں، موقفِ پرویز کی تغلیط و تردید کے بعد، حضرت صالحؑ کے معجزۂ ناقۃ اللہ، حضرت ایوبؑ کے معجزۂ شفا، حضرت ابراہیمؑ کے چار پرندوں کا احیاء، ان کا آگ میں جلنے سے بچایا جانا اور بڑھاپے میں اولاد کی پیدائش کے معجزات، حضرت یعقوبؑ کی ذات میں معجزۂ ردِ بصارت، حضرتِ موسیٰ کے معجزات میں سے لاٹھی کا اژدھا بننا، یدِ بیضا، ساحرینِ فرعون کی کھلی شکست، تنبیہی عذابوں کا سلسلہ، ضربِ عصا سے فلقِ بحر، لاٹھی مارنے سے بارہ چشموں کا پھوٹ نکلنا اور پکی ہوئی مچھلی کا زندہ ہو کر سمندر کی راہ لینے کے جملہ معجزات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں، حضرت سلیمانؑ کے لیے ہواؤں کی تسخیر، منطق الطیر اور چیونٹیوں کے کلام کو سمجھنے کے معجزات، نیز ملکہ سبا کے تخت کے آناً فاناً لائے جانے کے معجزہ پر، ''عقل پرستوں'' کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ مزید برآں حضرت یونسؑ کی سرگذشت کے

معجزانہ پہلو کے علاوہ، حضرتِ زکریاؑ کے انتہائی بڑھاپے میں اولاد کی پیدائش کے معجزہ پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے جملہ معجزات پر بھی، موقفِ پرویز کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں نبیٔ اکرم ﷺ کے بارے میں، پرویز صاحب کے موقفِ معجزہ پر بھی بحث موجود ہے۔

نواں باب، تفسیر مطالب الفرقان کے حوالہ سے تعزیرات وعقوبات کی بابت، موقفِ پرویز اور اس کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس باب میں قتل وقصاص، حدِ سرقہ، حدِ حرابہ، سزائے ارتداد اور سزائے رجم وغیرہ کی تعزیرات وعقوبات پر، پرویز صاحب کی جملہ فاسد تاویلات، لغوی انحرافات، واقعات میں قطع و برید اور مسخِ حقائق کے ضمن میں، مغالطہ آرائی کی کارروائیوں کو بے نقاب کر کے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کیا گیا ہے۔

دسواں باب، خواتین سے متعلقہ مسائل پر مشتمل ہے جس میں عورتوں کے دائرہ کار، مخلوط سوسائٹی، حجابِ نسواں، خواتین کی عدالتی شہادت، مملکت کی سربراہیٔ نسواں اور قرآنی قانونِ میراث پر، تفسیر مطالب الفرقان کے حوالہ سے، موقفِ پرویز کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزہ میں، ان کے ہر آن بدلتے ہوئے موقف کے اعتبار سے، ان کے تناقضات وتضادات بھی ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔

گیارہواں باب، پرویز صاحب اور تفسیر مطالب الفرقان کے معاشی نظریات کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ کیونکہ فکرِ پرویز کا یہ ایک ایسا اہم پہلو ہے جسے برسوں سے، طلوعِ اسلام کی پیشانی کا یہ کہہ کر جھومر بنایا گیا ہے کہ مجلّہ طلوعِ اسلام، ''قرآنی نظامِ ربوبیت کا علم بردار'' ہے۔ پرویز صاحب کے معاشی نظریات کا تفصیلی جائزہ، مندرجہ ذیل عناوین کے تحت، لیا گیا ہے۔

(۱) پرویز صاحب کا نظامِ ربوبیت اور کارل مارکس کی اشتراکیت
(۲) ذاتی ملکیت پر تفسیر مطالب الفرقان کا موقف
(۳) ملکیتِ اراضی اور قرآنِ مجید
(۴) ملکیتِ مال اور قرآنِ مجید
(۵) انفاقِ اموال اور قرآنِ مجید
(۶) ''نظامِ ربوبیت'' کا منزل بمنزل نفاذ
(۷) کیا صدرِ اسلام میں ''نظامِ ربوبیت'' نافذ تھا؟
(۸) کیا خلافتِ راشدہ میں فاضلہ دولت کا وجود تھا؟
(۹) ''مفکرِ قرآن'' اپنے تضاداتِ کے آئینہ میں
(۱۰) صدرِ اسلام کے نظامِ معیشت کی اصل واساس

اس باب میں، پرویز صاحب کے خود ساختہ ''نظامِ ربوبیت'' کا، خود انہی کی بیان کردہ شروط کی روشنی میں، ہر پہلو سے

جائزہ لیا گیا ہے اور اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ نہ تو قرآن کے اوراق میں اصولاً، اور نہ ہی عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں عملاً، اس نظام کا وجود پایا جاتا ہے۔ یہ نظام، صرف اور صرف، جنابِ پرویز صاحب کے حلقۂ دامِ خیال ہی میں پایا جاتا ہے۔

بارہویں باب میں، عائلی قوانین کے ضمن میں کچھ مباحث کو قلم بند کیا گیا ہے۔ ان میں نکاح، حقِ مہر، طلاق، تعددِ ازواج اور یتیم پوتے کی میراث کے مباحث شامل ہیں۔ ان امور میں تفسیر اور صاحبِ تفسیر کے موقف کا جائزہ، قرآن اور تصانیفِ پرویز ہی کی روشنی میں لیا گیا ہے۔

تیرھواں باب، جو آخری باب ہے، وہ ''متفرقات'' کے زیرِ عنوان، مختلف امور کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ جن میں فطرتِ انسانی، غلامی کا مسئلہ، اور جن وانس جیسے امور کو، زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

اور آخر میں ''حرفِ آخر'' کے زیرِ عنوان، فکرِ پرویز کی قدر و قیمت کو، علمائے اسلام کے فتاویٰ اور علمائے مغرب کی آراء کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

اس مقالہ کی تکمیل میں، جن حضرات کا تعاون مجھے حاصل رہا ہے، میں، ان کی خدمتِ اقدس میں، ہدیۂ تشکر، صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ حضورِ اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ ''جو لوگوں کا شکر گزار نہیں، وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں'' من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ، ورنہ جہاں تک ان معاون بزرگوں اور دوستوں کے ساتھ میری قلبی عقیدت اور دلی محبت کا تعلق ہے، وہ اسلامی اخوت اور قرآنی رشتہ کی اس مضبوط و مستحکم اساس پر قائم ہے جو تشکر کے رسمی الفاظ سے بالا تر ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں --- یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک --- کی ساکت وصامت اور مہر بلب بیتابئ جذبات کی کیفیت کے سامنے، زبان وقلم اور بیان وکلام کی لاکھ سحر آفرینیاں بھی ہیچ ہوا کرتی ہیں۔

مجھے اس بات پر خوشی بھی ہے اور فخر بھی کہ اس مقالہ کی راہِ تکمیل میں واقع موانع ومشکلات کے ازالہ کے لیے، اپنے نگران وسرپرست، جناب پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی شفقت بھری راہنمائی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر شبیر احمد منصوری صاحب کی محبت بھری ڈانٹ ڈپٹ نے، مجھے، غفلت وسہل انگاری کا شکار ہونے سے بچائے رکھا۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمود اختر صاحب کی تشجیع وحوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کی راہنمائی بھی میرے ہمرکاب رہی۔ عزیزی حافظ محمد اقبال صاحب کی دقتِ نظر سے، مسودہ کی خواندگی، حوالہ جات کی جانچ پڑتال اور تصحیحِ اغلاط میں، ان کی محنتِ شاقہ بھی، میرا ہاتھ بٹاتی رہی۔ عزیزی اسد علی ہمایوں صاحب (انچارج شعبہ کمپیوٹر ایجوکیشن، دارِارقم سکول فیصل آباد) کی پوری لگن اور تندہی کے ساتھ، مقالہ کی خوبصورت کمپوزنگ اور پھر فوٹو سٹیٹ کاپیوں کے بعد، جلد بندی کے لیے عزیزی محمد ابرار صاحب مغل (ایڈمن آفیسر، دارِارقم سکول فیصل آباد) کی مساعئ جمیلہ کے بغیر، اس کارِ خیر کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے بے پایاں فضل ورحمت سے، ان سب کے دامن میں، دین ودنیا کی حسنات کو سمیٹ دے۔

اور ہاں، سپاس گزاری کے سلسلہ میں، حضرت مولانا عبدالوکیل علوی مدظلہ العالی تو مجھے یاد ہی نہیں رہے ۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

مولانائے محترم سے میرا تعارف، اسی مقالہ کی اشاعت کے سلسلہ میں ہوا اور اب ان سے مستقل قلبی عقیدت کا تعلق، میرے لیے باعث سعادت ہے۔

اشاعت مقالہ سے قبل، خود میں نے اور میرے احباب نے تقریباً دس بارہ مرتبہ اس کا مطالعہ کیا اور ہر بار جو غلطیاں سامنے آئیں، ان کا ازالہ کر دیا گیا۔ ادارہ معارف اسلامی، لاہور کو، بغرض اشاعت، سی ڈی فراہم کرتے وقت، مجھے اطمینان تھا کہ اب اس میں کوئی غلطی نہیں ہوگی۔ ناظم ادارہ نے حضرت موصوف سے یہ درخواست کی کہ ایک نظر اسے پھر دیکھ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں ان سے ملاقات پر، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری توقع کے خلاف، انھوں نے بے شمار اغلاط کی نشاندہی فرمائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس دقتِ نظر اور حدید البصری سے انھوں نے یہ خواندگی فرمائی، کوئی ماہر پروف ریڈر (Proof Reader) بھی شاید ایسا نہیں کر سکتا۔ ان کی اس ژرف نگاہی اور دقیقہ رسی پر مبنی خواندگی پر، اظہارِ تشکر کے لیے، مجھے الفاظ نہیں مل رہے اور میں اپنی اس کوتاہی کو اس اطمینان کے پردے میں چھپانے پر مجبور ہوں کہ ان کی نگاہیں بھی، میرے الفاظ پر نہیں، بلکہ اس دل پر ہیں، جو سرچشمۂ الفاظ ہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

اس مقالہ کے متعلق، مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے فکرِ پرویز اور منکرین حدیث کے دلائل کو، صرف اور صرف قرآن کی روشنی میں پرکھا ہے اور اپنی سعی و کاوش اور نتائجِ بحث کو، بصورتِ مقالہ، سمیٹ دیا ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ فکرِ پرویز سے وابستہ وہ لوگ، جو اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹی اتار کر، بے لاگ انداز میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے، اس کا مطالعہ فرمائیں گے، وہ، جناب پرویز صاحب کے تجدد کے پائے چوبیں کو سخت بے تمکین پائیں گے، اور وہ یہ محسوس کریں گے کہ رشد و ہدایت، فی الواقع غوایت و ضلالت سے متمیز ہو چکی ہے۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ

میں نہ کوئی عالمِ دین ہوں، اور نہ ہی کوئی ''مفکرِ قرآن''، نہ ابلۂ مسجد ہوں اور نہ تہذیب کا فرزند۔ میں علمائے کرام کی جوتیوں میں بیٹھنے والا محض ایک طالبِ علم ہوں، مجھے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا اچھی طرح علم و احساس ہے۔ اپنی علمی بے بضاعتی اور بے مائیگی کو خوب جانتا ہوں۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ ۔

نہ گلم، نہ برگِ سبزم، نہ درخت سایہ دارم ہمہ حیرتم کہ دہقاں، بچہ کار کشتِ مارا

یہ سراسر فضلِ خداوندی ہے کہ اس نے مجھ جیسے عاجز کو، اس مقالہ کے ذریعہ، خدمت قرآن کی توفیق عطا فرمائی ۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمے کنی منت ازو شناس بہ خدمت بداشتت

میری یہ حقیری خدمت دین، اور آیندہ بھی جو کچھ کر گزرنے کی آرزوؤں سے، خانۂ دل آباد ہے، صرف اور صرف،

اُسی کے فضل و کرم کا مرہونِ منت ہے، اور ہوگا ۔

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا　　　ہم کیا ہیں ، جو کوئی کام ، ہم سے ہوگا

جو کچھ کہ ہوا ، ہوا کرم سے تیرے　　　جو کچھ ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر، میرے سمندِ شوق نے کہیں ٹھوکر کھائی ہو اور میرا قلم و قدم، جادۂ حق اور طریقِ اعتدال سے منحرف ہو گیا ہو، اہلِ علم و فہم اور اربابِ فکر و نظر سے میری گذارش ہے کہ میری خطاؤں اور لغزشوں سے، مجھے، آگاہ فرمائیں تاکہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔ اس مقام پر حضرت عمرؓ کا یہ ارشادِ گرامی میرے لیے مسرت بخش ہے کہ رحم الله رجلا اهدى الیَ عیوب نفسی (خدا اس مردِ مومن کو اپنی رحمت سے نوازے جو میرے عیبوں کا ہدیہ، مجھے بھیجتا ہے)۔

اس مقالہ میں، اگر قارئین کو عیوب و نقائص اور اسقام و علل نظر آئیں تو انھیں میری کوتاہ فہمی کا نتیجہ سمجھیں، ورنہ خدا کی وہ کتاب، جس کی روشنی میں، میں نے یہ مواد مرتب کیا ہے، ہر عیب و سقم سے پاک ہے۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے، مئے بے درد و صاف　　　رنگ جو کچھ دیکھتے ہو، میرے پیمانے میں ہے

مقالہ نویس

حافظ پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی

باب ۱

جناب غلام احمد پرویز کی زندگی اور ان کے علمی آثار

فصل اول

دورِ پرویز اور برِّصغیر کے حالات

(الف) برِّصغیر میں اسلام کی آمد

فاران کی چوٹیوں پر جو آفتاب ہدایت طلوع ہوا تھا، اس کی شعاعیں، پہلی صدی ہجری کے خاتمہ سے قبل ہی ہندوستان پہنچ چکی تھیں۔ محمد بن قاسم نے ۹۳ھ/۷۱۱ء میں جب سندھ فتح کیا، تو پورے ہندوستان میں، فروغ اسلام کے لیے سندھ کو باب الاسلام کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ محمد بن قاسم کو خلافت کے تغیر پذیر حالات کے تحت، جلد واپس جانا پڑا۔ تاہم ملتان تک کے افراد کو، وہ، اسلامی ثقافت اور فیاضی و سخاوت کے اسلامی فضائل سے متاثر کر چکا تھا۔ تقریباً دو صدیوں تک سندھ میں عربوں کی حکومت قائم رہی۔ مگر پھر اضمحلال کا شکار ہو کر ختم ہوگئی۔ بعد میں ترکی النسل، غزنوی حکمرانوں نے، ہندوستان میں ورود فرمایا۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۷ھ/۱۰۲۷ء میں لاہور فتح کیا۔ سلطنت وسعت پذیر ہوئی اور لاہور ہی اس کا دارالسلطنت قرار پایا۔ بعد ازاں سلطان معزالدین محمد بن سام غوری نے ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں دہلی فتح کیا۔ پھر اس کے غلام، قطب الدین ایبک نے مسلم سلطنت کو گوڑ بنگالہ تک وسیع کیا۔ خلجی اور تغلق فرمانرواؤں نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوستان کو، اس وقت امن عطا کر دیا تھا، جبکہ بیرون ہند، اسلامی تہذیب کے مراکز، بلخ، بخارا، سمرقند، نیشاپور، بغداد اور دمشق، تاتار کے ہاتھوں آتش زنی اور غارتگری کا ہدف بنے ہوئے تھے۔

مسلم فاتحین کے علاوہ بلکہ مسلمان حکام کے علاوہ، فروغ اسلام میں، ان مسلم تاجروں کا بھی بڑا حصہ ہے، جو اگرچہ تجارت کے پیش نظر، ہندوستان میں آئے، لیکن انھوں نے اپنی کاروباری دیانت، اسلامی اخلاق، بے لاگ عدل و انصاف پر مبنی لین دین، اور معاملات میں راستبازی کے ذریعہ، اپنے ماحول میں اسلامی اصولوں کی عظمت، اپنے عمل سے اجاگر کی۔ اور تیرہ و تار فضاء میں روشنی کی کرنیں ثابت ہوئے۔

علمائے کرام اور صوفیائے عظام نے بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں، لوگوں سے ربط و ضبط قائم کیا، علماء نے درس گاہیں اور صوفیاء نے خانقاہیں قائم کیں۔ درسگاہوں سے تعلیمات اسلامیہ کے پھیلاؤ کا آغاز ہوا اور خانقاہوں میں تزکیۂ نفس کا سلسلہ وجود میں آیا، اور دونوں طبقوں کی مساعی، اشاعت اسلام میں مؤثر اور کارگر رہی۔

لیکن مسلمان فرمانروا ہوں یا تاجر، علماء کرام ہوں یا صوفیائے عظام، ان سب کی کوششوں کا اصل ہدف، بہرحال وہ نہ تھا، جو خلفاء راشدین کے پیش نظر تھا۔ صحبت نبوی اور تعلیم و تربیتِ آغوشِ رسالت نے، صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی کو صبغۃ اللہ میں رنگ دیا تھا۔ اور ان کا مقصدِ حیات، خدا کی زمین پر، خدا کا اقتدار بالفعل قائم کرنا تھا۔ لیکن ہندوستان آنے والے فاتحین اور سربر

آرائے تخت ہونے والے حکمران، اگرچہ مسلمان تھے، مگر اسلام، ان کا اوڑھنا بچھونا نہ تھا۔ ان کے بدن، اس روحِ اسلام سے محروم تھے، جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں موجود تھی۔ انھیں، اسلام کے مقصد سے کہیں زیادہ، اپنا سیاسی اقتدار عزیز تھا، اور یہی ان کی تگ و دو کا مرکز و محور تھا۔ اسلام کا استحکام، اتنا اہم نہ تھا جتنا سیاسی استحکام ان کی نگاہ میں اہم تھا۔ اس لیے وہ یہاں کی مقامی آبادی کے فکر و نظر، قول و کردار اور سعی و عمل کو، اسلامی ڈھانچے میں نہ ڈھال سکے، اور لوگ، خالص اسلام کی ان برکات سے محروم رہے، جن برکات کے دروازے، عرب کے بدوؤں پر، اللہ تعالیٰ نے کھول دیے تھے۔ اس طرح، اگر یہاں مسلم تاجروں نے فروغِ اسلام کا کام کیا، تو ان کا دائرہ کار بھی محدود تھا۔ پورے اسلام کو، پوری زندگی پر غالب کر دینے پر، نہ تو وہ قادر ہی تھے، اور نہ ہی شاید، ان کے پیش نظر تھا۔ یہی حال صوفیاء کرام کا بھی تھا۔ وہ لوگوں کا تزکیۂ نفس کیا کرتے تھے، مگر ان کے تزکیۂ نفس کا مقصد، وہ نہ تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے پیش نظر تھا۔ اسلام، تزکیۂ نفس کے ذریعہ، ایسے بیدار مغز مجاہد پیدا کرنا چاہتا ہے، جو رزم گاہِ حق و باطل میں، مردانہ وار کود کر، باطل کو نیچا دکھانے اور حق کو غالب کرنے کا مقصد پیش نظر رکھتے ہوں، لیکن خانقاہی تزکیۂ نفس، انھیں کشمکشِ خیر و شر سے بیگانہ رکھ کر، باطنی مشاہدات و واردات کے لیے گوشہ گیر کر کے رکھ دیتا ہے، ایسے زاویہ نشینوں سے، یہ توقع کیونکر وابستہ کی جا سکتی ہے کہ وہ خانقاہوں سے نکل کر اور اپنی خلوت گاہوں کو چھوڑ کر، رسم شبیری ادا کرتے ہوئے، حق کا بول بالا کریں گے، اور کلمۂ باطل کو پست کریں گے۔

مزید برآں، رسالتِ محمدیہ کی برکت سے، وادیٔ غیر ذی زرع کے سرچشمۂ ہدایت سے جو سیلِ آب اُمڈا، وہ اپنے صافی اور شفاف پانی میں، راستے کی کثافتیں سمیٹتا ہوا، ہندوستان پہنچا، اور خود یہاں کا خس و خاشاک بھی، اس میں شامل ہو گیا۔ اس طرح یہاں پر اسلام آیا تو وہ ابتدائی سرچشمہ سے برآمد ہونے والے، پانی کی طرح صاف اور شفاف نہ تھا، بلکہ مرورِ ایام کے باعث بھی اور راستے کی کدورتوں کے شامل ہو جانے کی وجہ سے بھی، گدلا اور مکدر ہو چکا تھا، اس لیے یہاں کی آبادی پر وہ اثر ظاہر نہیں ہو سکتا تھا، جو قرنِ اول کے سادہ بدوی مزاج پر، خالص اسلام نے مرتب کر دکھایا تھا، کیونکہ یہاں پہنچنے والے اسلام میں، عربی اسلام کی تازگی اور طراوت باقی نہ رہی تھی، سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

> ایرانی اور ترکی سلاطین نے قانونِ شریعت کے ساتھ، ''آئینِ نوشیرواں'' کو بھی شامل کر دیا۔ جب تاتاری، عالم اسلام کے حکمران بن گئے تو انھوں نے شریعت میں تورۂ چنگیز خاں (تورہ بمعنی قانون ہے۔ قاسمی) کا اضافہ کیا۔ وہ دین، محمد ﷺ کا رکھتے تھے، مگر ان کی سیاست اور خراج باج کے طریقے، آئینِ قیصر و کسریٰ اور چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے دستور و قواعد پر مبنی تھے۔ اس لیے ہماری پچھلی سلطنتیں مسلمان تو ضرور تھیں، مگر اسلامی نہ تھیں۔ ان کے فرمانروا مسلمان تھے مگر ان کا قانون اسلامی نہ تھا، جس طرح آج، انگریزی عہد میں محمڈن لاء جاری ہونے سے، کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی، الا یہ کہ ان کے لیے اسلام کے استعمال میں، ہم ایک نوع کا مجاز اور تساہل برتتے ہیں۔ [1]

---

[1] رسالہ معارف، اعظم گڑھ، انڈیا، اکتوبر ۱۹۴۷ء، عنوان ''اسلامی حکومت''، بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، صفحہ ۴۵ تا صفحہ ۴۶

اکبر بادشاہ اور مجدد الف ثانی

اسلام، ہندوستان میں آیا تو یہاں کے اسلامی شعور سے بے بہرہ حکمرانوں میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اسلام اور جاہلیت کا ملغوبہ بناتے رہے، یہاں تک کہ مغل بادشاہ، اکبر کے متعلق، مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا کہ

> اپنی ماں کے مرنے پر، اس نے، ہندو رسم کے مطابق بھدرا کرایا تھا یعنی سر داڑھی، مونچھ اور ابرو کے سارے بال مونڈوا دیے تھے، ہمایوں کا بیٹا، بابر کا پوتا، ترک بچہ، ایسا لگتا تھا جیسا کہ بھوانی کا کوئی بنیا بیٹھا ہو۔[1]

اسی اکبر نے، دین الٰہی کے نام سے، اسلام اور ہندومت پر مشتمل ایک ملغوبہ پیش کیا تھا، جسے سرکاری پشت پناہی کے باوجود، مقبولیت حاصل نہ ہوئی، اسلام اور ہندو دھرم کا یہ آمیزہ، یا یوں کہیے کہ حق و باطل کا یہ امتزاج، کفر و اسلام کی حد فاصل مٹا دینے کے لیے، ایک متحدہ دین اور متحدہ قومیت کو رواج دینے کی ایک کوشش تھی، لیکن احمد سرہندی، المعروف بہ مجدد الف ثانی کی زبردست شخصیت، اس گمراہی کے راستے میں رکاوٹ بن گئی اور اکبر کی یہ مساعیٔ نامسعود بار آور نہ ہو پائی۔

مسلم عوام کی اسلام سے دوری کا ایک سبب یہ بھی تھا، کہ ہندوستانی اسلام، فقہ و تصوف کے دو بڑے اجزاء پر مشتمل تھا۔ جس میں قرآن و سنت کے ماخذ اصلیہ کا عنصر، اگرچہ ناپید نہ تھا لیکن کمزور ضرور تھا۔ اس فضاء میں، شیخ احمد سرہندی نے رجوع الی القرآن والسنۃ کی انقلابی صدا بلند کی۔ اس کے اثرات، دوررس اور دیرپا ثابت ہوئے، اور ہندوستان میں عامۃ الناس نہیں، تو کم از کم دینی حلقوں میں، اسلام کے ماخذ اصلیہ ...... قرآن اور سنت رسول ...... کی طرف رجحان، افزائش پذیر ہوا۔ اس طرح انھوں نے ہندوستان میں اہل علم اور ان کے زیر اثر عوام الناس کا رخ، اصل سرچشمۂ اسلام کی طرف موڑ دیا، اور عربی اسلام سے ان کا قرب بڑھتا گیا۔ اسی بناء پر، علامہ اقبالؒ نے انھیں یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

شیخ مجدد الف ثانیؒ نے سلطنتِ اکبر کے مسلمان امراء و اعیان تک بھی رسائی پائی، اور ان کے ذریعہ سے حکومت کو کفر کی گود میں جانے سے بچا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت آیا کہ تختِ اکبر پر بھی محی الدین اورنگزیب جیسا متقی اور متبعِ سنت فرمانروا جلوہ گر ہوا۔

شاہ ولی اللہ

شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد، دوسری عظیم شخصیت، جس نے ہندی اسلام کو، آلائشوں سے پاک صاف کر کے، تجدید و احیائے اسلام کی خدمت انجام دی، وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہیں۔ آپ کا عرصہ حیات ۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۲ء تک ممتد

[1] مقالات محمد حسین آزاد، صفحہ ۷۸۵، بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، صفحہ ۴۷

ہے۔ انھوں نے مغل حکمرانوں کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ محض زوالِ اقتدارِ مغلیہ ہی نہ تھا بلکہ ایک تہذیب اور ایک ملت کا زوال تھا۔ ان کے عرصہ حیات میں دس حکمران، یکے بعد دیگرے، برسرِ اقتدار آئے، اور محرومِ اقتدار ہوئے۔ ان حکمرانوں کی ترتیب یہ ہے۔

عالمگیر، بہادر شاہ، معز الدین جہاندار، شاہ فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ (المعروف بہ رنگیلا)، ابوالنصر احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم [1]

شاہ صاحب، ملت کے اس زوال پر انتہائی فکر مند ہو کر فرمایا کرتے تھے، کہ

> اگر کفار کا غلبہ معاذ اللہ، اسی طرح باقی رہا تو مسلمان، اسلام سے بیگانہ ہو جائیں گے، اور زمانہ زیادہ نہیں گزرے گا کہ وہ ایسی قوم بن کر رہ جائیں گے، جو نہ اسلام کو جانتے ہوں گے اور نہ ہی کفر کو۔ یہ بڑی مصیبت ہوگی۔ [2]

شاہ صاحب کا دور، انتہائی پُرفتن اور خونی انقلابات کا دور تھا، جسے بالا اختصار، ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے:

> ان سلاطین کے عہد میں، ہندوستان کو جن مہیب اور خونی واقعات اور تاریخی انقلابات سے گزرنا پڑا، تاریخ دان طبقہ اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ ''ساداتِ بارہ'' کا فتنہ، شہزادہ فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں، قید میں بصد بے کسی مرنا، دربار کے تورانی امراء کے ہاتھوں ان سادات کا زوال، مرہٹوں کی سرکشی کا انتہائی عروج، سکھوں کا خونی فتنہ، نادر شاہ کا قتل، احمد شاہ ابدالی کا پانی پت کے میدان میں ایک فیصلہ کن جنگ کے ذریعہ ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دینا، روہیلوں کا ہندی سیاست میں حصہ لینا، مغربی طاقتوں کا بتدریج ملک کی سیاست میں دخیل ہوتے چلے جانا، اور پھر بنگال اور بعض علاقوں پر، اس کا اقتدار قائم ہو جانا، تقریباً یہ تمام واقعات، شاہ صاحب کی زندگی ہی میں پیش آئے تھے اور شاہ صاحب ان سے بے تعلق نہ رہے تھے، بلکہ ایک خاص پروگرام کے تحت، وہ ایک مخصوص مقصد کو سامنے رکھ کر، اپنی جدوجہد میں مصروف رہے اور یہ اس جدوجہد کا ہی کا نتیجہ تھا، کہ حالات کی ناسازگاری کے باوجود، ہندوستان میں اسلام 'الحمد للہ' زندہ رہا۔ [3]

بہرحال، مسلم حکمران، سیاسی زوال کا شکار تو ہو ہی رہے تھے، شاہ صاحب کی کوشش یہ تھی کہ اہل ایمان میں، دینی انحطاط واقع نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے لیے، انھوں نے درج ذیل تدابیر اختیار کیں۔

(۱) انھوں نے دین کے سرچشمۂ حقیقی قرآن مجید کو عوام کے لیے قابل فہم بنایا۔ خود انھوں نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا اور ان کے بعد شاہ عبدالقادر نے ۱۸۱۳ء اور شاہ رفیع الدین نے ۱۸۱۸ء میں اردو تراجم کیے۔ یہ دونوں ان کے فرزند تھے۔

(۲) دینِ اسلام کا دوسرا سرچشمہ، حدیث ہے۔ شاہ صاحب نے علم حدیث کو ہندوستان میں عام کیا۔ حدیث کی چھ مستند کتابوں (صحاح ستہ) کا چلن عام کیا۔ اور ان کو نصابِ تعلیم میں شامل کیا۔

(۳) فکری لحاظ سے شاہ صاحب کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دین کا مجموعی مربوط تصور پیش کیا۔ اس کو ایک نظامِ حیات بنا کر

---

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷۹

[2] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (از خلیق احمد نظامی)، صفحہ ۴۵

[3] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷۹

پیش کیا۔ اور اسے فکری بنیادوں پر استوار کیا۔ اس طرح آنے والی تمام عقلی اور فکری کاوشوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔ بعد کے تمام اہل علم ان کے نقطہ نظر کی پیروی کرتے ہیں۔

(۴) اختلافات نے اس ملت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے انھوں نے وحدتِ ملت کی کوشش کی۔ اختلافات میں تطبیق پیدا کی۔ ان کی مساعی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے شیعہ، سنی، حنفی، شافعی تقلید و اجتہاد، شریعت و طریقت، وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں راہ تطبیق پیدا کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔

(۵) سیاسی اعتبار سے انھوں نے اسلامی حکومت کو بچانے کی آخری مرتبہ کوشش کی۔ نجیب الدولہ کو خطوط لکھے۔ افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کو بلوایا مگر حکومت کا درخت اس قدر کھوکھلا ہو چکا تھا کہ اب کسی خارجی سہارے سے بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ [1]

شاہ ولی اللہؒ کی اس مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں دو قسم کی تحریکیں معرضِ وجود میں آئیں۔

اولاً علمی اور فکری تحریک، جس کا مقصد، اسلام کی دعوت و اشاعت تھا۔

ثانیاً اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے جہاد اور مسلح جدوجہد

ان دونوں تحریکوں کے چراغ سے مزید چراغ جلتے گئے، اور فکری اور جہادی تحریکیں منصۂ شہود پر آ کر اپنا کردار ادا کرتی رہیں۔

برطانوی عہد میں مذہبی حالت

مسلمانانِ ہند، اگر چہ فکر و نظر، اور سیرت و کردار کے اعتبار سے بہت بلند پایہ مسلمان نہ تھے، مگر برطانوی اقتدار سے قبل تک، وہ ایسے بھی گئے گزرے نہ تھے کہ کفر، ان سے راضی ہو، اور بت ان سے خوش ہوں۔ انھوں نے اپنے دین سے وابستگی کی بناء پر، اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھا۔ ایک ایسے ملک میں، جس میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہوں اور جس میں مخلوط و مشترک معاشرت کی بناء پر، باہمی اخذ و قبول کے راستے بھی کھلے ہوں، اس میں مسلمانوں کا اپنی تہذیبی اقدار و روایات سے یوں وابستہ رہنا کہ ان کی دینی انفرادیت اور اسلامی تشخص مٹنے نہ پائے، ایک ایسا امر تھا جو انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کے لیے وجۂ پریشانی تھا۔ چنانچہ انھوں نے پوری جدوجہد کی کہ مذہبی طور پر مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعہ، اور تہذیبی طور پر، مغربی ثقافت کی یلغار کے ذریعہ، اہل اسلام کی انفرادیت کو ختم کیا جائے۔ مغربی تعلیم، مغربی طور طریقے، مغربی آداب اکل و شرب، مغربی انداز لباس و معاشرت اور مغربی طرز کے اداروں کا قیام، یہ سب کچھ اسی مقصد ہی کے پیش نظر تھا۔ تمدنی اور ثقافتی دائرے میں تو یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا۔ مگر دینی عقائد کی شکست و ریخت کے لیے، مسیحی مشنریوں کے ذریعہ، جارحانہ تبلیغ کے ذرائع اختیار کئے گئے۔ پادریوں کی کھیپ کو وسیع پیمانہ پر درآمد کیا گیا، جگہ جگہ یہ پادری مجمع قائم کر کے وعظ کرتے، اور مسلمانوں اور غیر

[1] تاریخ نظریہ پاکستان، صفحہ ۵۲ تا ۵۳

مسلموں کو قبولِ مسیحیت پر آمادہ کرتے، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، پادریوں کی ان تبلیغی سرگرمیوں کے متعلق فرماتے ہیں:

جب تک انگریزوں نے اپنی سلطنت ہندوستان میں قائم نہیں کی اور مکمل انتظام نہیں کر لیا، اس وقت تک ان کے پادریوں کی جانب سے دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کی تردید میں رسالے کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ ان کو ہندوستان کے مختلف شہروں میں اور عوام الناس میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ بازاروں میں لوگوں کو مجمع میں اور عام گزرگاہوں پر کھڑے ہو کر، یہ پادری وعظ کہنے لگے۔ [۱]

پولیس کے ذریعے، ان پادریوں کی حفاظت کا سرکاری انتظام کیا جاتا تھا، اور یہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف، کھلے بندوں، بدزبانی اور دریدہ دہنی کا ارتکاب کرتے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں کلکتہ کے لاٹ پادری ایڈمنڈ کی طرف سے جاری، ایک چھٹی کے مطابق، تمام سرکاری ملازمین کو یہ ہدایت کی گئی کہ

اب جگہ جگہ ریلوے اور سڑک جاری ہے، تار برقی کے ذریعہ خبریں پہنچتی ہیں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ تم سب لوگ عیسائی بن جاؤ۔ [۲]

پادریوں سے مناظرہ بازی

پادری، اسلام کے خلاف متعصبانہ مطالعہ کر کے، عام مسلمانوں کو مناظروں کا چیلنج دیتے پھرتے۔ روز روز کے ان نت نئے چیلنجوں سے تنگ آ کر، فرزندانِ اسلام کو بھی مجبوراً میدانِ مناظرہ میں آنا پڑا۔ لیکن اس سے پہلے انھوں نے مسیحیت کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ عبرانی، سریانی اور یونانی زبانیں سیکھیں، اور پھر مناظروں کے اکھاڑے جمتے، لیکن سب سے اہم اور فیصلہ کن مناظرہ، وہ تھا جس میں مسیحیت کے سب سے بڑے مناظر، پادری فنڈر کو سرکاری حکام اور خلقِ کثیر کی موجودگی میں، مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ایسی شکست دی، کہ اس کے بعد عیسائی پادریوں کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

انگریز حکمرانوں کی شہ پا کر، آریہ سماجیوں نے بھی، اسلام اور پیغمبرؐ اسلام پر، زبانِ طعن دراز کرنا شروع کر دی۔ علماء کرام کے ایک گروہ نے، جن میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا عبدالحق نمایاں افراد ہیں، پنڈتوں کو مُسکت جواب دے کر، مدافعتِ اسلام کا فریضہ انجام دیا۔

بہر حال، مسلمانوں کی مذہبی حالت کا یہ پہلو تو مدافعانہ پہلو ہے، جو اعداء اسلام کے حملوں کے ردِ عمل میں ظاہر ہوا، اگر دشمنانِ دین، دینِ اسلام یا پیغمبرؐ اسلام کو اپنی دریدہ دہنی کا نشانہ نہ بناتے تو مذہبی حالت کا یہ پہلو، کبھی منظر عام پر آ ہی نہ سکتا تھا۔

علاوہ ازیں، داخلی طور پر، مسلم معاشرے کی اٹھارہویں صدی میں جو حالت تھی، اس کے متعلق مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

ہم نے ایک مدت تک بادشاہی نظام کے تحت زندگی گذاری ہے جو پوری طرح اسلامی نظام نہیں تھا۔ مگر اس میں پھر بھی

---

۱ میزان الحق (رحمت اللہ کیرانوی)، صفحہ ۹، بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، صفحہ ۸۵

۲ اسباب بغاوت ہند از سر سید احمد خاں، صفحہ ۱۵۹

اسلامی قانون رائج تھا اور عام مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا کام، علماء اور صوفیاء انجام دیتے تھے۔ اس وجہ سے اگر چہ وہ معاشرہ، اس درجہ کا تو نہ تھا جس درجہ کا وہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں تھا، لیکن اس کے باوجود، نہ لوگوں کی عام حالت اتنی بگڑی تھی جتنی بعد میں بگڑی، اور نہ لوگ اسلام کے علم سے اس قدر بے بہرہ تھے، جس قدر بعد میں ہوئے، شراب نوشی مسلمانوں میں تقریباً ناپید تھی، لوگ گناہ کرتے تھے، مگر اعلانیہ بے باکی کے ساتھ نہ کرتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں، جب انگریزی حکومت، اول بنگال میں قائم ہوئی تو اس زمانہ کے بعض انگریز مصنفین لکھتے ہیں کہ چوری وہاں ناپید تھی، چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا، مسلمانوں سے جھوٹ کی کوئی توقع نہ کرتا تھا کہ عدالت میں جا کر کوئی مسلمان جھوٹی گواہی دے گا۔ مسلمانوں کی عام آبادی لکھی پڑھی تھی، بلکہ تقریباً سو فیصدی خواندہ تھی، یہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک ہماری حالت تھی۔ [1]

مسلمانوں کی حالت میں جب بھی ضعف واضمحلال کی کیفیت پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اس کے ازالہ کے لیے کسی نہ کسی جید ہستی کو اٹھا کھڑا کیا۔ شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ اور ان کا پورا خاندان، ایسی ہی نادرۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ خاندانِ ولی اللہ کی مساعیٔ جمیلہ کے نتیجے میں دو قسم کی تحریکیں معرض وجود میں آئیں، ایک علمی وفکری تحریک، جو تعلیم وتدریس کے میدان میں مصروف کار تھی، اور دوسری مسلح جہاد کی تحریک، جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جان ومال کی قربانی دینے پر تلی ہوئی تھی۔ مجنون شاہ مستانہ کی انگریزوں کے خلاف (۱۷۶۱ء تا ۱۷۸۶ء تک) گوریلا تحریک، حاجی شریعت اللہ (۱۸۰۲ء تا ۱۸۶۰ء) کی فرائضی تحریک، دراصل، اس تحریک مجاہدین (۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۵ء) کا ہراول دستہ تھیں، جس کی قیادت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے ہاتھوں میں تھی۔ اس تحریک کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو، اپنی تعلیم وتربیت کے ذریعہ، ایسے پاکباز اور تقویٰ شعار مجاہدین میں بدل دیا، جو اپنی متاعِ حیات مع نفس حیات، اللہ تعالیٰ کا بول بالا کرنے کے لیے وقف کر چکے تھے۔ اگر چہ یہ تحریک چند عارضی کامیابیوں کے بعد، اپنوں کی ''کرم فرمائیوں'' کے سبب دم توڑ گئی، لیکن اخلاف کو غلبۂ دین کا نہ صرف یہ کہ نصب العین دے گئی بلکہ اس کی خاطر، تن من دھن تک کو قربان کر دینے کا حوصلہ اور جذبہ بھی دے گئی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

اس کے بعد، آخری معرکہ وہ تھا، جسے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کہا جاتا ہے۔ اس میں ہندو مسلم سب ہی شامل تھے، جو انگریزوں کے خلاف، آزادی یا کم از کم اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اور مسلمان تو بالخصوص، انگریزوں کے ہاتھوں ستم رسیدہ تھے، اہل ایمان میں سے ایک گروہ، ان مخلصین پر مشتمل تھا، جو انگریزوں کے خلاف لڑنا، تقاضائے ایمان اور مطالبۂ دین سمجھتا تھا، یہ علمائے کرام کا گروہ تھا۔

ان جنگ آزما لوگوں میں اسلامی حمیت اور دینی غیرت، جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت تو فراواں تھا، لیکن نظم وضبط کا

[1] بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، صفحہ ۵۳

فقدان تھا، باہمی ربط اور مشترکہ قیادت کے فقدان کے باعث، اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ بہت سے راجے، نواب اور سردار، اب بھی انگریزوں کے حامی تھے، اس تحریک کا، ان وجوہ سے، ناکام ہونا، غیر متوقع نہ تھا، لیکن اس کا بدترین نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے اس ناکام بغاوت کی ساری ذمہ داری، مسلمانوں پر ڈال دی اور انھیں شدید ترین انتقام کا نشانہ بنایا، علماء اور شرفاء کو چن چن کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد، تمام شہر کو آبادی سے خالی کروالیا گیا، خوب لوٹ مار کی گئی، مدفون خزانوں کے لالچ میں، مکانوں کے صحنوں تک کو کھود ڈالا گیا۔ تین ہفتہ بعد، ہندو افراد کو شہر میں آنے کی اجازت دی گئی، مگر مسلمانوں کو یہ اجازت، تین سال بعد ملی، مارشل لاء حکام نے سول اور فوجی افسروں کو پھانسی تک دے دینے کے اختیارات عطا کر دیے تھے۔ دیر تک پھانسی یافتہ لاشوں کو لٹکائے رکھنے کے بعد جلا دیا جاتا تھا۔ غالب، جو ان مظالم کا عینی شاہد ہے، کہتا ہے۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک، جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا!
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا!

بہادر شاہ ظفر کہتا ہے ۔

جسے دیکھا حاکم دار نے ، کہا ، یہ بھی قابلِ دار ہے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کو اس قدر کچلا گیا کہ انگریز کو یقین ہو گیا کہ اب مسلمانوں میں دوبارہ اٹھنے کا دم خم باقی نہیں رہا، لیکن تحریک مجاہدین کی راکھ میں ابھی کچھ چنگاریاں باقی تھیں جو ہوا پا کر بھڑک سکتی تھیں۔ خلفائے سید احمد میں سے، مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی صادقپوری، عظیم آبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد، پھر مجاہدین کو منظم کیا اور ۱۸۶۲ء میں انگریز سے ٹکر لی، انبیلہ کی جنگ میں، انھوں نے جنرل چیمبرلین کو شکست دی، وہ (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۸ء) چار سال تک، انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے، افرادی اور مالی صورت میں امداد، بنگال سے فراہم ہوتی رہی، انگریزوں نے بنگال میں اس سرچشمہ کا سراغ لگایا جو مجاہدین کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ وسیع پیمانے پر مقدمات قائم کئے گئے، دار و گیر کا منظم سلسلہ وجود پذیر ہوا، اور سزائیں دے کر مجرموں کو کالے پانی بھیجا گیا۔ جائیدادوں کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ اس طرح اگرچہ بظاہر یوں یہ شورش ختم ہو گئی، لیکن انگریز مسلسل اس تشویش میں مبتلا رہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جوش و خروش کو آخر کیونکر ٹھنڈا کیا جائے۔

برطانوی پارلیمنٹ نے بھی اس مسئلہ کی سنگینی کے پیشِ نظر، ایک کمیشن، جائزہ لے کر، پھر اس کا حل پیش کرنے کے لیے ہندوستان بھیجا جس نے غور کے بعد یہ حل پیش کیا:

اب تک حکومت مسلمانوں کے ساتھ سختی اور حقارت کا برتاؤ کرتی رہی ہے، مگر نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلا۔ اب ان کے ساتھ نرمی کا

برتاؤ کرنا چاہیے، شاید حالات بہتر ہو جائیں۔ مزید یہ کہ ان کو داخلی انتشار میں مبتلا کر دیا جائے، تاکہ یہ آئندہ کوئی متحدہ اقدام نہ کر سکیں۔ ؎۱

اس طرح ۱۸۶۹ء سے مسلمانوں کے متعلق، انگریزوں کے رویہ میں سختی کی جگہ نرمی نے لے لی اور ان کی دلداری کے لیے تلافیٔ مافات کی بھی کوششیں کی گئیں۔

حرمتِ جہاد کے فتاویٰ

انگریز، جس لفظ سے سب سے زیادہ خائف تھا وہ ''جہاد'' کا لفظ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد کو ختم کیا جائے۔ اس کے لیے انگریزوں نے دو تدابیر اختیار کیں۔

اولاً............ یہ کہ برطانوی حکمرانوں نے مخالفتِ جہاد میں فتاویٰ اکٹھے کیے، انگریزوں نے خلافتِ عثمانیہ کو استعمال کیا، اور علمائے حرمین شریفین سے بھی فتاویٰ حاصل کیے کہ ''چونکہ انگریزی حکومت امن فراہم کرتی ہے، اس لیے ہندوستان، دارالحرب نہیں بلکہ دارالامن ہے فلہٰذا انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا درست نہیں''۔ مقامی علماء سے بھی ایسے فتوے لے کر ان کی خوب تشہیر کی گئی۔ لیکن بہرحال، یہ علماء کی انفرادی آراء ہی تھیں جو قرآن و سنت کی واضح نصوص کے مدمقابل نہیں ہو سکتی تھیں، قرآن کے بین احکام کو بدل ڈالنے کے لیے ایک نئی شریعت، نئی کتاب، اور نئی نبوت درکار تھی مگر اس میں عقیدۂ ختم نبوت حائل تھا۔

ثانیاً............ یہ کہ عقیدۂ ختم نبوت کو تاویل کی بھینٹ چڑھا کر، ظلی نبوت کی آڑ میں، مرزا غلام احمد قادیانی کو اس مقصد کے لیے انگریزوں نے اٹھا کھڑا کیا۔ مرزا صاحب نے خود بھی انگریزوں کے ہاتھوں اپنے تئیں خود کاشتہ پودا ہونے کا اعتراف کیا ہے اور برطانوی حکومت سے خاص توجہ کا مطالبہ کیا ہے:

> صرف یہ التماس ہے کہ سرکارِ دولت مدار، ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے پکے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں، اس خود کاشتہ پودہ کی نسبت، نہایت حزم اور احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔ ہمارے خاندان نے سرکار انگریزی کی راہ میں، اپنے خون بہانے سے اور جان دینے سے فرق نہیں کیا اور نہ اب فرق ہے۔ لہٰذا ہمارا حق ہے کہ ہم خدماتِ گذشتہ کے لحاظ سے سرکار دولتمدار کی پوری عنایات اور خصوصیتِ توجہ کی درخواست کریں تاکہ ہر شخص بے وجہ ہماری آبروریزی کے لیے دلیری نہ ہو سکے۔ ؎۲

چنانچہ مرزا غلام احمد صاحب نے، اپنی متنبیانہ حیثیت میں، بڑے زور شور سے یہ فتویٰ جاری کیا کہ ـــ

؎۱ بیس بڑے مسلمان (از عبدالرشید ارشد)، مکتبہ رشیدیہ، دیباچہ، صفحہ ۶، بحوالہ تاریخ نظریہ پاکستان، صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۴

؎۲ تبلیغِ رسالت (از مرزا غلام احمد قادیانی)، جلد ہفتم، صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۲۰

اب چھوڑ دو اے دوستو! جہاد کا خیال
دیں کے لیے حرام ہے، اب جنگ اور قتال

صرف فتویٰ ہی نہیں دیا بلکہ برسوں ایسی کتب اور رسائل اور اشتہارات و مقالات کی تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، جن کا مقصد اہل اسلام کے دلوں سے جذبہ جہاد کو ختم کر کے، انگریزوں کی سچی وفاداری اور پختہ فرمانبرداری کی راہ پر لانا تھا۔ مرزا صاحب نے اپنی جماعت کی تشکیل و تعمیر، جن اصولِ پنجگانہ پر کی تھی، ان میں سے، تیسرے اور چوتھے اصول کو وہ ان الفاظ میں پیش کیا کرتے تھے:

......تیسرے یہ کہ دین اسلام کی دعوت، محض دلائل عقلیہ اور آسمانی نشانوں سے کرنا، اور خیالاتِ غازیانہ اور جہاد اور جنگ جوئی کو اس زمانہ کے لیے قطعی طور پر حرام اور ممتنع سمجھنا، اور ایسے خیالات کے پابند کو صریح غلطی پر قرار دینا، چوتھے یہ کہ اس گورنمنٹ محسنہ کی نسبت، جس کے ہم زیر سایہ ہیں یعنی گورنمنٹِ انگلیشیہ کوئی مفسدانہ خیالات دل میں نہ لانا، اور خلوصِ دل سے اس کی اطاعت میں مشغول رہنا۔ [1]

جہاد سے متنفر کرتے ہوئے اور حکومتِ برطانیہ کی وفاداری اور تابعداری میں امت مسلمہ کو سونپنے کے لیے، مرزا صاحب نے برسوں پر محیط کوششوں کا یوں ذکر کیا ہے۔

میں ابتدائی عمر سے اس وقت جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلیشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کو دور کروں جو انکو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔ [2]

☆ - افسوس کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس لمبے سلسلۂ اٹھارہ برس کی تالیفات کو جن میں سے بہت سی پرزور تقریریں اطاعتِ گورنمنٹ کے بارے میں ہیں، کبھی ہماری گورنمنٹ محسنہ نے توجہ سے نہیں دیکھا اور کئی مرتبہ میں نے یاد دلایا مگر اس کا اثر محسوس نہ ہوا۔ [3]

☆ - میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے، کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔ [4]

مرزا صاحب، وہ واحد ''نبی'' اور ''رسول'' ہیں جنھیں انگریزوں نے صرف اس لیے مبعوث فرمایا کہ وہ ''دیں کے لیے جہاد کو حرام قرار دیں'' اور لوگوں کو بلکہ امتِ مسلمہ کے افراد کو، اللہ تعالیٰ کی بجائے، انگریزوں کا وفادار اور فرمانبردار بنائیں۔ ان کی انھی تعلیمات پر، علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی

---

[1] تبلیغ رسالت، جلد ہفتم، صفحہ ۱۸
[2] تبلیغ رسالت، جلد ہفتم، صفحہ ۱۰
[3] تبلیغ رسالت، جلد ہفتم، صفحہ ۱۱
[4] تبلیغ رسالت، جلد ہفتم، صفحہ ۱۷

جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے [1]
وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش

جس نبوت میں نہیں، قوت وشوکت کا پیام [2]
ہو بندۂ آزاد، اگر صاحب الہام

ہے اس کی نگاہ فکر و عمل کے لیے مہمیز [3]
محکوم کے الہام سے ، اللہ ، بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز [4]

عملی بگاڑ کے بعد فکری انتشار

حرمتِ جہاد کے بعد، مسلمانوں کو داخلی انتشار میں مبتلا کرنے کے لیے، مناظرانہ اور مجادلانہ فضاء کو دوبارہ تیار کیا گیا۔ پہلی مرتبہ یہی کام مسیحی پادریوں اور ہندو پنڈتوں کے ذریعہ کیا گیا تھا جو بہر حال غیر مسلم تھے، لیکن اب کی بار یہی کام، ان لوگوں سے لیا گیا جو مسلمانوں کی صفوں میں شامل تھے۔ اس کی ابتداء سر سید احمد خاں کے ہاتھوں ہوئی جنھوں نے مغربی تعلیم وتہذیب کی ذہنی غلامی کا شکار ہو کر، اسلام کو چھیل چھال کر، معیارِ مغرب کے مطابق بنانے کی جب کوشش کی تو ایسی رکیک اور دور خیز تاویلات سے کام لیا جس سے مسلمانوں میں وہ مسائل بھی متفق علیہ نہ رہے جن پر صدیوں سے مسلمانوں کا اتفاق چلا آرہا تھا۔ سر سید نے سائنس اور طبیعی قوانین پر اس قدر زور دیا کہ ایمان واعتقاد کی قرآنی تعلیمات، یا تو پس منظر میں چلی گئیں یا پھر تاویلات کا شکار بن کر، مغربی افکار کے سانچوں میں ڈھلتی گئیں۔ سائنسی قوانین کی تعلیم پا کر، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے پر اسقدر زور دیا کہ ایمان واعتقاد کی قرآنی تعلیمات پر مبنی ''اخلاقی صالحیت''، اُس ''مادی صلاحیت'' کی بھینٹ چڑھ گئی جو کائنات کے طبعی قوانین پر مبنی ہے۔ علماء کے درمیان، اگرچہ فقہی اختلافات پہلے بھی موجود تھے مگر ان کی حیثیت محض معمولی اور فروعی اختلافات کی تھی لیکن سر سید نے جو اختلافات پیدا کیے اس سے اسلامی اصول وکلیات ہی اختلاف وانتشار کا نشانہ بن گئے۔ الغرض، سر سید سے قبل، مسلمانوں میں عملی گمراہیاں ضرور تھیں مگر ان کی خدمتِ اسلام اور تفسیر قرآن کے نتیجہ میں، ذہنی پراگندگی اور فکری انتشار کا آغاز ہوا۔ ایسی صورتِ حال کا فطری ومنطقی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وحی کو پس پشت ڈال کر، عقل کو امام بنالیا جائے اور عقل بھی وہ، جو مغربی افکار واقدار کے سانچہ میں ڈھل چکی ہو۔ اس لیے ہر وہ چیز، جو عقل کی میزان پر پوری نہیں اترتی، وہ قابلِ رد قرار پاتی ہے خواہ اسلام اسے کتنی ہی اہمیت عطا کرے اور ہر وہ چیز قابلِ قبول قرار پاتی ہے جسے عقل پسند کرتی ہو، خواہ اسلام اسے حرام ہی کہتا رہے۔ سر سید کے بعد، مسلمانوں میں قدیم اور جدید کی، یا بالفاظ دیگر، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کا ایک نیا دور شروع ہوا، بلکہ

---

[1] ضربِ کلیم، صفحہ ۵۰ [2] ضربِ کلیم، صفحہ ۵۶ [3] + [4] ضربِ کلیم، صفحہ ۵۴

صحیح تر بات یہ ہے کہ خود سرسید ہی نے اس نئے دور کی بنیاد رکھی۔ وہ خود فرنگی تہذیب سے متاثر ہی نہیں بلکہ انتہائی مرعوب بھی تھے، اور ان کی معاشرت وثقافت پر فریفتہ تھے، مغرب کی مادی ترقی کی چکا چوند نے اور اس پر مستزاد، ان کی سائنسی مہارت نے، انھیں شدید فکری غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ لہٰذا وہ بخلوصِ قلب یہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی فرنگیوں کے نقشِ قدم پر چل کر ''ترقی'' کریں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے تعلیمی اداروں میں جو نظامِ تعلیم نافذ کیا وہ لارڈ میکالے کے معیارِ تصور کے مطابق جیسے طالب علم پیدا کر رہا تھا اس کا ذکر بعین الفاظ ہی کیا جا سکتا ہے۔

> اس تعلیم سے ایسا طبقہ پیدا کرنا مقصود تھا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، اخلاق اور عقل وفہم کے نقطہ نظر سے انگریز ہو۔ [1]

مگر ان کی اس خواہش کے عملی جامہ پہننے میں سب سے بڑی رکاوٹ زندگی کا وہ ڈھانچہ تھا جس کی صورت گری، قرآنی اصولوں سے کہیں زیادہ سنت نبویہ نے کی تھی۔ چنانچہ سرسید احمد خاں نے ترقی کے لالچ میں، کتاب بلا پیغمبر اور قرآن بلا محمدؐ کا نرالا مسلک ایجاد کیا۔ اس طرح سرسید نے فتنۂ انکار حدیث کا ایک ایسا تخم بویا جس کی آبیاری، عبداللہ چکڑالوی، خواجہ احمد دین امرتسری، حافظ محمد اسلم جیراجپوری وغیرہم کرتے رہے اور آخر میں، اس مسندِ ضلالت کی پیشوائی، جناب غلام احمد پرویز کے حصہ میں آئی۔

(ب) انگریزوں کی آمد پر مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی حالت

مسلمان، اُس وقت، جب انگریز متحدہ ہندوستان میں آئے، اپنی تمام ہموطن اقوام پر تعلیم وتہذیب کے اعتبار سے فوقیت رکھتے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب افراد پر مشتمل، ایک سلجھی ہوئی قوم تھے۔ فارسی اور عربی زبان میں ماہر تھے۔ فارسی ان کی روز مرہ بول چال کی زبان تھی اور عربی، دینی زبان تھی۔ ان کی تہذیب وثقافت کا ذخیرہ بھی، انھی دونوں زبانوں میں محفوظ تھا۔ مسلمانوں کا معیارِ تعلیم، دیگر اقوام کے مقابلہ میں، انتہائی بلند تھا۔ مسلمانوں کی اس حالت پر مندرجہ ذیل اقتباس شاہد ہے:

> انگریزوں کی آمد کے وقت، اسلامی نظام تعلیم، سارے ملک میں سرگرم عمل تھا۔ ہر قسم کے مردان کار، یہی نظام تعلیم مہیا کر رہا تھا۔ یہ ایک خود کار نظام تعلیم تھا۔ امراء اور صاحب ثروت اور صاحب خیر حضرات، جائیدادیں، معافیاں اور اوقاف، تعلیم کے لیے وقف کر دیتے تھے جن کی آمدنی سے مدارس چلتے تھے۔ علماء، فقہا اور مشائخ، معاش کی جانب سے یکسو ہو کر تعلیم، تبلیغ اور اشاعتِ علم میں مشغول رہتے تھے۔ خانوادے نسلاً بعد نسل، یہی مشغلہ جاری رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ملک کے چپے چپے پر مدارس کا جال پھیلا ہوا تھا۔ تعلیم کے لیے کوئی فیس نہ تھی۔ تعلیم حاصل کرنا نہایت آسان تھا۔ کمپنی کی حکومت کے آغاز میں میکس مولر (MAX MULLER) نے سرکاری ریکارڈ اور مسیحی مشنریوں کی رپورٹوں کو سامنے رکھ کر تخمینہ لگایا تھا کہ بنگال میں اسی ہزار مدارس قائم ہیں گویا ہر چار سو کی آبادی پر ایک مدرسہ قائم ہے اور یہ اچھی شرح ہے۔ [1]

---

[1] تاریخ نظریہ پاکستان، صفحہ ۱۳۵

مسلمانوں کو جاہل اور پسماندہ بنانے کے لیے برطانوی ہتھکنڈے

چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت ہتھیائی تھی، اس لیے وہ انھیں اپنے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی سرتوڑ کوشش یہ رہی کہ انھیں، ایک طرف تو اس قدر پست و فرومایہ، ذلیل و خوار اور محتاج و قلاش بنا دیا جائے کہ ان کے اندر بازیابیٔ اقتدار کی خواہش باقی نہ رہے اور دوسری طرف، انھیں اس قدر جاہل، ناخواندہ اور پسماندہ بنا دیا جائے، کہ یہ کبھی سر نہ اٹھاسکیں۔ ان مقاصد کے پیش نظر، انگریزوں نے کل کی حکمران، آسودہ حال، ترقی یافتہ اور حوصلہ مند قوم کو پست ہمت اور جاہل بنانے کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کیں۔

(i) قانونی اور حکومتی طاقت سے مسلم نظام تعلیم پر بھرپور حملہ

مسلمانوں کا نظام تعلیم، حکومتی مداخلت سے آزاد اور خودکار نظامِ تعلیم تھا، جو اوقاف اور معافیوں کی مستقل آمدنی سے چلتا تھا۔ پورے ملک میں ایسے اوقاف موجود تھے اور جگہ جگہ تعلیمی ادارے، درسگاہیں اور خانقاہیں، ان محاصل اوقاف کے بل پر، تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفوس میں مصروفِ کار تھے۔ ایسی علم دوست اور علم پرور قوم کو پسماندگی و جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینکنے کے لیے یہ تدبیر اپنائی گئی۔

> ایسی تعلیم پرور قوم کو، انگریز، جاہل اور ناخواندہ بنائے بغیر اپنے مقاصد مذمومہ حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے انگریزی تدابیر کا اولین ہدف مسلمانوں کو جاہل بنانا قرار پایا۔ اس کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ پہلے فیض رسانی کے وہ سوتے خشک کردیے جائیں جن سے یہ مدارس سیراب ہورہے ہیں۔ دوسرے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے اوقاف اور معافیوں پر حملہ کیا۔ اس نے ۱۷۹۳ء میں قانون بازیافت (RESUMPTION ACT III OF 1793) بنایا جس کی رو سے بعض معافیوں کو بحق سرکار ضبط کرلیا۔ اس کو کافی نہ پاکر دوسرا قانون بازیافت (RESUMPTION ACT 19 OF 1793) بنایا جو اس سے زیادہ سخت تھا جس نے ضبطیوں کا دائرہ وسیع کردیا تھا۔ پھر اوقاف پر لارڈ ہیسٹنگز نے حملہ کیا اور نیا قانونِ بازیافت (RESUMPTION ACT III OF 1818-1819) بنایا جس نے ضبطیوں کا دائرہ مزید وسیع کردیا۔ آخری مرتبہ ولیم بینٹنگ نے ایک انتہائی سخت قانون بنایا۔ قانون بازیافت (RESUMPTION ACT III OF 1828) نافذ کیا اس کو نافذ العمل بہ ماضی (۱۷۶۵ء) قرار دیا۔ اس وقت کمپنی کی حکومت، بنگال سے لے کر پنجاب میں چناب تک وسیع تھی۔ ایک نیا محکمہ بازیافت کھول کر سارے ملک کے اوقاف، معدنیات اور لاخراج زمینات کو تلاش کرکے بحق سرکار ضبط کرڈالا۔[۲]

(ii) مدارس اور خانقاہوں کا خاتمہ

اوقاف کے بحق سرکار ضبط ہوتے ہی، تعلیمی اداروں کے مالی سوتے خشک ہوگئے، اور وہ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح گر پڑے۔ دفعتاً اور یکلخت، مدارس کا خاتمہ ہونے لگا۔ اس صورتحال سے انگریز افسروں کو کس قدر خوشی ہوتی تھی، اس کا اندازہ، ایک

۱۔ مغربی زبانوں کے ماہر علماء (از سید محمد سلیم پروفیسر)، صفحہ ۱۰ ۲۔ مغربی زبانوں کے ماہر علماء، صفحہ ۱۰

انگریز ہی کی اس عبارت سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

> ایف ڈبلیو تھامسن نے تعلیم کی اس تباہی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے، زیادہ مدت نہیں گذری کہ پرانے نظام کو تباہ کرنے کا کام منظم طور پر شروع ہوا، اور ڈائریکٹر تعلیمات کو بار بار خوشی کے ایسے لمحات میسر آتے تھے کہ ایک سال میں، ایک ہی تحصیل میں چھ چھ سو، سات سات سو مدارس کے بند ہونے کی اطلاع ملتی تھی۔ نئی متشدانہ پالیسی کی بناء پر گذشتہ پچاس سال میں ہندوستان کا پرانا نظام تعلیم ختم ہو گیا اور بحیثیت مجموعی ناخواندگی میں اضافہ ہوا۔ [1]

(iii) علماء و مدرسین کی بے روزگاری

خاتمۂ مدارس کا ایک منطقی لازمہ یہ بھی تھا کہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے ان ہزاروں بلکہ لاکھوں مدارس کے بند ہو جانے پر، ان سے وابستہ لاکھوں علماء و مشائخ اور اساتذہ و مدرسین پر ایسی بجلی گری کہ وہ آن واحد میں بیروزگار ہو گئے، اور تباہی و فاقہ مستی کا نشانہ بن گئے۔ قانون بازیافت کا ظالمانہ قانونی ہتھکنڈہ، جب سنگدل حکمرانوں کے ہاتھ میں استعمال ہونے لگ جائے، تو اس کی مضرتوں اور ایذاء رسانیوں کا کیا ٹھکانہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ

> یہ کاروائی اس قدر سنگین اور سنگدلانہ تھی کہ ولیم ہنٹر کے الفاظ میں یہ اقدام مسلمانوں کے نظام تعلیم پر ضرب مرگ (DEATH BLOW) ثابت ہوا۔ تمام مدارس بند ہوتے چلے گئے۔ علماء و فضلاء کے ہزار ہا گھرانے نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے۔ ان اٹھارہ سالوں میں (۱۸۲۸ء تا ۱۸۴۶ء) علماء کا طبقہ بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ [2]

(iv) علماء کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ

علماء پر صرف یہی افتاد ہی نہیں پڑی کہ وہ خوشحالیوں کے اوج ثریا سے یکدم افلاس و تنگدستی کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیے گئے، بلکہ الٹا ان کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ بھی کیا گیا۔

> مزید برآں، علماء کے طبقہ کو مسلمان معاشرہ میں بے دخل اور بے اثر بنانے کے لیے، افلاس کی مار کے علاوہ، پراپیگنڈے کے ذریعہ مختلف قسم کے الزامات کا ہدف بنایا مثلاً یہ کہ "یہ تنگ نظر ہیں، ترقی کے دشمن ہیں۔" مثلاً ملا کے لفظ ہی کو نشانہ بنایا اور ہر قسم کے عیوب، اس سے وابستہ کر دیے۔ [3]

(v) عربی اور فارسی زبانوں کی تعلیم کا خاتمہ

عربی اور فارسی، ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی اور علمی زبان تھی۔ جس میں اسلامی ثقافت کا وسیع ذخیرہ، ہمیشہ موجود رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ زبانیں، عالم اسلام سے، ہندی اہل اسلام کے رابطوں کا بڑا ذریعہ تھیں۔ یہ دونوں زبانیں، مسلم نظامِ تعلیم کا حصہ تھیں، جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے:

> ہندوستان کے قدیم مدارس میں جو نظام تعلیم رائج تھا اس کی امتیازی خصوصیات، نصاب تعلیم کا فارسی حصہ تھا۔ نصاب تعلیم کا ایک حصہ عربی تھا، جو اسلام کا ورثہ تھا، جو عالم اسلام سے ہندوستان منتقل ہوا تھا۔ دوسرا حصہ فارسی تھا جو اہل عجم کا ورثہ تھا جو ایران

---

[1]+[2]+[3] مغربی زبانوں کے ماہر علماء، صفحہ ۱۱

توران سے ہندوستان منتقل ہوا تھا۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی نصاب تعلیم کے یہ دونوں حصے یہاں ہندوستان میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں کے قدیم دینی مدارس میں یہ دونوں حصے پڑھائے جاتے تھے۔ تعلیم کا آغاز فارسی حصہ سے ہوتا تھا اور تعلیم کی تکمیل عربی حصہ سے ہوتی تھی۔ کوئی شخص، اہل علم اس وقت تک شمار نہیں ہوتا تھا جب تک کہ اس نے عربی زبان اور دینی علوم کی تحصیل نہ کر لی ہو۔ فارسی حصہ اور عربی حصہ یعنی دنیوی علوم اور دینی علوم کی تحصیل سے فارغ ہو کر طالب علم کوئی ہنر سیکھتا تھا۔ کوئی ذریعہ معاش ڈھونڈتا تھا۔ عربی نصاب کی تحصیل کرنے والے کو عالم اور فارسی نصاب کی تحصیل کرنے والے کو فاضل کہتے تھے اور دونوں نصابوں کی تکمیل کرنے والے کو عالم فاضل کہتے تھے۔

برصغیر ہندو پاک میں سلطان محمود غزنوی (۱۰۳۰ء) کے وقت سے فارسی مملکت کی سرکاری زبان رہی ہے۔ ساری دفتری کاروائی، ساری سرکاری مراسلت، فارسی زبان میں ہوتی تھی۔ اسلامی عہد حکومت کے بعد، مرہٹوں اور سکھوں کے دورِ اقتدار میں بھی یہ حیثیت برقرار رہی۔ البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ۱۸۳۵ء میں فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کر ڈالی، اس پر کاری ضرب لگائی۔ اس کے بعد فارسی زبان برصغیر پاک و ہند سے مٹ گئی۔ [1]

اس کے بعد، انگریزی حکومت نے ایک اور ظالمانہ قدم اٹھایا۔

۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے ایک حکم نافذ کیا کہ عربی فارسی کے تعلیم یافتہ شخص کو سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی۔ اس حکم نے ہفت صد سالہ اسلامی نظام تعلیم کی بساط الٹ دی۔ ان مدارس کی اب کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی اور یہ سکڑتے چلے گئے۔ [2]

عربی اور فارسی زبانوں کی تعلیم کے خاتمہ نے مسلمانوں کی نئی نسلوں کو، ان کے دین، ان کی تہذیب اور ان کے شاندار ماضی سے منقطع کر دیا اور وہ اسلاف کے کارناموں سے یکسر غافل اور بے خبر ہو گئے۔ ان زبانوں سے محرومی اور جہالت کا معنی، صرف مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ذرائع کا مفقود ہو جانا ہی نہ تھا، بلکہ سیرت و کردار پر ان کے تہذیبی اثرات کا خاتمہ بھی تھا۔

(vi) تہذیبی اثرات اسلام سے بیگانہ کرنا

فارسی زبان، ہندوستان کی سرکاری زبان تھی۔ مسلمانوں کے صدیوں پر محیط دور حکومت میں، اس کی یہی حیثیت رہی۔ زبان کسی تہذیب کی نہ صرف یہ کہ آئینہ دار ہوتی ہے، بلکہ اس کے تہذیبی اثرات بھی، بولنے والوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ فارسی زبان، علاقائی سطح پر بھی، اور غیر مسلم آبادی میں بھی، دفتری زبان رہی ہے۔ جس سے غیر مسلم بھی، اس زبان کے تہذیبی اثرات سے متاثر ہوتے تھے۔ انگریز اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ انھوں نے اس زبان کے تہذیبی اثرات کے خاتمہ کے لیے، اس کی سرکاری حیثیت کو (باوجود اس کی دفتری اہمیت کے) ختم کر دیا۔ جس سے ہندوؤں پر پڑنے والے اثرات کا خاتمہ تو ہوا ہی تھا، خود مسلمان بھی ان اثرات سے محروم ہو گئے۔

(vii) مغربی نظام تعلیم کا اجراء

انگریز یہاں آئے تو تھے تاجرانہ لبادہ اوڑھ کر، مگر ان کے عزائم سیاسی تھے، اور وہ اقتدار پر متمکن ہو کر، اپنی تہذیب

---

[1] دینی مدارس کی روایات اور نصاب کی خصوصیات، صفحہ ۲۵ [2] دینی مدارس کی روایات اور نصاب کی خصوصیات، صفحہ ۱۴

ثقافت کو رائج کرنا چاہتے تھے تا کہ یہاں کے عوام، خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، عیسائی ہوں یا کچھ اور، مغربی کلچر کے رنگ میں رنگے جائیں، چنانچہ اس مقصد کے لیے، انھوں نے اپنا نظام تعلیم، بتدریج مگر بڑی عیاری سے نافذ کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے، خود براہ راست، اپنے آپ کو ملوث کرنے کی بجائے، مسیحی مشنریوں کو تعلیمی ادارے کھولنے کی اجازت دی۔ ابتداءً تو یہ اجازت نری برطانوی مشنریوں تک ہی محدود تھی۔ لیکن جب ان کی کارکردگی کے نتائج، خاطر خواہ نہ پائے گئے تو پھر دنیا بھر کی مسیحی مشنریوں کو صدائے عام دی گئی کہ وہ آئیں اور اشاعت مسیحیت کے کارِ خیر میں ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ امریکہ، یورپ اور جرمنی سے مشنری دوڑے اور مسیحی انجمنوں نے جگہ جگہ تعلیمی ادارے کھول دیے۔ ان اداروں کی تصویر کشی، ایک مصنف نے یوں کی ہے:

> مسیحیوں کا مقصد، تعلیم دینے سے ہندوستان کو مسیحی بنانا تھا۔ درسگاہ کا سارا ماحول مسیحیت نواز تھا۔ درس گاہ کا نام، کسی مسیحی بزرگ کے نام پر ہوتا تھا، سینٹ جونز، سینٹ سٹیفن وغیرہ۔ سکول کی عمارت کے اندر گرجا تعمیر کیا جاتا تھا۔ ایک نمایاں مقام پر، کنواری مریم اور حضرت عیسیٰ کے مجسمے نصب ہوتے تھے۔ اساتذہ سارے پادری اور بشپ ہوتے تھے جو مخصوص مذہبی لباس پہن کر کلاس روم میں آتے تھے۔ سینہ پر صلیب نمایاں نظر آتی تھی۔ طلبہ ان کو استاد کی بجائے فادر کہہ کر پکارتے تھے۔ طلبہ کے لیے انگریزی لباس لازمی ہوتا تھا۔ گلے میں ٹائی لازمی تھی۔ تعلیم کا آغاز بائیبل خوانی سے ہوتا تھا۔ نصاب میں بائیبل کا گھنٹہ، اس کے علاوہ ہوتا تھا جو ہر طالب علم کے لیے لازمی تھا۔ [1]

جو شخص بھی اس منظر اور پس منظر پر غور کرے گا، اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان تعلیم گاہوں کا مقصد، مسیحیت کی اشاعت اور ترویج تھا، تعلیم تو برائے نام تھی، مسلمان آخر اتنے گئے گزرے تو نہیں تھے کہ دیکھتی آنکھوں مکھی نگل لیتے، ان مدرسوں میں داخل ہوتے اور مسیحیت قبول کر لیتے۔ مسلمان مسیحیت کے خلاف تھے یا پھر ان نام نہاد درسگاہوں کے خلاف تھے جو مسیحیت کی اشاعت کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ وہ نہ انگریزی زبان ہی کے خلاف تھے اور نہ ہی مغربی علوم کے خلاف تھے۔ اس پر انگریزوں نے وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ کیا کہ مسلمان جدید تعلیم کے خلاف ہیں۔

(vii) جدید تعلیم کے خلاف فتوائے کفر کا پراپیگنڈہ

انگریزوں نے، مسلمان علماء کو رسوا و بدنام کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ چھوڑا۔ وہ خود مسلمانوں کو اپنی جن زیادتیوں کا نشانہ بنا رہے تھے، ان پر پردہ ڈالنے کا ایک مؤثر طریقہ یہ تھا کہ الٹا مسلمانوں ہی کے خلاف پراپیگنڈہ کیا جائے کہ وہ اپنے علماء کرام کے زیر اثر اور مفتیانِ عظام کے فتاویٰ کی رو سے، انگریزی تعلیم کے خلاف ہیں۔ اس پراپیگنڈے کی شدت اور وسعت کا یہ حال تھا کہ اپنے اور بیگانے، سب اس کا نشانہ بن گئے۔ حالانکہ آج تک کوئی ایسا فتویٰ پیش نہیں کیا جا سکتا، بلکہ عین، اس کے برعکس، انگریزی پڑھنے کے حق میں فتاویٰ موجود ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۸۲۴ء) کے فتاویٰ میں آج

[1] مغربی زبانوں کے ماہر علماء، صفحہ ۱۳

بھی یہ عبارت موجود ہے۔

انگریزی پڑھنا یعنی انگریزی کا حرف پہچاننا، لکھنا، اور اس کی لغت اور اصطلاح جاننا، اس میں کچھ بھی قباحت نہیں بشرطیکہ صرف مباح ہونے کے خیال سے انگریزی حاصل کی جائے۔............ اگر صرف ان (انگریزوں) کی خوشامد کی وجہ سے اور ان کے ساتھ اختلاط رکھنے کے لیے یہ علم پڑھے اور اس ذریعہ سے چاہے کہ ان کے یہاں تقرب حاصل ہو تو البتہ اس میں حرمت اور کراہت ہے۔ [1]

علاوہ ازیں، مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا فتویٰ بھی موجود ہے جس میں انگریزی کی تعلیم پانے کا جواز پایا جاتا ہے۔

دار العلوم دیو بند

مسیحی مشنریوں کی سرگرمیوں، عیسائیوں کے مبلغین کی مناظرہ بازیوں اور ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی جیسے واقعات نے انگریزوں کے انتقام سے بچ جانے والے علمائے امت کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر اسلام اور امت مسلمہ کے مستقبل کو کیونکر محفوظ کیا جائے۔ ایک گروہ کا یہ خیال تھا کہ عامۃ الناس میں اگر اسلامی تعلیمات کو راسخ کر دیا جائے، تو اس سے اسلام اور امت مسلمہ دونوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ جبکہ دوسرے گروہ کا موقف یہ تھا کہ مسلمان اس وقت جس افلاس و تنگدستی اور ذلت و مسکنت کا شکار ہیں، جب تک انھیں اس صورتحال سے نکال کر، ان کی دنیاوی بہتری کا سروسامان نہ کیا جائے، اس وقت تک خوشحال مستقبل کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن بہر حال دونوں گروہ، اس پر متفق تھے کہ آغاز کار، تعلیم گاہوں کے قیام ہی سے ممکن ہے۔ گروہِ اول میں وہ علمائے کرام شامل تھے، جن میں قائدانہ کردار، مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تھا، جبکہ دوسرے گروہ میں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگ تھے، جن کی فکری قیادت سرسید احمد خاں کر رہے تھے۔

مولانا فضل الرحمان (جو مولانا شبیر احمد عثانی کے والد محترم تھے)، مولانا ذوالفقار علی اور حضرت محمد عابد سے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مذاکرات کے نتیجہ میں یہ طے پایا کہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ان میں دینی شعور پیدا کرنے کے لیے ایک دینی درسگاہ، دہلی کی بجائے، دیوبند میں قائم ہونی چاہیے۔

سید مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد، قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں، آپ کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دار العلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اس لائحۂ عمل کا سب سے نمایاں اور جوہری عنصر تھا۔ [2]

اس تعلیم گاہ نے اپنے قیام کے فوراً بعد ہی، نہایت برق رفتاری کے ساتھ، ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں۔

موج کوثر میں، شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:

جلد ہی اس نے قوم کے تعلیمی نظام میں جگہ حاصل کر لی اور آج قدیم طرز کی درسگاہوں میں سب سے اہم گنا جاتا ہے۔ اس

[1] فتاویٰ عزیزی کامل (از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی)، صفحہ ۵۷۱ تا ۵۷۲
[2] سوانح قاسمی (از مناظر احسن گیلانی)، جلد ۲، صفحہ ۲۲۳

کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا بیج اچھا تھا اور اچھے ہاتھوں سے بویا گیا تھا۔ دیوبند کا مدرسہ حقیقتاً شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ کے درس کی نمایاں خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اس میں فرنگی محل کی طرح منطق اور صرف ونحو اور فقہ ہی پر سارا وقت صرف نہیں ہوتا، بلکہ حدیث کا بھی خیال رکھا جاتا ہے، جو شاہ ولی اللہ اور اُن کے جانشینوں کی خصوصیت تھی۔ اسی خاندان کے شاہ عبدالغنی سے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے فیض حاصل کیا، اور حاجی امداد اللہ، مولانا سید احمد بریلوی کے ایک خلیفہ کے مرید تھے۔ اور مولانا سید احمد، شاہ عبدالعزیز کے نامور خلیفہ تھے۔ اس طرح دیوبند میں شروع ہی سے شاہ عبدالعزیز اور اُن کے تلامذہ کے درس کی خصوصیات تھیں۔ [1]

دارالعلوم دیوبند کے مقصدِ وجود کو اگر بالاختصار بیان کیا جائے، تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ

مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۸۰ء) کو مسلمانوں کے دینی سرمائے کے تحفظ کی فکر دامنگیر ہوئی، اس کے لیے انھوں نے ۱۸۶۷ء میں سہارن پور کے ایک غیر معروف قصبے دیوبند میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ ان کے پیش نظر دینی سرمائے کا تحفظ تھا، اس لیے انھوں نے خیر آباد، فرنگی محل، دہلی، پنجاب اور دہلی کالج، سب کی روایات کو یکجا جمع کر لیا۔ [2]

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے، پانچ نکات پر مشتمل دستورِ اساسی مرتب کیا گیا۔ جو درج ذیل ہے۔

۱- قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور ان کے علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر، اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خدمت انجام دینا۔

۲- اعمال و اخلاقِ اسلامیہ کی تربیت اور طلبہ کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

۳- اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر و تقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم و تبلیغ کے ذریعے خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق و اعمال پیدا کرنا۔

۴- حکومت کے اثرات سے اجتناب و احتراز اور علم و فکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵- علوم دین کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق [3]

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے اندر جتنے مدارس اور دینی ادارے ہیں، ان کی خدمات کا ماحَصَل اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھوں نے چند قابل ذکر افراد پیدا کئے۔ لیکن دیوبند نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسے افراد پیدا کئے، جو اپنی شخصیت کے اعتبار سے اور خدمتِ اسلام کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہیں، انھیں بیان کرتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کن ہستیوں کا تذکرہ کیا جائے اور کن افراد کو نظر انداز کیا جائے۔ مولانا اشرف تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، مولانا عبدالحق حقانی، مفتی کفایت اللہ، مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا قاضی سجاد احمد میرٹھی، مولانا مظہر الدین، مولانا محمد شفیع، مولانا ظفر احمد عثمانی وغیرہم ایسی ہی عظیم المرتبت ہستیاں ہیں۔

[1] موجِ کوثر (از شیخ محمد اکرام)، صفحہ ۲۰۸

[2] دینی مدارس کی روایات اور نصاب کی خصوصیات، صفحہ ۲۳

[3] تاریخ دارالعلوم دیوبند (از سید محبوب رضوی، یوپی، انڈیا، ۱۹۷۷ء)، صفحہ ۱۴۲

زندگی کے ہر شعبہ میں، اس تحریک کے اثرات مرتب ہوئے۔ سیاسی امور میں اس کی ایک فکر تھی۔ مذہبی میدان میں اس کا اپنا مخصوص رنگ تھا، دارالعلوم دیوبند نے علوم دین اور تمدنِ اسلامی کی حفاظت و ترویج میں مؤثر کردار ادا کیا۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ وطن سے ہزاروں افراد، اکتسابِ فیض کے لیے اس سے وابستہ ہوئے۔ عیسائی مشنریوں کے حملے ہوں یا آریہ سماجیوں کے اعتراضات، الحاد و زندقہ کی یلغار ہو یا قادیانیت کی آندھی، تجدد پسندی کا طوفان ہو یا انکار حدیث کا جھکڑ، دیوبندی تحریک نے ہر فتنے کے خلاف چومکھی لڑائی لڑی۔ اور عصر جدید کے ہر الحاد و فتنہ کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔ قوم کو جہالت، غلط رسومات اور ہندوانہ تہذیب سے باہر نکالا، فرنگی تہذیب کے سیلاب کو روکا، اور ہزاروں کی تعداد میں علماء، مصنف، مفسر، محدث اور مورخ پیدا کئے جن کا وظیفۂ حیات، خدمتِ اسلام تھا۔

تحریک علی گڑھ

دوسرا گروہ، جو تعلیم ہی کے ذریعہ مسلمانوں کی فلاح و بہتری کا خواہاں تھا، اُن افراد پر مشتمل تھا جن کی قیادت سرسید احمد خاں کر رہے تھے۔ ان کی برپا کردہ تحریک علی گڑھ (خواہ اسے ''تحریک سرسید'' کہا جائے یا ''تحریک تعلیم'' کا نام دیا جائے) محض تعلیمی اداروں کے قیام تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ اس میں وہ انجمنیں اور سوسائٹیاں بھی شامل تھیں، جو جدید سائنسی علوم کے فروغ کے لیے، انھوں نے، قائم کی تھیں۔ مثلاً ''سائنٹیفک سوسائٹی'' جس کا کام، انگریزی میں موجود سائنسی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنا تھا۔ اور ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیمِ مسلمانان'' وغیرہ۔ اس کے علاوہ اخبار و رسالہ کا اجراء بھی اسی تعلیمی تحریک کا ایک پہلو تھا۔

مسلمانوں کے آزاد اور خود کار نظام تعلیم کو تباہ کرنے اور ان کے تعلیمی اداروں اور خانقاہوں اور دیگر تربیت گاہوں کو ختم کر دینے کے تقریباً پچاس سال بعد، انگریزوں نے ۱۸۷۱ء میں، (جبکہ لارڈ میو وائسرائے ہند تھا) اپنی سابقہ تعلیمی پالیسی میں ترمیم کی، اور مسلمانوں کو جداگانہ سکول اور کالج کھولنے کی اجازت دے دی گئی، جس سے وہ ایک مدت سے محروم تھے۔ اس رعایت سے استفادہ کرتے ہوئے سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء میں ایک سکول کی بنیاد رکھی۔ جس کا افتتاح سر ولیم میور نے کیا۔ یہی سکول، بعد میں، ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے کالج بنا، اور پھر مسلم یونیورسٹی تک ارتقاء پذیر ہوا۔

علی گڑھ کالج کے مقاصد

علی گڑھ میں قائم کردہ سکول ہو یا کالج، بہر حال، اس کے قیام سے، جو مقصد، انگریزی حکومت کے پیش نظر تھا، وہ ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ میں یہ تھا کہ

> مذہبی اخلاص اور دینی احکام کی پابندی میں، ضعف اور کمزوری پیدا کرنا، نیز یہ کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح اعتقادات میں پختہ نہ رہیں۔ [1]

علی گڑھ کالج ہو، یا دیگر اسلامیہ کالج، ان کی تعلیمی اور دنیاوی خدمات، خواہ کچھ ہی کہتی ہوں، دینی پہلو سے یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ، اس معیار پر پورے اترتے ہیں، جو انگریزی حکومت کے پیش نظر تھا۔ اور جس کی پیشین گوئی ولیم ہنٹر نے کی تھی۔ ان مدارس میں اسلام سے تعلق، بڑی حد تک محض زبانی اور جذباتی تھا۔ سرسید خود بھی بھرپور دینی تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔ انھوں نے نصاب ساز کمیٹی سے برملا یہ کہہ رکھا تھا، کہ

> مگر مذہبی کورس کو ایسی معتدل مقدار پر قرار دینا ضروری ہوگا جس سے انگریزی کی تعلیم میں حرج نہ پڑے۔ ۲

دینی مقاصد کے علاوہ، سرسید کے پیش نظر، کچھ سیاسی اور تہذیبی مقاصد بھی تھے۔ جن کا اظہار بایں الفاظ کیا گیا ہے۔

> ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کے لائق اور کارآمد بنانا۔ ۳

سٹوڈنٹس یونین کلب کا افتتاح ۲۶، اگست ۱۸۸۴ء کو ہوا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے سرسید نے اپنے سیاسی مقاصد کو بایں الفاظ بیان کیا۔

> اگر تم حاضرین کی خواہش یہ ہے کہ ہم قوموں میں عمدہ تعلیم پھیلے تو سب سے عمدہ حکمت عملی یہ ہے کہ تم کریسنٹ اور کراس کو ملا دو۔ بعض انگریز اور بعض ہندوستانی دوست یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے، مگر میرا خیال ہے کہ ایک دن ایسا ہوگا کہ دونوں اس طرح مل جائیں گے۔ ۴

پہلے اقتباس کے مطابق، سرسید، مسلمانانِ ہند کو برطانوی نظام حکومت کے لیے "لائق اور کارآمد" پرزے بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس دوسرے اقتباس میں تو انھوں نے غضب ہی کر ڈالا، وہ کریسنٹ (Crescent) اور کراس (Cross) کو ملا کر اسلام اور عیسائیت کا نیا مرکب تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ کریسنٹ کے معنیٰ ہلال ہیں اور کراس کے معنیٰ صلیب ہیں جو اسلام اور عیسائیت کے مخصوص نشان ہیں۔ اکبر کے "دینِ الٰہی" کی طرح، سرسید کا، اسلام اور مسیحیت پر مشتمل، ایک نیا دین تراش ڈالنے کے اقدام کی سنگینی، ہر قلبِ مسلم محسوس کر سکتا ہے۔

مغربی علوم کی تحصیل کا مقصد، سرسید، اس طرح بیان کرتے ہیں:

> اصلی مقصد، اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سینسز (سائنس) اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب مسلمان اور از روئے خون و رنگ کے ہندوستانی ہو، مگر باعتبار مذاق ورائے وفہم کے انگریز ہوں۔ ۵

---

۱ Indian Musalmans, W. Hunter, Page 183, Lahore, 1974

۲ تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ (از سید افتخار عالم مارہروی)، صفحہ ۱۳۳

۳ تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ (از سید افتخار عالم مارہروی)، صفحہ ۴۱

۴ تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ (از سید افتخار عالم مارہروی)، صفحہ ۱۲۵

۵ ایڈریس اور سپیچس متعلق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ، از ابتدائے فونڈیشن لغایت ۱۸۹۸ء، مرتبہ محسن الملک، دیباچہ صفحہ ۲، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ پریس

علی گڑھ کالج کے خاص امتیازات

سرسید احمد خاں کی مغرب سے شدید مرعوبیت اور کریسینٹ اور کراس کو باہم ملا دینے کی بیتاب تمنا، علی گڑھ کالج کے ان خاص امتیازات سے بھی انعکاس پذیر ہوتی ہے، جنھیں سید محمد سلیم صاحب نے بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے مبارک دن ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس کالج کا افتتاح کیا گیا۔

کالج کا نام انگریزی میں اینگلو محمڈن اورینٹل کالج اور اردو میں مدرسۃ العلوم رکھا گیا۔

دربار قیصری دہلی سے لوٹتے وقت لارڈ لٹن وائسرائے ہندوستان نے ۱۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کے لیے، عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

کالج کی عمارت، کیمبرج یونیورسٹی کے نمونہ پر بنائی گئی۔

کالج کے مونوگرام میں، ہلال اور کھجور کے ساتھ تاجِ برطانیہ کو بھی شامل کیا گیا۔ ہندوستان کے کسی دوسرے کالج کے مونوگرام میں تاج شامل نہیں ہے۔

دارالاقامہ کے دروازوں پر، ہلال اور تاج کندہ کرائے گئے، تاکہ یہ ہردو، طالب علموں کی نظروں کے سامنے رہیں، وفاداری کی تعلیم ملتی رہے۔

جگہ جگہ انگریزی زبان کے مقولے اور انگریز افسروں کے نام کندہ کرائے گئے۔

طلبہ اور استادوں کے لیے مغربی لباس استعمال کرنا لازمی قرار دیا گیا۔

لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہندوستان نے اس کالج کو دس ہزار روپیہ چندہ دیا۔

ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر یوپی نے ایک ہزار چندہ دیا، دوسرے انگریزوں نے بھی چندہ دیا۔

آکسفورڈ (آکسن) کیمبرج (کینٹب) کے نمونہ پر علی گڑھ سے عایگ بنایا گیا، ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے ساتھ یہ خصوصیت نہیں ہے۔ [1]

لارڈ میکالے نے بھی تعلیم کا مقصد، جو مسلمانوں کے لیے طے کیا تھا، یہ تھا کہ...... ''اس تعلیم سے ایسا طبقہ پیدا کرنا مقصود تھا، جو خون و رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو، مگر مذاق، رائے، اخلاق اور عقل و فہم کے نقطۂ نظر سے انگریز ہو''......اور اسی مقصد کو بعینہ سرسید نے اپنا لیا تھا۔ اس مقصد کو پانے کے لیے، ہندوستان کے طول و عرض میں، اگر کسی کالج میں دانستہ اور شعوری کوشش کی گئی تو وہ صرف اینگلو محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ ہے، مذکورہ بالا امتیازات اور خصوصیات کے حامل، اس کالج سے تعلیم پا کر جو طالب علم برآمد ہوئے، وہ فی الواقع میکالے کے معیارِ تصور کے مطابق تھے۔ ایک طرف، ہندوؤں کے کالجوں سے پکے ہندو اور سادہ مزاج طلبہ پیدا ہو رہے تھے، اور دوسری طرف علی گڑھ کالج سے کالے انگریز پیدا کئے جا رہے تھے ؎

طائروں پر سحر ہے، صیاد کے اقبال کا
اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

---

[1] تاریخ نظریۂ پاکستان، پروفیسر محمد سلیم، ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، اشاعت دوم، جولائی ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۳۴ تا صفحہ ۱۳۵

علی گڑھ سیلابِ مغربیت کا دروازہ

علی گڑھ کالج میں برصغیر کے مسلمانوں کا ذہین اور خوشحال طبقہ، اپنی نوخیز نسلوں کو بغرض تعلیم جمع کر رہا تھا، اور مسٹر بیک جو اس کالج کے پرنسپل تھے، اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے تقریباً تمام ہی فارغ التحصیل طلبہ کو ملازمت دلا دیا کرتے تھے۔ نصف صدی قبل، سرکاری ملازمت کا جو دروازہ مسلمانوں پر بند ہو گیا تھا وہ اس کالج کے طلبہ پر چوپٹ کھول دیا گیا۔ بس پھر کیا تھا؟ سارے ہندوستان سے طلبہ کھنچ کھنچ کر علی گڑھ کالج پہنچ رہے تھے۔

یہ طلبہ، یہاں انگریز اساتذہ کی زیرنگرانی تعلیم و تربیت حاصل کرتے، مغربی زبان اور مغربی علوم پڑھتے، مغربی معاشرت اور مغربی آدابِ حیات سیکھتے۔ ظاہر کی یہ تبدیلی، باطن کی تبدیلی پر منتج ہوئی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ پسند و ناپسند کا معیار، انگریزی تہذیب و ثقافت ہی قرار پا گیا۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

چیز وہ ہے، جو آئے لندن سے
بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

یاد رہے کہ پائنیر (Pioneer) اس دور کا انگریزی اخبار تھا۔

ہندوستان کے مسلمان معاشرہ میں، مغربیت کا سیلاب، علی گڑھ کالج قائم ہو جانے کے بعد آیا ہے۔ اس لیے بجا طور پر، مغربی ثقافت کی یلغار کا اولین دروازہ، علی گڑھ ہی کا تعلیمی ادارہ قرار پاتا ہے۔ مشہور شاعر، عبدالغفور نساخ کلکتوی، اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> ۱۵، اکتوبر ۱۸۸۵ء کو تین مہینہ کی رخصت پر دہلی گیا۔ اس دفعہ جو گیا تو دیکھا کہ بعضے بعضے ہندو اور مسلمان انگریزی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ [1]

سید محمد سلیم کا یہ اقتباس بھی، اسی حقیقت کا عکاس ہے۔

> The people had been hypnotized to believe in the altruism of their foreign rulers.

> ''عوام پر ایسا افسوں کر دیا گیا تھا کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ غیر ملکی حکمران فی الواقع ان کے حقیقی محسن ہیں'' [2]

مسلمانوں کی معاشی حالت

انگریزی اقتدار کے روز افزوں اضافہ کے خلاف، خاندانِ ولی اللہ کی طرف سے، دو تحریکیں...... علمی و فکری تحریک

---

[1] نساخ، از ڈاکٹر صدرالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۷

[2] تاریخ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم، صفحہ ۱۳۶

بھی، اور جہادی و عسکری تحریک بھی...... اپنے اپنے دائرۂ کار میں سرگرم عمل تھیں، مگر انگریز، جو تاجروں کے روپ میں قزاق بن کر، مسلمانوں سے اقتدار ہتھیا چکے تھے، اس خطرہ کے پیش نظر، کہ کہیں مسلمان اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کی بازیابی کی خاطر، ان کے لیے دردسر نہ بن جائیں، انھیں زیادہ سے زیادہ خستہ حال اور بے دست و پا کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس بناء پر، انھوں نے ایک طرف تو ہندوؤں کو ابھارا اور مرتبہ بلند دیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو دبایا اور انھیں ذلیل و خوار کیا، چنانچہ مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کی پالیسی، لارڈ ایلن بارد کے اِن الفاظ پر مبنی رہی۔

> میں اس حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا کہ یہ نسل (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے، اس لیے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کو خوش کیا جائے۔ [۱]

افلاس کی مار

جس وقت انگریز ہندوستان میں وارد ہوئے، اس وقت مسلمان، مادی اعتبار سے صاحب ثروت، آسودہ حال، فارغ البال اور خوشحال تھے۔ دولت و ثروت میں وہ امتیازی حیثیت کے مالک تھے، مگر انگریزی حکومت نے یہ طے کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کو مفلس اور نادار بنانا ہے۔ اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کئے گئے۔

(۱) استمراری بندوبستِ اراضی

ایسٹ انڈیا کمپنی، ایک تجارتی کمپنی تھی، جسے نیرنگیٔ دوراں نے ہندوستان کی حکمرانی سونپ دی تھی۔ کمپنی کا مقصودِ اصلی، دولت سمیٹنا تھا۔ پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے محکمہ مال گزاری کے قواعد و ضوابط میں، اس انداز میں تبدیلی کی کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کاشتکاروں اور زمینداروں کے مفاد سے یکسر آنکھیں بند کر لی تھیں، اور تمام اراضی کو نیلام کر دیا تھا۔ یاد رہے کہ اس وقت کاشتکاروں اور زمینداروں کی اکثریت، مسلم آبادی پر مشتمل تھی۔ دوسرے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے سال بہ سال، زمین کو نیلام کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی بلکہ ساری اراضی کو دائمی ٹھیکہ پر دے دیا، تاکہ کمپنی کے خزانہ کو ایک متعین رقم ملتی رہے۔ بیشتر کاشتکار اور زمیندار اگرچہ مسلمان تھے، مگر ان پر ٹھیکیدار ہندو تھے۔ اس صورتحال نے نو دولتیئے ٹھیکیداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ بنرجی، چٹرجی، مکرجی، مجومدار، ٹیگور، سین، داس گپتا خاندان، سب کے سب استمراری بندوبست اراضی کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ مسلمان کاشتکاروں پر، ہندو ٹھیکیدار کس قدر ظلم و ستم کرتے تھے، اس کا اندازہ راجہ رام موہن کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

> ایک کاشتکار جو زمین کی رقم ادا نہیں کر سکتا تھا وہ مجبور ہو کر، اپنی جوان لڑکی نیچ ذات کے ہندو کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا، اور اس رقم سے ٹھیکہ کی رقم ادا کرتا تھا۔ [۲]

---

۱ Letters of Lord Ellen Borough to Lord Weellingtion, 18 Jan., 1847

۲ بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد، از عبداللہ ملک، مجلس ترقی ادب لاہور، صفحہ ۱۵۵

(۲) صنعت وحرفت کی تباہی

برطانوی حکومت کو دلچسپی صرف اس بات سے تھی کہ یہاں کی دولت، سات سمندر پار انگلستان میں لیجائی جائے، اور ہندوستانی منڈیوں میں، ہندوستانی مصنوعات کی بجائے، برطانوی مصنوعات کی گرم بازاری ہو۔ اس مقصد کے لیے، انھیں ہندوستان کی صنعت وحرفت کو تباہ کرنے میں بھی کوئی تامل نہ تھا۔ مندرجہ ذیل حقائق، انگریزوں کی اسی پستیٔ ذہن کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

(الف) ...... بہار و بنگال میں مسلمانوں کا ایک طبقہ، صنعت پارچہ بافی میں مشہور تھا۔ انھی لوگوں کو عرفِ عام میں جولاہے کہا جاتا ہے، اُن دنوں، ڈھاکہ کی ململ، اپنی نفاست کے اعتبار سے ساری دنیا میں مشہور تھی۔ کمپنی کے ملازم اپنی تجارت کے لیے، ان سے ململ بنواتے تھے۔ کمپنی کے ملازمین کے سامنے وہ بے چارے، بے بس ولاچار تھے۔ یہ ملازم ان پر بے اندازہ مظالم ڈھاتے، راجہ رام موہن لکھتا ہے کہ

> کمپنی کے ملازم، جولاہوں کو ایک مکان میں بند کر دیتے تھے، کمپنی کے کارندے ان سے کم قیمت پر اور جلدی کپڑا تیار کرانا چاہتے تھے، ہر جولاہے پر ایک سپاہی مسلط ہوتا تھا، کام میں سستی کرنے پر جولاہے پر سخت مار پڑتی تھی۔ [۱]

(ب) ...... متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ ریشم کاتنے والے جولاہوں نے، کمپنی کے کارندوں کے مظالم سے بچنے کے لیے اپنے انگوٹھے کٹوا لیے تھے، اور خود کو ناکارہ بنوالیا تھا، تاکہ وہ ان مظالم سے بچ سکیں۔ جیسا کہ پروفیسر محمد سلیم نے اپنی کتاب ''تاریخ نظریۂ پاکستان'' میں ذکر کیا ہے۔

(ج) ...... نیل کی کاشت کرنے والے مسلمانوں پر بھی، اسی نوع کے مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں باقر گنج کے ایک انگریز جج نے اپنے ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ

> نیل کی کاشت سے حکومت کو خواہ کتنا ہی مالیانہ وصول ہوتا ہو، مگر رعیت کے نقطۂ نظر سے یہ بہتر ہوتا کہ نیل کا پودا سرے سے کاشت ہی نہ کیا جاتا، تاکہ کاشت کاروں پر یہ مظالم تو نہ ہوتے۔ [۲]

(۳) ملازمتوں سے محرومی

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ملازمت پیشہ تھا۔ کمپنی کی حکومت نے پے در پے ایسے اقدامات کئے جن کی وجہ سے یہ طبقہ روزگار سے محروم ہوگیا۔ وارن ہیسٹنگز نے مغل دور کی عدالت مال ختم کردی جس سے ایک طرف کاشتکاروں اور زمینداروں کی مصیبتوں میں اضافہ ہوگیا اور دوسری طرف، اس شعبہ سے وابستہ ہزاروں افراد بیکار ہوگئے۔ ان میں سے بیشتر لوگ مسلمان تھے۔

> کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں، مغل دور کے نظام چوکیدارہ کو ختم کر دیا، جو دیہات میں امن وامان برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہوتا

---

۱ Economic History of India by Gutt, Vol. I, P- 264, 25, 27 بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، صفحہ ۲۷

۲ تاریخ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم، صفحہ ۲۷

تھا۔ اس سے ایک طرف دیہات میں امن و امان کی حالت بگڑ گئی اور دوسری طرف اس شعبہ سے وابستہ ہزاروں افراد بے روزگار ہو گئے۔

فوج میں مسلمانوں کی تعداد غیر معمولی ہوتی تھی۔ مسلمان سب سے زیادہ فوج کی ملازمت کو پسند کرتے تھے۔ ہمارا قومی شاعر غالب کہتا ہے کہ ۔ سو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری

لارڈ کارنوالس نے ایک حکمنامہ کے ذریعہ آگاہ کیا کہ آیندہ سے کسی شریف مسلمان کو فوج میں افسر کا عہدہ نہ دیا جائے، البتہ وہ سپاہی رہ سکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہزار ہا افراد بے روزگار ہو گئے اور ہزاروں گھر تباہ ہو گئے۔

سول حکومت میں بھی کوئی بڑا عہدہ مسلمانوں کو نہیں مل سکتا تھا۔ صرف ۲۵ روپیہ ماہانہ کا داروغہ مقرر کیا جا سکتا تھا۔ جس کے حصول کے لیے بھی ملازموں کو رشوت اور نذرانہ دینا پڑتا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ نے ۱۱، اکتوبر ۱۸۴۴ء کو ایک حکمنامہ جاری کیا جس کے تحت انگریزی ناخواندہ افراد پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ۱۸۶۰ء میں صدر عدالت کو ہائی کورٹ کا نام دیا گیا، اور عدالتی کارروائی کو فارسی زبان سے انگریزی زبان میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس اقدام سے ہزاروں مسلمان وکلاء بے روزگار ہو گئے۔ پھر ایک ضرب، خاص مسلمانوں پر لگائی گئی۔ ۱۸۶۴ء میں قاضی ایکٹ پاس ہوا۔ قاضی کورٹ ختم کر دی گئیں، ان کے جج کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہ رہا۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزار ہا افراد بے روزگار ہو گئے۔ شرفاء کے گھرانے نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے۔ ان کی حالت بقول سرسید یہ ہو گئی کہ

ہائی کورٹ میں جا کر علوم شرقی کے علماء (وکلاء) کا حال دیکھو، ان کے منہ پر مکھیاں بھنکتی ہیں''۔ [1]

اسلام دشمنی، اور مسلم کش پالیسی انگریز کا نتیجہ کیا نکلا؟ سید محمد سلیم صاحب فرماتے ہیں کہ

انگریزی حکومت کی ان تدابیر کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ۱۸۶۹ء تک ایک بھی شریف مسلمان، خوشحال باقی نہیں رہا جو کسی سرکاری عہدے پر فائز ہو۔ علماء، فضلاء، نوابین اور امراء کی اولاد، لکڑ ہارے اور سقے کا کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ [2]

ایک اور مصنف لکھتا ہے۔

کیا غضب ہے وارن ہیسٹنگز کا شریک تجارت کنتو بابو تو دولت میں کھیلے اور اپنی ماتا کے مرنے پر کریا کرم کے کھانے پر نو لاکھ روپیہ صرف کرے، اور شاہان مغلیہ، سلطان ٹیپو کی اولاد، نانِ شبینہ کی محتاج ہو، اور بھوکوں مرے۔ [3]

مسلمانوں کی سیاسی حالت

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد، انگریزوں نے عامۃ الناس پر ایسی نئی پابندیاں عائد کیں جن سے وہ ناواقف تھے۔ نئے نئے ٹیکس لگائے گئے جن کا انھوں نے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا، اور ایسے نئے قوانین نافذ کئے گئے جن کا مقصد عوام کی زندگی کو پابندیوں میں جکڑ کر انھیں تنگ کرنا تھا۔ قانون اسلحہ کے تحت بندوق رکھنے کے لیے پہلے اجازت (لائسنس) لینا ضروری قرار دیا گیا۔ اسٹامپ ایکٹ نافذ ہوا۔ انصاف حاصل کرنے کے لیے فیس دینا لازم ہو گیا حالانکہ اس سے پہلے مسلم

[1] مقالات سرسید، حصہ ہشتم، صفحہ ۴۲، بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم، صفحہ ۷۳ یا ۷۴

[2] تاریخ نظریۂ پاکستان، ص ۷۵

[3] تاریخ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم، صفحہ ۷۵ تا ۷۶

عدالتیں، انصاف، بلافیس اور بغیر قیمت کے فراہم کر رہی تھیں۔ پولیس کا محکمہ کھولا گیا جس میں اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے رذیل لوگوں کو بھرتی کیا گیا جن کا کام عوام کو تنگ کرنا اوران پر مظالم ڈھانا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر، عوام میں بے چینی بڑھنے لگی۔ بے چینی کے معاملہ میں حکومت اب بہت حساس ہوگئی تھی وہ ان حالات سے گھبرا گئی۔ لندن حکومت نے اس کا نوٹس لیا۔

آئینی اصلاحات کا آغاز اور لوکل سیلف ایکٹ

بے چینی ختم کرنے کے لیے حکومت نے آئینی اصلاحات کے ذریعہ، حکومتِ خود اختیاری کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے، لوکل سیلف ایکٹ ۱۸۸۲ء نافذ کیا۔ اس قانون کے تحت بڑے بڑے شہروں میں میونسپل کونسل اور اضلاع میں ڈسٹرکٹ کونسل قائم کی گئیں۔

۱- نمایندوں کے انتخاب کے لیے مخلوط حلقے قائم کئے گئے جس میں ہندو اور مسلمان (بلکہ تمام مذاہب کے افراد) مل کر ایک امیدوار کو منتخب کیا کرتے تھے۔

۲- انتخابات براہ راست ہوتے تھے۔

یہ قانون، نیابتی طرز حکومت کا اولین سنگ میل تھا۔ اس قانون کے تحت ملک میں جب انتخابات ہوئے تو مسلمان راہنماؤں کے خطرات اور اندیشے درست ثابت ہوئے اور مسلمان امیدوار، مسلم آبادی کے اکثریتی حلقوں میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ تنگدل ہندوؤں کی اکثریتی حکومت میں مسلمانوں کے مذہب اوران کی تہذیب کا جو حشر ہونے والا تھا وہ اب ہر چشم بینا کو نظر آرہا تھا۔ آئندہ مسلمانوں کی ہر چیز ہندوؤں کے رحم وکرم پر ہوگی۔

بالآخر سرسید احمد خاں نے زبان کھولی اور ایکٹ کے خلاف تقریر کرتے ہوئے ۱۸۸۲ء میں، انھوں نے کہا۔

> جب تک قوم اور مذہب کے اختلاف اور ذاتوں کا امتیاز، ہندوستان کی سوشل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا اوران معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبود سے بیشتر متعلق ہیں، ان کے باشندوں پر اثر ڈالے گا۔ اس وقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جاسکتا بڑی قوم، چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آجائے گی۔ [۱]

اس تقریر میں مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات اور مستقبل کے خطرات اور اندیشے، پہلی مرتبہ حکومت پر واضح کئے گئے اور مخلوط طریقۂ انتخاب کی سرسید نے اعلانیہ مخالفت شروع کردی۔

اکثریت واقلیت کا تصادم

مغربی طرز جمہوریت کا لازمہ ہے کہ عددی اکثریت والے گروہ کو، عددی اقلیت والے گروہ پر غلبہ وفوقیت بلکہ حاکمیت تک حاصل ہو جاتی ہے۔ اس جمہوریت میں حاکم گروہ اور مخالف گروہ کا پیدا ہو جانا امر لازم ہے۔ جن ملکوں میں ایک نسل، ایک

[۱] خطبات سرسید احمد خاں، جلد ۱، صفحہ ۴۰۱، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء، بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، صفحہ ۱۴۵

زبان اور ایک مذہب ہو، وہاں حزب اقتدار اور حزب مخالف کا فرق عارضی اور غیر اہم ہوتا ہے، لیکن جن ممالک میں زبان، نسل اور مذہب کے اختلافات بالاستقلال موجود ہوں، وہاں فریقین کا اختلاف مستقل اور دائمی ہوتا ہے وہاں جمہوریت کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ ایک مذہبی عددی اقلیت، دائماً مقہور اور محکوم رہے۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو:-

دراصل، جمہوری حکومت کے معنیٰ یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ [1]

پھر، چونکہ حکومت، اعلیٰ پارلیمان کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس لیے اکثریت، اقلیت کے لیے جو قانون چاہے پاس کردے۔ آج کل ساری دنیا میں جمہوریت کا غلغلہ بلند ہے اس لیے ساری دنیا ہی میں اقلیت اور اکثریت کا تنازعہ برپا ہے جو ملکی اور قومی وحدت کو اندر سے کھوکھلا اور پارہ پارہ کرتا رہتا ہے۔

بہرکیف ہندوستان میں اکثریت کی سیاست کا اصول رائج کر کے انگریزوں نے ہندوؤں کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ انگریز رہے یا جائے، ملک کی حکومت ہندوؤں کو ملنی ہے۔ اس اصول نے سیاسی انقلاب کے پلڑے کو ہندوؤں کے حق میں جھکا دیا۔ مسلمان جو کل تک حاکم تھے اب ان کے لیے مقدر ہو گیا کہ وہ محکوم بن کر رہیں۔ ہندو اپنے سامنے روشن مستقبل اور مسلمان اپنے آگے تاریک مستقبل دیکھتے ہیں۔

کانگرس کا قیام

ان آئینی اصلاحات سے متمول اور پڑھے لکھے لوگوں کو تسلی ہوئی ہو تو خیر، ورنہ عوام الناس جو مختلف پابندیوں اور بوجھل ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بے چینی کی لہر بدستور ان میں بڑھتی رہی۔ انگریز حکومت بے چینی سے بہت گھبراتی تھی۔ حکومت نے محسوس کیا کہ کونسلوں میں چند افراد کے اظہار خیال سے دل کا غبار دور نہیں ہو سکتا۔ عوام الناس کے پاس ایک پلیٹ فارم ہونا چاہیے جہاں جمع ہو کر وہ اظہار خیال کریں اور اپنے دل کا غبار نکال سکیں۔ حکومت کو اپنی شکایات اور تکالیف بتائیں تاکہ حکومت، اُن کے احوال سے باخبر رہے۔ اس طریقہ سے گویا حکومت کو عوام کے دل کی باتیں معلوم ہوتی رہیں گی۔ اس طرح عوام الناس کے دلوں میں اتنا غبار جمع نہیں ہوگا کہ لاوا بن کر پھٹنے کی نوبت آئے۔

ان گوناگوں فوائد کو حاصل کرنے کے لیے لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند نے سول سروس کے ایک سینئر افسر مسٹر ایلن ہیوم (Allan Hume) کو اشارہ کیا کہ وہ ہندوستانیوں کی ایک انجمن تشکیل کرے۔ ۱۸۸۵ء میں سربرآوردہ ہندوستانیوں کا ایک اجلاس، مسٹر ہیوم نے پونا میں طلب کیا اس اجلاس میں ۷۱ مندوبین نے شرکت کی۔ جن میں مسلمان صرف دو تھے اور وہاں (All India National Congress) کی تشکیل عمل میں آئی۔ دوسرے سال (۱۸۸۶ء میں) کانفرنس کے تمام شرکاء کو لارڈ ڈفرن نے گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ میں دعوت دی۔ تیسرے سال (۱۸۸۷ء) مدراس کے گورنر نے شرکاء کانفرنس

[1] میری کہانی (از جواہر لال نہرو)، جلد دوم، صفحہ ۴۵۵، بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، صفحہ ۱۴۶

کی دعوت کی۔ [1]

مسٹر ہیوم نے اس کا نام آل انڈیا نیشنل کانگرس رکھا۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو مسٹر ہیوم کی صدارت میں ہوا، اور ایک عرصہ تک سول سروس کے انگریز ہی اس کے صدر بنتے رہے، اور وہی اس کی پالیسیاں ترتیب دیتے تھے۔ عام طور پر سب سے پہلا ریزولیوشن، برطانوی حکومت کی وفاداری کے اظہار پر مشتمل ہوتا تھا۔ لالہ لاجپت رائے اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کانگریس اس لیے قائم کی گئی تھی کہ برطانوی شہنشاہیت کو پیش آمدہ خطرات سے محفوظ رکھا جائے، نہ کہ اہل ہند کو آزادی دلانے کے لیے۔ [2]

ہندوؤں کی تنگ نظری اور سرسید کی مخالفت

ہندو قوم کی خود غرضی، جاہ طلبی اور تنگ نظری، قدم قدم پر مسلمانانِ برصغیر پر یہ واضح کر رہی تھی، کہ دونوں قومیں ایک ہی وطن کی چھت تلے خوشگوار عادلانہ زندگی نہیں گزار سکتیں۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں کے رویہ سے چند باتیں بالکل واضح تھیں۔ مثلاً

(۱)............ کانگریس نے اور بالواسطہ انگریزوں نے مسلمانوں کو نظر انداز کیا۔ مسلمان ہندوستان کی دوسری بڑی قوم تھے اور اب بھی ہیں۔ جب کل ہند پیمانہ پر ایک انجمن تشکیل دی جا رہی تھی تو منتظمین اور ذمہ دار لوگوں کا فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کو بھی بحیثیت قوم اس میں شرکت کی دعوت دیتے، اور مسلمانوں کے سربرآوردہ اور ذمہ دار لوگوں سے گفتگو کرتے، ان کو اعتماد میں لیتے۔ ہندوؤں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اپنے طور پر دو چار غیر معروف مسلمانوں کو شریکِ اجلاس کر لیا اور پھر مطمئن ہو گئے کہ مسلمان بھی کانگرس میں شریک ہیں۔

(۲)............ کانگرس نے اپنے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے، حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان میں خالص پارلیمانی اور نیابتی طرز حکومت نافذ کرے۔ اس قسم کا مطالبہ کرنے سے قبل، ہندو راہنماؤں کا فرض تھا کہ وہ پہلے مسلمان راہنماؤں سے سیاسی مفاہمت کرتے، مسلمانوں کے اندیشے اور خطرات دور کرتے اور انھیں مطمئن کرتے۔ اس کے بعد ہی اس قسم کا مطالبہ کرنا درست ہو سکتا تھا۔ موجودہ صورت حال میں یکطرفہ مطالبہ کرنا درحقیقت مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کے مترادف تھا۔

(۳)............ یہ اندیشے اور خطرات محض وہم و گمان اور ظن و تخمین پر مبنی نہ تھے۔ بلدیاتی انتخابات کے نتائج مسلمان دیکھ چکے تھے۔ رائے دہندہ کے لیے پانچ ہزار روپیہ کی ملکیت کا حامل ہونا ضروری تھا۔ اس شرط کی بناء پر مسلمان رائے دہندوں کی تعداد بہت کم ہو گئی۔ پھر طریقہ انتخاب بھی مخلوط تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر علی گڑھ جیسے خالص مسلمانوں کے علاقہ میں بھی کوئی امیدوار منتخب نہ ہو سکا تھا۔ ان دونوں شرطوں کو برقرار رکھنے کے صاف معنیٰ یہ تھے کہ انتخاب کے میدان میں مسلمانوں کو اسی طرح پیچھے دھکیلا جا رہا تھا جس طرح اس سے قبل، تعلیم اور ملازمت کے میدانوں میں انھیں پیچھے دھکیلا گیا تھا۔ ان اسباب کی بناء پر سر

[1] تاریخ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم صاحب، صفحہ ۱۴۷، [2] بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم صاحب، صفحہ ۱۴۷

سید احمد خاں کو یقین ہو گیا کہ کانگرس کے عزائم مسلمانوں کے متعلق، کبھی بھی خیر خواہانہ نہیں ہو سکتے۔

۱۸۸۷ء میں، کانگریس نے سرسید کو اجلاس میں شرکت کی دعوت دی، اس کے جواب میں، سرسید نے صدر کانگریس کو یہ لکھا کہ

> میں نیشنل کانگریس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف ذاتیں، فرقے اور مذاہب کے جو افراد بستے ہیں وہ ایک ہی قوم کے افراد ہیں یا ایک قوم بن سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل ناممکنات میں سے ہے اور جب ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگرس کے نام کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور نہ اس ملک میں بسنے والی تمام قوموں کے لیے سودمند ہو سکتی ہے۔ [1]

اس کے بعد، سرسید نے کانگرس کی مخالفت میں لکھنؤ (۱۶ مارچ ۱۸۸۷ء) اور میرٹھ (۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء) میں تقریریں کیں جن میں مخلوط طریقۂ انتخاب کو اس ہندوستان کے لیے ناموزوں قرار دیا جہاں ایک سے زائد قومیں آباد ہیں۔ انھوں نے کانگرس کی کھل کر مخالفت کی، اور مسلمانوں کو اس میں شرکت سے منع کیا۔ انھوں نے کہا

> اس (ہندوستان) میں ہندو اور مسلمان اور کئی دوسری قومیں آباد ہیں اور انگلستان کی مختلف اقوام کی طرح مل جل کر ایک نہیں بن گئی ہیں اس لیے یہاں یہ طریقہ انتخاب ناموزوں ہے۔ کانگرس کی یہ تجویز ایسے ملک کے لیے جہاں دو مختلف قومیں رہتی ہوں مناسب نہیں، نہایت بداندیشی کی تجویز ہے۔ ایک دوسرے سے عداوت پیدا کر دینا ہے۔ یہ نہ دین کے لیے مفید ہے، نہ ملک کے لیے، نہ شہر کے لیے۔ [2]

سرسید کی مخالفتِ کانگرس سے یہ فائدہ ہوا کہ مسلمان ہندو لیڈروں کے زیرِ قیادت آنے سے بھی، اور ہندو قوم میں ضم ہونے سے بھی بچ گئے۔ مسلمانوں کی انفرادیت بہر کیف برقرار رہی اور ان کا ہندوؤں کے بالمقابل، انفرادی تشخص بھی بڑی حد تک محفوظ رہا۔

مزید اختیارات کی قسط، از حکومتِ برطانیہ

۱۸۹۲ء میں لینس ڈاؤن، وائسرائے ہندوستان کے زمانہ میں، اہل ہند کو مزید آئینی اختیارات دیے گئے۔

(الف) مرکزی اور صوبائی کونسلوں کے ممبران کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

(ب) غیر سرکاری ممبروں کو اجلاس میں سوالات کرنے کا حق ملا۔

(ج) انتخابات کا طریقہ حسب سابق مخلوط ہی رہا۔

ان اصلاحات کے بعد، ۱۸۹۳ء کے انتخابات میں بھی مسلمان امیدواروں کا وہی حشر ہوا جو اس سے قبل، میونسپل اور

---

[1] بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم صاحب، صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۰

[2] سرسید کے لیکچر، صفحہ ۳۰۱، بحوالہ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم، صفحہ ۱۵۰

ڈسٹرکٹ کونسلوں کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔ سرسید کے اندیشے پھر درست ثابت ہوئے۔ اس انتخاب میں بھی ہندوؤں کو غیر معمولی غلبہ حاصل ہوا۔

جداگانہ انتخاب کی تجویزِ سرسید

اس مرتبہ سرسید احمد خاں نے مخلوط انتخاب کی صرف مخالفت ہی نہیں کی بلکہ متبادل تجاویز بھی پیش کیں۔ ایک تجویز یہ تھی۔

> وائسرائے کی کونسل میں ایک معین تعداد سے ہندو ہوں اور مسلمان ہوں۔ ہندو ممبر کو ہندو منتخب کریں، اور مسلمان ممبر کو مسلمان، اور یہ بھی فرض کرتا ہوں کہ دونوں کی تعداد مساوی ہو۔ [1]

یہی وہ تجویز ہے جس کو بعد میں جداگانہ انتخاب کا نام دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جداگانہ انتخاب کی تجویز، سب سے پہلے سرسید نے پیش کی تھی۔

اردو اور ہندی زبان کا تنازعہ

انگریزی نوازشات سے تقویت پا کر، ہندو زعماء ایسے اقدامات کر رہے تھے جن سے قوم پرستی کو تقویت ملتی تھی۔ ایسے بیشتر اقدامات، مسلمانوں ہی کے خلاف ہوتے تھے۔ ان میں سرفہرست ہندی زبان کی ترویج ہے اور اردو زبان کو خارج البلد کرنا ہے۔

سب سے پہلے، بنارس کے ہندوؤں نے اردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط رائج کرنے کا مطالبہ کیا۔ سرسید کو ہندوؤں کے اس اقدام سے سخت تکلیف پہنچی۔ اس کا اظہار، انھوں نے اپنے دوست شیکسپیئر سے بھی کیا۔ پیرس (فرانس) میں بیٹھے ہوئے اردو زبان کے محقق گارساں دتاسی نے بھی ہندوؤں کے اس اقدام کو برا محسوس کیا۔ ہندو ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

> ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر اس امر کے مزاحم بن رہے تھے جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔ [2]

سرکاری زبان کی تبدیلی ایک اہم مسئلہ ہے، اور یہ کام، درحقیقت، مرکزی حکومت کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔ مگر ستم ظریفی دیکھئے، ایک معمولی کلکٹر نے اتنا بڑا کام کر ڈالا۔ انتھونی میکڈانلڈ نے بحیثیت کلکٹر بہار میں ہندی زبان اور کیتھی رسم الخط جاری کرنے کا حکمنامہ جاری کر دیا۔ پھر جب یہی کلکٹر، صوبہ یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر بن کر آیا تو یہاں بھی اس نے (۸، اپریل ۱۹۰۰ء کو) ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو عملاً رائج کر دیا، حالانکہ یوپی اردو کا گہوارہ ہے۔

اس زمانہ میں سرسید (۱۸۹۸ء) کا انتقال ہو چکا تھا۔ حکومت کے اس قدام سے جو اضطراب مسلمانوں میں پیدا ہوا تھا، اس سے اثر لے کر نواب محسن الملک، معتمدِ علی گڑھ نے احتجاج کرنا چاہا۔ گورنر نے کالج کی امداد بند کر دینے کی دھمکی دی۔ بے چارہ نواب خاموش ہو کر رہ گیا۔ بہار اور یوپی میں جس طرح ہندی زبان کو رائج کیا گیا، اس سے صاف نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کو گرانے کے لیے اور ان کے بالمقابل ہندوؤں کو بلند و بالا کرنے کے لیے، انگریز اس قدر سرگرم اور پرجوش تھے کہ

---

[1] بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان، از پروفیسر محمد سلیم صاحب، صفحہ ۱۵۲، [2] حیاتِ جاوید، از الطاف حسین حالی، صفحہ ۱۹۷

انھیں اپنے حدود اختیارات سے تجاوز کرنے میں بھی گریز نہ تھا۔

اس دور کی سیاست پر مختصر تبصرہ

مسلمانانِ ہند کا سیاسی دور سرسید سے شروع ہوا، اور ان کے جانشین نواب محسن الملک کی وفات پر، اکتوبر ۱۹۰۷ء میں ختم ہوا۔ یہ دور تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ (۱۸۸۵ء تا ۱۹۴۹ء)، اس دور کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد، ایسی بری طرح ہم کو کچلا گیا کہ مدت تک موت سی بیہوشی سارے ملک پر طاری رہی، کچھ افاقہ ہوا تو چاروں طرف مایوسی کی گھٹا چھائی دیکھی۔ مایوسی کے بعد حکومت کے سامنے چاپلوسی اور خوشامد کا دور آیا۔ پھر مدت کے دبے جذبات کچھ ابھرنے لگے۔ یہاں کے حاکموں نے جب دیکھا کہ مدت کی نیند سونے والے کچھ کروٹیں بدلنے اور جھرجھری لینے لگے ہیں تو انھوں نے معروضات اور گزارشات پیش کرنے کا راستہ سجھا دیا۔ مبادا یہ تازہ حرکت، اٹھے ہوئے جذبات اور بیدار کُن احساسات کے نکلنے کا کوئی دوسرا خطرناک راستہ اختیار کر لے۔ معروضات کی منزل سے گزر کر، پھر نرم اور پھر گرم لہجہ میں مطالبات کا آغاز ہوا۔ [۱]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اس دور پر اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> پہلا دور سرسید احمد خاں کا ہے جس میں مسلمان، ایک مسلک ایک مشن رکھنے والی جماعت کے بجائے محض ایک ''قوم'' بن کر رہ گئے۔ اور اس قوم کی پالیسی یہ قرار پائی کہ اپنی دنیا بنانے کے لیے، وقت اور موقع کے لحاظ سے جو طریقہ کارگر نظر آئے، بے تکلف استعمال کیا جائے۔ اگرچہ نام پھر بھی اسلام کا اور مسلمانوں کا لیا جاتا رہے، مگر جو ذہنیت اس دور میں کارفرما تھی، اس کا عطر، حالی نے اپنے اس مصرعہ میں کھینچ کر رکھ دیا۔ ع
>
> چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی
>
> ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ یہ دور اپنی طبعی عمر کو پہنچ گیا۔ [۲]

اسی دور کے قُربِ اختتام پر، جناب غلام احمد پرویز صاحب متولد ہوئے، اور یہ تھے، وہ مذہبی، اخلاقی، معاشی، علمی اور تعلیمی و سیاسی حالات، جن میں وہ اس عالم آب و دانہ میں وارد ہوئے، اور دنیا کے سٹیج پر، وہ اپنا کردار ادا کر کے فروری ۱۹۸۵ء کو راہئ عالم آخرت ہوئے۔

---

[۱] خطباتِ عثمانی، صفحہ ۱۹، ہاشمی بکڈپو، لاہور، ۱۹۴۶ء [۲] ادبیاتِ مودودیؒ، از خورشید احمد، صفحہ ۲۸۹

فصل ثانی

جناب پرویز صاحب کی سوانح حیات

حالاتِ حیاتِ پرویز کا مآخذ

جناب غلام احمد پرویز صاحب کے حالاتِ زندگی کی تفصیل میں جانے سے قبل، یہ جان لینا ضروری ہے کہ تادم تحریر، کوئی ایسی کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر، منظر عام پر نہیں آئی، جو موصوف کی زندگی پر روشنی ڈالتی ہو۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، طلوعِ اسلام کے کنونشن میں، ایک مرتبہ یہ طے پایا تھا کہ پرویز صاحب کے سوانحِ حیات کو کتابی شکل میں لایا جائے، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے عیاں ہے:

> محترمہ شمیم انور صاحبہ کی ایک تجویز کے پیشِ نظر، مولانا عبدالرب صاحب نے تحریک کی کہ پرویز صاحب کے سوانحِ حیات قلم بند کیے جائیں، اور یہ ذمہ داری محترم ابو عاکف صاحب (کراچی) کو سونپی جائے، ایوان نے اس قرارداد کو ولولۂ مسرت کے ساتھ منظور کیا۔ [1]

لیکن ابو عاکف صاحب، غالباً اس ذمہ داری کو پورا نہ کر پائے، اور مارکیٹ میں ایسی کوئی کتاب نہ آسکی، جو پرویز صاحب کے احوالِ شب و روز پر محیط ہو، اس لیے اس موضوع پر جو مواد بھی پیش کیا جا رہا ہے، اُس کا غالب اور بیشتر حصہ خود ان کی اپنی تصنیفات اور رسالہ طلوعِ اسلام کی فائل ہی سے ماخوذ ہے۔

مولد و مسکن اور ابتدائی زندگی

جناب غلام احمد پرویز صاحب، اپنے مولد و مسکن، اور ابتدائی زندگی کے متعلق، خود فرماتے ہیں کہ

> میری پیدائش ۹، جولائی ۱۹۰۳ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی تھی، جو مختلف خصوصیات کی بناء پر ایک مشہور بستی تھی۔ [2]

بچپن اور تعلیم و تربیت

پیدائش کے بعد، اپنے بچپن اور اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق تفصیل، وہ بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

> میری پیدائش، ایک ایسے گھرانے میں ہوئی، جو شریعت و طریقت کا نہایت نظیف و لطیف آمیزہ تھا۔ گھر کے اسی ماحول کی نسبت سے، مَیں، اکثر (استعارۃً) کہا کرتا ہوں کہ میری پیدائش پر، اگر میرے ایک کان میں اذان کی ندائے جانفزا پہنچی تھی، تو دوسرے کان میں قوالوں کی آواز میں، امیر خسرو کے قول قوّالوں کی نشید روح افروز۔ (میرے والد مرحوم تو ناخواندہ تھے،

---

[1] طلوعِ اسلام، مئی جون، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳۱

[2] شاہکار رسالت، حاشیہ بر صفحہ ۲۷

لیکن) میرے دادا، مولوی، چوہدری رحیم بخش، حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ تھے، علاوہ ازیں، وہ ایک ماہر طبیب بھی تھے، لیکن انھوں نے ان میں سے کسی خصوصیت کو بھی ذریعۂ معاش نہ بنایا کہ وہ نوعِ انسانی کی طبیعی یا روحانی اصلاح یا امداد کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ مجھے اپنے علم وسلوک کا وارث بنانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے شروع ہی سے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا، اور میری پرورش تعلیم وتربیت انھی کے ہاتھوں یا زیرِ نگرانی ہوئی، فطرت کی گرم گستری سے ذہنِ رسا پایا تھا، اس لیے علوم شریعت وطریقت کے مبادیات پر تھوڑے عرصہ میں عبور حاصل کر لیا۔ دادا جان سلوک کی منازل بھی ساتھ کے ساتھ طے کراتے جاتے تھے، اس لیے مراقبات، مجاہدات، ریاضات (چلہ کشی اور زاویہ نشینیاں) اس عمر میں میرے معمولات بن چکے تھے جن میں بچے ہنوز گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے، میرے ہم عصر پتنگیں اڑایا کرتے تھے، اور میں ''آنسوئے افلاک'' کے حقائق ومعارف سمجھنے میں محو ہوتا تھا۔ [1]

ایک کان میں اذان اور دوسرے میں موسیقی کا یہ ذوق، جو انھیں گھٹی میں ملا تھا، آخر عمر تک نہ صرف یہ کہ قائم رہا، بلکہ روز افزوں ترقی پر رہا۔ وہ قوالوں اور امیر خسرو کے قول قلبانوں سے کہیں آگے بڑھ کر، فلمی فنکاروں، ٹی وی گویوں اور معروف گلوکاراؤں کی محفلیں، خود اپنے گھر میں سجایا کرتے تھے، لیکن جب تک زندہ رہے، ''طلوع اسلام'' میں کبھی ایسی مجالس کا ذکر نہ ہوا، البتہ ان کے مرنے کے بعد، ان کی اس قسم کی رنگین محفلوں پر سے اس وقت پردہ اٹھا، جب ایک خاتون نے ان کی یادداشتوں کو، ایک انگریزی مقالے میں، بایں الفاظ پیش کیا۔

Music was not only his hobby; he was recognized as the connoisseur of music of Indo-Pakistan classical tradition. His knowledge of it and an ear of it, was tremendous. He would cringe in agony if any singer went out of tune. His approval was like a final verdict on one's accomplishment. It gave them confidence and happiness. I have heard the great Umrao Bundu Khan sing for him in these very lawns of 25-B Gulberg. Mahdi Hassan (during his pre-film and T.V days) gave several renderings of classical *raags*, Nazir Farooqi often sang Iqbal's poems during the conventions. Parwez Sahib made special effort to listen to Roshan Ara Begum of whom he had very high opinion. I have seen her really inspired when he was present among the audience. She knew he understood every note, *sur*, the nuances and subtleties of the particular *raag*, she was singing. Yes, for Parwez Shaib, music was the height of relaxation. With a large library of tapes and records, he would listen to it to recoup

[1] شاہکار رسالت، گذرگاہِ خیال، صفحہ ۲۷

his energies; no wonder music has been described as the food of the soul, and it has been well-said that those who can not appreciate music and declare it as "haram", have no soul! [1]

موسیقی نہ صرف یہ کہ ان (پرویز صاحب) کا مشغلہ تھا بلکہ وہ خود بھی، برصغیر پاک و ہند کی قدیم اور شستہ موسیقی کے صاحبِ تمیز اور دقیقہ شناس مبصر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ موسیقی کے متعلق، ان کا علم اور ان کا گوشِ نغمہ شناس بڑا عظیم تھا۔ اگر کوئی گویا، اپنے سر میں بے سُرا ہو جاتا تھا، تو وہ تکلیف کا شکار ہو کر، ایک طرف کو جھک جاتے، کسی گویے پر، ان کا رویۂ تحسین اس کی کارگزاری پر، گویا آخری فیصلہ قرار پاتا تھا۔ اس سے گلوکاروں کو اعتماد اور راحت میسر آتی۔ میں نے ۲۵-بی، گلبرگ کے سبزہ زاروں میں، پرویز صاحب کے لیے عظیم گلوکار، امراؤ بندو خاں کو گاتے ہوئے سنا ہے۔ مہدی حسن ٹی وی اور فلموں میں آنے سے قبل، قدیم راگ پیش کیا کرتے تھے۔ نذیر فاروقی، دوران کنونشن، کلام اقبال گایا کرتے تھے۔ روشن آراء بیگم، جن کے متعلق، پرویز صاحب، نہایت بلند رائے رکھتے تھے، کو سننے کے لیے، وہ خصوصی کوشش کیا کرتے تھے۔ اگر سامعین میں پرویز صاحب، موجود ہوتے تو وہ خاص طور پر، اپنے اندر ایک الہامی روح محسوس کیا کرتی تھی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ پرویز صاحب، اس کے گائے جانے والے گانے کے راگ، سر، نزاکتوں اور لطافتوں کے فہمیدہ تھے۔ ہاں، موسیقی، پرویز صاحب کے لیے، ازالۂ تکان اور تفریحِ طبع کا بلند ترین ذریعہ تھا۔ اپنی صرف شدہ توانائیوں کی بازیابی کے لیے، ان کے پاس، ٹیپ اور (گراموفون) ریکارڈوں کی وسیع لائبریری تھی۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ موسیقی کو غذائے روح بیان کیا گیا ہے، اور یہ بات بجا طور پر کہی جاتی ہے کہ وہ لوگ، جو موسیقی کے قدر دان نہیں ہیں اور اسے حرام قرار دیتے ہیں، وہ روح سے عاری ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب کا اپنی پختگی عمر میں بھی، روشن آراء بیگم کی گلوکاری سے محظوظ ہونے کے لیے، خصوصی کاوشوں کا اہتمام، دراصل، اسی راگ، سُر اور گانے بجانے کے ساتھ، شغفِ شدید کا نتیجہ ہے، جو بوقتِ پیدائش، اذان کے ساتھ ہی ان کی گھٹی میں پڑ چکا تھا۔ عام افراد، تو ممکن ہے کہ عہد طفولیت کی ان دلچسپیوں کو ''بچپن کی باتیں'' سمجھ کر نظر انداز کر دیں، لیکن جو لوگ، علم النفس (Psychology) سے کچھ بھی دلچسپی رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بچپن کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن پر مستقبل میں، انسانی کردار کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔

''مفکر قرآن'' ہونا تو رہا ایک طرف، اگر کوئی شخص، محض سادہ مزاج قرآنی مجاہد ہی ہو، تو اسے بھی صرف وہی راگ اچھا لگتا ہے جو تلواروں کی جھنکار سے پیدا ہو، نہ کہ وہ جو گلوکاراؤں کے گلے سے برآمد ہو۔ شمشیر بکف مجاہد اور سناں بردار مسلم، موسیقی اور گیت سنگیت کی محافل سے یوں پرہیز کرتا ہے جیسے ذیابیطس کا مریض شوگر سے۔ انفرادی سطح سے آگے بڑھ کر، جب کوئی قوم، گیت سنگیت کی ایسی محفلوں کو اپنا وطیرہ بنا لیتی ہے تو یہ اس کے زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے، خواہ، اس قوم کے ''دانشور'' اور ''مفکر'' اسے ''آرٹ یا ثقافت'' کے کتنے ہی خوشنما ناموں سے نواز دیں۔ یوں تو ''مفکر قرآن'' صاحب، خود کو، فکرِ اقبال اور کلامِ اقبال کے تنہا وارث اور شارح قرار دیا کرتے تھے، مگر کبھی، انھوں نے، اقبال کے اس حقیقت کشا شعر پر توجہ نہ فرمائی ؎

[1] طلوعِ اسلام، مارچ، اپریل ۱۹۸۹ء، صفحہ ۱۱۶

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیر امم کیا ہے؟
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

چنانچہ ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنی کوٹھی کے لان میں، ایک طرف، اگر ''قرآنی حقائق ومعارف'' بیان فرمایا کرتے تھے، تو دوسری طرف، وہ مہدی حسن اور روشن آراء بیگم کی صوتِ سحر آگیں سے ''غذائے روح'' کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، جو نرے دروسِ قرآن سے شاید ممکن نہ تھا۔

پھر وہ موسیقی کے ساتھ، اپنے شغفِ شدید کو، بایں الفاظ، سند جواز فراہم کیا کرتے تھے:

> یہ محض اتفاق تھا کہ دادا جان کا تعلق، تصوف کے چشتیہ نظامیہ سلسلہ سے تھا جس میں موسیقی کو جزوِ عبادت سمجھا جاتا ہے، اس سے شعر ونغمہ کے متعلق، میرے ذوقِ لطیف کی ازخود نشوونما ہوتی چلی گئی۔ اگر ان کا تعلق (مثلاً) قادریہ یا نقشبندیہ سلسلہ سے ہوتا تو میرے ذوق کا دم گھٹ جاتا اور نمعلوم یہ تسکین نایافتہ تقاضے، کس کس قسم کے نفسیاتی معاذیر کے جھروکوں سے جھانکتے، اور ''شرعی تاویلوں'' کے روزنوں سے سر نکالتے۔ [1]

موسیقی کی رغبت کے علاوہ، پرویز صاحب نے، اپنے ابتدائی ماحول سے جو کچھ پایا، اس کا تذکرہ، وہ، بایں الفاظ کرتے ہیں:

> بٹالہ ایک متشدد قسم کا مذہبی قصبہ تھا، آبادی کی اکثریت تو حنفی المسلک سنیوں پر مشتمل تھی، لیکن اہل حدیث اور اہل تشیع بھی خاصی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں قادیان جانے کے لیے بٹالہ ہی، ریلوے سٹیشن تھا، اس لیے وہاں کے زائرین کے لیے یہ قصبہ ناگزیر گذرگاہ تھا۔ علاوہ ازیں، یہ عیسائی مشنریوں کا مرکز اور آریہ سماج کا بھی گڑھ تھا۔ اس زمانے میں، بین الفرق مناظروں اور بین المذاہب مباحثوں کا بڑا زور تھا، اس لیے، جس طرح، دریا کے کنارے بستیوں کے بچے پیدائشی تیراک ہوتے ہیں، بٹالہ کے مذہب پرست طلبہ، پیدائشی مناظر ہوتے تھے۔ فضا کے ان تقاضوں کی وجہ سے، مختلف فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت لاحق ہوئی، دادا جان کو ان سب کے لٹریچر پر کافی عبور حاصل تھا (اور تو اور، وہ سنسکرت کے بھی عالم تھے)، اس لیے میں ان وادیوں سے بآسانی گزرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی میری انتہائی خوش بختی تھی کہ وہ اس قدر مذہبی شخصیت ہونے کے باوجود، بڑے روشن خیال اور وسیع الظرف واقع ہوئے تھے۔ ابتداءً، وہ انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ اس زمانہ میں، اس زبان کا جاننا کس قدر ضروری ہے تو انھوں نے کافی بڑی عمر میں، تھوڑے سے عرصہ میں، اس کی بھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔ مجھے اس کا یہ فائدہ ہوا کہ انھوں نے میری سکول کی تعلیم کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا۔ انھی مؤثرات وعوامل کا نتیجہ تھا کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے، میری نگاہ کی مشرقی اور مغربی افقیں، کافی وسیع ہو چکی تھیں، اور ان کے ساتھ ہی ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں بھی کافی عمیق۔ [2]

پرویز صاحب، اپنی عمر کے ابتدائی دور میں، تصوف، سے بھی خاصا شغف رکھتے تھے، وہ خود فرماتے ہیں:

> تصوف کا ''ہمہ اوست'' انسان کو وسیع المشرب بنا دیتا ہے، ... اگرچہ اکثر اوقات، کچھ ضرورت سے زیادہ ہی وسیع

---

[1] + [2] شاہکار رسالت، گذرگاہِ خیال، صفحہ ۲۸

المشرب...... اس وسیع المشربی کا نتیجہ یہ تھا کہ میں جس جذب وشوق سے میلاد کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا، اسی سوز و گداز کے ساتھ عزاداری کی مجلسوں میں بھی حاضری دیتا تھا، اور قوالی تو خیر تھی ہی جزو عبادت، اس قسم کے اضداد کا مجموعہ تھا میرے بچپن اور شباب کا زمانہ۔ [1]

اہل تشیع کی مجالسِ عزاداری میں شرکت کے عمل نے، تصوف کے ساتھ مل کر، پرویز صاحب کو کس ذوق و مزاج سے ہمکنار کیا تھا؟ اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

ویسے بھی صوفی آدھا شیعہ ہوتا ہے۔ [2]

اور بہر حال، شیعیت اور تقیہ لازم و ملزوم ہیں۔ تقیہ (قطعِ نظر، اس کے جواز و عدم جواز کے) قلب و زبان میں مغائرت ہی کا دوسرا نام ہے، شاید اسی کا یہ اثر ہے کہ ان کی بعد کی پوری زندگی، تقیہ ہی کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے، جس کا نمایاں اور منطقی نتیجہ، ان کے وہ تضادات و تناقضات ہیں، جو ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں، لیکن یہاں موضوع کی مناسبت سے، فوری حوالہ کے پیشِ نظر، صرف ایک مثال، عرضِ خدمت ہے۔

خلافِ ضمیر، اظہارِ خیال

قبل ازیں، یہ بیان ہو چکا ہے کہ عندالولادت، ان کے کانوں میں امیر خسرو کے قول قلبانوں کی جو آواز، صوتِ اذان کے ساتھ ڈالی گئی، اس سے انھیں موسیقی کا ایسا ذوق وشوق اور شغف و انہماک ملا اور ان کے ذوقِ لطیف کے تقاضے، یوں تسکین پا گئے کہ اس بات کا کوئی خطرہ نہ رہا کہ یہ تسکین نایافتہ تقاضے ''تفسیاتی معاذیر کے جھروکوں سے جھانکتے یا شرعی تاویلوں کے روزنوں سے سر نکالتے''، لیکن افسوس کہ جسے انھوں نے خود اپنے لیے پسند کیا، اسے دوسرے افراد کے لیے قطعاً پسند نہ کیا، اور ان پر موسیقی اور گیت سنگیت کے دروازے بند کر دیے۔ گانے بجانے کے ''آرٹ'' اور موسیقی کی ''ثقافت'' کے دلدادہ ہوتے ہوئے بھی، وہ اپنے ضمیر کے خلاف، قوم کو یہی وعظ سناتے رہے کہ مسلمانوں کے لیے راگ اور تال کی تعلیم درست نہیں ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب متحدہ ہندوستان میں، ہندو، ملکی نظام تعلیم میں گانا سکھانا ضروری قرار دینے پر مصر تھے۔ اس وقت ''مفکر قرآن'' صاحب فرمایا کرتے تھے۔

ہندو کنیا مہاودیالوں میں راگ وغیرہ نصاب میں شامل ہے، لہٰذا اگر ہندو لڑکے اور لڑکیوں کے لیے راگ کا نصاب رکھا جائے تو انھیں عین مسرت ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ چودہ برس کی عمر میں مسلمان لڑکیوں کو راگ اور تال سکھا کر، کیا بنانا مقصود ہے۔ حضرت اکبر مرحوم نے فرمایا تھا۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

[1] + [2] شاہکار رسالت، گذرگاہِ خیال، صفحہ ۲۹

دیندار متقی ہوں، جو ہوں، ان کے منصرم
استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

مسلمانو! ذرا سوچو کہ آزاد ہندوستان میں جبری تعلیم کی رو سے، آپ کی بیٹیاں اور بہنیں، کس قسم کی تعلیم حاصل کیا کریں گی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی [1]

طلوعِ اسلام کی اولین اشاعتوں میں، ڈھونڈ ڈھونڈ کر، تاریخ اسلام میں سے ایسے واقعات، پیش کیے جاتے تھے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گانے کے رسیا، شخص کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ صرف ایک واقعہ ملاحظہ فرمایئے:

اسی طرح کا ایک واقعہ قاضی شرف الدین بن عین الدولہ کا ہے جو مصر میں قاضی تھے، ان کی عدالت میں ملک کامل سلطان مصر، کسی مقدمہ میں شہادت میں طلب ہوا، وہ چونکہ روزانہ ایک مغنیہ کا گانا سنا کرتا تھا، اس وجہ سے قاضی موصوف نے اس کی شہادت لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر اس نے قاضی کی شان میں سخت کلمہ استعمال کیا، قاضی نے کہا کہ یہ عدالت کی توہین ہے، اور اسی وقت اپنی برطرفی کا اعلان کر کے، مسند سے اٹھ کر چلے آئے۔ سلطان نے مجبوراً جا کر معافی چاہی اور ان کو راضی کیا کیونکہ اس کو اپنی بدنامی اور نامقبولیت کا خطرہ ہوا۔ [2]

متحدہ ہندوستان میں، یہ اسوۂ رسول بھی بیان کیا جاتا تھا کہ حضرت نبی اکرم ﷺ:-

جن محفلوں میں باجہ اور راگ ہوتا تھا، ان میں کبھی نہیں جاتے تھے۔ [3]

قیامِ پاکستان سے قبل، موسیقی کے دلدادہ ہونے کے باوجود بلکہ ''موسیقی تھی ہی جزوِ عبادت'' اس کے باوجود بھی، وہ قلم کی زبان سے جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ ان کے ضمیر کے بالکل خلاف تھا، اور یہی ان کا تقیہ تھا، جسے انھوں نے نظریۂ ضرورت کے تحت، صرف اس لیے اختیار کیا تھا کہ جمہور مسلمانوں کی ہمنوائی کے ذریعہ، طلوعِ اسلام کے حلقۂ قارئین میں وسعت پیدا کی جائے، اور یہ روش، صرف موسیقی ہی کے معاملے میں نہ تھی بلکہ ہر مسئلے میں وہ مصلحتاً یہی طرزِ عمل اپنائے ہوئے تھے۔...... لیکن پھر جب پاکستان بنا اور اس کے افق پر ''طلوعِ اسلام'' ہوا، تو پھر موسیقی اور راگ، تال، سر سب حلال اور جائز قرار پا گئے، اور قرآنی مفرد يُحْبَرُوْنَ کا پہاڑ کھود کر، حِلت کا یہ چوہا نکال لیا گیا، اور یوں بے چارے مسلمان، موسیقی کے ''ارتکابِ حرام'' سے بچ گئے، بقول اکبرالہ آبادی کے،

سنا ہے حلّتِ بادہ کا ہو گیا فتویٰ
خدا نے فضل کیا، بچ گئے حرام سے ہم

اب حلتِ موسیقی کے اس ''قرآنی فتوے'' کی رو سے، حضور نبی اکرم ﷺ کا، ایسی محفلوں سے احتراز بھی ''خلافِ قرآن'' قرار پا گیا، اور خود ''مفکرِ قرآن'' صاحب کا فلمی مغنیہ ''روشن آراء بیگم کے گانے سننا'' ''مطابقِ قرآن'' ہو گیا۔

---

[1] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۳۸ء، صفحہ ۷۷ [2] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۶۷ [3] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۲

پرویز صاحب کا تنقیدی مزاج

پرویز صاحب، اپنے حالاتِ حیات بیان کرتے ہوئے، اپنے تنقیدی مزاج کا تذکرہ، ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

لیکن میں نے اپنی فطرت کی اس نوازشِ خصوصی کا ذکر نہیں کیا جس نے میری زندگی کے دھارے کا رخ بدل دیا، اس نے ذوقِ سلیم اور ذہنِ رسا کے ساتھ مجھے تنقیدی نگاہ بھی عطا کی تھی، غالب نے کہا تھا کہ

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
عشق کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

عشق کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا تنقیدی نگاہ کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس سے درد پیدا ہوتا ہے لا دوا، اور پھر یہی درد لا دوا، دنیا کے ہر درد کا مداوا بن جاتا ہے، یہی وہ جنسِ گراں مایہ ہے (کم از کم میرے حق میں تو یہ ایسی ہی ثابت ہوئی ہے) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اے متاعِ درد، در بازارِ جاں اندوختہ
گوہرِ ہر سود، در جیبِ زیاں انداختہ

غالب نے یہ بھی کہا تھا، کہ

گر عشق نبودے و غم عشق نبودے
اینہا سخن نغز، کہ گفتے، کہ شنودے

میں بھی اسی کی ہمنوائی میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے یہ تنقیدی نگاہ نہ ملتی، تو میری ساری متاعِ حیات ''یوسف بقیمتِ اول خریدہ'' سے زیادہ کچھ نہ ہوتی۔ میں نہ کوئی سخنِ نغز کہہ سکتا، نہ سن سکتا۔ [1]

بقولِ پرویز صاحب، ان کے تنقیدی مزاج نے دین و شریعت اور تصوف و طریقت کے بہت سے مسائل کے متعلق، غور و فکر کے نتیجہ میں، شکوک و شبہات پیدا کر دیے، اور قلب و دماغ، ایک کشمکش کی آماجگاہ بن کر رہ گئے۔ وہ خود اپنی اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

میری یہ کشمکش، اسرارِ طریقت سے ہی متعلق نہیں تھی، امورِ شریعت میں بھی میری یہ کیفیت ہو چکی تھی۔ اس کا تفصیلی تذکرہ میں نے ''شاہکار رسالت'' کے ابتدائیہ میں کیا ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ امورِ شریعت کے متعلق میں اپنے شبہات کا اظہار کر دیتا اور دادا جان مجھے اسناد اور دلائل سے اطمینان دلانے کی بھی سعی بلیغ فرماتے، لیکن اسرارِ طریقت کا تو معاملہ ہی جدا گانہ ہوتا ہے، ان میں نہ سند سے معاملہ ہوتا ہے اور نہ دلیل سے تعلق، ان میں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود، زِ راہ و رسم منزلہا

---

[1] شاہکار رسالت، گذرگاہِ خیال، صفحہ ۲۹

اس لیے ان شکوک کو میں زبان پر لانے سے گھبراتا تھا، نتیجہ یہ کہ میرا قلبی اضطراب دن بدن بڑھتا گیا، کبھی خیال آتا کہ ہمت کر کے میں اس کا تذکرہ داداجان سے کردوں، لیکن معلوم نہیں، یہ شدتِ احترام کا اثر تھا یا ان کے علوم رتبت کا احساس، کہ میں اپنے اندر اس کی جرأت نہ پاتا، اب جو میں اس کے متعلق سوچتا ہوں تو کچھ ایسے لگتا ہے کہ مجھے غالباً اندیشہ یہ تھا کہ وہ کہیں یہ تاثر نہ لے لیں کہ جسے انھوں نے اپنے علم وروحانیت کا وارث بنانے کے لیے، اسقدر محنت کی تھی، وہ سرکش نہیں تو کم از کم منحرف ضرور ہو رہا ہے، اس سے انھیں جو مایوسی ہوتی، اس کا دھچکا میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وجہ بہرحال کچھ بھی ہو، میں نے اس چنگاری کو اپنے سینے میں دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا، تا آنکہ مجھے بسلسلہ ملازمت لاہور آنا پڑا۔ یہ تبدیلی، میرے حق میں آیۂ رحمت ثابت ہوئی، اس سے میری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ [1]

تقلیدِ اعمٰی کے بعد تجدیدِ ایمان

پرویز صاحب، اپنی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں جن کی نمایاں خصوصیات تقلید، تنقید اور تجدید ایمان ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ:

میری زندگی کا پہلا تہائی حصہ، اندھی عقیدت کا تھا، اس زمانے میں، میں بھی اسی قسم کی باتیں، محض تقلیداً کرتا تھا، اس کے بعد، میری زندگی کا تنقیدی دور آیا جس میں اندھی عقیدت کا تراشیدہ ایک ایک بت پاش پاش ہو کر رہ گیا، یہ لَا کا دور تھا جس میں ہر اس عقیدے کی نفی ہوتی چلی گئی جسے بلا سوچے سمجھے اختیار کر رکھا تھا، اور اس کے بعد، میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا جس میں مَیں نے جس عقیدہ کو بھی مانا، علی وجہ البصیرت مانا، اس طرح، یوں کہیے کہ قرآن عظیم کی صداقتوں پر از سرِ نو ایمان لایا۔ [2]

۱۹۰۳ء میں متولد ہونے والے پرویز صاحب ۱۹۷۳ء میں (جبکہ وہ اپنی زندگی کے ان ادوار ثلاثہ کا ذکر کر رہے تھے) ستر سال کے تھے، اس عمر کا پہلا تہائی حصہ (جو ۲۳ یا ۲۴ سال پر محیط ہے) اندھی تقلید میں گزرا ہے، جس کا معنٰی یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء کے بعد، وہ ''اندھے مقلد'' نہ رہے تھے، اور یہی وہ دور ہے جس میں انھیں سرکاری ملازمت مل چکی تھی۔

سرکاری ملازمت

پرویز صاحب نے اپنی سرکاری ملازمت کے آغاز کی صحیح تاریخ کہیں پیش نہیں کی۔ تاہم ان کے بعض اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۲۲ء کے قریب سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ مثلاً ان کا وہ اقتباس، جس میں وہ ذکر کرتے ہیں کہ امور شریعت اور تصوف وطریقت کے بارے میں، وہ اپنے قلب و ذہن میں شکوک وشبہات کی بناء پر، مبتلائے کشمکش تھے، مگر وہ کھل کر، اپنے داداجان سے، اپنی قلبی کیفیت بیان کرڈالنے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے، آخر کیوں؟ وہ لکھتے ہیں۔

وجہ، بہرحال، کچھ بھی ہو، میں نے اس چنگاری کو اپنے سینے میں دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا، تا آنکہ مجھے بسلسلہ ملازمت لاہور آنا پڑا، یہ تبدیلی میرے حق میں آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔ اس سے میری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔

جب میں لاہور آنے لگا تو داداجانؒ نے مجھے (لاہور میں) دو ''بزرگوں'' سے ملنے کی تاکید فرمائی۔ ایک امام الدین نجار، جو

---

[1] تصوف کی حقیقت، صفحہ ق [2] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۰

نواں کوٹ کے گاؤں میں رہتے تھے (اور کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں)، اور دوسرے علامہ اقبالؒ۔ جن سے انھوں نے مجھے ذہنی طور پر پہلے متعارف کرا رکھا تھا۔ اول الذکر بزرگوار سے تو میں ایک آدھ مرتبہ ہی ملا، لیکن حضرت علامہؒ کی خدمت میں باریابی کے مواقع زیادہ حاصل ہوئے، اب جو اس زمانے میں، ان کی خدمت میں حاضری کی جرأت پر نگہ بازگشت ڈالتا ہوں (یہ آج سے قریب ساٹھ سال پہلے کی بات ہے) تو دل ہی دل میں مجوب ہو جاتا ہوں۔ کہاں علامہؒ اقبال اور کہاں ایک اٹھارہ بیس سال کا نو وارد، گمنام سا طالب علم! چہ نسبت خاک را با عالم پاک! [1]

بسلسلۂ ملازمت، لاہور آنے پر، جناب پرویز صاحب کا اٹھارہ بیس سال کی عمر میں، علامہ اقبالؒ سے ملاقات کرنے کا معنٰی یہ ہے کہ وہ (۱۹۰۳ء+۱۸ یا ۲۰ سال) ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۳ء میں برسر ملازمت تھے، لیکن طلوع اسلام، مارچ اپریل، ۱۹۸۹ء کے آخری صفحہ پر، ان کے آغاز ملازمت کا سال، ۱۹۲۷ء قرار دیا گیا ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب**۔ اپنی ملازمت کے دوران، وہ، لاہور کے علاوہ، دہلی اور شملہ میں بھی سکونت پذیر رہے ہیں جیسا کہ ان کی مختلف نگارشات سے واضح ہوتا ہے۔

دوران ملازمت، تین اہم واقعات

یہ ایک حقیقت ہے کہ پرویز صاحب، اپنی ملازمت کے آغاز سے قدرے قبل، یا قدرے بعد، جن شکوک وشبہات کا شکار تھے، تقریباً ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء تک وہ زائل ہو چکے تھے۔ اب ان کا ذہن، حدیثِ نبوی سے منقطع ہو کر، فرقہ اہل قرآن سے وابستہ ہو چکا تھا۔ صرف اور صرف قرآن کی بنیاد پر، انسائیکلو پیڈیا لکھنے کا جو منصوبہ، پرویز صاحب کے پیشِ نظر تھا، اس کی پہلی کڑی...... معارف القرآن جلد اول...... کا آغاز ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا، جیسا کہ درجِ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

جناب پرویز صاحب نے سلسلہ معارف القرآن کی ابتداء، ۱۹۲۸ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا ''اللہ'' جو بعد میں ''من ویزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ [2]

اس کتاب کو ''قرآن وسنت'' کی بجائے، صرف ''خالص'' قرآن کی اساس پر تصنیف کیا جا رہا تھا۔ خود پرویز صاحب فرماتے ہیں:

معارف القرآن میں وہی کچھ لکھا گیا ہے، جو میں نے خالص قرآن کریم سے سمجھا ہے کہ یہی اصول، اس کتاب کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ [3]

اس حقیقت پر (کہ ۱۹۲۸ء تک وہ سنت نبویؐ سے کٹ کر، محض قرآن ہی کی حجت پر قائم ہو چکے تھے) ان کا یہ اقتباس بھی شاہد ہے:

مہ وسال کے شمار سے، میں، ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو، اپنی عمر رواں کے پچھتر (۷۵) سال پورے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں تھا جس کا خصوصیت کے ساتھ، طلوع اسلام کے صفحات پر ذکر کیا جاتا۔ قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں پچاس سال پورے کر رہا ہوں۔ عام اصطلاح میں اسے گولڈن جوبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ [4]

---

[1] تصوف کی حقیقت، رہ ورسم منزلہا، صفحہ ق [2] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۴

[3] معارف القرآن، جلد ۱، تعارف، صفحہ ۵۳ [4] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۶

اس سے یہ قطعی واضح ہے کہ ۱۹۷۸ء سے پچاس سال قبل، یعنی ۱۹۲۸ء میں، وہ سنت نبویہ سے دامن کش ہو کر، صرف قرآن ہی کی حجیت اور سندیت کے معتقد ہو چکے تھے، اور وہ فرقہ اہل قرآن سے وابستہ ہو کر، ''قرآنی ذہن'' بن چکے تھے، لیکن اپنے ضمیر کے خلاف، اپنے مقالات و مضامین میں، وہ مصلحتاً، قرآن کریم کے ساتھ، سنتِ رسولؐ اور اسوۂ نبی کا ذکر کرنے پر مجبور تھے، جیسا کہ درج ذیل اقتباسات سے واضح ہے۔

۱- طلوع اسلام کا نصب العین، ان تمام سوالات کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔ ۱

۲- ہمارا دعویٰ ہے اور علی وجہ البصیرت یہ دعویٰ ہے کہ قرآن و حدیث و آثار و تاریخ میں کہیں ایک سند بھی اس چیز کے اثبات میں نہیں ملے گی کہ مسلمانوں نے غیر قوموں سے انفرادی طور پر، دوستی اور تولّی کے تعلقات قائم کیے ہوں، اگر کسی کو اس میں شک ہو تو اپنے دعوے کے اثبات میں کوئی ایک سند پیش کرے۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۲

۳- کتاب و سنت کی ان تصریحات کو سامنے رکھئے، اور پھر دیکھئے کہ اگر مسٹر جناح یا کوئی اور مسلمان یہ کہہ دے کہ

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحادِ عمل کی صرف یہی صورت ہے کہ ان دونوں کے درمیان من حیث الجماعت معاہدہ ہو اور

(۲) ایک فریق کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے، اور دوسرے فریق کو غیر مسلموں کی نمائندہ جماعت۔

تو کہیے، اس نے کون سا جرم کر دیا؟ ۳

۴- ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ کتاب سنت کی رو سے صرف یہی راستہ صراط مستقیم ہے، اس دعویٰ کے ثبوت میں طلوع اسلام، قرآن و سنت برابر پیش کر رہا ہے، جو قومیت پرست مسلمان، اس مسلک کو غلط سمجھتے ہیں، وہ خدارا، قرآن و سنت سے اپنے دعوے کے اثبات میں کوئی دلیل پیش کریں۔ ۴

۵- ایک صاحب فرماتے ہیں کہ:

طلوع اسلام کا مسلک جمہور کا مسلک ہے لیکن چونکہ یہ ضرور نہیں کہ جمہور کا مسلک ہمیشہ حق و عدل کا مسلک ہو، اس لیے طلوع اسلام کا مسلک غلط ہے۔

لیکن ان کے ہم مشرب، دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ:

طلوع اسلام کا مسلک، جمہور کا مسلک نہیں ہے، اور چونکہ صحیح مسلک جمہور کا ہوتا ہے، اس لیے طلوع اسلام کا مسلک صحیح نہیں۔

حالانکہ طلوع اسلام کا مسلک، صرف کتاب و سنت کا مسلک ہے۔ ۵

۶- آیئے ہم بتائیں کہ حصولِ آزادی کے متعلق، کتاب و سنت کی رو سے مسلمانوں کا مسلک کیا ہو سکتا ہے، یہ وہ مسلک ہے جس کے ہم مدعی ہیں اور علی وجہ البصیرت مدعی ہیں۔ ۶

اور بعض اوقات، سنت کی بجائے ''اسوۂ رسول'' کی ترکیب بھی استعمال کی جاتی تھی، اور اسے قرآن مجید کے بعد،

۱ طلوع اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۱۱
۲ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۹
۳ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۶۲
۴ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۹
۵ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۴
۶ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۷

دوسرا ماخذِ شریعت مانا جاتا تھا، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے عیاں ہے۔

اپنے ماحول کو مدنظر رکھ کر، قرآن واسوۂ حسنہ کی روشنی میں جو مسائل، انھوں نے مستنبط کیے تھے، آج کے ماحول کے مطابق، ویسے ہی دساتیر وقوانین آج بھی مرتب کیے جاسکتے ہیں، جن کا سرچشمہ، وہی اصولِ دین ہوں، وہی شمع ہدایت، ان کے لیے تھا وہی آج ہمارے لیے بھی ہوسکتا ہے، اس میں پھر ان کی تنکیر کیسی اور تنقیص کیا؟ [۱]

الغرض، اُن دنوں، پرویز صاحب کا تصورِ قرآن، (قطع نظر اس کے کہ ان کے دل میں کیا تھا) زبان وقلم کی حد تک، سنتِ رسولؐ اور اسوۂ نبیؐ سے منقطع نہ تھا، بلکہ وہ، قرآن کریم سے، اسوۂ رسولؐ کے انقطاع کو، فرقہ اہل قرآن کی ضلالت اور غوایت کا سبب کہا کرتے تھے۔ اُس وقت انھوں نے کبھی یہ نظریہ پیش نہیں کیا تھا کہ سنتِ رسول اور اسوۂ نبی، سب کچھ، قرآن ہی میں ہے، خارج از قرآن نہیں، چنانچہ وہ فرقہ اہلِ قرآن کی ضلالت کو، بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے۔

جو اہل قرآن ہونے کے مدعی ہیں، وہ قرآن ورسول کے باہمی تعلق سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے قرآن سے بہت دور پڑے ہوئے ہیں، لہذا تمسک بالکتاب، کسی گروہ بندی سے حاصل نہیں ہوگا، اس کے لیے تو ضرورت ہے کہ تمام انسانی مرکزوں سے منہ موڑ کر، احکام قرآنی کو، اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے واجب الاتباع سمجھا جائے۔ [۲]

بہر حال، قرآن وسنت رسول کو ناقابل انقطاع قرار دینا، اور ''احکام قرآنی کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے واجب الاتباع سمجھنا'' اور کتاب وسنت یا قرآن واسوہ حسنہ، دونوں کو اسلاف صالحین کی طرح، ادلۂ شرعیہ یا ماخذِ قانونِ اسلامی قرار دینا، ''تقلیدی دور ہی کے وہ عقائد'' ہیں جو، صرف اس لیے (۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء کے بعد) اپنے ضمیر کے خلاف، پرویز صاحب پیش کرتے رہے تھے کہ امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ کی حمایت وہمنوائی کی آڑ میں، اپنے اعتماد ووثوق کی ایک فضا پیدا کی جائے، تاکہ اُسے اپنے حصولِ مفاد کے لیے بطور زینہ استعمال کیا جاسکے۔ اُس دور میں، وہ پکے، پختہ اور کٹڑ ''قرآنی'' ہونے کے باوجود بھی، سنت رسولؐ اور اسوۂ نبیؐ کا نام لینے پر مجبور تھے، بالکل اسی طرح جس طرح عہدِ نبوی کے منافقین، اہلِ ایمان کے ہاں خود کو مسلمان باور کروانے کے لیے، چارو ناچار نماز باجماعت کی حاضری پر مجبور تھے۔ جو کچھ پرویز صاحب کے دل میں تھا، اسے وہ اپنی زبان پر لانے سے گریزاں تھے اور جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہے تھے وہ ان کے مافی الضمیر کے خلاف تھا، وہ اپنی تقریر وتحریر میں انتہائی محتاط تھے کہ مبادا، ان کی زبان سے بیساختہ یا ارتجالاً اصل قلبی معتقدات ظاہر ہو جائیں، لیکن اس شدت احتیاط کے باوجود، کبھی حزم واحتیاط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ بھی جایا کرتا تھا۔

(الف) جمعہ کا خطبہ، پرویز اور چپڑاسی کی غیرتِ ایمانی

اس کی بہترین مثال، دہلی سیکرٹریٹ کی مسجد میں، پرویز صاحب کے خطبۂ جمعہ کا وہ واقعہ ہے جس میں جوش خطابت

---

[۱] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۲۴

[۲] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۲۵،۲۶

میں، وہ اپنے ہوش پر قابو نہ رکھ سکے اور اپنے باطنی اور منحرف خیالات کو بھی پیش کرنا شروع کر دیا۔

تحریر کے ساتھ، پرویز صاحب، جمعہ کے خطبہ میں بھی اپنے بدلتے ہوئے خیالات کو پیش کرنے لگے۔ شروع شروع میں یہ باتیں، استعاروں اور کنایوں میں پیش کی گئیں، پھر استعارات و کنایات کے پردے بھی اٹھنے لگے۔ سیکریٹریٹ کے لکھے پڑھے لوگ تو سوچتے ہی رہے کہ اس فتنہ کو کس مصلحت اور حکمت کے ساتھ بند کیا جائے، مگر موسیٰ نام کے ایک چپڑاسی نے جرأت کر کے مداخلت کی اور پرویز صاحب کو سختی کے ساتھ ٹوکا۔ بس اس دن کے بعد، پھر دہلی سیکریٹریٹ کی مسجد میں، پرویز صاحب خطبہ نہ دے سکے اور ایک غیرت مند چپڑاسی کی جرأت نے اس فتنہ کا سد باب کر دیا۔ [۱]

(ب) اسلم جیراجپوری سے تعلق

دورانِ ملازمت، حیاتِ پرویز کا دوسرا اہم واقعہ، اسلم جیراجپوری سے ان کی پہلی ملاقات اور پھر مستقل تعلقاتِ باہمی کا استوار ہونا ہے۔ وہ اپنے زمانے میں، منکرینِ حدیث میں سے ایک معروف شخصیت تھے۔ پرویز صاحب، ان سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ، بایں الفاظ کرتے ہیں۔

غالباً ۳۱-۱۹۳۰ء کا ذکر ہے، میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے متعلق، ایک مضمون دیکھا، اس کا بیشتر حصہ، خود میرے خیالات کا ترجمان تھا لیکن بعض مقامات ایسے بھی تھے جن میں مجھے کچھ تردد بھی تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس موضوع پر، اس قسم کا مضمون دیکھا، سلجھی ہوئی عبارت، خیالات صاف اور واضح، سادہ انداز اور الفاظ کم از کم، لیکن ہر لفظ اپنے مقام پر منتخب محکم اور بخود خزیدہ، دلائل دلکش، تبحر عالمانہ، لیکن اسلوبِ بحث طالبعلمانہ، سب سے بڑی بات، یہ کہ ہر دعوے کی تائید قرآن سے۔ [۲]

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ ۳۱-۱۹۳۰ء تک پرویز صاحب، اپنے ذہن کو کچھ واضح افکار و نظریات کی آماجگاہ بنا چکے تھے، اور یہ مضمون ایسا تھا کہ بقولِ پرویز صاحب ''اس کا بیشتر حصہ، خود میرے خیالات کا ترجمان تھا''۔ نیز اس مضمون کی تعریف میں، ان کا یہ کہنا کہ ''سب سے بڑی بات، یہ کہ ہر دعوے کی تائید قرآن سے''، خود اس بات کی دلیل ہے کہ فکری طور پر، وہ اپنے رسول کی سنت اور اسوۂ حسنہ سے اپنا تعلق توڑ چکے تھے، اور ان کا ذہن، اب ''قرآنی ذہن'' تھا، یعنی قرآن بلا محمدؐ، کتاب بغیر رسولؐ اور کلام اللہ بدونِ تشریحِ رسولؐ کا مسلک، وہ، اُس وقت، اپنا چکے تھے۔ اسی مضمون کے تسلسل میں، پرویز صاحب، فرماتے ہیں۔

مضمون پڑھنے کے ساتھ ہی، صاحبِ مضمون سے ملنے کا شوق، دل میں ابھرا، اسی وقت خط لکھا اور تیسرے ہی دن (ایک دوست کی زبانی) اس کا جواب آ گیا، چنانچہ اتوار کے دن، دوپہر کے وقت، قرول باغ پہنچا۔ قرول باغ اس زمانہ میں چھوٹی سی بستی تھی اور زیادہ تر جامعہ ملیہ کی وجہ سے مشہور، چنانچہ وہاں ''چھتر والے کنوئیں'' کو تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی، مکان پر پہنچا، دستک دی، دروازہ کھلا تو خود صاحبِ خانہ (اور صاحبِ مضمون) میرے سامنے تھے۔ [۳]

---

[۱] ماہنامہ فاران (کراچی)، اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵ [۲] + [۳] طلوعِ اسلام، ۷ جنوری ۱۹۵۶ء، صفحہ ۷

اس وقت، پرویز صاحب کی عمر کیا تھی؟ وہ خود فرماتے ہیں

میں اس وقت ۲۶، ۲۷ برس کا تھا۔ ۱؎

اور اسی ملاقات کے متعلق، پرویز صاحب، یہ بھی لکھتے ہیں کہ

یہ تھی علامہ اسلم جیراجپوری (مدظلہ) سے میری پہلی ملاقات۔ ۲؎

اب یہ بات، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ پرویز صاحب نے اپنی اس ملاقات کو، جو ۳۱-۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی، اپنی پہلی ملاقات، قرار دیکر، محض لغزشِ قلم کا ارتکاب کیا ہے، یا وہ سہو ونسیان کا شکار ہوئے ہیں، یا کسی دروغِ مصلحت آمیز سے کام لیا ہے؟ کیونکہ ۱۹۳۱ء بلکہ ۱۹۳۰ء سے بھی پہلے، ۱۹۲۹ء کا یہ واقعہ بھی وہ خود بیان فرماتے ہیں، کہ

۱۹۲۹ء کی بات ہے، غیر منقسم ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز کے ہندو ممبر (مسٹر ساردا) نے ایک بل پیش کیا، جس کی رو سے نابالغ لڑکے کی شادی کو ممنوع قرار دیے جانے کی تجویز تھی، اس کے خلاف، ہندوؤں کے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی، لیکن سب سے شدید مخالفت ہمارے ''علمائے کرام'' کی طرف سے ہوئی۔ اس درجہ شدید کہ اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی، اس تحریک کا مرکز، دہلی میں قرول باغ کا علاقہ تھا، وہاں طے یہ ہوا کہ علماء کا ایک وفد وائسرائے کے حضور پیش ہو، اور اسے بتائے کہ اگر اس قانون کا اطلاق، مسلمانوں پر کیا گیا تو یہ ان کے نزدیک مداخلت فی الدین ہوگا۔ اور اس کے خلاف ملک میں کہرام مچ جائے گا، مجھے وہ واقعہ کبھی نہیں بھولتا جب یہ حضرات ایک وفد کی شکل میں وائسریگل لاج جا رہے تھے۔ اس میں قریب قریب تمام فرقوں کے علماء حضرات شامل تھے۔ میں استاذ المکرم علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) کے پاس بیٹھا تھا۔ ۳؎

کچھ سمجھے آپ، کہ پرویز صاحب کی ''پہلی ملاقات'' تو اسلم جیراجپوری سے ۳۱-۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی، لیکن ۱۹۲۹ء میں بھی، وہ، ان کے ساتھ، ان کے مکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید اسی تضاد کو محسوس کرتے ہوئے، اپنی پہلی ملاقات میں ''غالباً'' کے لفظ کا اضافہ کرتے ہوئے، انھیں یہ کہنا پڑا، کہ ''غالباً ۳۱-۱۹۳۰ء کا ذکر ہے''۔

(ج) اسلم جیراجپوری سے تلمیذانہ استفادہ

اپنی اسی ''پہلی ملاقات'' کے ضمن میں، پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں ناپختگی محسوس کیا کرتا تھا، میں نے چاہا کہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاؤں، اور عند الفرصت مولانا سے یہ کتابیں، از سر نو پڑھ لوں، چنانچہ غالباً ۱۹۳۵ء میں، میں نے اس کے متعلق مولانا سے ذکر کیا اور وہ اس کے لیے بخوشی راضی ہو گئے، چنانچہ میں شملہ سے تنہا دہلی آ گیا، اور چونکہ مولانا بھی، اس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے، اس لیے فیصلہ یہی ہوا کہ میں انھی کے ساتھ رہوں۔ یہ چھ ماہ کا عرصہ، میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے تھا۔ میں آیا تو تھا، عربی ادب کی ناپختگی دور کرنے کے لیے، لیکن [وہ جو کہتے ہیں کہ...... آگ لینے کو جائیں، پیمبری مل جائے ......] ہمارا بیشتر حصہ، قرآن کے

۱؎ + ۲؎ طلوعِ اسلام، ۷ جنوری ۱۹۵۶ء، صفحہ ۷ ۳؎ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۳۳۷

رموز و غوامض پر بحث و تحقیق میں گزرتا۔ [1]

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عربی ادب میں ناپختگی کو دور کرنا ہی مقصود تھا تو اس کے لیے، دہلی میں اسلم جیراجپوری سے کہیں بڑھ کر ہستیاں موجود تھیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا تھا، مثلاً

> عربی دانی کے لیے، وہ مولانا عبدالسلام نیازی کی صحبت سے فیض اٹھا سکتے تھے .... اسی دلی میں مولانا محمد ایوب صاحب جیسے فاضل روزگار عالم بھی تھے، جن کے درس و وعظ میں نازک و غامض دینی اور کلامی مسائل کی گرہیں کھلتی ہیں، سب سے زیادہ معروف شخصیت مولانا کفایت اللہ مرحوم کی تھی جن کے علم و فضل اور صالحیت و تقویٰ کی قسم کھائی جا سکتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے جن کو دیکھ کر، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوتی تھی .... ان تمام اربابِ کمال کو نظر انداز کر کے، پرویز صاحب کی نگاہِ انتخاب پڑی تھی تو کس پر، مولانا اسلم جیراجپوری پر، جو عبداللہ چکڑالوی کے "مسلک انکار حدیث" کا بوریا سنبھالے بیٹھے تھے .... لیکن اس قسم کے حق پسند علماء کو چھوڑ کر، پرویز صاحب نے مولانا اسلم جیراجپوری کی راہنمائی اور قیادت کو قبول کیا۔
>
> پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا [2]

بہر حال، عربی زبان و ادب میں ماہر، مشاق اور طاق، ان اربابِ فضل و کمال کو چھوڑ کر، اسلم جیراجپوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ مسلک انکارِ حدیث کے حوالہ سے دونوں افراد (استاد اور شاگرد) تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ کے رشتہ میں منسلک تھے۔

قلب و زبان کی عدم رفاقت

یہاں یہ بات، پیش نظر رہنی چاہیے کہ اگرچہ اسلم جیراجپوری سے پرویز صاحب کی پہلی ملاقات سے قبل بھی اور اس کے بعد بھی، سنتِ رسول ﷺ سے اپنا اعتقادی رشتہ توڑ چکے تھے، لیکن وہ اپنے قلم اور زبان سے مصلحتاً، ان ہی خیالات و نظریات کا اظہار کرنے پر مجبور تھے، جو ملتِ اسلامیہ میں مقبولِ عام تھے، حتیٰ کہ اسی ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے کہ اعظم گڑھ (بھارت) سے، سید سلیمان ندوی کی زیر سرپرستی، شائع ہونے والے رسالہ معارف کے مارچ اور اپریل کے شماروں میں، پرویز صاحب نے منکرینِ حدیث کی تردید و ابطال میں، حدیثِ نبوی ﷺ کی دینی حیثیت کا پُرزور اثبات کیا تھا، یہ بالکل وہی ٹیکنیک تھی، جو دعوائے نبوت سے قبل، مرزا غلام احمد نے اختیار کی تھی، بقول طلوعِ اسلام

> مرزا غلام احمد، ایک مناظر کی حیثیت سے قوم کے سامنے آئے اور بہت مقبول ہو گئے، انھی موضوعات پر، انھوں نے اپنی کتاب "براہینِ احمدیہ" شائع کی جسے مسلمانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ [3]

---

[1] طلوعِ اسلام، ۷ جنوری ۱۹۵۶ء، صفحہ ۷

[2] قرآن کی معنوی تحریف، قرآن کے نام پر، (از ڈاکٹر مظفر احمد) صفحہ ۸۱-۸۲

[3] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۴ء، صفحہ ۳۴

بالکل اسی طرح جناب غلام احمد پرویز صاحب بھی، منکرینِ حدیث کے خلاف، حامیٔ حدیث اور مدافعِ سنت ہونے کی حیثیت سے نمودار ہوئے، ان دنوں، ماہنامہ نگار کے نیاز فتحپوری صاحب، وہی کچھ کہہ رہے تھے جو بعد میں پرویز صاحب کا مستقل تکیۂ کلام بنا رہا، لیکن اُس دور میں، وہ، نگار میں شائع ہونے والی تحریروں کے خلاف، خود مقالات و مضامین لکھا کرتے تھے، جو مختلف جرائد میں اشاعت پذیر ہوتے تھے، حالانکہ وہ اس وقت بھی ذہناً سنت نبویہ سے منحرف اور حدیثِ رسول کے خلاف تھے، لیکن بہرحال، مسلمانوں میں، اپنی ہردلعزیزی پیدا کرنے اور ان کی نگاہوں میں حامیٔ حدیث اور معتقدِ سنت قرار پانے کے لیے مجبور تھے کہ منکرین حدیث کی تردید و ابطال کرتے رہیں، ان کا یہ رویہ طلوعِ اسلام کے اجراء تک ہی نہیں، بلکہ خود طلوعِ اسلام میں بھی ایک مدت تک باقی رہا ہے، اور مسلکِ انکارِ حدیث کا دم بھرنے سے ایک عرصہ قبل تک، وہ معتقدِ سنت اور حامیٔ حدیث بنکر اُسی طرح مسلمانوں میں اپنی مقبولیت میں اضافہ کرتے رہے ہیں جس طرح مرزا غلام احمد، انکارِ ختمِ نبوت کا عقیدہ اپنانے سے قبل، ختم نبوت کے اجماعی عقیدہ کو پیش کرتے ہوئے مقبول عام بنے رہے تھے، اس سلسلہ میں، چند اقتباسات پہلے پیش کیے جا چکے ہیں، چند مزید اقتباسات یہ ہیں۔

۱- جب تک مسلمان اپنے مذہب کے پابند ہیں، ان کے باہمی معاملات کا تصفیہ، از روئے کتاب و سنت صرف مسلمانوں کی جماعت، ان کی اپنی مجلس شوریٰ، اور اس مجلس کا امیر مرکز ملت ہی کرسکتا ہے۔ [۱]

۲- جناب رازی، مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں کس حسن و خوبی سے حل کرتے ہیں! [۲]

۳- پرچہ (طلوعِ اسلام) کے مقاصد کے متعلق، اعلان کیا گیا تھا کہ اس کا مسلک، حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے نورِ بصیرت کو عام کرنا۔ یعنی مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ سے متعلق، ہر مسئلہ کا حل، کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرنا ہوگا۔ [۳]

۴- اس مسئلہ (یعنی مسئلہ قومیت) کے متعلق مولانا (مودودی) صاحب کا مسلک وہی ہے جس کی تائید، کتاب و سنت سے ہوتی ہے، اور جس کی اشاعت کی سعادت طلوعِ اسلام کو بھی حاصل ہے۔ [۴]

۵- ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اور ان جیسے دوسرے سوشلسٹ حضرات کی واقفیت کے لیے سوشلسٹ مفکرین کے اقوال و کتب کے حوالوں سے بتائیں کہ سوشلزم کیا ہے، اور اس کے بعد ان حضرات کے لیے جو یہ معلوم کرنے کی تمنا رکھتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک، اس نظام زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے، یہ عرض کریں کہ کتاب و سنت کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم [۵]

۶- جس طرح اشتراکیت کے تعارف میں ان ہی اصولوں کو معتبر سمجھا گیا ہے جو مدعیانِ تحریک کے نزدیک مستند ہیں اور ان

---

[۱] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۸

[۲] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۳۹ء، صفحہ ۹۴

[۳] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، صفحہ ۴

[۴] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۴

[۵] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۳۴

کے ماوراء فروعات یا ذاتی قیاسات کو اہمیت نہیں دی گئی، اسی طرح اسلامی تعلیم کو پیش کرتے وقت صرف قرآن کریم کی نصوص صریحہ اور سنت نبوی کی حکمت بالغہ کو ہی سامنے رکھا جائے گا۔ ۱

۷-۸- ادارہ طلوع اسلام کے شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ طلب فرمائیے اور ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں سیاستِ حاضرہ کے اہم مسائل کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں کس حسن وخوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ ۲ + ۳

۹- مسلم لیگ ابھی بمشکل چند قدم چل سکی ہے کہ اس کے اندر بھی ان خطرات کے آثار شروع ہو گئے ہیں جو بڑی بڑی منظم جماعتوں کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں، چونکہ ہماری سیاست کا ماخذ، کتاب وسنت کی بجائے دساتیرِ افرنگ ہیں، اس لیے ان کی دیکھا دیکھی لیگ میں بھی دائیں اور بائیں بازو کا شاخسانہ چھڑتا نظر آ رہا ہے۔ ۴

۱۰- قومیت پرست علماء کے پورے گروہ کو ہم چیلنج دیتے ہیں کہ کتاب وسنت وآثار سے کوئی ایک سند ایسی پیش کریں جس کی رو سے اسلام، اپنے متبعین کے لیے، اس قسم کے نظامِ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام، آزادی قرار دیتا ہو، ۵

۱۱- یہ نظام جیسا کہ کتاب وسنت وآثار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، نہ تو خالصۃً جمہوریت ہے، نہ آمریت بلکہ ان کو سمویا ہوا سا ہے، یعنی اس کی خوبیاں اس نظام میں موجود ہیں، اور ان کی برائیوں سے یہ منزہ ہے۔ صحیح جمہوریت اور آزادی کے لیے مساوات اور اخوت مقدم ہے، اور مساوات اور اخوت، اسلام کی روح ہے۔ ۶

۱۲- حیرت ہے کہ یہ حضرات اگر کتاب وسنت کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں تو کیا روزمرہ کے واقعات بھی ان کے سامنے نہیں آتے۔ ۷

مشتے نمونہ از خروارے، یہ چند اقتباسات ہیں، جن میں قرآن کے ساتھ سنتِ رسول کو بھی، قوانینِ اسلام اور احکامِ دین کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ اقتباسات بھی طلوع اسلام کے (۳۹-۱۹۳۸ء کے) بالکل ابتدائی شماروں سے لیے گئے ہیں (اس سے قبل، اسی ضمن میں، جو سات عبارتیں پیش کی گئی ہیں وہ ۱۹۳۸ء کے پرچوں سے ماخوذ ہیں، جبکہ مندرجہ بالا اقتباسات ۱۹۳۹ء کے شماروں سے پیش کیے گئے ہیں)، ان سب حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنت کے متعلق، پرویز صاحب کے دل میں خواہ کچھ بھی ہو مگر ان کا قلم، اس وقت بھی، قرآن وسنت ہی کا قائل، حامی اور مؤید تھا، لیکن پھر جوں جوں، طلوع اسلام کا حلقۂ قارئین بڑھتا چلا گیا، اور پرویز صاحب، قرآن کے ساتھ، سنت کا بالالتزام نام لیتے لیتے ''پاپولر'' بنتے گئے، تو پھر آہستہ آہستہ، انھوں نے اپنا نقاب الٹنا شروع کیا، اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب وہ کھل کر، مسلک انکار حدیث کا دم بھرنے لگے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مرزا غلام احمد، ایک عرصہ تک اپنی خدماتِ اسلام کے ذریعہ، اہل اسلام کے قلوب میں، اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے، ختم نبوت کے عقیدے کا راگ الاپتے رہے، اور پھر یکا یک عقیدۂ ختم نبوت کو پسِ پشت ڈال کر، خود دعوائے نبوت پر اتر آئے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ غلام احمد قادیانی کے معاملہ میں، عقیدۂ ختم نبوت کے اقرار اور انکار کے

---

۱ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۷
۲ + ۳ طلوع اسلام، ستمبر+اکتوبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۲۴
۴ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۷۷
۵ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۴
۶ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۵
۷ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۱

درمیان کوئی ایسا ''عبوری دور'' نہیں ہے جس میں انھوں نے کسی لمبے چوڑے تدریجی عمل کو اختیار کرتے ہوئے، ایک عقیدہ کی جگہ، دوسرے عقیدہ کو اپنایا ہو مگر پرویز صاحب نے ایسا کرنے میں تدریج کو اختیار کیا جس میں ایک ایسا ''عبوری دور'' بھی گزرا ہے جو طالبعلمانہ انداز میں، حدیث وسنت کے بعض پہلوؤں پر، شکوک وشبہات کے اظہار کا دور تھا، اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اپنے رسالہ ترجمان القرآن کے ذریعہ، ایسے جملہ اوہام وشبہات کا کافی شافی اور اطمینان بخش ازالہ کر چکے تھے، جیسا کہ ڈاکٹر مفکر احمد صاحب کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

سب سے پہلے مسٹر پرویز نے بعض احادیث کے بارے میں اپنے شکوک وشبہات پیش کیے، ماہنامہ ترجمان القرآن میں، ان شبہات کا پوری طرح ازالہ کر دیا گیا۔ لیکن پرویز صاحب کے یہ شبہات، ایک جویائے حق اور مخلص قلب کی کھٹک نہ تھی جو افہام وتفہیم کے بعد دور ہو جاتی، ان کے یہ شکوک، ایک برخود غلط قلب کے شکوک تھے، جو رفتہ رفتہ شاخ درشاخ اور پختہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ ان کو سنتِ رسول سے عناد پیدا ہو گیا۔ [1]

بہرحال، پرویز صاحب، اپنے شکوک وشبہات کے اس سلسلہ کو طول دیتے ہوئے، تدریجاً انکارِ سنت کی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے، یہ عبوری دور اور اس سے قبل کا وہ زمانہ، جس میں پرویز صاحب، اعتقاد برحدیث ہی نہیں، بلکہ دفاعِ سنت کا بھی فریضہ ادا کرتے رہے ہیں، دراصل، ان کا وہ عہد زندگی ہے جس میں ان کی زبان، دل کی رفیق نہیں رہی تھی۔ اسلم جیراجپوری کی صحبت اختیار کرنے سے قبل ہی، وہ، ذہنی طور پر حدیث وسنت سے منحرف ہو چکے تھے، لیکن مسلم عوام میں ''پاپولیریٹی'' حاصل کرنے کی خاطر، وہ قرآن کے ساتھ، سنت کا نام لینے پر بھی مجبور تھے۔ تاہم انھوں نے اپنی آواز کو مسلسل لوگوں تک پہنچانے کے لیے، خود اپنا ایک ماہوار رسالہ ''طلوعِ اسلام'' کے نام سے نکالا۔

طلوعِ اسلام کا دورِ اجراء وانقطاع

طلوعِ اسلام کے اجراء کے دو دور ہیں، ایک دور وہ تھا جس میں یہ مجلّہ جناب نذیر نیازی کے زیر اہتمام جاری ہوا تھا، جبکہ دوسرا دور وہ تھا جب اس کا اجراء، جناب غلام احمد پرویز اور اُن کے رفقاء کے ہاتھوں ہوا۔

نیازی صاحب نے ''طلوعِ اسلام'' کے نام سے، ایک ماہوار مجلّہ، اکتوبر ۱۹۳۵ء میں، دہلی سے جاری کیا تھا، اس کے بعد وہ پرچہ لاہور میں منتقل ہو گیا، لیکن ۱۹۳۶ء میں، جبکہ اس کے کل چھ پرچے شائع ہوئے تھے وہ بند ہو گیا، موجودہ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۳۸ء میں، نئے انتظامات کے تابع شائع ہوا، اس کا سابقہ طلوعِ اسلام کے ساتھ (اشتراکِ رسمی ☆ کے علاوہ) کوئی تعلق نہیں تھا۔ نیازی صاحب نے اپنے شذرہ میں اس کی وضاحت فرمائی ہے، لیکن آخر میں لکھا ہے کہ:

یہ ایک جداگانہ اور نیا طلوعِ اسلام تھا، حضرتِ پرویز اور ان کی جماعت کے خیالات کا حامل یہ نیا ''طلوعِ اسلام'' بھی پیامِ اقبال کا ترجمان اور قرآنی تعلیم کا پیامبر تھا (اور ہے)۔ پرویز صاحب، اسی پیام اور تعلیم کی طرف دعوت

---

[1] قرآن کی معنوی تحریف، صفحہ ۸۲

☆ ''اشتراکِ اسمی''......قاسمی

دیتے ہیں۔ باقی رہی ''ان کی جماعت''، سوانھوں نے جماعت نہیں بنائی، وہ جماعت سازی کے خلاف ہیں۔
بہر حال، یہ بات ضمناً سامنے آ گئی تھی جس کی وضاحت ضروری سمجھی گئی۔ ۱؎

جملۂ معترضہ

اس اقتباس کے آخری حصہ میں، طلوعِ اسلام کو'' قرآنی تعلیم'' کا پیامبر بھی قرار دیا گیا ہے، لیکن طلوعِ اسلام کی ابتدائی فائل سے پیش کردہ اقتباسات سے یہ بات واضح ہے کہ اس وقت، پرویز صاحب کا تصورِ قرآن، سنتِ رسول سے منقطع نہ تھا جیسا کہ بعد میں قرار پایا۔ آج اگر وہ قرآن کی طرف دعوت دیتے ہیں تو یہ دعوت، اس دعوت سے کلی مغائرت رکھتی ہے جس میں قرآن کے ساتھ، بہر حال، سنتِ رسول اللہ بھی، قوانینِ اسلام اور احکامِ دین کا ماخذ قرار پائے ہوئے تھی۔ اس لیے'' قرآنی تعلیم'' کی طرف دعوت لفظاً تو صحیح ہے، لیکن معناً، دونوں ادوار میں سے، بہر حال، ایک دور کی دعوت غلط قرار پاتی ہے۔

اور دوسری بات جو اس اقتباس کے آخر میں واضح ہے وہ طلوعِ اسلام کی'' الفاظ کی ایسی تماشاگری'' (Jugglery of words) ہے جس کے پیچ وخم میں خود کو بھی، اور اپنے قارئین کو بھی الجھاتے ہوئے، یہ فرمایا گیا ہے کہ...... '' باقی رہی'' ان کی جماعت''، سوانھوں نے جماعت نہیں بنائی، وہ جماعت سازی کے خلاف ہیں'' ...... لیکن پرویز صاحب، ایک ایسا گروہ ضرور بنا دیتے ہیں جسے وہ'' جماعت'' کہنے کی بجائے'' بزمِ طلوعِ اسلام'' کہہ دیتے ہیں، آخر کیا نام کے بدل جانے سے، کسی شے کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ خود پرویز صاحب اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں۔

......لیکن نام بدل دینے سے کسی شے کی حقیقت اور ماہیت تو نہیں بدل جاتی۔ ۲؎

آمدم برسرِ مطلب

بہر حال، یہ ایک جملۂ معترضہ تھا جو ضمناً سامنے آ گیا۔ بات ہو رہی تھی طلوعِ اسلام کی، جو نئے انتظامات کے تحت، مئی ۱۹۳۸ء میں، اپنے پہلے شمارے کے ساتھ، اجراء پذیر ہوا، اور جس میں بالعموم، امتِ مسلمہ کے مسلّمہ عقائد وافکار کی مصلحتاً ہمنوائی اختیار کی گئی تھی۔ اس رسالہ کے اجراء کے ساتھ ہی، پرویز صاحب نے باضابطہ طور پر، صحافتی زندگی میں قدم رکھا، اس میں شک نہیں کہ ان کی تحریر میں شگفتگی، ادبی چاشنی اور نغمہ وشعر کی حلاوت بخوبی ہوتی ہے۔ ان کا اندازِ نگارش دلکش اور سحر آگیں ہوتا ہے۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو محض ادبی چٹخارے کی خاطر، ان کا لٹریچر پڑھنے لگے تو ان کی فکر سے بھی متاثر ہوتے رہے۔ بہر حال، مجھے کوششِ بسیار کے باوجود بھی یہ معلوم نہ ہو پایا کہ ان کا سب سے پہلا مقالہ (ان کے اپنے طلوعِ اسلام کے اجراء سے قبل) کب اور کس رسالے میں شائع ہوا، تاہم یہ امر واضح ہے کہ سید سلیمان ندوی کے رسالہ معارف، اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے مجلّہ ترجمان القرآن کے ذریعہ، ان کی نگارشات قارئین تک پہنچتی رہی ہیں۔ تحریر کی روانی، عبارت کی سلاست اور (اس دور کے)

۱؎ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۹ء، صفحہ ۵۱ ۲؎ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۳

خیالات کی نفاست کے باعث، ان کی پذیرائی بھی ہوتی رہی، پھر ان کا اپنا رسالہ "طلوع اسلام" مئی ۱۹۳۸ء سے لے کر، جون ۱۹۴۲ء تک، ان کی آواز کو عامۃ الناس تک پہنچانے کا ذریعہ بنتا رہا۔

قائد اعظم اور پرویز ...... باہمی تعلقات

اس دوران، آزادی کی تحریک نے زور پکڑنا شروع کیا، علماء کرام بھی تحریکِ آزادی میں دو گروہوں میں بٹ گئے، ایک گروہ، کانگرس کا ہمنوا تھا اور دوسرا مسلم لیگ کا حامی تھا جس کا نعرہ یہ تھا

پاکستان کا مطلب کیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ

مسلم لیگ کی قیادت، قائد اعظم محمد علی جناح کر رہے تھے جو مغربی دستور و قانون کے ماہر اور فرنگی بحر سیاست کے شناور تھے، وہ اگرچہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے، لیکن اسلام کے متعلق ان کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر تھا، ان کی ساری تعلیم و تربیت، مغربی خطوط پر ہوئی تھی، وہ خود اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے، کہ

> میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ [1]

اردو زبان کو، وہ، روانی سے بول بھی نہیں سکتے تھے، عربی زبان سے مطلق ناواقف تھے کہ براہ راست اسلام کے سرچشموں تک ان کی رسائی ہوتی، عربی زبان کے بعد، اسلامی تعلیمات کا دوسرا بڑا ذخیرہ فارسی زبان ہے، جس سے ان کی آگاہی اور واقفیت کی بھی کوئی دلیل فراہم نہیں ہو سکی، البتہ انگریزی زبان کو وہ خوب سمجھتے، جانتے، بولتے اور لکھتے تھے۔ قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کا جو مطالعہ بھی انھوں نے کیا تھا وہ اسی زبان کے ذریعہ، بالواسطہ مطالعہ تھا، پھر اس مطالعہ کی تفصیل بھی ناپید ہے کہ جن کتب اور تراجم قرآن کی بناء پر، انھوں نے اپنے طور پر کاوشِ مطالعہ کی تھی، وہ مسلمان علماء کی تصنیفات تھیں یا ان مستشرقین کی، جو اسلام کے بارے میں بہر حال صحیح نقطۂ نظر نہیں رکھتے، اور نہ ہی وہ اسلام کو اس کی اصل سپرٹ میں پیش کر سکتے ہیں۔ بہر حال اسلام کی بنیاد پر تحریکِ پاکستان کو مؤثر حیثیت دینے کے لیے اور پبلک کا سامنا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ نہ صرف اسلام کا نام لیا جائے، بلکہ اس کے بارے میں کچھ معلومات بھی بہم پہنچائی جائیں۔ یہ ہے وہ مقام، جہاں پرویز صاحب، ایک سرکاری ملازم ہونے کے ناطہ سے بھی اور "واقفِ اسلام" ہونے کی حیثیت سے بھی، قائد اعظم کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ تاکہ قائد اعظم کی (اسلامی سکالر ہونے کی حیثیت سے نہ سہی، لیکن) ان کی قائدانہ حیثیت سے قد آور شخصیت کے ساتھ، وہ، اس طرح وابستہ ہو جائیں کہ لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگ جائے، اور رفیقِ قائد اعظم ہونے کی حیثیت سے، انھیں بھی ایک پہچان اور مقام مل جائے۔ اس اعتبار سے، قائد اعظم کے ساتھ، ان کے ربط و تعلق کی کیا کیفیت تھی؟ پرویز صاحب، خود فرماتے ہیں:

> مجھے اس کی اجازت تھی کہ میں پہلے سے وقت لیے بغیر، ان کی فرصت کے اوقات میں حاضر ہو جایا کروں، میں جب بھی

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶

حاضر ہوتا، پیش آمدہ مسئلہ کے بعد، قرآن کریم کے کسی نہ کسی مقام پر بات شروع ہو جاتی۔ [1]

پرویز صاحب کو، قائداعظم کے ہاں، باریابی کا یہ موقع ملا تو ان کے قلب و زبان کا تضاد و تناقض، اس شکل میں ظاہر ہوا کہ وہ خود تو اپنے قلم اور زبان سے عامۃ المسلمین کو وعظ کرتے ہوئے، قرآن کے ساتھ سنت کا بھی ذکر کرتے رہے، لیکن قائد اعظم کو، وہ، جو اسلام سکھایا اور پڑھایا کرتے تھے، اس میں سنتِ رسول اور حدیث نبوی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا کرتے تھے، اور یوں وہ قائداعظم کے دل و دماغ میں اسلام کا واحد اور یکتا مصدر و ماخذ، جو پیش کرتے تھے، وہ صرف قرآن مجید تھا، یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے حوالے سے، ان کے اکثر و بیشتر اقتباسات، سنتِ نبوی اور حدیثِ رسول کے ذکر سے عاری، لیکن صرف قرآن ہی کی سندیت پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ ایسے ہی وہ اقتباسات ہیں جنھیں قیامِ پاکستان کے بعد، پرویز صاحب ...... ''قائداعظم کا تصورِ پاکستان ......'' کے زیرِ عنوان اپنے ''مخصوص'' مقاصد کے لیے عمر بھر استعمال کرتے رہے ہیں۔

تاہم مسلم لیگ میں شامل بعض دیگر علماء کے زیر اثر، قائداعظم کے منہ سے ایسے بیانات کا صدور بھی ہوا ہے جن میں قرآن مجید کے ساتھ، اسوۂ رسول کی متابعت کا ذکر ہے، جو علمی اعتبار سے بہر حال ''کتاب و سنت'' یا ''قرآن و حدیث'' ہی کا ہم معنٰی ہے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیے ان کا وہ بیان، جو انھوں نے ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو شاہی دربار بلوچستان میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

> میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات، اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبرؐ اسلام نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ [2]

بہر حال، پاکستان بن گیا، قائداعظم وفات پا چکے، تو پرویز صاحب نے قائداعظم کو اسلام کا عظیم سکالر، وسیع المطالعہ اور جید عالم دین'' ثابت'' کرنے کے لیے، یہ پراپیگنڈہ، خود بھی کیا اور بعض رفقاء سے بھی کرایا، کہ

> ۱- یہ درست ہے کہ قائداعظم کو فقہی موشگافیوں کا درک حاصل نہ تھا لیکن جہاں تک اسلام کی دینی عظمت و برتری کا تعلق ہے، انھوں نے اس کی روح تک کو سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ [3]
>
> ۲- اس شخص (قائداعظم) کے متعلق، جس کی قرآن حکیم کے حقائق پر غائر نگہی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ...... [4]
>
> ۳- قائداعظم کے متعلق میں جو کچھ عرض کرتا ہوں، وہ میری شنید نہیں، دید ہے۔ مجھے ان سے قریب دس سال تک ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ میرے اور ان کے درمیان وجہِ اشتراک، قرآن کریم تھا، میں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر شہادت دے سکتا ہوں کہ قرآنی حقائق اور دین کے اصول و اقدار، ان کے قلب کی گہرائیوں میں اترے ہوئے تھے۔ [5]

---

[1] طلوع اسلام، فروری ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۴
[2] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲۰
[3] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۲
[4] طلوع اسلام، اگست ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲۳
[5] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۰

پرویز صاحب کے ایک فکری ہمنوا (جو بظاہر ایک عالم دین اور خطیب مسجد تھے، لیکن بباطن منکر حدیث تھے)، یہ کہا کرتے تھے کہ

> میں نے سیاسی لیڈروں کو بھی دیکھا اور مذہبی راہنماؤں کو بھی، لیکن مجھے پوری زندگی میں، قائداعظم سے بڑھ کر، کوئی شخصیت متاثر نہ کرسکی، میں نے ہرایک کو ان سے کم تر پایا۔ بلندیٔ کردار کے اعتبار سے بھی، اور قرآنی بصیرت کے نہج سے بھی۔ [۱]

لیکن یہی قائداعظم، جنھوں نے ''فقہی موشگافیوں سے ناواقف ہو کر بھی، روحِ دین کو سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا'' اور جن کی ''قرآنِ حکیم کے حقائق پہ غائرنگہی'' پرویز صاحب کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت تھی، اور ''قرآنی حقائق اور دین کے اصول واقدار'' جن کے ''قلب کی گہرائیوں میں اترے ہوئے تھے'' اور جس سے ''قرآنی بصیرت کے نہج سے ہرایک کو کم تر پایا گیا'' اس کے ''قرآنی فہم اور اسلامی فراست'' کا یہ حال تھا کہ جونہی وہ پاکستان پہنچے تو ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء ہی کو یہ بیان دیکر ''دوقومی نظریہ'' کو پسِ پشت ڈال دیا کہ

> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیے کہ ایک وقت کے بعد، یہاں نہ ہندو ہندو رہے گا، اور نہ مسلمان، مسلمان۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں، کیونکہ وہ تو ہرفرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے، ایسا ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہوگا۔ [۲]

یہ الفاظ، اپنے معنٰی ومفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ اس بیان سے، اُس قائداعظم کا اسلام کے بارے میں تصور بھی واضح ہو جاتا ہے، جس نے ''اسلام کی روح کو سمجھنے کے لیے پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا''۔ یہ پاکستانی وطن پرستی پر مبنی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنانے کا وہی نظریہ ہے جس کا پرچار، قیامِ پاکستان سے قبل، کانگرس کے ہندو زعماء، متحدہ ہندوستان میں کررہے تھے، اور جس کی تردید کرتے ہوئے، مسلم لیگ نے، ہندوؤں سے مسلمانوں کے لیے جداگانہ قومیت کا اعلان کرکے پاکستان بنانے کا عزم کیا تھا، لیکن جب پاکستان بن گیا، تو یہ بیان دے کر، قائداعظم نے خود ''دوقومی نظریہ'' کی تردید کرڈالی، حالانکہ یہ اس نظریے کی عملی ترویج کا وقت تھا لیکن ؎

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام نے شاید قائداعظم کو معصوم عن الخطا شخصیت سمجھ رکھا ہے۔ اسی لیے ان کی اس کھلی ہوئی غلطی کو برملا غلطی کہنے کی بجائے، ایک سے ایک بڑھ کر ''مفکرانہ تاویلات'' پیش کرنے پر تل گئے، لیکن آخرکار، انھیں یہ کہنا ہی پڑا کہ

> ہمیں یہ اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف، شدتِ جذبات میں، الفاظ کے انتخاب میں کماحقہ احتیاط نہ برت سکے۔ [۳]

پھر وہی قائداعظم .... جن کی ''قرآن حکیم کے حقائق پر غائرنگہی'' کا ڈھنڈورا پیٹنے میں، پرویز صاحب، رطب اللسان رہا کرتے تھے، اور جن سے ''قرآنی بصیرت کے نہج سے'' طلوعِ اسلام نے ''ہرایک کو کم تر پایا'' ....

---

۱ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۸۳ء، صفحہ ۶۴ ۲ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲۶

۳ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲۸

اسلام اور ہندومت کے آمیزہ شدہ، اکبر کے دین الٰہی کو حق و باطل کی بھونڈی پیوند کاری قرار دینے کی بجائے، الٹا اسے اکبر کی ''رواداری پالیسی'' قرار دیتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ

> شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ، جس مذہبی رواداری کا اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا، وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہ تھا وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ [1]

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ۱۱ اگست ۱۹۴۸ء سے پہلے اور بعد کے، ان کے جملہ بیانات کو اگر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ پاکستان کو اسلامی مملکت ہی بنانا چاہتے تھے۔لیکن بہرحال، زیرِ بحث بیان میں، وہ، جو کچھ کہنا چاہتے تھے، اس کے لیے، وہ مناسب الفاظ کا انتخاب نہ کر پائے۔ اگر وہ، فی الواقع، (بقولِ پرویز صاحب) ''قرآن حکیم کے حقائق پر غائر نگہی'' کا وصف رکھتے ہوتے، اور انھوں نے ''فقہی موشگافیوں سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی، روحِ دین کو سمجھنے میں، پوری عرق ریزی سے کام لیا ہوتا'' اور'' قرآنی حقائق اور دین کے اصول و اقدار، ان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر چکے ہوتے'' اور حقیقتاً وہ ایسے ہی ہوتے کہ'' طلوعِ اسلام نے قرآنی بصیرت کی نہج سے ہر ایک کو، ان سے کمتر پایا تھا'' تو وہ کبھی ۱۱ اگست ۱۹۴۸ء کے بیان میں، نامناسب الفاظ اختیار نہ کرتے۔وہ، بہرحال کوئی عالمِ دین نہ تھے، اور نہ ہی انھیں اس کا کوئی دعویٰ تھا، ان کی یہ خوبی بہت بڑی فضیلت ہے کہ وہ ہندو کی مکارانہ سیاست اور انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کے باوجود، حصولِ پاکستان کے مقصد میں کامیاب رہے۔وہ ایک ماہر وکیل، کامیاب سیاست دان اور اعلیٰ درجے کے دیانتدار قائد تھے۔

مزاجِ پرویز کا ایک خاص پہلو

بعض انسانوں میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ محبت یا نفرت کے ہر دو جذبات سے مغلوب ہو کر افراط و تفریط کی انتہائی حدوں کو پہنچ جاتے ہیں، ایسے لوگ عقیدت و محبت میں کسی کی حمایت پر اتر آئیں تو حدِ اعتدال سے متجاوز ہو جاتے ہیں، نفرت و عداوت میں شدت پیدا ہوئی تو دوسری انتہاء کو لڑھک گئے، کسی سے خوش ہوئے تو اسے آسمان پر چڑھا دیا، بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثریٰ میں پھینک دیا۔ اگر ایک طرف، نھیں، کسی بخیل و کنجوس فرد کو حاتم طائی پر اور کسی بزدل ڈرپوک شخص کو رستم و اسفند یار پر فضیلت دینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تو دوسری طرف کسی سے رنج پہنچ جائے تو اس کی پاکیزہ زندگی پر دھبہ لگانے، اس کی عزت پر خاک ڈالنے اور اس کے حسب نسب پر طعن کرنے میں بھی ذرا شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اپنی ممدوح شخصیت میں، انھیں، وہ خوبیاں نظر آتی ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا، لیکن اپنی مبغوض ہستی کے کمالات و فضائل بھی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب، ایک ایسے ہی غیر متوازن، افراط و تفریط کا شکار جذباتی انسان تھے۔انھیں اگر ایک طرف، قائد اعظم کی ذات میں یہ فرضی اور خود ساختہ خوبیاں دکھائی دیتی ہیں کہ انھوں نے'' اسلام کی روح کو سمجھنے کے لیے پوری عرقریزی سے کام لیا تھا'' اور وہ'' قرآن حکیم کے حقائق پر غائر نگہی'' کا وصف رکھتے تھے، اور یہ کہ'' قرآنی حقائق اور اصول

[1] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲۹

واقدار، ان کے قلب کی گہرائیوں میں اترے ہوئے تھے''، اور طلوعِ اسلام نے ''قرآنی بصیرت کے نہج سے ہر ایک کو ان سے کم تر پایا تھا''، تو دوسری طرف، مولانا مودودیؒ کے واضح کمالات، نمایاں اوصاف، شاندار خوبیاں اور علمی فضائل، پرویز صاحب کی نگاہ سے قطعی طور پر اوجھل تھے۔ انھیں، مولانا مودودیؒ کی ذات میں، صرف عیوب ونقائص ہی نظر آیا کرتے تھے، جنھیں وہ خوب اچھالا کرتے تھے، چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

۱- یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہم مودودی صاحب کو نہ دین کا عالم مانتے ہیں، نہ کوئی مفکر۔ [۱]

۲- پاکستان میں ملائیت کے منظم ادارے کے سرخیل سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ [۲]

۳- مودودی صاحب کے پاس کوئی نئی چیز پیش کرنے کو نہیں ہوتی، اس لیے کہ نہ انھیں جدتِ فکر نصیب ہوئی ہے، نہ ندرتِ نگاہ۔ ان کے پاس وہی فرسودہ مال ہوتا ہے، جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ [۳]

۴- جو ''دینی سیاست'' مودودیؒ صاحب کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے، اس میں اور میکیاولی کی لادینی سیاست میں، جن کا مظاہرہ عام ارباب سیاست کی طرف سے ہوتا ہے، کچھ بھی فرق نہیں۔ [۴]

۵- مودودی صاحب، سرمایہ داری نظام کے سب سے بڑے حامی ہیں۔ [۵]

لیکن یہی دلسوز ہے جورہ چکا ہے دل نشیں برسوں

یہی مولانا مودودی، جنھیں آج پرویز صاحب ''نہ دین کا عالم مانتے ہیں، اور نہ مفکر''، ایک زمانے میں، ان کی ممدوح ومحبوب ہستی تھے، اور جب تک، پرویز صاحب، ان سے بگڑ نہیں بیٹھے تھے، وہ، مولانا مودودیؒ اور ان کے مجلّہ ترجمان القرآن کے متعلق لکھا کرتے تھے:

ترجمان القرآن، ایک ماہانہ مجلّہ ہے جو چھ سال سے مسلسل اسلام کی صحیح ترجمانی اور قرآن حکیم کی حکیمانہ دعوت کی نشر وتبلیغ کر رہا ہے، جن لوگوں کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکری اور اسلامی صلاحیتوں کا علم ہے، ان کے لیے بس یہ کہنا ہی کافی ہے کہ آپ ہی ترجمان القرآن کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مولانا موصوف کو، اس زمانہ میں اسلام کی صحیح خدمت اور ملت کی تجدید کے لیے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے، اور وہ شرحِ صدر، وہ اسلامی بصیرت اور تفقہ فی الدین دیا ہے جو مغربی الحاد کے دور میں ہر چیز کا صحیح ادراک کر کے قرآن کریم کی روشنی میں ہر مرض کا تریاق مہیا کرتا ہے، ترجمان القرآن کا موضوع، قرآن حکیم ہے ایک طرف وہ قرآن حکیم کی روشنی سے تاریک دلوں کو منور کر رہا ہے، اور دوسری طرف، فرنگی اور مغربی الحاد کے خلاف مسلسل جہاد کر کے مغربی فلسفہ کا رعب دلوں سے نکال رہا ہے۔

قرآن کریم کو منشائے الٰہی کے مطابق صحیح سمجھنا، صحیح اصولوں پر اس کی نشر واشاعت کرنا، اسلام کے خلاف باطل سرچشموں کا پتہ لگانا اور ان کو عقلِ سلیم کی حجت سے بند کرنا، اسلام کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی مخالفت سے مرعوب نہ ہونا، ذہنیتوں میں

---

[۱] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶
[۲] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۵
[۳] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۵۲
[۴] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۴۰
[۵] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۲۶

یکسر انقلاب پیدا کر دینا اور وقت کی مناسبت سے جملہ مشکلات کا حل، قرآن کریم سے پیش کرنا وغیرہ وہ خصوصیات ہیں جو بحمد اللہ رسالہ ترجمان القرآن کو حاصل ہیں۔ ہندوستان میں آج کل سیاست کے نام پر مسلمانوں میں جو گمراہی پھیلائی جا رہی ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، اس سے غافل نہیں ہیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں، مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی بھی فرما رہے ہیں، اس رسالہ کا مطالعہ، ہر خیال کے مسلمانوں کے لیے ازبس ضروری ہے خصوصاً ان تعلیمیافتہ اور روشن خیال مسلمانوں کے لیے جو فلسفۂ جدیدہ، سائنس اور مغربی حکماء کی دانش فروشیوں سے مرعوب ہو چکے ہیں اور جنھوں نے مذہب کو عقل و دانش اور ترقی کے خلاف سمجھ لیا ہے، کالج اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور اساتذہ کو اس رسالہ کا مطالعہ سب سے پہلے کرنا چاہیے، بلحاظ نصب العین اور مسلک، ترجمان القرآن اور طلوع اسلام کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں سمجھئے۔ [1]

ما ابعد الیوم من الامس - آج اور کل میں کس قدر بونِ بعید اور تفاوتِ شدید ہے، مولانا مودودیؒ کے بارے میں، پرویز صاحب کی کل کی عبارتوں میں اور ان کے آج کے اقتباسات میں، افراط و تفریط کی حدود تک پہنچے ہوئے اختلافات ...... بلکہ تضادات و تناقضات ......کو دیکھ کر، ہر شخص، ان کی جذباتی اور غیر متوازن شخصیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

تحقیرِ معروف اور تحسینِ منکر کا رویۂ پرویز

نفرت و عداوت کا جذبہ ہو یا عقیدت و محبت کا، اگر یہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو جائے تو انسان کے دین و اخلاق کے لیے فتنہ بن جاتا ہے، ان جذبات کی شدت، حقائق و واقعات کو معکوس کر ڈالتی ہے، ایسی صورت میں، فردِ مبغوض کے فضائل بھی رذائل بنکر دکھائی دیتے ہیں اور ہستیٔ محبوب کے مثالب بھی، مناقب قرار پاتے ہیں۔ جب کسی شخص کو ایسی حالت میں پایا جائے کہ خوبیوں کی تحقیر اور منکرات کی تحسین کر رہا ہو، تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ وہ حق سے کنارہ کش ہو کر، بے جا عداوت یا مذموم محبت کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔

ایک زمانہ تھا، جب پرویز صاحب، مولانا مودودیؒ کی مدحت سرائی اور قدر افزائی میں، وہ کچھ کہا کرتے تھے جو اقتباسِ بالا میں پیش کیا گیا ہے، لیکن پھر ان کا، سید مودودیؒ سے اختلاف ہو گیا (کیوں؟ فی الحال، اسے نظر انداز کیجئے) رفتہ رفتہ یہی اختلاف، اختلافِ محض کی حد سے گزر کر، شدید مخالفت بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، نفرت و عداوت اور بغض و کینہ میں ڈھل گیا، یہاں تک کہ مولانا مودودیؒ کا اسلوبِ حیات اور ان کا حلیہ و خد و خال بھی تحقیر و تشنیع کا مستحق قرار پائے، چنانچہ ایک مقام پر، وہ، مولانا مودودیؒ کی داڑھی پر، اور عالم دین ہونے کی حیثیت سے، ان کے منصبِ قیادت پر، یوں زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔

جب ان کے دل میں مذہبی قیادت کی ہوس نے انگڑائی لی تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ داڑھی بڑھالی، اور سر پر پٹے رکھ لیے، اور ایک اسلامی جماعت کے امیر بن گئے۔ [2]

لیکن دوسری طرف، قائداعظم کے سر سے پاؤں تک، انگریزی لباس میں ملبوس واقعہ کو یوں تحسین آمیز انداز میں پیش

---

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۷۳　[2] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۰

کرتے ہیں کہ گویا یہ ان کے ''استحکامِ کردار'' کی دلیل ہے، انگریزی ٹوپ کو اتار دینا، اور اچکن کے ساتھ شلوار قمیض کو زیب تن کرنا، کوئی ''منافقت کا کام'' ہے، اور مسلمانوں میں مروج آدابِ اسلامی اور طرز بود باش کو اختیار کرنا، گویا ''ضُعفِ کردار'' کی علامت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے، یہ اقتباس، جس میں ان کے جلوس کی قیادت کا حال ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

> جب یہ جلوس، اس مقام پر پہنچا جہاں سے راستہ نیچے اترتا تھا، تو مسٹر جناح، انگریزی لباس میں ملبوس تھے، اور ان کا سفید رنگ کا بڑا سا ''ٹوپ''، ان کے زانوؤں پر سامنے دھرا رکھا تھا۔ اس زمانے میں، انگریزوں سے دشمنی کی بناء پر ''ٹوپ'' کو خاص طور پر نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور کانگرسی لیڈروں نے اسے (بلکہ پورے کے پورے انگریزی لباس کو) ترک کرکے ''کھدّر کی گاندھی کیپ'' پہننا شروع کر دی تھی، اس مقام پر، بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال ابھرا کہ لوئر بازار کے مسلمان، اپنے قومی راہنما کو پہلی بار دیکھیں گے، یقیناً وہ متوقع ہوں گے کہ یہ راہ نما ''اسلامی لباس'' میں ملبوس ہوگا...... ''اسلامی لباس'' سے اس زمانے میں مراد تھی شیروانی شلوار اور ترکی ٹوپی...... وہ جب انھیں اس لباس میں دیکھیں گے تو ان پر اس کا کچھ اچھا اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت، اس سلسلہ میں ہو کیا سکتا تھا؟ بعض لوگوں نے کہا کہ اور کچھ نہیں تو جناح صاحب سے کہا جائے کہ وہ کم از کم اپنے ''ٹوپ'' کو نیچے پاؤں میں رکھ لیں تا کہ وہ نمایاں طور پر دکھائی نہ دے، اس تجویز کو لے کر، ایک صاحب، جنھیں جناح صاحب سے شرفِ نیاز حاصل تھا، آگے بڑھے اور ان سے کان میں ہی کچھ کہا۔ جناح صاحب نے اسے سنا، اور برافروختہ ہوکر (لیکن اس طرح سرگوشیانہ انداز سے) کہا کہ ...... کیا تم مجھے مہاتما گاندھی بنا دینا چاہتے ہو؟ ویسے ممکن تھا کہ میں اس ''ٹوپ'' کو نیچے بھی رکھ دیتا، لیکن اب ایسا کرنا منافقت ہوگی، جس کی کم از کم مجھ سے توقع نہ رکھو ...... یہ کہا اور اس ''ٹوپ'' کو زانوؤں سے اٹھا کر، سر پر رکھ لیا۔ [۱]

فی الحال اس بات کو تو نظر انداز کیجئے کہ آیا یہ واقعہ خود پرویز صاحب ہی کے معیارِ درایت پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ زیب داستاں کے لیے، اس میں کیا کچھ کمی بیشی کی گئی ہے؟ صرف اس بات پر غور فرمایئے، کہ آیا ملکی دستور کے مطابق لباس پہن لینا اور غیر مسلموں سے تشبہ اختیار نہ کرنا، واقعی ''منافقت'' ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر بعد میں انھوں نے یہ ''منافقت'' کیوں اختیار کی؟ کیونکہ آج تک سرکاری دفاتر میں قائداعظم کی اس ''اسلامی لباس'' میں ملبوس تصاویر موجود ہیں جس کو اقتباس بالا میں (Inverted Commas) میں رکھ کر نشانۂ طنز بنایا گیا ہے، اور اس کے مقابل مولانا مودودیؒ کی داڑھی اور علمی فضیلت کو عیب قرار دیا گیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کی مخالفتِ پرویز کی وجہ؟

آیئے! اب یہ دیکھیں کہ آخر پرویز صاحب، مولانا مودودیؒ کی اس قدر شدید مخالفت پر کیوں تل گئے، خود پرویز صاحب نے اس کی جو وجوہ بیان کی ہیں، ان کا جائزہ لینا طویل فرصت اور مبسوط تصنیف کا مقتضی ہے، لیکن یہاں اختصار و ایجاز کے ساتھ صرف ایک وجہ بیان کرنا ہی کافی ہے۔

---

[۱] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲۲

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پرویز صاحب ۱۹۲۸ء سے قبل ہی اہل قرآن کے عقیدۂ انکارِ حدیث کو قبول کر چکے تھے، لیکن مصلحتاً وہ اس کا نہ صرف یہ کہ برملا اظہار نہیں کر رہے تھے، بلکہ الٹا حجیتِ حدیث کے حق میں مضامین و مقالات بھی لکھا کرتے تھے، تاکہ مسلم معاشرہ میں انھیں قبولِ عام کا مرتبہ مل سکے، زبان و قلم کے ذریعہ، مسلک حجیت حدیث کا اقرار، لیکن دل و دماغ میں مسلک انکارِ حدیث کو مکتوم و مخفی رکھنے کی یہ کیفیت، ایک عرصہ تک طلوعِ اسلام میں بھی برقرار رہی ہے، تاہم، کبھی کبھی، وہ بڑے معصومانہ انداز میں طالب علم اور جویائے حقیقت کا روپ دھار کر، حدیث و سنت کے بارے میں، علمائے کرام کو خطوط لکھا کرتے تھے جن میں وہ اپنے شکوک و شبہات کے ازالہ کے خواہش مند ہوا کرتے تھے، اس سلسلہ میں، مولانا مودودیؒ سے بھی ان کی مراسلت ہوئی، اور انھوں نے سنجیدگی اور معقولیت کے ساتھ، اطمینان بخش جوابات دیے، لیکن چونکہ ان شکوک و شبہات کے پس پردہ جویائے حق کی مخلصانہ خواہش نہ تھی، اس لیے مولانا مودودیؒ کا ہر جواب، پرویز صاحب کے لیے گرانبار اور ضیقِ قلب کا ذریعہ بنتا رہا، اور نتیجتاً ان دونوں کے درمیان، قلبی فاصلے بڑھتے رہے، خود مولانائے محترم نے، اپنے ایک مکتوب میں، اس حقیقت کی یوں نقاب کشائی کی ہے:

> واحدی صاحب نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ غلام احمد پرویز صاحب، کبھی میرے رفیق رہے ہیں، حالانکہ میری ان سے کبھی رفاقت نہیں رہی۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب تک پرویز صاحب کا مسلکِ انکارِ حدیث، پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آیا تھا، اس وقت تک، ان کے مضامین، رسالہ معارف کی طرح، ترجمان القرآن میں بھی شائع ہوتے رہے، لیکن جب وہ کھلے کھلے منکر حدیث ہو گئے تو یہ تعلقات بھی ختم ہو گئے، پھر نہ معارف میں ان کا کبھی کوئی مضمون آیا، اور نہ ترجمان القرآن میں۔ اور چونکہ میں نے شدت کے ساتھ، ان کے انکارِ حدیث کی مخالفت کی، اس لیے وہ میری مخالفت میں شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ [1]

''طلوعِ اسلام'' افقِ پاکستان پر

متحدہ ہندوستان میں، جس طلوعِ اسلام کی اشاعت، مئی ۱۹۳۸ء سے جون ۱۹۴۲ء تک برقرار رہ کر، جولائی ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک تعطل کا شکار رہی، وہ پاکستان میں جنوری ۱۹۴۸ء سے دوبارہ اشاعت پذیر ہوا، اور نہ صرف وفاتِ پرویز تک بلکہ اب تک جاری و ساری ہے۔ قیام پاکستان سے قبل، اس کا اجراء و آغاز دہلی سے ہوا تھا۔ جبکہ نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کے وجود کوش ہونے کے بعد، اس کا مصدر و مخرج، کراچی قرار پایا۔ ۱۹۵۵ء میں، اسے ماہ نامہ مجلّہ سے ہفت روزہ طلوعِ اسلام میں بدل دیا گیا۔ اس ہفت روزہ رسالے کا پہلا شمارہ ۵ فروری ۱۹۵۵ء کو شائع ہوا اور آخری شمارہ، ۷ جنوری ۱۹۵۶ء کا پرچہ تھا جو اسلم جیراجپوری کی وفات پر، بطور خصوصی شمارہ کے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۵۶ء سے، اس نے پسپائی اختیار کی، اور اس کی حیثیت بطور ماہ نامہ، پھر بحال ہوگئی، لیکن اپریل، مئی ۱۹۵۸ء سے، کراچی سے نقلِ مکانی کے بعد، یہ لاہور سے شائع ہونا

---

[1] مکاتیب، سید ابوالاعلیٰ مودودی، جلد ۲، صفحہ ۲۸۶ تا ۲۸۷

شروع ہوا اور آج تک لاہور ہی سے، اس کی اشاعت کا سلسلہ برقرار ہے، اگرچہ پرویز صاحب، فروری ۱۹۸۵ء میں فوت ہو گئے، مگر اس کی اشاعت میں کبھی انقطاع واقع نہ ہوا، پرویز صاحب کے بعد، اس کے فکر سے وابستہ احباب، اب تک اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔

طلوع اسلام کے بدلتے ہوئے افکار ونظریات

لیکن قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے ''طلوعِ اسلام'' میں نمایاں فرق تھا۔ متحدہ ہندوستان میں، یہ مجلّہ اور پرویز صاحب، امتِ مسلمہ کے جن افکار ونظریات کی، اپنے ضمیر کے خلاف، حمایت بلکہ مدافعت کیا کرتے تھے، اب وہی نظریات، مصلحت کی دیمک کا شکار ہو گئے۔ اب وہ ملتِ اسلامیہ میں مقبول ہر اصول اور مسئلے کی تردید وابطال پر اتر آئے، اور اپنے قلب ودماغ میں مکتوم ومستور افکار وتخیلات کو ایک ایک کر کے تدریج کے ساتھ علانیہ بیان کرنے لگے۔ اور ایسا کرتے ہوئے، پرویز صاحب کے لب ولہجہ میں بھی تبدیلی واقع ہوتی چلی گئی۔ طلوع اسلام کے تب کے اور اب کے نظریات میں واضح فرق وتفاوت کی بہت سی مثالوں میں سے چند ایک ملاحظہ فرمایئے۔

پہلی مثال ...... حجاب نسواں

متحدہ ہندوستان میں طلوع اسلام، خواتین کے حجاب ونقاب کا نہ صرف یہ کہ قائل تھا بلکہ عقلی دلائل سے، اس کا اثبات بھی کیا کرتا تھا۔

> نظام فطرت، جن فرائض کی انجام دہی عورت سے چاہتا ہے، ان کے پیشِ نظر، یہ نہایت کافی ہے کہ ایک لڑکی ذمہ دارانہ زندگی میں قدم رکھنے سے قبل، امور خانہ داری، اصول حفظانِ صحت، نوشت وخواند، حسب ضرورت حساب کتاب اور روزمرہ کے مسائل دینیہ سے واقف ہو۔ اوسط درجے کے گھرانوں کے لیے یہ تعلیم وتربیت بالکل کافی ہے اور اس کی تحصیل میں پردہ کسی طرح مانع نہیں ہو سکتا، اول تو اس قدر تعلیم ہر گھر میں خود ماں دے سکتی ہے یا باپ اور بھائی دے سکتے ہیں، اگر آج نہیں تو دو ایک پشتوں کی کوشش کے بعد، ہر ماں یقیناً اس قدر تعلیم دے سکے گی، لیکن اگر گھر میں کسی وجہ سے بالکل ہی ناممکن ہو تو نیک اور لائق عورتوں کی نگرانی میں ہر محلّہ اور بستی میں پردہ دار مدارس قائم کیے جا سکتے ہیں جیسا کہ قدیم زمانہ میں رواج تھا اور اب بھی اکثر مقامات پر ہیں۔ دولت مند اور صاحب استطاعت گھرانوں میں معیارِ تعلیم کو اور بھی بلند کیا جا سکتا ہے اور لڑکیوں کو اعلیٰ ادب، تاریخ، سیاسیات، دینیات وغیرہ بھی پردہ کے معقول انتظام کے ساتھ سکھائے جا سکتے ہیں، لہٰذا، جہاں تک ضروری علم و ہنر کی تحصیل کا سوال ہے، پردہ کی وجہ سے کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمٰعیل نے، جو یقیناً ''فاضل دیوبند'' نہیں ہیں، حال ہی میں اپنی ایک تقریر میں صاف طور پر اعلان فرمایا کہ ریاست میں پردہ کی وجہ سے تعلیم نسواں کے راستہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ [1]

[1] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۴

تب کا طلوع اسلام، مغرب کے ترکِ حجاب و نقاب (یا بالفاظ دیگر، بے پردگی) کے عمل کو، اس کے یکے از " کارہائے نمایاں" قرار دیا کرتا تھا۔

> تہذیب مغرب کا سب سے بڑا معرکۃ الآراء کارنامہ عورتوں کو پردہ سے آزاد کرانا ہے، لیکن اس مسلک میں بھی، ان کی وہی افراطی حالت جلوہ فرما ہوئی، پردہ اتار پھینکا تو اس زور سے کہ ستر و حیا کے لباس بھی ساتھ ہی الجھے ہوئے ایک طرف جا پڑے۔[1]

لیکن پاکستان بنتے ہی، اس کے افق پر، جب " طلوع اسلام" ہوا تو پردہ کی یوں مخالفت کی گئی۔

> عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دینا، جرم فحش کی سزا ہے۔ لہذا ہمارا مروجہ پردہ، جس میں عورتوں کو گھروں کے اندر قید رکھا جاتا ہے، نہ صرف منشائے قرآنی کے خلاف ہے بلکہ جرم ہے، کیونکہ کسی بے گناہ کا حبسِ بے جا (Ilegal Detention) عرفاً و شرعاً جرم ہے۔[2]

دوسری مثال ...... گانے اور گویئے کی شرعی حیثیت

قبل از قیام پاکستان، وہ گانے کو امر معیوب اور گانے کے رسیا کو، علماء سلف و خلف کی ہمنوائی میں مردود الشہادہ سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ متحدہ ہندوستان میں یہ تبلیغ کیا کرتے تھے کہ واردھا تعلیمی سکیم میں موسیقی کا داخلِ نصاب ہونا، ہندو تہذیب کے مطابق ہو تو ہو، لیکن اسلامی تہذیب کے قطعی منافی ہے۔ اس سکیم کے ایک مرتب ڈاکٹر ذاکر حسین تھے، اس وقت " طلوع اسلام" نے یہ لکھا تھا کہ

> موسیقی چونکہ ہندوؤں کی تہذیب کا ضروری جزو ہے، اس لیے اسے بھی داخل نصاب کیا جاتا ہے، ہم بادب دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اگر اس کا نام " اشتراکِ عمل" ہے تو پھر اطاعت کی کیا تعریف ہوگی! کیا نبی اکرمؐ سے لے کر اس وقت تک کسی اسلامی نظام تعلیم میں کبھی یہ اجزاء بھی شامل ہوئے تھے! دوسروں کو چھوڑیے کیا خود جامعہ کے نصاب میں بھی اس سے پیشتر یہ اجزاء موجود تھے، جامعہ ایک آزاد درسگاہ ہے اس کے نظام و نصاب کی باگ ڈور، خود انھی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں ہے جو واردھا رپورٹ کے مرتب کرنے والے ہیں، اگر ان کے نزدیک، صحیح اسلامی تعلیم یہی ہے کہ اہسا کو ہمسا پر فوقیت ہے، ادیانِ عالم، بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے یکساں ہیں اور موسیقی ایک عمدہ جوہر ہے تو انھوں نے اپنے ہاں ان چیزوں کو اب تک کیوں رائج نہ کیا، کیا اس سے پیشتر، خود انھیں بھی معلوم نہ تھا کہ صحیح اسلامی تعلیم کیا ہے، اور اب مہاتما جی کے سمجھانے سے معلوم ہوا کہ اسلام کی روح یہ ہے۔[3]

اس وقت، طلوع اسلام، گانا گانے والا تو رہا ایک طرف، محض گانا سننے والے کو مردود الشہادہ قرار دینے کا یہ واقعہ، اوراقِ تاریخ میں سے پیش کیا کرتا تھا۔

> اسی طرح کا ایک واقعہ، قاضی شریف الدین بن عین الدولہ کا ہے جو مصر میں قاضی تھے، ان کی عدالت میں ملک کامل، سلطانِ مصر، کسی مقدمہ میں شہادت میں طلب ہوا، وہ چونکہ روزانہ ایک مغنیہ کا گانا سنا کرتا تھا، اس وجہ سے قاضی موصوف نے

---

[1] طلوع اسلام، جون ۱۹۴۰ء، صفحہ ۵۲ [2] طاہرہ کے نام، صفحہ ۱۹۸ [3] طلوع اسلام، فروری ۱۹۳۹ء، صفحہ ۲۱

اس کی شہادت لینے سے انکار کر دیا، اس پر اس نے قاضی کی شان میں سخت کلمہ استعمال کیا، قاضی نے کہا کہ یہ عدالت کی توہین ہے اور اسی وقت اپنی برطرفی کا اعلان کر کے مسند سے اٹھ کر چلے آئے، سلطان نے مجبوراً جا کر معافی چاہی اور ان کو راضی کیا، کیونکہ اس کو اپنی بدنامی اور نامقبولیت کا خطرہ ہوا۔ [۱]

ان دِنوں واردھا کی تعلیمی اسکیم کے تحت، ہندو اطفال کے ساتھ جب مسلمان بچوں اور بچیوں کو راگ تال کی تعلیم تجویز کی گئی تو ''طلوعِ اسلام'' نے یہ کہہ کر مخالفت کی تھی۔

اگر ہندو لڑکے اور لڑکیوں کے لیے راگ کا نصاب رکھا جائے تو انھیں عین مسرت ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ چودہ برس کی عمر میں مسلمان لڑکیوں کو راگ اور تال سکھا کر کیا بنانا مقصود ہے۔ [۲]

اس وقت، سیرتِ سرورِ عالم ﷺ کا یہ واقعہ بھی، طلوعِ اسلام کے اوراق کی زینت بنا کرتا تھا کہ حضرت نبی اکرم ﷺ:

جن محفلوں میں باجہ اور راگ ہوتا تھا، ان میں کبھی نہیں جاتے تھے۔ [۳]

لیکن جب افقِ پاکستان پر طلوعِ اسلام ہوا تو راگ تال اور موسیقی کے متعلق، یہ سب تصورات بدل کر رہ گئے، اور تو اور، خود ''مفکرِ قرآن'' جناب پرویز صاحب، بہترین گوشِ نغمہ شناس ٹھہرے، یہاں تک کہ فلمی مغنیہ، روشن آراء بیگم کے گانوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ خصوصی کاوش فرمایا کرتے تھے۔

Pervez Sahib made special efforts to listen to Roshan Ara Begum, of whom he had a very high opinion. [۴]

اور چونکہ پرویز صاحب کو قرآن کریم سے بہت ''پیار'' تھا، اس لیے انھوں نے جب اور جہاں بھی، اپنے نظریات میں الٹی زقند لگائی، قرآن کو بھی اپنی زقندِ معکوس میں شامل رکھا، چنانچہ راگ تال اور موسیقی، جس کی تعلیم مسلمان بچوں اور بچیوں کو ہندوستان میں دینا معیوب تھی، اور وہ محفلِ راگ و باجہ، جس میں شرکت سے حضور اکرم مجتنب رہا کرتے تھے، اس کا ''ثبوت'' اب قرآن ہی سے برآمد کر لیا گیا، پھر اس ''مطابقِ قرآن عمل'' کا ''تائیدی ثبوت'' تحریف شدہ تورات سے بھی نچوڑ لیا گیا کہ حضرت داوٗد علیہ السلام، خود باجے کے ساتھ گایا کرتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تورات میں بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے لیکن ہم موسیقی کے متعلق اس بیان کو اس لیے قابل قبول سمجھتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں جنتی معاشرے میں موسیقی کی محفلوں کا ذکر ہے، تو یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤد نے، اس فن کی تہذیب و تزئین کی ہوگی۔ [۵]

پرویز صاحب کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ وہ تہذیبِ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر، جس فکر یا عمل کو ''ثابت''

---

[۱] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۶۷
[۲] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۳۸ء، صفحہ ۷۷-۷۸
[۳] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۲
[۴] طلوعِ اسلام، مارچ اپریل ۱۹۸۹ء، صفحہ ۱۱۶
[۵] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۹

کرنا چاہتے تھے، اسے قرآنی مفردات میں ٹھونس کر، بطور ''قرآنی حقیقت'' پیش کر دیا کرتے تھے، اور پھر دنیا جہان کی خواہ کتنی ہی گری پڑی کتاب میں وہ فکر یا عمل مذکور ہو، اسے یہ کہہ کر قبول کر لیتے تھے کہ یہ ''مطابق قرآن'' ہے۔

رہا وہ قرآنی لفظ، جس میں ''جنتی معاشرے میں موسیقی کی محفلوں'' کا تصور ٹھونس کر ''ثبوت'' فراہم کیا گیا ہے، وہ يُحۡبَرُوۡنَ کا لفظ ہے۔

فَهُمۡ فِىۡ رَوۡضَةٍ يُّحۡبَرُوۡنَ (۱۵/۳۰) سرسبز و شاداب باغات میں، نہایت شستہ اور اعلیٰ پایہ کی موسقی کی محفلیں [۱]

حقیقت یہ ہے کہ يُحۡبَرُوۡنَ کا معنیٰ ''موسیقی کی محفلیں'' دنیائے علم میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا، نہ ہی کتب تفسیر میں اور نہ ہی لغات میں۔ اس لفظ کے جو معانی، اہل علم کے ہاں معروف و متداول ہیں، وہ یہ ہیں۔

ان کو خوش کیا جائے گا (ابوعبیدہ)۔ ان کی عزت کی جائے گی (ابن عباس)۔ ان کو آرام دیا جائے گا، نعمتیں دی جائیں گی (مجاہد)۔ جنت میں نغمات سنائے جائیں گے (یحییٰ بن ابن کثیر بروایت اوزاعی) [۲]

شاید پرویز صاحب نے آخری معنیٰ ''نغمات سنائے جانے'' سے ''موسیقی'' کا معنیٰ کشید کیا ہے، حالانکہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ نغمات کا یہ سماع، آلاتِ غنا اور مزامیر موسیقی ہی کے ساتھ مقرون ہو، پھر دعویٰ یہ کہ تصریفِ آیات کے ذریعہ، قرآن کی تفسیر، قرآن ہی سے کی جاتی ہے لیکن عمل یہ کہ قرآنی مفردات کے اصل معانی سے انحراف کر کے خودساختہ معانی کی آڑ میں، ایک ''قرآنی حقیقت'' گھڑی جاتی ہے اور پھر توراتِ محرفہ سے، اس کے حق میں ''تائیدی شہادت'' کشید کی جاتی ہے۔

قرآن کریم، جنت میں، جن نغمات کے سنائے جانے کا ذکر کرتا بھی ہے تو وہ، دراصل، وہ نغمات ہیں جو مزامیرِ غنا اور آلاتِ موسیقی کے بغیر، محض تحمیدِ خداوندی، تسبیح الٰہیہ، اور اہل جنت کے لیے سلامتی و تہنیت کے نغمات ہیں، دورِ حاضر کے وہ نغماتِ اخلاق سوز، جو بے خدا تہذیب کے ہاتھوں ''آرٹ اور فنونِ لطیفہ'' قرار پا چکے ہیں، ہرگز مراد نہیں ہیں۔ چند آیات، جو اس حقیقت پر شاہد ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

۱- فِىۡ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ لَّا تَسۡمَعُ فِيۡهَا لَاغِيَةً (الغاشیہ-۱۰، ۱۱) (وہ لوگ) بلند باغ میں ہوں گے اس میں کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے۔

۲- لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا (مریم-۶۲) وہ اس میں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے مگر صرف سلامتی کی دعائیں۔

۳- لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا تَاۡثِيۡمًا (الواقعہ-۲۵) وہ اس میں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے اور نہ ہی کوئی گناہ کی بات۔

۴- لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا كِذّٰبًا (النبأ-۳۵) وہ اس میں نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ ہی کوئی جھوٹی (خرافات)

۵- وَالۡمَلٰٓئِكَةُ يَدۡخُلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ (الرعد ۲۳-۲۴) اور فرشتے ان پر، ہر دروازہ سے داخل ہوں گے (یہ کہتے ہوئے کہ) تم پر سلامتی ہو، اس لیے کہ تم

---

[۱] طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۷ [۲] لغات القرآن، جلد ۲، صفحہ ۲۰۲ (از مولانا عبدالرشید نعمانی و مولانا عبدالدائم الجلالی)

نے صبر کیا، پس خوب ہے آخرت کا گھر۔

۶- خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (ابراھیم-۲۳) وہ آمیں اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے، اس میں انکا تحفۂ ملاقات "سلام" ہوگا۔

۷- اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ (الحجر-۴۶) تم ان (باغات اور چشموں) میں سلامتی کے ساتھ، بے خوف و خطر داخل ہو جاؤ۔

۸- يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (النحل-۳۲) (فرشتے) کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، تم اپنے اعمال کے بدلے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

۹- سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (یٰسین-۵۸)-(ان اہل جنت پر) مہربان پروردگار کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا۔

۱۰- اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (ق-۳۴) اس (جنت) میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔

۱۱- دَعْوٰهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَّاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس-۱۰) اس (جنت) میں ان کی دعا ہوگی "اے اللہ! تو پاک ہے"۔ اور سلیقۂ ملاقات "سلام" ہوگا اور خاتمۂ دعا یہ الفاظ ہوں گے "تمام تعریفیں، اللہ رب العالمین کے لیے ہیں"

یہ ہے حقیقت، ان نغماتِ تسبیح و تحمید کی اور ان ترانہ ہائے تہنیت و سلامتی کی، جو از روئے قرآن، جنت میں سنے اور سنائے جائیں گے۔

بہر حال، اس مختصر سی بحث سے یہ بات واضح ہے کہ پرویز صاحب، جس قرآن کی بنیاد پر، متحدہ ہندوستان میں موسیقی اور راگ تال کو معیوب کہا کرتے تھے، پاکستان بننے کے بعد، اسی قرآن سے اس کی اباحت اور جواز کو کشید کر ڈالا گیا اور یوں ان کی زنبیلِ تضادات میں ایک اور ترکش کا اضافہ ہو گیا۔

تیسری مثال ...... مصوری و تمثال سازی کی شرعی حیثیت

موسیقی اور راگ و رنگ ہی نہیں، بلکہ مغربی تہذیب کے دیگر اجزاء فنونِ لطیفہ مثلاً مصوری اور تمثال کے بارے میں بھی، پرویز صاحب کے کل کے اور آج کے نقطۂ نظر میں یکسر اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے، متحدہ ہندوستان میں، طلوعِ اسلام، مغربی ثقافت کے ان جملہ اجزاء کو، اسلامی تعلیم کے سراسر منافی قرار دیا کرتا تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد، یہ سب کچھ عین مطابق اسلام قرار پا گیا، قیامِ پاکستان سے قبل، ان کا موقف یہ تھا۔

> اس نظامِ تعلیم میں، انگریزی ادب کی بدولت، ایک نہایت ہی گمراہ کن نظریہ پیدا ہو گیا ہے، اس کی بنیاد انگریزی شاعری میں رومانی (Romantic) دور سے پڑی ہے، آگے چل کر فنِ تعمیر، مصوری اور تمام فنونِ لطیفہ کو مقصود بالذات قرار دیکر حقائقِ زندگی کو نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کا اثر و نفوذ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ عصرِ رواں کی تہذیب میں زنا جیسی ہلاکت آفریں معصیت کاری کو محض افراد کی "خوش وقتی" (Having A Good Time) کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے، اور

تمام راگ ورنگ اور عیش ونشاط کی محفلوں کو ذوقِ جمالیات (Aesthetic Taste) کا مظہر سمجھ کر سراہا جاتا ہے، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں، ان کے ''اعصاب پر ہمیشہ عورت سوار رہتی ہے''۔ پھر ہمارے نوجوان مصوری، تمثیل اور گل وبلبل کی شعر وشاعری کی طرف، فن برائے فن (Art for Art's Sake) کے لیے عملا نہ جذبہ کی بدولت منہمک نظر آتے ہیں، حالانکہ یہ تعلیم، اسلام کے سراسر منافی ہے۔ ؁۱

لیکن راگ تال ہو یا موسیقی، مصوری ہو یا تمثیل، مملکت خداداد پاکستان کے وجود میں آتے ہی، یہ سب مطابقِ اسلام اور موافقِ قرآن قرار پا گیا۔

حضرت سلیمان کے متعلق، خود قرآن کریم میں ہے کہ انھوں نے مختلف علاقوں کے نادرہ کار صناع، اپنے ہاں اکٹھے کر رکھے تھے يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ .... (۳۴/۱۳) جو حضرت سلیمان کی منشاء کے مطابق ان کے لیے بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور ان میں مجسمے تراشتے ...... یا تصاویر بناتے تھے، تماثیل، مجسمے اور تصاویر دونوں کے لیے آ سکتا ہے۔

آرٹ (یعنی فنون لطیفہ) میں چار اصناف ہی بنیادی شمار کی جاتی ہیں۔ مجسمہ سازی۔ تصویر کشی۔ موسیقی۔ اور شاعری۔ پہلی تین کا ذکر آ گیا ہے، شاعری کے متعلق ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ ؁۲

اور لطف کی بات یہ ہے کہ پرویز صاحب، اپنے تضادات کو، قرآن کا نام لے کر ہی پیش کیا کرتے تھے، اب ہر شخص، خود سوچ سکتا ہے کہ قرآن ہی مختلف اوقات میں متضاد نظریات پیش کرتا ہے؟ یا پھر یہ ذہنِ پرویز کی خلاقی کا کرشمہ ہے کہ وہ اپنے نہاں خانۂ دماغ میں چھپے ہوئے ہر تصور کو، مرورِ ایام کے ساتھ، قرآن کے نام پر، بدلتے رہا کرتے تھے، قرآن کے الفاظ تو بہر حال، چودہ سو سالوں سے وہی ہیں، لیکن پرویز صاحب کے، قرآنی اساس پر پیش کیے جانے والے افکار، ہمیشہ بدلتے ہی رہے۔

چوتھی مثال ...... ملکیتِ زمین کی شرعی حیثیت

متحدہ ہندوستان میں جاری ہونے والا ''طلوعِ اسلام''، زمین کی ذاتی ملکیت کا قائل تھا، خواہ یہ ملکیت خرید وفروخت کے ذریعہ حاصل ہو، یا کسی بنجر و بے آباد زمین کو قابل کاشت بنا کر حاصل ہو، ثانی الذکر صورت کے متعلق، اس دور کا ''طلوعِ اسلام'' یہ کہا کرتا تھا۔

بے شک اگر پانی کے چشمہ سے کوئی شخص مشک میں پانی، یا جنگل سے لکڑی کا گٹھا، یا کان سے ایک بوری نمک اٹھا کر لائے تو وہ اس کی شخصی ملکیت قرار دیا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی اپنی محنت سے زمین کو قابل کاشت یا اپنے کسی عمل سے کارآمد بنائے تو اس پر اس کی ملکیت تسلیم کی جائے گی۔ ؁۳

رہی خرید وفروخت کے ذریعہ سے ملکیت اراضی، تو کون نہیں جانتا کہ جناب ابوبکر صدیق ؓ نے، اپنی اس زمین کو فروخت کر کے، اس کی ملکیت، خریدار کو سونپ دی جس کی قیمت اس لیے بیت المال میں جمع کرا دی گئی، کہ آپ بیت المال سے

؁۱ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۷۰ ؁۲ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۹ ؁۳ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء: صفحہ ۴۹

اخذ شدہ حق الخدمت واپس کر دینا چاہتے تھے۔

لیکن جب پاکستان بنا تو اس کے افق پر جو "طلوعِ اسلام" ہوا، اس میں نہ صرف یہ کہ زمین کی شخصی ملکیت ناجائز، بلکہ کفر وشرک قرار پا گئی۔ اب طلوعِ اسلام کے توپ خانۂ تکفیر سے یہ فتویٰ (بتکرار بسیار) داغا جانے لگا۔

قرآن کریم کی رو سے وسائلِ رزق (ارض یعنی زمین) خدا کی پیدا کردہ ہیں اور خدا ہی ان کا مالک ہے، لہٰذا ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ان کا کوئی اور بھی مالک ہو سکتا ہے، شرک ہوگا۔ ۱

اس (اللہ) نے تمھارے لیے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا، اور پرفضا میں کُرّے بکھیر دیے، پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمھارے لیے سامانِ رزق پیدا ہو، ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملا ہے، اس پر ملکیت خدا ہی کی ہے، تمہیں صرف اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے لہٰذا، تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ جانتے بوجھتے، خدا کے ساتھ اور خدا کھڑا کر دینے کے مترادف ہوگا۔ ۲

پانچویں مثال ...... ذاتی وشخصی ملکیت درنگاہِ اسلام

قیام پاکستان سے قبل، طلوعِ اسلام اور جناب پرویز صاحب کے، اشتراکیت کے بارہ میں مضامین میں یہ کہا جاتا تھا کہ

اشتراکیت، ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اسلام، ہر شخص کی کمائی، اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے۔ ۳

لیکن یہی طلوعِ اسلام جب دہلی سے پاک سرزمین پر آیا، تو ذاتی ملکیت کے بارے میں اسلام کا نظریہ بھی بدل گیا، اور اب بڑی بلند آہنگی اور تکرار بسیار کے ساتھ، یہ کہا جانے لگا کہ

قرآن جس معاشی نظام کو پیش کرتا ہے اس کی رو سے دولت کا اکتناز یا وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہی نہیں۔ ۴

چھٹی مثال ...... ضبط تولید، کل اور آج

تہذیب مغرب، اپنے جلو میں جن آفات و بلیات کو لے کر آئی ہے، ان میں سے ایک ضبطِ تولید یا برتھ کنٹرول بھی ہے، طلوعِ اسلام، متحدہ ہندوستان میں، چونکہ اس کے خلاف تھا، اس لیے بڑے اہتمام کے ساتھ، ان اشعار کو یہ اپنے صفحات میں جگہ دیا کرتا تھا، جن میں اس کی مخالفت پائی جاتی تھی، چنانچہ ایک مقام پر، جناب نعیم صدیقی کی مندرجہ ذیل رباعی کو "ضبط تولید" کے زیرِ عنوان شائع کیا گیا ہے۔

ہے نئی تہذیب میں بھی جاہلیت کا اثر

---

۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۲۹۷

۲ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۵۲

۳ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۳۷

۴ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۶ء، صفحہ ۹

نوجوانوں کا گناہوں کی طرف ہے ربطِ نفس

آدمیت کی نظر سے دیکھ کر، فرمایئے!! ضبط تولید آپ کو مطلوب ہے یا ''ضبطِ نفس'' ۱؎

مغرب کے ہاں، مرد و زن کی ایک ہی تعلیم اور وہ بھی مخلوط انداز میں دیے جانے پر، جو خرابیاں پیدا ہوئیں، ان کے بارے میں طلوعِ اسلام نے، تقسیمِ ملک سے قبل، یہ لکھا تھا کہ

یہ نظامِ تعلیم، جنسِ لطیف کے لیے، اس کی زندگی کے مطابق نصاب پیش نہیں کرتا بلکہ اصولاً ان کے لیے، وہی نصابِ تعلیم ہے جو لڑکوں کے لیے پیش کیا گیا ہے، اس نظام کے بدترین اثرات، طلبہ اور طالبات دونوں طبقوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑ رہے ہیں، جب مرد و زن کے واجبات زندگی الگ الگ ہیں تو ماہرین تعلیم کو چاہیے کہ ان کے فرائض کی بجا آوری کے لیے حسب حال نظامِ تعلیم مرتب فرماتے، لیکن افسوس کہ انھوں نے ان جنسی اختلافات کو درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے ایک ہی نظام تعلیم تجویز کر دیا، اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جو خرابیاں اس نظام سے پیدا ہوگئی ہیں وہ الم نشرح ہیں، یہ دونوں طبقے اپنے وظیفۂ زندگی کو نبھانے سے عاری ہیں، عورت، چراغِ خانہ ہونے کی بجائے شمعِ بزم ہونے پر فخر محسوس کرتی ہے افزائش نسل انسانی کی بجائے، ضبط تولید کو رواج دیا جا رہا ہے، وہ عورت، جس کی آغوش، مردِ غیور و حق پرست کے لیے اولین تربیت گاہ تھی وہ اپنے فرائض سے متنفر ہو رہی ہے۔ ۲؎

ایک اور مقام پر، طلوعِ اسلام نے ضبط تولید کو، فطرت کے خلاف، مقابلہ بازی قرار دیا تھا۔

کیا انسان کے لیے اپنے طبعی رجحانات کو، اقتضائے فطرت سمجھ کر، رہبر حیات بنالینا چاہیے، یا ان کو کسی اور معیار سے جانچ لینا ضروری ہے؟ اس بارے میں اسلام کا فیصلہ تو صاف ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس قدر تعلیم و ترقی کے باوجود، مغرب کی مادی تہذیب ابھی تک کسی خاص نتیجہ تک نہیں پہنچ سکی، کیونکہ دیکھا یہی گیا ہے کہ بعض امور میں تو انسانیت کا خاص تصور پیش کر کے فطرت کا مقابلہ کرنے کا درس دیا جاتا ہے مثلاً ضبط تولید۔ اور بعض باتوں میں حیوانوں کی پیروی کرنے کو عین اتباعِ فطرت ٹھہرایا جاتا ہے، مثلاً تحریک عریانی۔ ۳؎

لیکن پاکستان کے معرضِ وجود میں آ جانے کے بعد، کل کا خوب، آج کے ناخوب میں بدل گیا، علامہ اقبال نے تو یہ کہا تھا کہ- ''غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر''۔ لیکن طلوعِ اسلام پر، حصولِ آزادی کا الٹا اثر ہوا، دورِ غلامی میں جن افکارِ صحیحہ کا وہ پرچار کیا کرتا تھا، آزادی پاتے ہی ان سے رفتہ رفتہ دستکش ہوتا چلا گیا، چنانچہ ضبط تولید کے معاملہ میں بھی طلوعِ اسلام نے پینترا بدلا، اور تقلیدِ مغرب میں، اسے جبلِ قرآن سے کھود ہی ڈالا، اور اس کے لیے اصول کے جس کدال کو استعمال کیا گیا، وہ یہ ہے کہ قرآن نے اس کی کہیں مخالفت نہیں کی، لہٰذا

قرآن کی رو سے یہ چیز قابل اعتراض نہیں کہ اس قسم کی اجتماعی اور ہنگامی ضرورت کے لیے افزایشِ نسل پر پابندی عائد کر

۱؎ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۶

۲؎ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۷۱

۳؎ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۸۰

دی جائے۔ فطرت نے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو انسان کی مرضی کے تابع رکھا ہی اس لیے ہے کہ اسے افزائش نسل پر کنٹرول رہے۔ ۱؎

دوسرا اصول، جسے ضبطِ ولادت کی تحریک کا جواز تراشنے کے لیے استعمال کیا گیا وہ ملک کے مجموعی معاشی حالات، ذرائعِ رزق اور وسائلِ پیداوار کو پیشِ نظر رکھنا ہے، چنانچہ طلوعِ اسلام، اس اصول کی روشنی میں یہ طے کرتا ہے کہ

اگر تمام حالات کا جائزہ لینے اور زمین کی پیداوار بڑھانے کے لیے پوری کوشش کے بعد بھی حالات ایسے ہوں جن میں آبادی کی تحدید ناگزیر ہو جائے تو اس صورت میں اس قسم کا اقدام، قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں ہوگا۔ ۲؎

یاد رہے کہ یہ مسئلہ، پاکستان کے فوجی حکمران، صدر ایوب خاں کے عہد میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ ایوب خاں، تقلیدِ مغرب کی راہ پر چلتے ہوئے ضبطِ تولید کی اس تحریک کو ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے نام سے، اپنے حاکمانہ اختیارات سے پوری مملکت پر مسلط کرنے پر تلا ہوا تھا، لیکن پبلک کا دینی مزاج حائل ہو رہا تھا۔ ملک کا مغرب پرست طبقہ جن ''عقلی اور نقلی دلائل'' کی بناء پر، اس تحریک کا ہمنوا تھا، ان کا تار و پود، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بکھیر چکے تھے، اور اپنی ایک کتاب ''اسلام اور ضبط ولادت'' میں مغرب سے اٹھنے والی اس تحریک کی پوری تاریخ کو، اس کے پس منظر کو، اور اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، نفسیاتی اور طبی مضرات کو، مغربی مفکرین کی تحریروں کی روشنی میں پیش کر چکے تھے، علاوہ ازیں، مولانا مودودیؒ کا ایک پمفلٹ- ''اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی''- نہایت سائنٹیفک انداز میں، پرزور استدلال کے ساتھ منظر عام پر آیا، اس نے حکومتی استدلال کے غبارہ سے ساری ہوا نکالدی، مولانائے محترم کی ان تحریروں کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر وہ شخص، جس کے سر میں ذرا سی بھی عقل ہو اور جس کے دیدوں میں معمولی سی بھی بصارت ہو، وہ یکسو ہو کر، اس تحریک کی مخالفت کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس کی پشت پر صالح فکر کی بجائے، خالص مادہ پرستانہ اور اباحیت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہو، چنانچہ مولانا مودودیؒ کے اس پمفلٹ کا مقابلہ، ایوبی حکومت نے یوں کیا کہ اسے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ضبط کر لیا۔

چونکہ حکومتی صفوں میں کوئی لال بجھکڑ ایسا نہ تھا جو سید مودودیؒ کی پرزور اور مدلل تحریروں کا جواب دے پاتا، اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کی سرکاری تحریک کے حق میں، پرویز صاحب، ''قرآنی دلائل'' کے ساتھ آگے بڑھے، یہ ''قرآنی دلائل'' کس قسم کے تھے؟ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (۲/۲۲۳) میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے معاملہ میں اس اصول کو یاد رکھو کہ اس سے مقصود، افزائشِ نسل (اولاد پیدا کرنا) ہے۔ اس اعتبار سے تمھاری بیویوں کی مثال کھیتی کی سی ہے، جس طرح کسان، اس وقت تخم ریزی کرتا ہے جب اسے فصل اگانا مقصود ہو، اسی طرح تم بھی اس وقت، اپنی ''کھیتی'' میں جاؤ، جب تم (اولاد پیدا کرنا) چاہو۔ ۳؎

۱؎ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۰ء، صفحہ ۹۱

۲؎ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۰ء، صفحہ ۸۴

۳؎ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۳۷۲

سید مودودیؒ نے، اس افلاطونی دلیل کا جو جواب دیا ہے، ایک نظر، اس پر بھی ڈال لیجئے۔

ایک صاحب نے اس آیت سے ضبط ولادت کے حق میں استدلال کرتے ہوئے یہ نرالا نکتہ پیدا کیا ہے کہ کھیتی کے ساتھ کسان کا تعلق صرف پیداوار کی خاطر ہے، جب ملک کو پیداوار کی ضرورت ہو تو کسانوں کو کھیتی میں جانا چاہیے، جب پیداوار کی ضرورت ہی نہ ہو تو ان کو سرے سے اپنی کھیتیوں میں جانے کا حق ہی نہ ہونا چاہیے، نیز جتنی پیداوار درکار ہو، بس اسی حد تک کسانوں کو کاشت کرنی چاہیے، اس سے زیادہ نہیں۔

اس عجیب وغریب تفسیر کی رو سے اول تو بانجھ مرد یا بانجھ بیوی کی باہم مقاربت حرام قرار پاتی ہے، ثانیاً، استقرارِ حمل کے بعد زوجین کی باہمی مقاربت اس وقت تک کے لیے حرام ہو جاتی ہے جب تک کہ پھر ایک بچے کی ولادت مطلوب نہ ہو، ثالثاً، میاں اور بیوی کا تعلقِ زوجیت بھی ریاست کے کنٹرول میں چلا جاتا ہے، جب ریاست اعلان کر دے کہ اب ہمیں بچوں کی ضرورت نہیں ہے تو تمام مرد، اپنی بیویوں سے الگ ہو جائیں اور جونہی ایک سرکاری اعلان شائع ہو کہ اب بچوں کی ضرورت ہے تو یک لخت شوہروں اور بیویوں کے درمیان رابطہ قائم ہو جائے، پھر حکومت کو رپورٹ دی جاتی رہنی چاہیے کہ کتنی عورتیں حاملہ ہو چکی ہیں، مطلوبہ تعداد میں حمل قرار پاتے ہی حکومت سرخ جھنڈی ہلائے گی اور شوہروں کے لیے بیویوں کے پاس جانا ممنوع ہو جائے گا۔

یہ ''نظام ربوبیت'' کی ہمہ گیر منصوبہ بندی کا وہ نقشہ ہے جو ابھی تک کیمونسٹوں کو بھی نہیں سوجھا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ بھی قران سے برآمد کر لیا گیا حالانکہ اگر زوجین کے باہمی تعلق ''کسان اور کھیتی'' کی تشبیہ کو تشبیہ تام ہی مان لیا جائے، تب بھی آج تک کسی صاحبِ عقل کے دماغ میں یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ تخم ریزی کے بعد کسان کا کھیتی میں جانا حرام ہو جاتا ہے۔ [1]

بہرحال، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، جو دورانِ بحث ضمناً آ گیا، اصل بحث یہ ہو رہی تھی کہ پرویز صاحب، برصغیر کی تقسیم سے قبل، تحریکِ ضبطِ تولید کو خلافِ اسلام قرار دیا کرتے تھے، لیکن بعد میں، متضاد روش اپناتے ہوئے، اس کے جواز کو، قرآن ہی سے کشید کر ڈالا۔

ساتویں مثال ...... خلیفۃ اللہ کا تصور

قیامِ پاکستان سے قبل، طلوعِ اسلام، خلافتِ الٰہیہ کا قائل تھا، اور انسان کو، اللہ تعالیٰ کا خلیفہ قرار دیا کرتا تھا، اور اس حوالے سے وہ افرادِ مسلمین کو بھی اور امت مسلمہ کو بھی، بحیثیت مجموعی، ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا کرتا تھا، چند اقتباسات ملاحظہ فرمایے۔

۱۔ مسلمان، اس پیغام کا حامل ہے جو خالق ارض وسماوات کا آخری پیغام ہے، مسلمان، اس دین کا سرمایہ دار ہے جس کی تعریف میں اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا آ چکا ہے۔ جب تک اسلام کی بعثت کا مقصد وہی ہے جو اسلام کے داعی نے بتایا ہے، جب تک مسلمانوں کا وظیفۂ حیات امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے، جب تک اسلام کا مقصد اولین وآخرین خلافۃ اللہ فی الارض کا قیام ہے مسلمان کے لیے وہی ضابطۂ حیات رہے گا جو اس کے اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔ [2]

---

[1] اسلام اور ضبط ولادت (مودودیؒ)، صفحہ ۵۸

[2] طلوع اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۵۴

۲- مسلمان ہو تو صحابہ کے سے مسلمان بنو۔ نبیؐ کی مدینہ والی مجاہدانہ زندگی اختیار کرو، اور خلیفہ الٰہی کا تاج جو تم سے چھن گیا ہے، اس کو واپس لو۔ ۱

۳- کائنات کی ساری قوتیں، اسی لیے اس کی اطاعت و فرمانبرداری پر مامور و مجبور کر دی گئی ہیں کہ وہ وسعت شش جہات میں، خدا کی نیابت کر کے جہان ناتمام کی تکمیل کر سکے، خلافت الٰہی کا قیام ہی انسان کی منزل ہے۔ ۲

۴- وحی و الہام کا سلسلہ خلافت الٰہی کو قائم کرنے والے سپاہی تیار کرنے کے لیے تھے، قومی اور انفرادی تربیت کے بعد، جو شئے سب سے زیادہ اہم تھی وہ تمام انسانوں کی مرکزی اور اجتماعی تربیت تھی۔ ۳

۵- اس تاکید و ترغیب کا مقصود بھی وہ مبنی بر توحید اجتماعیت، اخوت اور مساوات قائم کرنا تھا، جس کے بغیر، اللہ کی خلافت، قائم نہیں ہو سکتی۔ ۴

۶- عام طور پر معروف کا ترجمہ ''نیکی'' اور منکر کا ''برائی'' کیا جاتا ہے، یہ صحیح ہے، لیکن اگر قرآن کریم کی روشنی میں عالم انسانی کی اصلی منزل اور پھر ساری امتوں میں ملت بیضا کے مقام اور اس کے مشن پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نیکی، ہر وہ کام ہے جو خلافت الٰہی کے قیام پر منتج ہو، اور برائی ہر وہ کام ہے جو افرادِ جماعت کو اس منزل سے دور کر دے! صداقت، امانت، عدل، علم پروری، عفت، غریب نوازی وغیرہ اگر نیکیاں ہیں تو اسی لیے۔ جھوٹ، خیانت، ظلم، جہالت، ہٹ دھرمی وغیرہ اگر برائیاں ہیں تو اس لیے کہ ان سے اجتماعی حیات کا نشو و نما رک جاتا ہے، جو اللہ کی حکومت کے قیام کے لیے ضروری ہے، امت مسلمہ کی فضیلت کا خلاصہ ہی یہ ہے کہ وہ خلافت الٰہیہ کے قیام کے لیے اٹھی ہے۔ اس کا آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہونا یہی ہے اور انھی معنوں میں وہ اخص ترین امت ہے۔ ۵

یہ چھ اقتباسات، ان متعدد اقتباسات میں سے ہیں، جو صرف طلوع اسلام بابت سال ۱۹۴۰ء میں سے ماخوذ ہیں، ورنہ اگر مکمل احصاء کیا جائے تو بہت سی مزید عبارات بھی درج کی جا سکتی ہیں، ان اقتباسات سے یہ بالکل واضح ہے کہ طلوع اسلام، اپنے ابتدائی دور میں، جمہور علمائے امت کی ہمنوائی میں، خدا کی زمین پر، خدا کے بندوں کی خلافت الٰہیہ کا قائل تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد، یکا یک یہ انکشاف ہوا کہ خلافت اللہِ فی الارض کا تصور، غیر اسلامی اور غیر قرآنی تصور ہے۔ ملاحظہ فرمایئے، طلوع اسلام کا یہ بدلا ہوا موقف بھی۔

۱- اصل یہ ہے کہ اس قسم کے باطل تصورات کا بنیادی سبب وہ عقیدہ ہے جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آ رہا ہے کہ خدا نے انسان کو ''اپنا خلیفہ'' بنایا ہے، یہ عقیدہ قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ ۶

---

۱ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۴۰ء، صفحہ ۵۷
۲ طلوع اسلام، اگست ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷۸
۳ طلوع اسلام، اگست ۱۹۴۰ء، صفحہ ۸۳
۴ طلوع اسلام، اگست ۱۹۴۰ء، صفحہ ۸۴
۵ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۶۷
۶ طلوع اسلام، جون ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۶

۲- یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا، تو یہ تصور غیر قرآنی ہے، قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، یہ عیسائیت کا تصور ہے۔ ۱

۳- ملوکیت مسلمانوں میں آئی تو اسی باطل تصور نے "السلطان ظل الله علی الارض" (بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے) کا روپ دھار لیا۔ اب امت بے چاری دُہرے عذاب میں مبتلا ہو گئی- دنیاوی امور میں بادشاہ، خدائی اختیارات کا حامل اور مذہبی امور میں مذہبی پیشوا۔ اس کی سند میں یہ کہا گیا کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، اور انسانوں سے مراد ہیں اس کے منتخب بندے............سلاطین اور علماء............حالانکہ خدا نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ ۲

۴- ہمارے ہاں ایک غلط تصور یہ بھی رائج ہے کہ انسان، دنیا میں "خدا کا خلیفہ" ہے (خلیفة اللهِ فی الارض)۔ یہ تصور بھی قران کے خلاف ہے، اللہ نے کہیں بھی انسان کو "اپنا خلیفہ" نہیں کہا۔ آدم کے متعلق اتنا ہی کہا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۳۰)- اپنا خلیفہ نہیں کہا۔ ۳

یہ چند اقتباسات، اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ خلافت الہیہ کے بارے میں، طلوعِ اسلام کا نظریہ، جبکہ وہ ہندوستان میں اشاعت پذیر تھا، اس نظریے سے مختلف بلکہ متضاد ہے جسے اس نے قیامِ پاکستان کے بعد پیش کیا ہے۔

آٹھویں مثال ...... وقتِ موت، مقرر ہے یا نہیں؟

کیا موت کا وقت مقرر ہے؟ یا نہیں؟ طلوعِ اسلام نے اس سوال کے جواب میں بھی متضاد رویہ اختیار کیا ہے، تقسیم ہند سے قبل، طلوعِ اسلام کا موقف یہ تھا کہ موت کا وقت، مقرر ہے اور وہ بھی ایسا کہ ایک لحہ کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے۔

یہ خیرات اس موت کی مصیبت کو ٹالنے کے لیے ہے جس کے متعلق قرآن کا فیصلہ ہے کہ اس کے وقتِ معین میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ ۴

لیکن جس طلوعِ اسلام کا اجراء پاکستان بننے کے بعد، کراچی سے اور پھر لاہور سے ہوا، اس کے نزدیک، موت کا وقت ہر گز مقرر نہیں ہے، چنانچہ وہ نظریۂ تعینِ وقتِ موت پر بایں الفاظ تنقید کرتا ہے۔

اگر موت اور مرض کو ایک مقررہ وقت پر آنا ہے تو پرہیز اور علاج سے متعلق، ان ہدایات کی ضرورت ہی کوئی نہیں تھی، قرآن کہتا ہے کہ مرض اور موت کے لیے قانون مقرر ہیں، یہ چیزیں اِنہی قوانین کے مطابق آتی ہیں اور اُنہی قوانین کے مطابق جاتی ہیں، لہٰذا، ایک خاص قانون کے مطابق عمر گھٹ جاتی ہے اور دوسرے قانون کے مطابق عمر بڑھ جاتی ہے، سورۂ فاطر میں اس کی تصریح موجود ہے جہاں یہ فرمایا کہ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ (۳۵/۱۱) نہ کسی کی عمر بڑھتی

---

۱ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۳۸

۲ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۷

۳ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۶۴

۴ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۶۷

ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر قانون کے مطابق۔ ۱

طلوعِ اسلام کے اس مضمون کو جب کتابی شکل میں ڈھالا گیا تو اس میں مندرجہ ذیل جملے کا اضافہ ہو گیا جس سے یہ تضاد اور بھی نمایاں ہو گیا۔

یاد رکھیے، موت کا وقت نہیں، قانون مقرر ہے۔ ۲

پرویز صاحب کا سابقہ مؤقف کہ ''موت کا وقت مقرر ہے'' ان کے بعد کے اُس مؤقف کے ساتھ متصادم ہے کہ ''موت کا قانون'' مقرر ہے۔

نویں مثال ...... انسانی فطرت ہے یا نہیں؟

فکر و نظر کے اعتبار سے، قیامِ پاکستان سے پہلے کے اور بعد کے طلوعِ اسلام میں جن امور میں فرق و تفاوت واقع ہوا ہے، ان میں سے ایک امر، انسانی فطرت کے وجود یا عدم وجود سے متعلق ہے، پاکستان بننے سے قبل، طلوعِ اسلام، انسانی فطرت کے وجود کو تسلیم کیا کرتا تھا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ، فطرتِ صحیحہ اور فطرتِ سلیمہ و فاسدہ کے متضاد وجود کا بھی قائل تھا، بعض چیزوں کو، وہ ''خلافِ فطرت'' اور بعض کو ''مطابق فطرت'' بھی قرار دیا کرتا تھا۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

گویا انسان کو اس کے صحیح راستہ پر قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی فطرت اگر بالکل خاموش کر دی گئی ہے تو اس کی یاد تازہ کر دی جائے، اگر وہ خارجی اثرات کے پردوں میں چھپ کر غافل ہو چکی ہے تو اسے بیدار کر دیا جائے، اگر وہ اخلاطِ فاسدہ کے امتزاج سے نحیف و کمزور ہو چکی ہے تو اس میں دوبارہ قوت پیدا کر دی جائے، اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرے کون؟ ۳

ایک مقام پر طلوعِ اسلام، فطرتِ سلیمہ اور فطرتِ صحیحہ کا ذکر، ان الفاظ میں کرتا ہے:

سب سے بڑی چیز، جو انسان کو صحیح راستہ پر چلنے سے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے جذبات، عقل یا فطرتِ سلیمہ پر غالب آ جاتے ہیں، جذبات کا قائم رہنا بھی ضروری ہے اور ان کا قائم رکھنا بھی۔ لیکن اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ انھیں فطرتِ سلیمہ کے تابع رکھا جائے، اس پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ قرآن کریم نے مثلاً اسی لیے مومنین کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ کاظم الغیظ ہوں گے یعنی غصہ کو دبا لینے والے، فنا کر دینے والے نہیں، اسے فطرتِ صحیحہ کے تابع رکھنے والے۔ ۴

اُن دنوں طلوعِ اسلام، انسانی فطرت کا اثبات، قرآنی آیات سے کیا کرتا تھا، صرف ایک مقام کی عبارت ملاحظہ فرمایے:

فطرتِ صحیحہ، باوجود ان تمام زنجیروں کے خطرے سے آگاہ ضرور کرتی رہتی ہے، جونہی جذبات (نفس امارہ) ابھرنے شروع ہوئے انسان کا قدم صحیح راستہ سے ڈگمگایا اور اسے (نفس لوامہ نے) للکارا۔ لیکن اگر جذبات غالب آتے رہیں تو رفتہ رفتہ اس

---

۱ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶۴-۶۵

۲ قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۳۶۳

۳ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۸

۴ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۶

کی آواز بھی دب جاتی ہے اور اگر ایک مدت تک یہ کیفیت جاری رہے تو یہ بے چاری بھولی بسری ہو جاتی ہے، اس حالت کا نام قرآن کریم کی اصطلاح میں فسق ہے فرمایا وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنسٰهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ '' اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے (اس جرم کے فطرتی نتیجہ کے مطابق) ان کی فطرت (نفس) کو بھلا دیا (فطرت صحیحہ بھولی بسری ہوگئی) یہ لوگ فاسقین ہیں۔ ۱

اس وقت، طلوع اسلام کو، خلافِ فطرت، امور کا بھی اعتراف تھا۔

تمھاری بنیادی غلطی یہ ہے کہ تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ایک انسان کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے، یہ غلط ہے اور خلافِ فطرتِ انسانی۔ ۲

لیکن یہی طلوع اسلام، جب متحدہ ہندوستان سے پاکستان پہنچا تو فطرتِ انسانی کے انکار پر اتر آیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ

یہ تمام خصوصیات انسان کی حیوانی سطح زندگی کی ہیں، ذہنِ انسانی کی یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ اس نے ان جذبات کو انسانی فطرت (Human Nature) قرار دے دیا، حالانکہ انسانی سطح زندگی (Human Level) اس سے یکسر الگ اور ممتاز ہے۔ یاد رکھیے! یہ انسان کے حیوانی جذبات ہیں (جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا) انسان کی نہ کوئی ''فطرت'' ہو سکتی ہے، اور نہ ''فطرت'' ہے۔ ۳

آگے چل کر، انسانی فطرت، کا پھر انکار کیا گیا ہے۔

حیوانی سطح زندگی پر انسان کے جبلی تقاضے تو ہیں لیکن انسانی سطح پر اس کی کوئی فطرت (Nature) نہیں۔ ۴

اب انسانی فطرت کو ماننا محض ضلالت ہی نہیں بلکہ سب سے بڑی گمراہی قرار پایا۔

انسانی ذات کے تذکرہ کے بعد، ہم ان چند ایک نظریات کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں جو ہمارے ہاں شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بنے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ ''انسانی فطرت'' کا ہے۔ ۵

اب یکا یک پاکستان میں ان پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ

فطرتِ انسانی کا عقیدہ، وحی کے منکرین نے وضع کیا، لیکن اس کی تبلیغ ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو وحی پر ایمان رکھنے کے دعویٰ سے مسلمان کہلاتے ہیں۔ ۶

یہ کہتے ہی پرویز صاحب کے جذباتِ غیظ و غضب میں تحرک پیدا ہوتا ہے، غصے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، چہرہ چیں بجبیں ہو جاتا ہے، اور پھر وہ انسانی فطرت کے قائلین پر یوں برسنا شروع ہو جاتے ہیں کہ

حرام جو یہ لوگ کبھی کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور ایسا کہنے کے اثرات اور نتائج کیا ہیں، بس بھیڑوں کی ایک قطار ہے جو صدیوں سے اس راستے پر چلی جا رہی ہے جس پر کبھی کوئی پہلی بھیڑ چلی تھی كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا

---

۱ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۸
۲ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۲۹
۳ طلوع اسلام، نومبر دسمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۰۴
۴ طلوع اسلام، نومبر دسمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۰۷
۵ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۳۲
۶ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۸

يَسْمَعُ إِلَّا دُعَآءً وَنِدَآءً صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۲/۱۷۱) ۱؎

لیکن انسانی فطرت کا یہ پہلو بڑا ہی تابناک اور تحیر انگیز ہے، کہ اس نے بالآخر، ان لوگوں سے بھی اپنے وجود کو تسلیم کروا ہی لیا جو اس کے منکر تھے، اور اسے منکرینِ وحی کا وضع کردہ عقیدہ قرار دیتے نہیں تھکتے تھے، چنانچہ وہ اس ساری ژاژ خائی کے بعد، مودودیؒ صاحب کی فطرت کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ

> اگر مودودی صاحب میں اخلاقی جرأت ہوتی تو وہ اس کا اعتراف کر لیتے کہ مجھ سے ایسا سمجھنے اور کہنے میں غلطی ہوگئی تھی جس کے لیے میں نادم ہوں، لیکن اپنی غلطی کا اعتراف تو ان کی فطرت میں نہیں۔ ۲؎

اس کے بعد، پرویز صاحب، کم وبیش، چودہ برس تک زندہ رہے، مگر حرام ہے جو کبھی انھوں نے سوچا ہو کہ جب انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں ہے اور مودودیؒ صاحب بہرحال، انسان اور بشر ہی تھے، تو مودودیؒ صاحب کی فطرت کا وجود کہاں سے ٹپک پڑا۔ کیا انکارِ فطرت کے بعد، اور اسے منکرینِ وحی کا وضع کردہ عقیدہ قرار دینے کے بعد، پرویز صاحب وہ پہلی بھیڑ کا کردار ادا نہیں کر رہے تھے جن کے نقش قدم پر بعد میں آنے والی بھیڑوں کو چل پڑنا تھا؟

دسویں مثال ...... دین یا مذہب؟

دین اور مذہب، عرف عام میں، ہم معنیٰ الفاظ ہیں، دین کی جگہ مذہب اور مذہب کی جگہ دین کا استعمال بکثرت ہر وقت اور ہر جگہ ہوتا رہتا ہے، لیکن پرویز صاحب نے پاکستان بننے کے بعد، یہ نرالی اُپج اختیار کی، کہ اسلام دین ہے، مذہب نہیں ہے، حالانکہ دین و مذہب دونوں مترادف المفہوم الفاظ ہیں، لیکن پاکستان میں اختراع پذیر ہونے والے اس نظریے کی وضاحت کو، ۱۹۶۷ء میں، اُس طلوعِ اسلام کا مقصدِ وجود قرار دیا گیا، جو ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا، چنانچہ پرویز صاحب نے ایک تقریر کے دوران یہ انکشاف فرمایا کہ

> حضرت علامہ کی وفات کے بعد، دین اور مذہب کے اس فرق کو نمایاں کرنے کی سعادت، اس ہیچ میرز کے حصہ میں آئی تھی، اور طلوعِ اسلام کے اجراء سے یہی مقصود تھا۔ ۳؎

کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ انسان کے سچ کی تو کوئی حد ہوتی ہے، لیکن جھوٹ کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی، جس وقت، جو چاہے، انسان اپنی زبان سے نکال دے اور قلم سے اچھال دے، کون پوچھنے والا ہے؟ آزادی کا یہی تو معنیٰ ہے، کہ آدمی جتنا چاہے جھوٹ بولتا چلا جائے، کیونکہ وہ اب آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو چکا ہے۔

آیئے اب اس بات کا جائزہ لیں کہ طلوعِ اسلام جب جاری ہوا تھا تو اس نے دین و مذہب کے اس خودساختہ فرق کو

۱؎ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۸

۲؎ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۵

۳؎ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۱

واضح کیا تھا یا ان دونوں الفاظ کو ہم معنٰی سمجھ کر، (بغیر کسی معنوی فرق کے) ایک دوسرے کا متبادل لفظ سمجھ کر استعمال کیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ اُن دنوں، یہ دونوں الفاظ، ایک ہی مفہوم کے حامل تھے، اور خود پرویز صاحب نے، (بعد کے خود ساختہ باہمی فرقِ معانی اور تفاوتِ مفاہیم کو واضح کرنے کی بجائے) ان دونوں الفاظ کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا تھا، ذیل میں، طلوع اسلام کے بالکل ابتدائی دور کے وہ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں، جو کبھی خود پرویز صاحب ہی کے قلم سے برآمد ہوئے تھے۔

> ۱- دنیا کے کسی حصہ میں اور تاریخ عالم کے کسی دور میں، حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسٰیؑ تک، جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہیں مذہب، وجہٗ جامعیت نہیں ملتا، قرآن کریم میں قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، قومِ بنی اسرائیل، قومِ فرعون، سب اقوام میں وجہٗ مشترک نسل یا وطن تھا، وہ عام طور پر قبائلی زندگی کا زمانہ تھا، انسانیت کی طفولیت کا وقت تھا، قوموں میں وجہٗ جامعیت نسل یا وطن ہی ہوا کرتا تھا حتّٰی کہ خود حضراتِ انبیاء کرام کی بعثت بھی انہی قوموں کی طرف ہوئی تھی وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا (۱۱/۵۰) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صَالِحًا (۱۱/۶۰) وغیرہ، عاد کی طرف، ان کے بھائی ہودؑ اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ۔ دوسری دنیا میں آ جایئے تو یونانی، رومی، مصری، ایرانی، تورانی، ساسانی وغیرہ سب اقوام میں وجہٗ جامعیت نسل اور وطن ہی تھا، مذہب نہ تھا، آریہ ورت میں تو قوم چھوڑ کر درنوں کی تقسیم بھی نسل سے ہوتی چلی آئی ہے، مذہب وجہٗ جامعیت کہاں ملتا ہے؟ اس کا جواب تو ایک ہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہی دنیا میں وہ قوم تھی جس میں وجہٗ جامعیت مذہب تھا۔ [۱]

اس اقتباس سے ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ مذہب کو دین ہی کے معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے، ایک اور مقام پر، پرویز صاحب، سورۃ المائدہ کی آیت (۵۴) کی وضاحت میں فرماتے ہیں۔

> یعنی جو تمھارے دین میں سے نکلتا جائے گا، دوسری قوم بنتا جائے گا اور ایسے لوگوں کے خلاف، اللہ ایسی قوم پیدا کر دے گا جن میں ایمان والوں کی خصوصیات ہوں گی، دیکھ لیجئے وجہٗ جامعیت مذہب ہے، وطن نسل وغیرہ کچھ نہیں۔ [۲]

اس اقتباس کے آغاز میں، جس معنٰی ومفہوم کے لیے دین کا لفظ لایا گیا ہے، ٹھیک اسی مفہوم و مدلول کے لیے آخر میں مذہب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ذرا اور آگے چل کر پھر لفظ مذہب کو دین ہی کے معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے۔

> اگر وطن ہی وجہٗ جامعیت ہو تو ایک ہندی مسلمان کو اس سے کیا غرض کہ ایک افریقی مسلمان پر کیا بیت رہی ہے ان دونوں کے درمیان تو وجہٗ جامعیت مذہب ہی ہے جس نے انھیں ایک جسم کے دو اعضاء بنا دیا ہے کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا لگ جائے تو آنکھ کے آبگینہ میں آنسو چھلک آئے۔ [۳]

یاد رہے کہ اب تک کے یہ تینوں اقتباسات، اس طلوع اسلام کے بالکل پہلے شمارے (مئی ۱۹۳۸ء) سے ماخوذ ہیں جس کے بارے میں ۱۹۶۷ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ اس کے اجراء کی غرض وغایت، دین و مذہب میں فرق وتفاوت کو نمایاں کرنا تھا، ان تین اقتباسات کے بعد، اب اگلے پرچے (یعنی جون ۱۹۳۸ء کے شمارے) کے اقتباساتِ پرویز بھی ملاحظہ فرمایئے۔

---

[۱] طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۵

[۲] طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۸

[۳] طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۵

ہم اپنے اس دعوے کو کہ اسلام پرائیویٹ عقیدہ نہیں بلکہ ایک اجتماعی مذہب ہے بتوفیقِ الٰہی، کتاب وسنت، آثار و تاریخ سے پوری طرح ثابت کر سکتے ہیں۔ ۱

اب ہم اس مسلم قوم پرست طبقہ کے امام، مولانا آزاد کے الفاظ میں اس بات کو ثابت کریں گے کہ مذہب اسلام پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک منظم مذہب ہے، جماعتی مذہب ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا آزاد کی یہ تحریریں اس وقت کی ہیں جب انھوں نے ہنوز ابھی ''قوم پرستی'' کا مسلک اختیار نہیں کیا تھا۔

۱۹۱۳ء کا ذکر ہے کہ انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک ریزولیوشن پاس کر دیا کہ شاہی مسجد میں ''سیاسی'' تقریریں کرنے کی اجازت نہیں، اس پر مولانا آزاد نے اپنے رسالہ الہلال میں چار مبسوط اور مفصل افتتاحی مقالے تحریر فرمائے جس میں اس جوش اور ولولے کے ساتھ، جو زمانہ قوم پرستی سے پیشتر، ان کی نمایاں خصوصیت تھی، انھوں نے کتاب وسنت سے ثابت کیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ سمجھنا کفر ہے، شرک ہے، جہالت ہے۔ ۲

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ وہم پیدا ہو کہ پرویز صاحب نے یہاں مذہب کا لفظ، صرف اس لیے تتبُّعاً استعمال کیا ہے کہ مولانا آزاد (جن کی تردید میں پرویز صاحب نے یہ مقالہ لکھا تھا) نے اس لفظ کو اپنے اقتباسات میں استعمال کیا ہے، لیکن دو وجوہ سے یہ بات غلط ہے اولاً اس لیے کہ خود مولانا آزاد نے مذہب کے لفظ کو چند مذہبی مراسمِ عبودیت تک محدود رکھنے کی بجائے، پوری انسانی زندگی کا لائحہ عمل کے معنوں میں استعمال کیا ہے، لہٰذا ان کے تتبع میں بھی اگر اس لفظ کو پرویز صاحب نے استعمال کیا تھا، تو پھر بالیقین یہ لفظ وہی وسیع مفہوم رکھتا ہے جسے بعد میں پرویز صاحب نے لفظ دین کا خاصہ و لازمہ قرار دیا تھا، ثانیاً اس لیے کہ خود پرویز صاحب نے، اپنے اقتباسات میں بھی، لفظ مذہب کو دین ہی کے معنٰی استعمال کیا ہے۔ مثلاً

''مسلم قومیت'' کا تصور، جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا ہے، اس نظریہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک منظم مذہب (Organised Religion) ہے، اور یہی خصوصیت ہے جو اسلام کو دیگر ادیان سے متمیز کرتی ہے، اس کے برعکس، ہمارے قوم پرست حضرات مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ قرار دیتے ہیں، اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔ ۳

۱۹۳۸ء کے طلوعِ اسلام کے ابتدائی شماروں میں سے تیسرا شمارہ، جولائی کا شمارہ تھا، اب اس کے اقتباسات بھی ملاحظہ فرمائیے، اور اس سوال کا جواب بھی ان عبارات میں واضح ہے کہ اسلام مذہب ہے یا دین؟ نیز یہ بھی کہ کیا طلوعِ اسلام نے مذہب اور دین کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کا ''مناسب'' لفظ اختیار کیا ہے؟ یا مذہب کا ''غیر مناسب'' لفظ؟

اس پر شاید یہ کہا جائے کہ جو اشتراکیت، آیندہ حکومت کا خاکہ تیار کرے گی اور اشتراکیت کی بنیاد پر تعمیر کا نقشہ بنائے گی، اس کو پہلے خود مذہب سے آزاد ہونا چاہیے تاکہ وہ مذہب کے خلاف نبرد آزما ہو سکے، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی اکثریت خود ایک مستقل مذہب کی علمبردار ہے اور اس کو اپنا مذہب اتنا ہی عزیز ہے جتنا مسلمانوں کو اپنا مذہب اسلام۔ ۴

بلاشبہ اشتراکیت، خدا اور مذہب کی دشمن ہے، اخلاق اور روحانیت کے منافی ہے، مگر ہندو ''مذہب'' کے خلاف نہیں ہے۔ ۵

۱ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۶ ۲ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۷
۳ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۹ ۴ + ۵ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۸

کیا پاکستان بننے کے بعد، پرویز صاحب، اسلام کے لیے جس لفظ کو استعمال کیا کرتے تھے، اس کا استعمال، وہ ہندوستان میں نہیں کیا کرتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص کوئی ''جھوٹ'' اختیار کرتا ہے تو خواہ کتنی ہی احتیاط برتے، اس کو دوام کے ساتھ نباہ نہیں سکتا، اب دعویٰ تو پرویز صاحب کا یہ تھا کہ طلوعِ اسلام کے اجراء کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ دین و مذہب میں فرق و تفاوت کو واضح کرے، لیکن جملہ اقتباساتِ پرویز، نہ صرف یہ کہ اس فرق کو واضح نہیں کرتے، بلکہ ان دونوں الفاظ کو ہم معنیٰ اور ایک ہی مفہوم کا حامل سمجھتے ہوئے، استعمال کرتے رہے ہیں۔ اب مندرجہ ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے:

> اب تصور کیجئے ایسی حکومت کا جو خدا کی منکر ہو، مذہب کی دشمن ہو، اخلاق کے لیے سمِ قاتل ہو، انسانوں کو قوم و وطن کے دائرہ میں محبوس کرنے والی ہو اور جس کا مذہب اور نصب العین صرف روٹی اور مادی دنیا کی چندروزہ خوش حالی ہو، اور پھر تصور کیجئے اسلام جیسے پاکیزہ اور مقدس مذہب کا، جس کی بنیاد خدائے تعالیٰ کا وجود ہو، جس کی اساس مکافاتِ عمل یعنی آخرت کا عقیدہ ہو، جس کا ستون مکارمِ اخلاق اور تزکیۂ نفس ہو اور جو بہمہ وجوہ اس قدر مکمل اور جامع ہو کہ دین اور دنیا کی سعادتیں اس میں جمع ہو گئی ہوں، اس پر اشتراکی حکومت کی بدولت کیا گزرے گی۔ [1]

آگے چل کر، پھر پرویز صاحب، ''مذہب'' کو، اسلام ہی کے مفہوم میں بطور ''دین'' پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> یہ ہیں وہ وجوہ و اسباب جو مسلمانوں کو کانگرس کی شرکت سے روکتے ہیں اور ان کو اپنی علیحدہ تنظیم اور اپنی علیحدہ مرکزیت کے قیام کی طرف توجہ دلاتے ہیں ورنہ حریتِ عمل اور استقلالِ حیات کا جذبہ مسلمان کا مذہب اور ایمان ہے اور وہ ہندو سے زیادہ آزادی کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ [2]

مسلمان جب تک مذہب اسلام پر قائم ہے وہ ایک انچ بھی جادۂ مذہب سے ادھر ادھر نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ وہ **وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ** کے حکم خداوندی میں جکڑا ہوا ہے وہ بازارِ سیاست میں ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی بنیاد پر کوئی سودا بازی نہیں کرسکتا، وہ یہ کہہ کر اپنے اصولوں سے منحرف نہیں ہوسکتا کہ ''سیاسی مصلحتیں بدلتی رہتی ہیں اور سیاست میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں''۔ اس کے نزدیک حرفِ آخر، صرف قرآن و سنت کے احکام ہیں، اور جہاں کہیں خدا یا رسول کا حکم آ گیا وہاں:

> مسلمان اس مقام پر مجبور ہو جاتا ہے، فریقِ مقابل، اس کی مجبوری کو نہیں سمجھتا اور کہہ دیتا ہے کہ ''دیکھو صاحب! ہم معاملہ کے تصفیہ پر آمادہ ہیں، لیکن یہ حضرت عجیب قسم کے واقع ہوئے ہیں، اپنی سی کہے جاتے ہیں، ان سے معاملہ طے کیسے ہو، بات تو جب ہو کہ کچھ ہم بڑھیں کچھ یہ گھٹیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ اتحاد و مفاہمت چاہتے ہی نہیں، یہ تو انگریزوں کے پٹھو ہیں، یہ تو جنگ آزادی کے راستے میں سنگِ گراں بن کے بیٹھے رہنا چاہتے ہیں''۔ مسلمان یہ سب کچھ سنتا ہے اور متعجب ہو کر رہ جاتا ہے کہ یا اللہ! میں نے وہ کون سی خطا کی ہے جو اس قسم کی سب و شتم کا نشانہ بنایا جا رہا ہوں، وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ ''بھائی! یہ میرے مذہب کا معاملہ ہے، میں اس میں مجبور و بے بس ہوں'' تو اس پر پھر ایک شور بلند ہو جاتا ہے کہ ''لو بھئی! اب کونسل کی نشستوں میں بھی مذہب آ گھسا، بندے ماترم کا گیت بھی مذہبی مسئلہ بن گیا، اور ہندی کا جھگڑا بھی دین کا معاملہ ہو گیا''، مسلمان پھر یہ

[1] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۹ [2] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۲

سب کچھ سنتا ہے اور کہنے والوں کا منہ تکتا رہ جاتا ہے اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ۔

یا رب! یہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات   دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

لہٰذا برادران وطن جب تک مسلمان کی اس مجبوری کو نہیں سمجھیں گے، ملکی معاملات نہیں سلجھ سکتے، جب تک انہیں اس بات کا یقین نہیں آ جائے گا کہ ایک مسلمان کے لیے پولنگ اسٹیشن پر جا کر صحیح ووٹ دینا بھی ایسا ہی مذہبی فریضہ مقدس ہے جیسا کہ نماز پڑھنا۔ سیاسی مسائل کے اختلافات کا کوئی حل تجویز نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت ہم ایک نشست میں اتنا تو نہیں کر سکتے کہ اسلام کے جملہ عناصر ترکیبی کو سامنے لا کر یہ بتا دیں کہ بساط سیاست کے جن جن گوشوں کو ہندو خالص دنیاوی اور ملکی مسائل سمجھتا ہے وہ مسلمان کے نزدیک عین دینی اور مذہبی معاملات ہیں۔ [1]

اسی مقالہ میں آگے چل کر، یہ اقتباس بھی موجود ہے۔

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کا اپنا ذاتی خیال ہے، یا وہ بحیثیت مسلمان، مذہب کی رو سے ایسا کہنے اور کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر تو وہ ان کا اپنا خیال ہے تو اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ "خیال" نہیں بلکہ قرآن حکیم کا حکم ہے تو پھر تو جب تک ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، وہ اس بنیادی اصول سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتا۔ ساری دنیا اس کی مخالفت کرے، اسے فرقہ پرست کہے، ضدی قرار دے، "غدار وطن" اس کا نام رکھے، جو جی میں آئے کہتی جائے، وہ فیصلے میں تبدیلی تو ایک طرف، تبدیلی کا خیال تک بھی نہیں لا سکتا۔ [2]

چند صفحات بعد، اسی مقالہ میں، یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

مسلمان فی ذاتہ ایک مستقل قوم (Nation) ہے اور یہ کسی مخلوط قوم (Nation) کا جزو بن ہی نہیں سکتے۔ مذہبا یہ ناممکن ہے، یہ جب تک مسلمان رہے گا، ایک قوم، ایک جماعت کی حیثیت سے رہے گا، جب کسی مخلوط قوم میں جا کر مل جائے گا، اسلام کے دائرے سے باہر چلا جائے گا۔ [3]

آگے چل کر، کانگرس کے متعلق (جو ہندوؤں اور بعض مسلمانوں پر مشتمل، بھارت کی سیاسی پارٹی تھی)، یہ واضح کیا جاتا ہے کہ

اسلام کے نزدیک چونکہ مسلم و غیر مسلم کی مخلوط جماعت کا تصور ہی باطل ہے، اس لیے مسلمانوں کے نزدیک یہ جماعت غیر مسلموں کی جماعت ہی رہے گی، مسلمان ایسا سمجھنے، ایسا ماننے اور ایسا کہنے پر اپنے مذہب کی رو سے مجبور ہے، اس میں نہ کسی سیاسی مصلحت کو دخل ہے، نہ کسی ذاتی رائے کو۔ [4]

یہ جملہ اقتباسات، اس امر پر کھلی کھلی دلیل ہیں کہ قیام پاکستان سے قبل، دین سے مراد وہی کچھ تھا جسے مذہب کہا جاتا ہے اور مذہب سے مفہوم بھی وہی کچھ تھا جسے دین کہا جاتا ہے، دین اور مذہب دونوں ایک دوسرے کے باہم مترادف اور ہم معنی الفاظ تھے، اور اسلام کے لیے دونوں الفاظ کا استعمال خود پرویز صاحب کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، ان دنوں، وہ، اسلام کے

---

۱ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۰-۵۱
۲ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۲
۳ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۷
۴ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۶۲

لیے دین اور مذہب (دونوں الفاظ) کا استعمال نہ صرف یہ کہ جائز سمجھا کرتے تھے بلکہ عملاً ان دونوں کا اطلاق بھی کیا کرتے تھے، لیکن قیام پاکستان کے بعد، ان پر یہ انکشاف ہوا کہ دین کسی اور چیز کا نام ہے اور مذہب کسی اور ہی شئے کو کہتے ہیں۔ پھر دین و مذہب کی یہ تفریق طے کر ڈالنے کے بعد، مذہب کے لفظ کا اطلاق، ان تعلیمات پر بالالتزام کیا جانے لگا جو اسلام کے حوالے سے علماء کرام پیش کیا کرتے ہیں اور دین کا لفظ، انھوں نے خود اپنے بیان کردہ تصورات واعمال کے لیے مخصوص کر دیا، علماء امت کے پیش کردہ دین کو ''عجمی سازش'' کے نام سے مطعون کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور خود اپنے بیان کردہ مذہب کو ''قرآنی دین'' کے طور پر سُر اہنے لگے، اس طرح دین اور مذہب کے دونوں الفاظ میں معنوی مغائرت پیدا کرتے چلے گئے۔ پھر وہ بڑی بلند آہنگی کے ساتھ اس قسم کے اعلان کرنے پر تُل گئے کہ:

> حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے، قرآن نے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں کیا، قرآن نے مسلمانوں کو مذہب نہیں دیا، دین عطا فرمایا ہے، اور دین کے معنی آج کی اصطلاح میں نظام معاشرت (Social Order) یا نظام مملکت (System of State) ہیں۔ ۱

اسی صفحہ پر نیچے حاشیہ میں پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

> اہل مغرب، قرآنی زندگی سے واقف نہیں تھے، اس لیے انھوں نے اسلام کے لیے بھی (Religion) کا لفظ اختیار کیا۔ ۲

چونکہ مذہب (Religion) کا لفظ اہل مغرب نے اختیار کیا تھا، اس لیے پرویز صاحب نے بڑی ذہانت اور فطانت سے کام لیتے ہوئے، اس لفظ کو علماء کرام کی طرف منسوب کر دیا بلکہ ان کے لیے مخصوص کر دیا اور اپنے لیے دین کا لفظ اختیار کر لیا، اور پھر علماء پر یہ طنز کرنا شروع کر دی کہ ''مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے'' اور خود یہ بات بھول گئے کہ طلوع اسلام کے ہر شمارہ کے سرورق کی پیشانی پر ''نظام ربوبیت'' کا جو لفظ لکھا جاتا ہے وہ کونسا قرآنی لفظ ہے، لیکن ۔

غیر کی آنکھوں کا تنکا، تجھ کو آتا ہے نظر دیکھ اپنی آنکھ کا، غافل، ذرا شہتیر بھی!

ایک اور مقام پر، دین اور مذہب میں، (اپنے خود ساختہ) فرق وتفاوت کی وضاحت، ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ''مذہب'' اور ''دین'' کے بنیادی فرق کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے، اسلام دین ہے، مذہب نہیں۔ مذہب سے مفہوم یہ ہے کہ انسان، خدا کے ساتھ، اپنا پرائیویٹ رشتہ جوڑے، اپنی نجات کی فکر کرے، اس کے لیے خدا کی ''پرستش'' کرتا رہے۔ باقی رہے دنیاوی امور اور اجتماعی مسائل حیات، سو انھیں اپنی صوابدید کے مطابق خود حل کرے، مذہب کا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس، دین سے مقصود یہ ہے کہ............ ۳

حقیقت یہ ہے کہ اس اقتباس میں ''مذہب'' کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، وہ اہل مغرب کا تصور ہے، جیسا کہ خود پرویز صاحب کو بھی تسلیم ہے، اسلام کا تصور، خواہ اسے دین کہیے یا مذہب، وہی ہے جو قرآن وسنت پر مبنی نظام معاشرت یا نظام مملکت کہلاتا ہے اور جسے متحدہ ہندوستان میں خود پرویز صاحب بھی اور مولانا مودودیؒ بھی پیش کیا کرتے تھے، البتہ پاکستان بننے کے

---

۱ + ۲ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳۱   ۳ طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۲

بعد، پرویز صاحب نے اسلام کو (i) مبنی بر قرآن وسنت کہنے کی بجائے، فقط قرآن ہی پر اساس پذیر کہنا شروع کیا اور (ii) پھر اسلام کے لیے لفظ دین کو اپنی خودساختہ تشریحات کے لیے خاص کر لیا، لیکن مودودیؒ صاحب نے قرآن وسنت پر مبنی نظام حیات کو، (خواہ دین کہا یا مذہب) اسلام ہی قرار دینے کی روش کو برقرار رکھا۔ ملاحظہ فرمایئے، ان کا ایک اقتباس، جس میں وہ ''مذہب کا اسلامی تصور'' کے زیر عنوان، فرماتے ہیں:

> محمد ﷺ جس غرض کے لیے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصور کو مٹا کر ایک عقلی وفکری تصور پیش کریں اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اس کی اساس پر تہذیب وتمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھادیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنیٰ ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے، ایسی چیز کو دین ومذہب کے نام سے پیش کرنا ہی غلط ہے، حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو، زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو، فہم وشعور اور فکر ونظر ہو، صحیح وغلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے، راہِ کج سے بچائے، راہ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں، جو دنیا سے لے کر، آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی وسعادت کے ساتھ گزار دے۔
>
> اسی مذہب کا نام اسلام ہے، یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے ماتحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دیا جائے، یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق، سے بحث کرتا ہے، اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا مقصد، انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزاء ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ [1]

الغرض، اسلام کو خواہ دین کہا جائے یا مذہب، وہ پوری زندگی پر حاوی نظامِ فکر وعمل کا نام ہے۔

خارزارِ تضاداتِ پرویز

رہا پرویز صاحب کا یہ فرمان کہ...... ''اسلام، دین ہے، مذہب نہیں''...... تو یہ سب کچھ، ان کی ان تحریروں سے متضاد ہے، جن کو وہ متحدہ ہندوستان میں پیش کرتے رہے ہیں، کل تک وہ خود اسلام کو مذہب کہا کرتے تھے، لیکن آج وہ اس کے مذہب ہونے سے منکر ہیں، اور دین ہونے کے قائل ہیں، حالانکہ اس لفظی جنگ سے اگر الگ ہو کر دیکھا جائے تو عرفِ عام میں، دین اور مذہب ایک ہی چیز کا نام ہے۔

تضاداتِ پرویز کی یہ دس مثالیں، ان بیسیوں بلکہ سینکڑوں مثالوں میں سے چند ایک ہیں جنھیں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں وہ تضادات شامل نہیں ہیں جو قیام پاکستان کے بعد، ان کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں، اور

---

[1] تحریک آزادی ہند اور مسلمان، جلد اول، صفحہ ۱۰۹ تا صفحہ ۱۱۰

وہ تضادات بھی شامل نہیں ہیں جو ترجمہ آیات یا مفہوم آیات سے متعلق ہیں۔ ان تضادات کو بھی یہاں نظر انداز کیا گیا ہے جو ان کے تفسیری مواد سے متعلق ہیں۔ نیز ان میں وہ تضادات بھی ہماری دانستہ چشم پوشی کا شکار ہوئے ہیں، جن میں انھوں نے ''مفتی'' بن کر اپنے اور بیگانے تمام افراد کو نشانہ بنایا ہے۔ ان تمام تضاداتِ پرویز کو اگر جمع کیا جائے، تو اچھا خاصہ موسوعہ تیار ہو جائے، لیکن حیرت بالائے حیرت تو یہ بات ہے کہ طلوع اسلام، اپنے ان تضادات کے باوجود بھی، بڑی بلند آہنگی کے ساتھ، یہ اعلان بھی کرتا ہے اور اعلان بھی اپنے مخالفوں کو مطعون کرتے ہوئے بتکرار و اعادہ کرتا ہے کہ

> مفاد پرستوں کے خودساختہ اسلام کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے، لیکن مصلحت اندیشیوں کی دیمک نے انھیں اس طرح چاٹا کہ ان کا ایک حرف بھی زمانہ کے صفحہ پر دکھائی نہیں دیتا، لیکن تغیرات کی ان آندھیوں میں اور انقلابات کے ان جھکڑوں میں ایک طلوع اسلام ہے کہ جس میں آپ کو نہ کہیں تضاد ملے گا، نہ تخالف نظر آئے گا۔ [1]

...... ''چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد'' ...... کے الفاظ، ایسے ہی موقع پر بولے جاتے ہیں۔ اپنے تضادات سے چشم پوشی کرتے ہوئے، دوسروں کی تصانیف سے خورد بینی مطالعہ کے ذریعہ، تناقضات کو تلاش کرنا اور عدم دستیابی کی صورت میں، ذہنی چابکدستی کی بناء پر، انھیں ''پیدا کر ڈالنا'' اور پھر انھیں مسلسل اچھالتے چلے جانا، فقط اس لیے ہے کہ قارئین، دوسروں کے تضادات کی آڑ میں، خود اس کے اپنے تضادات کو نظر انداز کر دیں، اس معاملہ میں، طلوع اسلام کی ہمیشہ یہی روش رہی ہے۔ وہ مولانا مودودیؒ کی عیب جوئی، اور ان پر حرف گیری میں صرف اس لیے شدت اختیار کرتا رہا ہے کہ اس کے (یا پرویز صاحب کے) اپنے عیوب و نقائص، اس کی آڑ میں چھپے رہیں۔ چالاک اور عیار لوگ، اپنے عیبوں پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے، مسلسل دوسروں کی عیب چینی کرتے رہتے ہیں، اس نفسیاتی حقیقت کو خود، طلوع اسلام، نے بھی بیان کیا ہے۔ اس لیے اُسے نہایت ادب سے التجاء و التماس کیا جاتا ہے کہ

> وہ اپنی اس روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس، دوسروں کی تنقیص میں اس لیے مصروف ہے تاکہ اپنی سہل انگاری ڈھکی رہے، اور اسے چھپانے کے لیے اس نے بلند نصب العین کو آڑ بنا رکھا ہو، فریب نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ [2]

طلوع اسلام اور پرویز صاحب، اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت اور خوش نصیب تھے کہ انھیں ایسے اندھے مقلدین کا ٹولہ میسر آ گیا جنھیں یا تو یہ صریح تضادات نظر ہی نہیں آتے، یا پھر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ''مصلحت اندیشیوں کی دیمک نے انھیں چاٹ کر'' فی الواقع کالعدم کر دیا ہے، اور اب تضادات، انھیں دکھائی ہی نہیں دیتے، اور وہ یہ کہنے میں خود کو ''حق بجانب'' سمجھتے ہیں کہ:

> پرویز صاحب کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نہ کبھی پرانی ہوتی ہیں اور نہ ہی ان میں کہیں تضاد واقع ہوتا ہے، یہ اس لیے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، قرآن کریم کی روشنی میں لکھتے ہیں اور قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اس کے حقائق کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ [3]

---

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۹ [2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۳ [3] طلوع اسلام، فروری ۱۹۸۳ء، صفحہ ۲۶

لیکن بے چارے اندھے مقلدین کے متعلق تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ پرویز صاحب یا خود طلوع اسلام کے برسوں پر پھیلے ہوئے، تضادات پر ان کی نگاہ حاوی نہ ہو سکی ہو، اس لیے وہ تضاداتِ پرویز کی نفی کرنے کے اعلان میں معذور ہیں، لیکن خود پرویز صاحب پر بہر حال یہ بات عیاں تھی، کہ وہ کس قدر متناقض الکلام اور تضاد گو واقع ہوئے تھے۔ اس لیے انھیں طلوع اسلام کے ذریعہ، دنیا کو یہ تحدی پیش کرتے ہوئے شرمانا چاہیے تھا کہ:

> اس کی اشاعتوں کے انبار میں سے آپ کوئی سے دو پرچے اٹھا لیجئے، جہاں تک قرآنی فکر کا تعلق ہے، آپ کو ان میں کوئی تضاد، کوئی تخالف نہیں ملے گا۔ [۱]

لیکن اس شرم و ہچکچاہٹ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، پرویز صاحب نہ صرف یہ کہ اپنے تضادات کے عدم وجود کا اعلان کیا کرتے تھے، بلکہ وہ اپنے ساتھ، قرآن مجید کو بھی گمراہی کے کھڈ میں لے گرا کرتے تھے، اور یہ کہا کرتے تھے کہ تضاد و تناقض کے عدم وجود کی وجہ، ان کا قرآن کریم کی روشنی میں لکھنا ہے، اور چونکہ قرآن، خود تضادات سے بالاتر ہے، اس لیے ان کی تحریریں بھی تضادات سے بالاتر ہیں۔

> میں نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا ۱۹۸۰ء میں بھی وہی کہتا ہوں کیونکہ یہ قرآنی حقائق پر مبنی ہے، اور قرآنی حقائق ابدی اور غیر متبدل ہیں..... قرآن کو سند اور حجت ماننے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے اور کل کچھ اور۔ قرآن کا متبع نہ مداہنت کر سکتا ہے نہ کسی سے مفاہمت۔ [۲]

ہر وہ شخص، جس کی نگاہ، ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۸۵ء میں پرویز صاحب کی وفات تک کی طلوع اسلام کی فائل پر حاوی ہے، یہ جانتا ہے کہ طلوع اسلام اور کتبِ پرویز، تضادات و تناقضات کا وسیع و عریض صحرا ہے۔ آج کچھ، کل کچھ، یہاں کچھ، وہاں کچھ، کبھی کچھ، کبھی کچھ، حجاب نسواں، گیت سنگیت، مصوری و تمثال سازی، ملکیتِ مال و اراضی، ضبط تولید، خلیفۃ اللہ اور خلافتِ الٰہیہ، انسانی فطرت، وقتِ موت کا تعین و تقرر، دین و مذہب کے معنی و مفہوم میں فرق، سنت رسول اللہ کی حیثیت، بطور ماخذِ قانونِ اسلام، الغرض ان تمام امور میں، اور ان جیسے دیگر بیشمار امور میں سے وہ کونسا امر ہے جس میں واضح تضاد و تناقض کا رویہ اختیار نہیں کیا گیا، اور لطف یہ کہ تمام متضاد اور متناقض رویے، ''قرآن ہی کی روشنی'' میں اپنائے گئے ہیں، اس سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو قرآن (معاذ اللہ) خود متناقض اور متضاد تعلیم پیش کرتا ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ جو چیز، قبل از قیامِ پاکستان، عین اسلام تھی، بعد از تقسیم برصغیر، وہی چیز کفر و شرک قرار پا گئی، یا پھر، قرآن کریم کے واحد سند اور حجت ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے والے، دل سے اس کی سندیت اور حجیت کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ، بقولِ پرویز..... ''قرآن کو حجت اور سند ماننے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے اور کل کچھ اور......'' ......امر واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب، معتقد تو ان افکار و نظریات کے ہیں جو تہذیب مغرب نے پیش کیے ہیں، ان کا یقینِ محکم تو ان اصول و اقدار پر ہے جو فرنگی معاشرت اور یورپی

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۸۴ء، صفحہ ۳۳ [۲] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۸۳ء، صفحہ ۵۲

سماج کی اساس ہیں، وہ ایمان تو اس نظام معیشت پر رکھتے ہیں، جسے اشتراکیت کہتے ہیں، لیکن وہ قرآن کی ورق گردانی، صرف اس لیے کیا کرتے ہیں، کہ اپنے محبوب و مستعار افکار و نظریات اور اصول و اقدار کی حمایت میں قرآن سے "تائیدی دلائل" فراہم کر پائیں، اور جب کوئی شخص، اپنے دل و دماغ میں، پہلے سے کچھ معتقدات کو راسخ کر لے، اور پھر ان کی تائید حاصل کرنے کے لیے، قرآن کی طرف راجع ہوتا ہے، تو ایسی بلی کو چھیچھڑوں کے خواب آ ہی جایا کرتے ہیں، خود پرویز صاحب لکھتے ہیں۔

جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اتر آئے تو اسے اس سے اپنی کون سی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی؟ [1]

یوں پرویز صاحب کو اپنے ہر مزعومہ کی "سند" قرآن سے ملتی رہی، پھر جنھوں نے، اُن کی اس "قرآنی سند" سے انکار کیا، انھیں، پرویز صاحب نے قرآن کریم ہی کا منکر اور مخالف قرار دیا۔

میں بلاتشبیہ اور بلاتمثیل عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ لوگ میری مخالفت نہیں کرتے، کتاب اللہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ [2]

حالانکہ پرویز صاحب کی مخالفت کرنے والے لوگ، واقعتاً، قرآن کے مخالف نہیں بلکہ صرف اُس مفہوم کے مخالف ہیں جسے پرویز صاحب نے منسوب الی القرآن کر رکھا ہے، وہ اپنی ذاتی تعبیراتِ قرآنیہ کو "قرآنی حقائق" اور "قرآنی دعاوی" قرار دے کر، پیش کیا کرتے تھے، اور نہ ماننے والوں پر بزعمِ خویش، "اتمام حجت" کیا کرتے تھے۔

ہمارا مقصد صرف قرآنی حقائق پیش کرنا ہے، اس سے اگر کسی کے مروجہ عقیدہ یا کسی کے کسی دعویٰ پر زد پڑتی ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی کیونکہ اس باب میں مدعی قرآن ہے، ہم نہیں، ہمارا فریضہ، قرآن کے دعاوی کو پیش کرنا ہے اور بس۔ [3]

امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے گلے، مڑھے جانے والے تصور کی مخالفت، کسی صورت بھی قرآن کی مخالفت قرار نہیں پاسکتی، خود پرویز صاحب ہی کا یہ فرمان ہے کہ ان کی "بصیرت کی روشنی" میں، قرآن سے ماخوذ تصور، میں سہو و نسیان کا امکان موجود ہے کیونکہ یہ بہر حال، انسانی کوشش ہے۔

قرآن تو وحی الٰہی ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں، لیکن میں اپنی قرآنی بصیرت کو کبھی وحی الٰہی قرار نہیں دیتا، اس لیے اس میں سہو و خطا، دونوں کا امکان ہے۔ بناء بریں، میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ حرفِ آخر ہے، اور وحی الٰہی کی طرح منزہ عن الخطاء۔ [4]

یہ ہاتھی کے صرف دکھانے کے دانت ہیں، کھانے کے نہیں۔ قولاً تو وہ یہی کہتے ہیں کہ "میری قرآنی تعبیر، انسانی تعبیر ہے، جس میں نسیان و سہو کے دونوں پہلو موجود ہیں اور یہ حرف آخر نہیں"، لیکن عملاً وہ، اپنی تعبیر کو قرآنی حقیقت اور خدائی حکم کا درجہ دیتے ہیں، اور اسے نہ ماننے والوں پر، وہ "منکر قرآن" ہونے کا فتویٰ رسید کرتے ہیں۔ چنانچہ، ان کے ایسے ہی "قرآنی حقائق" اور "خدائی احکام" کا انکار، جب مولانا مودودیؒ نے کیا تو پرویز صاحب نے انھیں یکے از منکرینِ قرآن قرار دیا۔

طلوع اسلام نے اپنی سابقہ اشاعت میں قرآنی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ یتیم پوتا، اپنے دادا کی وراثت سے محروم نہیں ہو

---

[1] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۳
[2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵۲
[3] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۸۵ء، صفحہ ۲۱
[4] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۳

سکتا، اس کے جواب میں، منکرین قرآن کی طرف سے جو جواب شائع ہوا وہ ملاحظہ فرمائیے۔ [1]

اب ظاہر ہے کہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ، قرآن میں صراحتِ نص کے ساتھ کہیں مذکور نہیں ہے، دراصل، پرویز صاحب کی استنباطی موشگافیاں ہیں جنھیں انھوں نے ''قرآنی دلائل'' کا نام دیکر بطور ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کی مخالفت میں جن ''منکرین قرآن'' کی طرف سے جواب شائع کرنے کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے مراد مولانا مودودی مرحوم ہیں۔ کیونکہ اقتباس بالا میں، جس جواب کی اشاعت کا ذکر ہے، وہ مولانا مودودیؒ ہی کا جواب (بصورت اقتباس) ہے۔

پاکستان میں طلوعِ اسلام کا ابتدائی دور

پاکستان بنتے ہی، پرویز صاحب نے، اس اسلام کے بارے میں، جس کے نفاذ کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا، پراگندہ خیالی اور ژولیدہ فکری پیدا کرنے کی ٹھان لی، متحدہ ہندوستان میں، اگرچہ وہ قرآن وسنت کا نام لیا کرتے تھے، لیکن پاکستان آ کر، اب انھوں نے، کتاب بلا پیغمبر اور قرآن بلا محمد کا نرالا مسلک اپنایا، قرآن وحدیث یا کتاب وسنت کی بجائے، صرف قرآن یا کتاب اللہ ہی کو ماخذِ اسلام قرار دیا۔ اس سے قبل، جب وہ قرآن کا نام لیا کرتے تھے تو ان کا تصورِ قرآن، سنتِ رسولؐ سے منقطع نہ تھا، لیکن اب تنہا قرآن، بغیر سنتِ نبویہ کے، ان کا تکیۂ کلام بن چکا تھا، چنانچہ طلوعِ اسلام نے، ان تمام امور میں، جن میں مصلحتاً، امت مسلمہ کے افکار ونظریات کی ہمنوائی کیا کرتا تھا، اب قطعی متضاد اور مخالف روش اختیار کر لی، اور تنہا قرآن کی آڑ میں، ایک بالکل نیا نظام معاشرت اور نظام مملکت وضع کرنے پر تل گیا۔ اِس نئے ضابطۂ حیات اور لائحۂ عمل کی بنیاد، چونکہ قرآن وسنت کی بجائے، صرف قرآن قرار دی گئی تھی، اور اس سے استنباط کرنے والی شخصیت، مغربی معاشرت اور اشتراکیت سے ذہناً مرعوب ومسخر تھی، اس لیے اس کا ہر جزو، اس اسلام کے خلاف تھا، جو مبنی بر قرآن وسنت تھا۔ اس طرح علماء امت اور پرویز صاحب کے درمیان، سب سے بڑا اختلاف، خود تصورِ اسلام ہی میں واقع ہو گیا جس کا اصلی اور بنیادی سبب، سنت نبویہ کی حجیت وسندیت کے بارے میں دونوں فریقوں کا باہمی اختلاف تھا۔ علماء امت تو ہمیشہ ہی سے قرآن کے بعد، حجیتِ سنت کے قائل رہے ہیں، لیکن پرویز صاحب (یا طلوعِ اسلام) قیام پاکستان سے قبل، اگرچہ، قرآن وسنت کی اساس پر، امت مسلمہ کے مسائل کے حل کے قائل تھے، لیکن پاکستان کی فضا میں آتے ہی، وہ کھلے بندوں انکارِ سنت کے مسلک کے پشتیبان بن گئے، اور سنتِ نبویہ کے متعلق، طرح طرح کے شکوک وشبہات پھیلانے میں گولڈزیہر، شاخت اور دیگر مستشرقین پر بھی بازی لے گئے، مخالفتِ حدیث اور اثارۂ شکوک وشبہات، پاکستان میں طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کا مستقل شیوہ بن گیا۔ مفہوم حدیث، تدوینِ حدیث، متنِ حدیث، الغرض، ہر پہلو سے اسے نشانہ بنایا جانے لگا۔ مولانا مودودیؒ اور پرویز صاحب کے درمیان بنیادی اختلاف، دراصل، یہی حجیتِ حدیث ہی کا مسئلہ تھا۔

---

[1] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵۸

''دو اسلام''

انکارِ حدیث اور حجیتِ سنت کی بنا پر، پرویز صاحب اور مولانا مودودیؒ کے مابین، نظامِ حیات کے تصورات میں انتہائی بعد اور مغائرت پیدا ہوئی، پرویز صاحب نے صرف قرآن کو ماخذِ قانون قرار دیکر، جو نظام حیات پیش کیا اس کا معاشی نقشہ، ہو بہو اور من وعن اشتراکیت سے ماخوذ ہے، اور جو نظام معاشرت، قرآن سے کشید کیا، اس کے جملہ اجزاء، مغربی معاشرت میں پہلے سے موجود ہیں مثلاً مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجاب و نقاب، مرد و زن کی مطلق اور کامل مساوات، خواتین کو درونِ خانہ فرائض کی بجائے، بیرون خانہ مردانہ مشاغل میں منہمک کرنا، تعددِ ازواج کو معیوب قرار دینا، عورت کو خانگی مستقر سے نکال کر، اسے مردانہ کارگاہوں میں لا کھڑا کرنا، خانگی زندگی میں، اس کے فطری وظائف سے، اسے منحرف کر کے، قاضی و جج بلکہ سربراہانِ مملکت تک کے مناصب پر براجمان کرنا وغیرہ، یہ سب وہ اجزائے معاشرت ہیں جنھیں اگرچہ پرویز صاحب نے قرآن مجید سے کشید کر ڈالنے میں بڑی زحمت اٹھائی ہے، لیکن تہذیب مغرب کے علمبردار، بغیر کسی قرآن کے، اسے پہلے ہی سے اپنائے ہوئے ہیں۔ دراصل، یہ پرویز صاحب کی مغرب کے مقابلہ میں، ذہنی غلامی کا منہ بولتا کرشمہ ہے۔

اس کے برعکس، مولانا مودودیؒ اور دیگر علماء کرام، قرآن وسنت کی بنیاد پر جو نقشۂ زندگی پیش کرتے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ، مغرب کے سرمایہ دارانہ مزاج کے خلاف ہے بلکہ پرویز صاحب کے اس نظام ربوبیت کے بھی خلاف ہے جسے انھوں نے اشتراکیت پر قرآنی ٹھپہ لگا کر پیش کیا ہے، رہا معاشرتی نظام، تو اس کے جملہ اجزاء، قرآن وسنت کی روشنی میں، مغربی معاشرت کے تمام اجزاء وعناصر کے بالکل متضاد اور مخالف ہیں۔

لیکن پرویز صاحب، مغربی تمدن وثقافت سے ماخوذ، معاشرتی ڈھانچے کو، جب اشتراکیت سے اخذ کیے ہوئے معاشی نظام کے ساتھ ملا کر، پیش کرتے ہیں تو اسے ''قرآنی نظام حیات'' کا نام دیتے ہیں، اور مولانا مودودیؒ اور علمائے امت کے، قرآن وسنت پر مبنی نظام حیات کی یہ کہہ کر مخالفت کرتے ہیں کہ یہ ''عجمی اسلام'' ہے۔ رہا ''خالص عربی اسلام''، تو اس کے اجزائے معاشرت، اقوام مغرب ہی میں پائے جاتے ہیں، اس کا معاشی نظام، بغیر کسی قرآنی یا آسمانی ہدایت کے، حضرت کارل مارکس اور اس کے خلیفۂ خاص، حضرت انجلز ہی سمجھ سکتے ہیں، اور جس کی عملی شکل، بعد میں، روس، چین اور دیگر ممالک میں نظر آتی ہے۔

دونوں میں اصل اختلاف، دونوں کے نظام ہائے حیات کا تھا، لیکن پرویز صاحب نے تہذیبِ جدید سے اخذ کردہ معاشی نظام اور اس کے معاشرتی اجزاء کو ملا کر، ''قرآنی نظام'' قرار دیا، اور مودودیؒ صاحب پر الزام عائد کیا کہ وہ ''قرآنی نظام'' کے مخالف ہیں۔ رہا مودودی صاحب کا پیش کردہ نظامِ حیات، جو قرآن وسنت کی اساس پر پیش کیا گیا ہے، تو وہ چونکہ پرویز صاحب کے پیش کردہ نظام کے بالکل برعکس ہے، اس لیے، اسے ''خلافِ قرآن'' اور ''عجمی اسلام'' کہہ کر مطعون کیا جانے لگا، اور

اس کے نفاذ کی راہ میں روڑے اٹکائے جانے لگے۔

زعماء مسلم لیگ کی جان کو دوگونہ عذاب

زعماء مسلم لیگ نے متحدہ ہندوستان میں، مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے لیے، اسلام کا نعرہ لگایا تھا، وہ محض ایک سیاسی حربہ تھا؟ یا فی الوقعہ مبنی بر اخلاص، مقصد تھا؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد، پاکستانی عوام اور علمائے کرام نے بالعموم اور جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودیؒ نے بالخصوص حکمرانوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اسلام کو نافذ کریں، حکمرانوں کا حال یہ تھا کہ وہ مغربی نظریات کا دودھ پی پی کر پلے تھے، ان کے گھروں میں دنیا جہاں کے سامان عیش و عشرت موجود تھے، لیکن جائے نماز تک نہ ملتا تھا۔ رہن سہن، بود و باش، طرز زندگی، لباس اور چال ڈھال سب مغربی رنگ میں مصبوغ تھے، نہ وہ اسلام کا مطالعہ رکھتے تھے اور نہ ہی عملی زندگی میں اسلام کے اثرات دکھائی دیتے تھے، اس لیے، نہ وہ اسلام کو جانتے تھے اور نہ ہی اسے نافذ کرنے کی کوئی مخلصانہ نیت رکھتے تھے، لیکن عوام الناس، علمائے کرام، اور جماعتِ اسلامی کی طرف سے مطالبۂ نفاذِ اسلام کے لیے عائد کیے جانے والے دباؤ پر، حکمران زچ ہو کر، پیچ و تاب کھا رہے تھے، ارباب اقتدار کے لیے، اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ، سانپ کے منہ میں چھچھوندر والا معاملہ بن چکا تھا کہ نہ ہی اگلے بنے، نہ ہی نگلے بنے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ وہ قولاً یہ اعلان کر نہیں سکتے تھے کہ ''ہم اسلام کو نافذ نہیں کریں گے''۔ اور عملاً ایسا کرنے میں وہ مخلص ہوتے بھی، تو اسلام سے عدم واقفیت کے باعث، ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔

غلام احمد پرویز کی خدمتِ سرکار

ایسے کٹھن وقت میں، جناب غلام احمد پرویز صاحب، حکمرانوں کے کام آئے، اور انھوں نے اسلامی نظام میں، جس کے نفاذ کے لیے علماء و عوام، دباؤ ڈال رہے تھے، کیڑے ڈالنا شروع کر دیے، اور سرے سے اسلامی نظام اور اس کے تصور ہی کو، ناقابل عمل قرار دینا شروع کر دیا، اور اس قسم کا پراپیگنڈہ کرتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ.......... ...... ''بھلا اس تہذیب و تمدن کے روشن دور میں چور کو قطع ید کی سزا دی جائے گی؟ زانی محصن کو رجم اور کنوارے زنا کاروں کو ضربِ تازیانہ کا نشانہ بنایا جائے گا؟ جنگی قیدیوں کو بعد از تقسیم، غلام اور ان کی عورتوں کو کنیزیں بنا کر رکھا جائے گا؟ پھر یہاں کئی فرقے موجود ہیں، کس فرقے کی فقہ (بلکہ اسلام) کو نافذ کیا جائے گا؟ کیا باقی فرقے، کسی ایک فرقے کی فقہ کے نفاذ کو گوارا کر لیں گے؟ جو علماء، نماز کے اختلافی مسائل کو ختم کر کے، کوئی متفق علیہ شکلِ نماز طے نہیں کر سکے وہ بھلا متفقہ ملکی دستور و آئین کی تشکیل میں کامیاب ہو جائیں گے؟ تب بھلا اسلامی نظام میں، فیصلے کا آخری اختیار، کیا علماء کے ہاتھ میں نہیں آ جائے گا؟ اگر ایسا ہو گا تو کیا یہ مذہبی پیشوائیت (Priesthood) نہیں ہو گی؟ پھر بھلا یہ اسلامی نظام، کیا آج کے ''ترقی یافتہ'' اور ''روشن دور'' میں چل بھی سکے گا؟ کیا علماء کا یہ اسلام، آج کے انتہائی ارتقاء یافتہ دور میں عقل و فکر کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے؟ .... یہ اور اس طرح کے

گوناں گوں سوالات چھیڑ چھیڑ کر، انھیں مختلف اسالیب اور پیرایوں میں، دُہراء دُہراء کر، پرویز صاحب (اور طلوعِ اسلام) نے لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ یہ اسلامی نظام، قرآن وسنت پر مبنی تھا، اس لیے سنت کے بارے میں بھی ژولیدہ فکری پیدا کرنے کے لیے، ''مفکرِ قرآن'' مصروفِ جہاد ہو گئے، سنتِ نبویہ کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لیے طلوعِ اسلام میں ایک ارتیابی مہم اور تشکیکی تحریک چلائی گئی۔ جس طرح، اسلامی نظام کے بارے میں، شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے، مختلف اسالیب اور متنوع انداز اختیار کیے گئے، بالکل اسی طرح، سنتِ رسولؐ کے بارے میں بھی، اسلوب وانداز کو بدل کر، اور طرح طرح کے سوالات کو چھیڑ چھیڑ کر، دماغوں کو پراگندہ کرنے کی کوشش کی گئی، اور ایسا کرتے ہوئے، ایک طرف تو علماء کرام کا استخفاف اڑایا جاتا کہ یہ علم سے کورے، بصیرت سے عاری، قرآن سے نابلد، دلائل سے محروم اور تقاضائے وقت سے بے خبر ہیں جو طلوعِ اسلام کے سوالات اور دلائل کا جواب تک نہیں دے سکتے، اور دوسری طرف، خود مظلوم بن کر، اپنے قارئین کو، پرویز صاحب (اور طلوعِ اسلام) یہ تاثر دیتے رہے کہ علماء کرام بالعموم اور جماعت اسلامی اور اس کے امیر بالخصوص، ان کے خلاف، جھوٹے پراپیگنڈے، باطل الزامات اور افتراء پردازیوں کے ذریعہ، ان پر ظلم ڈھا رہے ہیں، اور پھر عوام الناس سے یہ اخلاقی اپیلیں کی جاتیں کہ وہ، جماعت اسلامی کو اس غیر اخلاقی طرزِ عمل سے باز رکھنے کی کوشش کریں، حالانکہ حقیقت، اس کے بالکل بر عکس تھی۔

یہ اور اس قسم کی تھیں وہ دلچسپیاں اور سرگرمیاں، جن میں طلوعِ اسلام، پاکستان کے ابتدائی دور میں مگن اور منہمک تھا۔

مالی دشواریاں اور ہفتہ وار طلوعِ اسلام

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، علماء وعوام کی طرف سے نفاذ اسلام کے لیے حکمرانوں پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، یہ دباؤ، جس قدر ارباب حل وعقد کے لیے پریشان کن تھا اسی قدر طلوعِ اسلام (اور پرویز صاحب) کے لیے بھی باعثِ تشویش تھا، چنانچہ طے پایا کہ طلوعِ اسلام کی اشاعت اگر روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتہ وار ضرور کر دی جائے، اس کے لیے ایک فرضی یا حقیقی خط کی بناء پر، کسی قاریٔ طلوعِ اسلام کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ

> اگر ہمیں یہاں قرآنی نظام کو رائج کرنا ہے تو اس کے لیے یہاں کی اکثریت کو اپنے ہمنوا کرنا ہوگا، اور یہ ہو نہیں سکتا جب تک ہم قرآن کی آواز کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر عام نہ کر دیں۔ ان حالات کے پیش نظر ضرورت ہے، اور اشد ضرورت، کہ طلوعِ اسلام، اگر روزانہ شائع نہیں ہو سکتا تو کم از کم ہفتہ وار ہی ہو جائے، اور اگر دنیا کی زیادہ زبانوں میں نہیں تو کم از کم اردو اور انگریزی ہی میں اس کی اشاعت ہو، کیا آپ کے پیشِ نظر، اس کے لیے کوئی عملی سکیم نہیں؟ خدا کے لیے اس میں تاخیر نہ کیجیے، زمانہ بڑا نازک اور وقت بہت کم ہے، اس لیے جو کچھ کیجیے جلدی کیجیے۔ [1]

اس تجویز کی راہ میں مالی دشواریاں حائل تھیں، ان کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا۔

---

[1] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۳

ہم اس ''درماندہ راہی کی صدائے دردناک'' پر ایک لفظ کا اضافہ کیے بغیر، اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ طلوعِ اسلام تو اپنے خونِ جگر کا ایک ایک قطرہ، ودیعتِ مژگانِ یار کیے بیٹھا ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ اس دور میں خالی خونِ جگر سے کام نہیں چلتا۔ طلوعِ اسلام کو (ایک روز نامہ نہیں تو کم از کم) ہفتہ وار کر دینے (اور اس کے اردو، انگریزی اور عربی ایڈیشن نکالنے) کی آرزوئیں، ایک عرصے سے ہمارے دل میں مچل رہی ہیں، لیکن آج تک اس کی ماہوار اشاعت کا خرچ بھی پورا نہیں ہو سکا چہ جائیکہ اسے ہفتہ وار نکالنے کا سامان میسر آ سکے، اگر (سو سو روپے والے) معاونین کی اسکیم خاطر خواہ طور پر کامیاب ہو جاتی تو بھی اس کی گنجایش نکل آتی لیکن وہ اسکیم طلوعِ اسلام کی کتابیں شائع کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہو سکی۔ [۱]

اس کے بعد طلوعِ اسلام کو ہفتہ وار کرنے کے لیے، مندرجہ ذیل اسکیم پیش کی گئی۔

ہمارا اندازہ ہے کہ طلوعِ اسلام کو ہفتہ وار (صرف اردو میں) شائع کرنے کے لیے کم از کم دس ہزار روپیہ درکار ہے، آجکل کے زمانے میں یہ ایک ایسی قلیل رقم ہے جسے کوئی شخص تنہا اٹھ کر ادا کر سکتا ہے، لیکن اگر اس حلقہ میں کوئی ایک آدمی ایسا صاحبِ ہمت نہیں تو اس رقم کو دس حضرات، ایک ایک ہزار روپیہ ادا کر کے پورا کر سکتے ہیں، طلوعِ اسلام نے آج تک کبھی عطیہ کے لیے اپنا دامن نہیں پھیلایا (معاونین کی اسکیم کاروباری اسکیم ہے، اس میں ہم نے عطیہ کی شکل نہیں رکھی)، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وقت کا تقاضا ایسا شدید ہے جس کے پیشِ نظر، ہمیں اپنی اس ''وضعداری'' کو بھی چھوڑنا ہو گا۔ لہٰذا

(۱) اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ طلوعِ اسلام کو ہفتہ وار ہونا چاہیے اور

(۲) آپ میں اتنی استطاعت ہے کہ اس مقصد کے لیے آپ ہماری امداد کر سکیں تو براہ کرم ہمیں مطلع فرمائیے کہ آپ اس کام میں کس حد تک حصہ لے سکتے ہیں، سرِ دست روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں، صرف اتنی اطلاع دینے کی ضرورت ہے کہ آپ عند الطلب اس قدر رقم بطورِ عطیہ دے سکیں گے، واضح رہے کہ

(۱) ہماری یہ اپیل ان حضرات سے بالکل نہیں جو اپنے پہلو میں دلِ دردمند رکھتے ہیں لیکن جنھیں ایسے کاموں میں حصہ لینے کے لیے اپنے یا اپنے بچوں کا پیٹ کاٹنا پڑتا ہے۔

(۲) نہ ہی یہ اپیل ان حضرات سے ہے جو اپنے عطیوں کو ایسی شرائط سے مشروط کرنا چاہیں جو طلوعِ اسلام کی حق گوئی کی راہ میں مانع ہو جائیں، عطیہ بلا مشروط ہونا چاہیے۔

آپ کا جواب بیس نومبر تک ہمارے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ [۲]

اس اسکیم پر قارئین طلوعِ اسلام نے کس حد تک لبیک کہا؟ درج ذیل اقتباس سے واضح ہے۔

اس اپیل کے جواب میں قریباً پانچ ہزار روپے کے وعدے ان حضرات کی طرف سے موصول ہوئے جو اس کی فی الواقع استطاعت رکھتے ہیں، لیکن باقی حضرات پھر وہی تھے جو اپنے خلوص کی گراں بہا پیشکش لے کر آگے بڑھے، ہم اس گرانی کے زمانہ میں ان حضرات کی پیشکش کو قبول کرنے سے معذور ہیں، اگر ایک ہزار یا پانچ پانچ سو روپیہ دینے والے کچھ حضرات اور آگے بڑھ سکتے ہیں تو اس تجویز کو عمل میں لایا جا سکے گا ورنہ ہم معذور ہیں، جن حضرات نے دستِ تعاون بڑھایا ہے ہم ان کے بہ دل شکر گذار ہیں، لیکن ان سے روپیہ اس وقت منگایا جائے گا جب دس ہزار کے وعدے ہم تک پہنچ جائیں گے۔ [۳]

---

[۱] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۳ تا ۱۴ [۲] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۴

[۳] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۵۴ء، صفحہ ۶۴

جنوری ۱۹۵۴ء سے لے کر اکتوبر ۱۹۵۴ء تک طلوع اسلام نے ہفتہ وار طلوع اسلام کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی، کیا مطلوبہ رقم کی فراہمی کے لیے باقی ماندہ وعدے وصول ہو گئے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ "قرآنی نظام" کی وسیع اشاعت کے لیے طلوع اسلام کو ہفتہ وار قرار دینے کے لیے، نومبر ۱۹۵۴ء تک بھی مطلوبہ رقم میسر نہ ہو سکی، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

> اس کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ طلوع اسلام کو ہفتہ وار کر دیا جائے، اور اس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے، اس کے لیے روپیہ درکار ہے جو ہمارے پاس نہیں۔ [1]

لیکن دسمبر ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں، یکا یک یہ انکشاف قارئین کے سامنے آیا کہ

> اس دفعہ سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ طلوع اسلام کو ہفتہ وار کر دیا جائے۔ [2]

مالی دشواریوں کے باوجود، دفعتاً، اور یکا یک طلوع اسلام کو ہفتہ وار کر دینے کے لیے، اتنی کثیر مقدار میں "غیبی امداد" کہاں سے مل گئی، جس کی بناء پر......

> پہلے اردو میں اور جب حالات اجازت دیں تو اس کے ساتھ ہی انگریزی میں۔ [3]

طلوع اسلام کی اشاعت ممکن ہو گئی؟ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر مفکر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ

> مسٹر غلام محمد کے دورِ حکومت کے آغاز میں "طلوع اسلام" بند ہونے والا تھا مگر چند دنوں میں، اس کے مالی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ "ہفتہ وار" ہو گیا، اسی زمانہ میں، یہ خبر عام طور پر مشہور تھی کہ حکومت، پرویز صاحب کی پشت پناہی کر رہی ہے، اب اس کی تفتیش تو موجودہ حکومت ہی کر سکتی ہے کہ "طلوع اسلام" کو اگر مالی امداد دی گئی تو کس بنیاد پر اور کن لوگوں کی سعی و سفارش سے دی گئی تھی، اور اس دور کی بدنام حکومت، پرویز صاحب سے کیا کام لینا چاہتی تھی، اور وہ کون سرکاری افسر تھے جو "طلوع اسلام" کے مشن سے دلچسپی رکھتے تھے؟ [4]

لیکن پرویز صاحب نے طلوع اسلام کی یکا یک مالی خوشحالی کا سبب کبھی حکومت کی عطاء کو قرار نہیں دیا اور اس اچانک مالی خوشحالی کی توجیہ یوں کی گئی

> ہم نے ان حضرات سے معاونت کی اپیل کی جو اس باب میں بغیر کسی شرط اور معاوضہ کے ہمارا ہاتھ بٹائیں، یہ امر ہمارے لیے بڑا حوصلہ افزاء اور باعث فخر و مباہات ہے کہ ہماری اس اپیل کے جواب میں، قرآنی فکر کی برادری کے افراد ملک کے چاروں گوشوں سے ہجوم کر کے آگے بڑھے، لیکن ان میں بیشتر حصہ، ان کا ہے جو اپنے پاس مخلص آنسوؤں کی متاع اور درد بھری آرزوؤں کے عطیہ کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔ ہمارے لیے ان کے یہ آنسو بیش بہا موتی ہیں، اور ان کی یہ آرزوئیں بے بہا متاع۔ ان کا ہمارے ساتھ ہونا بڑی تقویت کا موجب ہے۔ ان کے بعد وہ حضرات ہیں جن کی آمدنیاں بہت قلیل ہیں، لیکن انھوں نے اس کے باوجود، اس مد میں کچھ نہ کچھ ضرور پیش کیا ہے۔ پانچ پانچ روپے، دس دس روپے۔ ان کی یہ پیشکش ہمارے نزدیک بڑی قیمتی ہے، کچھ حضرات نے، اس سے زیادہ معاونت کی پیش کش کی ہے۔ [5]

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۸
[2] + [3] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۴
[4] قرآن کی معنوی تحریف، صفحہ ۸۵
[5] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۴

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نومبر ۱۹۵۳ء سے اکتوبر ۱۹۵۴ء تک مکمل ایک سال تک "قرآنی فکر کی برادری کے یہ افراد" کہاں سوئے پڑے تھے کہ اب یکا یک صدائے صورِ اسرافیل سن کر "ملک کے چاروں گوشوں سے ہجوم کر کے آگے بڑھے" اور پھر طلوع اسلام نے آج تک کبھی ان لوگوں کے نام تک شائع نہیں کیے حالانکہ یکمشت یا چند اقساط میں سو روپیہ جمع کروانے کے عوض، طلوع اسلام کی کتب کی فراہمی کی اسکیم ہو یا قرآنک کالج فنڈ میں عطیات دینے کی اسکیم ہو، ہر دو اسکیموں میں معطیان حضرات کی فہرستیں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن اگر فہرست شائع نہیں ہوئی تو صرف ان معطیان کی، جنھوں نے ہفتہ وار طلوع اسلام کے لیے عطیات دیے، آخر کیوں؟

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بزمِ طلوعِ اسلام

ہفتہ وار طلوع اسلام کا پہلا شمارہ، ۵، فروری ۱۹۵۵ء کو شائع ہوا اور اس کا آخری شمارہ ۷ جنوری ۱۹۵۶ء کو منظر عام پر آیا، اسی دوران قارئین طلوع اسلام میں ایک احساس ابھرا، اور پھر:-

> جگہ بہ جگہ سے تقاضے شروع ہو گئے کہ قارئین طلوع اسلام مجتمع ہوں اور جماعتی تنظیم کریں، یہ مطالبہ طلوع اسلام کے لیے بڑے فخر و ابتہاج کا پہلو لیے ہوئے تھا، کیونکہ یہ اس کی دعوت کی قبولیت کا واضح نشان تھا، لیکن اس کے ساتھ یہ دشواری بھی سامنے آئی کہ جماعتی تنظیم ایک نئی پارٹی کی شکل اختیار کر کے مزید تشتت کا ذریعہ بن جائے گی، شدید اصرار پر گہرے سوچ کے بعد، طلوع اسلام نے یہ سمجھا کہ قارئین طلوع اسلام ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کریں اور باہمی طور پر مل جل کر یہ سوچیں کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ قارئین، اپنے اپنے علاقوں میں "بزمِ طلوعِ اسلام" قائم کریں اور باہمی مشورے سے یہ طے کریں کہ انھیں اس فکر کو عام کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ [1]

یوں بزمہائے طلوع اسلام کا وجود، ملک کے مختلف علاقوں میں قائم ہوتا رہا، تاہم ان سب کی کارکردگی کو منظم کرنے کے لیے اور ان سے رابطہ استوار رکھنے کے لیے ایک "مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام" کی تشکیل عمل میں آئی جو علاقائی بزموں سے بذریعہ مراسلت رفتارِ کار کی رپورٹیں طلب کرتی رہے، ان بزموں کی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ

> بزم طلوع اسلام، نہ تو کوئی مذہبی فرقہ ہے، نہ سیاسی پارٹی، بلکہ یہ قرآنی فکر کی اشاعت کی ایک اجتماعی کوشش کا نام ہے۔ [2]

بزم طلوع اسلام، دراصل تحریکِ طلوع اسلام ہی کا عملی میدان میں ہراول دستہ ہے جس کے متعلق یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ

> یہ تحریک، ایک مکتبۂ فکر کہلا سکتی ہے، فرقہ نہیں۔ [3]

---

[1] طلوع اسلام، ۲۶ فروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۶ [2] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۷۹ [3] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۴

لیکن ہمارے ملک میں احناف، خواہ وہ وابستگانِ علماءِ دیوبند ہوں یا معتقدینِ علمائے بریلی ہوں، اہل حدیث ہوں یا اہل سنت، جب یہ کہتے ہیں کہ وہ فرقے نہیں بلکہ مکاتبِ فکر ہیں، تو طلوعِ اسلام تلملاتے ہوئے نعل در آتش ہو کر یہ کہتا ہے

> جب یہ حضرات طلوعِ اسلام کے پیہم اصرار سے تنگ آ گئے تو ابلیس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ تم کہو کہ ہم فرقے نہیں، مکاتب فکر ہیں، چونکہ یہ ابلیسی دلیل ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی اس لیے یہ اس سے بہت خوش ہو گئے چنانچہ اب ہر طرف سے اسے اچھالا جا رہا ہے، گویا یہ محض لفظوں کی تبدیلی سے (بقول طلوعِ اسلام، رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ کر) خدا کو (معاذ اللہ) فریب دے رہے ہیں۔ ۱

حالانکہ ٹھیک یہی پوزیشن، طلوعِ اسلام کی بھی ہے، جو اپنے مخالفوں ہی کی طرح، بزمِ طلوعِ اسلام کو فرقہ کی بجائے مکتبِ فکر قرار دیکر، (بقول طلوعِ، رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ کر (معاذ اللہ) خدا کو فریب دے رہے ہیں، آخر فرقہ کیسے بنتا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ پرویز صاحب ہی سے، اس کا جواب حاضر ہے۔

> اسے اچھی طرح سن رکھئے کہ جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں، قرآن کریم کی بجائے، کسی انسان کو سند مان لیا، آپ نے فرقہ پرستی کی بنیاد رکھ دی۔ ۲

اب یہ بات تو واضح ہی ہے کہ وابستگانِ طلوعِ اسلام کے نزدیک، سند اور اتھارٹی کا مقام، پرویز صاحب ہی کو حاصل ہے، یہ لوگ، ان کے علاوہ کسی کو اتھارٹی تسلیم نہیں کرتے چنانچہ اس بات کا اعلان بھی، طلوعِ اسلام کنونشن میں برملا کیا گیا کہ

> اس نوجوان کا نام، جو اس وقت حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا، اور آج قرآن کریم کے حقائق کے سلسلہ میں اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، غلام احمد پرویز تھا۔ ۳

اور اتھارٹی، بہر حال، سند اور معیار ہی کو کہا جاتا ہے جیسا کہ خود طلوعِ اسلام کے، اس ننھے سے اقتباس سے واضح ہے:

> یہ اس لیے کہ آپ نے پہلے طے نہیں کیا تھا کہ کسی قانون کے اسلامی قرار دینے کے لیے معیار (اتھارٹی) کیا ہے۔ ۴

اس مختصر سی بحث سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام فرقہ ہے یا مکتبِ فکر؟ یا بالفاظِ دیگر، رام داس ہے یا عبدالرحمٰن؟

لاء کمیشن اور پرویز صاحب کی رکنیت

۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ "پاکستان لاء کمیشن" کے نام سے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے گا، جس کے فرائض کے متعلق طلوعِ اسلام یہ لکھتا ہے کہ

> لاء کمیشن کے فرائض میں اتنا ہی نہیں کہ وہ ان قوانین کو ایک ضابطہ کی شکل میں مرتب کرے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ انھیں کتاب و سنت کے مطابق منتقل کرنے کی سفارش کرے۔ ۵

---

۱ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۳ ۲ طلوعِ اسلام، مئی جون ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵۲ ۳ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۷۳
۴ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۸۱ء، صفحہ ۲۹ ۵ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۹

طلوعِ اسلام، چونکہ "سنت" سے متوحش ہو جاتا ہے، اس لیے وہ کمیشن کے ہدف کو قرآن ہی کی حد تک محدود کرتے ہوئے اور سنت کی پابندی کو نظر انداز کرتے ہوئے، یہ کہتا ہے کہ

اگر اس کمیشن نے اس اہم فریضہ کو قرآن عظیم کی منشاء کے مطابق سرانجام دے دیا تو آپ دیکھیں گے کہ پاکستان کو نہ صرف دیگر اسلامی ممالک میں ایک خاص مقام حاصل ہو جاتا ہے بلکہ غیر مسلم اقوام بھی دیکھ لیں گی کہ قرآن کریم، نوعِ انسانی کے اہم مسائل کا حل، کس حسن وخوبی سے پیش کرتا ہے۔ [۱]

پرویز صاحب کو اس کمیشن کا ممبر بنایا گیا تو طلوعِ اسلام نے انھیں یہ کہہ کر ہدیۂ تبریک اور خراجِ عقیدت پیش کیا، کہ

پرویز صاحب کی لاء کمیشن میں شمولیت کوئی ہنگامی واقعہ نہیں، یہ ان کے عمر بھر کے مشن کے سلسلۂ دراز کی ایک کڑی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اس کا منطقی اور لازمی نتیجہ۔ [۲]

لاء کمیشن کی رکنیت، پرویز صاحب کی عمر بھر کی مسلسل مساعی کی ایک فطری اور منطقی کڑی ہے۔ [۳]

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب کو اس کمیشن کا رکن بنا دینا، جس کی ذمہ داری قرآن وسنت کی روشنی میں قوانین متشکل کرنا ہے، بالکل ایسا ہی ہے جیسے کارل مارکس کو قرآن کریم سے "نظام ربوبیت" کشید کرنے پر مامور کر دیا جائے۔

طلوعِ اسلام، ہفتہ وار سے پھر ماہانہ

طلوعِ اسلام ہفتہ وار کا آخری پرچہ ۷ جنوری ۱۹۵۶ء کا تھا جو اسلم جیراجپوری کی وفات پر ایک خاص نمبر کے طور پر شائع ہوا تھا۔ بطور ماہوار مجلّہ کے، طلوعِ اسلام نے فروری ۱۹۵۶ء کے پرچہ سے از سر نو اپنا آغاز کیا، اسی سال یہ طے کیا گیا کہ قارئین طلوعِ اسلام کی سال بسال بالمشافہ ملاقات کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے نتیجہ میں پہلا کنونشن ۱۶، ۱۷، ۱۸ نومبر ۱۹۵۶ء کو لاہور میں منعقد ہوا، اس کے بعد ہر سال، ایسے اجتماعات کا انعقاد ہوتا رہا، تاکہ فکرِ طلوعِ اسلام سے وابستہ حضرات وخواتین، باہم متعارف ہوں، اور ساتھ ہی اس فکر کی ترویج وترقی کے لیے تجاویز وتدابیر بھی نہ صرف یہ کہ سوچی جائیں بلکہ عملاً اپنائی بھی جائیں۔

طلوعِ اسلام کی سرگرمیوں کے چار اہم پہلو

طلوعِ اسلام ہفتہ وار ہو، یا ماہانہ، پرویز صاحب کے دروسِ قرآن ہوں، یا کنونشن کے خطابات، ان سب میں، جن امور کو سب سے بڑھ کر اہمیت دی جاتی تھی، اور جن پر لسان وقلم کی اور دل ودماغ کی ساری قوتیں اور قابلیتیں صرف کی جاتی تھیں، وہ مندرجہ ذیل چار امور ہیں۔

(۱) علماء امت کے خلاف، نفرت کی مہم کو بھرپور انداز میں جاری رکھنا۔

(۲) جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کے خلاف، خاص طور پر، یلغاری مہم کو برقرار رکھنا۔

(۳) انکارِ سنت کے لیے ارتیابی مہم اور تشکیکی تحریک کو پوری قوت سے چلائے رکھنا۔

---

[۱] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۹ [۲] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۰ [۳] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۲

(۴) اصحاب اقتدار سے استمتاعی تعلقات قائم رکھنا، اور پھر انھیں چھپائے رکھنا۔

یہ طلوع اسلام کی پالیسی کے چار مستقل اجزاء ہیں، اس کی تحریک کی ساری سرگرمیاں، انھی چار پہلوؤں پر محیط ہیں جیسا کہ اس تفصیل سے ظاہر ہے۔

(۱) علماء کرام کے خلاف نفرت کی مہم

چونکہ علماء کرام، پرویز صاحب کے پیش کردہ، اس قرآنی نظام حیات کے منکر ہیں جس کے معاشرتی اجزاء، مغرب کے فاسد تمدن سے اور معاشی نظام، پورے کا پورا، اشتراکیت سے ماخوذ ہے، اس لیے وہ علماء کے خلاف انتہائی تحقیر آمیز رویہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ تمام جہان کی سمیٹی ہوئی برائیوں کو، لفظ ملاں میں سمو کر، اسے علماء سے منسوب کرتے رہنا، پرویز صاحب کا مستقل شیوہ رہا ہے، اس نفرت انگیز مہم کا ہلکا سا تصور پیش کرنے کے لیے، چند اقتباسات عرضِ خدمت ہیں۔

۱۔ ارباب مذہب کے علاوہ، ارباب اقتدار کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ یہاں قرآنی معاشرہ نہ بننے پائے، اس لیے کہ اس سے ان کی تمام مفاد پرستیاں، خوابِ پریشاں بنکر رہ جاتی ہیں، قرآن، جس طرح مذہبی پیشوائیت کا دشمن ہے، اسی طرح انسانی استبداد اور سرمایہ پرستی کو بھی جڑ سے اکھاڑتا ہے، یہ ہے وہ چوکھی لڑائی جو طلوع اسلام کو یہاں لڑنی پڑ رہی ہے، ملا کے پاس نہ علم ہے نہ بصیرت، نہ دلائل ہوتے ہیں نہ براہین۔ [۱]

۲۔ مولوی صاحبان کی طرف سے، ہر اس تحریک کی مخالفت ہوگی جو مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دے اس بناء پر ان کی طرف سے طلوع اسلام کی مخالفت بھی ضروری تھی، یہ حضرات طلوع اسلام کے پیش کردہ قرآنی دلائل کا جواب تو دے نہیں سکتے اس لیے انھوں نے اس کے خلاف وہی حربہ پیش کیا جسے یہ اپنے مخالفین کے لیے شروع سے استعمال کرتے چلے آرہے ہیں، انھوں نے مشہور کر دیا کہ طلوع اسلام، منکر حدیث ہے۔ [۲]

۳۔ سانپ اور مولوی: ٹائمز آف انڈیا میں ایک خبر چھپی ہے کہ جب گاندھی جی کے آشرم میں بہت سے چوہے پیدا ہوگئے جو ان کے کاغذوں کو خراب کرتے تھے تو انھوں نے پونہ کے کسی ڈاکٹر سے ایسے سانپ منگائے، جو چوہوں کو کھاجاتے تھے لیکن انسانوں کے لیے بالکل بے ضرر تھے، کیونکہ ان میں زہر نہیں تھا (چنانچہ اس ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کے پاس اب بھی اس قسم کے کئی سانپ موجود ہیں) اس سے ہمیں نیاز فتحپوری کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ انھوں نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ جس طرح سانپوں کی کئی قسمیں ہیں، اسی طرح مولویوں کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ سانپوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو زہریلے نہیں ہوتے، لیکن مولویوں میں ایسی کوئی قسم نہیں پائی جاتی۔

فطرت کی یہ ستم ظریفی ہے کہ اس قسم کے بے ضرر (بلکہ مفید) سانپ تو ہندوستان میں رہ گئے، اور مولوی صاحبان پاکستان میں آ گئے تا کہ یہاں کسی کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہو سکے، کیا یہ تقسیم بھی کہیں ''ریڈکلف'' صاحب ہی کی نظر عنایت کا نتیجہ نہیں؟ [۳]

۴۔ اصل یہ ہے کہ ہمارا اقدامت پرست طبقہ، جو کچھ مذہب کے نام سے پیش کرتا ہے، اس میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ علم

---

[۱] طلوع اسلام، ۵ فروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴ [۲] طلوع اسلام، ۱۲ فروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۳ [۳] طلوع اسلام، ۱۹ فروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۸

وبصیرت کی کسوٹی پر پورا اترے اور عقل وفکر کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ ۱

۵-ہمارے ہاں (کم از کم ملک کے ہوشمند، تعلیم یافتہ طبقہ میں) یہ رونا رویا جاتا ہے کہ قوم کو ''مولوی'' نے تباہ کر دیا ہے وہ لوگوں کو اس قسم کی تعلیم دیتا، اور تلقین کرتا ہے جس سے وہ انسانیت کی سطح تو خیر، بہت بلند ہے، آدمیت کی سطح پر بھی نہیں پہنچ سکتے، انھیں چند بے روح عقائد، چند بے جان رسوم اور سینکڑوں قسم کی توہم پرستیوں کے الجھاؤ میں الجھا کر، عقل وفکر کا دشمن، علم وبصیرت کا حریف، ہر قسم کی ترقی کے راستے میں سنگِ گراں اور دھرتی کے سینے پر بوجھ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ ۲

۶-ہم اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قرآن کو مروجہ ترجموں (بلکہ تفسیروں) کے ساتھ پڑھ لینے سے قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا، اگر اس طرح قرآن سمجھ میں آ سکتا ہوتا تو ہمارے ''علمائے کرام'' سے بڑھ کر، قرآن کو سمجھنے والا، اور کون ہو سکتا تھا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں اور جس چیز کو وہ قرآن کہہ کر پیش کرتے ہیں، اس میں قرآن کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ۳

۷-مُلّا کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام، ایک جامد(Static) اور متصلب (Rigid) مذہب ہے جس میں ارتقاء (Evolution) کی قطعاً گنجائش نہیں، جو کچھ اس وقت، شریعت کے نام پر رائج ہے، اور جس کا علمبردار، خود مُلّا کا طبقہ ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ۴

۸-جب خلفائے راشدین کے جانشینوں نے سیاسی معاملات تو اپنی ملوکیت کی گرفت میں لے لیے اور مذہبی امور کو پیشوائیت کے سپرد کر دیا، بظاہر یہ دو الگ الگ کیمپ دکھائی دیتے تھے، لیکن ان کے مابین ایک ملی بھگت اور ''شریفانہ معاہدہ'' کم وبیش ہر دور میں قائم رہا، مسلمان حکمران، ان مذہبی پیشواؤں کے لیے مالی وظائف کا انتظام کرتے اور اس کے بدلے میں مذہبی پیشوائیت، ان حکمرانوں کو ''امام المسلمین'' اور ''ظل اللہ'' کے مقدس خطابات سے یاد کرتی۔ ۵

۹-حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کی گرفت ازمنۂ مظلمہ (Dark Ages) کے بدترین استبداد کی یادگار ہے جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا، یہ وہ اکاس بیل ہے کہ جس درخت پر مسلط ہو جائے، درخت خشک ہوتا چلا جاتا ہے اور بیل بڑھتی پھولتی رہتی ہے، انسانیت پر جس قدر مظالم، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں ''خدا کے نام'' پر ہوئے ہیں، ابلیس کے حصہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا، اس لیے جو ملک بھی آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہے وہ اپنے ہاں کوئی نظام متشکل کرے، حصولِ آزادی کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنے ہاں سے اس اکاس بیل کو الگ کرے۔ ۶

۱۰-ملک پر قدامت پرست مذہبی پیشوائیت کا تسلط نہ ہونے دیا جائے، اس لیے کہ یہ طبقہ حکومت کو کوئی اصلاحی قدم نہیں اٹھانے دے گا اور جس بات سے ان کے مفاد پر ذرا سی بھی زد پڑے گی، اس کی مخالفت میں عوام کو ''خدا اور سول'' کے نام پر، مشتعل کر دے گا اور حکومت مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ ۷

---

۱ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳

۲ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۴ء، صفحہ ۴

۳ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۶ء، صفحہ ۶

۴ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۹

۵ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۶ء، صفحہ ۴۹

۶ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۸

۷ طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۰

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۔ علمائے کرام کے خلاف، سینکڑوں اقتباسات میں سے یہ صرف دس اقتباسات ہیں، جن میں انھیں ''قرآنی معاشرے کا مخالف'' قرار دیا گیا ہے، انھیں ''بے علم، بے بصیرت اور دلائل سے محروم اور براہین سے عاری'' کہا گیا ہے، ان پر ''قرآنی تحریک'' کی مخالفت کا حکم لگایا گیا ہے حالانکہ وہ ''قرآنی تحریک'' کے نہیں بلکہ قرآن کے نام پر اس تحریک کے مخالف ہیں جو ''قرآنی معاشرہ'' کے دلفریب لیبل کے تحت، مغربی معاشرت کے جملہ اجزاء کو یہاں رائج کرنا چاہتی ہے، علماء کی صف میں تو کوئی بے ضرر اور مفید فرد نہیں ہے جبکہ سانپوں میں بے ضرر اور مفید سانپ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے قدامت پسند بلکہ قدامت پرست ہیں، جن کا پیش کردہ دین، ''نہ تو علم وبصیرت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی عقل وفکر کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے'' ظاہر ہے کہ ایسا دین تو وہی شخص پیش کرسکتا ہے جو ''علم وبصیرت اور عقل وفکر'' کو مغرب کی ذہنی غلامی کی بدولت پا کر، قرآن کو اس کے سانچے میں ڈھال کر، تغیر کی بھینٹ چڑھا دے، جبکہ ''مولوی'' ایسی جدت پرستی کے خلاف ہے، جس کی بناء پر پرویز صاحب کے ممدوح تعلیم یافتہ حکمران، یہ رونا روتے ہیں کہ اس نے ''قوم کو تباہ کرڈالا'' کیونکہ یہ ''مولوی'' اور ''علماء'' ''قرآن سے قطعاً نابلد ہیں'' اور قرآن وسنت پر اساس پذیر، چودہ سوسالہ پرانا وہ دین پیش کرتے ہیں، جو ''جامد اور متصلب'' ہے، اور جس میں خدا اور رسول سے ہٹ کر، جدید معاشرتی اور معاشی اقدار کو اپنانے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، پھر ان علماء کا یہ مستقل وطیرہ رہا ہے کہ ''اقتدار کے ساتھ، ہمیشہ ان کا گٹھ جوڑ رہا ہے''۔

(۲) الف- جماعت اسلامی کی انتہائی مخالفت

پرویز صاحب اور طلوع اسلام کے اعصاب پر ہمیشہ جماعت اسلامی اور مودودی صاحب سوار رہے ہیں۔ علمائے کرام کی بالعموم مخالفت کے ساتھ ساتھ، جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کی انتہائی مخالفت، ان کا وظیفۂ حیات رہی ہے، کوئی صحافتی ہتھکنڑہ ایسا نہیں ہے جو حکام اور عوام کو، ان کے خلاف برانگیختہ کرنے کے لیے اختیار نہ کیا گیا ہو، ان کی حدود ناآشنا مخالفت، طلوع اسلام کا مقصد وجود اور دائمی پالیسی رہی ہے، چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

(۱) سادہ لوح مسلمان، پھر ایک بار فریب کھا رہا ہے کہ یہ جماعت، نہایت مقدس عزائم کی حامل ہے اس کی مخالفت، خدا اور رسول کے پیغام کی مخالفت ہے، اس کا قانونِ شریعت کا مطالبہ، کس قدر صحیح اسلامی روح کا آئینہ دار ہے چنانچہ وہی مسلمان جو ''ہر تیز رو کے ساتھ'' تھوڑی دور چلنے کا عادی ہو چکا ہے، اس گروہ کے ساتھ بھی چل رہا ہے، اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ یہ راہ ٹھیک کعبہ کی طرف لے جائے گی۔ [1]

(۲) اقامت دین کے ان مدعیان کے پیش نظر بھی، حصولِ اقتدار کے سوا، کوئی مقصد نہیں، اور اس مقصد کے حصول کے لیے یہ بھی وہی حربے استعمال کرتے ہیں جنھیں لادین سیاست کے علمبرداروں کی خصوصیت قرار دیا جاتا ہے، فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ لادینی سیاست کے بدنام مہرہ باز، ان حربوں کو کھلے بندوں استعمال کرتے ہیں، اور دینی سیاست کے یہ مقدس مدعی،

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۵

انھیں اقامت دین کے نقاب میں چھپا کر، اور خدا اور رسول کے نام کی کمین گاہ کے پیچھے بیٹھ کر آگے بڑھاتے ہیں۔ ۱

(۳) کیا کوئی شخص یہ بتا سکے گا کہ مکیاولی سیاست کی روباہ بازیوں میں اور اس قسم کے انوکھے ہیر پھیر میں کیا فرق ہے؟ حقیت یہ ہے کہ جب انسان کے قلب و دماغ پر ذاتی مفاد کا بھوت سوار ہو جائے، اس وقت نہ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ پیشِ نظر معاملات میں خدا کا دین کیا فیصلہ دیتا ہے اور نہ یہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ ہم جو مطالبہ کر رہے ہیں اس کے مطابق فیصلوں کی پابندی بھی کوئی حیثیت رکھتی ہے، جو چیز بھی اپنے مفاد کے حصول کا سامان کر دے، وہی عین دین بن جاتی ہے، چاہے یہ کچھ خدا کے دین کا نام لے کر حاصل ہو، کسی اسمبلی کے فیصلے سے ہو، یا پھر عوام کے استصواب رائے کے نتیجہ میں۔ جس بارگاہ سے یہ مقصد حاصل ہو جائے وہ ان کے نزدیک سرتا سر اسلام اور جہاں سے اس کی نفی ہو وہ سراسر الحاد اور باطل قرار پا جاتی ہے۔ ۲

(۴) جماعت اسلامی، پاکستان اور اسلام دونوں کے لیے بڑے خطرے کا موجب ہے اور چونکہ روپیہ ان کے پاس بے پناہ ہے، اس لیے ملک کے پراپیگنڈے کی مشینری پر، انھیں قبضہ حاصل ہے، ان حالات میں، ان کی حقیقت کو واشگاف کرنے کے لیے جو کوشش بھی کیجائے، وہ ملت اور اسلام دونوں کی نگاہوں میں مستحسن قرار پائیگی۔ ۳

(۵) عائلی قوانین کی مخالفت میں ملک میں جو طوفان برپا کیا جا رہا ہے، اس سلسلہ میں ہم شروع سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس کا جذبۂ محرکہ (عام محاورہ کی زبان میں) ''حُبِ علی نہیں، بغضِ معاویہ ہے''، جماعتِ اسلامی نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ ملک کی زمامِ اقتدار، اپنے ہاتھ میں لے کر رہے گی، اس مقصد کے حصول کے لیے وہ مذہب کو بطور آلۂ کار استعمال کر رہی ہے، اس سلسلہ میں، اس نے عائلی قوانین کو بطور (Test Case) اپنے سامنے رکھ لیا ہے جس سے اس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ملک میں وہ قانون نہیں چلے گا جسے حکومت مرتب کرے گی، قانون وہ چلے گا جسے ہم چلانا چاہیں گے۔ ۴

(۶) ہمارے ملک کی کم از کم اسی فیصد آبادی جاہل ہے اور مذہب پرست؛ اس لیے اسے مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے اپنے پیچھے لگایا اور اکسایا جاتا ہے۔

انفرادی طور پر اس صورتحال سے، مختلف مذہبی فرقے اور پیشوا فائدہ اٹھا رہے ہیں، لیکن جو گروہ اس سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ جماعت اسلامی ہے، اس جماعت نے مذہب کو حصولِ اقتدار کے لیے سپر بنا رکھا ہے۔ اور ہمارا یہ دعویٰ، تعصب یا مخالفت پر مبنی نہیں، حقائق پر مبنی ہے، آپ اس جماعت اسلامی کی تاریخ کو سامنے لائیے اور پھر دیکھئے کہ جب اس نے حکومت کی مخالفت کرنی ہوتی ہے تو حکومت کی ایک ایک بات کس طرح خلاف شریعت بن جاتی ہے اور جب اس سے اپنا فائدہ مقصود ہوتا ہے تو وہی بات کس طرح عین مطابق شریعت قرار پا جاتی ہے، ان کی شریعت ان کے مفادات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ جھوٹ بولنا، ان کے نزدیک وجوب شرعیہ میں داخل ہے، اور اصول توڑنا (معاذ اللہ، معاذ اللہ) اتباعِ سنتِ رسول اللہ! ۵

(۷) مشہور ہے کہ ''پبلک کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے''۔ یہ ہے وہ میکیاولی مفروضہ جس پر جماعت اسلامی کی سیاست کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے، ان کا مسلک یہ ہے کہ جو کچھ مصلحت کا تقاضا ہو، دھڑلے سے کہہ دو اس کی فکر مت کرو کہ اس سے پہلے

---

۱ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۷

۲ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۳۵

۳ طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۳ء، صفحہ ۵۲

۴ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۵۷

۵ طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۵

تم کیا کر چکے ہو، کسے یاد رہ سکتا ہے کہ تم نے پہلے کیا کہا تھا، "پبلک کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے"۔ ۱

(۸) ہماری قوم میں مذہبیت بڑی شدید ہے، اس لیے مذہب کے نام پر، یہ بہت جلد دامِ فریب میں گرفتار ہو جاتی ہے، تحریکِ مرزائیت بھی مذہب کے ہی نام سے اٹھی، اور یہ بھولی بھالی قوم ان کے دامِ تزویر میں گرفتار ہو گئی، نتیجہ یہ کہ وہ تحریک ان سے جھاڑ کی طرح لپٹ گئی، اور اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ جماعت اسلامی کی تحریک بھی وہی انداز لیے ہوئے چل رہی ہے اور سادہ لوح مسلمان اسے نہایت معصوم سی دینی تحریک سمجھ کر، اس کا ساتھ دے رہے ہیں، لیکن آپ سوچئے کہ اگر (خدانکردہ) یہ تحریک تقویت پکڑ گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا، تحریکِ مرزائیت کی خطرناکیاں، اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوں گی۔ ۲

(۹) جماعت اسلامی کے پروگرام میں انتخابات، محض دفع الوقتی کے لیے ہوتے ہیں یا فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے۔ ان کے عزائم کچھ اور ہیں۔ ۳

(۱۰) ہمارے ملک میں پراپیگنڈہ کے فن میں کوئی پارٹی جماعت اسلامی کا مقابلہ نہیں کر سکتی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ میزانِ خداوندی میں کوئی پارٹی بھی، ان سے زیادہ مذموم اور مقبوح قرار نہیں پا سکتی۔ باقی پارٹیوں کا جس قسم کا طرزِ عمل ہو، وہ بہر حال اعتراف کرتی ہیں کہ یہ سیاست کا کھیل ہے جو اسی طرح کھیلا جاتا ہے، لیکن اس پارٹی کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہتھکنڈے وہی استعمال کرتی ہے جو دوسری سیاسی پارٹیاں کرتی ہیں لیکن کہتی یہ ہے کہ یہ سب کچھ خدا اور رسولؐ کے نام پر اقامت دین کے لیے کیا جاتا ہے۔ دین فروشی، خدا کی نگاہ میں بدترین جرم ہے، اس کی غیرت اسے گوارہ نہیں کر سکتی۔ آپ سوچئے کہ جو جماعت یہ کہے کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے، جس کا مسلک یہ ہو کہ قوم کے سامنے بڑے بڑے ہم آہنگ اصول رکھو لیکن عملی ضرورت کے وقت، ان سب کو بالائے طاق رکھ دو۔ جس کی جرأتیں یہاں تک بیباک ہوں کہ وہ اس دریدہ دہنی میں بھی کوئی باک محسوس نہ کرے کہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) رسول اللہ اپنے مخالفین کو صحابہ کے ہاتھوں فریب کارانہ طریق سے مروا دیا کرتے تھے، جو کسی وقت یہ کہے کہ انتخابات میں حصہ لینا شرعاً حرام ہے اور پھر دوسرے موقع پر یہ فتویٰ دے کہ انتخابات لڑنا عین مطابقِ اسلام ہے، کیا اس قسم کی جماعت کے خلاف ربِ العزت کی غیرت جوش میں نہیں آ جائے گی؟ یہ کس طرح جوش میں آئی، اس کا نظارہ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں دنیا نے خود دیکھ لیا۔ ۴

یہ صرف دس اقتباسات ہیں جن میں جماعت اسلامی کے خلاف، طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کا غصہ، کینہ و کدورت، حسد و عداوت، شقاق و تعصب، نفرت و حقارت اور غیظ و غضب ابلا پڑ رہا ہے، اور یہ سب کچھ ان اقتباساتِ مودودیؒ کی اساس پر ظاہر کیا گیا ہے جن کو سیاق و سباق سے کاٹ کر، تاویل و تحریف کا نشانہ بناتے ہوئے، سخن سازی اور کھینچ تان سے کام لیتے ہوئے اور خدع و فریب کے اوزار استعمال کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے، اس کا مفصل جائزہ تو کسی کتاب کی تصنیف کا مقتضی ہے، لیکن یہاں صرف اتنی بات واضح کر دینا ناگزیر ہے کہ جماعت اسلامی کی مخالفت کے لیے جتنے "جواز" بھی تراشے گئے ہیں وہ سب کے سب مہمل اور بے حقیقت ہیں، انھیں صرف خود فریبی اور فریب دہی کے لیے بطور بہانہ اختیار کیا گیا ہے، ورنہ اصل

---

۱ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۶۷ء، صفحہ ۶۹

۲ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۴ء، صفحہ ۵۱

۳ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۷ء، صفحہ ۷

۴ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۷ء، صفحہ ۶

سبب صرف یہ ہے کہ سید مودودیؒ اور جماعت اسلامی، قرآن وسنت کی بنیاد پر صرف اس اسلام کو نافذ کرنا چاہتی ہے جو رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے سنہری دور میں قائم تھا، اور جسے پرویز صاحب ''عجمی اسلام'' کہہ کر، اپنی شدید مخالفت کا نشانہ بناتے ہیں اور خود جس اسلام کو ''قرآنی نظام'' کہہ کر نافذ کرنا چاہتے ہیں اس کا معاشی نظام، سراسر اشتراکیت سے، اور معاشرتی نظام اپنے تمام تر اجزاء سمیت، فرنگی کلچر سے لے کر، ایک ''متحدہ دین'' بنا کر اسی طرح پیش کیا جاتا ہے جس طرح، اکبر نے اپنے دور میں، اسلام اور ہندومت میں پیوند کاری کر کے ''دین الٰہی'' کے طور پر پیش کیا تھا، جماعت اسلامی اور مودودیؒ صاحب، چونکہ پرویز صاحب کے اس نام نہاد ''قرآنی نظام'' کے مخالف ہیں بالکل اسی طرح جس طرح شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانیؒ)، اکبر کے دین الٰہی کے مخالف تھے، اس لیے پرویز صاحب، مودودیؒ صاحب کی کتب کے خورد بینی مطالعہ کی بناء پر، ہمیشہ ان کی خوردہ گیری میں مصروف رہے، پرویز صاحب کی طرف سے یہ وہ اصل وجہِ مخالفت ہے، جس کا اعتراف، خود انھیں بھی ایک مرتبہ کرتے ہی بنی:

> ہم جماعت اسلامی کو نظامِ قرآنی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا اور پاکستان کا دشمن سمجھتے ہیں۔ [1]

بہرحال یہ بات، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ کتاب وسنت کی بنیاد پر پیش کیا جانے والا اسلام تو ''عجمی سازش'' قرار پائے، لیکن اشتراکیت (جسے سکہ بند یہودی کارل مارکس نے گھڑا تھا) سے معاشی نظام لے کر، اور یورپ سے معاشرتی اطوار لے کر، جو مخلوطہ پیش کیا جاتا ہے، اسے ''قرآنی نظام'' باور کروایا جائے، آخر اس قرآن کا کیا فائدہ، جس کے بغیر ہی مغرب وہ کچھ اختیار کیے ہوئے ہے، جسے ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنی مفکرانہ موشگافیوں کے ذریعہ، قرآن سے کشید کرنے کی زحمت عمر بھر کرتے رہے۔

بہرحال، یہی وہ اصل وجہ ہے جو پرویز صاحب اور طلوع اسلام کی طرف سے مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی مخالفت میں کارفرما ہے، اور اسی باعث، اول الذکر، مؤخر الذکر پر ملائیت کا لیبل لگا کر، اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا فریضۂ اولین قرار دیتا ہے۔

> طلوع اسلام کو جو قرآنی بصیرت عطا ہوئی ہے، اس کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لیے جو قوتیں مصروف عمل رہی ہیں (اور آج بھی مصروف عمل ہیں) ان میں ملائیت کا حصہ بڑا نمایاں ہے اس کے نزدیک ملائیت، قرآن اور مسلمان دونوں کی بدترین دشمن ہے، اس لیے طلوع اسلام ملائیت کی مخالفت کو اپنی زندگی کا اولین فریضہ سمجھتا ہے۔ [2]

(۲) ب- سید مودودی کے خلاف انتہائی نفرت انگیز مہم

جماعت اسلامی پر اس قدر شدید کلوخ اندازی کے ساتھ یہ کیونکر ممکن تھا، کہ اس کے بانی کو نشانہ نہ بنایا جائے، لہٰذا

---

[1] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۶ [2] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۵

مودودیؒ صاحب کے خلاف بھی، انھی ہتھکنڈوں اور ہتھیاروں کے ساتھ، بڑی اشتعال انگیز اور انتہائی نفرت انگیز مہم، طلوعِ اسلام کی طرف سے چلائی گئی، عبارتوں کی سیاق و سباق سے علیحدگی، اقتباسات میں قطع و برید، دوسروں کے الفاظ میں اپنے ہی خیالات کو پڑھنے کی عادت اور اسی طرح کے دیگر حربوں کے ذریعہ، جو کچھ موصوفِ محترم کے خلاف لکھا گیا، وہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے:

(۱) پاکستان میں ملائیت کے ادارے کے منظم سرخیل، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہیں چنانچہ وہ اپنی خاص جرنلسٹ ٹیکنیک کے ذریعہ، ملاازم کے جواز کی دلیلیں بہم پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ [۱]

(۲) ہم مودودی صاحب کو نہ دین کا عالم مانتے ہیں نہ کوئی مفکر۔ [۲]

(۳) مودودی صاحب کے پاس کوئی نئی چیز پیش کرنے کو نہیں ہوتی، اس لیے کہ نہ انھیں جدّتِ فکر نصیب ہوئی ہے، نہ ندرتِ نگاہ، ان کے پاس وہی فرسودہ مال ہوتا ہے جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آ رہا ہے، لیکن جب وہ اسے لے کر بازار میں نکلتے ہیں تو ان کی آواز یہ ہوتی ہے کہ

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک [۳]

واقعی درست! مودودیؒ صاحب کے پاس فی الواقع قرآن و سنت کا ''وہی فرسودہ مال ہے جو ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آ رہا ہے''، اگر ''جدتِ فکر اور ندرتِ نگاہ'' سے مراد وہ کچھ ہے جس کی بناء پر، کارل مارکس جیسے یہودی کی تراشی ہوئی اشتراکیت سے معاشی نظام کی بھیک مانگ کر اور یورپی تمدن سے معاشرتی اطوار کی خیرات پا کر، انھیں قرآنی کشکول میں پیش کر دیا جائے، تو مودودی صاحب واقعی اس ''جدتِ فکر اور ندرتِ نگاہ'' سے محروم ہیں۔

(۴) مودودی صاحب کی پیش کردہ ''شریعت'' اور میکیاولی سیاست میں کچھ بھی فرق ہے؟ فرق ہے تو اتنا کہ میکیاولی سیاست پر عامل (سیاسی لیڈر) اپنے جھوٹ، فریب، دغابازی کو کبھی فخریہ بیان نہیں کرے گا، اگر ان الزامات کو اس کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ ان سے انکار کر دے گا اور یہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا کہ وہ اس قسم کی حرکات سے، بہت بلند ہے یعنی وہ جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی کو عیوب شمار کرے گا، اور ان کے ارتکاب پر کبھی فخر نہیں کرے گا، لیکن ''مودودی شریعت'' پر عامل انسان، اپنے جھوٹ پر فخر کرے گا، وہ اسے نیکی اور ثواب کا کام تصور کرے گا اور دوسرے کو دھوکہ دیکر خوش ہوگا کہ وہ خدا کے حضور سرخرو جائیگا اس لیے کہ اسے بتایا گیا ہے کہ ایسا کرنا خدا کا حکم اور (معاذ اللہ، معاذ اللہ، نقل کفر کفر نباشد) رسول اللہ کی سنت ہے۔ [۴]

(۵) مودودی صاحب کے متعلق مدت العمر کے مطالعہ نے ہمیں اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ ان کے پیش نظر اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں جن کے لیے وہ دین کو آلۂ کار بناتے رہتے ہیں، چنانچہ اپنی مصلحتوں کے پیش نظر انھوں نے متعہ کو جائز قرار دیا، زمینداریوں کو

[۱] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۵
[۲] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶
[۳] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۵۲
[۴] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۵

عین مطابق شریعت ٹھہرایا، یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بڑے کام کے حصول کے لیے جھوٹ بولنا اور فریب دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے، آگے بڑھے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ رسول اللہ ساری عمر مساواتِ انسانیہ کی تبلیغ فرماتے رہے لیکن جب سلطنت حاصل ہوگئی تو (معاذ اللہ معاذ اللہ) حکومت کو اپنے قبیلہ (قریش) کے لیے مختص کر دیا، پھر انھوں نے یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ گھر کے اندر شراب کشید کرنا اور پینا کوئی جرم نہیں .... اب انھوں نے قرآن کو اپنے تیروں کا ہدف بنانا شروع کر دیا ہے اور یہ خیال پھیلانے لگے ہیں کہ موجودہ قرآن جو ہمارے پاس ہے وہ ہے ہی نہیں جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا اس قرآن میں آیات اور الفاظ مختلف طریقوں پر تھے۔ [1]

(۶) ایک دوسرا طائفہ، جو اسلامی نظام اور اقامتِ دین کے مقدس نقاب اوڑھ کر، استقلالِ پاکستان کی جنگ میں افرادِ ملت کے دماغوں کو زہر آلود کرنے میں کوشاں رہا، اس طائفہ کے سرخیل سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی ٹیکنیک یہ تھی (اور اب بھی ہے) کہ ایک طرف وہ کانگرس کے نیشنلسٹ مسلمانوں کو مردود قرار دیتے تھے اور دوسری طرف قائدِ اعظم اور ان کے رفقاءِ کار کے کردار اور خود تحریکِ پاکستان کو اس انداز میں پیش کرتے تھے جس سے عوام میں نفرت اور عداوت کے جذبات بیدار ہوں، تقسیم ہند کے بعد نیشنلسٹ عناصر نے شکست خوردگی کے احساس سے پاکستان میں خاموشی سی اختیار کر لی، یا پھر ہندوستانی شہریت کو قبول کر لیا، لیکن پاکستان کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ سیاسی طالع آزماؤں کا یہ دوسرا گروہ، اسلام کے نام پر یہاں اپنے مراکز قائم کر کے پوری بیباکی سے اس نوزائیدہ مملکت کے سادہ لوح مسلمانوں میں فتنہ انگیزی کا زہر پھیلانے میں منظم طور پر سرگرمِ کار ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کی پچھلی تاریخ میں بہت سے طالع آزماؤں نے اپنی مفاد پرستیوں کے لیے اسلام کے مقدس نام کو استعمال کیا اور اس کا پورا فائدہ اٹھایا لیکن دل فریب اسلامی اصطلاحات کے پردے میں، ان نئے صالحین اور ان کے سرخیل نے جس قسم کے ڈرامے ایجاد کیے اس کی مثال ہماری گذشتہ تاریخ میں ناپید نظر آئے گی۔ [2]

(۷) لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی کہ یہ صاحب جھوٹ بولنے اور اصول شکنی کو جائز اور واجب قرار دیتے ہیں، بات اس سے آگے بڑھتی ہے اور بہت آگے تک بڑھتی ہے، آپ کسی جھوٹے اور اصول شکن سے (اس کا جھوٹ اور اصول شکنی ثابت ہو جانے کے بعد) کہیے کہ تم نے جھوٹ بولا اور اصول شکنی کی ہے، تو وہ ندامت سے گردن جھکا لے گا، لیکن ایک یہ صاحب ہیں کہ جب ان سے کہا جائے کہ آپ جھوٹ بولتے اور اصول شکنی کرتے ہیں تو یہ (بجائے اس کے کہ شرم سے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں) پوری ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ میں یہ کچھ اپنے طور پر نہیں کرتا، یہ تو اسلام کی تعلیم اور رسول اللہ کا عمل ہے، جس کا میں اتباع کرتا ہوں...... یہ کہتے ہیں اور دل میں قطعاً خوف خدا نہیں کھاتے کہ یہ کچھ میں کس ذات گرامی کے متعلق کہہ رہا ہوں، اس ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق، جو شرف و مجد انسانیت کی معراج کبریٰ پر فائز ہے، جس کے متعلق خود خدائے بزرگ و برتر شہادت دیتا ہے کہ...... **اِنک لعلٰی خلق عظیم** ''تو اخلاق انسانی کے بلند ترین مقام پر فائز ہے''...... جس کے نقشِ قدم پر، ہر اس سعادت بخش انسان کے لیے جو زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتا ہو، دلیلِ راہ اور خضرِ طریق بنتے ہیں، اس ذاتِ گرامی

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۵

[2] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۴-۴۵

کے متعلق یہ کچھ کہنا اور خدا کے غضب سے نہ ڈرنا، اس کی جرأت، اسی شخص کو ہو سکتی ہے جس کے دل میں خدا کے سامنے جانے کا خیال تک نہ آتا ہو۔ کوئی اور ایسی جسارت نہیں کر سکتا۔ [1]

(۸) ایک سچا مسلمان سپاہی جب دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے گا تو خواہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر دیے جائیں وہ نہ اپنی فوج کا پتہ بتائے گا، نہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی مردِ مومن سے مظلوم کی بابت دریافت کرنا چاہے گا تو وہ اپنی جان دے دے گا، لیکن نہ جھوٹ بولے گا، نہ مظلوم کا پتہ نشان بتائے گا، دنیا نے انھی جواں ہمت، صداقت شعار انسانوں کے مجسمے نصب کیے ہیں جنھوں نے ہر قسم کی اذیت برداشت کی، لیکن نہ راز افشا کیا، نہ جھوٹ بولا۔ ہم بھی اپنی تاریخ سے، ان لوگوں کو بطور فخر، دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتے، جنھوں نے جھوٹ بول کر مملکتوں کو بچایا تھا، ہم انہی کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں جنھوں نے جان دے دی تھی لیکن نہ مملکت کے ساتھ غداری کی تھی، نہ ہی جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی تھی، ''دروغِ مصلحت آمیز'' اس ضابطۂ اخلاق کا اصول ہے، جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع اور مرتب ہوا تھا، اور جس میں لوگوں کو تعلیم یہ دی جاتی تھی، کہ

اگر شہ، روز را گوید شب است ایں بباید گفت، اینک ماہ و پروین

(اگر بادشاہ دن کو رات کہے تو تم فوراً کہہ دو کہ بالکل ٹھیک، وہ دیکھئے چاند چڑھ رہا ہے اور یہ دیکھئے ستارے چمک رہے ہیں) [2]

(۹) مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آج ایک بات کہتے ہیں اور نہایت حتم ویقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ عین مطابق شریعت ہے، لیکن اس کے بعد، اس بات کے بالکل برعکس دوسری بات کہتے ہیں اور اس کے متعلق بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بھی عین مطابق شریعت ہے، انھوں نے آج تک اپنی کسی روش کے متعلق یہ نہیں کہا کہ وہ خلاف شریعت تھی، اور اب جو میں نے اس میں تبدیلی کی ہے تو یہ مطابق شریعت ہے، ان کی ساری زندگی اس قسم کے تضادات سے بھری پڑی ہے اور لطف یہ کہ وہ ان باہم گر متضاد باتوں میں سے، ہر ایک کو مطابق شریعت بتاتے ہیں۔ [3]

(۱۰) مودودی صاحب سرمایہ داری کے سب سے بڑے حامی ہیں۔ [4]

''مفکرِ قرآن'' جناب غلام احمد پرویز صاحب، اگر مولانا مودودیؒ کو ...... ملائیت کے منظم سرخیل، جدتِ فکر سے محروم، ندرتِ نگاہ سے عاری، سرمایہ دارانہ نظام کا حامیِ اعظم، الیکشن کے لیے فنڈ بٹورنے والا، پراپیگنڈہ کے فن کا ماہر، جھوٹا، بے اصول، دریدہ دہن، فریب دہ، دغاباز اور پھر اپنے ان رذائل پر فخر کرنے والا، طالع آزما، اپنی مفاد پرستیوں کے لیے اسلام کے مقدس نام کو استعمال کرنے والا، عدوِ دین اور دشمنِ پاکستان ...... قرار دیں، تو یہ سب کچھ ''سب وشتم'' نہیں کہلاتا، لیکن اگر مولانا مودودیؒ، صرف یہ کہہ دیں کہ

افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو، اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔ (ترجمان القرآن ذی الحجہ، ۱۳۵۹ھ) [5]

[1] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۲
[2] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۴-۵
[3] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۸ء، صفحہ ۴۹
[4] طلوعِ اسلام، اگست ستمبر ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۲۶
[5] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۱

تو ان کا یہ کہنا ہی سب وشتم قرار پاجاتا ہے اور قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ کا مصداق بن کر، پرویز صاحب کی قلبی کدورت، صفحہ قرطاس پر بکھر جاتی ہے، لیکن جو کینہ وعداوت ظاہر نہیں ہو پاتی، وہ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ کی حقیقت بن کر مستور ہی رہتی ہے۔ چنانچہ وہ مودودیؒ صاحب کے متعلق لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ان دونوں طبیبوں کو بیچ بازار کھڑے ہو کر گالیاں دیتے تھے۔ [1]

ایک اور مقام پر، لکھتے ہیں۔

جو لوگ اس زمانے کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مودودی صاحب نے اس مخالفت میں کس قدر شدت برتی تھی اور جداگانہ قوم بننے والے مسلمانوں اور ان کے قائد کو کس قدر گالیاں دی تھیں۔ [2]

مودودیؒ صاحب کی طرف سے دی جانے والی گالیوں کے اس بہتان کو، ان الفاظ میں بھی دہرایا گیا ہے۔

مودودی صاحب بھی تحریکِ پاکستان کے دوران، مسلم لیگ کی ہر کامیابی پر، اسی قسم کی گالیاں دیا کرتے تھے۔ [3]

مجھے، بہرحال، مودودیؒ صاحب کی کسی تحریر میں بھی، مسلم لیگ اور ان کے زعماء کو دی جانے والی گالیاں دکھائی نہیں دیں، لیکن پرویز صاحب نے مولانا مودودیؒ کے بارے میں، جو کچھ لکھا ہے، اگر ان پر بھی گالیوں کا اطلاق ہو سکتا ہے تو اس کی جھلک اوپر دیے گئے اقتباسات میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگ، اس وقت تک تو بڑے شاداں وفرحاں رہتے ہیں، جب تک ان کے کسی ناپسندیدہ گروہ کی تردید کی جاتی رہے، لیکن جب کسی بے لاگ مصلح کا نشترِ تنقید، خود ان کے اپنے محبوب گروہ کی طرف مڑتا ہے تو انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے، ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، احساسِ ننگ کا خون ہو جاتا ہے، اور ان کا وہی نفس، جو تھوڑی دیر پہلے، دوسروں کی تردید و تنقید سے محظوظ ومسرور ہو رہا تھا، اب وقفِ درد و الم ہو جاتا ہے، چنانچہ رنج وکرب کی اس کیفیت میں، انھیں، ہر مدلل اختلاف، سب وشتم نظر آتا ہے، ہر نصیحت ایک چوٹ دکھائی دیتی ہے، اور ہر فہمائش ایک طعن قرار پاتا ہے۔ محمد علی جناح، بہرحال، اپنی قانونی مہارت وبصیرت اور سیاسی فہم وفراست کے باوجود، کوئی پیغمبر نہیں تھے جو ذنوب وزلّات سے بالاتر ہوں، دیگر سیاسی زعماء کی طرح وہ بھی ایک پولیٹیکل لیڈر تھے، جس طرح وہ دوسروں کے قائدین سے اختلاف کا حق رکھتے تھے، بالکل اُسی طرح، اُن کے مقابل، دوسروں کو بھی اختلاف کا حق حاصل تھا، اس حق کو استعمال کرتے ہوئے اگر قائد اعظم نے دوسروں سے مدلل اختلاف کیا تھا تو دوسروں نے بھی ان سے دلیل وبرہان کے ساتھ، اپنے حقِ اختلاف کو برتا تھا، مولانا مودودیؒ کے اس اختلاف کو جو انھوں نے عقلِ سلیم کی حجت کے ساتھ اور نقلِ صحیح کے براہین کے ساتھ، قائد اعظم سے کیا تھا، گالیوں سے تعبیر کرنا، پرویز صاحب کی ایک لیڈر سے بے جا محبت وعقیدت اور دوسرے سے بے جا عداوت ونفرت کا کرشمہ ہے، ورنہ ہر وہ سلیم

---

[1] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۴ء، صفحہ ۳۱ [2] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۶۷ء، صفحہ ۶۹ تا ۷۰

[3] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۲

الفطرت شخص، جو ہر نوع کی جانبداری اور تعصب سے بالا تر ہو کر، اُن اقتباسات کو (جنھیں پرویز صاحب، سیاق و سباق سے کاٹ کر، اور خدع و فریب کے اوزاروں سے لیس ہو کر، اپنے مقالات میں پیش کرتے رہے ہیں)، ان کے اصل پس منظر، مَالَهُ اور مَاعَلَيْهِ میں رکھ کر پڑھے گا، تو ان سے ہرگز ہرگز وہ مفہوم نکلتا ہوا نہ پائے گا، جو پرویز صاحب نے، بر بناء حسد و کینہ پیدا کر ڈالا ہے۔

وہ بھی دن تھے کہ ترا ذکر تھا سرمایۂ زیست

ایک زمانہ تھا جب طلوع اسلام، مولانا مودودی کی تعریف و مدحت میں رطب اللسان تھا، اور مولانائے محترم کی طرف سے طلوع اسلام کو کسی مقالے کا بغرض اشاعت مرحمت فرمایا جانا، مولانا مودودی کی کرم گستری قرار پاتا تھا، اور مولانا موصوف کے علم و بصیرت، فہم و فراست اور تفقہ فی الدین پر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا جاتا تھا، اگرچہ آج طلوع اسلام، الٹی زقند لگا کر، یہ کہتا ہے کہ "ہم مودودی صاحب کو نہ دین کا عالم مانتے ہیں نہ کوئی مفکر"۔ ملاحظہ فرمایئے کہ کل، جب طلوع اسلام بھی ترجمان القرآن ہی کی طرح، قرآن و سنت کا بظاہر علمبردار تھا، اور پرویز صاحب اور مولانا مودودیؒ میں قرآن و سنت ایک مشترک اساس اسلام تھی، تو اس وقت دونوں مجلّوں کو باہمدگر قلمی معاونت حاصل تھی، لیکن ترجمان اور مولانا مودودیؒ تو بعد میں بھی مسلک قرآن و سنت پر برقرار رہے، لیکن پرویز صاحب نے بعد میں جب سنت سے مسلک اعتزال کو اپنایا تو قلمی تعاون کا یہ باہمی سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، طلوع اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں، مولانا مودودیؒ کی کتاب "مسلمان اور سیاسی کشمکش" کی ابتدائی دو جلدوں پر تبصرہ کرتے ہوئے، کتاب اور مصنف کتاب کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اسے ملاحظہ فرمایئے۔

> (۱) یہ بے نظیر کتاب، دو رسالوں کی صورت میں شائع ہوئی ہے، اس میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر، ایک نہایت ہی جامع، پُر خیال اور سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے، ہندوستان کے گذشتہ انقلابات نے مسلمانوں پر کیا کیا اثرات چھوڑے اور اب جو انقلاب آیا ہے وہ مسلمانوں کو کہاں پہنچائے گا؟ اس وقت ہم کو کیا کرنا چاہیے اور کیا ہرگز نہ کرنا چاہیے؟ یہ اور دیگر متعلقہ سوالات ایسی حکیمانہ صحت نظر کے ساتھ شائع کیے گئے ہیں کہ ایک دفعہ پڑھ لینے کے بعد، ہندوستان کی اسلامی ریاست آئینہ بن کر سامنے آ جاتی ہے اور ہمارے قومی مسئلہ کا کوئی پہلو بھی غیر واضح نہیں رہتا۔ فاضل مصنف کا نہیں بلکہ پڑھنے والوں کا دعویٰ ہے کہ اس بلند پایہ اور ٹھوس حقائق سے مملو کتاب کا خود پڑھنا اور دوسرے مسلمانوں تک پہنچانا، بجائے خود ایک جہاد ہو گا، اور بہت بڑے ثواب کا موجب، یہ کتاب کسی تجارتی غرض سے شائع نہیں کی گئی، بلکہ مسلمانوں کی سیاسی تعلیم مقصود ہے۔ [1]

اور ایک نظر، ذرا، طلوع اسلام کے اس تحسین آمیز تبصرہ پر بھی ڈال لیجئے، جو مولانائے محترم کی کتاب "مسئلہ قومیت" پر اُس دور میں کیا گیا تھا۔

[1] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۱

(۲) ہمارے محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی، دنیائے صحافت و سیاست میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اور آپ بہ حیثیت مدیر ترجمان القرآن، ملت اسلامیہ کی اصلاح فکر و نظر کے متعلق جو خدمات سرانجام دے رہے ہیں وہ بھی ارباب بصیرت سے چھپی ڈھکی نہیں، رسالہ زیر نظر، ان کے ان گراں بہا مضامین کا مجموعہ ہے جو مسئلہ قومیت کے متعلق وقتاً فوقتاً ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں، اس مسئلہ کے متعلق مولانا صاحب کا مسلک وہی ہے جس کی تائید کتاب و سنت سے ہوتی ہے اور جس کی اشاعت کی سعادت طلوع اسلام کو بھی حاصل ہے، ہماری دلی آرزو ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت عام ہو کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو اس سیلاب بلا کو روکنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں جن میں مسلمانان ہند کو بہا لے جانے کی انتہائی کوششیں ہو رہی ہیں اور جن کوششوں میں ہماری بدبختی سے خود ہمارے بھی چند بھائی شامل ہیں۔ [۱]

مسلمانوں کے اس دور انحطاط میں اور جاہلی تہذیب کے غلبہ و عروج کے اس زمانہ میں، مسلمانوں کی نسل نو کو اسلام کی صحیح تعلیم دینے کے لیے، سید مودودیؒ نے ایک کتابچہ ''دینیات'' تصنیف فرمایا تھا جس کا مقصد تعلیمی اداروں میں ایک نصابی ضرورت کو پورا کرنا تھا، مولانا مودودیؒ کو، آج ''عالم و مفکر'' نہ ماننے والے طلوع اسلام نے، دینیات پر کبھی یہ تبصرہ بھی کیا تھا۔

حلقۂ طلوع اسلام میں مولانا مودودی صاحب مدظلہٗ کسی تعارف کے محتاج نہیں، زیر نظر رسالہ، انھی کی تالیف ہے، اور خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانوں کے لیے لکھا گیا ہے جو ہائی اسکولوں کی آخری جماعتوں یا کالج کی ابتدائی منزلوں میں تعلیم پاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ کفر و الحاد کے جس ماحول میں، ان کی تعلیم و تربیت سرانجام پا رہی ہے، اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو جائیں، پھر بدبختی یہ کہ ہمارے نام نہاد مدارس ''اسلامیہ'' میں، جس طریق پر دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے وہ مذہب میں کسی قسم کی کشش پیدا کرنے کی بجائے، اکثر اوقات، اس سے نفرت کا موجب بن جاتی ہے مولانا صاحب نے ان حالات کو پیش نظر رکھ کر یہ رسالہ تالیف فرمایا ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ طالب علم کو فقہی مسائل رٹانے کی بجائے، اس کے دل میں دین کی حکمت بالغہ کی عظمت پیدا کی جائے، ان کی یہ کوشش بڑی مبارک اور کامیاب ہے امید ہے کہ مسلمان اسے بنظر استحسان دیکھیں گے، یہ رسالہ مختصراً عقائد و عبادات کا صحیح صحیح تعارف کرواتا ہے، اور قرآن کریم کے طرز استدلال کی پیروی کی گئی ہے، اس کی خاص ضرورت تھی کہ یہی طریقہ سب سے زیادہ درست اور مفید ہو سکتا ہے۔ [۲]

یہ اقتباس، اس امر کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں، ''مذہب'' کا لفظ فی الواقع دین ہی کے مفہوم میں مستعمل تھا، دین سے الگ، اس کا معنی و مفہوم، پاکستانی ایجاد (Made in Pakistan) ہے۔

مولانا مودودیؒ کی ایک اور کتاب ''تنقیحات'' (جسے اس کے دور تصنیف سے لے کر، آج تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ہمیشہ، ذوق و شوق سے پڑھتا چلا آ رہا ہے) پر تبصرہ کرتے ہوئے، کبھی طلوع اسلام نے، مولانائے محترم اور ان کی اس کتاب کے بارے میں، یہ بھی کہا تھا کہ

یہ رسالہ، ان اہم مضامین پر مشتمل ہے، جو ہمارے محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے قلم سے ترجمان القرآن میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، ان مضامین کی اہمیت یقیناً اس امر کی متقاضی تھی کہ انھیں الگ بھی شائع کیا جائے، مولانا

۱۔ طلوع اسلام، جون ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۴ ۲۔ طلوع اسلام، اگست ۱۹۳۹ء، صفحہ ۷۹

صاحب نے ان کی اس انداز کی اشاعت سے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے، مضامین اتنے متنوع ہیں کہ ہماری زندگی کا شاید ہی کوئی اہم گوشہ ہو، جس پر بالواسطہ یا بلا واسطہ روشنی نہ ڈالی گئی ہو، ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب، عقلیت کا فریب، تجدد کا پائے چوبیں، دور جدید کی بیمار قومیں، ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط، ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی نقص، انسانی قانون اور قانون الٰہی، مسلمان کا حقیقی مفہوم، ایمان اور اطاعت، مرض اور اس کا علاج، یہ ہیں چند عنوانات، اس فہرست میں سے، جو اس مجموعۂ مضامین کی ماجرا نوازیں ہیں، ضرورت ہے کہ اس رسالہ کی عام اشاعت ہو جو ترجمان القرآن کے سائز پر ۲۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ۱

علاوہ ازیں، طلوع اسلام نے اپنی اولین اشاعت میں، جن جید علماء، بلند پایہ مفکرین اور روشن خیال دانشوروں کی قلمی معاونت پر، ہدیۂ تشکر پیش کیا تھا، ان میں بھی سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام شامل تھا، چنانچہ طلوع اسلام نے اس وقت، ان کی یوں مدح سرائی کی تھی۔

ہماری خوش بختی ہے کہ ہندوستان کے ممتاز اہل الرائے، اور اہل قلم حضرات کی ایک جماعت کی توجہات وعنایات ہمارے شامل حال ہیں اور ان میں سے اکثر حضرات کی نہ صرف قلمی اعانت ہی ہمیں رہین منت کرے گی بلکہ ان کی بالغ نظری اور بلند نگہی ہر مسئلہ میں ہمارے لیے شمع ہدایت ہوگی، اس ضمن میں منجملہ دیگر حضرات، جناب مولانا اسلم جیراجپوری، شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب قبلہ، چوہدری غلام احمد پرویز صاحب، بی اے، جناب سید ابوالاعلےٰ صاحب مودودی (مدیر ترجمان القرآن)، ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالد، ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لاء، جناب محمد اسد خان صاحب، اسد ملتانی صاحب، جناب راجہ حسن اختر صاحب، پی سی ایس، خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ۲

ان اقتباسات کی روشنی میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ آج جس ہستی کو طلوع اسلام، نہ عالم سمجھتا ہے، اور نہ کوئی مفکر، کل تک وہ اس کی مدح سرائی میں کسطرح رطب اللسان رہا کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ حسد وکینہ کی تمام صورتوں میں سے بدترین صورت، علمی حسد اور قلمی رقابت کے میدان میں پائی جاتی ہے، بالخصوص جبکہ اس میں معاصرت کا عنصر بھی موجود ہو، ہر وہ شخص جس کی نظر، بیک وقت طلوع اسلام اور ترجمان القرآن دونوں کی فائلوں پر حاوی ہو، جانتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے علوم جدیدہ پر وسیع اور بالغ نظر، علوم اسلامیہ پر گہری بصیرت اور عمیق نگاہ، قرآن وسنت پر ماہرانہ عبور، کفر والحاد کی دلنشیں دلائل کے ساتھ پرزور تردید کی صلاحیت، فرقِ باطلہ کی مسکت اور اطمینان بخش دلائل کے ساتھ تنقید کا ملکہ، اور ان مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کرنے کی اہلیت، جن کے متعلق تہذیب مغرب کی اندھی پیروی کے سوا کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا، یہ سب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وہ خوبیاں ہیں، جس سے ان کے معاصرین بڑی حد تک محروم ہیں، اور اسی بناء پر، ان کے معاصرین، خواہ وہ دین سے وابستہ روایتی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں، یا جدید تعلیمیافتہ طبقہ سے، ان کے ساتھ ایک بیجا معاصرانہ چشمک میں مبتلا ہیں، کہیں یہ چشمک زیادہ پائی جاتی ہے اور کہیں کم، لیکن جو لوگ، اس معاصرانہ چشمک میں شدید ترین ہیں، ان میں قادیانیت اور طلوع

۱ طلوع اسلام، اگست ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۰
۲ طلوع اسلام، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۱۲

اسلام کا حلقہ، سرفہرست ہے، مگر طلوعِ اسلام کا حلقہ، مولانا مودودیؒ کی مخالفت کے جوش میں، اپنی ہوش کا دامن بھی چھوڑ دیتا ہے، اور اسے مطلق یہ خیال تک نہیں رہتا کہ وہ اپنے حالیہ موقف کے ذریعہ، اپنے گذشتہ موقف کے ساتھ، کس قدر تضاد و تناقض اختیار کر رہا ہے، صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

> گذشتہ دو تین ماہ میں، اکابرینِ جماعت اسلامی (میاں طفیل محمد، امیر جماعت، اور مودودی صاحب بانیٔ جماعت) کی طرف سے، بانیان و معماران پاکستان کے خلاف، جس کذب و افتراء، اور ہرزہ سرائی کا مظاہرہ ہوا، اس کے متعلق طلوعِ اسلام کی سابقہ دو تین اشاعتوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں تھی،......وہ ۱۹۳۸ء سے یہی کچھ لکھتا چلا آ رہا ہے۔[1]

اس اقتباس میں، میاں طفیل محمد اور مولانا مودودیؒ کی طرف سے، جس ''کذب و افتراء اور ہرزہ سرائی کا مظاہرہ'' مذکور ہے، اسے توفی الحال چھوڑ دیجئے، کسی دوسرے موقع پر، اس کا بھی جائزہ لیا جائے گا، لیکن ان چار سطروں میں، خود طلوعِ اسلام نے جس ''کذب و افتراء اور ہرزہ سرائی'' کا مظاہرہ کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیے۔

مئی ۱۹۳۸ء سے لے کر، جون ۱۹۴۲ء تک (جس کے بعد، ساڑھے پانچ سال تک طلوعِ اسلام کی اشاعت، تعطل کا شکار رہی ہے اور پھر اس کی اشاعت، از سرنو، قیامِ پاکستان کے بعد، جنوری ۱۹۴۸ء سے آغاز پذیر ہوئی ہے) میاں طفیل محمد کے خلاف، ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوا ہے، بلکہ ان پچاس مہینوں کی فائل میں سرے سے میاں طفیل محمد صاحب کا نام ہی نہیں پایا جاتا، لیکن مودودیؒ کے ساتھ، میاں طفیل محمد کی مخالفت کو بھی ۱۹۳۸ء سے جاری قرار دیا گیا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا یہ چیز بھی ''کذب و افتراء اور ہرزہ سرائی'' کی مد میں آتی ہے یا نہیں؟

رہے مولانا مودودیؒ، تو ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں، طلوعِ اسلام، خود، ان کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہا ہے جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے گزر چکا ہے، بلکہ ۱۹۴۱ء میں بھی، ان کی کتاب ''خطبات'' پر تبصرہ کرتے ہوئے، اس کتاب کے ساتھ ساتھ، مولانا مودودیؒ کی تعریف و تحسین بھی بایں الفاظ کی گئی ہے۔

> جس زمانہ میں، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مدیر ترجمان القرآن، کا قیام، دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں تھا، وہ وہاں کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، دارالاسلام، پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع میں واقع ہے جہاں مسلمانوں میں جہالت عام ہے، اس لیے ضرورۃً سید صاحب کو سلیس زبان میں عام فہم مسائل کو بیان کرنا ہوتا تھا، اب انھوں نے ان خطبات کو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ مجموعہ کام کی چیز بن گیا ہے، سید صاحب کی تحریر میں متانت اور طریقِ استدلال میں سنجیدگی ہوتی ہے، یہ خصوصیات، ان خطبات میں بھی موجود ہیں جو اسلام کے مبادیات کے مختلف گوشوں پر مشتمل ہیں، ان کے ساتھ، کہیں کہیں وہ غلو اور تشدد بھی موجود ہے جو سید صاحب کے انداز کی ایک اور خصوصیت ہے۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ کہنے کو تو طلوعِ اسلام نے یہ کہہ دیا ہے، کہ مولانا مودودیؒ صاحب کے ''کذب و افتراء اور ہرزہ سرائی'' کے خلاف وہ ۱۹۳۸ء سے یہی کچھ لکھتا چلا آ رہا ہے، لیکن واقعات کی دنیا میں، حقیقتِ حال، اس کے قطعی خلاف ہے،

---

[1] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۰ [2] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۶۷

جیسا کہ کتبِ مودودی کے تبصروں پر مشتمل اقتباسات میں واضح کیا جا چکا ہے، وہ تند و تیز، مخالفت، جو بغض و عداوت اور تحقیر و توہینِ مودودیؒ سے مملو ہے، اور جسے طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء سے جاری قرار دیتا ہے، نہ صرف یہ کہ بے بنیاد ہے بلکہ اس جوشِ غیظ و غضب کی بھی آئینہ دار ہے، جس میں وہ ہوش سے عاری ہو کر، خود افتراء و کذب اور ہرزہ سرائی پر اتر آتا ہے، مثال کے طور پر، طلوعِ اسلام، ایک مقام پر یہ لکھتا ہے کہ

> مودودی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں، اپنی پارٹی کا سنگ بنیاد رکھتے وقت، اس کا مقصد یہ بتایا تھا کہ
>
> یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے، زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔[1]

اس عبارت میں، طلوعِ اسلام نے، اپنے قارئین کو دھوکہ اور فریب دینے کے لیے، یہ کس قدر بڑا جھوٹ بولا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے، اپنی پارٹی کا سنگِ بنیاد، ۱۹۳۷ء میں رکھا تھا، حالانکہ اس وقت، نہ جماعت اسلامی کا وجود تھا، نہ اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور نہ ہی مولانا مودودیؒ نے، اس وقت وہ کچھ فرمایا تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، مولانائے محترم نے، اپنی جماعت کی تاسیس کب کی تھی؟، اسے طلوعِ اسلام کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔

> انھوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں اپنی جماعت کی بنیاد رکھی۔[2]

اگر چہ اس اقتباس میں، جماعت اسلامی کی تاسیس کا سال اور مہینہ تو درج کیا گیا لیکن تاریخ ماہ کا تعین نہیں ہے، جو دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے۔

> جماعت اسلامی کا قیام، مولانا مودودیؒ صاحب کے ہاتھوں، ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں عمل میں لایا گیا۔[3]

سوال یہ ہے کہ کیا طلوعِ اسلام کی یہ روش بھی ''کذب و افتراء اور ہرزہ سرائی'' کی تعریف میں آتی ہے، یا نہیں؟

قبل از قیامِ پاکستان، شدید مخالفت نہیں بلکہ محض اختلاف تھا

مولانا مودودیؒ کی وہ مخالفتِ شدیدہ، جو طلوعِ اسلام نے پاکستان کی سرزمین میں مولانا مودودیؒ کی وفات کے بعد بھی جاری رکھی، اور جس کے تحت، وہ- ''انھیں ڈھیٹ، میکیاولی سیاست پر کاربند، مکیاولی شریعت کا پیروکار، دشمنِ دین اور عدوِ پاکستان، اسلام اور پاکستان، ہر دو کے لیے خطرہ، ملائیت کا سرخیل، پاکستان کا کھلا کھلا باغی، صحابہ سے بغض رکھنے والا، جرأت اور دیدہ دلیری سے جھوٹ بولنے والا، ہر آن بدلتے ہوئے اور تضاداتی اسلام کا علمبردار، (جس پر اصل اسلام بھی سرپیٹ کر رہ جائے) مذہبی آمریت کے مقام پر براجمان، ایسے ہفوات کا قائل، جس پر نہ انھیں خدا کا خوف اور رسولؐ کی شرم لاحق تھی، جو پاکستان میں صرف اس لیے آیا کہ وطنِ عزیز کو کمزور کرے اور لوگوں کو اسلام سے متنفر کرے، اور جو مرزائیت کے نقشِ قدم پر چلنے والا مگر خود مرزائیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے، جو امتِ محمدیہ سے شدید بغض و عناد رکھنے والا، دین کو تفریح سمجھنے والا،

---

[1] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۲ء، صفحہ ۶ تا صفحہ ۷ [2] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۱ [3] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۸ء، صفحہ ۳۳

اپنے انداز نگارش میں لفاظی اور طول نویسی کو اپنانے والا، نفرت پھیلانے کے واحد مشن کا علمبردار، سیرتِ رسول ؐ کو داغدار کرنے کا سازشی، بلکہ اس سازش کا بانی، اسلام کو بہت بدنام کرنے والا، قرآن کریم کی ابجد سے بھی ناواقف، قرآن سے کھلا کھلا بغض وعناد رکھنے والا، نظریۂ ضرورت کے تحت فتوائے کذب دینے والا، اپنی ہوسِ اقتدار میں پاکستان کو جہنم میں دھکیلنے والا''۔ قرار دیتا رہا۔ یہ ہے وہ سنگین مخالفت اور شدید مخاصمت، جسے مولانا مودودیؒ کے خلاف طلوعِ اسلام نے پاکستان بننے کے بعد، اپنی مستقل پالیسی کے طور پر اپنائے رکھا، اور جس کے متعلق اس کا (طلوعِ اسلام کا) اور پرویز صاحب کا یہ اعلان ہے کہ

میں اس جماعت کی یومِ تاسیس کے وقت سے بالعموم اور قیامِ پاکستان کے بعد بالخصوص اس کی التزاماً مخالفت کرتا چلا آ رہا ہوں۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل، مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی اس تند و تیز مخالفت اور شدید وغلیظ مجادلت کا وجود، طلوعِ اسلام کی فائل میں کہیں بھی موجود نہیں ہے، البتہ ''مخالفت'' کی بجائے بعض مقامات پر محض ''اختلاف'' کا ذکر ضرور موجود ہے، پھر یہ اختلاف بھی بعض جگہ مولانا مودودیؒ کا نام لیے بغیر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) جس قدر کسی قوم پر انحطاط ہوگا، اسی قدر اس کی قوتِ عمل مفقود ہو جائے گی، اور جوں جوں قوتِ عمل کم ہوتی جائیگی، بیجا تنقید، بے معنی نکتہ چینی اور نظری اعتراضات کا مادہ بڑھتا جائیگا، زندہ قوموں کی حالت اس سے بالکل برعکس ہوتی ہے، وہ کامل غور و تدبر کے بعد، اپنے نصب العین کو متعین کر کے راہِ عمل تجویز کر لیتی ہیں، اور اس کے بعد جوشِ کردار میں مست، ایں و آں سے بے خبر، والہانہ منزلِ مقصود کی طرف بڑھے جاتی ہیں۔ کام کرنیوالوں کو باتیں کرنے کی فرصت کہاں؟

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت گل چہ شنید، و صبا چہ کرد

ہندوستان کے مسلمان کے بازو چونکہ عام طور پر قوتِ عمل سے محروم ہو چکے ہیں اس لیے اس کے دماغ میں بے معنی نکتہ چینی کی عادت، اسی اعتبار سے بڑھ گئی ہے۔[2]

اس اقتباس میں ''بیجا تنقید، بے معنی نکتہ چینی اور نظری اعتراضات'' جس چیز کو قرار دیا گیا ہے، وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے وہ دلائل و براہین ہیں جو انھوں نے (نیشنلسٹ علماء پر جاندار اور مدلل تنقید و تردید کے بعد) مسلم لیگ کی غلطیوں کی وضاحت کے لیے پیش کیے تھے، لیکن طلوعِ اسلام نے اسے محض ''بے معنی نکتہ چینی کی عادت'' کہہ کر نظر انداز کر دیا ہے اور پاکستان بننے کے بعد، ان ہی دلائل کو ''تحریکِ پاکستان کی دشمنی، مسلم لیگ پر سب وشتم اور پاکستان مخالف'' قرار دے کر، مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی اسقدر شدید مخالفت کی جس کا اندازہ گذشتہ اقتباسات طلوعِ اسلام سے لگایا جا سکتا ہے۔

اپنے اسی مقالہ میں، آگے چل کر، طلوعِ اسلام پھر مولانا مودودیؒ کا نام لیے بغیر، ان کے دلائل کو، خود ان کے اپنے الفاظ میں، پیش کرنے کی بجائے، اپنے ہی خود ساختہ الفاظ میں پیش کر کے، اس کا جواب بایں الفاظ دیتا ہے۔

(۲) پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو میلے سے تو باہر ہیں، لیکن ایک طرف کھڑے، ہر ادھر آنے والے کے کان میں کہہ دیتے ہیں

---

[1] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۰ [2] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۴

کہ دیکھنا! اس کی طرف نہ جانا، وہ تمہیں ''حجاز'' کی بجائے ''ترکستان'' کی طرف لے جائے گا، لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس چیز کے فیصلے کا وقت بھی ابھی نہیں آیا کہ یہ داعی اس قافلہ کو کدھر لے جائے گا، یہاں تو ابھی قافلہ کا وجود ہی غائب ہے، راستے کے تعین کا سوال تو بعد کی چیز ہے ...... [۱]

ہم اس اقتباس کے تسلسل کو توڑنے پر معذرت خواہ ہیں، لیکن اتنے سے حصۂ عبارت میں، طلوعِ اسلام کی سطح بینی ملاحظہ فرمائیے، کہ قافلہ تو کہتے ہی اسے ہیں جو منزلِ مقصود کے تعین کے بعد، اجتماعِ افراد کی صورت میں وجود پذیر ہو، منزلِ مقصود کے تعین کے بغیر جمع ہونے والے افراد کو قافلہ نہیں بلکہ ''انسانوں کی بھیڑ'' کہا جاتا ہے، لیکن طلوعِ اسلام کا اُس وقت استدلال یہ تھا کہ افراد کو گھروں سے عازمِ سفر ہوتے وقت، ''منزلِ سفر'' کے تعین کی کیا ضرورت ہے، بس وہ اکٹھے ہو جائیں، تو پھر یہ فیصلہ کر لیا جائے گا کہ لاہور جانا ہے یا پشاور؟ حجاز کا رخ کرنا ہے یا ترکستان کا؟ - اور یہی وہ سطح بینی ہے جس کا مودودیؒ صاحب اُن دنوں بدلائل و براہین ابطال فرمایا کرتے تھے، لیکن طلوعِ اسلام، بڑی سادگی اور سطح بینی کے ساتھ، یہ کہہ رہا تھا، کہ

...... فرض کر لیجئے، کہ آپ کے شکوک بجا ہیں، لیکن قافلہ جمع ہو جانے میں کیا حرج ہے، جب قافلہ کے تمام افراد یکجا ہو جائیں گے، اس وقت یہ بھی فیصلہ کر لیجئے گا کہ اب اس کا رخ (کس طرف) کدھر کو ہونا چاہیے ...... [۲]

اب طلوعِ اسلام کو یہ بات کون سمجھائے کہ بلا تعینِ منزلِ مقصود، جو لوگ جمع ہوں گے، وہ ''قافلہ'' نہیں بلکہ ''آوارہ گردوں کی بھیڑ'' ہوگی، اسے قافلہ قرار دینا ہی غلط ہے، .... اس کے بعد اسی تسلسل میں آگے یہ کہا گیا تھا کہ

یہ بھی تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجئے کہ یہ صاحب، اس قافلہ کو ''ترکستان'' کی طرف لے جائیں گے، لیکن اس صورت میں بھی صحیح راہِ صواب یہی ہوگی کہ آپ اس قافلہ کے ساتھ رہیے، قافلہ کو چلتا جانے دیجئے، اور آپ راہرووں کو بتاتے جائیے کہ ''دیکھو بھائی! یہ راستہ حجاز کی طرف نہیں جا رہا، دیکھتے نہیں ہو، حجاز کے راستے میں اس قسم کے کھنڈرات کہاں آئے تھے! وہاں اس قسم کی جھاڑیاں کہاں تھیں، یہ آموں کے باغ عرب کی سرزمین میں نہیں ہو سکتے'' یقین مانئے کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد، ان قافلہ والوں کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ واقعی یہ میر کارواں، انھیں سیدھے راستے پر نہیں لے جا رہا، اس لیے کہ

کم کوش تو ہیں بے ذوق نہیں راہی [۳]

اَمرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ راہی کم کوش بھی تھے اور بے ذوق بھی تھے، اور پھر ''قومی حکومت'' کی راہ سے ''اسلامی حکومت'' کی منزل تک پہنچنا ناممکن بھی تھا، اس لیے کہ یہ قیادت کی منزل کے وہ حریص مسافر تھے، جن کے متعلق طلوعِ اسلام کی اُس خوش فہمی کے علی الرغم کہ ''کم کوش تو ہیں، لیکن بے ذوق نہیں راہی'' تجربہ نے یہ ثابت کر دیا، کہ وہ ایک نالائق اور بد دیانت ٹولہ ہے، جسے اقتدار کی مسانید سے ہٹا کر، اس کے اصلی مقام پر لوٹا دینا چاہیے۔

جو نالائق اور بد دیانت گروہ، حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر، مسانید اقتدار پر متمکن ہو چکا ہے، اسے اس کی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر، اس کے اصلی مقام تک لوٹا دینے کا انتظام کیا جائے۔ [۴]

---

[۱] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۶ [۲] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷
[۳] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷ [۴] طلوعِ اسلام، جنوری فروری ۱۹۴۸ء، صفحہ ۹۹

یہ اقتباس، قیامِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام کی اولین اشاعت سے ماخوذ ہے، اس سے اگلی اشاعت میں پھر مسلم لیگ کی قیادت کے بارے میں یہ کہا گیا کہ:

> اب مسلم لیگ کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہے، ہماری دس سالہ جدوجہد میں، لیگ کی حیثیت، ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک فریقِ متخاصم سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ صورت یہ تھی کہ ایک نہایت قابل اور دیانتدار وکیل تھا جو دنیا کی عدالت میں، ملت اسلامیہ کا مقدمہ لڑ رہا تھا، اسے ضرورت فقط اتنی تھی کہ جب قوم سے کسی عدالت کی طرف سے پوچھا جائے کہ ''یہ تمھارا وکیل ہے؟ اور تم نے اسے مختار نامہ دے رکھا ہے؟'' تو وہ کہہ دے کہ ''بیشک'' -لٰہذا ارباب لیگ کے ذمہ اس سر ہلا دینے کے علاوہ، اور کوئی کام نہ تھا، بنابریں لیگ کے مناصب و مدارج کے لیے، یہ معیار انتخاب اتنا ہی تھا کہ وہ شخص اتنی مالی حیثیت رکھتا ہے کہ ''عدالتوں'' میں حاضری کے لیے خرچہ نہ طلب کرے، اس خرچہ کے معاوضہ میں جو امتیازی شان مل جاتی تھی وہ یقیناً مہنگی نہ تھی، لٰہذا، لیگ کی سیادت و قیادت، ان ارباب دولت وحشمت کے لیے بالعموم ''ذہنی عیاشی'' سے زیادہ کچھ نہ تھی، نہ انھیں عوام سے کوئی ربط تھا، نہ ان کے احوال و کوائف کی کچھ خبر، نہ ان کے دل میں قوم کا درد تھا، نہ اس درد کے مداوا کی کوئی فکر، اقلیت کے صوبوں میں پھر بھی ان کو ''ہندوؤں کی بالادستی کے خلاف'' کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا، لیکن اکثریت کے صوبوں میں تو عام طور پر ''نوابی ٹھاٹھ'' تھا، نتیجہ اس کا یہ کہ یہ اکابرین، برف کی سلوں کی طرح، ملت کے قوائے عمل کو مفلوج کیے ہوئے تھے۔ [1]

یہ تھی مسلم لیگ کی وہ قیادت، جو نفاذِ اسلام کے لیے اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے، ان اوصاف و خصائل کے اسلحہ کے ساتھ مصروف جہاد تھی، اور جن کے بارے میں طلوعِ اسلام، قوم کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ یہ قائدینِ مسلم لیگ، علیحدہ وطن کے حصول کی راہ میں ''کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی'' اور جن سے مولانا مودودیؒ کے مدلل اختلاف کو، قیامِ پاکستان کے بعد گالیوں سے تعبیر کیا گیا، لیکن تحریکِ پاکستان کے دوران، یہ محض اختلاف ہی تھا، نہ کہ سنگین مخالفت یا شدید مخالفت۔ بہرحال، طلوعِ اسلام، اسی ''کم کوش لیکن بے ذوقی سے مبراء قیادت'' کے بارے میں آگے یہ کہتا ہے کہ

> اس وقت اگر میر کارواں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو یا تو وہ خود سیدھے راستے پر آ جائیگا، یا قافلہ کی قیادت راہ شناس لوگوں کے سپرد کر دے گا، اور اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو قافلہ والے اسے مجبور کر دیں گے، کہ وہ ایسا کرے، اُس وقت آپ شوق سے زمام قیادت، اپنے ہاتھ میں لے لیجئے گا۔ [2]

نمعلوم اسے طلوعِ اسلام کی خود فریبی کہا جائے یا خام بصیرت، کہ وہ اس لیگی قیادت سے، جو محض اپنی دولت وحشمت کی بنیاد پر منصب قیادت پر براجمان تھی (اور جسے نہ عوام سے کوئی ربط تھا، نہ ان کے احوال و کوائف کی کچھ خبر تھی، نہ ان کے دل میں قوم کا درد تھا، نہ اس درد کے مداوا کی کوئی فکر تھی) یہ توقع تھی کہ ''جونہی'' میر کارواں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا، تو یا تو وہ خود سیدھے راستے پر آ جائیگا، یا قافلہ کی قیادت، راہ شناس لوگوں کے سپرد کر دے گا، اور اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو قافلہ والے اسے مجبور کر دیں گے، کہ وہ ایسا کرے''۔ چھوڑیے مودودیؒ صاحب کو، کہ وہ تو بقول طلوعِ اسلام کے، لباس خُلت میں پاکستان کے دشمن

---

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۸ تا ۱۹

[2] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷

تھے، لیکن خود طلوعِ اسلام اور اس کے روحِ رواں پرویز صاحب تو دل و جان سے تحریک پاکستان کے ساتھ تھے، پھر کیا مسلم لیگ کی قیادت کو خود پرویز صاحب کی زندگی میں کبھی یہ احساس ہوا کہ وہ غلط راستہ پر پڑے ہوئے ہیں؟ کیا اس احساس کے بعد وہ سیدھے راستے پر آ گئے؟ کیا کبھی انھوں نے قیادت سے دست بردار ہوکر، آپ جیسے ''مفکرِ قرآن'' اور راہ شناس کو سیادت سونپی؟ اور اگر وہ اپنی لیڈری پر مصر رہے اور زمامِ اختیار کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے تو کیا آپ جیسے قافلہ والوں نے انھیں منصبِ قیادت چھوڑنے پر آمادہ کر دیا؟

ایک اور مقام پر طلوعِ اسلام نے مولانا مودودیؒ کا نام لیے بغیر، ان سے اپنے اختلاف کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

> بعض حضرات کہتے ہیں کہ ''ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے یا دس حصوں میں، ہمارے نزدیک تو اگر ایک چپہ زمین پر بھی خدا کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ قطعۂ خاک تمام روئے زمین سے زیادہ گراں بہا ہے''۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ وہ خطۂ پاک جس میں اللہ کی حکومت کا قیام ہو، پوری کائنات سے افضل ہے، لیکن سوال تو یہ ہے، کہ عملی حیثیت سے یہ خطۂ زمین پیدا کیسے ہو؟
>
> کچھ ہوش میں آنے کی میرے شکل بھی ناصح!
> یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے
>
> آج ہندوستان کے مسلمان کے سامنے تین مراحل درپیش ہیں، سب سے اول، انگریز کی غلامی کا جوا، دوم، ہندو اکثریت کی مزعومہ حکومت (جسے وہ جمہوری یا قومی حکومت کہتے ہیں) کا عفریتِ باطل۔ ان دونوں سے نجات حاصل ہو جانے کے بعد، مسلمانوں کی حکومت۔ اور جب یہ حاصل ہو جائے تو پھر اس خطہ میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام، تقسیم ملک کی پہلی کڑی (تحریک پاکستان) اس آخری کڑی کے حصول کی ابتداء ہے، اس لیے جس حقیقی مسلمان کے دل میں، اس آخری کڑی کے حصول کی تمنا موجزن ہے، وہ اس مسئلہ سے بے تعلق نہیں رہ سکتا کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے یا ایک ہی رہتا ہے۔ جب تک مسلمان اکثریت کے علاقوں میں آپ مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں کر لیتے اس وقت تک حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی مقدس آرزوئیں، حسین خواب سے زیادہ معنیٰ نہیں رکھتیں
>
> بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی
>
> اس لیے آج قوم کی صحیح خدمت یہ ہے کہ اپنی خیالی جنت کو چھوڑ کر عملی دنیا میں قدم رکھا جائے اور جس سے جو بن پڑے، اس مقصد کے حصول میں کر گزرے۔ [1]

سب سے پہلے تو اس اقتباس سے، پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کے اس الزام کا ابطال ہو جاتا ہے کہ مودودیؒ صاحب، اُس اسلامی حکومت کے قیام کے خلاف تھے، جو تحریک پاکستان کے پیشِ نظر تھا، کیونکہ اس عبارت میں، خود مولانائے محترم کے یہ الفاظ موجود ہیں کہ ''ہمارے نزدیک، اگر ایک چپہ زمین پر بھی خدا کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ قطعۂ خاک، تمام روئے زمین سے زیادہ گراں بہا ہے''۔

[1] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۲-۱۳

رہا طلوعِ اسلام کا یہ نقطۂ نظر کہ پہلے مسلمانوں کی (قومی) حکومت قائم کر لی جائے، تو پھر اسے "حکومتِ الٰہیہ" میں بدل دیا جائیگا، تو اس کی تردید میں اُس وقت، مولانا مودودیؒ نے بہت سے دلائل دیے تھے، جنھیں طوالتِ بحث کے سبب نظر انداز کیا جاتا ہے، ان دلائل میں سے ایک دلیل یہ تھی۔

> ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہوسکتا ہے، جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ترکی اور مصر میں موجود ہے، اور وہاں اس کو وہ "پاکستان" حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جارہا ہے، پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت، کسی درجہ میں بھی حکومت الٰہیہ کے قیام میں مددگار ہے یا ہوتی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں، کیا آپ وہاں حکومتِ الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ ۱

یہ تین وہ مقامات ہیں، جہاں طلوعِ اسلام نے مولانا مودودیؒ کا نام لیے بغیر، ان کے موقف سے اختلاف کیا تھا، (یہ محض صرف اختلاف تھا، وہ تند و تیز اور شدید و غلیظ مخالفت ہرگز نہ تھی جو ایک مستقل وظیفۂ حیات کے طور پر، نعل در آتش ہو کر، طلوعِ اسلام (اور پرویز صاحب) نے قیام پاکستان کے بعد، اختیار کیے رکھی)، اب اس اختلاف کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں مولانا مودودیؒ کا نام لیا گیا تھا، لیکن اس اختلاف میں بھی اتفاق کا عنصر موجود تھا، چنانچہ مولانا مودودیؒ کے طویل اقتباسات پیش کرنے کے بعد، طلوعِ اسلام نے یہ لکھا تھا، کہ

> ہم نے ان حضرات کی روش کو قومیت پرستوں کے مسلک سے زیادہ خطرناک اس لیے کہا ہے کہ قومیت پرستوں کے دعاوی کی کمزوری بداہۃً نظر آجاتی تھی اور تھوڑی سی کوشش سے عوام کو، ان کے دام فریب سے آگاہ کیا جاسکتا تھا، لیکن جو نصب العین یہ حضرات پیش کر رہے ہیں، اس کے صحیح اور خالص اسلامی ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا، نہ اس کی اس بناء پر مخالفت کیجا سکتی ہے، اس لیے جوشیلے نوجوانوں کا، جو بالعموم جذبات کی ہر رو میں بہہ جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ہو جانا کچھ مستبعد نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ نصب العین اسلامی ہو تو پھر اس سے خطرہ کیا ہے؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا ہی نازک بھی ہے، اس لیے اس کی اہمیت و نزاکت کا تقاضا ہے کہ اس پر بدقتِ نظر غور کیا جائے۔ ۲

اس کے بعد، اس سوال کو تفصیل سے زیر بحث لایا گیا ہے، لیکن جگہ جگہ، مولانا مودودیؒ سے اختلاف (نہ کہ مخالفت) کرتے ہوئے، اتفاقی امور کا بھی اعتراف ہے۔

> سب سے پہلے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ دیکھ لیجئے کہ مسلمانوں کی سیاست کے متعلق ہمارا نظریہ کیا ہے، ہمارا نظریہ...... نظریہ نہیں...... بلکہ ایمان ہے کہ
>
> (۱) مسلمان دنیا میں اللہ کے سوا کسی کا محکوم نہیں ہوسکتا، حکومت اس کی اپنی ہونی چاہیے۔

---

۱ ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ/مارچ ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۸ + مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، جلد ۳، صفحہ ۱۰۸

۲ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۶

(۲) اسکی اپنی حکومت سے مراد، ان انسانوں کی حکومت نہیں جو اپنا نام مسلمان رکھتے ہیں بلکہ ان کے خدا کی حکومت ہے، یعنی خدا کے ضابطۂ قوانین، قرآن کریم کی تنفیذ وترویج، اسی کے مطابق امرونہی۔

(۳) اس حکومت کا قیام وبقا، ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو سکے گا جن کی سیرت خالص اسلامی قالب میں ڈھلی ہو، غیر اسلامی فکر ونظر کے لیے اس میں کہیں کوئی گنجایش نہیں۔

ہمارا یہ ایمان، آج کا نہیں بلکہ جس دن سے طلوع اسلام مطلع شہود پر آیا ہے، ہم اپنے اس ایمان کا اعلان کرتے چلے آ رہے ہیں، لہٰذا، اس باب میں ہمارا اور ہمارے پیش نظر حضرات کا کچھ اختلاف نہیں، اختلاف ہے تو اس نصب العین تک پہنچنے کے وسائل وطرق کا، اختلاف منزل کا نہیں، رہگذر کا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اختلاف ایسا ہے کہ ان حضرات کی روش فی الواقع خطرناک نتائج پیدا کرنے کی موجب ہو جائے گی، اس لیے ہم اس اختلافِ راہ کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں، یہ بھی واضح رہے کہ ہمیں ان حضرات کے حسن نیت کے متعلق کسی شبہ کی ضرورت نہیں۔ [۱]

یہاں سب سے پہلے تو اس تضاد کو ملاحظہ فرمایئے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے ''اسلامی حکومت کا قیام، ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو سکے گا جن کی سیرت خالص اسلامی قالب میں ڈھلی ہو، غیر اسلامی فکر ونظر کے لیے اس میں کہیں کوئی گنجایش نہیں''، اور دوسری طرف، ان لوگوں کے بارے میں، جن کے ہاتھوں میں تحریکِ پاکستان کی قیادت تھی، یہ بھی اعتراف کیا جاتا ہے کہ ...... ''لیگ کی قیادت، ان اربابِ دولت وحشمت کے لیے بالعموم ''ذہنی عیاشی'' سے زیادہ کچھ نہ تھی نہ انھیں عوام سے کچھ ربط تھا، نہ ان کے احوال وکوائف کی کچھ خبر، نہ ان کے دل میں قوم کا درد تھا، نہ اس درد کے مداوا کی کوئی فکر''۔

اس کے بعد، پھر مولانا مودودیؒ سے اختلاف کرتے ہوئے، اس امر کے حق میں ''دلائل'' دیے گئے ہیں کہ ساتھ، بہرحال، مسلم لیگ، ہی کا دینا چاہیے، خواہ مسٹر جناح اور دوسرے مسلمانوں کی سیرت، خالص اسلامی سانچے میں نہ ہی ڈھلی ہو، کیونکہ اسلامی حکومت کے بارے میں مولانا مودودیؒ کی یہ توقع بالکل خام ہے کہ امت مسلمہ، آناً فاناً مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے قدوسی پیکروں میں ڈھل جائے گی، حالانکہ مولانائے محترم نے ایسی کسی توقع کا کہیں ذکر ہی نہیں کیا، لیکن طلوع اسلام، پہلے اس خام توقع کو مولانائے محترم کی طرف منسوب کرتا ہے اور پھر، اس کی تردید، ان الفاظ میں کرتا ہے۔

جو قوم، اس قسم کی دوہری لعنت میں گرفتار ہو، ان میں ایسے اجتماعی انقلاب کی توقع رکھنا کہ وہ ایک ہی چکر میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے قدوسی پیکر میں تبدیل ہو جائے گی، بہت زیادہ خوش فہمی ہے۔ [۲]

مولانا مودودیؒ نے اُس وقت جو کچھ کہا تھا، وہ، بقولِ طلوع اسلام، صرف یہ تھا کہ

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں تغیر واقع ہونا چاہیے، اس کے بعد، ان کی کوششیں صحیح نتائج کی مثمر ہوں گی۔ [۳]

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کے ساتھ، اُس وقت طلوع اسلام نے بھی یہ کہہ کر اتفاق کیا تھا کہ......

''اس میں کسے کلام ہے'' [۴]

---

[۱] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷ [۲] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۰ [۳] + [۴] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۰

ایک خوش فہمی یا دلیل؟

اُس دور میں، طلوعِ اسلام، ایک دلیل یہ بھی دیا کرتا تھا کہ موجودہ مسلمان، خواہ، اسلام کے معیار سے کتنے ہی فروتر ہوں، عین ممکن ہے کہ ان کی پشتوں سے آئندہ ایسی نسل پیدا ہو جو معیاری مسلمانوں پر مشتمل ہو، بالکل اسی طرح، جس طرح ہم سے قبل والی غیر معیاری نسلِ مسلم میں سے آج کچھ بلند نظر لوگ پیدا ہو گئے ہیں، لیکن اگر وہ مٹ گئے یا مٹا دیے گئے ہوتے، تو ان میں سے یہ بلند لوگ کیسے پیدا ہوتے۔

قطع نظر، اس کے کہ آیا موجودہ مسلمانوں کی نسل سے، معیاری مسلمانوں کے پیدا ہو جانے کی توقع پر بھی ''بہت زیادہ خوش فہمی'' کا اطلاق ہوسکتا ہے یا نہیں، اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کے وجود کو مٹنے دیا جائے یا نہ مٹنے دیا جائے، نہ ہی یہ تھا کہ ایسے غیر معیاری مسلمانوں کو ہلاکت کا انجکشن لگایا جائے یا انھیں زندہ رہنے دیا جائے، بلکہ یہ تھا کہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے ضرورت، محض طبیعی اعتبار سے زندہ مسلمانوں کی ہے؟ یا کہ نظریاتی رنگ میں رنگے ہوئے افراد کی؟ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا طبیعی وجود (اگر وہ نظریاتی اور اعتقادی اعتبار سے زندہ و بیدار نہ ہوں) اسلامی حکومت کے نصب العین کے لیے باقی رہے یا نہ رہے، برابر ہے، ایسے لوگوں کی بھیڑ، کسی اور کام کے لیے نافع ہو تو ہو، لیکن خدائی حکومت کے قیام کے لیے، نہ صرف یہ کہ قطعاً نافع نہیں بلکہ الٹا نقصان دہ ہے، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا مقصد، تو صرف، ان ہی ہاتھوں سے ممکن ہے، جو بقول طلوعِ اسلام اپنی سیرت کو خالص اسلامی قالب میں ڈھال چکے ہوں۔ اس صورتحال اور سیاق وسباق میں کہی ہوئی بات سے یہ نتیجہ کشید کر ڈالنا کہ مولانا مودودیؒ کے نزدیک، غیر معیاری مسلمانوں کو مٹا دینا یا زہر کا انجکشن دینا ضروری ہے، ایک ایسا استدلال ہے جو نہ صرف یہ کہ قائل کی منشا کے خلاف ہے بلکہ بنائے فاسد بھی ہے جس پر ایک اور فاسد کا رڈا، یہ کہہ کر چڑھایا جاتا تھا کہ

> ان کا نظریہ یہ ہے کہ جس مریض کے قویٰ، اس قابل نہ رہے ہوں کہ وہ صحتیاب ہو کر میدان جنگ میں جا کر لڑ سکے، اس کے علاج کی کوشش بیکار ہے۔ بہتر ہے کہ اسے انجکشن دے کر ہلاک کر دیا جائے، اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی صحتیابی کے لیے کوشش کیجئے، میدان جنگ میں لڑنے کے قابل نہ بھی ہو سکے گا تو ایک کنبہ کی پرورش کا کفیل تو ہوگا۔ [1]

ایک اور دلیل اور اس کا جائزہ

اُس دور میں طلوعِ اسلام، اس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھا، کہ اگر اہلِ اسلام کی اپنی حکومت ہو جائے تو ان کی حالت آج سے بہتر ہوگی کیونکہ ہندو اور انگریز کی دوہری غلامی سے تو انھیں نجات حاصل ہو جائے گی، چنانچہ اس ضمن میں طلوعِ اسلام، یہ کہا کرتا تھا کہ ہماری قوم ایسی ہے کہ

> اگر اسے اپنی حکومت نصیب ہو جائے، تو آج سے تو حالت اچھی ہوگی، انگریز کی آہنی غلامی اور ہندو کی اقتصادی غلامی تو نہ ہوگی، آپ کہدیں گے کہ اس وقت، خود اپنوں کا استبداد ایسا ہوگا کہ جو مشکل آج ہے وہی اُس وقت ہوگی، سواول تو یہ مفروضہ غلط ہے،

---

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۸ تا ۹

دوسروں کی غلامی کے مقابلہ میں، اپنی حکومت میں انقلاب کے لیے حالات کہیں زیادہ سازگار ہوتے ہیں، ترکی اور ایران کے انقلاب کو دیکھئے اور اس کے مقابلہ میں مثلاً شام اور مراکش کے مسلمانوں کی حالت پر غور کیجئے، وہاں اپنی حکومت تھی تغیر نسبتاً آسانی سے پیدا ہو گیا (یہ الگ بات ہے کہ وہ تغیر کیسا تھا)، شام اور مراکش میں غیروں کی حکومت ہے وہاں انقلاب ایسا آسان نہیں۔ ۱؎

یہ اقتباس، نہ صرف یہ کہ طلوع اسلام (اور پرویز صاحب) کی ''خوش فہمی'' کو واضح کرتا ہے بلکہ ان کی ''قرآنی بصیرت'' کو بھی اَلَمْ نَشْرح کر دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا حصول پاکستان کے بعد، یا بالفاظ طلوع اسلام، قوم کی اپنی حکومت قائم ہو جانے کے بعد، حالتِ قوم سدھرتی چلی گئی؟ اس کا جواب طلوع اسلام ہی کی زبان سے ملاحظہ فرمایئے۔ وہ ہماری، ہندوستان میں دینی اور اخلاقی حالت کا، آزادی کے بعد کی حالت سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

(۱) کبھی ہماری یہ حالت تھی کہ بلقان میں جنگ چھڑتی تھی اور ہمارے گھروں میں ماتم کی صفیں بچھ جایا کرتی تھیں، یونانی سمرنا پر حملہ کرتے تھے اور یہاں گھر گھر سے رونے کی آواز بلند ہو جایا کرتی تھی، تحریک خلافت کا زمانہ ابھی کل کی بات ہے، کون بھول سکتا ہے کہ ترکوں کی مصیبت پر، ہندوستانی مسلمانوں کی بیواؤں نے اپنے چھلے، کپڑے اور برتن تک چندہ مانگنے والوں کی جھولیوں میں ڈالدیے تھے، سارے ملک میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی، چندے کے لیے جلوس نکلتے تھے تو روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں، لیکن آج ہمارے اپنے گھر میں ایک قیامت آ گئی ہے، اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہو رہا، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ہم ان تباہیوں اور بربادیوں کی خبروں کو یوں پڑھ لیتے ہیں جیسے ٹمبکٹو میں کچھ ہوا ہو جس سے ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں۔ ۲؎

(۲) ہندوستان میں (انگریز کے عہد غلامی میں) ہمارے قلوب میں اس اخوت اسلامی کی حرارت موجود تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئے ہم اپنی جگہ تڑپ اٹھتے تھے۔ ۳؎

پھر پاکستان میں امتِ مسلمہ کی حالت، یوں بیان کی گئی۔

اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ مختلف اسلامی ممالک تو ایک طرف، کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان بھی آپس میں بھائی بھائی نہیں ہیں ...... ان کے مفاد الگ الگ ...... ان کے مقاصد جدا جدا ...... ان کی راہیں متفرق ...... ان کی منزلیں متشتّت ...... ان کی ہیئتِ اجتماعیہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (تم خیال کرو گے کہ یہ سب ایک ہیں حالانکہ ان کے دل، ایکدوسرے سے الگ الگ ہیں) کا عبرت انگیز مرقع ...... جو کیفیت کسی ایک ملک کے مسلمانوں کی ہے وہی کیفیت مختلف ممالک کے مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات کی ہے۔ ۴؎

(۳) جس قدر روشن خیالی اور بلند آہنگی ہم میں تقسیم سے پہلے آ چکی تھی، آج ہم اس سے پست مقام پر پہنچ چکے ہیں، اگر یہی حالت چندے اور رہی تو ہم اس دور تہذیب و تمدن میں بھی زمانہ متوسطہ (Medival Age) میں جا پہنچیں گے۔ ۵؎

(۴) ہم گذشتہ ایک سال سے آزاد ہیں، پچھلے سال بھی ۱۵ اگست کو ہم نے آزادی کا جشن منایا تھا، آج ایک سال بعد پھر ویسا

۱؎ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۰ تا ۱۱ ۲؎ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۰ء، صفحہ ۷

۳؎ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۷ ۴؎ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۸

۵؎ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۳۴

ہی جشنِ آزادی منا رہے ہیں، آزادی کا یہ تیوہار اب ہر سال منایا جایا کرے گا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے اس ظاہری شور و غوغا اور سطحی دھوم دھام کے ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، ہم وہی کچھ ہیں جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تھے، ہم وہیں ہیں جہاں اس تاریخ آزادی کے وقت تھے، بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی کچھ پیچھے۔ [1]

(۵) اشاعت حاضرہ میں، ہم ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کے جشنوں کی تقاریب پر پیش کردہ محاسبہ کو دہراتے ہیں اگر صورت یہ ہے کہ اس بیس سال کے عرصہ میں ہم پہلے سے بھی زیادہ گہری پستیوں میں گر چکے ہیں تو اس سے ہم اپنے مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس کے دل سے پوچھئے، اس کے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزل مقصود، کل سے دور ہو! [2]

(۶) یقین مانئے، ہم اپنے دور غلامی میں اس قدر پست سطح پر نہیں تھے جس پر ہم اب پہنچ چکے اور مزید پستی کی طرف جا رہے ہیں، اس وقت ہم میں کم از کم انسان تو پیدا ہوتے تھے۔ [3]

ان چند اقتباسات سے، طلوعِ اسلام (اور پرویز صاحب) کی ''قرآنی بصیرت'' کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کی بناء پر، وہ کہا کرتے تھے کہ...... ''اگر مسلم قوم کو اپنی حکومت نصیب ہو جائے تو آج سے تو حالت اچھی ہوگی، انگریز کی آہنی غلامی اور ہندو کی اقتصادی غلامی تو نہ ہوگی''...... حالانکہ اپنی حکومت پا لینے کے بعد، مسلمانوں کی حالت، خود بقولِ پرویز صاحب اور بفحوائے طلوعِ اسلام، بد سے بدتر ہی ہوتی چلی گئی۔ لیکن قیام پاکستان سے قبل، مسلم لیگ کی ''قرآنی قیادت'' کو دیکھ کر، مولانا مودودیؒ نے بھی اپنی اسلامی فراست کی بناء پر، ایک پیشینگوئی، ان الفاظ میں کی تھی،

سچ یہ ہے کہ یہ لوگ، اس انقلاب (یعنی حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے انقلاب) میں مدد دینے کی بجائے، الٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کی نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں، ان کا چراغ نہ جل سکے گا، یہی نہیں، اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بیباکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے، اور ان کے نام، ان کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے، جب صورتحال یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو انقلابِ اسلامی کا نصب العین سامنے رکھ کر، ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر، اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی۔ [4]

ایک اور مقام پر، مسلمانوں کے ہاتھوں قائم ہونے والی ''قومی حکومت'' کے اربابِ اقتدار کے متعلق وہ یوں پیشینگوئی کر چکے تھے کہ

وہ ''قومی حکومت''، جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، انقلاب کا راستہ روکنے میں، اس سے بھی زیادہ جری و بیباک ہوگی

---

[1] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۴۸ء، صفحہ ۶۳

[2] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۹

[3] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۷۴ء، صفحہ ۴۸

[4] ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ/مارچ ۱۹۴۱ء، صفحہ ۳۰ + مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۰

جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے، غیر مسلم حکومت، جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ ''مسلم قومی حکومت'' ان کی سزا پھانسی اور جلا وطنی کی صورت میں دے گی، اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے، پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی ''قومی حکومت'' کسی معنٰی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ [1]

اور یہ پیشنگوئی، حرف بحرف پوری ہوئی، مسلم لیگ کی قیادت، نہ تو مولانا مودودیؒ ہی کے تصور کے مطابق اسلامی حکومت قائم کر سکی، اور نہ ہی پرویز صاحب کے نقطہ نظر کے موافق ''قرآنی حکومت'' ہی وجود میں لا سکی، حالانکہ بقول پرویز صاحب، قائداعظم ''اسلام کی روح کو سمجھنے کے لیے پوری عرق ریزی سے کام لے چکے تھے''، اور ''قرآن حکیم کے حقائق پر غائر نگہی'' کے مالک تھے، اور ''قرآنی حقائق اور دین کے اصول و اقدار، اُن کے قلب کی گہرائیوں میں، اترے ہوئے تھے''۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد، وہ تقریباً تیرہ ماہ زندہ رہے، لیکن کبھی اُن کی توجہ، پاکستان کے مقصد وجود کی طرف، عملی قدم اٹھانے پر مبذول نہ ہوئی، اسلامی انقلاب کی طرف عازم سفر ہونے کے لیے، کم از کم تقاضا یہ تھا کہ رخ ہی سیدھا کر لیا جاتا، لیکن قبلہ رو ہونے کی بجائے، اور کعبہ کو مقصودِ دل بنانے کی بجائے، راہِ ترکستان ہی پر جادہ پیمائی کو دیکھا جاتا رہا .... حتیٰ کہ طلوعِ اسلام کو بھی حیاتِ قائداعظم میں یہ کہنا پڑا کہ

مانا کہ مدت چاہیے قطع سفر کے واسطے !
دل طالب محمل تو ہو رُخ جانبِ منزل تو ہو
یوں ٹھوکریں کھاتے رہیں کیوں راہِ ''ترکستان'' میں
ہم قبلہ رو تو ہو چلیں، کعبہ مرادِ دل تو ہو!
آجائیگی منزل کی حد، کٹ جائے گا صحرا اسدؔ
عزمِ حرم سے کاروانِ شوق میں شامل تو ہو [2]

وہ قائداعظم، جن کے قلب کی گہرائیوں میں، بقول طلوعِ اسلام ''قرآنی حقائق اور دین کے اصول و اقدار اُترے ہوئے تھے''، قرآنی آیت اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کی روشنی میں یہ تو جانتے ہی تھے کہ اسلامی ریاست کے مقصدِ وجود میں، سب سے پہلی چیز ''اقامت صلٰوۃ'' ہے، لیکن قطع نظر اس کے کہ خود انھوں نے بھی کبھی نماز پڑھی تھی یا نہیں، سوال صرف یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد، کیا انھوں نے کبھی اقامت صلٰوۃ کا نظام (مولانا مودودیؒ یا شبیر احمد عثمانیؒ کے تصور کے مطابق نہ سہی، خود پرویز صاحب ہی کے تصور کے مطابق) قائم کیا تھا؟ کیا تیرہ مہینوں میں، قائداعظم کے لیے نمازوں کے اہتمام کے لیے اتنا سا کام بھی ممکن نہ تھا کہ

---

[1] ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ / مارچ ۱۹۴۱ء، صفحہ ۶۱، بحوالہ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۳۴

[2] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۴۸ء، صفحہ ۲۸

دفاتر کی عمارات کے درمیان کئی ایک کشادہ میدان پڑے ہیں جن میں تھوڑی سی توجہ سے، سردست کسی عمارت کے کھڑے کیے بغیر، نمازوں کا اطمینان بخش انتظام ہو سکتا ہے لیکن ارباب اختیار نے اِسکی ضرورت ہی نہیں سمجھی، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی زبانوں سے شریعت اسلامی اور قانونِ خداوندی کے تذکرے ہمیشہ زمزم ریز اور کوثر بار ہوتے ہیں۔ ؎۱

آخر اس کی وجہ؟ پرویز صاحب کے نزدیک، معلوم نہیں کہ، اس تساہل و تغافل کا اصل باعث کیا تھا لیکن مولانا مودودیؒ کے نزدیک، اصل وجہ مسلم لیگ کی قیادت کا اسلام کی تعلیمات سے بے خبر ہونا اور سیکولر مزاج ہونا تھا، لہٰذا انھیں اُس قیادت سے قطعاً یہ توقع نہ تھی کہ پاکستان بنا کر اس میں وہ اسلامی نظام کو نافذ کریں گے۔

مسلم لیگ کی سیکولر قیادت

مولانا مودودیؒ بغیر کسی لومۃ لائم کی پرواہ کیے، قائدینِ مسلم لیگ کے اس کردار کو واضح کیا کرتے تھے، جو نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی تھا بلکہ مغرب کی لادینیت کے رنگ میں بھی مصبوغ تھا۔

افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو، یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہیں جیسی دنیا میں اور قومیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس ''اسلامی سیاست'' ہے حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا، اسلام کے لیے ازالۂ حیثیت عرفی سے کم نہیں۔ ؎۲

چنانچہ قیامِ پاکستان سے قبل، مولانا مودودیؒ، جب مسلم لیگی قیادت کو اسلامی آئیڈیل کا نام لینے کے ساتھ ساتھ، پُشت بمنزل دیکھتے، تو یہ فرماتے ہوئے سمجھاتے کہ

فرض کیجئے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہر حال، میں وہی ذریعہ تلاش کروں گا جو مجھے اوپر کی طرف لے جا سکتا ہو، خواہ ابتداء میں وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اٹھائے، ایسا ذریعہ مجھے نہ ملے تو میں سطح زمین ہی پر قیام کرنا پسند کر لوں گا ...... لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں اوپر جانے کے ارادے سے، ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اترنا شروع کر دیتا ہوں اور اس راستے سے اس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے فاتر العقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپ کو میرے فتورِ عقل میں، اس وقت بھی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے، ان لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں، خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی، جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر، بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی، انھیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے، نہ وہ اُسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، جن کو نورِ ہدایت، صرف مغربی قوانین

؎۱ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۴۸ء، صفحہ ۲۳

؎۲ ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ / فروری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۳۳ + مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، جلد ۳، صفحہ ۳۰

دوسا تیر ہی میں ملتا ہے، اس کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اس کے بعد، اگر کوئی چیز، ان کی نگاہ میں قابل لحاظ ہوتی ہے تو وہ محض وقتی سیاست کی مصلحتیں ہیں، جنھیں وہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ۱

یہ تھی اس دور کی مسلم لیگ کی قیادت کی ذہنیت اور اُن کے کردار کی کیفیت، لیکن طلوع اسلام، اُس دور میں مسلم لیگ کے قائدین کی اس منفی ذہنیت کی نہ تو تردید ہی کر پایا، اور نہ ہی ان میں اسلامی طرز فکر اور دینی کردار کا اثبات ہی کر پایا، معلوم نہیں کہ، یہ اس کی بے بصیرتی تھی یا دانستہ کتمانِ حقیقت، کہ مسلم لیگ کی قیادت پر، یہ کھلی ہوئی تنقید اور اس کے نتیجہ میں ان کی غیر اسلامی ذہنیت اور غیر دینی سیرت پر اُس وقت کوئی تردیدی دلائل قائم نہ کر پایا، حتی کہ پاکستان بننے کے بعد، قائداعظم کی زندگی ہی میں، طلوع اسلام نے لیگی قیادت کے متعلق وہی کچھ کہنا شروع کر دیا جو قبل ازیں مولانا مودودیؒ کہا کرتے تھے، ملاحظہ فرمایئے چند اقتباسات:

(۱) انگریز چلا گیا لیکن اُس کے نظامِ حکومت نے تمھارے قلب و دماغ کو جن سانچوں میں ڈھال دیا تھا، تم نے انھیں بدستور قائم رکھا ہے بلکہ وہ برائیاں، جو پہلے پھر بھی کسی حد تک، انگریز کے خوف یا شرم سے دبی دبی سی رہتی تھیں، ابھر اور نکھر کر سامنے آ گئیں، خارجی دنیا میں پوری کی پوری بساطِ سیاست و حکومت بدل گئی لیکن تمھارے قلب و نگاہ کی دنیا میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

دل نے نئی دنیا بنا ڈالی
تم کو لیکن ذرا خبر نہ ہوئی!

وہی اپنوں سے بیگانگی و مغائرت، وہی مصنوعی رعب و داب، وہی خوشامد پرستانہ مسلک، وہی فریب کارانہ مشرب، وہی حیلہ جوئی اور کام چوری، وہی نالائقی اور نا اہلی، وہی خیانت و بددیانتی، وہی اعزہ پروری و جنبہ داری، وہی ظلم و استبداد، وہی جور و ستم، کوئی دادخواہ نہیں جو تمھارے ہاتھوں نالاں نہ ہو، کوئی ستم رسیدہ نہیں جو تمھاری نازیبائی سلوک کا شکوہ سنج نہیں۔ ذرا سوچو!

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

یاد رکھو! اگر تم نے خود اپنے آپ کو نہ بدلا تو خدا کا نہ بدلنے والا قانون تمھیں بدل دے گا اور اس کا بدلنا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تختہ الٹ جایا کرتا ہے۔ ۲

پاکستان کی خاطر، اپنے گھر جھگے جلوا کر آنے والے، اور آگ اور خون کا سمندر تیر کر آنے والے، لٹے پٹے لوگوں کے ساتھ، اپنے عشرتکدوں میں سوئے ہوئے حکمران اور نشۂ اقتدار کی بدمستیوں میں کھوئے ہوئے ارباب اختیار، جس بے رحمی اور شقاوت قلبی کا مظاہرہ کر رہے تھے، اس سے اُن کی آنکھوں میں سجے ہوئے پاکستان کے متعلق حسین خواب، نہ صرف یہ کہ چکنا چور ہو رہے تھے، بلکہ اُن کے غیظ و غضب کو بھی ہوا دے رہے تھے، ان کی چیخ و پکار کی ترجمانی، ان الفاظ میں کی گئی تھی۔

(۲) کیا یہی ہیں وہ حکومت الٰہیہ کے ایوانِ خاص کے عمائدین و اراکین، جن کی شیطنت پر انسانیت روتی اور آدمیت آنسو بہاتی ہے، جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی، رشوت ستانی، حرام خوری، خوشامد، تملق، اعزہ پروری، احباب نوازی، کیا یہی ہیں

۱ ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ/فروری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۶۶ + مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، جلد ۳، صفحہ ۶۲ تا ۶۳

۲ طلوع اسلام، جنوری فروری ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۶

وہ خصوصیات جن کی خاطر، غیروں کی حکومت پر، اپنی حکومت کو ترجیح دی جاتی تھی؟ نا اہلی، غلط اندیشی، تساہل انگاری، وعدہ خلافی، کام چوری، ملت فروشی، خودغرضی، خودستائی، ہوس پرستی، زراندوزی- کیا یہی ہیں وہ معیار جن کی بناء پر ارباب حکومت و سطوت کا انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا؟ اسلام خطرے میں ہے، ملت تباہ ہو رہی ہے، قوم ڈوب رہی ہے، کیا یہ سب نعرے اس لیے لگائے جا رہے تھے کہ ان اکابرین کے اپنے مفاد خطرے میں تھے۔ [1]

اکابرین مسلم لیگ کے وہ کون سے لوگ تھے جو اقتدار کی مسندوں پر، پاکستان بنتے ہی براجمان ہو چکے تھے اور یہ کن اوصاف کے مالک تھے، سنئے!

(۳) جو نالائق اور بددیانت گروہ، حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسانید اقتدار پر متمکن ہو چکا ہے، اُسے اُسکی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر، اس کے اصلی مقام کی طرف لوٹا دینے کا انتظام کیا جائے، اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقے کی تطہیرِ فکر اور تربیت قلب، اس انداز میں کی جائے کہ وہ حکومت کے بارِ عظیم کو اٹھانے کے اہل ہو جائیں۔ [2]

بے یار و بے مددگار مہاجرین، جو ہندو استبداد سے بچ کر، پاکستان پہنچ چکے تھے، بہر حال، اپنی آتشِ شکم کو بجھانے کے لیے غذا و خوراک کے محتاج تھے، کارپردازان حکومت نے، نہ انھیں دکانوں کے لیے جگہ دی، نہ رہنے کے لیے مکان دیا، نہ کاروبار شروع کرنے کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کیا، جب ان لوگوں نے شبانہ روز محنت و جانفشانی سے رہگذر پر بیٹھ بیٹھ کر کسب معاش کی حقیر صورتیں پیدا کیں تو حکومت کا قانون، حرکت میں آیا، اور ان پر ذریعۂ معاش بند کر دیا، چنانچہ ان بدنصیبوں کو سڑکوں اور پٹڑیوں سے اٹھا دیا گیا، اس پر طلوع اسلام نے کیا لکھا، ملاحظہ فرمائیے:

(۴) اب ہماری ہمہ گیر حکومت کی دسترس سے کچھ بھی محفوظ نہیں، موت کے منہ سے، جان جوکھوں میں ڈال کر، جان بچا کر پاکستان میں پناہ ڈھونڈنے والے نیم مردہ، پاکستان میں بھی موت ہی کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں، کیا اس سے بہتر یہ نہ تھا کہ وہ دشمنوں کی سفاکیوں کی نذر ہو جاتے؟ کم از کم وہ اس تلخی اور مایوسی کا شکار تو نہ ہوتے، کہ جس پاکستان کی خاطر، انھوں نے سب کچھ قربان کر دیا، وہی ان کی رسوا کن موت کا باعث ہوا، جسے وہ جنت سمجھ رہے تھے، وہ جہنم ثابت ہوا۔ وہ پھول چننے کے لیے بڑھے تو ان کی انگلیوں میں کانٹے پیوست ہوئے، وہ اپنے بنائے ہوئے پاکستان کے قلب میں اترے تو انھیں ٹھکرا دیا گیا، وہ روٹی مانگتے تھے، انھوں نے خون پسینہ ایک کر کے روٹی کمائی اور حکومت پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا، لیکن حکومت نے ان کی کمائی ہوئی روٹی ان سے چھین لی اور انھیں اور ان کے بھوکے بیوی بچوں کو بے رحم قانون کے رتھ کے نیچے کچل دیا۔ [3]

قیام پاکستان کے وقت، مجلس دستور ساز میں، ایسے ارکان بھی تھے جن میں ایک گروہ کو طلوع اسلام "ایماندار بے ایمانوں" کا گروہ قرار دیتا تھا اور دوسرے گروہ کو، وہ "بے ایمان ایمانداروں" کا ٹولہ کہا کرتا تھا، اول الذکر گروہ کے متعلق، طلوع اسلام نے یہ لکھا تھا کہ

(۵) اول الذکر گروہ سے، جو "ایماندار بے ایمانوں" پر مشتمل ہے، خطاب فضول ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظریں جلوہ گاہِ

---

[1] طلوع اسلام، جنوری فروری ۱۹۴۸ء، صفحہ ۹۷ [2] طلوع اسلام، جنوری فروری ۱۹۴۸ء، صفحہ ۹۹

[3] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۴۸ء، صفحہ ۹۰

دانشِ فرنگ نے خیرہ کر رکھی ہیں، اور جن کی نگاہوں میں کوئی ایسی چیز جچ نہیں سکتی جس پر لنڈن یا ماسکو کی مہر ثبت نہ ہو۔ ان کے نزدیک کوئی ایسا نظام، قابلِ قبول نہیں ہوسکتا جو مغربی مادہ پرستی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو، لہٰذا یہ گروہ اس موضوع کے پیشِ نظر، مرفوع القلم ہے۔

دوسرا گروہ جسے ہم ''بے ایمان ایماندار'' کہہ سکتے ہیں .... یہ گروہ یا تو بزدل ہے کہ اپنے دلی معتقدات کے اظہار سے ڈرتا ہے، یا فریب کار کہ اپنے موجودہ دنیاوی مراتب کو برقرار رکھنے کے لیے وہ بات کہتا ہے جس میں اسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی امید ہوسکتی ہے......... اس بناء پر ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام و قرآن سے ان لوگوں کی والہانہ شیفتگی ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، انھوں نے عوام کی نازک رگ کو پہچان لیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کے ذہن اس چیز کو سننے اور برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں جو ان کے قلوب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے......... ان لوگوں سے ہم گذارش کریں گے کہ وہ قوم سے مذاق کرنا چھوڑ دیں، ان کی قیادت کے ایوان، ریت کے ستونوں پر استوار نہیں ہو سکتے، اس لیے جس قدر جلد وہ اس فریب کاری، ملمع سازی اور منافقت کو ترک کر دیں، بہتر ہے۔ [1]

پاکستان کی اولین حکومت کے عمائد و اراکین، اپنی حرکات کی بدولت، قائد اعظم کی زندگی ہی میں عوام کے اعتماد سے محروم ہو چکے تھے، جیسا کہ خود طلوعِ اسلام نے اعتراف کیا تھا۔

(۲) ہم اربابِ حکومت پر اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نبضِ ملت کا احساس کر رہے ہیں، انھیں ملت کا اعتماد حاصل نہیں، عدمِ اعتماد اگر کسی صحیح ترقی یافتہ جمہوری ملک میں پایا جاتا تو حکومت کب کی شکست کھا چکی ہوتی .... یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس وقت ملت، حکومت کو ''اپنی'' نہیں سمجھتی، وہ اسے بدستور اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہے، حکومت نے یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، اربابِ حکومت، مشینوں کی طرح پہلے سے طے شدہ آئین و ضوابط کے مطابق حکومت کر رہے ہیں اور بس۔ وہ خود اس احساس و شعور سے، تہی معلوم ہوتے ہیں کہ اب حکومت ''اپنی'' ہے، بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ''اور'' کا غلام تصور کرتے ہیں، اے کاش! اس ''اور'' سے مراد، ملت ہوتی۔ [2]

قیامِ پاکستان سے قبل، مسلم لیگی قائدین کے متعلق، مولانا مودودیؒ نے کس قدر سچی بات کہی تھی کہ ان لوگوں کی عملی زندگی میں اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی، معاملاتِ زندگی میں، خواہ وہ چھوٹے امور ہوں یا بڑے، نہ تو انھیں اسلام کا نقطۂ نظر معلوم ہے اور نہ وہ اسے معلوم کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں، ایسے معاملات میں یہ لوگ اندھے مقلد اور نقال ہیں اور راہِ ہدایت پانے کے لیے، اسلام کی طرف دیکھنے کی بجائے، دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں، مولانائے محترم کی یہ بات حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی، جبکہ قیامِ پاکستان کے بعد، حکومتِ پاکستان کے ایک اہم کارپرداز، جناب ملک فیروز خاں نون نے، ''یومِ عالمِ اسلام'' کی تقریب پر، کراچی میں تقریر کرتے ہوئے، یہ کہا کہ پاکستان کو، اسلام کا مفہوم، ترکی اور ایران جیسے ''ترقی یافتہ'' ممالک سے سمجھنا چاہیے، اس پر طلوعِ اسلام

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۰۱ + طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۱۵

[2] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۴۸ء، صفحہ ۹۵ + طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۱۶

نے ''اسلامی حکومتیں'' کے زیر عنوان جو کچھ لکھا تھا، اس سے ایک طرف، مولانا مودودیؒ کے فرمودات کی تصدیق ہو جاتی ہے تو دوسری طرف، اسلام کے بارے میں، مسلم لیگی قائدین کا ''مبلغ علم'' بھی واضح ہو جاتا ہے۔

(۷) اس وقت ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اسلامی حکومتوں کی بہترین مثال ترکی اور ایران ہے۔ ترکی کانوں پر ہاتھ رکھ رہا ہے کہ ہماری حکومت اسلامی نہیں، غیر دینی (Secular) ہے۔ اور ایران پر وہ ملوکیت مسلط ہے جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ یہ ہیں ہمارے اکابر، جن سے مسلمان توقع وابستہ کیے بیٹھے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ کریں گے۔ جو مسلمانوں کو اسلام فہمی کے لیے ترکی اور ایران کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کریں، ان کی اسلام فہمی کو ہزار سلام۔ اس سہاگ سے تو رنڈاپا اچھا۔ [1]

اسلام کا نعرہ لگانے والے، مسلم لیگ کے قائدین کی ہوسِ اقتدار کا یہ عالم تھا کہ پاکستان بنتے ہی قائداعظم کے حینِ حیات، یہ لوگ، نوزائیدہ مملکت کو خانہ جنگی کے جہنم میں دھکیلنے پر آمادہ ہو گئے۔

(۸) قائداعظم کی زندگی ہی میں ارباب سیاست کی خانہ جنگی اس قدر گھناؤنی ہو گئی تھی کہ ان کی مساعی مفاہمت یکسر ناکام ہو گئیں، قائداعظم کے انتقال کے بعد جو دور شروع ہوا، اس کا دارومدار ہی ریشہ دوانی اور سازش پر تھا، اس پر پاکستان کے دل پر دورے پر دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ [2]

مسلم لیگی قیادت، اہل اسلام کے لیے ہمدردی و غمگساری کے کس قدر جذبات رکھتی تھی؟ اسلامیان ہند کے مصائب و تکالیف کا انھیں کس قدر احساس تھا؟ ان کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے وہ کس قدر حریص تھے؟ مسلمانوں پر منڈلانے والے خطرات کو ٹالنے کے وہ کس قدر مشتاق تھے؟ اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ پاکستان بننے پر، ہندوؤں اور سکھوں نے جس قدر اور جس طرح مسلمانوں کو نشانہ ظلم و ستم بنایا، ان کے گھر جھگے جلائے گئے، اُن کے ہجرت پر مائل قافلوں کو لوٹا گیا، مردوں کو قتل اور نوجوانوں کو ذبح کیا گیا، بچوں کو نیزوں اور سنگینوں پر اچھالا گیا، مسلم خواتین کی عفت و عصمت پر حملے کیے گئے، یہ سب کچھ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ہندوؤں کے سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا، اور لطف یہ کہ پاکستان بنانے والی مسلم لیگی قیادت کو بھی اس سارے منصوبے کا علم تھا، لیکن اس قیادت نے نہ تو پرامن انتقالِ آبادی کا کوئی بندوبست کیا، اور نہ ہی مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے اس تباہ کن منصوبے کی اطلاع دی کہ بے چارے مسلمان، اپنے طور پر ہی اپنے دفاع کا بندوبست کر لیتے۔ قتل و غارت گری کے اس منصوبے کی اطلاع پا کر بھی مسلم لیگ کے قائدین کا اسے مخفی رکھنا، کیا محض اس لیے نہ تھا کہ مسلم مہاجرین زیادہ سے زیادہ قتل و فساد اور تباہی و بربادی کا نشانہ بنیں؟ اور نئے پاکستان میں کم سے کم لوگ، آگ اور خون کے اس دریا سے بسلامت پہنچیں، تاکہ انھیں، ان لوگوں کی آبادکاری میں کم از کم دقتیں پیش آئیں، پھر ہندو اور انگریز کی ملی بھگت کے اس منصوبہ کا انکشاف کیا بھی گیا تو پاکستان بننے کے ایک مدت بعد، اور، وہ بھی پاکستان میں نہیں، بلکہ انگلستان میں جا کر، تاکہ پاکستانی عوام،

---

[1] طلوع اسلام، جون ۱۹۴۸ء، صفحہ ۲۰

[2] طلوع اسلام، ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۳ بحوالہ طلوع اسلام، جون ۱۹۷۹ء، صفحہ ۲۹

اس سے بے خبر ہی رہیں، یہ پاکستان کی ملت اسلامیہ کے ساتھ، مسلم لیگی قیادت کی اتنی بڑی غداری تھی کہ بالآخر طلوع اسلام کو بھی اس پر یوں لب کشائی کرنی ہی پڑی۔

(۹) قوم اپنے لیڈروں سے پوچھتی ہے کہ جب آپ کو اتنے وثوق سے اس کا علم ہو چکا تھا، کہ اتنا عظیم خطرہ، مسلمانوں کے سر پر منڈلا رہا ہے، اور آپ کو اس کا بھی علم تھا کہ ماؤنٹ بیٹن مسلمانوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کرے گا، بلکہ شاید وہ اس سازش میں خود شریک ہے، تو آپ نے اپنی قوم کو اس قتل و غارتگری سے بچانے کے لیے کیا انتظامات کیے؟ کیا ان حالات میں آپ کا فریضہ محض اس قدر تھا کہ آپ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے تحفظ امن کا مطالبہ کرتے اور اس کے ٹال دینے پر، عافیت کدوں میں آ کر اطمینان اور بے فکری سے داد استراحت دیتے؟ آپ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے، تو کیا آپ سوئے قوم آ کر قوم کو آنے والے خطرات سے آگاہ نہیں کر سکتے تھے؟ اسے اس کے لیے تیار نہیں کر سکتے تھے؟ یا اسے حالات سے آگاہ کر کے یہ موقع نہیں دے سکتے تھے کہ وہ از خود اپنی حفاظت کے سامان کرے؟ جب تک قوم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا وہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں بالکل حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کے تمام قتل و غارت کا ذمہ دار، نہ مؤنٹ بیٹن ہے، نہ مرکزی حکومت، بلکہ اس بیگناہ دریائے خون کی ساری ذمہ داری، ان رہنمایانِ قوم کے سر ہے جنھوں نے سیلاب بلا امڈتے دیکھا لیکن قوم کو آگاہ کرنے کے روادار نہ ہوئے۔ ¹

آگے چل کر، اس ضمن میں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ

آپ نے تو ماؤنٹ بیٹن کا دامن حریفانہ کھینچا ہے اور اسے مورد الزام قرار دیا ہے، اور قوم آپ کا دامن کھینچتی ہے اور لاکھوں مظلومین کے بیگناہ خون کی دہائی دیتی ہے اور یہ پوچھتی ہے ''بای ذنب قتلتنی''۔ ذبح ہونے والی مائیں، بے آبرو ہونے والی بہنیں، نیزوں سے چھدنے اور پتھروں سے پاش پاش ہونے والے بچے، کرپانوں سے شہید ہونے والے نہالانِ امت، جو موت کی مہیب اور پرسکوت وادی میں جھونک دیے گئے ہیں، ان کی معصومیت، مظلومیت، کپکپی پیدا کرنے والی اور نہ تھمنے والی چیخ کی صورت میں ہمارا تعاقب کر رہی ہے، تاریخ کا مکبر الصوت، اس چیخ کو ''صورِ قیامت'' میں بدل دے گا، اور یہ ''مردے'' زندہ ہو کر پوچھیں گے۔

قصاص، خونِ تمنا کا مانگیے کس سے؟
گنہگار ہے کون، اور خوں بہا کیا ہے؟

قوم حق بجانب ہے کہ لیڈروں کے اعتراف کے پیشِ نظر، ان سے کہے کہ

بچتے نہیں مؤاخذۂ روز حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو ²

یہ تھی مسلم لیگ اور اس کی قیادت، جس سے مولانا مودودیؒ نے قبل از قیام پاکستان، اختلاف کیا تھا، اور دلائل و براہین کی بنیاد پر کیا تھا، اور یہ اختلاف بھی، بقول طلوع اسلام، کوئی مقصدی اور جوہری اختلاف نہ تھا۔

¹ طلوع اسلام، اگست ۱۹۴۸ء، صفحہ ۷۴ ² طلوع اسلام، اگست ۱۹۴۸ء، صفحہ ۷۷ تا ۷۸

اس باب میں ہمارا اور ہمارے پیش نظر حضرات کا کچھ اختلاف نہیں۔ اختلاف ہے تو اس نصب العین تک پہنچنے کے وسائل و طرق کا۔ اختلاف منزل کا نہیں، رہگذر کا ہے۔ ۱

اور اس اختلاف میں، طلوع اسلام کو، مولانا مودودیؒ کی حسنِ نیت پر بھی کوئی شک وشبہ نہ تھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمیں ان حضرات کی حسنِ نیت کے متعلق کسی شبہ کی ضرورت نہیں۔ ۲

اس وقت، طلوع اسلام کو اس شبہ کی ضرورت ہو بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ طلوع اسلام بھی، اس وقت قرآن وحدیث، کتاب وسنت اور کلام اللہ کے ساتھ اسوۂ رسولؐ کے ماخذِ ہدایت ونجات ہونے کا (بظاہر ہی سہی) قائل تھا، اور حکومتِ الٰہیہ کا علمبردار تھا، اور یہی کچھ مولانا مودودیؒ بھی کہہ رہے تھے، بلکہ حکومتِ الٰہیہ کے بارے میں، ان کے حرص واشتیاق کا یہ عالم تھا کہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ

مجھے اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر، خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرہ خاک کو، تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔ ۳

تحریک پاکستان کے نصب العین اور منزل مقصود کے ساتھ اتفاق واتحاد کا دم بھرتے ہوئے، اس تحریک کی قیادت کے ساتھ اختلاف کرنا، ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی کسی ریاست کی وفاداری میں پختہ ہونے کے باوجود، اُس کے حکمرانوں سے اختلاف کرے، اور ظاہر ہے کہ حکومت سے اختلاف، ریاست کے مقصدِ وجود سے اختلاف کا ہم معنٰی نہیں ہوتا، لیکن قیامِ پاکستان کے بعد، خود پرویز صاحب کا جوذہن بدلا تو اسلامی حکومت کا مبنیٰ قرآن وسنت کی جگہ لفظ قرآن قرار پایا، جبکہ مولانا مودودیؒ کا، وہی ''قرآن وسنت'' پر مبنی تصور برقرار رہا۔ اب پرویز صاحب کی ''قرآنی حکومت'' کا تصور، (جس کا معاشی نظام، اشتراکیت سے اور معاشرتی نظام، یورپی تمدن سے ماخوذ تھا) مولانا مودودیؒ کے قرآن وسنت پر مبنی ''اسلامی حکومت'' کے تصور سے قدم قدم پر ٹکرا رہا تھا، جبکہ پرویز صاحب، اپنے نظریہ کے مخالف تصور کو ''عجمی اسلام'' کے نام سے مطعون کر رہے تھے، ''مفکرِ قرآن'' نے یہاں اپنی ذہنی چابکدستی سے کام لے کر، سید مودودیؒ کی یہ کہہ کر مخالفت...... اور وہ بھی انتہائی شدید مخالفت...... کرنی شروع کر دی کہ وہ ''قرآنی حکومت'' کے خلاف ہیں، حالانکہ وہ فی الواقع صرف اس حکومت کے خلاف تھے جسے پرویز صاحب نے منسوب الی القرآن کر رکھا ہے، اور اس پر مزید ستم اور سینہ زوری یہ کہ اسی قرآن کے گلے مڑھے ہوئے ''قرآنی نظام'' کے نفاذ کو، وہ قائداعظم کی منزلِ مقصود قرار دیتے تھے، پھر ستم بالائے ستم یہ کہ پرویز صاحب، مولانا مودودیؒ کو قائداعظم کے ''قرآنی نظام'' کا مخالف قرار دے کر مطعون کیا کرتے تھے، اور اپنے قارئین کے دلوں میں، یہ کہہ کر، مولانا مودودیؒ کے خلاف، نفرت، کینہ، بغض اور عداوت پیدا کیا کرتے تھے کہ

مودودی صاحب کے نزدیک، جس مملکت کا دستور قرآنی ہو، اس میں حکومت کا فرانہ ہوتی ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل

---

۱ + ۲ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۷

۳ ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ/فروری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۸۳ + مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، جلد سوم، صفحہ ۷۹

لعنت (استغفر اللہ)۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان صاحب کو قرآنی دستور سے کس قدر بغض اور عناد ہے، اور وہ اس کی مخالفت میں کس طرح ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہے تھے۔ ۱؎

پھر اس پراپیگنڈے کو طلوعِ اسلام میں، بار بار، بتکرار و اعادہ، مختلف پیرائیوں میں، متفرق عنادین کے تحت، ایک مستقل پالیسی کے طور پر، دائمی روش اختیار کرتے ہوئے جاری رکھا گیا، یہ گویا مولانا مودودیؒ کے خلاف ایک مستمر جنگ تھی، جس کی آگ کو برقرار رکھنے بلکہ بھڑکائے رکھنے کی خاطر، طلوعِ اسلام کے آتشکدے میں مسلسل ایندھن کا ڈالا جانا ضروری تھا، تاکہ کہیں مولانا مودودیؒ کے خلاف نفرت و عناد اور بغض و عداوت کی یہ آگ بجھنے نہ پائے، اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس ''کارِ خیر'' میں کوئی ناغہ یا وقفہ نہ پیدا ہونے پائے، کیونکہ طلوعِ اسلام کا یہ ایمان تھا کہ:

> جنگ اسی صورت میں جاری رکھی جا سکتی ہے کہ فریقین اپنی اپنی قوم اور سپاہیوں کے دل میں، فریق مخالف کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات برابر مشتعل کرتے رہیں، اگر کسی طرح جنگ میں وقفہ پیدا کر دیا جائے تو جذبات کا یہ اشتعال مدھم پڑ جاتا اور پھر ختم ہی ہو جاتا ہے، اس کے بعد دوبارہ اس آگ کو بھڑکانا مشکل ہوتا ہے۔ ۲؎

لیکن یہ ایک ایسی جنگ تھی، جس کی آگ کو طلوعِ اسلام کی طرف سے یکطرفہ ایندھن ڈال کر ہی برقرار رکھا بلکہ بھڑکایا جاتا رہا، مولانا مودودیؒ کا ترجمان القرآن اور اس کی پوری فائل، اس دائمی جنگ کے ذکر سے یکسر خالی رہی، الا یہ کہ احیاناً کبھی سر راہ چلتے ہوئے، افکارِ پرویز کی تردید کر دی گئی، اور وہ بھی اکثر و بیشتر بغیر نام لیے، اس لیے کہ ترجمان القرآن کا مقصد، محض افکار باطلہ کی تردید ہے (نہ کہ کسی شخصیت کو نشانہ بنانا، جیسا کہ طلوعِ اسلام کا شیوہ رہا ہے)۔

الغرض یہ پوری بحث، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل، طلوعِ اسلام نے، مولانا مودودیؒ کی مخالفت نہیں بلکہ اُن سے صرف اختلاف کیا تھا، اور وہ بھی، مولانا مودودیؒ کی حسنِ نیت میں کسی قسم کا شک وشبہ کیے بغیر۔ پھر یہ اختلاف بھی نصب العین کا اختلاف نہ تھا، بلکہ نصب العین تک پہنچنے کے لیے وسائل و طرق کا اختلاف تھا، منزل کا نہیں بلکہ رہگذر کا اختلاف تھا .... لیکن .... قیامِ پاکستان کے بعد، ذہنِ پرویز بدلا تو حقائق بھی بدلتے چلے گئے، اور وہی مولانا مودودیؒ، جو تقسیم سے قبل، طلوعِ اسلام کے نزدیک، شرحِ صدر، اسلامی بصیرت اور تفقہ فی الدین کے اوصاف سے متصف تھے، اب نہ کوئی عالم رہے اور نہ ہی مفکر۔ بلکہ وہ اب'' منکرِ قرآن '' قرار پائے، ملائیت کے سرخیل، جدتِ فکر سے عاری، ندرتِ نگاہ سے محروم، دروغ گو، بے اصول، سرمایہ داری کا حامی، دشمنِ اسلام، عدوِ پاکستان، مذہبی آمر، صحابہؓ سے شدید بغض رکھنے والا، مسلم لیگ کو ہر قسمی گالیاں دینے والا، امتِ محمدیہ سے شدید بغض اور عداوت رکھنے والا، دین اسلام کو تفریح سمجھنے والا، سیرتِ رسولؐ کو داغ دار کرنے والا، نظریۂ ضرورت کا اسلام تراشنے والا، اسلام کا بدنام کنندہ، قرآن کے نام سے چڑنے والا، مسلمانوں کو مسلمان نہیں بلکہ جانور کہنے والا، اپنی ہوسِ اقتدار میں پاکستان کو جہنم میں دھکیلنے والا قرار پائے۔

۱؎ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۷ء، صفحہ ۲۷ ۲؎ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۳ء، صفحہ ۳۲

یہاں یہ بات بھی قارئین کرام کے لیے موجبِ حیرت اور باعثِ صد استعجاب ہوگی کہ دسمبر ۱۹۴۰ء کے طلوعِ اسلام میں مولانا مودودیؒ سے، منزل کا نہیں بلکہ راہگذر کا اختلاف ظاہر کرنے کے بعد بھی، (قیامِ پاکستان سے قبل) مولانا مودودیؒ کا ذکر، پرویز صاحب، اکرام واحترام اور حسن وخوبی کے ساتھ کرتے رہے ہیں، چنانچہ ستمبر ۱۹۴۱ء کے شمارہ میں مولانائے محترم کی کتاب خطبات پر تحسین افزاء تبصرہ بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے۔

> جس زمانے میں جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن کا قیام دار الاسلام (پٹھان کوٹ) میں تھا، وہ وہاں کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، دار الاسلام پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع میں واقع ہے جہاں مسلمانوں میں جہالت عام ہے، اس لیے ضرورتاً سید صاحب کو سلیس زبان میں عام فہم مسائل کو بیان کرنا ہوتا تھا، اب انھوں نے ان خطبات کو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ مجموعہ کام کی چیز بن گیا ہے۔ سید صاحب کی تحریر میں متانت اور طریقِ استدلال میں سنجیدگی ہوتی ہے یہ خصوصیات ان خطبات میں بھی موجود ہیں جو اسلام کے مبادیات کے مختلف گوشوں پر مشتمل ہیں۔ [1]

لیکن پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد، پرویز صاحب کی ایسی دماغی کایا پلٹ ہوئی کہ پہلے والا وسائل اور طرق کا اختلاف اب نصب العین کا، اور رہگذر کا اختلاف، اب منزل ہی کا اختلاف قرار پا گیا، اور پھر یہ اختلاف بھی، اختلاف کی حد سے گزر کر، مخالفت ومخاصمت اور عداوت ومجادلت تک پہنچ گیا، اور مولانا مودودیؒ کی تحقیر وتوہین، اور وہ بھی انتہائی سوقیانہ انداز میں، پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کا مستقل شیوہ بن گیا۔

(۳) انکارِ حدیث اور مخالفتِ سنت کی طوفانی یلغار

علمائے کرام، جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے خلاف تحقیر وتوہین اور استہزاء وتمسخر کی شدید مہم کے پہلو بہ پہلو، انکارِ حدیث اور مخالفتِ سنت کے لیے بھی طلوعِ اسلام میں ایک طوفانی یلغار برپا دکھائی دیتی ہے چنانچہ ہم طلوعِ اسلام کی فائل میں یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث کی مخالفت اور سنت کی عداوت میں وہ سارے حربے آزمائے گئے جو سیکولر حکومتوں کی مفاد پرست صحافت میں اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً

(۱) سنسنی خیز سُرخیاں جما کر، حدیث وسنت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والے سوالات کو بڑے تحدی آمیز اعلانات کے ساتھ شائع کیا گیا، صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

> کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟ [2]

(۲) سنت کی حقیقت اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں علماء کے باہمی اختلافات کو، بڑے تکرار واعادہ کے ساتھ پیش کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی تا کہ یہ تاثر اچھالا جائے کہ سنت، علماء کے درمیان لفظاً متفق علیہ ہو تو ہو، ورنہ معناً اور مفہوماً

---

[1] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۶۷

[2] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۱ء، صفحہ ۴ + اگست ستمبر ۱۹۵۲ء، صفحہ ۱۳۲

قطعاً متفق علیہ نہیں ہے اور جب متفق علیہ نہیں ہے تو آئین پاکستان کی بنیاد کیسے بن سکتی ہے؟ اور یہ روش اپناتے ہوئے، پرویز صاحب (اور طلوعِ اسلام) خود یہ بات بھول جاتے ہیں کہ خود قرآن مجید کا بھی یہی حال ہے، اہل قرآن کے مختلف دھڑوں میں، متنِ قرآن پر اتفاق و اجماع کے باوجود، اس کے معنی و مفہوم میں شدید اختلافات، آج تک موجود ہیں، ایسی صورت میں تو پھر قرآن بھی دستور پاکستان کی اساس قرار نہیں پا سکتا، لیکن پراپیگنڈہ صرف حدیث نبوی اور سنت رسول ؐ ہی کے خلاف دائماً جاری رکھا گیا۔

(۳) سنت کے بارے میں، منکرینِ حدیث نے اپنے نقطۂ نظر سے، اس کا مقام اور حیثیت متعین کرتے ہوئے، ایک مضمون ''سنت رسول اللہ'' کے زیر عنوان، ادارتی صفحہ پر ثبت کیا اور پھر اس کے بعد، بڑے مسکین الطبع بنتے ہوئے، طالب علمانہ انداز میں یہ کہا گیا کہ:

> یہ ہے ہمارے نزدیک، اتباعِ سنت کی صحیح پوزیشن جس کی طرف ہم شروع سے دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں، ہم ملک کے اربابِ فکر و نظر سے باادب درخواست کریں گے کہ وہ ان معروضات پر دل کے سکون اور فکر کی گہرائی سے غور کریں، اور پھر سوچیں کہ جس نتیجے پر ہم پہنچے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط، ہم محسوس کرتے ہیں کہ اربابِ فکر و نظر سے یہ درخواست کرنا کہ وہ اس پر سکوت و سکون سے غور فرمائیں، عام حالات میں خود فکر و نظر کی توہین ہے، لیکن اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ کسی معاملہ پر (بالخصوص جو مذہب سے متعلق ہو) خالی الذہن ہو کر سکوت و سکون سے غور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے، اور اتباعِ سنت کا سوال اتنا اہم ہے کہ اس کا صحیح حل کیے بغیر، ملت کی حیاتِ اجتماعیہ کا کوئی نقشہ صحیح نہیں بیٹھے گا۔ [1]

اب بڑی سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ سنت کے بارے میں، اس کا اختیار کردہ موقف درست ہے یا نہیں (اور لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات ڈالنا، نہ تو اس کا مقصود ہے اور نہ ہی عادت ہے) تو وہ کسی محدث یا عالمِ حدیث سے مل کر، یا اس سے نجی خط و کتابت کے ذریعہ، اپنے موقف کے صحیح یا غلط ہونے کا علم پا سکتا ہے، لیکن آخر یہ کیا طریقہ ہے کہ سلف سے لے کر خلف تک، سنت کے بارے میں، علماء کے کامل اتفاق پر مبنی نظریہ کے خلاف، ایک نیا اختراعی اور وضعی عقیدہ اپنا لیا جائے، اور پھر اسے عامۃ الناس میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی غرض سے، تکرار و اصرار کے ساتھ، مسلسل اور متواتر شائع کیا جائے، اور ساتھ ہی بڑے معصومانہ انداز میں ''باادب گذارش'' کی جائے کہ ''ہماری غلطی یا صحت کو واضح کیا جائے تاکہ ہم شکر گزار ہوں''۔

اس کے ساتھ ہی، طلوعِ اسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ

> جو حضرات یا جماعتیں، طلوعِ اسلام کو منکر حدیث پکار کر، ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی چلی آ رہی ہیں، ان سے بھی ہماری باادب گذارش ہے کہ وہ از راہ کرم صرف اتنا بتا دیں کہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اس میں کوئی غلطی ہے؟ اگر غلطی ہے تو

---

[1] طلوعِ اسلام، ۲ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴

کہاں ہے؟ اس کے لیے کسی لمبے چوڑے مضمون لکھنے کی ضرورت نہیں فقط اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ فلاں مقام غلط ہے اور اس کی جگہ صحیح پوزیشن یہ ہے۔ اس باب میں ہم جماعت اسلامی کی خدمت میں خاص طور پر درخواست کرنے کی جرأت کرتے ہیں، ان سے یہ بھی گذارش ہے کہ کہ وہ ایک نظر اس مضمون پر بھی ڈال لیں جو "قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن" کے عنوان سے اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے، اگر اس طرح ہماری کسی واقعی غلطی کی اصلاح ہو جائے، تو ہم بدل شکر گزار ہوں گے، اور اگر اس طرح غور و فکر کے بعد یہ متعین ہو جائے کہ سنت رسول اللہ کسے کہتے ہیں؟ وہ کہاں سے اور کسطرح حاصل ہوگی؟ اور اس پر عمل کیسے ہوگا؟ تو اس سے ایک بڑے سوال کا حل مل جائے گا جس کے متعین نہ ہونے سے، اس وقت قوم عجیب الجھن میں ہے اور جس کی وجہ سے اس کی بہت سی توانائیاں بے نتیجہ ضائع ہو رہی ہیں، بلکہ مضر نتائج پیدا کر رہی ہیں۔ [1]

جی ہاں! پرویز صاحب نے شاید قوم صرف اپنے آپ کو اور ان چند نفوس کو سمجھ رکھا ہے جو وابستگانِ طلوعِ اسلام ہیں، کیونکہ فی الواقع، یہی لوگ "عجیب الجھن" میں مبتلا ہیں، جن کی "توانائیاں بے نتیجہ ضائع ہو رہی ہیں بلکہ مضر نتائج پیدا کر رہی ہیں"، ورنہ باقی پوری امت مسلمہ، شرقاً غرباً، شمالاً جنوباً اور سلفاً خلفاً، حجیتِ سنت کے مسئلہ پر مطمئن اور آسودۂ خاطر ہے، اور اب یہ "قوم" چاہتی یہ ہے کہ سارے اربابِ فکر و نظر بالعموم اور جماعت اسلامی اور اس کے امیر بالخصوص، اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر، اس "قوم" کو "عجیب الجھن" سے نجات دلانے پر جُت جائیں تا کہ ان کی "توانائیاں بے نتیجہ ضائع نہ ہوں" اور "مضر نتائج پیدا نہ کریں"۔

اب علماء کرام کے پاس، اُس شخص کے مؤقف کی تردید کے لیے، نہ تو وقت ہی ہے اور نہ ہی ضرورت ہے، جو اس خبط میں مبتلا ہو کہ قرآن کو چودہ صدیوں میں، اس کے سوا کسی نے نہیں سمجھا، اور پھر اس کی عربی زبان سے شناسائی کا یہ عالم ہے کہ افعال کے صیغوں تک سے ناواقف ہے، فعل نہی اور فعل مضارع میں فرق و امتیاز کی صلاحیت تک سے عاری ہے، (اس کی مثالیں اگلے ابواب میں آ رہی ہیں) چنانچہ علماء کرام نے اپنی مصروفیات اور قلت وقت کی بناء پر یا جمہور امت سے قطعی الگ، اس شاذ اور نرالے مسلک کی تردید میں اپنا وقت ضائع کرنا مناسب نہ جانا۔

(۴) اس ضمن میں، طلوعِ اسلام نے مولانا مودودیؒ کے خلاف ایک خاص حربہ یہ اختیار کیا کہ ان کی کتب سے متفرق عبارتوں کو، سیاق و سباق سے کاٹ کر، ان میں کتر بیونت کرتے ہوئے، خودساختہ سرخیوں کے تحت، ایک پورے مضمون کی شکل میں جوڑ جاڑ کر، "قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن" کے زیرِ عنوان شائع کیا، مودودی صاحب کے اقتباسات میں بین القوسین اضافے بھی کیے گئے، یہ سب کچھ کر ڈالنے کے بعد، طلوعِ اسلام نے یہ لکھا کہ

یہ مضمون مولانا مودودیؒ صاحب کی تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے، اس میں تمام الفاظ انھی کے ہیں بجز ان کے جو خطوط وحدانی میں ہیں .... حدیث کے متعلق بعینہ یہی مسلک، طلوعِ اسلام کا ہے، صرف اس فرق کے ساتھ، کہ وہ کسی ایک فرد کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ جس بات کو اس کی نگۂ جوہر شناس، سنتِ رسول قرار دے، اس کی اتباع ساری امت پر لازم قرار

[1] طلوعِ اسلام، ۲ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴

پائے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ حق صرف امت کے قرآنی نظام کو حاصل ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ کو چھان پھٹک کر دیکھے کہ اس میں کون سی چیز صحیح ہوسکتی ہے اور کون کون سی جزئیات ایسی ہوسکتی ہیں جن میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں، لیکن آپ دیکھئے کہ اس کے باوجود، جماعت اسلامی، طلوع اسلام کو مسلسل اور پیہم منکر حدیث اور منکر شانِ رسالت قرار دیکر ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی رہتی ہے، اور اپنے امیر کو حدیث کا سب سے بڑا حامی اور سنت کا جید متبع قرار دیتی ہے، اس کے جواب میں جماعت اسلامی والے کہیں گے کہ یہ اقتباسات، مودودی صاحب کی تحریروں سے توڑ مروڑ کر لکھ دیے گئے ہیں، اس کے جواب میں، ہم آپ سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ ان کتابوں کو نکال کر اپنا اطمینان خود کر لیجئے کہ یہ اقتباسات، سیاق وسباق کے مطابق ہیں یا توڑ مروڑ کر لکھے گئے ہیں، سچ اور جھوٹ خود سامنے آجائے گا۔ [۱]

مولانا مودودیؒ کے اقتباسات کو صحت وصداقت اور دیانت وعدالت کے ساتھ پیش کرنے میں، اس اعتماد اور وثوق کو ملاحظہ فرمایئے، جس کا اعلان یہ کہہ کر کیا گیا کہ- ''آپ خود مودودیؒ کی کتابوں کو نکال کر اپنا اطمینان کر لیجئے کہ یہ اقتباسات، سیاق وسباق کے مطابق ہیں یا توڑ مروڑ کر لکھے گئے ہیں''- حالانکہ انھی اقتباسات میں سے اور کچھ دیگر اقتباسات میں سے، جب سنت کی آئینی حیثیت پر قلمی مناظرہ کے دوران، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے چند عبارتیں پیش کیں تو مولانا مودودیؒ نے ان حضرات کی صداقت و دیانت اور عدل وانصاف کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوڑ دیا تھا (اس کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے) لیکن اس مقام پر، صرف یہ امر پیش نظر رکھیے کہ منکرینِ حدیث کی محرفانہ ذہنیت کے پیش نظر، اور مسائل کی بحث وتمحیص میں بازاریت پر اتر آنے کی بناء پر، نیز اس وجہ سے بھی کہ یہ لوگ، افہام وتفہیم کی بجائے محض عقلی کشتی اور ذہنی دنگل لڑنے کی خاطر، ان مسائل کو کھڑا کرتے ہیں تاکہ عامۃ الناس کے قلوب واذہان کے اطمینان اور سکونِ خاطر کو، ژولیدہ فکری اور پریشاں خیالی میں تبدیل کیا جا سکے، اور لوگ اگر حجیتِ سنت کا انکار نہ بھی کریں تو کم از کم ان کے دلوں اور دماغوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے ضرور ڈالے جا سکیں۔ اس لیے مولانا مودودیؒ نے یہ مناسب نہ جانا کہ خود کو پرویز صاحب کا (اور ترجمان القرآن کو طلوع اسلام کا) حریف بنا ڈالا جائے، ویسے بھی مولانا مودودیؒ کا مزاج یہ تھا کہ جہاں کسی نے تہذیب وشائستگی کے ساتھ، سمجھنے سمجھانے کے لیے، استفسارات کیے تو انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے، وقار ومتانت اور سنجیدگی کے ساتھ مدلل اور مسکت جوابات دیے، لیکن جہاں انھوں نے محسوس کیا کہ سوالات میں نیک نیتی کی بجائے جھگڑالو پن کا محرک کارفرما ہے، وہاں وہ جواب دینے کی بجائے سکوت اختیار فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ ایک مقام پر وہ خود فرماتے ہیں۔

> میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ میری اور جماعت اسلامی کی اس قدر شدت کے ساتھ مخالفت یکا یک اب یوں شروع ہوگئی ہے اور یہ فتوے کن وجوہ سے دیے جا رہے ہیں، لیکن اگر میں اس کو جان بھی لیتا تو یہ غیر ضروری بحث ہے کہ کسی نے اعتراض کیا تو کیوں کیا؟ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا اعتراض معقول ہے یا نامعقول۔ معقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے مان لیتے ہیں یا اس کا معقول جواب دیتے ہیں اور نامعقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے ہوا میں تحلیل ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ [۲]

---

[۱] طلوع اسلام، ۲ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۴

[۲] رسائل ومسائل، جلد دوم، صفحہ ۴۵۳ تا ۴۵۴

طلوعِ اسلام کی ارتیابی یلغار اور تشکیکی مہم میں تیزی

بہرحال، مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں سے مسخ و تحریف اور کتر بیونت کے ذریعہ، سیاق و سباق سے کاٹی ہوئی عبارتوں پر مشتمل مضمون بعنوان "قرآن و حدیث کی صحیح پوزیشن" کی اشاعت (در طلوعِ اسلام ۲ اپریل ۱۹۵۵ء) کے بعد، مولانا مودودیؒ نے اسے نظر انداز کر دیا اور اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نہ ہی یہ بتایا کہ ان اقتباسات میں کہاں کہاں اور کس کس انداز میں کرشمہ سازی کی گئی ہے، لیکن طلوعِ اسلام، جس کا مقصد ہی ملا ازم کے لیبل کے تحت، علماء کرام کی مخالفت کرنا ہے، اپنی تشکیکی مہم اور ارتیابی تحریک کو آگے بڑھاتا رہا، اس اعلان کے ساتھ کہ---" بتاؤ ہم نے کہاں مودودیؒ صاحب کے اقتباسات میں مسخ و تحریف کی ہے، اگر نہیں تو ہماری غلطی واضح کرو، ورنہ خود اپنا مسلک تم تفصیل سے بیان کرو"---اس مضمون کی اشاعت کے بعد طلوعِ اسلام نے، حدیث و سنت کے متعلق، اپنی تشکیکی مہم اور ارتیابی تحریک کو اور تیز کر دیا، اور پوری تحدّی کے ساتھ اپنے قارئین کے سامنے یہ پیشین گوئی بھی کر ڈالی، کہ

> یہ حضرات، کبھی متعین طور پر یہ نہیں بتائیں گے (نہ مودودیؒ صاحب اور نہ ان کے متبعین) کہ ان کے نزدیک حدیث و سنت کی پوزیشن کیا ہے، ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ کسی ایک جگہ بات واضح اور متعین طور پر نہ کہی جائے، ہر بات مبہم رکھئے اور ہر جگہ متضاد بات کہیے تاکہ مداری کی پٹاری سے جس وقت، جی چاہے، حسب منشا بات نکالی جائے۔
>
> ہم جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے پھر درخواست کرتے ہیں کہ وہ حدیث و سنت کے بارے میں اپنا اور مودودیؒ صاحب کا متعین مسلک بتائے، تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ منکرِ حدیث کون ہے۔ [۱]

اسی اشاعت میں بلکہ اسی مقام پر "سنت رسول اللہ" کے زیرِ عنوان، پھر یہ مطالبہ داغا گیا کہ "ہماری غلطی واضح کرو"

> ۲/اپریل کے طلوعِ اسلام میں عنوانِ بالا کے تحت لمعات میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہمارے نزدیک اتباعِ سنت کی صحیح پوزیشن کیا ہے، ہم نے اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مختلف افراد اور اداروں سے بالعموم اور جماعت اسلامی سے بالخصوص، یہ درخواست کی تھی کہ وہ ہمیں بتائے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی غلطی ہے؟ اور اگر ہے تو کہاں ہے؟ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد، ہم نے نعیم صدیقی اور امین احسن اصلاحی صاحبان کی خدمت میں خطوط لکھ کر، ان کی توجہ اس درخواست کی طرف مبذول کروائی، اِس وقت تک، نہ ان کی طرف سے (نہ کسی اور طرف سے) ہمیں کوئی جواب موصول ہوا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری درخواست پر ضرور غور فرمائیں گے۔ [۲]

اب ذرا یہاں اس تضاد کو ملاحظہ فرمایئے جو طلوعِ اسلام کی اُس "قرآنی بصیرت" کا نتیجہ ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے وہ نہیں تھکتا کہ اسی شمارہ کے اسی صفحہ اور اسی کالم میں بالائی سطور میں بطور تحدّی یہ کہا گیا کہ یہ حضرات، کبھی متعین طور پر، یہ نہیں بتائیں گے کہ حدیث و سنت کی پوزیشن کیا ہے، اور زیریں اقتباس میں یہ کہا گیا ہے کہ---" ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری درخواست پر ضرور غور کریں گے"---

---

۱ + ۲ طلوعِ اسلام، ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۸، کالم ۲

اسی سال بلکہ اسی ماہ کی ایک اور اشاعت میں، طلوعِ اسلام، پھر تعلّی آمیز انداز میں یہ لکھتا ہے کہ

۲/اپریل کے طلوعِ اسلام میں، ہم نے "قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں تصریح کردی گئی تھی کہ مضمون مودودی صاحب کی مختلف تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے، ہر تحریر کے ساتھ حوالہ بھی دیدیا گیا کہ اقتباس کہاں سے لیا گیا ہے، جماعت اسلامی پر یہ ضرب اتنی کاری پڑی کہ وہ بالکل سٹپٹا گئے، ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ [1]

یہاں ایک نظر، طلوعِ اسلام کے پراپیگنڈہ کی ٹیکنیک پر بھی ڈال لیجئے، ۱۹۵۵ء میں یہ رسالہ ہفت روزہ تھا جبکہ ترجمان القرآن حسبِ معمول ماہوار رسالہ ہی رہا، طلوعِ اسلام کے ۲/اپریل کے شمارہ میں شائع شدہ مضمون کی ضرب "اگر جماعت اسلامی پر اتنی کاری پڑی تھی کہ وہ بالکل سٹپٹا گئے تھے، اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا" تو اس کاری ضرب پر سٹپٹا جانے کی خبر، لامحالہ (اپریل کے ترجمان القرآن کی بجائے) مئی ہی کے شمارہ میں منظرِ عام پر آسکتی تھی، لیکن طلوعِ اسلام نے، ترجمان القرآن کے مئی کے پرچے کا انتظار کیے بغیر، اپنی اپریل ہی کی اشاعت میں، جماعت اسلامی پر کاری ضرب پڑنے اور پھر اس کے سٹپٹا جانے کی خبر شائع کرڈالی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس خبر میں جو کچھ کہا گیا ہے عالمِ واقعہ میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے، یہ سب کچھ طلوعِ اسلام کے اپنے ہی عالمِ خیال کے خواب اور سراب ہیں، اس سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے مخالفین کو بدنام کرنے کے لیے، اور اپنے قارئین کو تاریکی میں رکھنے کے لیے، طلوعِ اسلام بھی وہی گھٹیا اور خسیس ہتھکنڈے کام میں لانے کا عادی ہے جو مروجہ لادین سیاست کا وطیرہ ہیں۔

پھر پراپیگنڈے کی اس ٹیکنیک کے ساتھ ہی، یہ چیلنج بھی مذکور ہے۔

ہم جماعت اسلامی کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ مذکورہ صدر مضمون کے کسی مضمون کے متعلق یہ ثابت کردیں کہ اگر اسے اصل تحریر کے اندر رکھ کر پڑھا جائے تو اس کا مطلب کچھ اور ہوگا۔ اگر وہ کسی ٹکڑے کے متعلق بھی یہ ثابت کردیں تو طلوعِ اسلام، اپنی غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرلے گا، اور ان سے اور مودودی صاحب سے اپنے قصور کی معافی مانگ لے گا۔

اور وہ اگر ایسا نہ کرسکیں (اور وہ ہرگز ایسا نہیں کرسکیں گے) تو ہم ان سے دریافت کرنا چاہیں گے کہ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو آخر کب تک دھوکہ دیتے چلے جائیں گے۔ [2]

اسے کہتے ہیں، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، اپنے قارئین کو تاریکی میں رکھنے کے لیے طلوعِ اسلام، اپنے عالمِ خیال کے گمانوں کو "حقائق" کا لباسِ زُور پہنا کر پیش کرتا ہے، لیکن اس کاروائی کا الزام، اپنے مخالفین پر عائد کرتے ہوئے، الٹا اُن سے یہ استفسار کرتا ہے کہ "وہ سادہ لوح مسلمانوں کو آخر کب تک دھوکہ دیتے چلے جائیں گے"۔

اسی اشاعت میں ایک اور مقام پر، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ

ان کے پاس طلوعِ اسلام کے پیش کردہ حقائق کا کوئی جواب نہ تھا، اس لیے انھوں نے سوچا کہ ملک میں بھگدڑ مچادو، اس کے لیے انھوں نے شور مچایا کہ اسلام خطرے میں ہے، سنت رسول اللہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) مٹائی جارہی ہے، ذاتِ رسالت مآب

---

[1] طلوعِ اسلام، ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴
[2] طلوعِ اسلام، ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴

کی (خاکم بدہن) توہین ہو رہی ہے، اور یہ سب کچھ کس طرف سے ہو رہا ہے؟ طلوع اسلام کی طرف سے۔ [1]

اس کے بعد حدیث وسنت کے بارے میں یہ تین سوالات، اس زعم کے ساتھ پیش کیے گئے کہ ان کا جواب کہیں سے ممکن ہی نہیں ہے۔

(الف) --- قرآن وحدیث دونوں اگر دینی حیثیت کے حامل ہیں تو کیا وجہ ہے کہ قرآن کو لکھوایا گیا اور حدیث کو لکھوایا نہیں گیا؟

(ب) --- اگر ارشاداتِ نبویہ، وحی خداوندی تھے، تو خلفائے راشدین (بالخصوص حضرت عمرؓ) نے انھیں کیوں بدل دیا تھا؟

(ج) --- وہ صحیح حدیث، جو واجب الاتباع ہے، اس کا ماخذ کیا ہے؟ اسے کہاں سے لیا جائے گا؟

ان سوالات کو پیش کرنے کے بعد، یہ لکھا گیا ہے کہ

اس سوال کو طلوع اسلام نے اپنی ۲/ اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں (لمعات میں) پیش کیا تھا اور اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا تھا، اس کے بعد، اہم نے امت کے تمام اربابِ فکر ونظر سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سوال پر غور کر کے ہمیں بتائیں کہ جو خیال ہم نے پیش کیا ہے، اس میں کوئی غلطی ہے؟ اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟

اس کا جواب بھی اس وقت تک کہیں سے موصول نہیں ہوا (حالانکہ جماعت اسلامی کے اربابِ حل وعقد کو، اس بارے میں، ذاتی خطوط بھی لکھے گئے تھے) [2]

اور ذرا آگے چل کر، یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ اس قسم کے سوالات اٹھانا اور دینی اور علمی طریق سے ان کا حل طلب کرنا، یا حل سوچنا، کوئی ایسا جرم نہیں جس کی پاداش میں کسی کو ہدفِ سب وشتم بنایا جائے، جماعت اسلامی والے یہ کچھ اپنی مصلحتوں کے تحت کر رہے ہیں۔ [3]

یہ بھی اُسی ٹیکنیک کا ایک دوسرا پینترا ہے کہ از خود کچھ سوالات، اس غرض کے لیے تصنیف کیے جائیں کہ لوگوں کے قلوب واذہان میں شکوک وشبہات کے کانٹے ڈالے جائیں اور پھر یہ کہا جائے کہ ان سوالات کا حل یا جواب سوچنا، کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی پاداش میں کسی کو ہدفِ سب وشتم بنایا جائے، اور پھر یہ الزام تراشا جائے، کہ جماعت اسلامی والے، طلوع اسلام کو واقعی گالیاں دے رہے ہیں اور ان کا ایسا کرنا، ان کی مصلحتوں کا تقاضا ہے، حالانکہ ترجمان القرآن کی فائل گواہ ہے کہ نہ تو اس میں ان سوالات سے تعرض کیا گیا ہے اور نہ اسے جرم قرار دیکر، طلوع اسلام کو ہدفِ سب وشتم بنایا گیا ہے، یہ سب کچھ طلوع اسلام نے اپنے قارئین کو اندھیرے مین رکھنے کے لیے، اپنے ہی خیالات کی دنیا میں گھوم پھر کر فرما دیا ہے، جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

---

[1] طلوع اسلام، ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۰

[2] + [3] طلوع اسلام، ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۰

چنانچہ اس سے اگلی اشاعت میں "اصلاحِ خویش کے طالبین" نے، پھر---"سنتِ رسول اللہ"--- کے زیرِ عنوان یہ لکھا کہ

۲۱اپریل کے طلوعِ اسلام میں عنوان بالا پر ایک مبسوط مقالۂ افتتاحیہ شائع کیا گیا تھا جس میں سنتِ نبی اکرم کے متعلق، طلوعِ اسلام کا مسلک واضح کرنے کے بعد، ملک کے تمام ذمہ دار افراد اور اداروں سے گذارش کی گئی تھی کہ اگر وہ اس مسلک میں کوئی غلطی دیکھیں تو ہمیں اس سے مطلع فرمائیں، ان میں جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے خاص طور پر خطاب کیا گیا تھا اور محترم امین احسن اصلاحی صاحب اور نعیم صدیقی صاحب کو الگ الگ خطوط بھی لکھے گئے تھے، اس وقت تک، نہ ان حضرات کی طرف سے اور نہ ہی کسی اور صاحب کی طرف سے ہمیں کوئی جواب موصول ہوا ہے، لیکن طلوعِ اسلام کے خلاف گالیوں کا جو سلسلہ ان حضرات نے ایک عرصہ سے شروع کر رکھا ہے وہ برابر جاری ہے۔

چونکہ دین میں سنت رسول اللہ کے سوال کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے گذارش کریں گے کہ وہ ان حضرات سے کہیں کہ وہ اس اہم موضوع پر علمی انداز سے گفتگو کریں اور جو کچھ طلوعِ اسلام نے لکھا ہے، اس کا جواب عنایت فرمائیں تا کہ یہ اہم اور بنیادی مسئلہ واضح ہو جائے۔ [1]

یہاں یہ بات، ذہن نشین رہنی چاہیے کہ طلوعِ اسلام کے نزدیک، اپنی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کی کتب میں سے سیاق و سباق سے کاٹ کر، مصنف کے ادھورے سدھورے اقتباسات نقل کر دیے جائیں اور پھر یہ اعلان کر دیا جائے کہ ان اقتباسات سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے بعینہ وہی طلوعِ اسلام کا مسلک ہے، اگر کوئی ایسا نہیں سمجھتا تو اُسے خود بتانا چاہیے کہ طلوعِ اسلام کے مسلک میں کیا غلطی ہے، اگر کوئی شخص، اس پر سکوت اختیار کرتا ہے تو پھر شیطان طلوعِ اسلام کے کان میں یہ افسوں پھونک دیتا ہے کہ---"تمھارے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب تو ممکن ہی نہیں، لہٰذا تم اپنے ان تعلّی آمیز اعلانات کو جاری رکھو"---لیکن اگر کوئی شخص، طلوعِ اسلام کے دائمی گھٹیا اور جھوٹے پراپیگنڈے میں سے کسی بات کا سرِ راہ بھی جواب دے دیتا ہے تو یہ "طلوعِ اسلام کے خلاف گالیوں کا طویل سلسلہ" قرار پاتا ہے، طلوعِ اسلام خود کسی کو "دین کا دشمن، قرآن کا منکر، مکیاولی سیاست کا علم بردار اور ملک وملت کے لیے عظیم خطرہ" قرار دے دے تو یہ سب وشتم نہیں ہے بلکہ دعائے سلام ورحمت ہے، لیکن اگر کوئی طلوعِ اسلام کی ہزار زیادتیوں کے بعد کسی ایک زیادتی کا بھی جواب دے دے تو وہ تہمت طراز اور بہتان تراش قرار پاتا ہے چنانچہ اس سے اگلی اشاعت میں، "سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں"، یہ کہا گیا ہے کہ

اب جبکہ آپ جیل سے باہر تشریف لے آئے ہیں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ کی توجہ ایک اہم بات کی طرف مبذول کرائی جائے، آپ کی جماعت نے مدت سے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ موقع بہ موقع، ہر جگہ ہر طریق سے طلوعِ اسلام کو بدنام کیا جائے، ہمیں اس حقیقت کے اعتراف واعلان میں کوئی باک نہیں کہ طلوعِ اسلام، آپ کے تصورات اور آپ کی جماعت کے مسلک وعزائم کو اسلام اور پاکستان، دونوں کے لیے سخت خطرے کا موجب سمجھتا ہے، اس لیے وہ ان تصورات و مقاصد کی

[1] طلوعِ اسلام، ۷ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۸

مخالفت کو اپنا ملی اور دینی فریضہ قرار دیتا ہے، اس اعتبار سے آپ کی جماعت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں جو مناسب سمجھیں، کہیں اور کریں۔ ۱؎

گویا جماعت یا مولانا مودودیؒ کو تو صرف یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ''مدافعت'' میں جو مناسب سمجھیں، کہیں اور کریں، رہا جارحانہ اقدام، تو اس کے سارے حقوق بحق طلوعِ اسلام ہی محفوظ ہیں۔

اسی کے تسلسل میں، اگلی عبارت یہ ہے۔

لیکن مخالفت کا یہ انداز تو کسی شریف معاشرہ میں بھی درخور تحسین نہیں سمجھا جائیگا کہ اپنے مخالف کے خلاف، غلط الزامات لگائے جائیں، بہتان تراشے جائیں اور بے بنیاد اتہامات سے اسے بدنام کیا جائے، ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی جماعت نے طلوعِ اسلام کی مخالفت میں بڑی شدت سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ ۲؎

چور کی اس دیدہ دلیری کے کیا کہنے کہ وہ الٹا کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے، طلوعِ اسلام نے جو روش خود اپنا رکھی ہے اس کا الزام، وہ پلٹ کر دوسروں پر عائد کرتا ہے، کیوں؟ صرف اس لیے کہ دوسروں پر بہتان تراشی کا الزام عائد کر دینے سے یہ تاثر خود بخود ابھرتا ہے کہ جو دوسروں پر اس گھناؤنی حرکت کا الزام لگاتا ہے، کم از کم خود اس کا دامن تو ایسی حرکت سے پاک ہی ہوگا، اسی طرح دوسروں کے خلاف جارحانہ تنقیص کا یہ عمل، خود اس کے اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کا کام دیتا ہے۔

بہرحال، ''طالبینِ اصلاحِ خویش'' کا یہ مطالبہ کہ اُن کی غلطی واضح کی جائے، پھر ایک مرتبہ، ان الفاظ میں دہرایا جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام کی ۲ اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں شائع کر کے جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے بالخصوص درخواست کی گئی کہ وہ ہمیں بتائیں کہ ہماری غلطی کہاں ہے تاکہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں، اس کے متعلق ہم نے محترم امین احسن اصلاحی اور نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں نجی خطوط بھی لکھے اور پھر طلوعِ اسلام میں کئی مرتبہ یاد دہانی بھی کرائی، لیکن ان حضرات (یا جماعت اسلامی میں سے کسی دوسرے صاحب) کی طرف سے اس کے متعلق ہمیں کوئی جواب موصول نہیں ہوا، مگر ہمارے خلاف سب وشتم کا سلسلہ ہے کہ بدستور جاری ہے بلکہ تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ ۳؎

لیکن حرام ہے جو کبھی طلوعِ اسلام نے ترجمان القرآن میں سے مولانا مودودیؒ یا جماعت اسلامی کے کسی ذمہ دار یا غیر ذمہ دار شخص کا کوئی ایسا اقتباس پیش کیا ہو جس سے یہ ثابت ہو کہ طلوعِ اسلام'' کے خلاف سب وشتم کا سلسلہ ہے کہ بدستور جاری ہے بلکہ تیز تر ہوتا جا رہا ہے''، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ طلوعِ اسلام کے خلاف، شدید مخالفت اور بہتان تراشی کا یہ فرضی پراپیگنڈہ، خود اس کی اپنی ہی چالوں میں سے ایک چال ہے، جس کے پس پردہ اس کی اپنی ہی مصلحتیں کارفرما ہیں۔

اور پھر آخر میں، مولانا مودودیؒ سے، ایک مطالبہ یہ کہہ کر پیش کیا گیا ہے کہ

سنتِ رسول کے متعلق، ہم نے اپنا جو مسلک بیان کیا ہے، وہ آپ کے نزدیک درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو اس میں کیا غلطی ہے؟ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی گذارش کریں گے کہ آپ اپنے کسی ایسے مضمون کی نشاندہی کر دیں جس میں ایک

۱؎ + ۲؎ طلوعِ اسلام، ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵ ۳؎ طلوعِ اسلام، ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵

ہی جگہ، حدیث اور سنت کے متعلق، آپ کا مسلک واضح اور مکمل طور پر بیان ہوا ہو، اگر کوئی ایسا مضمون نہ ہو تو ہم درخواست کریں گے کہ آپ اس قسم کا کوئی جامع مضمون اب تحریر فرما دیں تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس باب میں آپ کی پوزیشن کیا ہے، اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اس موضوع پر آپ کی تحریروں میں اسقدر متضاد باتیں ملتی ہیں کہ آپ کی جماعت ہر موقع پر، ایک نئی بات، آپ کی طرف سے پیش کر دیتی ہے۔ [1]

یہ ہے پراپیگنڈے کی ٹیکنیک، جو طلوعِ اسلام نے پاکستان بننے کے بعد، سنت کو مشکوک و مشتبہ بلکہ بے وزن و بے وقعت ٹھہرانے کے لیے، ایک مہم کی صورت میں اپنائے رکھی اور تقریباً تیرہ چودہ سال تک بغیر دم لیے اسے جاری رکھا اور ساتھ ہی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق، اپنے مخالفین پر، پرویز صاحب، یہ الزام بھی لگاتے رہے کہ وہ طلوعِ اسلام کے خلاف، جھوٹا پراپیگنڈہ کر کے، اسے بدنام کرتے ہیں --- لیکن --- پھر بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جب مولانا مودودیؒ کو، منکرینِ حدیث کے غبارۂ استدلال سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساری ہوا نکال دینا پڑی۔

منکرین حدیث کی ایک مکروہ سازش

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے، منکرینِ حدیث کے معاملہ میں بھی یہی ہوا، اُن کی شامتِ اعمال نے انھیں دھکا دیا تو انھوں نے بظاہر علمی تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر، سنت کے بارہ میں چند سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ تیار کیا، اور اسے مولانا مودودیؒ، مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی سیاح الدینؒ صاحب اور بعض دیگر علماء کو اس امید پر ارسال کیا کہ ان علماء کی طرف سے جب جوابات (خواہ کتنے ہی خفیف اختلافات کے ساتھ ہوں) آئیں گے تو انھیں بنیاد بنا کر یہ پراپیگنڈہ کیا جا سکے گا کہ جس سنت پر یہ علماء لفظاً متفق ہیں، اُسکی حقیقت کے تعین میں مختلف الرائے ہیں، لیکن جملہ علماء نے حسب معمول ژاژ خائی پر مبنی ان سوالات کو کوئی اہمیت نہ دی، لیکن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، جن کا پیمانۂ صبر شاید لبریز ہو چکا تھا، اِن سوالات کا سامنا کیا اور اعتراضات اور جوابات پر طول پکڑتی ہوئی یہ مراسلت، ایک قلمی مناظرے کا روپ دھار گئی، اس کاروائی کے دو پہلو بڑے دلچسپ ہیں۔

اولاً یہ کہ جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب، جو مسلک انکار حدیث کے علمبردار اور مبلغ تھے اور اپنے رسالہ طلوعِ اسلام میں، سنت کو مشتبہ اور مشکوک قرار دینے کے لیے، سالہا سال سے مہم چلا رہے تھے، خود سامنے نہیں آئے، بلکہ اپنی فکر سے وابستہ ایک اور شخص مسمی ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو، اس مراسلت میں، مولانا مودودیؒ کے مقابل، بطور فریق پیش کیا۔

ثانیاً یہ کہ، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے سنت کے بارے میں چار بنیادی سوالات پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ لکھا کہ

چونکہ آئین کے سلسلہ میں، عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے، اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ [2]

---

[1] طلوعِ اسلام، ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵ [2] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۲۶

اس کے جواب میں، مولانا مودودیؒ نے نہایت اختصار سے یہ فرمایا تھا کہ

آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ آج پہلی مرتبہ آپ نے پیش نہیں کیے، اس سے پہلے یہی سوالات، دوسرے گوشوں سے آ چکے ہیں اور ان کا جواب بھی واضح طور پر میں دے چکا ہوں، ایک ہی طرح کے سوالات کا مختلف گوشوں سے بار بار دہرایا جانا اور پہلے کے دیے ہوئے جوابات کو ہمیشہ نظر انداز کرنا کوئی صحیح بات نہیں ہے، اگر بالفرض آپ کے علم میں میرے وہ جوابات نہیں ہیں جو میں اب سے بہت پہلے دے چکا ہوں تو میں اب آپ کو ان کا حوالہ دیے دیتا ہوں (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۰۹ تا صفحہ ۲۲۰ اور دسمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۶۰ تا صفحہ ۱۷۰) آپ انھیں پڑھ کر مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب، ان میں نہیں ہے اور جن سوالات کا جواب موجود ہے، اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟

اگر آپ اپنے اس عنایت نامے کے ساتھ میرے اس جواب کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو براہِ کرم میرے مذکورہ بالا دونوں مضامین بھی بجنسہٖ شائع فرما دیں کیونکہ دراصل وہی میری طرف سے آپ کے ان سوالات کا جواب ہیں، اس لیے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے آپ کو جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے۔ [1]

ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے دوسرے خط کے جواب میں، آخر میں مولانا مودودیؒ نے یہ فرمایا تھا کہ

آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اپنے پہلے عنایت نامے کو، آپ نے اس فقرے پر ختم فرمایا تھا......''چونکہ آئین کے سلسلہ میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے، اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا''...... میں اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اعتراض ہونا تو درکنار، میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ اس مراسلت کو جوں کا توں شائع فرما دیں، میں خود اسے ''ترجمان القرآن'' میں شائع کر رہا ہوں، آپ بھی اس کو ''طلوعِ اسلام'' کی کسی قریبی اشاعت میں درج کرنے کا انتظام فرمائیں تاکہ دونوں طرف کے عوام، اس سے آگاہ ہو کر پریشانی سے نجات پا سکیں۔ [2]

منکرین حدیث کی وعدہ خلافی اور ''اخلاقی نامردی''

اس مراسلت سے قبل، منکرینِ حدیث طلوعِ اسلام کے ذریعہ، جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کو، حدیث و سنت کے متعلق، مضامین و خطوط لکھ کر، یہ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ کے موقف کو بھی شائع کریں گے، اور خود ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے بھی، آغازِ مراسلت ہی میں، مولانا مودودیؒ کے جواب کو شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کی مولانا نے بخوشی اجازت دی تھی، لیکن منکرینِ حدیث کی اخلاقی جرأت کا فقدان آڑے آیا اور وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے، یک طرفہ طور پر ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے بعض خطوط تو طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہے مگر مولانا مودودیؒ کا کوئی جواب اور کوئی خط بھی شائع نہ ہونے دیا گیا۔ جب تک مولانا مودودیؒ نے ان لوگوں کو جواب نہ دیا تھا یہ لوگ سر پہ چڑھے جا رہے تھے، اور طلوعِ اسلام کے ۲ اپریل ۱۹۵۵ء کے

---

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۲۷ [2] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۴۲

مقالوں کے بعد تو یہ کہتے ہوئے شکایات کا طومار باندھ ڈالا گیا کہ

> سنت رسول اللہ کے متعلق ہمیں، ہماری غلطیوں سے متنبہ فرمائیں۔ ان میں سے کسی بات کا جواب، اس وقت تک نہ ہمیں براہ راست ملا ہے اور نہ ہی جماعت اسلامی کے کسی جریدہ میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔
>
> اس کے بعد ہم محترم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ براہ کرم بتادیں کہ کھل کر سامنے آنے اور دلائل و براہین سے بات کرنے کا اور کون سا طریقہ ہوتا ہے؟ اور ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس باب میں (مودودی صاحب کے الفاظ میں) ''اخلاقی نامرد'' کون ہے؟ [1]

ظاہر ہے کہ ''اخلاقی نامرد'' وہی لوگ ہیں جو دونوں طرف کی مراسلت شائع کرنے کا وعدہ کرنے کے بعد، یہ گھٹیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں کہ یک طرفہ طور پر ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے بعض خطوط کو تو طلوعِ اسلام میں شائع کر ڈالتے ہیں لیکن مولانا مودودیؒ کے جوابات کو شائع کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے، جبکہ دوسری طرف، مولانا مودودیؒ کی اخلاقی مردانگی کا یہ عالم ہے کہ وہ دونوں طرف کی مراسلت کو من وعن، ترجمان القرآن میں شائع کر دیتے ہیں تا کہ تصویر کے دونوں رُخ قارئین کے سامنے آجائیں۔ اس سے طلوعِ اسلام کی اخلاقی نامردی کے ساتھ ساتھ، اُسکی صحافتی دیانت وامانت کی قلعی بھی کھل جاتی ہے۔

بصیرتِ پرویز اور فراستِ مودودیؒ

یہاں، اس بحث کے حوالے سے ایک اور بات بھی قابل غور ہے، طلوعِ اسلام، حدیث وسنت کے بارے میں شکوک وشبہات کا گرد وغبار اڑانے کے جہاد پر مسلسل کمر بستہ رہا، تا کہ بحث کی آگ بجھنے نہ پائے، اور اپنے ہفتہ وار طلوعِ اسلام میں بھی اور ماہوار شماروں میں بھی متواتر اس آگ میں برسوں ایندھن ڈالتا رہا، تا کہ اس الاؤ کو نہ صرف یہ کہ بجھنے نہ دیا جائے بلکہ اسے دائماً بھڑکائے رکھا جائے، اور ساتھ ہی اپنی ''قرآنی بصیرت'' کا مظاہرہ، اس پیشگوئی کے ذریعہ کیا کہ

> آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات کبھی متعین طور پر یہ نہیں بتائیں گے (نہ مودودی صاحب اور نہ ان کے متبعین) کہ ان کے نزدیک حدیث وسنت کی پوزیشن کیا ہے۔ [2]

لیکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی مراسلت کے جواب میں، مولانا مودودیؒ نے غیر مبہم، ٹھوس اور مسکت دلائل کے ساتھ، طویل قلمی مناظرہ کے ذریعے، ''مفکر قرآن'' کی اُس پیشگوئی کو جھوٹا ثابت کر ڈالا جسے وہ اپنی ''قرآنی بصیرت'' کا آئینہ دار کہنے کے خوگر تھے، لیکن دوسری طرف، منکرینِ حدیث کے بارے میں، خود مولانا مودودیؒ نے اپنی خداداد فراست کی بناء پر جو پیشگی خبر دی تھی، وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی، یہ پیشگی خبر، درجِ ذیل اقتباس میں موجود ہے جسے خود طلوعِ اسلام نے اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے۔

> برکت علی محمڈن ہال میں، حدیث کی اہمیت، سنت اور حدیث کے فرق، ان کے باہم تعلق اور فتنۂ انکار حدیث پر، اپنے

---

[1] طلوعِ اسلام، ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۶ [2] طلوعِ اسلام، ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۸

خیالات کا اظہار کرتے ہوئے، مولانا مودودیؒ نے فرمایا کہ ہماری مخالفت کرنے والے لوگ ایسے اخلاقی نامرد ہیں کہ سامنے آ کر دلائل سے بات کرنے کی بجائے، بھونڈے طریقوں سے مخالفانہ جدوجہد شروع کیے ہوئے ہیں، اگر ان کے پاس دلائل سے قائل کرنے کی ہمت ہوتی تو یہ لوگ کھل کر سامنے آتے، ہماری بات سنتے اور اپنی سناتے، اپنی بات پیش کرتے اور ہمارے لٹریچر کو پیش کرنے کا موقع دیتے، لیکن انھیں خطرہ ہے کہ لوگ اگر یہ لٹریچر پڑھ گئے تو ہمارے فتنے نہ چل سکیں گے۔ ؎۱

چنانچہ مولانا مودودیؒ کی یہ بات حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی کہ منکرین حدیث، ان کی کوئی بات بھی قارئینِ طلوعِ اسلام تک نہیں پہنچنے دینا چاہتے تاکہ ان کے فتنے برپا کرنے کی راہ مسدود نہ ہونے پائے۔

اور فی الواقع یہ ہے بھی حقیقت، کہ اگر طلوعِ اسلام کا کوئی سلیم الفطرت قاری، مولانا مودودیؒ کا لٹریچر بھی پڑھ لے تو طلوعِ اسلام کے موقف کی کمزوری، اس پر نمایاں ہو جاتی ہے۔

ایک سلیم الفطرت جو یائے حق کو طلوعِ اسلام کی ڈانٹ

ایسے ہی کچھ سلیم الفطرت قاری حضرات تھے جو طلوعِ اسلام، ترجمان القرآن اور بعض دیگر رسائل کا تقابلی مطالعہ کیا کرتے تھے، وہ یکطرفہ مطالعہ پر رائے قائم کرنے کو نامناسب بلکہ خلافِ عدل و انصاف جانتے تھے، انھوں نے مولانا مودودیؒ اور ان کے رسالہ ''ترجمان القرآن'' کے خلاف، طلوعِ اسلام کی مہمل موشگافیوں، مجادلانہ بحثوں اور بیجا خوردہ گیریوں کے دائمی تکرار و اعادہ کو دیکھتے ہوئے، طلوعِ اسلام کو ایک مشورہ دینا چاہا، لیکن پرویز صاحب نے انھیں ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا کہ تمھاری ذہنی سطح پست ہے، تم جو چاہو، پڑھو، لیکن طلوعِ اسلام کا مطالعہ چھوڑ دو۔ چنانچہ پرویز صاحب خود، اس موعظت کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں۔

> آپ جو جی میں آئے پڑھیے، لیکن طلوعِ اسلام کا مطالعہ کرنے میں اپنا وقت، توانائی اور پیسہ ضائع نہ کریں، آپ کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ آپ طلوعِ اسلام کی دعوت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس میں اور مذہبی رسالوں کی دعوت میں فرق کر سکیں، میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر آپ اپنی صفوں میں ایسے لوگوں کو دیکھیں تو انھیں اپنوں میں سے نہ سمجھیں، اگر وہ کسی سازش کے ماتحت ایسا نہیں کہتے --- نیک نیتی سے ایسا کہتے ہیں تو بھی وہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ ؎۲

طلوعِ اسلام کے نزدیک، صرف وہ شخص ہی ذہنی طور پر بلند سطح کا آدمی ہے جو طلوعِ اسلام کا یک رُخا مطالعہ کر کے، طلوعِ اسلام کا حامی اور اس کے مخالفوں کا دشمن بن جائے، کیونکہ صرف اُسی کی دعوت ہی ''قرآنی دعوت'' ہے، رہے وہ لوگ، جو کتاب اللہ کے ساتھ بھیجے جانے والے، رسول اللہ کی سنت کی طرف بھی دعوت دیتے ہیں تو ایسے لوگوں کی دعوت ''غیر قرآنی دعوت'' ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ پرویز صاحب کو ایسے متبعین درکار ہیں جو طلوعِ اسلام کا یا خود اُن کے لٹریچر کا یکطرفہ مطالعہ

؎۱ بحوالہ طلوعِ اسلام، ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء، صفحہ ۵ ؎۲ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۵

کر کے، ہر اُس جماعت کے خلاف اپنے دلوں میں کینہ اور کدورت پیدا کر لیں جس کے خلاف ایسا کرنا، طلوعِ اسلام نے اپنا فریضۂ زندگی بنا رکھا ہے، آزاد اور کھلا مطالعہ کرنے والے لوگ، ان کے نزدیک، پست سطح کے لوگ ہیں اور طلوعِ اسلام کے خول میں بند ہو کر، یک رخا مطالعہ کرنے والے لوگ ہی پسندیدہ افراد اور ذہناً بلند سطح لوگ ہیں، اس لیے وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے قارئین کے سامنے، تصویر کا وہ رُخ بھی آئے جسے دکھانا، اُسے مطلوب نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے حدیث وسنت کے متعلق اس قلمی مباحثے میں، ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے بعض خطوط کو تو یکطرفہ طور پر شائع کر دیا لیکن مولانا مودودیؒ کا کوئی جواب، صرف اس لیے شائع نہ کیا کہ کہیں طلوعِ اسلام کے قارئین اس سے مثبت اثر نہ لے پائیں، اور جن قارئینِ طلوعِ اسلام نے ''ترجمان القرآن'' کے ذریعہ مولانا مودودیؒ کے جوابات کو دیکھا، وہ فی الواقع متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور انکارِ حدیث کے جس مسلک پر، طلوعِ اسلام کے یکطرفہ مطالعہ نے، انھیں قائم کر رکھا تھا، اُس سے انھوں نے خود کو ذہناً سرکتے ہوئے پایا، کیونکہ مولانا مودودیؒ کے مدلل جوابات نے، ان کے قلوب واذہان میں، بقول طلوعِ اسلام ''بہت سی غلط فہمیاں'' پیدا کر ڈالی تھیں، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

> مودودی صاحب کا جواب، دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا، اور اس کے بعد ترجمان القرآن میں اس موضوع کے متعلق کچھ سامنے نہ آیا، اس پر لوگوں کی جانب سے پھر اصرار ہوا کہ مودودی صاحب کے جواب نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں اور ڈاکٹر صاحب خاموش ہیں، اس لیے طلوعِ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرے۔ [1]

چنانچہ ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے، پوری مراسلت کو، مولانا مودودیؒ کے جوابات کے ساتھ شائع کرنے کی بجائے، طلوعِ اسلام نے یکطرفہ طور پر صرف اُس خط ہی کو شائع کیا جو ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے مولانا مودودیؒ کو مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو لکھا تھا، جبکہ مولانا مودودیؒ نے دونوں طرف کی پوری مراسلت کو ترجمان القرآن میں شائع کیا، اور پھر اس رسالہ کے خاص نمبر (منصب رسالت نمبر، ستمبر ۱۹۶۱ء) میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا وہ آخری خط بھی مولانا مودودیؒ کے جواب کے ساتھ شائع کر دیا گیا جس میں منکرین حدیث نے اپنے تمام ''علمی دلائل'' کے ساتھ، اپنے ''اخلاقی فضائل'' کو بھی جمع کر دیا تھا، اس کی اشاعت پر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ

> ذیل میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا وہ آخری عنایت نامہ درج کیا جا رہا ہے جو ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو انھوں نے ارسال کیا تھا، اس خط کو پڑھ کر ہر صاحبِ ذوقِ سلیم یہ سوال کرے گا کہ اس تحریر کو شائع ہی کیوں کیا گیا، لیکن جس مقصد کی خاطر اس گندگی میں ہاتھ ڈالا گیا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ منکرین حدیث کے سارے دلائل ومسائل، ان کی اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے آجائیں اور پھر اس کا واضح جواب دیکر اُس گمراہی کا سدباب کر دیا جائے جو یہ لوگ عوام اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں پھیلا رہے ہیں، اسی لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ خط یہاں جوں کا توں درج کیا جا رہا ہے تاکہ منکرین حدیث، اپنے دلائل اور اپنے اخلاقی فضائل، دونوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائیں۔ یہ خط جس انداز میں لکھا گیا ہے اُس کی بنا پر جواب میں ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرنا تو پسند نہیں کیا گیا البتہ اس میں جو جو باتیں قابلِ لحاظ اور زیر بحث مسائل سے متعلق ہیں، ان سب کا جواب

---

[1] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۰

ناظرین کی تشفی کے لیے حواشی میں دے دیا گیا ہے تا کہ ڈاکٹر صاحب کی ہر بات کا جواب ساتھ ساتھ ملتا جائے۔

اس خط کے معاملہ میں ڈاکٹر صاحب نے اخلاقی جرأت کا ایک عجیب مظاہرہ یہ بھی فرمایا ہے کہ پچھلی تمام مراسلت کو چھوڑ کر تنہا یہی ایک خط، پہلے ''چٹان'' میں اور پھر اپریل ۱۹۶۱ء کے ''طلوعِ اسلام'' میں شائع کرا دیا، حالانکہ ابتداءً، انھوں نے خود اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس سلسلے کی پوری مراسلت شائع فرمائیں گے، اس طرح کی باتیں دوسرے لوگوں کے لیے چاہے کتنی ہی معیوب ہوں مگر منکرینِ حدیث کے تو شایانِ شان ہی ہیں۔ [1]

طلوعِ اسلام ...... آئینہ دیانت کے مقابل

ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مولانا مودودیؒ کے درمیان، سنت کی آئینی حیثیت پر طویل مراسلت نے، خود طلوعِ اسلام ہی کی ایک عبارت کا آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا ہے، ملاحظہ فرمایئے یہ آئینہ

> ہم المنیر اور اس کی وساطت سے عبدالغفار حسن صاحب سے ایک مرتبہ پھر تقاضا کریں گے کہ اگر ان میں دیانتداری کا کوئی شائبہ بھی ہے تو وہ ہمارے مقالہ کو من وعن اپنے ہاں شائع کریں اور پھر اس پر جسقدر بھی جی چاہے تنقید کرے، اگر اس سے ہم پر اپنی کوئی غلطی واضح ہوگئی تو ہم ان کے شکریہ کے ساتھ اپنی اصلاح کرلیں گے۔ [2]

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ جس مقالے پر تنقید کرنا مقصود ہو، اسے من وعن پیش کرنا اور پھر اس پر نقد کرنا، دیانتداری کا تقاضا ہے۔ لیکن کیا سنت کی آئینی حیثیت کی اس بحث میں طلوعِ اسلام نے اس تقاضائے دیانتداری کو ملحوظ رکھا؟ ...... ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے، جبکہ مولانا مودودیؒ نے منکرینِ حدیث کے تمام خطوط کو اور اس مسئلہ کی پوری بحث کو من وعن شائع کیا اور پھر ٹھوس دلائل کے ساتھ نہایت جاندار تنقید کر کے ان کی اغلاط کو واضح کیا، لیکن منکرینِ حدیث نے نہ تو مولانا مودودیؒ کا شکریہ ہی ادا کیا اور نہ خود اپنی اصلاح ہی کی، بلکہ مولانا کی اس تنقید نے ان پر وہی اثر کیا جو نزولِ قرآن نے مشرکینِ عرب کی ذہنیتوں پر کیا تھا **وَلَا يَزِيدُ الظّٰلِمِينَ اِلَّا خَسَارًا۔**

نیز اس سے یہ بھی واضح ہے کہ وعدہ وفائی کے ''قرآنی اخلاق'' سے یہ لوگ، کس قدر آراستہ ہیں۔

عبارتوں میں خیانت کاری کی مثالیں

مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں سے، سیاق وسباق سے کاٹی ہوئی متفرق عبارتوں کو کتر بیونت کے بعد، ۲؍اپریل ۱۹۵۵ء کے طلوعِ اسلام میں ''قرآن وحدیث کی صحیح پوزیشن'' کے زیرِ عنوان جب شائع کیا گیا تو ساتھ ہی ''چور کی داڑھی میں تنکا'' کے مصداق، یہ اعلان بھی بڑے وثوق کے ساتھ کیا گیا کہ

> جماعت اسلامی والے کہیں گے کہ یہ اقتباسات، مودودی صاحب کی تحریروں سے توڑ مروڑ کر لکھ دیے گئے ہیں، اس کے جواب میں ہم آپ سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ ان کتابوں کو نکال کر اپنا اطمینان خود کر لیجئے کہ یہ اقتباسات، سیاق وسباق کے مطابق ہیں یا توڑ مروڑ کر لکھے گئے ہیں، سچ اور جھوٹ خود سامنے آجائے گا۔ [3]

---

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۲۴

[2] طلوعِ اسلام، ۲۴ دسمبر ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۰ اور صفحہ ۱۴

[3] طلوعِ اسلام، ۲ اپریل ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۴

اور فی الواقع، سچ اور جھوٹ، اُس وقت سامنے آ گیا، جب انھی اقتباسات میں سے بھی اور دیگر تحریروں میں سے بھی کچھ عبارتیں، مولانا مودودیؒ کے سامنے، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے پیش کیں اور مولانا نے متعدد مقامات پر یہ واضح کیا کہ کس طرح ان عبارات کو سیاق و سباق سے کاٹ کر، قطع و برید کا نشانہ بنا کر، خود اِن عبارتوں کے مصنف ہی کو دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی، مولانا مودودیؒ کے مندرجہ ذیل اقتباسات منکرینِ حدیث کی ایسی ہی تحریفی چالبازیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

پہلی مثال

ڈاکٹر عبدالودود صاحب، مولانا مودودیؒ کا ایک تحریف شدہ اقتباس یوں پیش کرتے ہیں کہ درمیان میں سے ایک پورے جملے کو حذف کر ڈالتے ہیں، مولانا مودودیؒ نے اس خیانت کا پردہ یوں چاک کیا ہے۔

> اس کے بعد، ایک پورا فقرہ، ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے اور آگے کی عبارت اس طرح نقل کی ہے جس سے شبہ تک نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی عبارت چھوڑی گئی ہے۔ [۱]

دوسری مثال

ایک اور اقتباس کے ضمن میں، جسے ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے پیش کیا تھا، مولانا مودودیؒ پھر اسی قسم کی حرکت پر شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> بیچ میں پورے ڈیڑھ صفحہ کی عبارت چھوڑ کر، یہ فقرہ آگے کے ایک مقام سے نقل کیا گیا ہے مگر کوئی علامت یہاں بھی ایسی نہیں دی گئی جس سے معلوم ہو کہ اس جگہ کوئی چیز چھوڑی گئی ہے، طوالت سے بچنے کے لیے میں ان چھوٹے ہوئے فقروں کو نقل نہیں کرتا، میری کتاب ''تفہیمات'' ملک میں بکثرت لوگوں کے پاس موجود ہے اور اس کا مضمون ''اتباع و اطاعت رسول'' خود نکال کر دیکھ سکتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ ایک شخص کے سامنے خود اس کی تحریروں کو قطع و برید کے ساتھ پیش کرنے سے نہیں چوکتے وہ دوسروں کو دھوکہ دینے میں کتنے کچھ بیباک ہوں گے۔ [۲]

تیسری مثال

ایک اور مقام پر ڈاکٹر عبدالودود صاحب پھر اسی قسم کی ایک اور حرکت کرتے ہیں، اس پر مولانا مودودیؒ تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

> ذرا اس دیانت کو ملاحظہ فرمائیے کہ اس کے بعد کے فقرے دانستہ چھوڑ دیے گئے ہیں۔ جن اصحاب کے پاس رسائل و مسائل حصہ اول موجود ہو، وہ نکال کر دیکھ لیں، اس فقرے کے بعد متصلاً یہ عبارت موجود ہے،
>
> جو سنتیں تواتر کے ساتھ، نبی ﷺ سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں یا جو روایات، محدثین کی مسلمہ شرائطِ تواتر پر پوری اترتی ہیں وہ

---

۱ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۳۳

۲ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۳۳

یقیناً ناقابل انکار حجت ہیں، لیکن غیر متواتر روایات سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے، اس وجہ سے علمائے اصول میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ غیر متواتر روایات، احکام کی ماخذ تو ہو سکتی ہیں لیکن ایمانیات (یعنی جن سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہے) کی ماخذ نہیں ہو سکتیں۔

یہ اخلاقی جرأت واقعی قابل داد ہے کہ مجھے خود میری ہی عبارتوں سے دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے، اس پر مزید قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس مسئلے کو یہاں بھیس بدل کر پیش کیا جا رہا ہے اس پر میں خود اسی مراسلت کے سلسلہ میں تفصیل سے روشنی ڈال چکا ہوں (ملاحظہ ہو، کتاب ہذا، صفحات ۲۸ تا ۳۲، ۳۹، ۴۰) لیکن یہ عجیب طرز بحث ہے کہ جس بات کا پہلے جواب دیا جا چکا ہو، اسے پھر نئے لباس میں پیش کر دیا جائے، اور پچھلے جواب کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔ [۱]

چوتھی مثال

اثنائے مراسلت، ایک اور مقام پر، ڈاکٹر عبدالودود صاحب، اپنے قطع و برید کے فن کا مظاہرہ فرماتے ہیں، اس پر مولانا مودودی فرماتے ہیں:

اس کے بعد کا فقرہ، ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر، خود دیکھ سکتا ہے کہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ اسے چھوڑا گیا ہے، وہ فقرہ یہ ہے۔

اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا مگر فروعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ [۲]

پانچویں مثال

ایک اور مقام پر ڈاکٹر صاحب، مولانائے محترم کا ادھورا اقتباس پیش کر کے، اس کا آخری حصہ چھوڑ دیتے ہیں، اس پر مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

اس کے بعد کی پوری بحث چونکہ ڈاکٹر صاحب کے شبہات کا جواب تھی اور ان سے الجھن رفع ہو سکتی تھی، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اسے چھوڑ دیا، کیونکہ انھیں تو الجھن ہی کی تلاش ہے، ایک مضمون میں جتنے فقرے الجھنے اور الجھانے کے لیے مل سکتے ہیں، انھیں لے لیتے ہیں اور جہاں سے بات سلجھنے کا خطرہ ہوتا ہے صاف کترا کر نکل جاتے ہیں اور لطف یہ کہ یہ دھوکہ، ایک مصنف کی کتاب سے خود مصنف کو دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں ناظرین سے درخواست کروں گا کہ اگر تفہیمات حصہ اول، انھیں بہم پہنچ جائے تو اس میں سے "حدیث کے متعلق چند سوالات" کے زیر عنوان وہ پورا مضمون نکال کر ملاحظہ فرما لیں، جس سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کے فوراً بعد، جو فقرے میں نے لکھے تھے وہ یہاں بھی نقل کر دیے جائیں تاکہ جنھیں اصل کتاب نہ مل سکے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے کرتب کی داد دے سکیں۔ وہ فقرے یہ ہیں...... [۳]

---

[۱] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۴۶ تا ۱۴۷
[۲] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵۰
[۳] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵۱

چھٹی مثال

ایک اور جگہ، ڈاکٹر صاحب، مولانائے محترم کی ایک عبارت کو، سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں، تو مولانا مودودیؒ یہ فرماتے ہیں کہ

> ایک معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ بحث کے موڈ میں نہ ہو کہ جہاں تعبیر قانون اور قانون سازی کا معاملہ زیر بحث ہو، وہاں اکثریت سے مراد اہل علم کی اکثریت ہوتی ہے نہ کہ عوام کی اکثریت۔ میری کتاب ''سیاسی کشمکش'' کی جن عبارتوں کا حوالہ دیا جارہا ہے، ان میں قانون سازی کا مسئلہ زیر بحث نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے عام قومی امراض پر گفتگو تھی، ان عبارات کو لاکر ڈاکٹر صاحب، اس بحث میں استعمال فرمارہے ہیں جو خالص قانونی مسائل کے متعلق ہو رہی ہے، یہ خلط مبحث نہیں تو اور کیا ہے؟ [1]

ساتویں مثال

ایک اور مقام پر، ڈاکٹر صاحب، مولانا مودودیؒ پر تہمت طرازی اور بہتان تراشی کے فن کا مظاہرہ فرماتے ہیں مولانائے محترم نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں یہ استفسار کرتے ہوئے، یوں تردید فرماتے ہیں۔

> کیا کوئی شخص، میری کسی تحریر کا حوالہ دے سکتا ہے جس میں، مَیں نے یہ کہا ہو کہ قانونی مسائل میں رائے دینے والے اہل علم صرف وہی صالح (Competent) مانے جائیں گے جو میری ہاں میں ہاں ملائیں؟ [2]

آٹھویں مثال

ایک اور جگہ، ڈاکٹر صاحب، دیانت اور صداقت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، مولانا مودودیؒ کی عبارت کو کتر بیونت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اس پر مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

> یہ تمام عبارات، میری کتاب سے خوب قطع و برید کے بعد پیش کی گئی ہیں، جن حضرات کو ''تجدید و احیاء دین'' کے مطالعہ کا موقع مل جائے، وہ براہ کرم اس کا وہ حصہ نکال کر دیکھ لیں جو اس کے پہلے باب میں ذیلی عنوان ''جاہلیت کا حملہ'' کے تحت درج ہے، اس تقابل سے ان کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ حضرات دوسروں کی عبارتیں نقل کرنے میں کس درجہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ کتاب کے صفحات کا حوالہ، خدا جانے ڈاکٹر صاحب نے کہاں سے لیا ہے، قدیم ایڈیشن میں یہ بحث صفحہ ۲۳ تا ۲۵ پر ہے اور جدید ایڈیشن میں صفحہ ۳۶ تا ۴۱ پر۔ [3]

نویں مثال

سیاق وسباق سے عبارات کو کاٹ کر، جب پھر ڈاکٹر صاحب اپنے کرتب کا مظاہرہ فرماتے ہیں تو مولانا مودودیؒ کو پھر یہ کہنا پڑا کہ میری جن عبارات کا ڈاکٹر صاحب نے سہارا لیا ہے، ان کو نقل کرنے میں، پھر وہی کرتب دکھایا گیا ہے کہ سیاق وسباق سے

---

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۶۶ [2] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۶۶ [3] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۶۷

الگ کر کے، ایک فقرہ کہیں سے اور ایک کہیں سے نکال کر اپنا مطلب برآمد کر لیا گیا۔ دراصل جو بات اس مقام پر میں نے کہی تھی وہ یہ ہے کہ ۱

دسویں مثال

ایک اور مقام پر ڈاکٹر صاحب، پھر سید مودودیؒ کا ادھورا اقتباس پیش کرتے ہیں، اور مولانائے محترم ان کی بار بار کی ایسی حرکتوں پر، نہایت صبر و سکون سے، صرف یہ فرماتے ہیں کہ

> اس کے بعد کا فقرہ جسے ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے، یہ ہے:
> پس قرآن کی رو سے صحیح ضابطہ یہ ہے کہ پہلے خدا کا بھیجا ہوا اصولی قانون، پھر خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ، پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے اولی الامر کا اجتہاد۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۲

تِلْكَ عَشَرَةٌ كاملة

یہ دس مثالیں ہیں جو اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ منکرینِ حدیث، دوسروں کے اقتباسات کو پیش کرنے میں کس قدر دیانت صداقت، امانت اور عدالت سے کام لینے کے عادی ہیں، ایک مقام پر تو مولانا مودودیؒ، ان لوگوں کی ایسی جسارتوں پر بے بس ہو کر، یہ تک کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

> مجھے شکایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب میری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر میرے ہی سامنے پیش فرماتے ہیں مگر اب اس کی کیا شکایت کی جائے، جو لوگ، اللہ تعالیٰ کی آیات کو توڑ مروڑ کر ان کے من مانے مطلب نکالنے میں اسقدر بیباک ہوں ان کے سامنے ماوشما کی کیا ہستی ہے۔ ۳

یہ تھی وہ مہم، جو قیامِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام نے، حدیث و سنت کے خلاف بڑے زور شور سے برپا کیے رکھی، اور یہ تھی وہ مراسلت جو بزمِ طلوعِ اسلام کے ایک نمایاں فرد (ڈاکٹر عبدالودود صاحب) نے، بظاہر علمی تحقیق کی آڑ میں، لیکن حدیثِ رسول اور سنتِ نبی کو ساقط الاعتبار ٹھہرانے کے لیے محض اس امید پر جاری کی کہ اس خط و کتابت میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب، کسی عالمِ دین سے بن ہی نہیں پڑے گا، جیسا کہ فتنۂ انکارِ حدیث کے علم بردار، لوگوں کے قلوب و اذہان پر، علماء کرام کی علمی بے بضاعتی کے مقابلہ میں، خود اپنی علمی دھاک کا سکہ بٹھانے کے لیے، اس قسم کے اعلانات کیا ہی کرتے تھے کہ

> ہمارا ملا، طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب، دلائل و براہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لیے کہ وہ دعوت، قرآن کی دعوت ہے، اور ملا بے چارہ قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے) اس لیے ملا نے اس کے خلاف گوئرنگ☆ کا حربہ استعمال کرنا شروع

---

۱ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۸۰ ۲ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۹۳

۳ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۲۱۵

☆ یہاں طلوعِ اسلام کا مبلغ علم ملاحظہ فرمائیے کہ جس حربے کو ملا کی طرف منسوب کر رہا ہے، وہ گوئرنگ کا نہیں بلکہ گوئبلز کا مقولہ ہے لیکن طلوعِ اسلام، اسے گوئرنگ کے حوالہ سے پیش کر رہا ہے۔ خیر! یہ ایک ضمنی بات ہے جو سرِ راہ نوکِ قلم پر آ گئی۔

کر رکھا ہے، اس نے یہ مشہور کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے۔ [1]

طلوعِ اسلام کو یہ امید نہ تھی کہ علماء کرام میں سے، کسی کی طرف سے، ان کے چھیڑے ہوئے سوالات کا جواب دیا جائے گا، لیکن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، ان سوالات کا مردانہ وار سامنا کیا اور ایسے عالمانہ جوابات دیے جو پیاسے کی سیرابی اور بیمار کی شفایابی کا ذریعہ بنے، مگر منکرینِ حدیث پر، اس کا وہی اثر ہوا جو شور یلی اور کلراٹھی زمین پر بارانِ رحمت کا ہوا کرتا ہے یعنی وَلَا يَزِيدُ الظّٰلِمِينَ اِلَّا خَسَارًا- اس طرح، فتنۂ انکار حدیث کے علمبرداروں کی پوری سکیم، خود اُن پر الٹ پڑی، جیسا کہ مودودیؒ صاحب نے، ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو، خود فرمایا تھا۔

> پھر آپ اپنی اس بدنصیبی پر افسوس کرتے ہیں کہ میرے جوابات سے آپ کی الجھنیں اور بڑھ گئی ہیں، مجھے بھی اس کا افسوس ہے مگر ان الجھنوں کا منبع کہیں باہر نہیں، آپ کے اندر ہی موجود ہے۔ آپ نے یہ مراسلت واقعی ''بات سمجھنے'' کے لیے کی ہوتی تو سیدھی بات، سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آ جاتی، لیکن آپ کی تو اسکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات، میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ، کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی، اس امید پر بھیجے تھے کہ ان سے مختلف جوابات حاصل ہوں گے اور ان کا ایک مجموعہ شائع کر کے یہ پراپیگنڈہ کیا جا سکے کہ علماء سنت سنت تو کرتے ہیں مگر دو عالم بھی سنت کے بارے میں متفقہ رائے نہیں رکھتے۔ وہی ٹیکنیک جس کا ایک شاہکار، ہمیں منیر رپورٹ میں ملتا ہے۔ اب میرے جوابات سے، آپ کی یہ اسکیم آپ ہی کے اوپر الٹ پڑی ہے، اس لیے سمجھانے کی جتنی کوشش بھی مَیں کرتا جاتا ہوں، آپ کی الجھن بڑھتی چلی جاتی ہے، اس نوعیت کی الجھن کا آخر مَیں کیا علاج کر سکتا ہوں، اس کا علاج تو آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے، حق بات کو سمجھنے اور ماننے کی مخلصانہ خواہش اپنے اندر پیدا کیجئے اور ایک مسلک خاص کے حق میں پراپیگنڈہ کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کی فکر چھوڑ دیجئے، اس کے بعد، ان شاء اللہ، ہر معقول بات بآسانی آپ کی سمجھ میں آنے لگے گی۔ [2]

الغرض، اس طرح اور اس مراسلت کے ذریعہ، مولانا مودودیؒ نے منکرینِ حدیث کے غبارۂ استدلال کی ساری ہوا نکال دی، اور منکرینِ حدیث کے اپنے قلم سے بیان کردہ دلائل کا، مسکت، وافی کافی اور شافی جواب دیکر اُن کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا یہ سدباب، ستمبر ۱۹۶۱ء کے مجلّہ ترجمان القرآن میں کیا گیا۔

پرویز صاحب کے خلاف فتوائے کفر

۱۹۶۲ء میں جملۂ مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے، پرویز صاحب اور ان کے ہم مسلک افراد پر، کفر کا فتویٰ عائد کیا، اس فتویٰ کا تمہیدی بیان، مفتی محمد شفیع صاحب کے قلم کا مرہونِ منت تھا، اس کا ذکر، طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۲ء اور اپریل ۱۹۶۲ء میں بھی موجود ہے، اس کے بعد، عرب ممالک میں سے حکومتِ کویت اور علمائے سعودیہ نے بھی ایسا ہی تکفیری فتویٰ حالیہ برسوں میں جاری کیا ہے۔

(۴) اربابِ اقتدار سے تعلقاتِ پرویز

علمائے کرام، جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کے خلاف تحقیر و توہین کی مہم کے ساتھ ساتھ، سنت نبوی اور احادیث

---

[1] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۷
[2] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۱۰ تا صفحہ ۱۱۱

رسول کے خلاف بھی شدید ارتیابی اور انتہائی تشکیکی تحریک کے اجراء کے دوران، پرویز صاحب، قرآن کریم کے جعلی پرمٹ پر، مغربی معاشرت اور اشتراکیت کو درآمد کر کے، اسے قرآنی نظام حیات کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں، زمانے کو قرآن کے مطابق بدلنے کی بجائے، قرآن کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدل ڈالنے کی سعی و کوشش، ہمیشہ اور ہر جگہ، اُن لوگوں کا وطیرہ رہی ہے جو اغیار کی فکری غلامی اور ذہنی اسیری میں مبتلا رہے ہیں، پاکستان میں یہی کردار، غلام احمد پرویز نے اپنائے رکھا ہے، اور ہمارے حکمرانوں کو، جن کی تربیت اور نشو ونما ہی مغربی افکار و نظریات کا دودھ پی پی کر ہوئی ہے، انھیں یہ بات ہمیشہ پسند رہی ہے کہ وقت کی گردشوں کا ساتھ بھی دیں اور سندِ قرآن بھی، اُن کے ہاتھ میں رہے، اس وجہ سے پاکستانی ارباب اقتدار سے ان کے ہمیشہ اچھے تعلقات رہے ہیں۔

> پرویز صاحب کے قائداعظم سے لے کر، ان تمام حضرات تک سے، جو وقتاً فوقتاً صاحب اقتدار رہے، اچھے مراسم تھے، لیکن انھوں نے ان میں سے، کسی سے بھی کوئی مفاد حاصل نہیں کیا، نہ کوئی منصب مانگا، نہ کوئی اعزاز طلب کیا، نہ کوئی فیکٹری الاٹ کرائی، نہ جاگیر حاصل کی۔ ۱

فی الحال، اس بات کو نظر انداز کیجئے کہ انھوں نے ارباب اقتدار سے کوئی مفاد حاصل کیا یا نہیں۔ صرف یہ دیکھئے کہ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ

> قیام پاکستان کے بعد، ہمارے جو راہنما برسر اقتدار آتے رہے، ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ساتھ میری راہ ورسم تھی۔ ۲

یہی نہیں بلکہ ارباب اقتدار کو وہ اپنے سالانہ کنونشنوں میں بھی مدعو کیا کرتے تھے اور حکمران، کرسئ صدارت پر جلوہ افروز ہو کر، شریکِ کنونشن ہوا کرتے تھے، صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

> طلوع اسلام کے کنونشن کے اجلاس، منعقدہ ۱۲ نومبر کی صدارت، محترم المقام، خواجہ شہاب الدین صاحب، مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات نے فرمائی۔ ۳

رہی یہ بات کہ ''مفکر قرآن'' نے ارباب اقتدار سے، اپنی ''قرآنی خدمات'' کا کوئی اجر، کوئی معاوضہ، اور کوئی مفاد حاصل نہیں کیا، تو ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات مان لے کہ انھوں نے مادی طور پر (Materially) کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، لیکن اسے یہ بات ضرور ذہن نشین کرنی چاہیے کہ مفاد صرف وہی نہیں ہوتا جو عہدہ و منصب یا جاگیر و فیکٹری کی صورت میں حاصل کیا جائے، اس مفاد کی متنوع شکلیں ہیں، جیسا کہ خود پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ

> واضح رہے کہ دنیا میں معاوضہ صرف روپے کی شکل ہی میں نہیں ہوا کرتا، ذرا علم وفضل کی مسندوں، زہد وتقویٰ کے آستانوں اور راہبرانِ ملت کی بارگاہوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالو، اور دیکھو کہ کس قدر متنوع شکلیں ہیں جن میں اپنی بے لوث خدمات کا معاوضہ طلب کیا جاتا ہے۔ نذرانہ نہیں تو مخدومیت اور اطاعت، اور اطاعت بھی اکثر اوقات پرستش کی حد تک، کبرنفس کے

---

۱ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۷۴ء، صفحہ ۲۳ ۲ طلوع اسلام، فروری ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵۶ + طلوع اسلام، مارچ ۱۹۸۵ء، صفحہ ۶۰

۳ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۴

تقاضوں کی تکمیل، '' اَنَا الْمَوْجُوْدُ وَلَا غَیْرِیْ '' کے بلند آہنگ دعاوی، تنقید کی حد سے ماورائیت اور کم از کم نام کی جھوٹی شہرت، اور ان تمام داعیات واقتضاءات کے باوجود، بلا مزد و معاوضہ خدمت کا دعوے، کتنا بڑا فریب ہے جو اپنے آپ کو اور دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ [1]

اگر کوئی شخص، پاکستانی صحافی کے روپ میں مفکر قرآن بھی بن بیٹھا ہو، تو جھوٹے الزامات کے ذریعہ اپنے مخالفین کو رسوا و بدنام کرنا، اربابِ اقتدار سے اپنے ذاتی تعلقات کو، اپنے حریفوں کے خلاف استعمال کرنا، ملکی سیاست میں پس پردہ رہ کر، اپنی پسندیدہ تبدیلیاں لانا، اپنی صحافت کے آرگن کو ان گوشوں تک وسیع کرنا، جن تک رسائی، اربابِ اقتدار سے راہ ورسم پیدا کیے بغیر، ممکن ہی نہیں، یہ سب کچھ کیا ہیں؟ اربابِ اقتدار سے تعلقات کی '' برکات '' اور '' خالص قرآن '' کی خدماتِ جلیلہ کا بدلہ وصلہ ہی تو ہیں۔

ملکی سیاست میں کردارِ پرویز

اب دیکھئے کہ پرویز صاحب، ملکی سیاست میں، کیا کچھ کرتے رہے ہیں، اگرچہ زبان سے وہ سیاست سے غیر متعلق یا غیر سیاسی شخصیت ہونے کے دعویدار تھے، اور یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ ہماری جماعت ---

> بزم طلوعِ اسلام، نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے، نہ سیاسی پارٹی۔ [2]
>
> میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ [3]

لیکن عملاً وہ جماعتی حیثیت سے نہیں بلکہ جماعتی لیبل سے ہٹ کر، الیکشن میں ارکانِ بزم کو حصہ لینے کی ترغیب دیا کرتے تھے، اور جہاں کہیں ان کے مسلکِ انکار حدیث پر پردہ پڑا رہا اور سادہ لوح مسلمانوں کے ہاتھوں ووٹ لے کر جیت گئے، وہاں انھیں بصد فرحت و ناز ہدیہ تبریک پیش کیا گیا۔

> اکثر مقامات سے یہ مسرت بخش اطلاعات موصول ہونی شروع ہو گئی ہیں کہ بزموں کے بعض ارکان یا طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر سے دلچسپی لینے والے حضرات، بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات میں کامیاب ہو گئے ہیں، ہم ان تمام احباب کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ [4]

بزم طلوعِ اسلام کے پلیٹ فارم سے، جماعتی حیثیت میں حصہ لینے کی صورت میں پرویز صاحب کو بھی اور وابستگانِ طلوعِ اسلام کو بھی یقینِ کامل تھا کہ انکار حدیث کے مسلک کے علمبردار ہونے کے باعث، وہ اُس معاشرے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے جو قرآن وسنت کی حجیت کا قائل ہے، لیکن دل ودماغ میں واقع اس اصل وجہ پر پردہ ڈالتے ہوئے، وہ الیکشن میں بطور جماعت حصہ نہ لینے کی علت یہ بیان کیا کرتے تھے کہ چونکہ پاکستان میں رائج سیاست، میکیاولی سیاست ہے، اس لیے وابستگانِ طلوعِ اسلام جیسے بلند اخلاق اور پاکباز لوگ، عملی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے، چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ

---

[1] جوئے نور، صفحہ ۸۹
[2] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۷۹
[3] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۷ء، صفحہ ۳۹
[4] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۵

--- ''آپ عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے، اس کی کیا وجہ ہے؟'' --- طلوعِ اسلام یہ کہتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دور، میکیاولی سیاست کا ہے اور کوئی شخص، قرآنی حدود میں رہتے ہوئے اس سیاست میں کامیاب نہیں ہوسکتا، اس میں کامیاب ہونے کے لیے جماعت اسلامی جیسی پالیسی اختیار کرنا ضروری ہوجاتا ہے وہ پالیسی یہ ہے کہ:

(۱) زندگی کی بعض ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہوجاتا ہے۔ (۲) .... (۳) ....

ہم سے یہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ [۱]

طلوعِ اسلام کی اس سخن سازی پر، اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ

اتنی نہ بڑھا، پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

رہا ان مطہر اور مقدس ہستیوں کی قرآنی حدود کی پاسداری، تو اس کی قلعی اس مقالہ میں جگہ جگہ کھلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وابستگانِ طلوعِ اسلام، مکیاولی سیاست کے اس دور میں ''قرآنی حدود میں رہتے ہوئے کامیاب نہیں ہوسکتے'' تو کیا پھر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام میں کامیاب ہونے والوں نے ''جماعت اسلامی جیسی پالیسی اختیار کرکے'' کامیابی حاصل کی تھی؟

۱۹۵۴ء کی مقنّنہ کے خاتمہ میں کردارِ پرویز

خواجہ ناظم الدین، ایک شریف النفس سیاست دان تھے اور چاہتے تھے کہ ملک کو اسلامی خطوط پر چلایا جائے، ظاہر ہے کہ اس مزاج و کردار کا آدمی، طلوعِ اسلام (یا پرویز صاحب) کو طبعاً گوارا نہیں جس میں ایسی اسلامیت کی ذرا سی رمق بھی دکھائی دے، جو کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ، سنتِ رسول اللہ کو بھی دلیل ٹھہراتا ہو، پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس کی وزارت میں، مقنّنہ، جو آئین بنا رہی تھی، وہ بہر حال، قرآن و سنت پر مبنی تھا، ایسے آئین سے بڑھ کر ''غلط اور خطرناک آئین''، پرویز صاحب کی نگاہ میں کیا ہوسکتا تھا، اور جو قانون ساز اسمبلی، ایسا آئین بنا رہی تھی، اُسکا وجود، ''مفکرِ قرآن'' کے لیے کیونکر قابل برداشت ہوسکتا تھا، اس لیے انھوں نے، اُس وقت کے، ہمہ مقتدر، گورنر جنرل ملک غلام محمد کو مشورہ دیا کہ مقنّنہ میں، قرآن و سنت کی بنیاد پر، آئین سازی کا اب تک جو کام ہوچکا ہے، اسے کالعدم قرار دیا جائے اور صرف قرآن ہی کی بنیاد پر دستور سازی شروع کی جائے۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ اس وقت تک، اس جذبے کے ماتحت ہوا ہے، اس پر خط تنسیخ کھینچ دیا جائے ملک سے ایسے اربابِ فکر و نظر کو اکٹھا کرلیا جائے جو یہ بتاسکیں کہ دورِ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے، قرآن کون کون سے اصول دیتا ہے اور ان اصولوں کی روشنی میں فکرِ انسانی کے مطابق اپنا آئین مرتب کرلیا جائے۔ [۲]

چنانچہ، اس مشورہ کے بعد کیا ہوا؟

---

۱ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۴۷
۲ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۱

ملک غلام محمد (مرحوم) نے پوری جرأتِ رندانہ سے کام لیا، اور اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مجلس دستور ساز کو برخاست کر دیا اور اس طرح مملکت کو تباہی سے بچا لیا۔ [1]

ظاہر ہے کہ اگر "قرآن وسنت" پر مبنی دستور بن جاتا، تو مملکت پاکستان "تباہی سے نہیں بچ سکتی تھی"۔ ایک اندھے کو، اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی اور دوسرے اندھے نے اس "سوجھ بوجھ" پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، "مملکت پاکستان کو تباہی سے بچالیا"۔

پرویز صاحب کا معیار یہ تھا کہ ہر وہ حکمران، جو علماء کرام کی ہمنوائی میں، قرآن وسنت کا قائل ہو، ان کی نگاہ میں ناپسندیدہ بلکہ سخت مبغوض تھا، اس کے برعکس واہیات اور پتنگ بازی جیسی لغویات میں گہری دلچسپی رکھنے والا حکمران، پرویز صاحب کی آنکھوں کا تارا تھا، بشرطیکہ وہ علماء کرام کا مخالف ہو، ملک غلام محمد ایسی ہی صفات کا مالک تھا، اُس کا مقننہ کو توڑ ڈالنا، چونکہ خواہش پرویز کے مطابق تھا، اور اس کی تقاریر بھی چونکہ طلوع اسلام ہی کے خیالات کا چربہ ہوا کرتی تھیں، اس لیے وہ قابل تعریف وسزاوارِ ستایش تھا۔

وہ دبنگ قسم کے آدمی تھے اس لیے انھوں نے یہ مخالفت کھلے بندوں کی۔ [2]

دورِ ایوبی اور پرویز صاحب

رہا ایوبی دور، تو اس میں بھی ارباب اقتدار کے ساتھ بالعموم اور ایوب خاں کے ساتھ بالخصوص، پرویز صاحب کے گہرے تعلقات تھے، علماء کرام، جب یہ کہتے کہ --- "ہم قرآن وسنت کی بنیاد پر، طرز یثرب پر، پاکستان کی تعمیر کے خواہاں ہیں کیونکہ وہی ریاستِ نبویہ ہمارے لیے نمونہ اور مثالی حیثیت رکھتی ہے" --- تو اس کے جواب میں ایوب خاں کہا کرتے تھے کہ

ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک کو تیرہ چودہ سو سال پیچھے دھکیل دیا جائے۔ [3]

ایوب خاں، دراصل ایسے اسلام کے قائل تھے جو مغربی تہذیب کے معیار پر پورا اترتا ہو، لیکن وہ مغربی تہذیب کے معیار کا برملا نام لینے کی جگہ "وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے" کی گردان کیا کرتے تھے، اور ان کی یہی ادا، پرویز صاحب اور طلوع اسلام کو بھا جاتی تھی۔

صدر ایوب کی مالی اعانت

ایوب خاں طلوع اسلام کے لٹریچر سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، اور پرویز صاحب کی مالی اعانت بھی کیا کرتے تھے۔ اس مالی معاونت کا اعتراف، دبے الفاظ میں، طلوع اسلام میں بھی موجود ہے، خود پرویز صاحب فرماتے ہیں۔

صدر ایوب (مرحوم) سے میرے خاص روابط تھے، لیکن میں نے ان سے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا (جیسا کہ میں نے پہلے لکھا

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۸۰ء، صفحہ ۱۳ [2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۸۰، صفحہ ۱۰

[3] طلوع اسلام، جون ۱۹۷۴ء، صفحہ ۲۲

ہے) وہ میرے لٹریچر میں بڑی دلچسپی لیتے تھے (ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ انھیں میری کوئی کتاب خاص طور پر پسند آئی تو انھوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اس کی اشاعت وسیع تر ہو، اس کے لیے میں اپنی طرف سے بطور اعانت کچھ پیش کرنا چاہتا ہوں، اس سے زیادہ میں نے ان سے بھی نہ کچھ لیا، نہ مانگا) اس میں البتہ ایک استثناء ہوئی۔ [1]

صاحب اختیار اور ایوانِ اقتدار سے یہ تعلق، بجائے خود ایک ''عظیم مفاد'' ہے۔

''طلوعِ اسلام'' کا مطالعہ فوج میں لازم کیا گیا

ایک اور ''مفاد'' کو بھی ملاحظہ فرمائیے، جس کا ثبوت، ظاہر ہے کہ، پرویز صاحب کی زندگی میں تو ممکن نہ تھا کہ طلوعِ اسلام کی زینت بنتا۔ لہٰذا، جب تک وہ زندہ رہے، حصولِ مفاد کا یہ ثبوت، منظرِ عام پر نہ آسکا، لیکن مرگِ پرویز کے بعد، وابستگانِ طلوعِ اسلام، پرویز صاحب کی روایتی احتیاط کو ملحوظ نہ رکھ سکے، اور میجر جنرل احسان الحق کے قلم سے، یہ ثبوت، مجلّہ کے دامن میں بایں الفاظ ثبت ہو گیا۔

یہ شاید ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے، پرویز صاحب میرے ہاں پنڈی آئے، انھیں فیلڈ مارشل ایوب خاں نے ملاقات کے لیے بلایا تھا، ایوب خاں کے کان میں بھی اس نئی سوچ کی بھنک پڑی، انھیں پسند آئی، اور پھر انھوں نے چاہا کہ یہ سوچ دُور دُور تک پہنچنی چاہیے، چنانچہ مجھے یاد ہے کہ فوج میں ایک باقاعدہ مراسلہ آیا جس میں طلوعِ اسلام کی فکر کو سمجھنے اور عام کر دینے کی ترغیب دی گئی۔ [2]

ایوب خاں کو جماعتِ اسلامی کے متعلق مشورۂ پرویز

پرویز صاحب کو، مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے خلاف، جو کینہ و کدورت، بغض و عداوت اور حسد و تعصب تھا وہ ہر اس آدمی پر عیاں ہے جس نے سرسری طور پر بھی طلوعِ اسلام کی فائل پر نظر ڈالی ہو، وہ، جماعتِ اسلامی اور اس کے بانی کی مخالفت میں اس قدر پُر جوش اور سرگرم عمل تھے کہ پاکستان بننے کے بعد، شاید ہی طلوعِ اسلام کا کوئی ایسا پرچہ ہو جس میں جماعت اور مولانا مودودیؒ کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مخالفت نہ کی گئی ہو، وہ جماعت اسلامی کو میکیاولی سیاست کے علمبردار اور شریعت کے نقاب میں روباہ باز جماعت کہا کرتے تھے، اور اسے مرزائیوں سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیا کرتے تھے، عداوت و مخالفتِ جماعت کی آگ، اُن کے سینہ کی بھٹی میں ہر وقت دہکتی رہتی تھی، اس جماعت کے متعلق، اگر پرویز صاحب، ایوب خاں جیسے ہمہ مقتدر حکمران کو، مشورہ دیں، تو وہ یقیناً کوئی خیر خواہانہ مشورہ نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ بغض و عناد کے زہر میں بجھا ہوا ہی کوئی مشورہ ہوسکتا ہے، اور یہ بات بہر حال ثابت ہے کہ جماعت اسلامی کے متعلق، پرویز صاحب نے، صدر ایوب کو مشورہ دیا تھا، خود طلوعِ اسلام کی یہ عبارت اس پر شاہد عدل ہے۔

قدرت اللہ شہاب جیسے لوگ، جو ایوبی دور میں کلیدی حیثیت کے حامل تھے، بفضل خدا زندہ ہیں، ان کے حافظے میں یہ تو محفوظ ہے کہ اس دور میں پرویز صاحب نے جماعت اسلامی کے متعلق کیا مشورہ دیا تھا۔ [3]

---

[1] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۸۴ء، صفحہ ۴۷ [2] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۸۵ء، صفحہ ۴۴ [3] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۸۵ء، صفحہ ۵۴

پھر یہ بات بھی، ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ ایوبی دور میں، جماعت اسلامی اور اس کے امیر، شدید ابتلاء و آزمائش میں سے گزر رہے تھے حتّٰی کہ جماعت اسلامی کو سرکاری طور پر کالعدم قرار دے دیا گیا تھا جسے بعد میں سپریم کورٹ نے بحال کر دیا، ایوبی حکومت کو، جس کی پشت پر، پرویز صاحب کے مفکرانہ مشورے بھی موجود تھے، اس عدالتی جنگ میں شکست فاش ہوئی تھی، اسی عہد ایوبی میں، مولانا مودودیؒ کو سزائے جیل بھی دی گئی تھی۔

کیا اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرویز صاحب نے ارباب اقتدار سے اپنے روابط کے باعث کوئی مفاد نہیں اٹھایا؟ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے ہر صاحب اقتدار سے تعلق رہے ہیں، جاگیر و فیکٹری نہ لینے کے باوجود بھی وہ متنوع انداز میں ارباب بست و کشاد سے متمتع ہوتے رہے ہیں، جلب منفعت کی صورت میں بھی، اور اپنے مخالفین کے خلاف، اپنے نفسِ حسد پرست کی تسکین کی صورت میں بھی۔

کرو خود، اور الزام دوسروں پر

لیکن اپنی اس خامی کو چھپانے کے لیے، وہ، الٹا الزام، علماء کرام پر لگایا کرتے تھے کہ ''مذہبی پیشوائیت'' اور ''اقتدار و ملوکیت'' میں ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا کرتا ہے اور پھر اس گٹھ جوڑ کی تان یہاں آ کر ٹوٹتی ہے کہ

> پاکستان میں ملائیت کے منظم ادارے کا سرخیل، سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ [1]

اب اگر واقعی یہ حقیقت ہے کہ ملائیت اپنے دور کے اقتدار و ملوکیت کی حامی ہوتی ہے تو پھر مولانا مودودیؒ تو ہر حکومت کے مخالف ہی رہے ہیں جبکہ اس کے برعکس، پرویز صاحب کے ہر صاحب اقتدار سے تعلقات استوار رہے ہیں، اور وہ ان سربراہانِ مملکت کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں جو علماء کرام اور قرآن و سنت پر مبنی نظام کی مخالفت کرتے رہے ہیں، اور پھر پرویز صاحب، اربابِ اقتدار کی بہتی گنگا سے ہاتھ بھی دھوتے رہے ہیں۔

پیپلز پارٹی کا دورِ حکومت

پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب جناب ذوالفقار علی بھٹو، صدر ایوب خاں کی حکومت میں قلمدانِ وزارتِ امور خارجہ سنبھالے ہوئے تھے، اور اسے ڈیڈی کہہ کر پکارتے تھے، ایوب خاں ٹھیک اُس وقت بڑی تیزی سے انحطاط کی طرف لڑھکنا شروع ہوئے جب وہ اپنے دس سالہ جشنِ ترقی مناتے ہوئے خود کو انتہائی عروج پر دیکھ رہے تھے، ''ہر کمالے را زوالے'' کے مصداق، ایوب خاں کو، جب بھٹو صاحب نے بڑی برق رفتاری سے اپنی ہر دلعزیزی کھوتے ہوئے پایا تو ان کی اپنی ہوس اقتدار کا پارہ اوپر چڑھنا شروع ہوا، جوں جوں فوجی آمر، زوال و تنزل کی دلدل میں دھنستے چلے گئے، بھٹو صاحب کی ہوسِ جاہ بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ اپنے مربی و محسن بلکہ ڈیڈی کی زوال پذیر حکومت کو صرف اس لیے خیر باد کہا کہ وہ، اقتدار کی ڈوبتی

[1] طلوع اسلام، فروری ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۵

ہوئی کشتی میں سے نکل بھاگنے ہی میں اپنی عافیت پا رہے تھے، چنانچہ انھوں نے ایوبی حکومت سے علیحدگی اختیار کی اور پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے، اپنی پارٹی بنا کر، میدانِ سیاست میں کود پڑے اور عامۃ الناس میں، ایوب خاں کی آمریت کے خلاف، جو آتشِ غضب ظاہر ہوا چاہتی تھی، اس میں اپنی حکومت مخالف تقاریر کے ذریعہ خوب ایندھن ڈالا، وہ اپنی تقاریر کے ذریعہ، معاہدہ تاشقند میں، ایوب خاں کے خفیہ اور غدارانہ کردار کو، اُجاگر کرنے کا سیاسی حیلہ کام میں لانے پر جُت گئے اور یہ اعلان کرتے رہے کہ وہ یہ بتائیں گے کہ ایوب خاں نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں حاصل ہونے والی عسکری فتح کو کس طرح معاہدۂ تاشقند کی میز پر شکست میں تبدیل کر دیا، چنانچہ ایوب خاں کے سفینۂ اقتدار سے اتر کر، جب وہ ہر چوک اور ہر چوراہے پر، ایوب خاں کی خامیاں، نقائص، معائب اور جرائم اچھال رہے تھے تو اُس زمانے میں، طلوعِ اسلام نے، بھٹو صاحب کی اس حرکت پر دار و گیر کرتے ہوئے، ''انتہائی کمینگی'' کے زیرِ عنوان یہ لکھا کہ

جب سے صدر ایوب، اقتدار سے الگ ہوئے ہیں، ملک کا ایک طبقہ، انھیں ہدف طعن و تشنیع بنا رہا ہے، ان میں بعض لوگ دشنام دہی تک بھی اُتر آئے ہیں جو ہمارے نزدیک کسی شریف انسان کا شیوہ قرار نہیں پا سکتا، ان لعنت ملامت کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں --- اور بڑے فخر سے بڑھ چڑھ کر آگے آ رہے ہیں --- جو صدر ایوب کے دورِ اقتدار میں، ان کے سب سے بڑے مداح تھے، ان میں سے بعض بڑے بڑے بلند مناصب پر فائز تھے، اور بعض ایسے جو طرح طرح کے مفاد حاصل کرتے تھے، یہ حضرات، صدر ایوب کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے نہیں تھکتے تھے، یہ ان کے خاص مصاحب اور مقرب بنے رہتے تھے۔

ہمارے نزدیک یہ انسانی کیرکٹر کی انتہائی پستی اور کمینگی ہے کہ جب تک کوئی شخص برسر اقتدار رہے، اس کی مدح سرائی کیجائے اور جونہی وہ اقتدار سے الگ ہو، اسے ہدف طعن و تشنیع بنانا شروع کر دیا جائے، یہ خود غرضی، بزدلی اور منافقت کی بدترین مثال ہے، ایسے لوگوں پر نہ کبھی اعتماد کرنا چاہیے، نہ شریف انسانوں کو انھیں اپنے پاس بٹھانا چاہیے۔

لیکن ہمارے ہاں ایسی جماعتیں بھی ہیں جو اس قسم کے منافقوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر باہر لاتیں، انھیں بانس پر چڑھاتیں، اور ان کی ''گالیوں'' پر ''حق گوئی'' کا لیبل لگا کر، انھیں قوم کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں --- ان کا یہ کردار، ان منافقین سے کم شرمناک نہیں۔ حق گو وہی کہلا سکتا ہے، جو کسی کے اقتدار کے زمانے میں بھی اسے غلط بات پر ٹوکے، نہ وہ جو اس وقت اس کی کاسہ لیسی کرے اور جب وہ اقتدار سے الگ ہو جائے، تو اُسے گالیاں دینے لگ جائے۔ [1]

لیکن پھر جب، بھٹو صاحب، قائد اعظم کا ''آدھا احسان چکا ڈالنے'' کے بعد، بقیہ پاکستان میں سریر آرائے اقتدار ہوئے تو چونکہ وہ ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ لگا کر آئے تھے، اور خود طلوعِ اسلام کا پیش کردہ نظام بھی، اشتراکیت ہی کا چربہ تھا، اس لیے پرویز صاحب کے دل میں، اُن کے لیے گہری ہمدردی پیدا ہوگئی، مزید بریں، بھٹو صاحب اور پرویز صاحب کے درمیان، اس ''قدرِ مشترک'' نے بھی انھیں باہمدگر قریب کر دیا کہ دونوں ہی مولانا مودودیؒ کے مخالفین میں سے تھے، (ایک سیاسی میدان میں اور دوسرا نظریاتی میدان میں)۔ بھٹو صاحب سے پرویز صاحب کو کوئی خاص اختلاف نہیں تھا، کیونکہ دونوں کی منزل ایک ہی

[1] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۶

تھی، دونوں ہی نفاذ اشتراکیت کے خواہاں تھے، ایک ''اسلامی سوشلزم'' کے نام سے، اور دوسرا ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے نام سے یہ ہدف حاصل کرنا چاہتا تھا، البتہ بھٹو صاحب سے موخر الذکر، یہ مطالبہ ضرور کرتے رہے کہ وہ ''اسلامی سوشلزم'' کی ترکیب کا استعمال ترک کر کے، ''نظامِ ربوبیت'' یا اس طرح کی کوئی اور اصطلاح اپنالیں، لیکن بھٹو صاحب نے اسے ہمیشہ نظر انداز کیے رکھا، ''حُبِّ علی'' کا جذبہ تو کوئی مؤثر جذبہ نہ تھا، البتہ ''بغض معاویہ'' کے تحت، دونوں ہی --- بھٹو صاحب بھی اور پرویز صاحب بھی --- مخالفتِ مودودیؒ میں شدید تر ہوتے چلے گئے، چنانچہ بھٹو صاحب کے سیاسی بیانات اور پرویز صاحب کی قلمی زہر افشانیوں میں، اضافہ ہوتا رہا۔

ضیاء الحق کا عہد حکومت اور پرویز صاحب

ضیاء الحق صاحب چونکہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے جو قرآن وسنت کی حجیت پر گہرا ایمان رکھتے تھے، اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی متدین، متقی اور پارسا تھے، اس لیے چاہتے تھے کہ قرآن وسنت پر مبنی نظام نافذ کیا جائے، ان کے عہد میں اگرچہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لب ولہجہ میں ایک حد تک مثبت تبدیلی آئی لیکن پاکستان میں بسنے والی امت مسلمہ کی دینی تربیت اور اخلاقی نشوونما کے لیے، وہ کوئی بھرپور اور ٹھوس لائحۂ عمل مرتب نہ کر پائے، کچھ تعزیری قوانین بھی نفاذ پذیر ہوئے، لیکن لوگوں میں ان قوانین کے مؤثر نفاذ کے لیے، جس کم سے کم اخلاقی تربیت کی ضرورت تھی، چونکہ وہ مفقود تھی، اس لیے بھی، اور کچھ اس لیے بھی کہ ان کے وارثانِ تاج وتخت بھی، دین سے وہ رغبت نہیں رکھتے تھے جو اس کام کے لیے درکار تھی، شرعی قوانین کا نفاذ مؤثر حیثیت اختیار نہ کر پایا، اور پھر بعد کے حکمران تو بہرحال تھے ہی ایسے، جن کی زبانوں پر نعرۂ اسلام ہو تو ہو، مگر ان کی عملی زندگی میں اس کا کوئی اثر نہ پایا جاتا تھا۔

بہرحال، ضیاء الحق جیسا شخص، جو قرآن کے ساتھ سنت کی حجیت کا بھی قائل تھا، پرویز صاحب کی نظر میں، ایک ناپسندیدہ حکمران تھا، اس لیے ''مفکر قرآن'' صاحب نے، ان کے ''شرعی قوانین کے نفاذ پر'' تردید ومخالفت ہی کا رویہ اپنائے رکھا۔

سعودیہ کا دورۂ پرویز

۱۹۸۲ء میں، پرویز صاحب ۷۹ برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے، ان کا بدن وجسم اور ان کے قویٰ، اب اضمحلال کا شکار تھے، صحت روبہ زوال تھی، نقاہت بڑھ رہی تھی، ناسازیٔ طبع، مستمر عارضہ بن رہا تھا، ان کی صحت کا یہ تقاضا تھا کہ اُنہیں، اُن کے ہجوم مصروفیات سے نکال کر، کسی صحت افزاء مقام پر منتقل کیا جائے، لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئے، ان کے بعض احباب نے انھیں سعودی عرب کے دورے پر آمادہ کر لیا، لیکن حج اور عمرہ کے لیے نہیں بلکہ صرف تبدیلیٔ آب وہوا کے لیے۔ کیونکہ حج تو ان کے عقیدے کے مطابق، نمایندگانِ ملت ہی پر فرض ہے، نہ کہ عوام الناس پر۔ چنانچہ ضیاء الحق صاحب ہی کے دور میں، وہ، ۱۳ اپریل ۱۹۸۲ء کو سعودی عرب کے دورے پر سدھارے، لیکن جب وہاں پہنچے تو تقلیداً، لکیر کا فقیر بنتے ہوئے، کچھ اعمالِ عمرہ بھی،

انھیں انجام دینے پڑے، انھی اعمال میں سے ایک عمل، طوافِ کعبہ کا بھی تھا، لیکن یہ حقیقت مستور و مخفی ہی رہی کہ اس عمل کو پرویز صاحب نے چودہ صدیوں سے جاری ''روایتی'' اور ''قدامت پرستانہ'' مفہوم کے مطابق انجام دیا تھا؟ یا اپنے ''جدید'' اور ''ترقی پسندانہ'' مفہوم کے مطابق؟ جسے وہ بایں الفاظ بیان کیا کرتے تھے۔

> سورہ بقرہ میں ہے کہ خانہ کعبہ طائفین اور عاکفین کے لیے مرکزی مقام ہے، (۲/۱۲۵)۔ طائفین کے معنی ہیں، نوعِ انسانی کے چوکیدار۔ وہ لوگ جو انسانیت کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ اور عاکفین کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوعِ انسانی کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دے، بلکہ اسے ایک رشتہ میں پروئے رکھے، ان کے معاملے کو درست رکھے۔ دنیا کے نظم و نسق میں درستی اور آراستگی پیدا کر دے (دیکھئے عنوان ع-ک-ف)۔ قرآن کریم نے ملت اسلامیہ (جماعت مومنین) کو ایک بین الاقوامی امت قرار دیا ہے جس کا فریضہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے احوال و کوائف اور اعمال و افعال کی نگرانی کرے اور ان کے معاملات کو درست رکھے۔ اس مقصد کے لیے وہ جس نظام کی تشکیل کرتے ہیں اس کا مرکز کعبہ کو قرار دیا ہے (۲/۱۴۳)۔ لہٰذا اس نظام کو قائم کرنے والی جماعت طائفین کی جماعت ہے یعنی نوعِ انسانی کی چوکیداری کرنے والی، حقوق انسانیت کی حفاظت کرنے والی ....
>
> یہ ہے طواف کعبہ کا صحیح مفہوم، جس کی تمثیلی شکل (Symbolical Form) خانہ کعبہ کے گرد گھوم کر اس فریضہ کی یاد تازہ کرنا ہے۔ [۱]

بہر حال یہ حقیقت، ''مفکر قرآن'' کی کسی تحریر سے بے نقاب نہ ہوسکی کہ ان کا طوافِ کعبہ، محض تمثیلی شکل (Symbolical Form) تک ہی محدود رہا، یا اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے ''تمام نوعِ انسانی کے احوال و کوائف اور اعمال و افعال کی نگرانی کرنے اور ان کے معاملات کو درست رکھنے کا فریضہ بھی انجام دیا'' تھا؟ سعودیہ سے ان کی واپسی ۳۰ اپریل ۱۹۸۲ء کو ہوئی اور رات دس بجے وہ لاہور پہنچے۔

سلسلۂ درس قرآن کی آخری کڑی

پرویز صاحب کے ہفتہ وار درس قرآن کا سلسلہ، اگرچہ قیامِ پاکستان کے بعد، کراچی ہی میں آغاز پذیر ہو چکا تھا، اور لاہور منتقل ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن یہ معلوم نہ ہو پایا کہ زندگی میں کتنی مرتبہ وہ پورے قرآن کا درس دے چکے ہیں، قرائن کی روشنی میں ظنِ غالب یہ ہے کہ وہ دو مرتبہ اس سلسلۂ درس کی تکمیل کر چکے تھے، اور تیسری مرتبہ کا سلسلۂ اختتام کو نہیں پہنچ پایا تھا کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے، ان کی موت سے قبل، بوجہ علالت، ان کا سلسلۂ درس منقطع ہو گیا۔

> ۱۵/اکتوبر ۱۹۸۴ء (طلوعِ اسلام میں، غلطی سے ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء لکھا گیا ہے --- قاسمی) کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا، اور اس کے بعد، مسلسل بسترِ علالت پر رہے، اور ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو شام چھ بجے، اس دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ [۲]

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا　　وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

[۱] لغات القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۰۹۸ تا ۱۰۹۹　　[۲] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۷

اساتذۂ پرویز

اساتذۂ پرویز کی فہرست، کوئی بہت لمبی چوڑی نہیں ہے، وُہ اساتذہ، جن کے سامنے باضابطہ طور پر، زانوئے تلمذ تہہ کر کے، انھوں نے اکتسابِ فیض کیا، وہ صرف دو ہی ہستیاں ہیں، ایک، اُن کے دادا، مولوی چوہدری رحیم بخش، جن کے ہاتھوں، بچپن ہی میں، پرویز صاحب کی پرورش، تربیت اور تعلیم انجام پائی، اور بقول ان کے، وہ تھوڑے ہی عرصہ میں علوم شریعت و طریقت کے مبادیات پر، عبور حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اور دوسری ہستی، جن سے انھوں نے باقاعدہ تعلیم پائی، وہ مولانا محمد اسلم جیراجپوری کی ذات تھی۔

ان دونوں ہستیوں کے علاوہ، جن سے بھی انھوں نے اکتسابِ علم کیا، وہ باقاعدہ اور باضابطہ یا بالمشافہ طور پر نہیں کیا بلکہ اُن کی کتب اور لٹریچر کے توسط سے کیا، ایسی ہستیوں میں، سرسید احمد خاں، مولوی چراغ علی، عنایت اللہ اثری، خواجہ احمد دین امرتسری وغیرہ شامل ہیں۔

کتب بینی کے ذریعہ، اس طرح کے استفادہ کو اگر مزید وسعت دی جائے تو اس میں ایسی اسلام دشمن شخصیات بھی آ جاتی ہیں، جن کے خلافِ اسلام اعتراضات کو، پرویز صاحب نے نئی آب و تاب کے ساتھ، ''عجمی اسلام'' کے خلاف، اپنے ''عقلی دلائل'' کی حیثیت سے پیش کیا ہے، چنانچہ احادیث رسول کے بارے میں پرویز صاحب جو کچھ کہا کرتے تھے، وہ دراصل، اُن ہی شکوک وشبہات اور اعتراضات و مطاعن کا چربہ ہے، جو یا تو غیر مسلم ناقدینِ حدیث (مثلاً گولڈزیہر، شاخت وغیرہ) نے یا ان سے متاثر ہونے والے نام نہاد مسلم ''دانشوروں'' نے پیش کیے ہیں، اسی طرح، معاشی میدان میں، جس نظام کو وہ ''قرآنی نظام ربوبیت'' کہا کرتے تھے، وہ بھی دراصل کارل مارکس اور لینن کے پیش کردہ نظام ہی کا چربہ ہے، رہے معاشرتی طور طریقے، تو وہ بھی اگر سب کے سب نہیں، تو اکثر و بیشتر، تہذیب مغرب کے فاسد تمدن ہی سے ماخوذ ہیں، تاکہ اسلام، ''جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے''۔

تلامذۂ پرویز

پرویز صاحب کا کوئی ایسا قطعی تعلیمی ادارہ نہ تھا جس میں وہ خود معلم یا مدرس ہوں اور اس ادارہ سے فارغ شدہ طلبہ کو ان کا باضابطہ شاگرد قرار دیا جائے، اگرچہ ''قرآنک کالج'' کے قیام کا منصوبہ، اُن کے پیش نظر تھا تاکہ اپنے دور کے وہ بھی سرسید بن سکیں۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طلوعِ اسلام میں چندہ کی اپیل بھی کی گئی جس پر لبیک بھی کہا گیا، لیکن پھر بھی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، اس لیے ان کے باقاعدہ اور باضابطہ شاگردوں کا وجود تو ناپید ہے لیکن کچھ ایسے لوگ ہیں، جو فکری طور پر، خود کو ان کا شاگرد اور انھیں اپنا اعزازی استاد قرار دیا کرتے تھے، اور جو دیگر ہم مسلک رفقاء کی نسبت، ان سے بہت زیادہ قریب تھے، یہ قریبی رفقاء، پرویز صاحب کے حینِ حیات، ان کے یمین و یسار تھے، اور بعد از وفات، ان کی فکر کے علمبردار

بنکر، اسے آگے بڑھاتے رہے، چنانچہ محمد لطیف چوہدری، حسن عباس رضوی، امیر الدین بٹ، محمد عمر دراز، شیخ عبدالحمید، ڈاکٹر عبدالودود، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، صفدر سلیمی وغیرہم مردوں میں سے اور زاہدہ خانم دُرّانی، شمیم انور، سعیدہ اختر اور ثریا عندلیب وغیرھُنَّ خواتین میں سے چند ایک ایسے ہی افراد تھے، ان میں سے بعض لوگ، اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں جبکہ بعض، ابھی بقیدِ حیات ہیں۔

علمی آثارِ پرویز

جناب غلام احمد پرویز صاحب، دور حاضر کے اُن مشاہیر میں سے ہیں، جن کا زندگی بھر، قلم سے رابطہ استوار رہا ہے، وہ ہمیشہ لکھتے ہی رہے اور اپنے پیچھے بہت سے علمی آثار چھوڑ گئے، پرویز صاحب کا شمار بھی، عصرِ رواں کے ان مصنفین میں ہوتا ہے جو کثیر التصانیف واقع ہوئے ہیں، ان کے علمی آثار کا مرکز ومحور (بظاہر) قرآن مجید ہے، خدا کی آخری کتاب، قرآن کریم کے مختلف اور متنوع پہلوؤں پر خامہ فرسائی ہی ان کی اصلی جولان گاہ تھی، ذیل میں ان کی تصانیف ونگارشات کا بالاجمال تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

سلسلہ معارف القرآن

جناب پرویز صاحب نے اِکّا دُکّا مقالہ نویسی کے بعد، اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز، معارف القرآن کے سلسلہ سے کیا، یہ سلسلہ، اُن کی چار بڑی اور ابتدائی کتب پر مشتمل ہے، جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

(۱) معارف القرآن جلد اول

پرویز صاحب کی اس اولین تصنیف کا مرکز ومحور، ''اللہ تعالیٰ'' ہے، مصنف نے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلیلہ اور اسمائے حسنیٰ کو قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیا ہے، بعض صفات واسماء پر تفصیلی بحث ہے اور بعض پر نہایت مختصر۔

(۲) معارف القرآن جلد دوم

پرویز صاحب کی یہ دوسری تصنیف، تمہیدِ رسالت کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں انھوں نے ارتقائے پیکر انسانی، وادی آدمیت، سرکشئ ابلیس، فطرتِ شیطانی، سجودِ ملائکہ، وحیٔ آسمانی، مقام رسالت، طوفان نوحؑ اور اقوامِ عاد وثمود کے متعلق بزعم خود قرآن کی روشنی میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

(۳) معارف القرآن جلد سوم

یہ کتاب، انبیائے قرآن کی تاریخ پر مشتمل ہے، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک، انبیائے سابقین کی انقلاب انگیز دعوتِ توحید اور اقوامِ ماضیہ ومللِ گذشتہ کی عبرت آموز وبصیرت افروز داستانِ عروج و زوال کو پیش کیا گیا ہے۔

(۴) معارف القرآن جلد چہارم

پرویز صاحب کے سلسلۂ معارف القرآن کی یہ آخری کڑی ہے، جس میں انھوں نے حضور اکرم، نبیٔ معظم، خاتم الرسل، حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیا ہے، لیکن نبیٔ آخرالزماں ﷺ کے احوالِ شب و روز کے علاوہ، بعض ایسے ابواب بھی شامل ہیں جن میں بزعم مصنف، قرآنی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، مثلاً مذاہب شتّی اور ان کی کتب کا تفصیلی بیان، اسلامی نظام اور معجزات وغیرہ۔

اس سلسلہ کے اعادہ شدہ ایڈیشن

لیکن بعد میں پرویز صاحب نے، اس سلسلہ کتب اربعہ میں، حذف و ترمیم کرتے ہوئے، بہت حد تک تغیر و تبدل کر ڈالا، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور محسوس نہیں ہوتی کہ ابتداءً، وہ جن خیالات و افکار کو، عامۃ الناس کی ہمنوائی میں، اپنے ضمیر کے خلاف، محض مصلحتاً پیش کیا کرتے تھے، بعد میں اپنے ایک مستقل حلقۂ قارئین کے فراہم ہو جانے پر، اب وہ مصلحت باقی نہ رہی، للہذا، انھیں حذف کر دیا گیا، اور ساتھ ہی ان افکار و نظریات کو بھی، ان اعادہ شدہ ایڈیشنوں میں سمو دیا گیا، جنھیں ابتداءً، وہ اپنے دماغ میں مکتوم و مخفی رکھے ہوئے تھے، اس طرح معارف القرآن کی چاروں جلدوں کے مواد کو، جب نئی کتب کے سانچے میں ڈھالا گیا تو بڑے پیمانے پر تغیرات سامنے آئے حتی کہ اس سلسلہ کتب کے ابتدائی نام تک بدل ڈالے گئے اور ان کی جگہ مندرجہ ذیل نام اختیار کیے گئے۔

(۵) من و یزداں

یہ سلسلہ معارف القرآن کی جلد اول کا ترمیم شدہ ایڈیشن ہے، جو اللہ اور بندوں کے باہمی تعلق کو پیش کرتا ہے، معارف القرآن، جلد اول کی تصنیف کے دوران، معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب، ''انسانی فطرت'' کے قائل تھے، لیکن جب اسے ''من و یزداں'' کے قالب میں ڈھالا گیا تو ان عبارتوں کو بدل دیا گیا جن میں، ''انسانی فطرت'' کا ذکر تھا، کیونکہ اب خود پرویز صاحب، اس کے قائل نہ رہے تھے۔

(۶) ابلیس و آدم

یہ کتاب، معارف القرآن جلد دوم کا ترمیم شدہ ایڈیشن ہے، جس میں انسان کی پیدائش، قصۂ ابلیس و آدم، جنات، ملائکہ، وحی و رسالت جیسے موضوعات کے متعلق بحث کی گئی ہے، ان مباحث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جنات و ملائکہ اور ابلیس وغیرہ کے متعلق جو کچھ پیش کیا ہے وہ سر سید کے خیالات کا ہی چربہ ہے۔

(۷) جوئے نور

یہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر، حضرت شعیب علیہ الصلوۃ والسلام تک کے کوائفِ جمیلہ اور ان کی اقوام کی عبرت آموز داستانوں پر مشتمل ہے، اس کتاب کا مواد، معارف القرآن جلد دوم اور جلد سوم سے، ترمیم کے ساتھ ماخوذ ہے۔

(۸) برقِ طور

صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون مصر کی آویزش اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی حقائق پرور داستان ہی، اس کتاب کا مرکزی موضوع ہے، اس کتاب کا مواد، معارف القرآن جلد سوم سے، بعد از ترمیم و تبدیل اخذ کیا گیا ہے۔

(۹) شعلۂ مستور

اس کتاب میں مصنف نے، قرآن کریم کے نام پر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کوائف حیات، "جدید تاریخی انکشافات" کی روشنی میں پیش کیے ہیں، بعد از ترمیمِ بسیار، اس کتاب کے محتویات کو بھی، معارف القرآن جلد سوم ہی سے منتقل کیا گیا ہے۔

(۱۰) معراج انسانیت

یہ معارف القرآن جلد چہارم کی اس قدر حذف شدہ اور ترمیم یافتہ کتاب ہے کہ یہ حجم وضخامت میں تقریباً نصف کے قریب رہ گئی ہے، اب اس کے مندرجات، زیادہ تر، حیاتِ نبوی کے احوالِ شب و روز پر مشتمل ہو کر رہ گئے ہیں۔

(۱۱) مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں

اس کتاب کا مواد بھی، معارف القرآن جلد چہارم کے اُس ابتدائی حصہ سے ماخوذ ہے جو **ظهر الفساد** کے زیر عنوان درج تھا، اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ تاریخ میں پائے جانے والے مذاہب شتّی کی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں اور وہ کن کن مراحل سے گزر کر (آج اگر ان کا وجود موجود بھی ہو، تو وہ) کس حالت میں پائی جاتی ہیں۔ قرآن کے سوا کوئی کتاب بھی، آج اپنی اصل شکل میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

دیگر کتب

سلسلہ معارف القرآن کی ابتدائی چاروں کتابوں کو بعد میں سات کتب کی شکل میں ڈھال دیا گیا، ان کتب سبعہ کے علاوہ بھی جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں، مثلاً

(۱۲) انسان نے کیا سوچا؟

یہ کتاب حیاتِ انسانی کے حقائقِ مطلقہ کو پالینے کے لیے فکر انسانی کی لغزشوں پر مشتمل تاریخ پیش کرتی ہے، اِس کتاب میں (اور معارف القرآن جلد اول میں بھی) پرویز صاحب نے، علمائے مغرب کے افکار کو بکثرت پیش کیا ہے جس سے واضح ہے کہ

> پرویز صاحب نے مغربی فکر کا مطالعہ تو بہت محنت سے کیا ہے، لیکن جو چیز قاری کو الجھن میں ڈالتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنی تحریرات کو، ایسے اقتباسات سے بڑی کثرت سے آراستہ کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں متضاد فکر رکھنے والے مفکرین کا بیک وقت حوالہ دیتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقتباسات کے پیچھے جو مجموعی تجزیہ اور فکر موجود ہے، وہ اس پر سے سرسری طور پر گزر جاتے ہیں، اور مفیدِ مطلب اقتباسات سے بے دریغ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ انداز صرف ایک خاص سطح کے قارئین کو متاثر کر سکتا ہے۔ مطالعہ کی وسعت اور فکر کی گہرائی اور پختگی کے ساتھ یہ اسلوب بہت کم مناسبت رکھتا ہے۔ [1]

---

[1] تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، جلد ۱۰، صفحہ ۳۲۲

(۱۳) اسلام کیا ہے؟

اس کتاب کو ''انسان نے کیا سوچا؟'' میں مذکور انسانی فکر کی ناکامی کے بعد وحیٔ خداوندی کی طرف سے حقیقت کی نقاب کشائی کے طور پر مثبت جواب کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

(۱۴) ختم نبوت اور تحریک احمدیت

قادیانیت کی تردید میں پرویز صاحب کی یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس کی ابتداء ہی میں، یہ باطل دعویٰ کیا گیا ہے، کہ قادیانیت کے خلاف ۱۹۳۵ء کے مقدمہ بہاولپور کا فیصلہ، پرویز صاحب کے ایک اقتباس ہی کی روشنی میں درج کیا گیا تھا۔

(۱۵) لغات القرآن

قرآنی الفاظ کی تشریح و توضیح، پر مشتمل یہ لغات، چار جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں الفاظ قرآن کے خودساختہ اور دور خیز ایسے معانی پیش کیے گئے ہیں کہ جنھیں عجمی تو رہا ایک طرف، کوئی خالص عرب بھی نہ سمجھ پائے، طلوع اسلام، امام راغب اصفہانی کی کتاب، ''مفردات قرآن'' کی تنقیص کرتے ہوئے، یہ کہتا ہے کہ یہ:

> قرآن مجید کی لغات ہے لیکن اس میں قرآنی الفاظ کے مختصر معانی دیے گئے ہیں، ان پر تفصیلی بحث بہت کم کی گئی ہے۔ [1]

مفردات القرآن (راغب) کے اس عیب و منقصت کے مقابلہ میں، لغات القرآن (پرویز) کی یہ خوبی بیان کی جاتی ہے کہ اس میں تفصیلی معانی مذکور ہیں، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس میں تفصیلی معانی نہیں بلکہ تحریفی معانی کی بھرمار ہے، ان معانی میں سے بعض کی پردہ دری، اس مقالہ کے مختلف مقامات پر کردی گئی ہے۔

(۱۶) مفہوم القرآن

کہنے کو تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ قرآن، واضح، مُبین اور خود مکتفی (Self Explanatory) کتاب ہے، جو اپنا مفہوم خود واضح کردیتی ہے، لیکن پھر خود ہی اپنے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے، اور قرآن مجید کو غیر واضح، غیر مبین اور غیر خود مکتفی قرار دیتے ہوئے، کہیں اس کے الفاظ سے تجاوز کرتے ہوئے، اور کہیں قرآن کے منہ میں خود اپنی بات ڈالتے ہوئے، اس کا مطلب کچھ اور ہی کر ڈالا جاتا ہے، اور اس طرح کے حربوں سے جو کچھ نتیجتاً برآمد ہوتا ہے، اُس پر ''مفہوم القرآن'' کا لیبل چپکا دیا جاتا ہے۔

(۱۷) جہانِ فردا

''جہانِ فردا'' کے عنوان سے اُخروی زندگی کی ان کیفیات کو پیش کیا گیا ہے جو اوراقِ قرآن میں جنت اور دوزخ کے متعلق مذکور ہیں، لیکن یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ پرویز صاحب، اُس بہشت اور جہنم کو، جس سے ہر انسان کو مرنے کے بعد سابقہ پیش آنے والا ہے، اُسے ''جہانِ فردا'' سے ''جہانِ امروز'' ہی میں کھینچ لاتے ہیں، اس طرح وہ قیامت سے پہلے ہی،

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، حاشیہ بر صفحہ ۵۳

قیامت کو برپا کر ڈالتے ہیں۔

(۱۸) کتاب التقدیر

مسئلہ تقدیر کو حل کرنے کے لیے لکھی جانے والی اس کتاب میں یہ مسئلہ حل ہوا یا نہیں؟ اسے تو فی الحال نظر انداز کیجئے، اور دیکھیے کہ اس کتاب میں قرآنی حقائق کو کس قدر مسخ و تحریف کا نشانہ بنایا گیا ہے، مشتے نمونہ از خروارے، صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے، کتب لغات و موسوعات میں بھی، اور عام بول چال میں بھی، ''اللہ'' سے مراد وہ بلند و بالا اور بزرگ و برتر ہستی ہے جو فاطر السمٰوٰت والارض ہے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' جناب پرویز صاحب کے نزدیک ''اللہ'' سے مراد، ''ذات خداوندی'' نہیں ہے، بلکہ ''قانون خداوندی'' ہے۔ مثلاً قرآن کریم، اگر یہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ''تمھارے اعمال پر اللہ کی نگاہ ہے''۔ تو اس سے مراد، بقول پرویز صاحب، یہ نہیں کہ --- ''خدا کی نگاہ سے تمھارا کوئی عمل بھی مخفی نہیں ہے'' --- بلکہ یہ ہے کہ

انسان کا کوئی عمل، خدا کے قانون مکافات کی زد سے باہر نہیں رہ سکتا، انسان کا ہر عمل، اس کے دائرے کے اندر ہوتا ہے۔[۱]

اسی طرح لفظ ''اللہ'' کے اور بھی متعدد دور خیز اور خود ساختہ معانی دیے گئے ہیں۔

(۱۹) شاہکار رسالت

خوبصورت اندازِ بیان، مقفّٰی مسجع عبارتوں میں، لفاظی کی بھرمار کے ساتھ، سیرتِ عمرؓ پر مشتمل اس کتاب میں، جسقدر حقائق کو مسخ و تحریف اور قطع و برید کا نشانہ بنایا گیا ہے شاید ہی پرویز صاحب کی کسی دوسری کتاب میں اس کی مثال ملتی ہو، حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں مفکر قرآن کی چالبازیوں اور عیاریوں کا جائزہ لینے کے لیے، ایک مستقل اور ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، یہ کام کسی ایسے جید عالم اور صاحب خبر و نظر ہستی کے کرنے کا ہے، جس کی نگاہ عمیق، نہ صرف یہ کہ کتب احادیث و تاریخ پر وسیع ہو بلکہ پرویز صاحب کے جملہ لٹریچر پر بھی حاوی ہو، یہ کام عامۃ الناس کے کرنے کا نہیں ہے، وہ تو بے چارے چاشنیٔ ادب اور شگفتگیٔ زبان کی اس چکنی زمین پر سے پھسل جاتے ہیں، پھر منزلِ حقیقت تک ان کی رسائی کیسے اور کہاں؟

(۲۰) اقبال اور قرآن

دنیا میں ہر جعل ساز کو، اپنا کھوٹا سکہ چلانے کے لیے کسی قابلِ اعتبار ٹکسال کا، اور اپنا باطل نظریہ پھیلانے کے لیے کسی قابل احترام ہستی کا سہارا لینا پڑتا ہے، بالکل اُسی طرح، جس طرح یہود کو اپنے کافرانہ مسلکِ ساحری کو سند جواز دینے کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام استعمال کرنا پڑا تھا، اور پھر قرآن کو ان کی تردید میں یہ کہنا پڑا تھا کہ

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَـٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (البقرۃ - ۱۰۲) اور سلیمان نے کفر نہیں کیا (تھا) بلکہ یہ کفر اُن شیطانوں نے کیا تھا، جو (دوسرے) لوگوں کو ساحری کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

---

[۱] کتاب التقدیر، صفحہ ۷۷

جناب پرویز صاحب کو بھی اپنی دکان چمکانے کے لیے، علامہ اقبالؒ جیسی قابل احترام ہستی کا نام بکثرت استعمال کرنا پڑا، یہاں تک کہ وہ خود ہی بلاشرکتِ غیرے، فکر اقبالؒ کے وارث بھی بن بیٹھے اور شارح بھی، حالانکہ پرویز صاحب کے علامہ اقبالؒ کے ساتھ اختلافات، اُن اختلافات سے کہیں زیادہ ہیں جو وہ، مولانا مودودیؒ کے ساتھ کیا کرتے تھے، لیکن چونکہ پرویز صاحب، اپنی بلند پروازی کے لیے، اقبالؒ کے نام کو استعمال کرنا، قرینِ مصلحت سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے یہ مناسب جانا کہ لوہے کو پانی میں تیرانے کے لیے کسی بھاری بھرلکڑی کے ساتھ وابستہ و پیوست کر دیا جائے، اور اس کے ساتھ ہی مولانا مودودیؒ جیسی عالمی شہرت یافتہ شخصیت اور بلند پایہ دینی ہستی کی بھرپور مخالفت بھی اس لیے کی جائے کہ اس سے اور کچھ ملے یا نہ ملے، چھپکلی، بہر حال، بلند بام شہتیروں پر تو پہنچ ہی جائے گی۔

بہر حال، اس کتاب میں، پرویز صاحب نے، اقبالؒ کے متعلق، اُن مقالات کو جمع کر دیا ہے جو انھوں نے مختلف مواقع پر قلم بند کیے تھے۔

(۲۱) تفسیر مطالب الفرقان

یہ پرویز صاحب کے قلم سے، قرآن کریم کی ایک نامکمل تفسیر ہے، جو سات جلدوں میں ہے، اس تفسیر کے علمبردار، ایک طرف تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ --- قرآن کریم چونکہ بذاتِ خود تبیانًا لِکُلِّ شَیْءٍ ہے، اس لیے یہ کسی تشریح و تفصیل کا محتاج نہیں ہے'' --- لیکن دوسری طرف ان کا اپنا طرزِ عمل، خود ان کے اس دعویٰ کے منافی ہے، یعنی جس کتاب کو وہ مفصل، مبین، تبیان اور مبین سمجھتے ہیں، خود اس کی تفسیریں لکھ رہے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ، قرآن کے ایک مقام کی تفسیر، دوسرے مقام سے کرتے ہیں، لیکن اگر ان کی تفاسیر کو (بشمولِ تفسیرِ پرویز) بغور دیکھا جائے، تو معلوم ہو جاتا ہے، کہ ایک مقام اور دوسرے مقام کے درمیان جو خلاء رہ جاتا ہے، اسے پر کرنے کے لیے، وہ اپنے ذہن و اجتہاد سے کام لیتے ہیں یعنی ربطِ مضامین اور استنباطِ نتائج میں، یہ لوگ، قرآنی آیات کو، اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق چلاتے ہیں، اور چونکہ ان کی سمجھ اور فہم تغیر پذیر ہے، اس لیے مرور ایام کے ساتھ، قرآنی مفاہیم و مطالب اور اس کی تشریح و تفسیر بھی بدلتی رہتی ہے، جس کی عملی مثالیں، جگہ جگہ آ گے آ رہی ہیں، اور یہ پورا مقالہ تو ہے ہی اسی تفسیر (مطالب الفرقان) کا علمی اور تحقیقی جائزہ لینے کے لیے۔

(۲۲) تبویب القرآن

اس کتاب میں پورے قرآن کی تعلیم کو مختلف عنادین کے تحت، جدا جدا کر کے سمیٹا (Classify) کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ عنوانات و موضوعات کے تحت سمیٹی جانے والی آیات کو، پرویز صاحب نے اپنے مخصوص ذہنی تناظر میں، اجتہاد سے کام لیتے ہوئے ہی ترتیب دیا ہے۔

(۲۳) سلیم کے نام

یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جنھیں پرویز صاحب نے، اُن قرآنی تعلیمات کو جدید تعلیم یافتہ نسل کے قلوب و اذہان میں

اتارنے کے لیے، ''سلیم کے نام'' لکھا تھا، جنھیں وہ قرآن کریم کے نام سے پیش کیا کرتے تھے۔

(۲۴) طاہرہ کے نام

یہ ''سلیم کے نام'' کی طرز پر لکھی جانے والی، وہ کتاب ہے، جو خواتین سے متعلقہ مسائل کو'' طاہرہ کے نام'' خطوط کی شکل میں پیش کرتی ہے، اس کتاب میں مغربی معاشرت کے تقریباً جملہ اجزاء کو، کُلّی طور پر، یا جزوی طور پر،'' قرآنی تعلیم'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

(۲۵) اسلامی معاشرت

قیام پاکستان سے بہت پہلے چھپنے والی اس کتاب میں، مصنف نے، قرآن کریم کی روشنی میں اسلامی معاشرت کے خط وخال پیش کیے ہیں۔

(۲۶) فردوس گم گشتہ

اس تصنیف میں، مصنف نے اپنے متفرق طور پر لکھے گئے مقالات کو، اور مختلف مقامات و اوقات پر پیش کیے گئے خطابات کو جمع کر دیا ہے۔

(۲۷) سلسبیل اور (۲۸) بہار نو

یہ دونوں کتابیں بھی، پرویز صاحب کے ان خطبات و مقالات پر مشتمل ہیں جو وقتاً فوقتاً قلمی یا شفاہی انداز میں، وہ پیش کرتے رہے ہیں۔

(۲۹) قرآنی فیصلے

ابتداءً چار یا پانچ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب، اب صرف دو حصوں میں سمیٹ دی گئی ہے، یہ دراصل، قارئین طلوع اسلام یا دیگر افراد کے اُن استفسارات کے جوابات پر مشتمل کتابیں ہیں جو پرویز صاحب، طلوع اسلام میں شائع کرتے رہے ہیں۔

(۳۰) قرآنی قوانین

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، یہ کتاب، ان قوانین کو پیش کرتی ہے، جو صاحبِ تصنیف نے'' کتاب بغیرِ پیغمبر، وحی بلا رسول اور قرآن بغیرِ محمدﷺ '' کے نرالے مسلک کو ایجاد کر کے، اسے اپناتے ہوئے، الفاظِ قرآن سے روحِ قرآن کے خلاف، کشید کر ڈالے ہیں۔

(۳۱) اسباب زوال امت

اس کتابچے میں، عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے سنہرے دور کے بعد، امت مسلمہ، جس زوال وانحطاط کا شکار ہوئی، اس کے اسباب کی وضاحت کی گئی ہے، لیکن اس طرح کہ صحت وسقم، صواب وخطا، درست وغلط اور حق و باطل خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن اس مخلوطے پر، بڑے زور بیان کے ساتھ، ادبی چاشنی کی چادر ڈال دی گئی ہے، تاکہ نگاہیں، اس کی تہہ میں پہنچ کر، اس

آمیزۂ خطا وصواب کا ادراک نہ کر پائیں، تاہم حقائق پر نگاہ رکھنے والے زیرک افراد کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ جھوٹ، جس کے ساتھ کچھ سچ بھی ملا دیا جائے، خالص اور بے آمیز جھوٹ سے کہیں زیادہ خطرناک ہوا کرتا ہے۔

(۳۲) تصوف کی حقیقت

جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، اس کتاب میں تصوف کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے، تصوف کا مسئلہ بھی منجملہ ان مسائل میں سے ہے، جن میں پرویز صاحب اور علامہ اقبالؒ کے درمیان، اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۳۳) تحریک پاکستان اور پرویز

یہ کتاب پرویز صاحب کے اُن مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے، جو قیامِ پاکستان سے قبل، تحریکِ پاکستان کے حق میں، انھوں نے طلوعِ اسلام میں قلم بند کیے تھے، اگرچہ، کتاب کے آخر میں دو مقالے ایسے بھی ہیں جو حصولِ آزادی کے بعد، اگست ۱۹۶۰ء اور اکتوبر ۱۹۷۶ء میں لکھے گئے تھے، ان میں بعض مقالات ایسے بھی ہیں، جن میں مذکور نظریاتِ پرویز، ان کے بعد کے نظریات سے کھلا کھلا تضاد و تناقض رکھتے ہیں۔

(۳۴) نظام ربوبیت

یہ وہ کتاب ہے جس میں اشتراکیت کے معاشی نظام کو، قرآن مجید کے جعلی پرمٹ پر، درآمد کر کے، اس پر ''قرآن کے معاشی نظام'' کا لیبل چسپاں کیا گیا ہے، اور پھر اس ''نظام ربوبیت'' کے متعلق، یہ ادعائے باطل بھی کیا گیا ہے کہ عہدِ رسالت اور دورِ خلفائے راشدین میں بھی یہی نظام رائج تھا، مزید برآں، اس کتاب میں بھی، ''مفکرِ قرآن'' کی خوئے تضاد گوئی برقرار رہی ہے۔

(۳۵) ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGON

یہ پرویز صاحب کی انگریزی زبان میں لکھی گئی واحد کتاب ہے، اس میں انھوں نے، اسلام کو، عصرِ رواں کی غالب تہذیب کے مطابق، چھیل چھال کر پیش کیا ہے، اور قرآنی مفردات کو، معانی کے خود ساختہ سانچوں میں ڈھالنے کے لیے، اُنہی حربوں کو اس تصنیف میں بھی استعمال کیا ہے، جنھیں لغات القرآن میں اختیار کیا گیا ہے۔

باب ۲

تعارف تفسیر مطالب الفرقان

باب ۲

تعارف تفسیر مطالب الفرقان

عمومی تعارف تفسیر

جناب غلام احمد پرویز صاحب کی یہ تفسیر، پورے قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ ابتدائے قرآن (سورۃ الفاتحہ) سے لے کر، سورۃ الحجر تک حصۂ قرآن کی تفسیر ہے جو سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ جلدیں، صاحب تفسیر کی زندگی ہی میں، زیورطباعت سے آراستہ ہوکر، منظر عام پر آ چکی تھیں، مگر چھٹی اور ساتویں جلد، ان کی وفات کے بعد، اشاعت پذیر ہوئی تھیں۔ جیسا کہ ساتویں جلد کے ''پیش لفظ'' سے واضح ہے۔

انھوں نے ''قرآن مجید کی تفسیر، خود قرآن مجید سے پیش کرنا شروع کی۔ اس سلسلہ کی پانچ جلدیں، ان کی زندگی ہی میں پیش نظرِ قارئین ہوکر، دادِ تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ جلد ششم طباعت کے لیے تیار تھی کہ وہ اپنے سفرِ حیات کی اگلی منزل کی طرف جادہ پیما ہوگئے۔ چنانچہ یہ جلد ان کے بعد شائع ہوئی۔

محترم پرویز صاحب نے زیرِنظر، جلد ہفتم کا مسودہ، اکتوبر ۱۹۸۴ء (بستر علالت پر فراش ہونے) سے پہلے ہی لکھ ڈالا تھا۔ لیکن کتابت کے لیے اس کی تبییض کی سعادت، اولاً امیر الدین بٹ اور بعد ازاں حسن عباس رضوی مرحوم کے حصہ میں آئی۔ یہ جلد، محمد سعید قطبی کی حسنِ کتابت کی رہینِ منت ہے۔ سید شفقت حبیب نے بکمالِ دقت، کتابت کی تصحیح فرمائی۔ آئینۂ مطالب اور ابواب کی فہرستیں شیخ اللہ دِتا اور محمد عمر دراز کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہیں جبکہ انڈکس، پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا مرتب کردہ ہے۔[۱]

ساتوں جلدوں میں سے، ہر ایک میں، قرآن کریم کے کس حصہ کی تفسیر پیش کی گئی ہے؟ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جلد اول	مکمل سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کی ابتدائی انتیس (۲۹) آیات
جلد دوم	سورۃ البقرہ کی آیت تیس (۳۰) تا آیت ۱۱۲
جلد سوم	سورۃ البقرہ کی آیت ۱۱۳ سے لے کر، اختتامِ سورہ (آیت ۲۸۶) تک
جلد چہارم	سورۃ ال عمران کی ابتدا سے لے کر، سورۃ المائدہ کے اختتام تک
جلد پنجم	سورۃ الانعام کے آغاز سے لے کر، سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۸ تک
جلد ششم	سورۃ الاعراف، آیت ۱۵۹ سے لے کر اختتام سورہ ہود تک
جلد ہفتم	سورہ یوسفؑ کی ابتدا سے لے کر، انتہاء، سورۃ الحجر تک

انداز واسلوبِ تفسیر

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ صاحب تفسیر کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر، قرآن سے کرتے ہیں، لیکن دراصل قرآن

[۱] تفسیر مطلب الفرقان، جلد ۷، ''پیش لفظ''

کریم کے ایک مقام اور دوسرے مقام کے درمیان، واقع ہونے والے خلا کو، وہ خود اپنے قیاس ورائے سے پر کرتے ہیں، اس اعتبار سے ان کی تفسیر، حقیقتاً تفسیر بالرائے ہے۔ جن لوگوں نے بھی انکار سنت کی راہ اختیار کی ہے، ان کی روش ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ قرآن کو تفصیلاً لِکلّ شئ کہہ کر، پھر اس کی تشریح وتوضیح اپنی رائے سے کر ڈالی جائے اور یہ نعرہ بھی زبانوں پر جاری رہے کہ ہمارا قرآن توتِبیَانًا لِکلّ شئ ہے، جو اپنی وضاحت خود کرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ، یہ پرویز صاحب کے دل کی آواز تھی، یا کسی مصلحت کا تقاضا تھا، کہ اپنے دور ماضی میں، خود انھوں نے منکرین حدیث کی اس خامی پر ان الفاظ میں گرفت کی تھی جس میں بعد میں وہ خود مبتلا ہوئے تھے۔

> سب سے پہلے، تو ان کا اپنا طرز عمل، ان کے، اس دعویٰ کے منافی ہے، یعنی جس کتاب کو وہ مفصل، مبین اور تبیان کہتے ہیں، خود اس کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے ایک مقام کی تفسیر، دوسرے مقام سے کرتے ہیں لیکن اگر ان کی تفاسیر کو بغور دیکھا جائے، تو معلوم ہوجاتا ہے کہ ایک مقام اور دوسرے مقام کے درمیان، جو خلیج رہ جاتی ہے، اسے پر کرنے کے لیے، وہ، اپنے ذہن واجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ یعنی ربطِ مضامین اور استنباطِ نتائج میں قرآنی آیات کو، اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق چلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود یکہ ان کی نئی جماعت کا وجود ہی اس دعویٰ پر مبنی تھا، کہ مسلمانوں میں ''قرآن کے باہر'' کی تعلیم سے جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، انھیں مٹانے کے لیے رجعت الی القرآن ضروری ہے۔ لیکن ہوا یہ ہے کہ ابھی ان کی پیدائش کو چند روز بھی نہیں ہوئے، اور وہی جماعت کئی چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ہر جماعت، مبین اور مفصل قرآن کو کھینچ تان کر، اپنے مزعومات پر منطبق کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ [1]

بالکل ٹھیک یہی پوزیشن، تفسیر قرآن میں، پرویز صاحب کی رہی ہے۔ وہ بھی، دو قرآنی مقامات کے درمیان، واقع خلا کو پر کرنے کے لیے، اپنے قیاس ورائے کو استعمال کرتے رہے ہیں۔ اور آیاتِ قرآنیہ کو، اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق چلاتے رہے ہیں۔ اور چونکہ ان کی رائے اور قیاس، ہر آن بدلتے رہتے تھے، اس لیے، قرآن سے ماخوذ ومستنبط نتائج بھی ہمیشہ تغیر پذیر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پورا لٹریچر، ہر مسئلہ میں، اختلافات ہی نہیں، بلکہ تضادات کا بھی وسیع خارزار بن کر رہ گیا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

کشمکش اسلام ومغربیت میں، صاحبِ تفسیر کا رجحان

دورِ حاضر میں، اسلام اور مغرب کی کشمکشِ باہمی کے نتیجہ میں، امتِ مسلمہ تین گروہوں میں بٹ چکی ہے۔

ایک گروہ، ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو مغربی افکار ونظریات اور اس کے اخلاقی اقدار اور معاشرتی معیار سے متاثر ہی نہیں بلکہ بری طرح مرعوب ہو چکے ہیں۔ یہ گروہ چاہتا ہے کہ اسلام کو بھی چھیل چھال کر، معیارِ مغرب کے مطابق بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے، وہ قرآن وسنت کی تعلیمات کو، تاویل کے خراد پر چڑھا دیتا ہے۔ یہ لوگ، تقلید قدیم پر خوب گرجتے برستے

[1] ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ، انڈیا)، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۷۵، (جلد ۳۵، شمارہ نمبر ۴)

رہتے ہیں، لیکن تقلیدِ جدید کی راہ چلتے ہوئے، مقلدین قدیم سے بھی، دوقدم آگے رہتے ہیں۔

دوسرا گروہ، ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو جدید سے مکمل طور پر آنکھیں بند کر کے، قدیم ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکا ہے۔ اس گروہ کا موقف یہ ہے کہ تم قدامت پرستی کی مضبوط چٹان بن جاؤ۔ جدید کی لہریں، اس سے ٹکرا کر خود ہی دم توڑ دیں گی۔ سیلاب مغرب کا مقابلہ، اس کے آگے بند باندھنے سے ممکن نہیں، بلکہ مضبوط اور مستحکم چٹان بن کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ گروہ، اسلاف کی تقلید پر، اس قدر زور دیتا ہے کہ وہ دور حاضر کی مشکلات اور زمانۂ جدید کے تقاضوں کا شعور ہی نہیں رکھتا۔ کجا یہ کہ وہ ان مشکلات کا حل، قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کر سکے، اور تقاضاہائے جدید کا چیلنج قبول کر سکے۔ تمدنِ جدید کے وسیع سمندر میں، یہ لوگ، قدامت پرستی کے ایک ایسے جزیرے میں رہتے ہیں، جن میں یہ خود کو سیلاب جدید کی موجوں سے محفوظ و مصئون سمجھتے ہیں۔

تیسرا گروہ، ان اہل علم پر مشتمل ہے، جو تہذیب مغرب اور تمدنِ فرنگ پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے، اور خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَاکَدر کی روش اپناتا ہے۔ وہ قدیم کی صالحیت اور جدید کی نافعیت کو جمع کرتا ہے۔ یہ طبقہ، اسلاف کے سرمایہ کا بھی قدردان ہے، اور جدید تحقیقات اور انکشافات کا بھی۔ یہ لوگ، سابقہ دونوں طبقوں کے برعکس، اسلام ہی کو اصل واساس قرار دے کر، مغربی افکار ونظریات کو، اس کی میزان پر تولتے ہیں۔ اور ردّ وقبول کا فیصلہ کرتے ہیں۔

صاحبِ تفسیر، جناب غلام احمد پرویز صاحب کا تعلق، اول الذکر گروہ سے ہے۔ جو مغربی ثقافت وکلچر، اور اس کے افکار ونظریات سے مرعوب ہیں۔ چنانچہ وہ، اشتراکیت کا معاشی نظام، قرآن کے نام پر، من وعن قبول کرتے ہیں، اور اسی طرح، تمدنِ جدید کے جملہ لوازمات (مثلاً مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجابِ نسواں، مردوزن کی مطلق اور کامل مساوات، تعدّدِ ازواج کو معیوب قرار دینا، عورت کے دائرہ عمل کو، مردانہ کارگاہوں تک وسیع کر ڈالنا، اور عائلی زندگی میں، خاتونِ خانہ کے فطری وظائف سے اسے منحرف کر کے، مردوں کے جانکسل، بھاری اور کٹھن واجبات تلے دبا دینا، وغیرہ جملہ عناصر معاشرتِ جدیدہ) کو، صاحبِ تفسیر، عین قرآنی تعلیم قرار دیتے ہیں۔ احادیث کا انکار کیا ہی اس لیے ہے کہ جب کتاب اللہ...... کتاب بلا رسول اور قرآن بلا محمدؐ...... تنہا اور اکیلی رہ جائے، تو اسے مغرب کی غلام ذہنیتیں، من مانی تاویلات کا نشانہ بنا سکیں۔ یہ ہے وہ بنیادی نقطۂ نظر، جو صاحب تفسیر کے دل ودماغ پر حاوی رہا ہے۔ اور جس کے زیر اثر، رہ کر، انھوں نے تفسیر مطالب الفرقان کو پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوبِ تفسیر، خود، ان کے اقتباس سے واضح ہے۔

(۱) میں نے اکثر کہا ہے کہ قرآنِ مجید، عام تفاسیر سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ ان میں بیشتر حصہ خارج از قرآن ہوتا ہے، اور مفسر کے اعتقادات اور نظریات، قرآنی رہنمائی پر غالب آ جاتے ہیں۔ زیر نظر تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر آیت کے مفہوم کو، خود قرآن کریم کے دیگر مقامات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ نیز چونکہ میرا تعلق، کسی فرقہ سے نہیں، اور میرے اعتقادات ونظریات کی بنیاد قرآن کریم ہے، اس لیے اس تفسیر میں، آپ فرقہ بندی کے رنگ کی کوئی آمیزش نہیں پائیں گے۔ [1]

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ل

اسلوبِ تفسیر کے ضمن میں، یہ پرویز صاحب کا پہلا نکتہ ہے، جس میں تین باتیں کہی گئی ہیں۔

(الف) اس تفسیر میں، ہر آیت کے معنی کو، خود قرآن کریم کے دیگر مقامات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

(ب) میرا کسی فرقہ سے تعلق نہیں۔

(ج) تفسیر میں فرقہ بندی کا کوئی رنگ نہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، وہ محض منہ سے کہی ہوئی ایک بات ہے۔ ذَالِکَ قَولُھُمْ بِاَفْوَاھِھِمْ (۹/۳۰)، قرآن کے دو مقامات پر پائی جانے والی آیات کے درمیان باہمی خلا کو، وہ محض، اپنے قیاس اور گمان سے پر کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے اقتباس سے، قبل ازیں، واضح کیا جا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر آن بدلتی ہوئی رائے اور قیاس سے، قرآنی آیات کی تفسیر بھی بدلتی رہی ہے، جس کی مثالیں اس مقالہ میں جگہ جگہ پیش کی گئی ہیں۔

رہی دوسری بات، کہ ان کا کسی فرقہ سے تعلق نہیں ہے، تو یہ بات، اس پہلو سے محل نظر ہے کہ وہ مغرب کی فکری اسیری میں مبتلا ہو کر، آج خود، اس فرقے کی مسندِ پیشوائیت پر متمکن ہیں، جس کی ابتداء، سرسید نے کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ فرقہ بنتا کیسے ہے؟ خود پرویز صاحب، اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ

> اسے اچھی طرح سن رکھیے، کہ جس دن، آپ نے دین کے معاملہ میں، قرآن کریم کی بجائے، کسی انسان کو سند مان لیا، آپ نے فرقہ پرستی کی بنیاد رکھ دی۔ [1]

اور یہ بات تو بہر حال، واضح ہے کہ وابستگان طلوعِ اسلام کے نزدیک، قرآنی تعلیمات میں سند اور اتھارٹی، خود پرویز صاحب ہی ہیں۔ جیسا کہ طلوعِ اسلام کے ایک کنونشن میں، برملا اعلان کیا گیا تھا، کہ

> ....اس نوجوان کا نام، جو اس وقت، حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا، اور آج، قرآن کریم کے حقائق کے سلسلہ میں، اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، غلام احمد پرویز تھا۔ [2]

اب، اگر، پرویز صاحب واقعی انسان تھے، تو انہیں اتھارٹی اور سند تسلیم کرنے والے، خود ایک فرقہ ہیں۔ لہٰذا، خود پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ "میرا کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے"، قطعی خلاف حقیقت ہے۔

اسی طرح، یہ کہنا کہ ان کی تفسیر میں فرقہ بندی کا کوئی رنگ نہیں ہے، قطعاً غلط ہے۔ کتاب اللہ کو، رسول اللہ سے الگ کر کے، "قرآن بلا محمدؐ" کا نرالا مسلک اختیار کرنے والے، اور صرف قرآن ہی کو حجت ماننے والے، فرقۂ اہل قرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوادِ اعظم سے کٹ کر، جن اہل قرآن سے، یہ لوگ وابستہ ہوئے ہیں، وہ خود دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک کا تعلق، تحریک بلاغ القرآن سے ہے، اور دوسرے کا تعلق، تحریک طلوعِ اسلام سے ہے، اور دونوں، قرآن ہی کو واحد حجت (ماخذ قانون) مان کر، باہم مخالف و متصادم ہیں۔ خود پرویز صاحب پانچ نمازوں کے قائل ہیں، اور تحریک بلاغ القرآن والے،

---

[1] طلوعِ اسلام، مئی جون ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵۲ [2] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۴۳

تین نمازوں کے قائل ہیں، اور پرویز صاحب کے نزدیک، معمولی اختلاف بھی، فرقہ بن جانے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

سابقہ کنونشن میں (مجلس استفسارات میں) پرویز صاحب سے ایک سوال یہ بھی پوچھا گیا کہ طلوع اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ مذہبی فرقہ یا سیاسی پارٹی نہیں۔ اس بات کی وضاحت کی جائے۔ انھوں نے بتایا کہ مذہبی فرقہ کی پہچان یہ ہے کہ (مثلاً) اس کا نماز پڑھنے کا طریق، دوسرے فرقوں سے مختلف ہوتا ہے۔ (خواہ یہ فرق ذرا سا بھی کیوں نہ ہو) [1]

اور پرویز صاحب کا طریقۂ نماز، فقہ حنفی کے مطابق تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ فقہ حنفی میں، پانچ وقت کی نماز ہے۔ نماز میں، دو، تین اور چار تک رکعتیں ہیں، اور ہر رکعت دو سجدوں پر مشتمل ہے۔

میں بھی، اسی طرح نماز پڑھتا ہوں جس طرح جمہور مسلمان (فقہ حنفی) نماز پڑھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ، کہ اگر کہیں، فقہ حنفی کے علاوہ، دیگر طریق پر بھی نماز ہو رہی ہو (اور مجھے یہ طریق آتا ہو) تو ان کے ساتھ شامل ہو جانے میں بھی توقف نہیں کرتا۔ [2]

اور جہاں تک بلاغ القرآن والوں کا تعلق ہے، جنھیں پرویز صاحب ''لاہوری فرقہ'' کا نام دیتے ہیں، ان کی نماز کے متعلق، خود پرویز صاحب ہی لکھتے ہیں کہ وہ ہے:

(۱) تین وقت کی نماز (۲) نماز کی صرف دو رکعتیں (۳) ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ [3]

اب ظاہر ہے کہ ''لاہوری فرقہ'' کی نماز سے اختلاف کرنا، اور فقہ حنفی کے مطابق، نماز پڑھنا، کیا یہ فرقہ واریت نہیں ہے؟ جبکہ مذہبی فرقے کی پہچان ہی یہ ہے کہ ''اس کا نماز پڑھنے کا طریق، دوسرے فرقوں سے مختلف ہوتا ہے۔ (خواہ یہ فرق ذرا سا بھی کیوں نہ ہو)''۔

اسلوب تفسیر کا دوسرا نکتہ

یہ پرویز صاحب کی قرآنی تفسیر کے اسلوب و انداز کا پہلا نکتہ تھا، اب اس کے بعد، اگلا نکتہ، ملاحظہ فرمائیے، جو ان کے اپنے الفاظ میں یوں مذکور ہے:

(۲) آیات کا لفظی ترجمہ عند الضرورت دیا گیا ہے۔ عام طور پر ان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے، کیونکہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے، کہ قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ [4]

حقیقت یہ ہے کہ آیات کا لفظی ترجمہ تو کہیں دیا ہی نہیں گیا۔ آیات کے نیچے جو کچھ درج کیا گیا ہے، وہ من وعن، مفہوم القرآن ہی سے ماخوذ ہے، اور مفہوم القرآن کو، نہ صرف یہ کہ کوئی شخص بھی ترجمہ قرار نہیں دے سکتا، بلکہ خود، پرویز صاحب

---

[1] طلوع اسلام، مئی جون ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳
[2] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۶
[3] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۱۳۵
[4] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ل

نے بھی، اسے ترجمہ نہیں کہا ہے، وہ خود فرماتے ہیں کہ

نہ یہ قرآن کا ترجمہ ہے، نہ تفسیر، بلکہ اس کا مفہوم ایسے واضح، مسلسل مربوط اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے قرآنی مطالب، تابندہ ستاروں کی طرح نگہٗ بصیرت کے سامنے، ابھر کر آجاتے ہیں۔ [1]

رہا یہ فرمان پرویز، کہ ...... ''قرآن کا ترجمہ، کسی زبان میں نہیں ہوسکتا'' ......تو آخر اس کا یہ تقاضا کیونکر پیدا ہو گیا کہ الفاظ کے مسرفانہ اور مبذرانہ استعمال سے، ''مفہوم القرآن'' کے نام سے، بین القوسین الحاقی الفاظ کا اضافہ کرکے، تصریفِ آیات کی آڑ میں تحریفِ معانی کے ساتھ، اپنی ہر آن بدلتی ہوئی آراو قیاسات کا ملغوبہ پیش کیا جائے۔ اور اس سارے عمل کے دوران، دل و دماغ اور حواس و مشاعر پر یہی دھن سوار رہے کہ قرآن کو اشتراکیت کے معاشی نظام اور تمدنِ جدید کے جملہ عناصر کا حامی قرار دیا جائے تاکہ قرآن، ''قدامت پرست'' ہونے کے الزام سے بچ جائے اور ''جدید دور کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے'' کے قابل دکھائی دے سکے۔

یقیناً، قرآن کے بعض مفردات ایسے ہیں، جن کا ہو بہو مترادف، دوسری زبانوں میں ملنا ناممکن ہے، لیکن یہ مفردات، اپنے سیاق وسباق میں، دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر، ایسی ترجمانی کر ہی سکتے ہیں، جو حتی الامکان اقرب الی الصحت ہو، اور اسی بنا پر، قرآنی تعلیم کو عام کرنے کے لیے، دنیا کی ہر زبان میں عموماً، اور برصغیر کی زبانوں میں خصوصاً، ترجمہ کرنے کی مبارک کاوشیں کی گئی ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، محمود الحسن دیوبندی، احمد رضا بریلوی، اشرف علی تھانوی، عبدالماجد دریا آبادی، حافظ محمد جونا گڑھی، ثناء اللہ امرتسری، سید ابوالاعلیٰ مودودی، حافظ نذر احمد، حافظ صلاح الدین یوسف وغیرہم جیسے متعدد بزرگوں نے تراجم پیش کئے ہیں۔ دراصل، ان سادہ، صاف اور صریح تراجم سے، پرویز صاحب نے گریز کیا ہی اس لیے ہے کہ یہ تراجم، ان کے ذہنی مقاصد کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ لہٰذا انھیں، اپنے ذہنی افکار و معتقدات کی راہ نکالنے کے لیے، مفہوم القرآن کی آڑ میں، الفاظ کی بھرمار میں، یہ کوہ کنی کرنی پڑی۔ پھر یہ طرفہ تماشا بھی دیدنی ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ ''قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا''، لیکن دوسری طرف، اپنی مطلب برآری کے لیے، جب حوالوں کی ضرورت پڑتی ہے تو پھر انھی تراجم کی طرف رجوع بھی کیا جاتا ہے۔

اسلوب تفسیر کا تیسرا نکتہ

تیسرا نکتہ، الفاظ کے لغوی مفہوم سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

الفاظ کا لغوی مفہوم اسی حد تک دیا گیا ہے، جس حد تک آیت زیر نظر میں اس کی ضرورت ہے، باقی مفاہیم، لغات القرآن میں ملیں گے۔ [2]

پرویز صاحب نے لغوی مفہوم پیش کرتے ہوئے، جن ''پرویزی حیلوں'' سے کام لیا ہے، وہ ایک مستقل اور مبسوط کتاب

---

[1] مفہوم القرآن، جلد ۱، (سرورق) [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ل

ہی میں زیرِ جائزہ آسکتے ہیں۔ تاہم ضرورت کی حد تک محدود رہتے ہوئے، اس مقالہ کے مختلف مقامات پر بعض ان الفاظ کی لغوی حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے، جن میں، خود انھوں نے تحریفِ معانی کی ہے۔

اسلوب تفسیر کے بقیہ نکات

اسلوبِ تفسیر کے بقیہ نکات (۴ تا ۷) بلاتبصرہ پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نکات ایسے ہیں کہ وہ فی الواقع، اسلوبِ تفسیر سے غیر متعلق ہیں۔ مثلاً نکتہ نمبر ۵

(۴) جو آیات، کسی آیت کی تشریح میں تائیداً لکھی گئی ہیں، وہاں ان کا صرف ملخص بیان کیا گیا ہے، ان کی توضیح اور تشریح، اپنے مقام پر آئے گی۔

(۵) چونکہ میں قرآن کریم کے متعلق گزشتہ چالیس سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آ رہا ہوں، اس لیے اس تفسیر میں بہت سے ایسے امور سامنے آئیں گے جنھیں میں نے اپنی سابقہ تصانیف میں کہیں نہ کہیں بیان کیا ہوگا۔

(۶) اس تفسیر میں، ان غیر قرآنی معتقدات اور نظریات کی تردید خود بخود ہوتی گئی ہے، جو ہمارے ہاں عام طور پر، اسلام کے نام سے مروج ہیں، لیکن اس ضمن میں، میں نے کسی فرقہ کا نام لیا ہے، نہ شخصیتوں کا۔ بجز چند ایسے مقامات میں، جہاں ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اس سے ان فرقوں یا شخصیات کی کسی قسم کی تحقیر مقصود نہیں، ان کے خلافِ قرآن نظریات کی تردید مطلوب ہے۔

(۷) تفسیر کے ابواب، قرآنی تقسیم کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اس تفسیر کے مضامین کی تقسیم کے اعتبار سے ہیں۔ [1]

اصول تفسیر جن کی روشنی میں، یہ تفسیر لکھی گئی ہے

تفسیر قرآن کا اصل مقصد، لوگوں میں فہمِ قرآن پیدا کرنا، اور پھر اس کے سانچہ میں اپنی زندگی کو ڈھالنا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو تفسیرِ قرآن اور قرآن فہمی، دراصل، ایک ہی کرنسی نوٹ کے دو رخ ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ پرویز صاحب نے کسی مقام پر بھی، ان اصولوں کو یکجا کر کے بیان نہیں کیا جنھیں قرآن فہمی کے پیشِ نظر، اپنی تفسیر کے دوران ملحوظ رکھا ہو۔ البتہ، ان کی اولین کتاب، معارف القرآن جلد اول میں، جو مبسوط مقدمہ درج ہے، وہ قرآن فہمی یا تفسیر قرآن کے انھی اصولوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ مقدمہ، پرویز صاحب نے نہیں بلکہ ان کے استاد، جناب محمد اسلم جیراجپوری کا لکھا ہوا ہے۔ ان ہی اصولوں کی روشنی میں، جناب پرویز صاحب نے اپنی تفسیر کو مرتب کیا ہے۔ یہ اصول، درج ذیل ہیں۔

(۱) تفسیر قرآن بذریعہ قرآن

اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ

قرآن فہمی کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی جس حقیقت کی تفصیل مطلوب ہو، وہ قرآن ہی سے نکالی جائے، کیونکہ قرآن کی تفسیر، اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ل تا صفحہ م

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَه' (۱۹/۷۵) پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

قرآن نے تصریح کر دی ہے آیاتِ قرآنی بیشتر محکمات ہیں، یعنی ان کے معانی قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں جن کے حقائق، انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات، صفات، جنت، دوزخ اور میزانِ عمل وغیرہ، جس کو تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان، اس دنیا میں قاصر ہے۔ ان کے اوپر صرف ایمان کا مطالبہ ہے، نہ کہ عمل کا۔ اس وجہ سے ان کی تفصیل مطلوب نہیں ہے، البتہ محکم آیات، جوام الکتاب اور اصلِ قرآن کہی گئی ہیں ان کی تفصیلات، اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔ [1]

آگے چل کر، وہ لکھتے ہیں کہ

قرآنی آیات، جو اکثر بہ تبدیل الفاظ و عبارات، جا بجا الٹ پھیر کے بیان کی گئی ہیں، ان میں ان کی تشریح مضمر ہے۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۱۰۶/۶) اور اس طرح ہم آیتوں کو پھیر پھیر کے لاتے ہیں تاکہ وہ کہہ دیں کہ تو نے پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اہل علم کے لیے تشریح کر دیں۔

الغرض قرآن کریم کی تفصیل، خود قرآن ہی میں ہے، اور وہ مفصل کتاب ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۱۱۵/۶) اور وہی اللہ ہے جس نے تمھاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ [2]

(۲) تفسیر بالروایت سے مکمل اجتناب

قرآن کی تشریح میں، صاحبِ قرآن اور مہبطِ وحی ﷺ کے اقوال و اعمال کو دخیل نہ بنایا جائے، بلکہ ان سے مکمل اجتناب کیا جائے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

آیات کی تشریح میں، روایات سے مدد لی جا سکتی ہے، لیکن چونکہ روایات غیر یقینی اور ظنی ہیں، اس لیے ان پر تفسیر کا مدار نہیں رکھا جا سکتا۔ [3]

(۳) اختلافِ قراۃ سے مکمل گریز اور موجودہ قراۃ ہی سے اخذِ مسائل

اس اصول کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ

تفسیر بالروایت کی ایک شاخ، اختلافِ قراۃ بھی ہے یعنی بعض مفسرین نے، بعض آیات کے الفاظ میں شاذ قرائتوں سے اضافے کر لیے ہیں۔ [4]

آگے چل کر، وہ، بطور نتیجہ بحث، یہ فرماتے ہیں کہ

شاذ قرائتیں، قرآن میں اضافے ہیں، جو کسی طرح بھی تسلیم کے قابل نہیں، کیونکہ قرآن کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے اور وہ اس کے ایک ایک لفظ کا محافظ ہے۔ ہمارا ایمان اسی قرآن پر ہے جو بین الدفتین محفوظ ہے۔ [5]

---

[1] معارف القرآن، جلد ۱، (مقدمہ) صفحہ ۳۷

[2] + [3] معارف القرآن، مقدمہ، جلد ۱، صفحہ ۳۸

[4] + [5] معارف القرآن، جلد ۱، صفحہ ۳۹

(۴) الفاظِ قرآن کی حدود سے عدمِ تجاوز

وہ فرماتے ہیں کہ

قرآن کریم کے الفاظ، جس حد تک لے چلیں، اس سے آگے مطلق قدم نہ بڑھایا جائے، کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اپنے معنیٰ کے لحاظ سے کامل اور مقصود کے مطابق ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۱۱۶/۶) اور تیرے رب کے الفاظ، سچائی اور معنیٰ کی برابری کے لحاظ سے پورے ہیں۔

ان کلمات سے آگے بڑھنے میں، قرآنی حدود سے تجاوز لازمی ہے۔ جو بڑی غلطیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔ [۱]

(۵) الفاظِ قرآن کے وہی معانی جو مطابقِ زبان ہوں

اس اصول کی وضاحت یوں کی گئی ہے

جہاں تک زبان کا تعلق ہے، قرآن کی عربی آسان اور واضح ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۱۹۵/۲۶) واضح عربی زبان میں

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِىْ عِوَجٍ (۲۸/۳۹) عربی قرآن جس میں کوئی کجی نہیں۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ (۵۸/۴۴) ہم نے اس (قرآن) کو تمھاری زبان میں آسان کر دیا ہے

لہٰذا، الفاظ قرآن کے وہی معانی لیے جائیں گے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں۔ اہل لغت نے جو معانی الفاظ کے لکھے ہیں ان کی بنیاد سمع پر ہے۔ اور کتب لغت کی تدوین جس وقت ہوئی ہے۔ اس وقت تک بہت سے الفاظ کے معانی تفسیر وحدیث وفقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ وہی لغات میں درج ہوئے۔ اس لیے لغت مسلم ہے مگر وہ حتمی دلیل نہیں ہے۔ قرآنی الفاظ کے معانی میں اگر اختلاف واقع ہو تو خود قرآن سے ان کا تعین ہوسکتا ہے۔

اصول وقواعد لسانی کی ترتیب بھی نزول قرآن کے مدتوں بعد ہوئی ہے بلکہ ان کا بڑا حصہ ائمہ فن نے خود قرآن ہی سے استنباط کیا ہے۔ لہٰذا یہ اصول، قرآن پر حاکم نہیں ہوسکتے۔ اگر کوئی بات قرآن میں ان اصول کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہیے کہ جن لوگوں نے اصول استنباط کئے، ان سے کمی رہ گئی ہے۔ [۲]

(۶) تعارضِ قرآن کی اساس بننے والی تفسیر، نا قابل قبول ہے

اس کی وضاحت بایں الفاظ کی گئی ہے۔

ایک اہم اصول، قرآن فہمی کا یہ ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۸۲/۴) اگر یہ قرآن، اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا، تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس لیے کسی آیت کی ایسی تفسیر نہیں کی جاسکتی، جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو۔ [۳]

---

[۱] معارف القرآن، جلد۱، صفحہ ۳۹ [۲] معارف القرآن، جلد۱، صفحہ ۴۰ [۳] معارف القرآن، جلد۱، صفحہ ۴۰-۴۱

(۷) نسخِ آیات سے مکمل اجتناب

اس اصول کی وضاحت، صاحبِ مقدمہ نے ان الفاظ میں کی ہے۔

پہلے یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں نسخ کے عقیدہ نے بہت خرابیاں پیدا کی ہیں۔ [۱]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ

آیات کو جن لوگوں نے منسوخ کیا ہے، محض اپنی رائے اور قیاس سے کیا ہے، اور اللہ کا کلام اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ کسی انسان کی رائے سے منسوخ ہو سکے۔ خود رسول اللہ ﷺ کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ قرآن کے ایک لفظ کو بھی بدل سکیں۔ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ (۱۰/۱۵) کہہ دے کہ مجھے حق نہیں ہے کہ اس کو بدلوں، اپنی طرف سے۔ ان آیات کے متعلق، جن کو لوگوں نے منسوخ الحکم قرار دیا ہے، ہم کو یہ یقین ہے کہ وہ قرآن کی احکامی آیتیں ہیں، اللہ نے ان کو نازل فرمایا ہے اور رسول نے ان کو یاد کرایا اور قرآن میں لکھ دیا ہے۔ اب سوائے اللہ کے، دوسرا کون ان کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اگر کسی کو دو آیتوں میں باہمی تعارض نظر آتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک کو منسوخ قرار دیتا ہے تو یہ اس کی فہم کا قصور ہے کیونکہ قرآن نے تصریح کی ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے۔

قرآن کی آیات میں سے ایک بھی منسوخ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے روایات سے آیات کو منسوخ قرار دیا ہے، انھوں نے قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے۔ [۲]

یہ ہیں وہ سات اصولِ تفسیر، جن کو پیشِ نظر رکھ کر، پرویز صاحب نے اپنی تفسیر مطالب الفرقان کو مرتب کیا ہے آیئے! اب ہم ان اصولِ تفسیر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے، ان کا جائزہ لیں۔

جائزہ اصول اول (تفسیر القرآن بالقرآن)

یہ وہ اصل تفسیر ہے، جسے علمائے تفسیر نے ہمیشہ اولین اصلِ تفسیر قرار دے کر، اپنی تفاسیر میں ملحوظ رکھا ہے۔ لہٰذا، ایک متفق علیہ اصل ہونے کی بنا پر، یہ اس قابل نہیں کہ اس پر چنداں بحث کی جائے۔ لیکن علمی حیثیت سے فکر و نظر کا تفاوت، اور پیشِ نظر مقصود و ہدف کا تباین، اس اصلِ تفسیر کو غیر مؤثر بنا دیتا ہے۔ مثلاً ایک وہ شخص ہے جس کا تصورِ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ سے جدا نہیں ہے، اس کا قلب و ذہن، اسلامی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، وہ کسی بیرونی فلسفہ و فکر کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں مبتلا نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ایسا شخص، قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے، سب سے پہلے، یہی دیکھے گا کہ مسئلہ زیرِ نظر میں، خود قرآن، دیگر مقامات پر کیا کہتا ہے۔ اس طرح وہ قرآن کے کسی ایک مقام کی تفسیر کرتے ہوئے، دیگر مقامات سے صرفِ نظر نہیں کرے گا۔ لیکن اگر مسئلہ ایسا ہو کہ قرآن، اس بارے میں ساکت و صامت ہو، یا وہ اسے اجمالاً بیان کرتا ہو، یا وہ قرآن میں اس طرح مذکور ہو کہ پیغمبرِ خدا، اپنی خداداد بصیرت ہی کی بنیاد پر اسے پا سکتا ہو، اور کسی دوسرے غیر نبی شخص کی رسائی محض اس کی عقل و خرد کے

---

[۱] معارف القرآن، جلد ۱، صفحہ ۴۱ [۲] معارف القرآن، جلد ۱، صفحہ ۴۲

زور پر ناممکن ہو، تو ایسی صورت میں وہ یقیناً صاحبِ قرآن ہی کی اطاعت کرے گا، اور قرآن کے سکوت کے باعث، وہ نطقِ نبی ہی سے مسئلہ کا حل پائے گا، یا قرآنی اجمال کی تفصیل، صاحبِ قرآن ہی سے اخذ کرے گا، یا پیغمبر کی خداداد بصیرت سے، قرآن میں سے کئے ہوئے استخراج واستنباط کو قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔ وہ اسے ''خلافِ قرآن'' کہہ کر رد نہیں کرے گا۔ اور اپنے ''قیاس ورائے'' سے خود قرآن کی تفسیر کرنے نہیں بیٹھ جائے گا۔ اس کی بہترین مثال، ہمیں شخصیتِ عمرؓ میں ملتی ہے، جو ایک طرف اگر حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ کہتے ہیں، تو دوسری طرف، ان کا عمر بھر کا طرزِ عمل، وہ ہے، جسے، وہ خلیفۂ وقت کی حیثیت سے، ضابطۂ عدالت کے متعلق، کوفہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، قاضی شریح کے نام، اپنے ایک خط میں بایں الفاظ بیان کرتے ہیں۔

> اگر تم کوئی حکم، کتاب اللہ میں پاؤ، تو اس کے مطابق فیصلہ کردو، اور اس کی موجودگی میں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کرو، اور اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم، کتاب اللہ میں نہ ہو تو سنتِ رسول اللہ میں، جو حکم ملے، اس پر فیصلہ کرو، اور اگر معاملہ ایسا ہو جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ ہی سنتِ رسول اللہ میں، تو اس کا فیصلہ اس قانون کے مطابق کرو جس پر اجماع ہو چکا ہو، لیکن اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ، دونوں خاموش ہوں اور تم سے پہلے، اس کے متعلق کوئی اجماعی فیصلہ نہ ہوا ہو تو تمہیں اختیار ہے کہ یا تو پیش قدمی کر کے، اپنی اجتہادی رائے سے فیصلہ کردو، یا پھر ٹھہر کر انتظار کرو (کہ اس معاملہ میں کوئی اجماعی فیصلہ ہو جائے)، اور میرے نزدیک، تمہارا انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ (اعلام الموقعین، جلد ا، صفحہ ۶۱-۶۲) [1]

اس کے برعکس، دوسرا وہ شخص ہے، جس کا تصورِ کتاب اللہ، سنتِ رسول سے قطعی الگ اور یکسر جدا ہے۔ وہ خود بیرونی افکار ونظریات اور خارجی تہذیب وثقافت کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں مبتلا ہے، اس کے قلب ودماغ کی خاک، اسلام کے خمیر سے نہیں اٹھی، ایسا آدمی، جب حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ کہے گا، تو اس کا تصورِ کتاب اللہ، محض ''قرآن بلا محمدؐ'' اور ''تعلیم بلا معلم'' کے نظریہ پر استوار ہوگا۔ اس کے نزدیک، منصب رسالت، اس ڈاکیئے کے منصب سے کچھ بھی مختلف نہیں ہوگا جس کا فرض منصبی محض خطوط کو مکتوب الیہ تک پہنچا دینے تک ہی محدود ہے۔ ایسا شخص خدا کے رسول کی تشریحات وتوضیحات کو قبول کرنے کی بجائے، خود اپنی قیاسی تشریح ووضاحت پیش کرے گا، جو بہر حال، ان افکار ونظریات کے زیر اثر ہوگی جو فکری اسیری میں مبتلا ہونے کے باعث، اس کے قلب وذہن پر حاوی ہوں گے۔ اس کی بہترین مثال، ماضی کے معتزلہ اور جدید دور کے ماڈرنزم (Modernism) کا شکار، وہ لوگ ہیں، جن کی برصغیر میں ابتداء، سرسید کی ذات سے ہوئی، اور پھر یہ فتنہ پھیلتا اور آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس کی مسند پیشوائیت، پرویز صاحب کے حصہ میں آئی۔ یہ سب لوگ، دراصل، تہذیبِ مغرب کے فلسفہ وفکر اور ان کے تمدن کی چکا چوند سے مسحور ومرعوب ہیں جس کی وجہ سے، جب یہ لوگ، حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ کہتے ہیں، تو اگرچہ قولاً یہ لوگ، حضرت عمرؓ کی موافقت کرتے ہیں، لیکن عملاً ان کی راہ، ان سے جدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح، تفسیر قرآن کا زیر بحث اصول، ایسا ہے کہ لفظاً اور قولاً تو پرویز صاحب اور علمائے امت متفق ہیں، لیکن جونہی عملاً تفسیر کی راہ اختیار کی جاتی ہے، تو دونوں فریقوں کے قلب وذہن کا تفاوت وتباین آڑے آتا ہے اور ان کے راستے مختلف ہو جاتے ہیں۔

---

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۱۶-۱۱۷

جائزہ اصولِ ثانی (تفسیر بالروایہ سے احتراز)

یہ ایک ایسا اصول ہے جس کا سلف وخلف میں سے، کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ الفاظ کی حد تک، یہ اصول، خواہ کتنا ہی دلکش اور جاذب نظر ہو، لیکن اس کا عملی نتیجہ، اس کے سوا کچھ نہیں کہ نبی معصوم کی تشریحِ قرآن کو رد کیا جائے، اور غیر معصوم شخص کی قیاسی رائے پر مبنی تفسیر کو، محض اس لیے قبول کر لیا جائے کہ وہ قرآن کا نام لے کر، اسے پیش کر رہا ہے۔ کیا یہ عجب بات نہیں کہ جس ہستی پر قرآن نازل ہوا ہے، اس کی توضیح وتفصیل کو تو نہ مانا جائے مگر جو شخص، غیر نبی ہو، اور رسول کا امتی ہو، تو اس کی ظن وتخمین پر مبنی تفسیر کو صرف اس لیے قبول کر لیا جائے کہ وہ اسے ''قرآن کے نام پر'' پیش کر رہا ہے۔

پھر روایات کے بارے میں، یہ نقطۂ نظر بھی قطعی باطل ہے کہ جملہ روایات کو (جن میں بہر حال، متواتر روایات بھی شامل ہیں) غیر یقینی اور ظنی قرار دیا جائے، اور سب کو اندھے کی لاٹھی کے حکم پر رکھ لیا جائے، حالانکہ متواترات کے قطعی اور یقینی ہونے میں، کوئی ایسا شخص، اختلاف نہیں کر سکتا، جو خدا پرست ہونے کی حیثیت سے، اطاعتِ رسول کا دم بھرنے والا ہو۔ یہ وہ چیز ہے جس کا اقرار، خود، طلوعِ اسلام کو بھی کرتے ہی بنی۔

> کوئی خبر (حدیث، روایت وغیرہ) اس وقت تک یقینی شکل اختیار نہیں کر سکتی، جب تک اس خبر کو تم نے بذاتِ خود، آنحضرت ﷺ سے نہ سنا ہو یا پھر وہ تمھارے پاس ایسے ذرائع سے پہنچے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کا احتمال تک نہ ہو، اور یہ ذریعہ، تواتر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ہمارے اور آنحضرت ﷺ کے درمیان، اس قدر طویل زمانہ گزرنے کے بعد، اب ''متواترات'' کے علاوہ کوئی دوسرا سرچشمۂ یقین نہیں ہے، اور متواترات میں بھی، وہ تواتر جس میں کسی ایک شخص نے بھی اختلاف نہ کیا ہو۔[1]

اور متواترات کے اتباع سے، خود پرویز صاحب بھی خلاصی نہ پا سکے اور انھیں یہ اعلان کرنا پڑا کہ

> جہاں تک اتباعِ سنتِ رسول اللہ کا تعلق ہے، بحالاتِ موجودہ، اس کی عملی شکل یہی ہے جس پر کاربند رہنے کی تاکید ہمارے علمائے کرام کرتے ہیں کہ نماز، روزہ وغیرہ ارکانِ اسلام کی ادائیگی اسی شکل میں کی جائے، جو شکل یا شکلیں، امت میں متواتر چلی آ رہی ہیں۔ میں خود بھی اس کا اتباع کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی اسی کا اتباع کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔[2]

الغرض، اتباعِ متواترات سے صرف وہی شخص، انکار کر سکتا ہے، جو خدا پرست ہونے کی بجائے ہوا پرست ہو، اور اطاعت رسول ؐ کی بجائے، پیرویٔ نفس کا خوگر ہو، اور فضائے دماغی میں، اٹھنے والی ہر لہر سے اس کا قبلۂ مقصود بدل جاتا ہو، اور پھر ذہن کی اس تغیر پذیری سے، قرآنی حقائق بھی تغیر وتبدل،...... بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بھی...... مسخ وتحریف کا نشانہ بن جاتے ہوں۔

قرآن کریم سے نبی اکرم ﷺ کا جو بھی تعلق مانا جائے، قرآن کی تشریح وتوضیح میں، آپ ؐ کی پیش کردہ تفسیر و تفصیل کو قبول کیے بغیر، کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ قرآن کریم کے ساتھ، آپ ؐ کا ایک تعلق تو (معاذ اللہ) کتاب اور مصنفِ

---

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۳ [2] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۴ء، صفحہ ۴۳

کتاب کا تعلق ہو سکتا ہے، اگر اس تعلق ہی کو مان لیا جائے، جیسا کہ کفار عرب گمان کیا کرتے تھے، تو بھی مصنفِ کتاب کے مقابل، کسی اور کی تشریح و تفسیر قابل قبول نہیں ہو سکتی، لیکن اگر آپؐ کو رسول اللہ مان کر، قرآن کو آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب تسلیم کیا جائے، تب بھی، آپؐ کی توضیح و تفسیر کے بالمقابل، کسی اور نبی یا رسول کی تشریح و وضاحت بھی قابل قبول قرار نہیں پا سکتی کجا یہ کہ کسی غیر نبی کی تفسیر و توضیح کو شرفِ قبولیت سے نوازا جائے، بالخصوص، جبکہ خود، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی تشریح و تفسیر کو، آپؐ کے منصب رسالت کا تقاضا بھی قرار دیا ہو، جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے۔

وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ (النحل ۴۴) ہم نے یہ ذکر اس لیے تیری طرف اتارا ہے تاکہ تو لوگوں کے لیے اس کی وضاحت کر دے

الغرض، سنتِ نبوی سے گریز کرتے ہوئے تفسیر قرآن کو کسی بشری قیاس و گمان پر استوار کرنا، عقلاً، شرعاً، عرفاً، اخلاقاً کسی طرح بھی درست نہیں۔

جائزہ اصولِ ثالث (اختلاف قرأۃ سے مکمل گریز)

علمائے اہل اسلام نے بالعموم اور علمائے برصغیر نے بالخصوص، موجودہ قرأۃ ہی سے اخذ مسائل کیا ہے۔ تفاسیر میں اختلافِ قرأۃ کا تذکرہ، خال خال ہی ملتا ہے، اور وہ بھی صرف علمی اور فکری حیثیت سے۔ جہاں تک عملی حیثیت کا تعلق ہے، شاید ہی کسی عالم نے، اختلافِ قرأۃ کو، اخذ مسائل کی اساس بنایا ہو، الا یہ کہ کوئی گمراہ فرد یا فرقہ، اپنی خواہش پرستی کی خاطر، اختلافِ قراءۃ سے، ناجائز فائدہ اٹھانے کا متمنی ہو۔ ایسے لوگوں کی بات، امت میں، نہ پہلے چل سکی ہے، اور نہ اب یا آئندہ چل سکے گی۔ تاہم بعض اوقات، یہ اختلاف، مفہومِ قرآن میں وسعت بھی پیدا کرتا ہے جسے کسی صورت میں معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خود ہم نے بھی، اس پورے مقالہ میں، فکر پرویز کا جائزہ، قرآن کریم کی اسی متداول قرأۃ ہی کی بنیاد پر لیا ہے۔

جائزۂ اصولِ رابع (حدودِ الفاظِ قرآن سے عدم تجاوز)

علمائے تفسیر نے اس اصول کی بھی ہمیشہ پاسداری کی ہے، لیکن خود "مفکر قرآن" نے اکثر و بیشتر مقامات پر، اسے نظر انداز کرتے ہوئے، قرآنی الفاظ کی حدود سے تجاوز کیا ہے، پورے مقالہ میں، اس کی بہت سی مثالیں پیش کی گئی ہیں، تاہم، فوری حوالے کے پیشِ نظر، صرف ایک مثال پیشِ خدمت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الانفال ۴۱) تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت، تم نے حاصل کیا ہے، اس کا پانچواں حصہ، اللہ اور اس کے رسول، اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

لیکن "مفکر قرآن" صاحب، قواعدِ زبان کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے بھی، اور الفاظِ قرآن کی حدود سے تجاوز کرتے

ہوئے بھی، مفہوم آیت یوں بیان کرتے ہیں۔

...... یادرکھو! میدانِ جنگ میں، جو مالِ غنیمت بھی ملے گا، اس میں پانچواں حصہ ''خدا اور رسول''......یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات...... کے لیے رکھ کر، باقی، ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں، صرف کیا جائے گا......مثلاً (میدان جنگ میں جانے والوں، اور کام آجانے والوں کے) اقربا کے لیے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یار ومددگار تنہا رہ جانے والوں کے لیے، ان کے لیے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو، یا جو کسی حادثے کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں۔ نیز ان مسافروں کے لیے، جو مدد کے محتاج ہوں۔ [1]

مال غنیمت کا پورا ایک خمس، ان سب کے لیے ہے، جن کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' قواعدِ زبانِ عربی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اور قرآنی حدود سے آگے بڑھتے ہوئے، پورے ایک خمس کو ''اللہ اور رسول'' کے لیے وقف کرتے ہیں، جو مملکت کی انتظامی ضروریات کے لیے ہوگا، اور باقی کے چار اخماس، حدودِ الفاظِ قرآن سے تجاوز کی بنا پر، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے وقف کرتے ہیں۔ حالانکہ تمام مذکورینِ آیت، لِلّٰہِ میں موجود حرف جار لام (جس کا اعادہ لِلرَّسُوْلِ میں بھی کیا گیا ہے) ہی کے تابع آتے ہیں، جس کا مفاد یہ ہے کہ ان سب کے لیے ایک خمس ہی مخصوص ہے۔

ایک زمانہ تھا، جب کہ پرویز صاحب، خود بھی، آیت کا یہی مفہوم پیش کیا کرتے تھے، جیسا کہ درج ذیل عبارت سے واضح ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اور جان رکھو! جو تمہیں مال غنیمت میں ملے، اس کا پانچواں حصہ، اللہ کے لیے، رسول کے لیے، (رسول کے) قرابتداروں کے لیے، یتیموں کے لیے، مسکینوں کے لیے، اور مسافروں کے لیے نکالنا چاہیے۔ [2]

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ مرورِ ایام کے ساتھ، فضائے دماغی میں، ہر نئی لہر کے اٹھتے ہی، کس طرح قرآنی آیات کے، ترجمے اور مفہوم بدل جایا کرتے تھے۔

جائزہ کا اصولِ خامس (دورِ نزولِ قرآن ہی کے معانی کا اعتبار کرنا)

اس اصول پر بھی علمائے تفسیر، ہمیشہ سے کاربند رہے ہیں، لیکن پرویز صاحب، اپنے شوقِ جدت طرازی میں، اسے گلدستۂ طاقِ نسیان بناتے رہے ہیں، اور ساتھ ہی، اس اصول سے وابستہ رہنے کی تلقین بھی، بڑی بلند آہنگی کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ تو ہمیشہ یہ رہا کہ وہ، قرآنی مفردات میں، دورِ نزولِ قرآن کے مفاہیم کو داخل کرنا چاہتے ہیں، لیکن عملاً، ان کا رویہ یہ رہا کہ دورِ حاضر کے چلتے ہوئے، دونوں معاشی نظاموں (اشتراکیت اور نظامِ سرمایہ داری) میں سے ایک کی حمایت و ہمنوائی میں اور دوسرے کی مخالفت و عداوت میں، قرآنی مفردات میں ایسے دور خیز معانی اور تصورات داخل کر دیے، جن کا

[1] مفہوم القرآن (۴۱/۸)، صفحہ ۴۰۴ [2] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۶۲۴

دورِ نزولِ قرآن کے معانی سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کی بہت سی مثالیں اگرچہ مقالے میں، مختلف مقامات پر موجود ہیں، لیکن پھر بھی فوری حوالے کے لیے، صرف ایک مثال، نذر قارئین کی جاتی ہے۔

قرآن کریم میں، ایک لفظ ...... مُتْرَفِيْنَ...... بکثرت استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ''خوشحال، صاحبِ ثروت اور آسودہ حال لوگ'' ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ اخلاقی طور پر، یہ لوگ، قابلِ تعریف اور نیک ہوں، یا قابلِ مذمت اور بدکردار ہوں، خود پرویز صاحب نے، اس لفظ کو، انھی معانی میں استعمال کیا تھا، اور قرآنی آیات کے تراجم میں، اس لفظ کے یہی معانی بیان کئے تھے۔ لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے، جب ان کا قلب و دماغ عجلِ اشتراکیت کی محبت کی آماجگاہ نہ بنا تھا۔ وہ آیتِ درج ذیل میں واقع لفظ مُتْرَفِيْنَ کا ترجمہ نہایت درست کیا کرتے تھے۔

> وَمَآ أَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴) اور ہم نے جس بستی میں بھی کسی ڈرانے والے (رسول) کو بھیجا، وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو ان احکام (کے ماننے) سے انکار کرتے ہیں، جو تمہیں دے کر بھیجے گئے ہیں۔ [1]

لیکن پرویز صاحب جب، لیلائے اشتراکیت پر فریفتہ ہوئے، تو جس قدر اشتراکیت سے ان کی فریفتگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اسی قدر نظام سرمایہ داری سے ان کا بغض و عناد فزوں تر ہوتا چلا گیا، جس نسبت سے حُبِّ اشتراکیت اور بغضِ سرمایہ داری میں اضافہ ہوا، اسی نسبت سے درجہ بدرجہ قرآنی الفاظ کے مفہوم میں بھی تغیر واقع ہوا، چنانچہ اشتراکیت کی شدید محبت اور سرمایہ داری سے سخت نفرت کے باعث، اب مترفین کے معنیٰ و مفہوم میں، ''دوسروں کی کمائی پر خوش حال ہونے اور تن آسان'' ہونے کا رنگ بھی پیدا ہو گیا چنانچہ وہ ''مترفین کے دو گروہ'' کے زیر عنوان، اس کی یہ تشریح کرتے ہیں۔

> قرآن نے ان دونوں کو مترفین کہہ کر پکارا ہے، یعنی وہ لوگ، جو دوسروں کی کمائی پر خوشحالی اور تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ [2]

''مفکرِ قرآن'' کے عشقِ اشتراکیت اور بغضِ سرمایہ داری، میں مزید سختی پیدا ہوئی تو، دوسری منزل کے معانی میں اور شدت اور غلظت پیدا ہوگئی۔ اس طرح، تیسرے مرحلے میں، اب اس لفظ کے مفہوم میں، اضافۂ شدت اور غلظت کے باعث، ''مزدور کی محنت اور دولت کے غاصب'' بننے کا معنیٰ بھی داخل ہو گیا جبکہ ''تن آسان'' ہونے کا مفہوم تو دوسری منزل ہی میں، اس لفظ میں سرایت کر چکا تھا۔ چنانچہ اب مترفین کی تعریف یہ قرار پائی۔

> مُتْرِفِيْنَ جو لوگ خود محنت نہیں کرتے بلکہ (اپنے سرمایہ کے زور پر) دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کر لیتے، اور اس طرح تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں، قرآن کریم انھیں مترفین کہہ کر پکارتا ہے۔ [3]

اب اگلی منزل میں مترفین کے معنیٰ ''سرمایہ دار طبقہ'' ہو جاتا ہے، چنانچہ، ایک آیت کا ترجمہ، بایں الفاظ کیا جاتا ہے۔

> اگر آپ کو اب بھی کسی قولِ فیصل کا انتظار ہے تو اسے بھی سُن لیجیے، جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے لوگ

---

[1] معارف القرآن، جلد ۱، صفحہ ۱۱۶ [2] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۲، صفحہ ۲۷

[3] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۶، صفحہ ۲۵

چیخ چلا رہے ہیں، پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور انھوں نے کیا جرم کیا تھا جو اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟

اِنَّھُمْ کَانُوا قَبْلَ ذَالِکَ مُتْرَفِیْنَ (۵۶/۴۵) یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔ ۱

اس ایک مثال ہی سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے اپنی لغات القرآن میں، قرآنی الفاظ کے وہی معانی بیان کئے ہیں جو دورِ نزولِ قرآن میں مستعمل تھے؟ یا چودہ صدیاں پیشتر کے نازل شدہ الفاظ میں، دورِ جدید کے معاشی نظاموں میں سے کسی نظام کی حد سے بڑھی حمایت وہمنوائی اور کسی دوسرے نظام کی مبالغہ آمیز نفرت وعداوت کے زیر اثر، جدید مفاہیم کو سمویا ہے؟

پھر یہ بھی کیا عجب ستم ظریفی ہے کہ ''مفکر قرآن'' قرآنی الفاظ میں، چودہ صدیوں کے بعد ''عجمی تصورات'' کو داخل کرتے ہوئے، اپنی آنکھ کے شہتیر کو تو دیکھتے نہیں ہیں، مگر دوسروں کی آنکھ کا تنکا انھیں خوب نظر آتا ہے، اور جو کچھ، وہ خود کرتے ہیں، ٹھیک، اسی کو وہ عیب قرار دے کر، اسے، دوسروں کے کھاتے میں ڈالتے ہیں، اور حقائق کو مسخ کرتے ہیں، علمائے حدیث و تفسیر، فاضلینِ تفسیر وتاریخ، اور جامعینِ کتبِ لغات کے متعلق، یہ ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے، کہ

ان لوگوں کے قلم سے جو کچھ نکلا، اس کے الفاظ تو عربی تھے لیکن ان الفاظ کے پیکروں میں تصورات عجمی تھے، یوں عربی زبان، تصنیف اور تالیف کے پہلے دور میں ہی، غیر عربی تصورات کی حامل بن گئی۔ ۲

اس کے علاوہ، ان حضرات کا ایک اور ''عیب'' بطور ایک ''عجیب ماجرا'' کے، یوں بیان کیا ہے۔

اس کے ساتھ، یہ بھی عجیب ماجرا ہے کہ جن حضرات نے یہ کتابیں مرتب کیں وہ (باستثنائے معدودے چند) سب غیر عرب (یعنی عجمی) تھے۔ یہی کتابیں عربی زبان کا اولین سرمایہ ہیں۔ ۳

اب یہ اللہ تعالیٰ کا کس قدر احسان ہے کہ چودہ صدیوں کے بعد، اس نے بٹالہ ضلع گورداسپور کے ''خالص عرب'' علاقے میں، ایک ''مفکر قرآن'' پیدا فرمایا، جو پیدائشی عرب ہے، اور جس پر گویا عجمیت کی پرچھائیں تک نہیں پڑی (جبکہ عباسی دور کے جملہ علمائے تفسیر وحدیث وسیر وتاریخ وکتبِ لغات کے مؤلفین'' باستثنائے معدودے چند'' سب غیر عرب یعنی عجمی تھے)، پھر اس مفکر قرآن نے عربی زبان ہی میں لغات القرآن لکھی، اور ایسا کرنے سے پہلے، عربی زبان سیکھی بھی، تو عرب کے ان بدوؤں سے، جن کے متعلق، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ

قرآن سمجھنا چاہتے ہو، تو صحرا کے بدوؤں میں جا کر کچھ دن گذارو، کیونکہ جس زبان میں، قرآن نازل ہوا ہے، وہ زبان، ان کے ہاں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ ۴

سچ ہے۔ ''عربی مفکر قرآن'' اور پھر ''عربی لغات القرآن'' .... فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

جائزہ اصول سادس (تعارض قرآن کی اساس بننے والی تفسیر کا ناقابل قبول ہونا)

اس اصول کو بھی علمائے تفسیر نے، ہر دور میں ملحوظ رکھا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ کسی بھی آیت کی تفسیر،

۱ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۶۳ ۲ + ۳ لغات القرآن، پیش لفظ، صفحہ ۸ ۴ لغات القرآن، پیش لفظ، صفحہ ۱۴

کسی دوسری آیت کی تفسیر سے متصادم اور متعارض نہ ہونے پائے، لیکن یہ بات، باعثِ حیرت ہے، کہ خود، ان کی تفسیر تعارضِ قرآن کی اساس بنتی رہی ہے، فوری حوالے کے پیشِ نظر، صرف ایک مثال پیشِ خدمت ہے (جبکہ متعدد امثلہ پورے مقالے میں جگہ جگہ مذکور ہیں)، افرادِ معاشرہ کی انفرادی ملکیت کے متعلق، پرویز صاحب، بڑی بلند آہنگی سے یہ فرماتے ہیں کہ

> قرآن کریم کے معاشی نظام، میں، نہ کسی کے پاس فاضلہ مال و دولت یا جائیدادیں ہوں گی اور نہ ہی ان کی (Disposal) کے متعلق سوالات پیدا ہوں گے، اگر کسی کا کوئی ترکہ ہوگا تو وہ ان اشیائے مستعملہ تک محدود ہوگا جنھیں حکومت نے ذاتی ملکیت میں رکھنے کی اجازت دے رکھی ہوگی۔ [۱]

ایک اور مقام پر، وہ ہر نوع کے سامانِ رزق کی ذاتی ملکیت کی نفی، ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> سامانِ رزق..... خواہ وہ زمین کے باہر ہو یا زمین کے اندر..... کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کی ذاتی ملکیت نہیں، اس کا حقِ ملکیت، صرف خدا کو حاصل ہے۔ [۲]

مال و دولت کی ملکیت کی نفی کا تصور، قرآنی الفاظ، قُلِ الْعَفْوُ سے کشید کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

> سورۃ البقرہ میں ہے وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ (۲: ۲۱۹) اے رسول! تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لیے دیں؟ قُلِ الْعَفْوُ کہہ دو کہ جسقدر تمھاری ضروریات سے زائد ہے، وہ سب کا سب''۔ اس طرح، قرآن کریم نے فاضلہ دولت کا وجود ختم کر دیا جو نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ [۳]

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۹ سے تو، ذاتی ملکیت کی نفی کا معاشی اصول برآمد کیا گیا، لیکن ایک دوسری آیت (سورۃ النساء، آیت ۳۲) سے، ملکیتِ مال و دولت کا اثبات کیا گیا، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

> **عورتوں کے حقوقِ ملکیت** ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلے میں، اس غلط تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ حقوقِ ملکیت، مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں ہوتے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے (۴: ۷)، عورت اپنے مال اور جائیداد کی آپ مالک ہوتی ہے۔ اس طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا، مردوں کا کام ہے، عورتیں ایسا نہیں کر سکتیں۔ مرد اور عورتیں سب اکتسابِ رزق کر سکتے ہیں۔ جو کچھ مرد کمائے، وہ اس کا حصہ ہے، جو عورت کمائے، وہ اس کا حصہ ہے۔ [۴]

یہ تفسیرِ قرآن میں صریح تعارض و تضاد ہے کہ ایک آیت سے ذاتی ملکیت کی نفی کا معاشی اصول اخذ کیا جائے اور دوسری آیت سے، اس کے بالکل برعکس، ملکیتِ مال کا اثبات کشید کیا جائے، لیکن یہ صرف ایک مثال ہے، جو فوری حوالہ کے پیشِ نظر دی گئی ہے، ورنہ اگر تفسیر سے ہٹ کر، محض آیات کے ترجمہ و مفہوم ہی پر نظر ڈالی جائے، تو تضادات و تعارضات کا ایک وسیع خارزار سامنے آئے گا۔

۱۔ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۴
۲۔ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۱۰۷
۳۔ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۶
۴۔ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۳۱۷

جائزہ اصولِ سابع (نظریہ نسخ آیات سے مکمل اجتناب)

مسئلہ نسخ آیات، ہمیشہ سے ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر مانا جاتا رہا ہے اس کا انکار، سوائے معتزلہ کے، اور کسی نے نہیں کیا۔ آج کے دور میں منکرین حدیث میں سے، پرویز صاحب نے بڑے شد و مد سے وجود نسخ کا انکار کیا ہے، لیکن، ان کا یہ انکار بھی لفظی حد تک ہے۔ جہاں تک تصورِ نسخ کی حقیقت کا تعلق ہے، وہ خود بھی اس کا انکار نہیں کر پائے۔ وہ قرآن کریم کی ان آیات کو، جو نئے احکام کے نزول کے باعث، بعد کے دور میں، قابلِ عمل نہیں رہ جاتی ہیں، منسوخ آیات کے نام سے قبول کرنے کی بجائے، ''عبوری دور کے احکام'' کے نام سے تسلیم کرتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی شے کی حقیقت محض اُس کا نام بدل دینے سے نہیں بدل جاتی، جیسا کہ خود پرویز صاحب کہا کرتے تھے کہ

> نام بدل دینے سے کسی شے کی حقیقت اور ماہیت تو نہیں بدل جاتی [1]
>
> جس طرح، لادینی کا نام، سیکولرزم رکھ دینے سے ''خدا پرستی'' نہیں آ سکتی، اسی طرح زارِ روس کا نام، مزدوروں کا ڈکٹیٹر رکھ دینے سے، ملوکیت کا استبداد نہیں ہو جاتا۔ [2]

لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت کا نام ''نظام ربوبیت'' رکھ دینے سے، باطل، باطل ہی رہتا ہے، حق نہیں بن جاتا ہے اور نام کی یہ تبدیلی، اشتراکیت کی حقیقت اور ماہیت کو نہیں بدل سکتی، اور نہ ہی ''نسخ آیات'' کی حقیقت کو ''عبوری دور کے احکام'' کا نام دینے سے، تبدیلیٔ حقیقت یا قلبِ ماہیت واقع ہوتی ہے۔ تو ہماری یہ بات، ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال، نسخ آیات پر تفصیلی بحث بھی، اس مقالے میں شامل ہے۔

مفسّر کی ضروری صفات اور ذاتِ پرویز میں ان کا تحقق

مفسر کے لیے، علمائے تفسیر نے بہت سی صفات بلکہ شرائط کا تذکرہ کیا ہے، جن کا ایک مفسر میں پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن پرویز صاحب اور ان کے ہمنوا، ان صفات و شرائط کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، چنانچہ محمد اسلم جیراجپوری صاحب، جو پرویز صاحب کے استاد تھے، فرماتے ہیں کہ

> **شرائطِ تفسیر** متاخرین نے مفسر کے لیے کم از کم پندرہ علوم جاننے کی شرط لگائی ہے۔ لغت، اشتقاق، صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، قرأت، کلام (اصول دین)، اصولِ فقہ، اسبابِ نزول، قصص، ناسخ و منسوخ، فقہ اور حدیث۔
>
> لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ یہ تمام علوم مسلمانوں میں، دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں رائج ہوئے ہیں، جس سے پہلے ہی قرآن کریم کو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ صحیح اور بہتر طریقہ سے سمجھتے رہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان علوم مشروطہ کا ماٰخذ خود قرآن ہے، اسی سے علما نے ان کو نکالا ہے، پھر یہ فہم قرآن کے لیے شرط کیونکر قرار دیے جا سکتے ہیں۔ غالباً ان لوگوں کا مقصد، جنھوں نے ان علوم کو شرط گردانا ہے، یہ ہوگا کہ ان سے فہم قرآن میں مدد ملتی ہے، ورنہ ان میں سے اکثر تو قیاسی علوم ہیں، جن

---

[1] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۳ [2] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۲ء، صفحہ ۵

میں غلطی کے پہلو بھی نکل آتے ہیں، چنانچہ وہ مفسرین، جن کی تفسیروں کو علما نے قابلِ اعتراض قرار دیا ہے، نہ صرف یہ کہ ان علوم سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اپنی تفسیروں میں، ان کے اصولوں کو مرعی بھی رکھتے تھے۔ [1]

یہ اقتباس، چند در چند غلط فہمیوں پر مشتمل ہے، یہ کہنا کہ ...... ''یہ علوم، دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں رائج ہوئے ہیں'' ......حقیقتِ واقعہ کی قطعی غلط تعبیر ہے، یہ علوم، پہلے ہی، حتّٰی کہ قبل از اسلام، دور جاہلیت میں بھی رائج تھے، اور شعرائے عرب، اپنے اشعار وکلام میں، ان علوم سے استفادہ کیا کرتے تھے، اور قرآن، چونکہ خود کلامِ خداوندی کی حیثیت میں، ان کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا، اس لیے اس میں انداز واُسلوب، وہ اختیار کیا گیا، جو انھی علوم پر استوار، اور خود اہل زبان کے ہاں معروف ومتعارف تھا۔ البتہ ان علوم کی تدوین کے وقت، اختلاف کی صورت میں، حتمی اور آخری فیصلہ، قرآن کریم کی اساس پر کیا جاتا تھا۔ جو کلامِ خداوندی ہونے کی جہت سے سند وحجت کا حامل تھا۔ دوسری یا تیسری صدی میں یہ علوم رائج نہیں ہوئے تھے بلکہ کتابی شکل میں باضابطہ طور پر مدون ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ، تدوین سے قبل، خود صحابہؓ وتابعین کو بھی یہ علوم از بر تھے۔ جس پر رسول اللہ اور صحابہ کرامؓ کی تعلیم اور صحبت نے، سونے پہ سہاگے کا کام کیا اور نتیجتاً یہ لوگ قرآن کو صحیح اور بہتر سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ رہے وہ مفسرین جن کی تفاسیر کو قابلِ اعتراض قرار دیا گیا ہے، تو ان پر یہ اعتراض، قطعاً نہیں ہے کہ وہ ان علوم سے بے بہرہ تھے، ان کی تفاسیر کا معرضِ اعتراض میں آنا، بعض دیگر وجوہ کی بنا پر ہے۔ اگر صاحب مقدمہ ان قابل اعتراض تفاسیر کا حوالہ دے دیتے تو ہم فرداً فرداً ان کے وجوہ اعتراض کی وضاحت کر دیتے، تاہم اجمالاً وجہ اعتراض، صاحب تفسیر کا، فکری بگاڑ، یا اسرائیلیات سے اس کی دلچسپی، یا بے جا فلسفیانہ موشگافیاں، یا تفصیل واطناب میں اصل تفسیری مقصد سے دور خیزی وغیرہ میں سے کوئی ایک بھی ممکن ہے۔

تین ناگزیر صفات وشرائط

مفسر کے لیے، علمائے تفسیر کی بیان کردہ صفات وشرائط میں سے آپ جس کا جی چاہے، انکار کر ڈالیں، لیکن تین شرائط ایسی ہیں، جن کا انکار عقلاً، عرفاً ممکن نہیں ہے، اور یہ درج ذیل ہیں۔

(۱) صحت عقائد (۲) عربی زبان پر عبور ومہارت (۳) تقوی اور امانت ودیانت

شرط اول - صحتِ عقائد اور سلامتی فکر

مفسر قرآن کے لیے از حد ضروری ہے کہ وہ صحت عقائد اور سلامتی فکر کا حامل ہو، کیونکہ عقیدہ براہ راست، صاحب عقیدہ کے طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتا ہے، اور فسادِ عقیدہ اسے نصوص کی تحریف اور نقل اخبار میں خیانت پر ابھارتا ہے۔ اس طرح بسا اوقات وہ زبان سے تو، حق کی شہادت دیتا ہے، مگر اس کا پورا طرزِ عمل، باطل کا حامی اور طرف دار ہوتا ہے، نتیجتاً وہ راہ راست کی پیروی

[1] معارف القرآن، جلد ا، مقدمہ صفحہ ۲۹

میں، خود اپنے لیے بھی رکاوٹ پیدا کرتا ہے، اور دوسروں کو بھی غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ پر دھکیل دیتا ہے۔

ذاتِ پرویز میں اس شرط کا تحقّق

اسلام کے پانچوں ایمانیات (اللہ، رسول، کتاب، ملائکہ اور آخرت کے عقائد)، پر اگرچہ، پرویز صاحب، ایمان کے مدّعی ہیں، مگر اس ایمان کی کیفیت، اس دودھ کی سی ہے، جس میں دہی کے چند چھینٹے ڈال دیے گئے ہوں۔ پرویز صاحب جمہور کے ان اعتقاداتِ خمسہ کی ہمنوائی بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ، وہ، الحادفی الآیات کا رویہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ وہ قولاً اور لفظاً ایمان باللہ کا دم بھرتے ہیں، لیکن معنی کے لحاظ سے وہ اللہ کا مفہوم حقیقتِ الوہیت سے ہٹ کر، ملحدانہ طور پر، کبھی کچھ اور کبھی کچھ بیان کرتے ہیں۔ اور جہاں کہیں وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی الوہیت کے مطابق ماننے پر مجبور ہوتے ہیں، وہاں وہ اپنے ذہنی تحفظات کے تحت اسے خود اس کے بنائے ہوئے، طبعی قوانین کے شکنجے میں، اس طرح جکڑتے ہیں کہ بیچارہ خدا، کچھ کر سکنے کی پوزیشن ہی میں نہیں رہتا، اور یہ سب کچھ خارقِ عادت امور اور معجزات کے انکار کی راہ ہموار کرنے کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے☆۔

پرویز صاحب، ایمان بالرسالت کے بھی لفظاً قائل ہیں، مگر ایسے ایمان کے، جس میں، اگر اطاعتِ رسول ہو بھی، تو اسے صرف قرآنی اتباع تک محدود رکھا جائے، اس کے علاوہ، وہ منصب نبوت و رسالت کو، ڈاکیے کے منصب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے جس کا کام، ڈاکخانہ سے خط لے کر اسے مکتوب الیہ تک پہنچا دینے تک ہی محدود ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک، بحیثیتِ رسول، فریضۂ منصبی بس یہی ہے کہ خدا سے کتاب وصول کر کے، بندوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد، آپؐ نے تعلیم کتاب، تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفوس، تعلیم حکمت، تشکیلِ مدنیتِ صالحہ، تشریحِ کتاب، تشریح و تقنین، قضائے خصومات اور تعمیر ریاست وغیرہ کے جو امور بھی سرانجام دیے ہیں، وہ بحیثیتِ رسول نہیں تھے، بلکہ ایسے انسان کی حیثیت سے تھے، جو قرآن کا پیروکار ہو☆۔

وہ عقیدۂ وحی کے بھی قولاً معترف ہیں، مگر کتابی وحی کے علاوہ، کسی اور قسم کی وحی کے یکسر منکر ہیں حالانکہ نزول کتاب سے قبل بھی، اور دورانِ نزولِ کتاب بھی، پیغمبر کو وحی کے ذریعہ احکام و ہدایات کے ملنے کا ثبوت، خود قرآن ہی سے فراہم ہو جاتا ہے☆۔

پھر اگر، اللہ و رسول کا ذکر قرآن حکیم میں مقرون ہو کر مذکور ہو، تو ایسی صورت میں، اللہ سے مراد، خالقِ ارض و سماوات نہیں ہوتا، اور رسول سے مراد، اس کا نمائندۂ مجاز نہیں ہوتا جسے لوگوں کی ہدایت کے لیے، من جانب اللہ، مأمور کیا گیا ہو، بلکہ ان دونوں (یعنی اللہ اور رسول) سے مراد، ''مرکز ملت'' ہوتا ہے، یعنی اللہ کی الوہیت ختم، اور رسول کی رسالت ختم، اور پھر اس عدم سے مرکزِ ملت کا وجود ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس طرح، ''اللہ اور رسول''، کا وجود، جب ایک مرکز ملت کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو، قرآنی ایمانیاتِ خمسہ کی تعداد، پانچ کی بجائے، چار رہ جاتی ہے۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے، خود اپنی طرف سے ''انسانی ذات'' کا ایک عقیدہ گھڑا جاتا ہے، اور پھر اسے اس قدر اہمیت دی جاتی ہے کہ

☆ یہ ساری بحث معہ ثبوت و دلائل ''ایمانیات'' کے باب میں تفصیلاً آگے آ رہی ہے۔

اگر کوئی شخص اس خدا کو مانتا ہے جس نے کارگہِ کائنات کو پیدا کیا اور جس کے قانون کے مطابق، یہ عظیم الشان سلسلہ، اس حسن وخوبی سے چل رہا ہے، لیکن وہ "انسانی ذات" پر یقین نہیں رکھتا، تو قرآن کی رو سے، اس کا خدا کو ماننا، کچھ معنٰی نہیں رکھتا۔ انسان کا اپنی ذات پر ایمان، خدا پر ایمان کی بنیادی شرط (Pre-requisite Condition) ہے [۱]

حالانکہ قرآن کریم میں، انسانی ذات پر ایمان کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے کجا یہ کہ اسے، خدا پر ایمان کی بنیادی شرط قرار دیا جائے۔ خود پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

قرآن کریم نے ایمان کے پانچ اجزا بیان کئے ہیں۔ ۱- اللہ پر ایمان ۲- رسولوں پر ایمان ۳- ملائکہ پر ایمان ۴- کتابوں پر ایمان، اور ۵- آخرت پر ایمان [۲]

وہ کہنے کو تو ایمان بالملائکۃ کو بھی مانتے ہیں، لیکن فرشتوں سے مراد، ان کی ہستی (Being) اور تشخص (Personality)، ان کے نزدیک ہرگز نہیں ہے، وہ فرشتوں کی جو خودساختہ توضیح کرتے ہیں اس میں وہ راہِ الحادیوں اختیار کرتے ہیں کہ کبھی وہ ان کو قوتیں (Energies) قرار دیتے ہیں، جو نظامِ کائنات کو چلا رہی ہیں۔ اور کبھی وہ ان سے مراد انسانوں کی داخلی قوتیں (Inner energies) لیتے ہیں اور کبھی کچھ اور ☆۔

وہ ایمان بالآخرۃ کے بھی قولاً قائل ہیں جس کے لیے قرآن میں بیشتر مقامات پر السَّاعَة کا لفظ بھی آیا ہے۔ قرآن وسنت کے نصوص میں اس سے مراد، صرف اور صرف "آخرت وقیامت" ہی ہے، لیکن پرویز صاحب، اس عقیدہ میں الحاد کی راہ یوں اختیار کرتے ہیں، کہ قرآن وسنت کے بیان کردہ، واحد مفہوم کے ساتھ، خودساختہ مفاہیم کا پیوند لگاتے ہیں، اور "روز قیامت" کے علاوہ، اس کا خود تراشیدہ مفہوم یعنی "انقلاب کی گھڑی" مراد لیتے ہیں، اور پھر اس انقلاب کو بھی، اسی دنیا میں وقوع پذیر مان کر، قیامت سے پہلے ہی قیامت برپا کر دیتے ہیں ☆۔

پھر ایمان باآخرت کے اجزا میں عذابِ قبر بھی شامل ہے، جس کے پرویز صاحب، سرے سے ہی منکر ہیں۔

ان تمام امور پر تفصیلی بحث، آگے چل کر ایمانیات کے باب میں آ رہی ہے، لیکن یہاں صرف یہ ملاحظہ فرمائیے کہ پرویز صاحب، اگرچہ، قرآنی ایمانیات کے معترف وقائل تھے، مگر اس طرح کہ لفظاً انھیں قبول کر لینے کے بعد ان میں الحاد و تحریف اور بعض اجزا میں کمی بیشی بھی کر ڈالتے تھے۔ اس طرح یہ عقائد اپنی تفصیلی شکل میں "مفکرِ قرآن" کے ہاں حق وباطل کا مخلوطہ بن کر رہ گئے تھے۔ اور جب ان پر گرفت کی جاتی تھی تو چونکہ ان کے تھیلے میں متضاد تصورات ونظریات ہر وقت موجود رہتے تھے اس لیے وہ حسبِ ضرورت جیسا چاہتے تھے اپنی تحریروں میں سے حوالے پیش کر دیا کرتے تھے۔ الحاد وزندقہ سے آگے بڑھ کر کفر کی حد تک پہنچی ہوئی، ان کی عبارتوں کی بنیاد پر مفتی محمد شفیع صاحب اور دیگر تقریباً ایک ہزار علما نے ان پر فتوائے کفر عائد کیا تھا ☆☆۔ اس پر "مفکرِ قرآن" بہت تلملائے تھے اور اس فتوے کو یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ "یہاں ہر فرقے نے

---

[۱] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۰ [۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۴۲۵

☆ "ایمانیات" کے باب میں شواہد ودلائل کے ساتھ یہ بحث آگے آ رہی ہے۔ ☆☆ دیکھئے اسی مقالہ کا "حرفِ آخر"

دوسرے فرقے کے خلاف فتوائے کفر وضلالت عائد کر رکھا ہے۔ان فتاویٰ کے باوجود، اگر ہر فرقہ دائرہ اسلام میں بدستور موجود ہے اور کوئی فرقہ بھی کافر نہیں ہوا، تو آخر میں کیسے کافر ہو سکتا ہوں''۔لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے خلاف کفر کا یہ فتویٰ کسی ایک فرقے کے ایک عالم کا انفرادی فتویٰ نہ تھا بلکہ تمام مسلم مکاتب فکر کا مشترکہ فتویٰ تھا۔ بالکل اسی طرح، جس طرح قادیانیوں کے خلاف، جملہ علما نے متفقہ فتوائے کفر جاری کیا تھا۔اب تو منکرین حدیث کے خلاف حکومتِ کویت بھی فتوائے کفر جاری کر چکی ہے۔یہ مختصر سی بحث اس امر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، کس قدر صحتِ عقائد اور سلامتی فکر کے حامل تھے۔

شرط ثانی - عربی زبان پر ماہرانہ عبور

قرآن کریم، عربی زبان میں نازل ہوا۔ اہل عرب ہی اس کے اولین مخاطب تھے، اور جس ہستی پر قرآن اترا، وہ خود بھی عرب ہی تھے، اور اسلامی قوانین اور نظام زندگی کا اولین ماخذ بھی قرآن ہی ہے، جسے عربی مبین میں نازل کیا گیا ہے۔لہٰذا اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ زبان کا علم حاصل ہو، رہی تفسیر کی بات، تو اس کے لیے صرف عربی زبان کی محض واقفیت ہی کافی نہیں، بلکہ اس پر کامل دسترس رکھنا ناگزیر ہے۔جو شخص عربی زبان پر ماہرانہ عبور نہیں رکھتا اور اس کے متعلقات پر وسیع اور گہری نظر نہیں رکھتا، اسے قطعاً یہ بات زیب نہیں دیتی کہ تفسیر قرآن لکھنے بیٹھ جائے۔

عربی زبان پر مہارتِ پرویز کی کیفیت

پرویز صاحب نے اگرچہ ''لغات القرآن'' نامی ایک کتاب بھی اپنی فہرست کتب میں شامل کی ہے جسے اس امر کے لیے بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے، کہ وہ مفسر کی اس بیان کردہ شرط پر پورے اترتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔یقیناً پرویز صاحب عربی زبان سے واقف تھے مگر صرف اس حد تک کہ وہ صرف قرآنی مفردات میں اپنے وضع کردہ مفاہیم کو گھسیڑ ڈالتے تھے۔عام طور پر ان کی عربی کی استعداد حیرت ناک حد تک کمزور تھی۔اور انھوں نے بعض مقامات پر ایسی فاش غلطیاں کی ہیں جن کی توقع ایک اوسط درجہ کے طالب علم سے بھی نہیں کی جاسکتی، کجا یہ کہ کسی مفسر قرآن سے اس کی توقع کی جائے، جبکہ یہاں توقع سے آگے بڑھ کر اس کا عملاً صدور ہو چکا ہے۔ایک مقام پر خود انھوں نے بھی اپنی اس کمزوری کا اظہار کیا تھا اور اس پر قابو پانے کے لیے اپنے استاد اسلم جیراجپوری سے استفادہ کرنے کی کوشش کی

> میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں ناپختگی محسوس کیا کرتا تھا، میں نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور عند الفرصت، مولانا سے کتابیں از سر نو پڑھ لوں۔ (یعنی ایک مرتبہ پڑھ لینے کے بعد بھی یا اس کے باوجود بھی ناپختگی ابھی تک باقی تھی- قاسمی)، چنانچہ غالباً ۱۹۳۵ء میں، مَیں نے اس کے متعلق مولانا سے ذکر کیا، وہ اس کے لیے بخوشی رضامند ہو گئے، چنانچہ میں شملہ سے تنہا دہلی آ گیا اور چونکہ مولانا بھی اس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے، اس لیے فیصلہ یہی ہوا کہ میں انھیں کے ساتھ رہوں۔یہ چھ ماہ کا عرصہ میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے ہے۔میں آیا تو تھا عربی ادب کی ناپختگی دور کرنے کے

لیے، لیکن [وہ جو کہتے ہیں کہ...... آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے......]، ہمارا بیشتر حصہ، قرآن کے رموز وغوامض پر بحث وتحقیق میں گزرتا۔ [1]

اسلم جیراجپوری سے عربی ادب کی ناپختگی کو دور کروا لینے کے باوجود بھی، ''مفکر قرآن'' کی علمی استعداد کیا تھی؟ درج ذیل مثالوں سے بخوبی واضح ہے۔ جن میں عربی ادب کی نایاب، ادق اور مغلق عبارات کے تراجم میں غلطی کرنا تو خیر دور کی بات ہے، وہ تو اس قرآن کریم کی آیات کے ترجمے میں بھی صریح اور فاش غلطیاں آخر تک کرتے رہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عمر بھر انہوں نے اس کا تحقیقی مطالعہ جاری رکھا۔

(۱) پہلی مثال - فعل مضارع کو فعل امر قرار دیا

قرآن کریم میں حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرہ جلیلہ میں یہ مذکور ہے کہ جب انھوں نے اللہ سے ولادتِ پسر کی خوشخبری پائی تو اللہ سے نشانی بھی طلب کی، اور اللہ نے جواباً جو کچھ فرمایا، اسے پرویز صاحب کے ترجمے کے ساتھ، بایں الفاظ درج کیا جاتا ہے۔

قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (۳/۴۱) ارشاد ہوا کہ ''تین دن تک بات چیت نہ کرو مگر صرف اشارہ سے'' [2]

ایک اور مقام پر اسی مضمون کی ایک اور آیت کا ترجمہ بایں الفاظ موجود ہے۔

قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (۱۹/۱۰) فرمایا ''تیری نشانی یہ کہ تین رات لگاتار لوگوں سے بات نہ کر'' [3]

اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ میں مذکور فعل، فعل مضارع ہے جس پر لائے نفی وارد ہے، اور جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''تو لوگوں سے بات چیت نہ کرے گا (یا نہ کر سکے گا)، جبکہ ''مفکر قرآن'' نے اسے فعل نہی سمجھ کر، اس کا ترجمہ یہ کیا ہے ''تو لوگوں سے بات نہ کر'' یا ''...... بات چیت نہ کرو''۔ اگر ''مفکر قرآن'' کا ترجمہ ہی مقصود و مطلوب ہوتا، تو الفاظ قرآن اَلَّا تُکَلِّمِ النَّاسَ ہوتے، یعنی فعل مضارع (تُکَلِّمَ) کی میم پر زبر (َ) کی بجائے زیر (ِ) ہوتی۔ ''مفکر قرآن'' کا ترجمۂ آیات، ان کی عربی زبان کی ثقاہت اور پختگی کو طشت از بام کر دیتا ہے، حتٰی کہ وہ عمر بھر یہ امتیاز نہ کر پائے کہ ان آیات میں مستعمل فعل، فعل مضارع ہے یا فعل نہی۔

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ معارف القرآن کے سلسلہ کو جب ''شعلۂ مستور'' کے نام سے کتابی شکل میں پیش کیا، تب بھی انھیں اس پر تنبہ نہ ہو سکا، اور اسی غلط ترجمہ کو وہاں بھی برقرار رکھا۔

قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (آل عمران - ۴۱) ارشاد ہوا کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم تین دن تک بات چیت نہ کرو مگر صرف اشارہ سے'' [4]

''مفکر قرآن'' نے غالباً یہ غلطی، مولانا ابوالکلام آزاد سے ورثہ میں پائی ہے کیونکہ سب سے پہلے، اس غلطی کا صدور،

---

[1] طلوع اسلام، ۷ جنوری ۱۹۵۶ء، صفحہ ۷، کالم ۳
[2] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۵۹
[3] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۶۲
[4] شعلۂ مستور، صفحہ ۳

ان ہی سے ہوا تھا، اور ''مفکر قرآن'' صاحب، اپنے معارف القرآن کے سلسلہ ہائے کتب میں، مولانا آزاد ہی کا ترجمۂ آیات پیش کیا کرتے تھے، کیونکہ اس وقت تک ان کا اپنا ''مفہوم القرآن'' موضوعِ نہیں ہو پایا تھا۔

(۲) دوسری مثال - اسم ظرف کو اسم فاعل بنا ڈالا

حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کی باہمی کشمکش کے سلسلہ میں، یہ مذکور ہے کہ قوم کے نو سرغنہ افراد نے، حضرت صالح علیہ السلام کو اور ان کے اہل خانہ کو، رات کی تاریکی میں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور یہ بھی طے کرلیا، کہ جب پوچھ گچھ ہوگی تو وہ کیا کہیں گے؟ دورانِ تفتیش، ان کے بیان پر مشتمل آیت، مع ترجمہ پرویز درج ذیل ہے۔

ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهٖ (النمل-۴۹) پھر ان کے ورثا سے کہہ دیں گے کہ ہم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے ان کے خاندان کو تباہ و ہلاک کر دیا ہے۔ [۱]

مَهْلِكَ کا ترجمہ ''ہلاک کرنے والے لوگ'' کرنا قطعی طور پر غلط ہے، یہ لفظ مُهْلِک یعنی میم کی پیش (ُ) کے ساتھ نہیں ہے، جو باب افعال میں، ہ-ل-ک کے مادہ سے اسم فاعل ہے، اور جس کا معنٰی واقعی ''ہلاک کرنے والا'' ہوتا ہے، بلکہ میم کی زبر (َ) کے ساتھ ہے جو اسی مادہ سے، ثلاثی مجرد کے باب میں سے ظرفِ زمان یا ظرفِ مکان ہے، اس صورت میں، اس کا معنٰی ''جائے ہلاکت'' یا ''وقتِ ہلاکت'' ہے۔ یاد رہے کہ یہ ترجمہ، اور اس میں موجود غلطی، اسلم جیراجپوری سے، اپنی عربی استعداد کی ناپختگی کو دور کروا لینے کے بعد کا واقعہ ہے۔

(۳) تیسری مثال - فعل امر کو مضارع مستقبل سمجھ بیٹھے

قرآن کریم میں، ایک جگہ، منکرین حق سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے، نبی اکرم ﷺ کو یہ الفاظ کہنے کا حکم دیا گیا کہ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (۳/۱۱۸) ''آپ کہہ دیجئے کہ --- مرو تم اپنے غصہ کے ساتھ''۔ مُوْتُوْا فعل امر کا صیغہ ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' اسے فعل مضارع (مختص بالاستقبال) سمجھتے ہوئے، اس کا ترجمہ خبریہ انداز میں کرتے ہیں۔

جن لوگوں کا مرض، علاج کی حد سے آگے بڑھ چکا ہو، وہ ان سے کہتا ہے کہ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (۳/۱۱۸) یاد رکھو! اگر تم ان ہی خیالات میں غرق رہے، تو تم اپنے غصہ کی آگ میں بھسم ہو کر، خود ہی مر جاؤ گے۔ [۲]

اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ ان کی عربی زبان سے واقفیت کا کیا عالم تھا۔

(۴) چوتھی مثال - فعل امر کو پھر فعل مضارع قرار دے دیا

سورہ یوسف میں، یہ مذکور ہے کہ جب برادرانِ یوسفؑ، پہلی مرتبہ، غلہ لینے کے لیے مصر آئے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا کہ ''آپ، اپنے ماں باپ کے ہاں سے، اپنے اس بھائی کو بھی، آئندہ لے کر آئیں جو آپ کے ساتھ

[۱] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۲۰۸
[۲] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۴ء، صفحہ ۸۲

نہیں آ سکا ہے، لیکن اگر تم ایسا نہ کرو گے تو:-

فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِىْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ (یوسف-٦٠) تو میرے ہاں، تمھارے لیے کوئی غلہ بھی نہیں اور میرے قریب بھی نہ پھٹکنا۔

اس آیت میں مذکور الفاظ لَا تَقْرَبُو نِ (بکسر النون)، دراصل فعل نہی لَا تَقْرَبُوا + نِی (ضمیر متکلم جو بطور مفعول واقع ہوئی ہے) کا مجموعہ ہے اور بر بنائے وقف نِیْ میں سے ی حذف ہوگئی ہے، اس ضمیر کا فعل نہی لَا تَقْرَبُوا سے مل کر ترجمہ بنتا ہے کہ ''تم میرے قریب نہ پھٹکو'' لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، لَا تَقْرَبُو نِ کو (جو فعل امر ہے) لَا تَقْرَبُوْنَ (بفتح النون) سمجھ کر، اور اسے فعل مضارع جانتے ہوئے، اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

فَإِنْ لَّمْ تَأْتُوْنِىْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِىْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ (یوسف-٦٠) اگر تم میرے پاس نہ لائے، تو نہ تمہیں غلہ مل سکے گا، اور نہ ہی تم میرے قریب آ سکو گے۔ [۱]

جو شخص، عربی زبان سے اتنی بھی شناسائی نہیں رکھتا، کہ فعل مضارع اور فعل امر میں تمیز کر سکے، اور قرآنی آیات میں مذکور فعل امر کو فعل مضارع میں اور فعل مضارع کو فعل امر میں (دوران ترجمہ) تبدیل کر ڈالے، اس کی ''لغات القرآن'' جس پائے کی ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔

عربی گرامر اور استعدادِ پرویز

اب ایک دو مثالیں، اس امر کی بھی ملاحظہ فرمالیں، کہ ''مفکر قرآن'' کا عربی زبان کے قواعد کا علم، کس پایہ کا تھا۔

عربی زبان کا مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ مرکب اضافی میں، مضاف کے ساتھ الف لام نہیں آیا کرتا، یا یوں کہیے کہ مضاف کبھی معرف باللاّم نہیں ہوتا، مثلاً، آپ رَسُوْلُ اللهِ کہہ سکتے ہیں، اَلرَّسُوْلُ الله نہیں کہہ سکتے کیونکہ ایسا کہنا قواعد زبان کے خلاف ہے۔ اس طرح بَيْتُ الله کہنا درست ہے لیکن اَلْبَيْتُ الله کہنا غلط ہے۔ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' عربی زبان کے ان ابتدائی اصول و قواعد سے بھی ناواقف ثابت ہوئے ہیں۔ اضافت کی اس قسم کی بہت سی غلطیاں، ان کی کتب میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباسات میں خط کشیدہ الفاظ میں یہی اغلاط موجود ہیں۔

۱- جنھوں نے حضرت شعیبؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا، یہ غریب لوگ تھے، اور ان کی برادریاں بھی طاقتور اور ذی اثر نہ تھیں۔ انہی اَلْمَلَأُ الْقَوْم نے ان سے کہا .... [۲]

۲- لَانَجِدُ الرَّجْمَ فِى الْكِتٰبِ الله .... (عبارت ماخوذ از احکام القرآن للجصاص صفحہ ۳۱۷) [۳]

۳- یاد رکھو! سب سے پہلا کلمہ لَاإِلٰهَ إِلَّا الله مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ الله ہے [۴]

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۵۲
[۲] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۷۲ء، صفحہ ۱۷
[۳] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۷۳ء، صفحہ ۵۷
[۴] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۳ء، صفحہ ۳۶

۴-جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے آخری حج میں، میں ان کے ساتھ تھا، ہم جبلِ عرفات پر کھڑے تھے کہ ایک شخص نے پکارا یَا خلیفة الرَّسُول الله [1]

۵-یسوع نے دلی خوشی کے ساتھ جواب دیا بیشک وہ محمد الرَّسُولُ الله ہے۔ [2]

۶-میرے سامنے، انجیل برنباس کا وہ اردو ترجمہ ہے جسے مولوی انشاء اللہ (مرحوم) نے اپنے اخبار وطن سے ۱۹۱۵ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے دیگر صفحات (صفحہ ۷۰، صفحہ ۱۴۶، صفحہ ۱۶۷، صفحہ ۳۰۶) پر بھی، اسی طور حضور کا اسم گرامی محمد الرسول اللہؐ مذکور ہے۔ [3]

جس ''مفکر قرآن'' کی علمی استعداد اور عربی زبان کے اصول و قواعد سے واقفیت کا یہ عالم ہو کہ وہ کلمہ طیبہ کی عبارت کو بھی صحیح نہ لکھ سکتا ہو اور محمد رَّسُولُ الله کو وہ محمد الرَّسُولُ الله لکھتا ہو، اس کے ''علامۂ دہر'' ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

طلوعِ اسلام کا علم الصیغہ

قرآن کریم میں، حضورؐ کو مخاطب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے، کہ آپؐ، اپنے رفقا سے، تدبیری امور میں مشاورت کیا کریں۔ الفاظ آیت یہ ہیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِفَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى الله (آل عمران-۱۵۸) آپؐ ان سے مشورہ کیجئے اور جب آپؐ کسی بات کا عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے (اور اسے کر گزریے)

اس آیت میں عَزَمْتَ کا فعل، کس صیغہ سے تعلق رکھتا ہے؟ طلوعِ اسلام کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے۔

عَزَمْتَ، صیغہ واحد متکلم ہے،............... باقی رہا یہ سوال، کہ عَزَمْتَ میں صیغہ واحد متکلم کا ہے، تو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ خواہ ہزار افراد سے لیا جائے، فیصلہ تو بہر حال، ایک فرد (متعلقہ اتھارٹی، امیر مملکت) ہی کو کرنا ہوگا۔ [4]

ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ عَزَمْتَ واحد مذکر مخاطب/حاضر کا صیغہ ہے، یہ ہے طلوعِ اسلام کا مبلغ علم۔

آیات قرآنیہ کے تراجم میں اور پھر قواعدِ زبانِ عربی میں، یہ فاش غلطیاں، جن کے صدور کی توقع، ایک مبتدی طالب علم سے بھی نہیں کی جا سکتی، خود ''مفکر قرآن'' کی عربی زبان پر عبور و مہارت کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتی ہیں۔ وہ بہر حال، قرآن اور اس کی زبان کا ادھورا اور ناقص علم ہی رکھتے تھے، ایسا ناقص علم، اسی طرح، دین و ایمان کے لیے خطرناک واقع ہوتا ہے، جس طرح کسی عطائی کا علم طب، انسانی زندگی کے لیے ہلاکت آفریں ہوا کرتا ہے۔

قرآنی مفردات کے مادوں سے بے خبری

ہمارے ''مفکر قرآن'' کی عربی زبان سے شناسائی اور واقفیت کا اندازہ، اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کسی ایک

---

[1] شاہکار رسالت، صفحہ ۴۳۰
[2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۵، صفحہ ۴۱۲
[3] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۵، صفحہ ۴۱۲
[4] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۸۳ء، صفحہ ۴۹

لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے، اس کے مادہ (Root) کی تحقیق کے دوران، ایسے لفظ کو گھسیٹ لاتے ہیں، جس کا مادہ (Root) قطعی مختلف ہوتا ہے، لغات القرآن کی اولین اشاعت میں ایسی بہت سی اغلاط تھیں، جنھیں بعد میں درست کر دیا گیا، لیکن لغات القرآن کے علاوہ، دیگر کتب میں اب بھی ایسی اغلاط موجود و برقرار ہیں، صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے، اس میں، وہ، آیت (۳/۴)* میں واقع لفظ تَعُولُوا (جس کا مادہ ع و ل ہے) کی بحث کے دوران، ایک ایسے لفظ کو گھسیٹ لاتے ہیں، جس کا مادہ (ع و ل کی بجائے) ع ل و ہے، ملاحظہ فرمایئے، اُن کا اقتباس۔

دوسرا لفظ تَعُولُوا (مادہ ع و ل ہے) جس کے معنٰی ہر وہ شے ہیں جس کے بوجھ تلے انسان دب جائے، اہل وعیال کے معنٰی بال بچوں کا بوجھ ہیں۔ اُسی سے عالي الميزان ہے، جس کے معنٰی ہیں ترازو کے ایک پلڑے کا جھک جانا۔ اس کے دونوں پلڑوں کا وزن برابر نہ رہنا، یہاں سے اس کے معنٰی ناانصافی کے آتے ہیں۔ [1]

اب یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ اس اقتباس میں، ''مفکر قرآن'' صاحب کی اغلاط، بر بنائے جہالت ہیں یا بر بنائے شرارت۔ قرآنی لفظ تَعُولُوا (جس کا مادہ ع و ل ہے) کی بحث و تمحیص اور توضیح و تشریح میں عالي الميزان کا لفظ گھسیٹ لانا، کسی صورت بھی درست نہیں کیونکہ عالی کا مادہ ع ل و ہے، جو زیر بحث لفظ کے مادہ سے قطعی مختلف ہے۔

پھر عالي الميزان کا معنٰی ''ترازو کے ایک پلڑے کا جھک جانا'' بھی غلط ہے، عالی، عَلٰی يَعْلُو سے اسم فاعل کا کلمہ ہے، جس کا معنٰی ہے ''اونچا یا بلند''۔

لہٰذا عالي الميزان کا معنٰی جو پرویز صاحب نے دیا ہے، قطعی غلط ہے۔ اگر زیر بحث لفظ (تعولوا) کے مادہ (ع و ل) سے اسم فاعل کا صیغہ مراد ہوتا تو عائل کا لفظ آتا (نہ کہ عالی کا)۔

جس ''مفکر قرآن'' کے علمی افلاس کا یہ عالم ہو کہ قرآنی مفردات کے مادوں (Root) سے بھی ناواقف ہو، اور ایک لفظ کی لغوی بحث میں، ایسے دوسرے الفاظ کو گھسیٹ لائے جو مختلف المادہ ہوں اور پھر کتب لغات کی عبارتوں کا ترجمہ بھی غلط پیش کرے، اُسکی پیش کردہ ''قرآنی تحقیقات'' کی قدر افزائی، صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو عربی زبان سے بالکل کورے ہوں۔

شرط ثالث - تقویٰ و دیانت

کسی بھی مفسر کے لیے، خدا خوفی، تقویٰ، پرہیز گاری، اور قرآن و رسولِ قرآن کی مخلصانہ اطاعت کے ساتھ ساتھ، دیانت و امانت اور عدالت و صداقت کا پایا جانا ضروری ہے، کیونکہ ان صفات کے بغیر، نہ تو اسلام کا صحیح فہم پانا ممکن ہے، اور نہ مخلصانہ اطاعتِ خدا اور رسول ہی متوقع ہو سکتی ہے، اور نہ ہی ان لوگوں سے، جن کے خلاف فکر و عمل کا اختلاف پایا جاتا ہے، عدل و انصاف اور صداقت و دیانت کا رویہ ہی اپنایا جا سکتا ہے۔ ان اخلاقی اوصاف و شرائط سے تہی دست مفسر، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، اطاعتِ خداوندی، اتباعِ رسول، پیرویٔ کتاب اللہ، اور عامۃ الناس کی خیر خواہی اور اپنے نظریاتی مخالفین کی تردید

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۳۴۷ ☆ ۳/۴: یعنی چوتھی سورت کی تیسری آیت، یہی انداز حوالہ آیندہ صفحات میں بھی ہے۔

میں نقلِ اخبار و اقتباسات میں خیانت و فریب دہی کی روش اپنائے گا، وہ محض اپنی مقصد برآری کے لیے، اور خلقِ خدا کو ہمنوا بنانے کے لیے، اس بات سے بے پرواہو گا کہ اس کی ان حرکات کے باعث، خود بارگاہِ الٰہی میں، اس کا کیا مقام اور انجام ہوگا۔

علاوہ ازیں، خدا خوفی اور تقویٰ و تدین کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جو شخص بھی تفسیر قرآن کا ارادہ کرے، وہ خارجی تصورات و نظریات سے خالی الذہن ہو کر بارگاہِ قرآن میں آئے، اور طلبِ ہدایت کی مخلصانہ نیت کے ساتھ، مطالعۂ قرآن کرے اور عامۃ الناس کو اپنی تفسیر کے ذریعہ، صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے آمادہ کرے، لیکن اگر وہ خارجی افکار و نظریات کو، قلب و دماغ پر مستولی کرنے کے بعد، اس لیے قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے کہ وہ قرآن سے اپنے تصورات کے حق میں، دلائل کشید کرے، یا قرآنی آیات کے مفاہیم و تراجم میں، اس طرح کی تبدیلی واقع کرے، جس سے اگر اس کے نظریات کی حمایت نہ بھی ہو سکے، تو کم از کم، ان کے خلاف نہ رہے، تو ایسا شخص، اپنی ذات پر بھی، خدا کی کتاب پر بھی، اور آخرالامر، اپنے قارئین پر بھی ظلم کرتا ہے۔

اب اس شخص کے معاملہ پر غور فرمائیے، جو قرآنی آیات کا ترجمہ پیش کرتا ہے، اور بغیر کسی نوع کے ذہنی تحفظات کے، درست ترجمہ پیش کرتا ہے، لیکن ایک دوسرا شخص، اس کے صحیح ترجمہ سے ایک ایسا استدلال کرتا ہے جو صاحبِ ترجمہ کے خلاف پڑتا ہے، اور اس کے خلاف حجت بن جاتا ہے، اب بجائے اس کے کہ صاحبِ ترجمہ، اپنے مخالف کی دلیل کو صحت مند بنیادوں پر رد کرے، وہ اپنی ذہنی چابکدستی سے، قواعد زبان کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، آیت کا ترجمہ ہی بدل دیتا ہے، تاکہ نہ وہ پہلا ترجمہ رہے اور نہ ہی وہ اس کے خلاف، دلیل و حجت بن سکے۔ سابقہ ترجمہ، صرف اور صرف، اس ذہنی تحفظ کے تحت، بدلا گیا ہے کہ جب تک وہ ترجمہ باقی رہے گا، مترجم کے خلاف، وہ استدلال کی بنیاد فراہم کرتا رہے گا، اس ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت، وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ سابقہ ترجمہ کو جدید ترجمہ سے بدل ڈالے، کیا ایسے شخص کی یہ روش، تقویٰ و پرہیزگاری، خدا خوفی اور اللہ کے ہاں احساسِ جوابدہی، صحتِ مقصد اور پاکیزگیٔ نیت کے ساتھ، میل کھاتی ہے؟

تحریفِ ترجمۂ آیت اور اس کا محرّک

اس کی بیشمار مثالیں ہیں، جو ''مفکرِ قرآن'' کی تصانیف میں، ایک سے ایک بڑھ کر، پائی جاتی ہیں لیکن فوری حوالہ کے پیشِ نظر صرف ایک مثال پیش کی جا رہی ہے، جبکہ بقیہ کثیر التعداد مثالوں میں سے حسبِ ضرورت اور حسبِ اقتضائے موقع، کچھ مثالیں، مقالہ کے مختلف مقامات پر عرضِ خدمت کی گئی ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت کو مع ترجمۂ پرویز ملاحظہ فرمائیے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ بیشک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے جو (بالکل) مطابق واقعہ ہے۔ [1]

پرویز صاحب کا یہ ترجمہ، سیاق و سباق، موقع نزول اور قواعد زبان، الغرض ہر لحاظ سے درست ترجمہ ہے، پھر ایک موقع آیا کہ مولانا مودودیؒ نے اسی ترجمہ سے یہ استدلال کیا کہ رسول خدا کو قرآن کے علاوہ بھی وحی آیا کرتی تھی، اور یہ قوی

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۶۰

استدلال، موقفِ پرویز کے خلاف تھا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تقریرِ استدلال بایں الفاظ تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کو خواب کے ذریعہ سے مکہ میں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپؐ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کی طرف جائیں، کفار روکیں گے آخر کار صلح ہوگی، جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا، اور آیندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائے گا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے ہدایت ملنے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟ [1]

سید مودودیؒ کا استدلال درست اور مضبوط بھی ہے اور پرویز صاحب ہی کے ترجمہ پر مبنی ہے جیسا کہ مندرجہ بالا حوالہ سے ظاہر ہے، پرویز صاحب چونکہ قرآن کے علاوہ خدا کی طرف سے پیغمبر کو کسی قسم کی ہدایت یا وحی کے ملنے کے قائل نہیں ہیں، اس لیے اس آیت کا خود ان کا اپنا پیش کردہ ترجمہ دردِ سر ہی نہیں بلکہ دردِ جگر بن گیا ہے، کہ جب تک یہ ترجمہ باقی اور برقرار ہے وہ قرآن کے علاوہ بھی وحی خداوندی کا مستقل ثبوت بنتا رہے گا، اس مشکل کا حل؟ بقول شاعر یہ سوچا گیا کہ

دوا، دردِ جگر کی، ان سے جب پوچھی تو فرمایا
جگر، جب تک تیرے سینے میں ہے، دردِ جگر ہو گا

فلہٰذا، مفکرِ قرآن نے دردِ جگر کا علاج، جگر ہی کو ختم کر ڈالنے کی صورت میں یوں کیا کہ اپنے ہی صحیح ترجمہ کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، اور اس کی جگہ جب اور جہاں بھی ضرورت پڑی، درجِ ذیل مفہوم پیش کیا ہے، جو موقعِ نزول اور سیاق وسباق اور قواعدِ زبان کے قطعی خلاف ہے۔

دو سال بعد، جب مکہ فتح ہوا، اور حضور فاتح ومنصور، اس میں داخل ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا (۴۸/۲۷) خدا نے رسول کا خواب سچ کر دکھایا۔ [2]

غور فرمایئے کہ الفاظ آیت کے اس غلط ترجمہ (خدا نے رسول کا خواب سچ کر دکھایا) سے قبل، وہ صحیح ترجمہ، ان الفاظ میں پیش کیا کرتے تھے، ''بیشک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے''۔

پھر اس جدید ترجمہ (بلکہ مفہوم آیت) میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ آیت کیا، بلکہ پوری سورۃ الفتح، جس میں یہ آیت شامل ہے، فتح مکہ سے تقریباً دو سال قبل نازل ہوئی تھی، اور ''مفکرِ قرآن'' ترجمۂ آیت کو بدلنے کے ساتھ ساتھ، اس کے زمانۂ نزول کو بھی مؤخر کرتے ہوئے، فتح مکہ تک کھینچ لے گئے ہیں۔ اس ترجمہ کے بطلان پر دلائل قائم کرتے ہوئے، سید مودودیؒ نے، اسی وقت یہ لکھ دیا تھا کہ

صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا کے معنیٰ ''اللہ نے رسول کا خواب سچا کر دکھایا'' کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے، یہ بات کہنی ہوتی، تو صَدَقَ اللّٰهُ رُؤْيَا الرَّسُول کہا جاتا، نہ کہ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا – اس فقرے میں صَدَقَ کے دو مفعول ہیں، ایک رسول، جسے خواب دکھایا گیا، دوسرا خواب، جو سچا تھا، یا جس میں سچی بات بتائی گئی تھی۔ اس لیے لامحالہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا یا اس کو خواب میں سچی بات بتائی، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے عربی میں کوئی کہے صَدَقَنِيَ

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۰۲
[2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۸۴

الحَدِیْثَ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''اس نے مجھ سے سچی بات کہی''، نہ یہ کہ ''اس نے جو بات مجھ سے کہی، اسے سچا کر دکھایا''۔مزید برآں، اگر فقرے کے وہ معنی لے بھی لیے جائیں، جو ڈاکٹر صاحب لینا چاہتے ہیں، تو اس کے بعد والا فقرہ قطعاً بے معنی ہو جاتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدِ الْحَرَامَ ''تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے''۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ خواب میں جو بات دکھائی گئی تھی، وہ ابھی پوری نہیں ہوئی، اس کی سچائی ثابت ہونے سے پہلے، جن لوگوں کو رسول کے خواب کی صداقت میں شبہ پیدا ہوا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ یقین دلا رہا ہے کہ ہم نے سچا خواب دکھایا ہے، یہ خواب پورا ہو کر رہیگا۔ اگر ان آیات کے نزول سے قبل، وہ خواب سچا کر دکھایا گیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ لَتَدْخُلُنَّ (تم ضرور داخل ہو گے) کہنے کی بجائے قَدْدَخَلْتُمْ (تو داخل ہو چکے ہو) فرماتا۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، پوری سورہ فتح، جس کی ایک آیت پر یہاں کلام کیا جا رہا ہے اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مسلمان، عمرے سے روک دیے گئے تھے، اور مسجد حرام میں داخل ہونے کا واقعہ ابھی پیش نہیں آیا تھا، لہٰذا اس سیاق و سباق میں، اس آیت کا یہ مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا کہ اس وقت خواب پورا ہو چکا تھا۔ [۱]

صورتِ واقعہ سے چند بدیہی نتائج

صحیح ترجمہ کے بعد، ''نظریہ ضرورت'' کے تحت، غلط ترجمہ آیت پیش کرنے کی اس کاروائی سے چند باتیں بالکل عیاں ہیں۔

اولاً............ یہ کہ صحیح ترجمہ کی جگہ، باطل ترجمۂ آیت، اور پھر اس کی وجۂ محرکہ، خود اس امر پر شاہد ہے کہ ''مفکر قرآن'' خود بدلنے کی بجائے، قرآن کو بدل دیا کرتے تھے، اور اس کوشش میں جت جایا کرتے تھے کہ اپنے ذہن میں محفوظ پیشگی خیالات پر آنچ نہ آنے پائے، قواعدِ زبان کی مخالفت ہو جائے، تو ہو جائے، آیت کا سیاق و سباق نظر انداز ہو جائے، تو ہو جائے، اس کا زمانہ نزول، اپنے مقام سے سرک جائے تو سرک جائے، مگر انھیں کسی چیز کی پروا نہیں ہوا کرتی تھی، انھیں اگر پروا تھی، تو صرف اپنے مزعومات ہی کی، جن کی خاطر وہ آیات کے تراجم کو تغیر و تبدل کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے، اور پھر اس طرز عمل کے ساتھ ساتھ، وہ یہ وعظ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

> اگر کوئی شخص، کسی خاص نظریہ یا تصور کو لے کر، قرآن کی طرف آتا ہے کہ اسے، اس سے اپنے نظریہ یا تصور کی تائید مل جائے، تو اسے قرآن کی بارگاہ سے ایسی پھٹکار پڑتی ہے، جو اس کے لیے ہر دو جہاں میں وجۂ روسیاہی ہوتی ہے، قرآن کو اپنے خیالات کے تابع رکھنا شرک عظیم ہے۔ [۲]

> اور پھر لوگوں کو اپنے بارے میں، یہ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ

> میں، برادرانِ عزیز! پوری دیانت داری سے عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں نے قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی، میں اسے شرک سمجھتا ہوں۔ [۳]

---

[۱] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱، صفحہ ۲۱۶ [۲] طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۷ [۳] طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۸

یہ ''دیانت دارانہ اعلان'' اور یہ تراجم آیات

''مفکر قرآن'' کے اس ''دیانتدارانہ'' اعلان کے بعد، صرف ان دو آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے، جن میں الفاظ کی حدود سے صریحاً تجاوز کیا گیا ہے، اور پھر خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ آیا یہ ترجمہ، اس آدمی کے قلم سے نکلا ہے جو خالی الذہن ہو کر، بارگاہِ قرآن میں آیا ہے؟ یا اس شخص کے قلم سے، جو نظریۂ اشتراکیت کو پہلے سے اپنے قلب و دماغ میں راسخ کر چکا ہے؟

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (۱۲/۵۵) ملک کے حدود میں جتنے بھی وسائل پیداوار اور ذرائع آمدنی ہیں، ان کو قومیا (Nationalize) کر، میری تحویل میں دے دیجئے، کیونکہ مجھے ان کی حفاظت اور ان کے محاصل کے صحیح مصرف کا علم دیا گیا ہے۔ [۱]

اب اسی آیت کا ''مفکر قرآن'' ہی کے قلم سے وہ ترجمہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے جن میں الفاظ کی حدود کی پابندی کی گئی ہے، اور صاف نظر آتا ہے کہ خارجی افکار و نظریات سے خالی الذہن ہو کر یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

یوسف نے کہا کہ مملکت کے خزانوں پر مجھے مختار کر دیجیے میں حفاظت کر سکتا ہوں، اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔ [۲]

اسی طرح سورۂ یوسف کی ایک اور آیت کا یہ ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

لَقَدْ كَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ (۱۲/۷) جو لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ کیا کبھی نظام ربوبیت قائم ہوا تھا تو بلاشبہ اس قصہ میں جس کے مرکزی کردار یوسف اور اس کے بھائی ہیں، ان کے اس سوال کا جواب موجود ہے، انھی کے لیے نہیں بلکہ ہر متجسس حقیقت اور جویائے صداقت کے لیے اس قصہ میں بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ [۳]

اب اسی آیت کا وہ ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیے، جسے خود ''مفکر قرآن'' ہی نے اُس دور میں پیش فرمایا تھا، جب وہ اسیر زلفِ اشتراکیت نہ ہوئے تھے۔

جو لوگ (حقیقتِ حال) پوچھنے والے ہیں (اگر وہ سمجھیں تو) ان کے لیے یوسف اور ان کے بھائیوں کے معاملے میں (موعظت و عبرت) کی بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ [۴]

سورہ یوسف کی ان دونوں آیات کے گذشتہ و قدیم تراجم کے مقابلے میں، اگر حالیہ اور نئے تراجم کو رکھ کر دیکھا جائے تو یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ آیا وہ (الف) خالی الذہن ہو کر بارگاہِ قرآن میں آتے ہیں؟ یا کچھ پیشگی نظریات کو اپنا کر؟ (ب) وہ حدودِ الفاظ کی پابندی کے تفسیری اصول کو ملحوظ رکھ کر ترجمۂ آیات کرتے ہیں؟ یا اس کی پابندی سے آزاد اور بالاتر ہو کر؟ (ج) وہ، دورانِ ترجمہ، قواعدِ زبان کو پیشِ نظر رکھتے ہیں؟ یا نظر انداز کرتے ہیں؟

ثانیاً................ یہ کہ، صرف آیتِ زیر بحث (۲۷/۴۸) کے غلط ترجمہ میں ہی نہیں، بلکہ دیگر آیات کے تراجم باطلہ میں بھی، وہ قواعدِ زبان کی صریح مخالفت کر جاتے تھے، جس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی تھی کہ انھیں قواعدِ زبان کا مطلق علم نہیں تھا، یا

---

[۱] طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۷
[۲] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۳۹
[۳] طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۷ء، صفحہ ۷۷
[۴] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۱۶

پھر یہ کہ محض اپنے مزعومہ تصورات کی بے جا پاسداری کی خاطر، وہ جانتے بوجھتے ایسا کر گزرتے تھے، دونوں صورتیں، کسی بھی مفسر قرآن کے شایانِ شان نہیں ہوسکتیں، پہلی صورت میں جہالت و بے خبری کا عیب، اور دوسری صورت میں نیت کا فساد، ظاہر ہی ہے۔

ثالثاً .... یہ کہ، خیالات کی غلطی واضح ہو جانے، اور راہِ صواب کے کھل جانے پر، اپنے افکارِ باطلہ سے دستکش ہو جانا، اور حق کے سامنے سپر انداز ہونا، آدمی کے نیک نیت ہونے کو واضح کر دیتا ہے، اور یہی طرزِ عمل، ایک حق پرست مفسر کے لیے زیبا ہے، لیکن وضوحِ حق کے بعد بھی، اگر کوئی شخص، اپنے باطل نظریات سے چمٹا رہے، اور بدستور، اپنے غلط ترجمہ پر اصرار کرتے ہوئے، اپنے قارئین کو بالخصوص، اور عامۃ الناس کو بالعموم، تاریکی میں رکھ کر، ان کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے حق کی بجائے، باطل ہی عزیز تر ہے۔ اسے قرآنی حقائق کے مقابلہ میں، اپنے مزعومات ہی محبوب تر ہیں، اور اس کا دل خوفِ خدا اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے یکسر بیگانہ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ''مفکر قرآن'' کو ہم نے ان کی تحریروں اور ان کے طرزِ عمل میں، ایسا ہی پایا ہے۔ سید مودودیؒ نے ان کے ترجمۂ آیات کی غلطی کو (نیز انکارِ سنت کے مسلک کی گمراہی کو) ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر عبدالودود کے ساتھ، اپنے قلمی مناظرہ میں، واضح کر دیا تھا، لیکن ''مفکر قرآن'' نے نہ صرف یہ کہ مسلکِ انکارِ سنت کو ترک نہیں کیا، بلکہ ۱۹۶۱ء کے بعد بھی، یہی غلط ترجمۂ آیت پیش کرتے رہے، مثلاً مفہوم القرآن کی تیسری جلد کے صفحہ ۱۲۰۲ پر، اسی آیت (۲۷/۴۸) کے دو ترجمے دیے گئے اور دونوں ہی غلط ہیں، اس کے علاوہ، تفسیر مطالب الفرقان کی ساتویں جلد کے صفحہ ۸۴ پر بھی یہی غلط ترجمہ دیا گیا ہے، حالانکہ دونوں کتابیں ۱۹۶۱ء کے بعد چھپی ہیں۔ اول الذکر کتاب، اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اور ثانی الذکر، جون ۱۹۹۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی، اور دونوں کتب، میں اسی غلط ترجمہ کو پیش کیا گیا ہے، جس کی غلطی دلائل کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں واضح کر دی گئی تھی، حالانکہ اگر ''مفکر قرآن'' (یا طلوعِ اسلام) کی طبیعت، اصلاح یا اعترافِ غلطی کی طرف نہیں آتی [جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی]، تو کم از کم، غلطی واضح کرنے والے کا شکریہ ہی ادا کر دیا جاتا، جیسا کہ طلوعِ اسلام یہ وعدہ کرنے کا عادی ہے۔

۱- اگر اس طرح، ہماری کسی واقعی غلطی کی اصلاح ہو جائے تو ہم بدل شکر گزار ہوں گے۔ [۱]

۲- جو شخص، ہماری کسی غلطی پر متنبہ کرتا ہے، ہم اس کے شکر گزار ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ اپنی تائید میں، قرآن کریم کی سند رکھتا ہو۔ [۲]

اور یہ حقیقت ہے کہ مولانا مودودیؒ نے، قرآن ہی کی سند پر، نہ صرف یہ کہ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا کے ترجمہ کی غلطی پر متنبہ کیا تھا بلکہ انکارِ سنت کے پورے مسلک کی غلطی اور گمراہی کو بھی بے نقاب کیا تھا۔

''مفکر قرآن'' کی ''عدالت و دیانت'' کی مثالیں

پرویز صاحب، اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں، کیا بعد از مرگ، ان کے فکر و عمل پر نقد و نظر ہو سکتی ہے؟ اس سوال کے دو جز

---

[۱] طلوعِ اسلام، ۲ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۴، کالم ۲ [۲] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲۸

ہیں (۱) ان کے افکار و نظریات پر تنقید، اور (۲) ان کے طرزِ عمل پر تنقید، جس میں وہ اپنے نظریاتی مخالفین کی مخالفت میں ایسا رویہ اپناتے رہے، جو کسی دیانتدار اور انصاف پسند شریف آدمی کو بھی زیب نہیں دیتا، کجا یہ کہ وہ رویہ، کسی مفسرِ قرآن اور مفکر قرآن کے شایانِ شان ہو۔

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے، اس کے بارے میں خود طلوعِ اسلام نے یہ کہہ کر، اثبات میں جواب دیا ہے کہ

> اگر کوئی شخص ایسے خیالات، دنیا میں چھوڑ جاتا ہے، جو اس کے مرنے کے بعد بھی لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں تو ان خیالات پر تنقید ضروری ہوتی ہے تاکہ لوگ غلط خیالات کی اتباع سے تباہی کے راستے پر نہ چل نکلیں۔ [1]

لیکن کیا ان کے عملی کردار کو بھی معرضِ تنقید میں رکھا جا سکتا ہے؟ یہ قدرے مشکل سوال ہے، اگر ایک پہلو سے ایسا کرنا، ناجائز دکھائی دیتا ہے، تو دوسرے پہلو سے اس کا جواز بھی نظر آتا ہے، عدمِ جواز کے پہلو سے، مرنے کے بعد، ان کے عملی کردار کو زیرِ بحث لانا، اخلاقاً ناپسندیدہ اور شرعاً ایک مفسدہ ہے، لیکن جواز کے پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا عملی رویہ ایسا نہ تھا جس کے اثرات، صرف، ان کی ذات تک ہی محدود ہوں، بلکہ ایسا تھا کہ اس کے اثرات، دوسروں تک بھی متعدی تھے۔ انھوں نے اپنے مخالفین کے خلاف غلط فہمیوں کا ایسا گرد و غبار اٹھایا کہ اصل حقائق، بہت سی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، اور اپنی تحریروں سے ایسی فضا باندھی، جس سے لوگوں کے قلوب و اذہان، شکوک و شبہات کے کانٹوں سے اٹ گئے، اور بعض لوگوں کے خلاف، نفرت کا زہر پھیلایا، اور بعض پر خوب کیچڑ اچھالا، اور مسخِ حقائق سے کام لیا، تو کیا اس صورت میں اسلام یہی کہتا ہے کہ اٹھایا ہوا گرد و غبار، اب اٹھا ہی رہنا چاہیے؟ اسے ختم نہ کیا جائے؟ اور لوگوں کے دل و دماغ میں، شکوک و شبہات کے جو کانٹے چبھ گئے ہیں، انھیں چبھے ہی رہنا چاہیے؟ باہر نہ نکالے جائیں؟ اور جن کے خلاف نفرت کا زہر پھیلایا گیا ہے، ان کے خلاف، اس زہر کو پھیلتے ہی رہنا چاہیے؟ اسے ختم نہ کیا جائے؟ اور جن پر کیچڑ اچھالا گیا، انھیں کیچڑ سے لت پت ہی رہنا چاہیے؟ ان کا دامن صاف نہ کیا جائے؟ اور جن حقائق کو مسخ کر کے، ان پر پردہ ڈالا گیا ہے، وہ بدستور مسخ ہی رہیں؟ ان کا پردہ چاک نہ کیا جائے؟ کیا اسلام یہی کہتا ہے؟

جب ہم اس پہلو سے اس مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صورتحال کو جوں کا توں چھوڑ کر، غیر جانبدار بن کر بیٹھنا اور خاموش تماشائی ہو کر رہ جانا، ایک عظیم تر مفسدہ دکھائی دیتا ہے، بہ نسبت، اس مفسدہ کے، جو پہلے مذکور ہو چکا ہے، کیونکہ وہ عیوب و ذنوب، جن کے اثرات بد، دوسروں تک بھی متعدی ہوں، ناقابلِ اغماض ہوتے ہیں، ان کے متعدی مضرات سے دوسروں کو بچانا، بجائے خود، نیکی ہے، اور جنھیں کیچڑ میں لت پت کیا گیا ہے، انھیں پاک صاف کرنا، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انھیں آلودۂ گندگی رہنے دیا جائے، لہٰذا، اس پہلو سے ہم مجبور ہیں کہ ''مفکرِ قرآن'' کے جس طرزِ عمل سے دوسروں کو ضرر اب تک پہنچ رہا ہے، اسے بھی قرآنی میزان میں تول کر دیکھا جائے کہ اس کا کیا وزن قرار پاتا ہے، اور یہی اَھْوَنُ البَلِیَّتَینَ (Lesser Evil) کا

---

[1] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۹ء، صفحہ ۶۷

تقاضا ہے کہ عظیم تر مفسدہ سے بچنے کے لیے چھوٹے مفسدہ کو گوارا کیا جائے۔

(۱) عبارات کو سیاق و سباق سے اکھاڑنا

قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کے پہلو سے تو ''مفکر قرآن'' کی بیشمار تحریفات ہیں ہی، اگر چہ ان کی قلعی بھی اپنے اپنے مقام پر کھلتی جا رہی ہے، لیکن اتباعِ پرویز کی حالت یہ ہے کہ وہ ''مفکر قرآن'' کی ان قرآنی تحریفات وتلبیسات کو ''بلند پایۂ علمی نکات'' قرار دیتے ہیں، لیکن جن چند واقعات کو، مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر وتاویل سے متعلق نہیں ہیں کہ ایک گروہ، ان کو ''قرآنی تحریفات'' کا نام دے، اور دوسرا گروہ، انھیں ''علمی جواہر'' گردانے، بلکہ دور حاضر کے ایسے پیش پا افتادہ حقائق ہیں، جنھیں ایک طالب علم بھی، نہایت معمولی سی تحقیق کے بعد جان سکتا ہے، کہ دوسروں کے اقتباسات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرنے میں، کس قدر ''عدل وانصاف اور امانت ودیانت'' سے کام لیا گیا ہے، ''مفکر قرآن'' صاحب، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> ان کی جماعت کے ارکان کی تعداد بہت تھوڑی تھی، وہ انھیں اطمینان دلاتے ہیں اور کہتے ہیں
>
> جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں، روسی کیمونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف بتیس لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت، اس سے بہت کم تھی مگر اس نے سترہ کروڑ انسانوں کو مسخر کیا، مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کے وقت صرف تین لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد، ساڑھے چار کروڑ☆ اطالوی باشندوں پر چھا گئی، یہی حال، جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ (ترجمان القرآن، بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۴۸) [۱]

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں، خدا کا خوف ہو، آخرت کی جواب دہی کی فکر ہو، اللہ اور رسول سے نہ سہی، کم از کم مخلوقِ خدا ہی سے شرم وحیا کا احساس ہو، تو وہ اس قسم کی خیانت، قطع وبرید اور دھوکہ دہی کا ارتکاب نہیں کر سکتا جیسا کہ یہاں ''مفکر قرآن'' نے کر ڈالا ہے۔

اس اقتباس میں، جو کچھ کہا گیا ہے، وہ مولانا مودودیؒ نے، اپنی جماعت کے ارکان کو، ان کی تعداد کی قلت کے حوالے سے، مطمئن کرتے ہوئے نہیں کہا تھا، بلکہ ہندوستان کی پوری مسلم آبادی کو، تحریری خطاب کرتے ہوئے کہا تھا جو ہندو اکثریت کے مقابلے میں، ایک چوتھائی حد تک، قلیل التعداد ہونے کی بنا پر، اپنے دینی اور سیاسی مستقبل کے متعلق پریشان تھی، پورا اقتباس، اپنے سیاق وسباق کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے، اگر چہ یہ اقتباس طویل ہے، لیکن طوالت کی کوفت کے باوجود، اسے صرف اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ یہ واضح ہو جائے، کہ ہمارے ''مفکر قرآن'' خود کن ''قرآنی فضائلِ اخلاق'' سے آراستہ تھے، اور اپنے مخالفین کے اقتباسات کو صحیح سیاق وسباق کے ساتھ، پیش کرنے میں کس قدر ''عدل ودیانت'' سے کام لیتے تھے۔

☆ یہاں غلطی سے تعداد ''ساڑھے چار لاکھ'' درج تھی۔ جس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

[۱] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۴۶

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو، ایک عالمگیر تحریک کی بجائے، ایک جامد قومی کلچر، اور خود اپنے آپ کو، ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کی بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے، لہٰذا، اس کا نتیجہ، آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ سر شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں؟

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمانوں کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں سوجھتی کہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے، اس صورت حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اس اللہ کے بندے کو نہ تو اس طاقت کا علم ہے اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے، یہ اپنے دین کو ایک کند ہتھیار اور اپنے آپ کو ایک ''قوم'' سمجھ رہا ہے، اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے، اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے، تو ہرگز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی، اس کے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے، ''جماعتوں'' کے لیے نہیں، جو جماعتیں کسی طاقت ور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں، روسی کیمونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف بتیس لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت، اس سے بہت کم تھی مگر اس نے سترہ کروڑ انسانوں کو مسخر کیا، مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کے وقت صرف تین لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد، ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی، یہی حال، جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے، لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانے کی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسی طرح مجاہدہ کرے، جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی جماعتیں کیا کرتی ہیں اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کی بجائے، ایسے اصولوں کے لیے لڑے، جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔ [1]

یہ پورا اقتباس اسی مقام سے پیش کیا گیا ہے جہاں سے آخری حصہ ایک ادھورے جزو کی حیثیت سے لے کر ''مفکر قرآن'' نے پیش کیا ہے اور ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ مولانا مودودیؒ کی یہ عبارت ہندوستان کی پوری مسلم آبادی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھی گئی ہے یا یہ ان کی اپنی جماعت کے ارکان کی قلت تعداد کو پیش نظر رکھ کر انھیں خطاب کرتے ہوئے کہی گئی ہے۔

اسی واقعہ میں دوسری خیانت

اس اقتباس میں دوسری خیانت یہ کی گئی ہے کہ ترجمان القرآن کے ماہ اشاعت کا جو حوالہ دیا گیا ہے، وہ سن عیسوی کی بجائے قمری کیلنڈر سے تعلق رکھتا ہے، یعنی ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، مگر سن عیسوی کا ماہ و سال درج کرنے کی صورت میں ''مفکر قرآن''

[1] ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ (فروری ۱۹۴۱ء)، صفحہ ۴۷ تا صفحہ ۴۸

کو یہ خطرہ تھا کہ ان کی خیانت کا پردہ چاک ہو جائے گا، اس لیے انھوں نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ سن عیسوی کا ماہ و سال درج کرنے کی بجائے فقط ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ لکھ دیا جائے، کیونکہ قمری کیلنڈر کی تاریخ پڑھتے ہوئے، قاری کا ذہن کم ہی اس طرف پلٹتا ہے، کہ اس کی مطابقت عیسوی کیلنڈر کے لحاظ سے معلوم کی جائے لیکن اگر آپ تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کا زمانہ، سن عیسوی کے اعتبار سے، فروری ۱۹۴۱ء بنتا ہے، خود طلوعِ اسلام کی فائل میں جلد ۴، شمارہ نمبر ا پر جو تاریخ درج ہے، وہ-'' ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ مطابق جنوری ۱۹۴۱ء'' ہے، اس سے اگلا شمارہ ظاہر ہے کہ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ مطابق فروری ۱۹۴۱ء بنتا ہے۔ اور فروری ۱۹۴۱ء میں، جماعت اسلامی کا وجود ہی نہیں تھا، کجا یہ کہ مولانا مودودیؒ، اپنی جماعت کے ارکان کو خطاب کرتے ہوئے، وہ بات کہتے، جس کا حوالہ'' مفکر قرآن نے دیا ہے، جماعت اسلامی کی تشکیل و تاسیس کب ہوئی؟ خود طلوعِ اسلام ہی میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ

> جماعت اسلامی کا قیام، مولانا مودودی کے ہاتھوں ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں عمل میں لایا گیا، اور دار السلام پٹھانکوٹ کو اس کا مرکز قرار دیا گیا۔ [1]

اب یہ بات، واضح ہوگئی ہوگی کہ کس'' نظریۂ ضرورت'' کے تحت، '' مفکر قرآن'' نے عیسوی کیلنڈر کی بجائے قمری کیلنڈر کی تاریخ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ درج کی ہے، اگر وہ'' فروری ۱۹۴۱'' لکھ دیتے، تو ہر اس شخص پر'' مفکر قرآن'' کی خیانت کا پردہ چاک ہو جاتا، جو جماعت اسلامی کی تاریخ تاسیس و تشکیل سے واقف ہے۔

(۲) ادھوری عبارت سے غلط استدلال

قبل اس کے کہ'' مفکر قرآن'' نے دوسروں کے خلاف، عدل و انصاف کے منافی جو رویہ اپنا رکھا تھا، اس کی ایک اور مثال پیش کی جائے، اس جملہ پر غور فرمایے ...... زید کا نظام، بکر کے نظام سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ھے ......

کیا اس ایک گونہ مماثلت کا فی الواقع یہی مفہوم ہے کہ زید نے نظریات اور تنظیمی پروگرام، بکر کے نظام ہی سے لیے ہیں؟............ یا............ یہ کہ، زید کا نظام، نظریات اور تنظیمی پروگرام کے لحاظ سے، بکر کے نظام سے ہے تو مختلف ہی، (اور اسی لیے تو ان کو دو مختلف نظام قرار دیتے ہوئے، دو مختلف ہستیوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے) مگر کسی پہلو سے، دونوں میں، ایک گونہ مماثلت بھی پائی جاتی ہے؟

آپ اگر کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، اور زید کے خلاف، آپ کے دل و دماغ میں، کوئی حسد، کینہ، بغض اور عداوت نہیں ہے، تو آپ یقیناً اور فوراً، اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ'' ایک گونہ مماثلت'' سے قطعاً یہ مفہوم نہیں کہ زید نے نظریات اور تنظیمی پروگرام، سب کچھ بکر کے نظام سے اخذ کئے ہیں۔ کیونکہ دو مختلف بلکہ باہم متضاد نظاموں کے درمیان بھی کسی جزئی یا ادنیٰ سی

[1] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۶۸ء، صفحہ ۳۳

مشابہت کا پایا جانا ممکن ہے، مثلاً اسلام اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں، شخصی ملکیت کے اصول کا ہونا، قدرِ مشترک ہے، لیکن اس مماثلت کے باعث بھی، اور باوجود بھی، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دونوں نظاموں میں نظریات اور تنظیمی پروگرام بھی یکساں ہیں، یا یہ کہ ان میں سے کسی ایک نظام نے، دوسرے سے نظریات اور تنظیمی پروگرام بھی لیے ہیں، ایسی ہی، ایک جزوی سی مماثلت، اسلام اور اشتراکیت میں بھی موجود ہے کہ دونوں میں سود کی نفی پائی جاتی ہے، ان دونوں نظاموں میں، سود کی عدم موجودگی سے، اگر کوئی شخص، یہ نتیجہ نکالے کہ دونوں میں نظریات اور تنظیمی پروگرام بھی ایک سے ہیں، یا یہ کہ کسی ایک نظام نے، دوسرے سے نظریات یا تنظیمی پروگرام بھی لے لیے ہیں، تو یہ استنتاج، خلافِ حقیقت ہوگا، کیونکہ دنیا میں، آج جتنے بھی نظام پائے جاتے ہیں، ان میں سے، کسی نہ کسی پہلو سے، کسی خفیف یا ادنیٰ سی مماثلت کا پایا جانا عین ممکن ہے، خود پرویز صاحب، ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

> آپ جو معاشی نظام بھی وضع یا اختیار کریں گے اس کے کچھ گوشے ایسے ضرور ہوں گے جو دیگر معاشی نظاموں کے بعض گوشوں سے ملتے جلتے ہوں گے (اور ایسا ہی اسلامی نظام میں بھی ہوگا) اس قسم کی جزوی مماثلت، کسی نظام کو اس کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیات سے محروم نہیں کر دیتی۔ [۱]

اس تمہید کے بعد، اب ''مفکر قرآن'' کے عدل و دیانت کے منافی، اس رویہ کی مثال، ملاحظہ فرمایئے جس میں، مولانا مودودیؒ کی ایک ادھوری عبارت سے قطعی غلط نتیجہ نکالتے ہیں، وہ مولانا مودودیؒ کے، ایک پمفلٹ ''اسلام کا نظریۂ سیاسی'' کا یہ اقتباس، طلوعِ اسلام میں درج کرتے ہیں۔

> اس نوعیت کا سٹیٹ، ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرہ کو محدود نہیں کر سکتا، یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے، اس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے، یہ تمدن کے ہر شعبہ کو، اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ، اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی شخص، اپنے کسی معاملہ کو، پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا، اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے (اسلام کا نظریۂ سیاسی صفحہ) [۲]

اس اقتباس کے بعد، وہی ''اکثریت اور اقلیت'' والا اقتباس (جو پہلی مثال کے تحت گزر چکا ہے) درج کرنے کے بعد ''مفکر قرآن'' صاحب، مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے خلاف، انتہائی اشتعال انگیز استدلال، بایں الفاظ کرتے ہیں۔

> آپ نے غور فرمایا، کہ اس تحریک نے کس طرح، اپنے نظریات اور تنظیمی پروگرام، یورپ کی فاشسٹ نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیا ہے۔ [۳]

حالانکہ مولانا مودودیؒ نے ہندوستان میں بسنے والی، امت مسلمہ کو ''اقلیت و اکثریت'' والے اقتباس میں، یہ فہمائش کی ہے کہ اگر تم، اپنے ایمان و عقائد اور اصول و اقدار کے مطابق، ایک جماعت (نہ کہ قوم) بن کر اٹھو گے تو تم نازیوں اور کمیونسٹوں کی طرح قلیل التعداد ہونے کے باوجود بھی، غالب رہو گے، اور اسلامی نظریۂ سیاست کی وضاحت کرتے ہوئے، یہ بتایا ہے، کہ اساس و بنیاد سے لے کر، اوپر تک کی پوری عمارت، جو بصورت ریاست، اسلام نے قائم کی ہے، دنیا کے ہر نظام کی

---

[۱] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۰ [۲] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۴۵ تا ۴۶ [۳] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۴۶

قائم کردہ ریاست سے مختلف ہے، تاہم، پھر بھی بعض گوشوں میں، فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت، اسے حاصل ہے، اور یہ گوشہ ہائے مماثلت، ان سب ریاستوں میں ایجابیت اور ہمہ گیری کے گوشے ہیں جیسا کہ اسلامی ریاست کی خصوصیات میں سے ''ایجابی اور ہمہ گیر ریاست'' کے عنوان سے، ان کا درج ذیل اقتباس واضح کر رہا ہے۔

> **(الف) ایجابی اور همه گیر ریاست:** ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس ریاست کا تخیل پیش کر رہا ہے اس کا مقصد سلبی (Negative) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتی ہے، اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے، ان کی آزادی کی حفاظت کرے اور مملکت کو بیرونی خطروں سے بچائے، بلکہ اس کا مدعا اجتماعی عدل کے اس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے، اس کا مقصد بدی کی ان تمام صورتوں کو مٹانا ہے، اور نیکی کی ان تمام شکلوں کو قائم کرنا ہے، جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایت میں بیان کیا ہے، اس کام میں حسب موقع محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائیگی، تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائے گا، تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائیں گے، اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائے گا۔
>
> اس نوعیت کی ریاست ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتی، یہ ہمہ گیر ریاست ہے اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے، یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے، اس کے مقابلہ میں، کوئی شخص، اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا، اس لحاظ سے یہ ریاست فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتی ہے ۱

اس کے بعد ''مفکر قرآن'' نے ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت، مندرجہ ذیل جملوں کو، (جو ان کے پیش کردہ اس اقتباس کے ساتھ ہی درج ہیں) حذف کر دیا ہے، کیونکہ ان فقروں کی موجودگی میں، یہ ''ثابت'' نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ...... ''مودودیؒ کی تحریک نے اپنے نظریات اور تنظیمی پروگرام یورپ کی فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیا ہے'' ...... از راہ کرم، مندرجہ بالا اقتباس کے ساتھ ملا کر ان جملوں کو بھی پڑھ لیجیے۔

> مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس ہمہ گیریت کے باوجود، اس میں موجود، زمانے کی کلی (Totalitarion) اور استبدادی (Authoritarion) ریاستوں کا سا رنگ نہیں ہے، اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے، اس معاملہ میں، جو کمال درجہ کا اعتدال، اسلامی نظام حکومت میں قائم کیا گیا ہے، اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں، انھیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کر سکتا ہے۔ ۲

ایک گونہ مماثلت اور مطلق مماثلت

مولانا مودودیؒ نے اسلامی ریاست کی فاشستی اور اشتراکی ریاستوں سے جو مماثلت بیان کی ہے، وہ محض ''یک گونہ'' ہے، جبکہ خود، ''مفکر قرآن'' نے ''اشتراکیت'' اور قرآنی نظام میں جو قدر مشترک بیان کی ہے، وہ ''عام اور مطلق مماثلت''

---

۱ + ۲ اسلام کا نظریۂ سیاسی، صفحہ ۳۲ تا ۳۳ + اسلامی ریاست، صفحہ ۱۳۵

ہے، جو کسی قیدِ وصف سے مقید یا کسی شرط سے مشروط نہیں ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآن کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مماثل ہے۔ [۱]

''مفکر قرآن'' نے بھی کیا دوہرے معیار قائم کر رکھے ہیں، ایک اپنے لیے اور ایک مولانا مودودیؒ کے لیے۔ سید مودودیؒ محض ''یک گونہ مماثلت'' کا ذکر کریں تو ان پر یہ الزام عائد ہو جاتا ہے کہ ان کی تحریک نے نظریاتی اور تنظیمی پروگرام سب یورپی تحریکوں سے لیا ہے، لیکن اگر وہ خود مطلق مماثلت کی بات کریں تو ان پر نہ صرف یہ کہ کوئی الزام بھی عائد نہیں ہوتا بلکہ نظریاتِ قرآن اور نظریاتِ اشتراکیت میں بعد المشرقین برقرار رہتا ہے، اور اس مطلق مماثلت کے باوجود بھی دونوں نظاموں کے فلسفہ حیات (نظریات) باہم متضاد اور متناقض رہتے ہیں، اور اشتراکیت کا فلسفہ حیات (نظریات)، قرآنی نظام کی طرف اس طرح منتقل نہیں ہوتا جس طرح یک گونہ مماثلت کی بنا پر فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں کے نظریات، مودودیؒ صاحب کی برپا کردہ اسلامی تحریک میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

سوشلزم کا معاشی نظام تو، قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے، لیکن سوشلزم کا فلسفہ، قرآنی فلسفہ حیات سے نہ صرف مختلف ہے، بلکہ اس کی ضد ہے۔ [۲]

(۳) منافیٔ دیانت، ایک اور مثال

''مفکر قرآن'' نے مولانا مودودیؒ کی تحریک پر پہلے تو یہ الزام عائد کیا کہ انھوں نے نظریات اور تنظیمی پروگرام، یورپ کی فاشسٹ نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیا ہے، اور پھر اس دیوارِ الزام پر ایک رڈا اور چڑھایا۔

ان پارٹیوں کی طرح ان (مودودی صاحب) کے پیشِ نظر بھی، قوت کے ذریعے حکومت چھین کر اپنا تسلط قائم کرنا تھا، چنانچہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے کہتے ہیں کہ اسلام اپنے متبعین سے کہتا ہے کہ

تم روئے زمین پر سب سے صالح بندے ہو، لہٰذا آگے بڑھو، لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بیدخل کر دو، اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات صفحہ ۲۳۵) [۳]

......'' خدا کے باغیوں اور متمرد اور سرکش لوگوں سے اقتدار چھین کر جماعتِ مومنین کو دینا تا کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کا دین قائم کریں'' ......کیا فی الواقع اسلام کا مقصود و مطلوب اور دین کا مطالبہ ہے یا نہیں؟ اسے تو فی الحال، نظر انداز کیجئے، اور سب سے پہلے ''مفکرِ قرآن'' کے اس بہتان کو ملاحظہ فرمایئے کہ خطبات کے حوالے سے (خدا کے باغیوں سے لڑ کر، اقتدار چھیننے کی جو بات کی گئی ہے)، اسے مولانا مودودیؒ نے، اپنی جماعت کے افراد سے خطاب کرتے ہوئے کہی تھی، حالانکہ یہ عبارت، جہاد کے موضوع پر، اس خطبۂ جمعہ کا حصہ ہے، جو پٹھانکوٹ کے اردگرد کی بستیوں کے، ان مسلم افراد کے سامنے پیش کیا گیا تھا، جو نمازِ جمعہ کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے، جمعہ کے یہ خطبات، اس وقت کتابی شکل میں، اشاعت پذیر ہوئے، جبکہ جماعت اسلامی کی

[۱] نظام ربوبیت، صفحہ ۳۵۸ [۲] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲۷ [۳] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۴۶

ابھی تاسیس وتشکیل بھی نہیں ہوئی تھی، اس لیے، اپنی جماعت کے افراد سے یہ بات کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کہ اس وقت، نہ جماعت تھی اور نہ ہی اس کے افراد۔ خود طلوع اسلام کو یہ بات تسلیم ہے کہ جماعتِ اسلامی کی بنیاد ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو رکھی گئی، اور کتاب خطبات پر ''نقد ونظر'' کے زیرِ عنوان، خود طلوع اسلام ہی کے تبصرہ سے یہ ظاہر ہے کہ

> جس زمانہ میں جناب سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب، مدیر ترجمان القرآن، کا قیام، دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں تھا، وہ وہاں کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ۱

مولانا مودودیؒ کا قیام دارالاسلام، کس زمانہ میں تھا، خود پرویز صاحب، بعنوان، دارالاسلام لکھتے ہیں۔

> ابھی اس سکیم کا پورا نقشہ بھی مرتب نہ ہونے پایا تھا حضرت علامہ، دنیا سے تشریف لے گئے، اور دارالسلام ایک جسد بے روح بن کر رہ گیا۔
>
> دارالاسلام کے لیے یہی حادثہ کچھ کم جانکاہ نہ تھا کہ اس کے بعد، ایک دوسرا حوصلہ شکن واقعہ رونما ہو گیا، مودودیؒ صاحب، حیدرآباد سے، ایک سکیم اپنے ذہن میں لائے تھے جب دونوں اسکیمیں، عملی لحاظ سے، ایک دوسرے کے مقابل آئیں تو معلوم ہوا کہ ان کی اسکیم، دارالسلام کی سکیم سے کچھ مختلف تھی، اور چونکہ وہ دارالاسلام کے موجودہ قالب میں ڈھل نہیں سکتی تھی، اس لیے مولانا صاحب، دارالاسلام چھوڑ کر، لاہور تشریف لے گئے۔ ۲

یہ تحریر اگست ۱۹۳۹ء کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگست ۱۹۳۹ء سے قبل، مولانا مودودیؒ، بہرحال، دارالاسلام سے لاہور منتقل ہو چکے تھے، لیکن وہ اس جگہ آئے کب تھے؟ مولانا مودودیؒ کی یہ عبارت، جو طلوع اسلام ہی سے ماخوذ ہے، اس سوال کا جواب بایں الفاظ دیتی ہے۔

> یہ صحیح ہے کہ انھی (یعنی علامہ اقبال) کی تحریک وترغیب پر، میں حیدرآباد دکن سے دارالاسلام پٹھان کوٹ (مشرقی پنجاب) منتقل ہوا تھا، مگر افسوس، کہ جس مہینے میں دارالاسلام پہنچا، اس کے دوسرے ہی مہینے علامہ مرحوم کا انتقال ہو گیا ۳

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ، دارالاسلام میں، تقریباً مارچ ۱۹۳۸ء میں آئے تھے، کیونکہ ان کی آمد کے، دوسرے ہی مہینے (یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) علامہ اقبال فوت ہو گئے تھے، اور اگست ۱۹۳۹ء سے قبل، وہ لاہور چلے گئے تھے۔ ان کے خطباتِ جمعہ، مسجد دارالاسلام میں، اسی دوران پیش کئے گئے تھے، اور یہ پورا سلسلہ خطبات، سب سے پہلے کتابی شکل میں رمضان ۱۳۵۹ھ بمطابق نومبر ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آیا۔ جیسا کہ مولانا مودودیؒ نے طبع ہشتم کے دیباچہ میں فرمایا ہے۔

> میرے خطباتِ جمعہ کا یہ مجموعہ، سب سے پہلے نومبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ۴

اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک نہ جماعت اسلامی کا وجود قائم ہوا تھا، اور نہ ہی جماعت کے وہ افراد موجود تھے،

---

۱ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۶۷ — ۲ طلوع اسلام، اگست ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۵

۳ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۷۶ء، صفحہ ۴۴ — ۴ خطبات، دیباچہ، طبع ہشتم، صفحہ ۸

جنھیں مولانا مودودیؒ، جاہلیت کے علمبرداروں اور خدا کے باغیوں کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگ ڈور چھین کر، خدا کے نیک بندوں کے ہاتھوں میں تھما دینے کی تلقین کر رہے تھے۔

فاشسٹ عزم - سلبِ اقتدار

رہا یہ امر کہ سید مودودیؒ نے خطبات کی محولہ بالا عبارت میں "اقتدار چھین لینے" کی جو بات کی ہے، تو پرویز صاحب، اسے اپنے استحصالِ نارِوا (Undue Exploitation) کا خوب نشانہ بنایا کرتے تھے، اور حکومتِ پاکستان کے اربابِ بست و کشاد کو، مودودیؒ کے "فاشسٹ عزائم" سے خبردار کیا کرتے تھے کہ وہ اور اس کی جماعت، تمھارا اقتدار چھین لینے کے درپے ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام کا حقیقی مشن کیا ہے؟ کیا وہ کوئی اپنا نظامِ فکر و عمل رکھتا ہے جسے وہ نافذ دیکھنا چاہتا ہے؟ یا وہ سرے سے کوئی نظامِ زندگی اور ضابطۂ فکر رکھتا ہی نہیں؟ وہ لوگوں کو خود اپنے نظامِ حیات کی مشینری چلانے کے لیے، تیار کرنا چاہتا ہے یا وہ دوسروں کی مشینری کا کل پرزہ بننے کے لیے انھیں آزاد چھوڑ دیتا ہے؟ کیا وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ لفظی طور پر حق کو حق مان لینے کے اعتراف پر اکتفا کیا جائے اور اسے بالفعل نافذ کرنے کی نیت تک نہ کی جائے؟ یا یہ چاہتا ہے کہ حق کو حق جان کر، اسے دنیا میں غالب کرنے کی جدوجہد بھی کی جائے؟ کیا اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ باطل کے باطل ہونے کا قولی اعتراف ہی کافی ہے؟ یا وہ اپنے پیرووں پر یہ فریضہ بھی عائد کرتا ہے کہ دنیا کے آخری سرے تک باطل کو نیچا دکھانے کے لیے، اس کا تعاقب بھی کیا جائے؟ کیا وہ یہ چاہتا ہے کہ کلمہ کا وِرد ہونٹوں پر سجا کر، ہر باطل نظام کی چاکری کی جاتی رہے؟ یا وہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ باطل کا سر کچل کر، اقتدار اسلام کے ہاتھوں میں تھما دو؟

اگر دل میں کوئی چور نہ ہو، تو ہر شخص، جو اسلام کے مقصد و مشن سے واقف ہے، مولانا مودودیؒ کی زیرِ نظر عبارت میں کوئی نقص نہ پائے گا، بلکہ اسے عین تقاضائے اسلام قرار دے گا، فی الواقع اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ خدا سے پھرے ہوئے لوگوں سے اقتدار سلب کر کے، ان بندگانِ خدا کے ہاتھوں میں دیا جائے، جو خدا کی زمین پر، خدا کا دین قائم کرنا اور پھر غالب رکھنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام، اپنے پیروکاروں سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال - ۳۹) "تم ان سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ، فنا کے گھاٹ اتر جائے، اور دین، سارے کا سارا، اللہ ہی کے لیے ہو کر رہ جائے"۔

ایں گناہ نیست کہ در شہر شما نیز کنند

اب اگر، "خدا کے باغیوں سے، اقتدار چھین کر، اہلِ ایمان کے ہاتھوں میں دے دینا" جرم ہے، خلافِ اسلام ہے، اور اس سے "فاشسٹ عزائم" کی بو آتی ہے، تو یہ جرم تنہا، مولانا مودودیؒ ہی نے نہیں کیا، بلکہ "مفکرِ قرآن" خود بھی، یہ کہہ کر، اس کا ارتکاب کر چکے ہیں کہ:

> اسلام میں دین کا تصور یہ ہے کہ دنیا بھر کے سرکش اور متمرد انسانوں سے، قوت و حکومت چھین کر، جماعتِ مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ [1]

[1] معارف القرآن، جلد ۲، صفحہ ۳۹۱ + جوئے نور، صفحہ ۴۹

''مفکر قرآن'' کے ہاں کیا خوب دوہرے معیار ہیں۔ ایک بات، اگر مولانا مودودیؒ کہیں، تو اس میں سے فاشسٹ عزائم کی بو آنے لگتی ہے، لیکن اگر وہی بات، وہ خود کہیں، تو وہ اسلام میں دین کا تصور قرار پاتی ہے۔

تمھاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی، جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

''مفکر قرآن'' کا علم التاریخ

تفسیر قرآن کے دوران، وہ خود اپنے ہی طے کردہ اصول تفسیر کو کس قدر مرعی رکھتے ہیں؟ عربی زبان کے اصول وقواعد سے وہ کس قدر شناسا ہیں؟ اپنے مخالفین کی عبارتوں کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرنے میں، اور پھر ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے میں، وہ کس قدر دیانت دار واقع ہوئے ہیں؟ یہ سب کچھ، اب تک کی بحث سے واضح ہو چکا ہے، اب اس کے بعد، یہ بھی دیکھ لیجئے کہ علم تاریخ میں، ان کا مبلغ علم کیا ہے؟

(۱) پہلا نبی بادشاہ کون؟

دنیا بھر کی تاریخ کے علم کو تو خیر! چھوڑیے، صرف یہ دیکھئے کہ تاریخِ انبیا ورسل کے متعلق، ان کی تاریخی معلومات کیا ہیں؟ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق، ''مفکر قرآن'' لکھتے ہیں کہ

> حضرت داؤد پہلے بادشاہ ہیں جو نبی ہوئے یا پہلے نبی ہیں جو بادشاہ ہوئے، ان سے قبل، یہ دونوں منصب، ایک شخص میں جمع نہیں ہوئے تھے۔ [۱]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں

> سب سے پہلے ساؤل (طالوت) بادشاہ ہوئے، ان کے بعد، حضرت داؤد، جو ان کے داماد تھے، تخت پر بیٹھے، یہ پہلے نبی تھے، جن کو بادشاہت کا منصب ملا۔ [۲]

اب ''مفکر قرآن'' کو یہ بات کون سمجھائے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی پہلے، حضرت یوسف علیہ السلام، نبی ہو کر، یکے از ملوکِ مصر تھے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے تھے، اور حضرت داؤد علیہ السلام کا شمار، انبیائے بنی اسرائیل میں ہوتا ہے، اور بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ، حضرت یعقوب علیہ السلام تھے، جن کا لقب اسرائیل تھا، اور حضرت یوسف علیہ السلام، ان ہی کے فرزند ارجمند تھے، جو ظاہر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے متقدم الزمان تھے، نیز ان کے زمانے کا دورِ داؤدی سے متقدم ہونا، خود پرویز صاحب کی تحریروں سے بھی واضح ہے، چنانچہ وہ دور یوسفی کے متعلق فرماتے ہیں کہ

> حضرت یوسفؑ کا زمانہ، قریب (۲۱۰۰) ق-م تھا۔ [۳]

---

[۱] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۲۹ [۲] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۴۸ء، صفحہ ۵۱

[۳] برق طور، صفحہ ۴

اور زمانۂ داؤد علیہ السلام کیا ہے؟ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

ان کا زمانہ قریب ۱۰۰۰ ق-م سمجھنا چاہیے۔ ۱

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ سے تقریباً ہزار، گیارہ سو برس قبل ہو گزرے ہیں۔

حضرت یوسفؑ، رسول خدا بھی اور بادشاہ بھی

قرآنِ کریم میں چونکہ، تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد، حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں تقسیم غلہ ہی کا زیادہ ذکر پایا جاتا ہے، اس لیے بعض ناواقف لوگ، یہ گمان کرتے ہیں کہ شاید حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس، افسر خزانہ، یا افسر مال، یا قحط کمشنر، یا وزیر مالیات، یا وزیر خوراک، یا ناظم غذائیات کی قسم کا کوئی عہدہ ہوگا، لیکن قرآن، بائیبل اور تلمود کی متفقہ شہادت ہے کہ درحقیقت حضرت یوسفؑ، سلطنتِ مصر کے مختار کل تھے، اور ملک کا سیاہ و سفید سب کچھ ان کے اختیار میں تھا، قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر پہنچے، تو اس وقت حضرت یوسفؑ، تخت نشین تھے (رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ)۔ حضرت یوسفؑ کی اپنی زبان سے نکلا ہوا، یہ فقرہ، قرآن میں منقول ہے کہ "اے میرے رب! تو نے مجھے بادشاہی عطا کی (رَبِّ قد اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ)۔ پیالے کی چوری کے موقع پر، سرکاری ملازم، حضرت یوسف کے پیالے کو "بادشاہ کا پیالہ" کہتے ہیں (قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِکِ) اللہ تعالیٰ، مصر پر ان کے اقتدار کی کیفیت، یہ بیان فرماتا ہے کہ ساری سر زمین مصر ان کی تھی (یَتَبَوَّءُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ)۔

خود پرویز صاحب، قرآنی آیت وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ کے تحت لکھتے ہیں کہ

> تمکن فی الارض اور ایسا تمکن، کہ آپ کے اختیارات میں کوئی دخل انداز نہ ہو، جہاں چاہیں اپنا حکم چلائیں، دنیا میں حسن عمل اور تطہیر فکر و نظر کی اس سے بڑی جزا اور کیا ہو سکتی ہے۔ باقی رہی، دنیا سے اگلی منزل، سو وہاں کے مدارج و مناصب کے کیا کہنے! ۲

دعائے یوسفی، رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ کا ترجمہ، ان الفاظ سے کرنے کے بعد، کہ "پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی" تشریحاً لکھتے ہیں

> غور فرمایئے، دنیا کی حکومت اور شوکت کے ساتھ ساتھ دعا کیا مانگی جارہی ہے، کہ جب دنیا سے جاؤں تو ایک عبد مسلم کی حیثیت سے جاؤں اور عاقبت میں تیرے صالح بندوں کے زمرہ میں شریک ہوں۔ ۳

پرویز صاحب کی یہ عبارتیں، اس امر میں قطعی واضح ہیں کہ انھیں جو "دنیا کی حکومت اور شوکت" ملی، اور جو "تمکن فی الارض" ملا، اور جس کی کیفیت یہ تھی کہ "آپ کے اختیارات میں کوئی دخل انداز نہ ہو، جہاں چاہیں، اپنا حکم چلائیں" وہ ایک

---

۱ برق طور، صفحہ ۲۴۰ + معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۳۹۴ ۲ جوئے نور، صفحہ ۲۴۵ تا صفحہ ۲۴۶ ۳ جوئے نور، صفحہ ۲۶۴

بادشاہت ہی تھی، جو نبوت کے ساتھ جمع تھی، اور اس حیثیت سے، آپؑ نبی و رسول ہو کر شاہانہ اقتدار اور شوکتِ بادشاہی پا کر، زمانہ کے اعتبار سے بھی، حضرت داؤد سے بہت پہلے ہو گزرے ہیں لیکن ''مفکر قرآن'' ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو سب سے پہلے پیغمبر قرار دیے جا رہے ہیں، جو دنیاوی تخت و تاج کے بھی مالک تھے۔ یہ ہے ان کا مبلغ علم۔

(۲) سپین پر مسلمانوں کا عرصہ اقتدار؟

''مفکر قرآن'' کی تاریخی معلومات کا ذخیرہ کس قدر وسیع تھا؟ ان کی درج ذیل تحریر بھی اس امر کو واضح کر دیتی ہے۔ مسلمانوں نے سپین پر کسقدر حکومت کی؟ عرصۂ اقتدار کتنا تھا؟ فرماتے ہیں

ذرا غور کیجئے، اسپین پر مسلمانوں نے تین سو سال حکومت کی، اور اس شان و شوکت سے کی کہ آج تک اس کی یاد باقی ہے۔ ۱

''مفکر قرآن'' اگر آسمانِ پندارِ علم سے اتر کر، زمینی حقائق کا مطالعہ کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ مسلمانوں نے سپین پر تین سو سال نہیں، بلکہ عیسوی کیلنڈر کے مطابق، سات سو اکاسی (۷۸۱) برس اور ہجری سال کے مطابق، آٹھ سو پانچ (۸۰۵) برس حکومت کی تھی، کیونکہ

الاندلس: (نیز الاندلس)

موجودہ ہسپانیہ اور پرتگال پر مشتمل قدیم اسلامی ملک، جہاں مسلمانوں نے، آٹھ سو برس (۹۲ھ/۷۱۱ء تا ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء) حکومت کی۔ ۲

مسلمانوں نے اسپین پر تین سو برس حکومت کی؟ یا آٹھ صدیوں تک؟ پروفیسر محمد رضا خان صاحب فرماتے ہیں۔

تقریباً آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد، مسلمانوں کا سپین سے حرف غلط کی طرح مٹ جانا، ایک تلخ مگر تاریخی حقیقت ہے۔ مادی ترقی کے نشے میں سرشار ہو کر، احکام خداوندی سے انحراف کرنے کا انجام، تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سپین میں امویوں، مرابطین اور موحدین نے شاندار محلات تعمیر کیے۔ علوم و فنون کو فروغ دیا اور اپنے شاندار کارناموں سے دنیا کو ششدر کر دیا مگر مرور ایام کے ساتھ ساتھ وہ ان اصولوں سے غافل ہو گئے جن پر ایک صحت مند معاشرہ کی بقا کا انحصار ہوتا ہے، وہ ان اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے جو بالآخر ان کے سیاسی نظام کو کھوکھلا کرنے کا باعث بن گئیں۔ ایسے حالات میں، ان کا عیسائیوں کے ہاتھوں پٹ جانا، ایک قدرتی امر تھا۔ ۳

یہی مصنف ذرا آگے چل کر لکھتا ہے

سپین پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو برس تک حکومت کی۔ ان کے کارناموں کے مدنظر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی کے شروع تک وہ یورپ میں تہذیب و تمدن کے علم بردار تھے۔ جب سارا یورپ جہالت کی تاریکی میں غرق تھا تو سپین کے مسلمانوں نے اپنے علمی کارناموں کی ضیا پاشیوں سے سارے یورپ کو منور کیا اور مختلف شعبوں میں ترقی

---

۱ طلوع اسلام، جون ۱۹۴۲ء، صفحہ ۹　۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۴، اشاریہ، طبع اول ۱۹۹۳ء

۳ قدیم و جدید تاریخ مسلمانانِ عالم، صفحہ ۴۱۰

کر کے اپنے کمالات کا بیش بہا ذخیرہ مغربی یورپ کی اقوام کے لیے قیمتی ترکے کی صورت میں چھوڑا۔ [1]

سرزمینِ اندلس پر، مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت پر مندرجہ ذیل اقتباس بھی دلالت کرتا ہے۔

جس تہذیب و تمدن پر آج یورپ اسقدر ناز کرتا ہے، وہ عرب کے اُن بادیہ نشینوں کی دی ہوئی بھیک ہے، جنھوں نے سرزمینِ اندلس پر آٹھ سو سال تک حکومت کی، اور علم و فضل کی ایسی لازوال شمعیں روشن کیں جن کی ضیا پاشیوں نے نہ صرف اندلس کو صدیوں تک منور کیا بلکہ یورپ کی جہالت کی تاریکیوں کو بھی تابناک اجالوں سے بدل دیا۔ اسی کے زیر اثر سارے یورپ میں تحریکِ احیائے علوم معرضِ وجود میں آئی، اور یورپ علم و فکر کی نئی منزلوں سے روشناس ہوا۔ [2]

ڈاکٹر غلام جیلانی برق، جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ آخری عمر میں، وہ مسلک انکارِ سنت سے رجوع کر چکے تھے، فرماتے ہیں۔

جب ۷۱۱ء میں طارق جبر الٹر پر اترا، تو اس وقت سپین پر غربی گاتھ کی حکومت تھی، روڈرک (Roderick)، جو اس شاخ کا آخری بادشاہ تھا، طارق سے شکست کھا کر بھاگا، اور دریائے وادی الکبیر کو عبور کرتے ہوئے، ڈوب گیا، اسلامی فوجیں نہ صرف سپین پہ چھا گئیں، بلکہ فرانس میں ٹورس (Tours) تک جا پہنچیں، جو پیرس سے اندازاً ۱۸۰ میل جنوب مغرب میں واقع ہے، البتہ چند سردار شمالی پہاڑوں میں چھپ گئے، اور وہاں انھوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنالیں، جن میں سے اراگان اور قسطیلہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انھی ریاستوں نے آٹھ سو سال بعد اسلامی حکومت کو ختم کیا، اور تمام مسلمانوں کو سپین سے نکال دیا۔ [3]

ریاست اراگان کا ساتواں بادشاہ مارٹن (۱۳۹۵-۱۴۱۰) بے اولاد مر گیا اور امرا دربار نے قسطیلہ کے فردینان (Ferdinand) سے، جو قسطیلہ کا بادشاہ تھا، درخواست کی کہ وہ اراگان کی بادشاہی بھی قبول کر لیں، خود فردینان (Ferdinand) قسطیلہ کے بادشاہ، جان دوم (John II) کی جگہ بادشاہ بنا تھا کیونکہ جان دوم، ابھی بچہ تھا اور بار سلطنت نہ سنبھال سکتا تھا، پھر قسطیلہ کا اقتدار ہنری چہارم کو ملا جبکہ اراگان پر اب بھی فردینان ہی کی حکومت تھی، ہنری چہارم کے بعد ازابیلا (Isabella) ۱۴۷۴ء میں تخت نشین ہوئی، تو اراگان کے بادشاہ فردینان سے شادی کر لی، اس طرح دونوں سلطنتیں ایک ہو گئیں، پھر دونوں نے ۱۴۹۲ء میں مسلم حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا۔

ایک اور مقام پر، برق صاحب لکھتے ہیں کہ

طارق نے ۷۱۱ء میں سپین پر حملہ کیا تھا، یہ ملک ۷۵۰ء تک خلفائے اموی (دمشق)، اور پھر ۷۵۶ء تک خلفائے عباسیہ کے تحت رہا، لیکن زوالِ امیہ کے بعد حالات نے ایک نئی کروٹ لی، جب عباسیوں نے دمشق پر قابض ہونے کے بعد، خاندان امیہ کا صفایا شروع کیا تو خلیفہ ہشام (۷۲۴-۷۴۳) کا پوتا، عبدالرحمٰن بچ بچا کر مراکش پہنچ گیا، اور وہاں سے امرائے اندلس کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی، جب اسے ان امرا کی حمایت کا یقین ہو گیا تو ۷۵۵ء میں وہاں پہنچا اور ۷۵۶ء میں ملک کی سیادت سنبھال لی، ابتدا میں یہ خلفاء، سلاطین کہلاتے تھے، ۹۲۹ء میں عبدالرحمٰن ثالث نے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۱۰۳۱ء

[1] قدیم وجدید تاریخ مسلمانانِ عالم، صفحہ ۴۱۲ [2] تاریخِ اسلام، صفحہ ۵۱۶ [3] یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ ۵۶

میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور جا بجا چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئیں، کچھ ریاستیں، ان خلفا کے عہد ہی میں تشکیل پا چکی تھیں، اشبیلیہ کے بنوعباد نے کسی حد تک اس طوائف الملوکی کو ختم کیا، اور پھر عیسائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے افریقہ کے مرابطین سے مدد مانگی، انھوں نے مدد کی، لیکن بنوعباد کا تخت خود سنبھال لیا، حالات یونہی چلتے رہے، یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں فردینان نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۱

ایک اور مقام پر، یہی مصنف لکھتا ہے کہ

مسلمانوں نے ہر ملک میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ، اسی طرح کا عادلانہ اور فیاضانہ سلوک روا رکھا، لیکن جب ہم پر کسی قوم نے غلبہ پایا، تو وہاں سے ہمارا نشان تک مٹا دیا، ہم سسلی میں دوسو چونسٹھ (۲۶۴)، اور سپین میں سات سو اکاسی (۷۸۱) برس تک حکمران رہے، لیکن آج وہاں ایک بھی مسلمان باقی نہیں ہے، ہندوستان پر ہمارا علم، ایک ہزار برس لہراتا رہا، لیکن اب وہاں نسل کشی کی ایک خوفناک مہم، سترہ برس سے جاری ہے، ۲

ایک اور مقام پر، یہی مصنف، اسی کتاب میں، سپین میں مسلم اقتدار کا ذکر، بایں الفاظ کرتا ہے۔

کسی وقت، اسلام نے بھی نوآبادیات قائم کی تھیں، ہم عرب سے نکل کر، جنوب میں ملتان، شمال میں بحیرۂ اسود، مشرق میں چینی ترکستان اور مغرب میں مراکش اور سپین تک جا پہنچے تھے، ہم سپین میں آٹھ سو برس رہے، ہند پر ہزار سال حکومت کی۔ ۳

نسیم حجازی کا صحافت کی دنیا میں ایک بلند اور ممتاز مقام ہے، وہ اخبار ''کوہستان'' کے برسوں ایڈیٹر رہے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ انھوں نے علی گڑھ سے، ایم اے تاریخ کیا تھا، وہ اپنے تاریخی ناولوں میں، ان گوشوں کو اجاگر کیا کرتے تھے، جو بالعموم مورخین کی نگاہوں سے مخفی اور اوجھل رہے ہیں، وہ اپنے ناولوں میں جو تاریخی حقائق بیان کرتے ہیں، وہ بہر حال، مستند ہیں، اگرچہ ان کی کہانی کے کردار ہر افسانہ و ناول کی طرح فرضی ہوا کرتے ہیں، چنانچہ وہ اپنے ایک ناول کی ابتدا ہی، اِن حقیقت کشا الفاظ سے کرتے ہیں۔

میرے سامنے تاریخ کے وہ اوراق بکھرے پڑے تھے، جب اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت............''غرناطہ'' کی تباہی کے بعد، وہ عظیم قوم بھی مٹ گئی تھی، جس کے غازیوں نے آٹھ صدیوں قبل، جبل الطارق کے سامنے، اپنی کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ ۴

یہاں سات سو اکاسی برس کی مدت کو، اکائیوں اور دہائیوں کی کسور کو نظر انداز کر کے، آٹھ صدیوں پر مشتمل مدت قرار دیا گیا ہے، جو ظاہر ہے کہ رواروی میں ایک معمولی بات ہے۔ جبکہ قمری کیلنڈر کے مطابق ۸۰۵ سال کی مدت میں، پانچ سال کی اضافی کسر کو نظر انداز کر کے، آٹھ صدیاں کہا گیا ہے۔

اس کے بعد (The Columbia Encyclopedia) میں لفظ Spain کے تحت دیے گئے، ان الفاظ کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

... Politically, the visigothic kings were weak and dependent on the

---

۱ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ ۱۱۴
۲ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ ۸۳
۳ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ ۳۱۰
۴ اندھیری رات کے مسافر، (پیش لفظ)، صفحہ ۵

powerful clergy and nobles. When in 711, a Muslim Berber army under TARIK crossed the Strait of Gibralter into Spain, the last visigothic king RODERICK was defeated and his kingdom collapsed.

. . . .

The fall of Granada (1492) made FERDINAND V and ISABELLA I, rulers of all Spain. ✯

انسائیکلو پیڈیا کولمبیا کا یہ اقتباس، اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ مسلمان ۷۱۱ء میں سپین میں وارد ہوئے، اور ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے نتیجہ میں، ان کا اخراج ہوا، اس اعتبار سے ان کا عرصۂ اقتدار، ۷۸۱ برس (۷۱۱ء تا ۱۴۹۲ء) بنتا ہے، جسے بعض لوگ کسری عدد کو نظر انداز کرتے ہوئے، آٹھ سو برس کہہ دیتے ہیں۔ اس بحث سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کی تاریخی حقائق پر نظر کس قدر وسیع ہے۔

''مفکرِ قرآن'' کا علمِ تاریخِ فقہ

''مفکرِ قرآن'' تاریخ فقہ کی بابت، کس قدر وسیع معلومات کے حامل تھے؟ اس کا اندازہ، ان کی مندرجہ ذیل عبارت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

> اربابِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین، ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے، امام شافعی نے پیش کیا تھا، اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو، کہ اس کی مخالفت امام اعظم نے کی تھی۔ [1]

اربابِ علم سے یقیناً، یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ ''مفکرِ قرآن'' اپنے مخالفین کی عبارات کو، مسخ و تحریف کا نشانہ بنا کر، بنائے فاسد علی الفاسد کی تعمیر کیا کرتے تھے، ہمیں آج تک، امام شافعی کا کوئی ایسا فرمان نہیں مل سکا، اور نہ ہی کوئی آدمی، امام شافعی کی کوئی ایسی تحریر دکھا سکتا ہے، جس میں یہ کہا گیا ہو کہ...... ''ایک دور کے قوانین، ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہوتے ہیں''۔

بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کی بات کو، کبھی تو سیاق و سباق سے کاٹ کر، ان کے خلاف بہتان تراشی کرتے ہیں، اور کبھی ان کی بات کو، خود ان کے الفاظ میں پیش کرنے کی بجائے، اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں اور مفہوم کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے ہیں، اور پھر اس بدلے ہوئے مفہوم پر، اپنے ذوقِ تردید اور شوقِ تنقید کو پورا کرتے ہیں، لیکن منکرینِ حدیث، اس معاملہ میں، سب سے آگے بڑھ کر، یہ حرکت بھی کرتے ہیں کہ اپنی طرف سے ایک بات گھڑ کر، اسے اپنے مخالفین کی طرف منسوب کر کے، ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کے مصداق، یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ دوسرے لوگ، ان کے خلاف یہی گھٹیا رویہ اختیار کرتے ہیں، جو دراصل، خود ان کا رویہ ہوتا ہے، چنانچہ ایک مقام پر طلوعِ اسلام لکھتا ہے کہ

---

[1] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۹ء، صفحہ ۵۴

✯ The Columbia Encyclopedia, Page 2009.

ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے، وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ "طلوعِ اسلام" کہتا ہے، اسے اس کے الفاظ میں، اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے، اس پر قرآنِ کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں، اور اسے طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینی شروع کر دیتے ہیں۔ [۱]

حالانکہ خود "مفکرِ قرآن" اور طلوعِ اسلام کی یہ خصلتِ بد، یہاں کھل کر سامنے آ رہی ہے کہ امام شافعی کی بات کو، خود ان کے الفاظ میں پیش کرنے سے اجتناب کر رہے ہیں اور اپنی طرف سے، یہ غلط بات وضع کرتے ہیں کہ................ "کسی ایک دور کے قوانین، ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہوتے ہیں"............................ اور پھر اسے امام شافعی کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

جھوٹ اور وہ بھی سو فیصد

اور اس سے بھی بڑا جھوٹ، جو یہاں "مفکرِ قرآن" نے بولا ہے، یہ ہے کہ................ "امام شافعی کے اس نظریہ کی مخالفت، امام اعظم نے کی تھی"................ حالانکہ امام اعظم ۱۵۰ھ کو فوت ہوئے ہیں اور اسی سال (یعنی ۱۵۰ھ کو) امام شافعی پیدا ہوئے ہیں۔ پیدائش کے بعد حصولِ تعلیم میں، اور پھر تعلیم و تدریس علم میں، بہرحال، کئی سال لگے ہوں گے، اور یہ نظریہ، جو "مفکرِ قرآن" نے بہتانا، ان کی طرف منسوب کیا ہے، یقیناً، امام اعظم کی وفات کے سالہا سال بعد ہی پیش کیا ہوگا، پھر اس صورت میں یہ کہنا کہ................ "آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت، امام اعظم نے کی تھی"........... واقعی، اس لحاظ سے باعثِ حیرت ہی ہے کہ امام اعظم کے اعصاب پر، امام شافعی ایسے سوار تھے کہ قبر میں مدفون ہو کر بھی، انہیں، امام شافعی کی مخالفت کے سوا، اور کوئی کام ہی نہ تھا۔

اب رہا یہ امر کہ کیا امام اعظم کی وفات اور امام شافعی کی پیدائش، واقعی ۱۵۰ ہجری کو ہوئی تھی، تو اس کا ثبوت، کسی اور کتاب سے دینے کی بجائے، مفکرِ قرآن ہی کے قلم سے دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

ان آئمہ فقہاء کی تعداد تو بہت زیادہ تھی، لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی یعنی

(۱)	امام اعظم	پیدائش ۸۰ھ	وفات ۱۵۰ھ
(۲)	امام مالک عینی مدنی	پیدائش ۹۳ھ	وفات ۱۷۹ھ
(۳)	شافعی امام	پیدائش ۱۵۰ھ	وفات ۲۰۴ھ
(۴)	امام احمد بن حنبل	پیدائش ۱۶۴ھ	وفات ۲۴۱ھ [۲]

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "مفکرِ قرآن" بہتان تراشی اور کذب و زُور سے کام لینے میں، کس قدر دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

---

[۱] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۹ء، صفحہ ۶۱ [۲] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۹ء، صفحہ ۴۹

''مفکرِ قرآن'' کی تاریخ برِصغیر سے واقفیت کا عالم

اب ایک نظر، اس امر پر بھی ڈال لیجئے، کہ ''منکرینِ حدیث'' نے جس شخص کو ''علامہ'' اور ''مفکرِ قرآن'' جیسے القاب سے نواز رکھا تھا، اپنے ملک کی تاریخ سے متعلق، اس کا مطالعہ کس قدر عمیق اور وسیع تھا، ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں۔

جوں جوں سرسید اپنے مشن میں کامیاب ہوتا جاتا تھا، مولوی صاحبان کی مخالفت، شدید سے شدید تر ہوتی جاتی تھی، جب ان کے کفر کے فتوے اور جھوٹا پراپیگنڈہ کامیاب نہ ہوا، تو انھوں نے، اس کے خلاف، ایک منظم عملی قدم اٹھایا، اور علی گڑھ کالج کے بالمقابل، ایک دار العلوم (دیوبند) قائم کر دیا۔ [1]

کہا جاتا ہے کہ سچ کی تو کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے، لیکن جھوٹ کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوتی جہاں پہنچ کر کوئی جھوٹا آدمی رک جائے، حقیقت کی کہانی، تو بہرحال کہیں جا کر، ختم ہو جائے گی، لیکن جھوٹ کی کہانی کی کوئی انتہاء نہیں، کاذب اور مفتری جسقدر رچاہے، اپنی حکایتِ زُور کو دراز سے درازتر کرتا چلا جائے، کوئی ''مفکرِ قرآن'' کے اباطیل واکاذیب کا کہاں تک تعاقب کرے۔ پاکستان میں طلوعِ اسلام کے اجرا سے لے کر، پرویز صاحب، اپنی موت کی آخری ہچکی تک، اپنے مخالفین کے خلاف بالعموم، اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے خلاف بالخصوص، وہ تمام حربے اور ہتھکنڈے وسیع پیمانے پر، اختیار کرتے رہے ہیں، جو ایک شریف آدمی کو بھی زیب نہیں دیتے، کجا یہ کہ، کسی مفسرِ قرآن کے شایانِ شان ہوں، قرآنی مفردات کی تحقیق میں لغوی تحریف، آیات کے تراجم میں تغییر، تفسیرِ قرآن میں نت نئی ترمیم، قواعدِ زبان سے چشم پوشی اور کہیں تغافل شعاری، دوسروں کی عبارتوں کو سیاق وسباق سے کاٹ کر، انھیں غلط معانی پہنانا، خودساختہ نظریات کو ائمہ کرام اور علمائے عظام کے سر تھوپنا، تاریخی حقائق کو مسخ کرنا وغیرہ، میں سے وہ کونسا حربہ ہے جو انھوں نے اختیار نہیں کیا۔

اب یہاں زیرِ بحث اقتباس سے یہ بالکل واضح ہے کہ یا تو وہ تاریخ برِصغیر سے قطعی ناواقف تھے اور انھیں اس بات کا علم ہی نہیں کہ دار العلوم دیوبند کب قائم ہوا؟ اور مدرسۂ علی گڑھ، اور پھر کلیۂ علی گڑھ کب اساس پذیر ہوئے؟ یا پھر حقائق کو مسخ کرنا، ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی اور وہ جھوٹ بولے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے، جو بےساختہ اور غیر شعوری طور پر، ان کی زبانِ قلم سے، اس طرح نکل جایا کرتا تھا جیسے کسی عابد و زاہد کی زبان سے کلمۂ خیر ارتجالاً نکل جایا کرتا ہے۔

برِصغیر کی تاریخ کا مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ دار العلوم دیوبند، علی گڑھ کے تعلیمی اداروں سے پہلے قائم ہوا تھا۔ دار العلوم، کے قیام و تاسیس کے وقت، سرسید کا کوئی بھی تعلیمی ادارہ موجود نہ تھا، جس کی ضد اور جس کے مقابلہ میں، دیوبند کی درسگاہ کی تعمیر عمل میں آتی، دار العلوم دیوبند کی بنیاد کب رکھی گئی؟ مندرجہ ذیل اقتباس، اسے واضح کر دیتا ہے۔

۳۰ مئی ۱۸۶۷ء بروز جمعرات، دیوبند کی مسجد چھتہ میں، انار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں، اس عظیم درس گاہ کا افتتاح ہوا۔ [2]

اب رہی علی گڑھ کالج کی بنیاد، تو اس کا زمانہ، خود طلوعِ اسلام کی زبانی، ملاحظہ فرمایئے:

---

[1] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۴ء، صفحہ ۳۴

[2] تحریک دتاریخ پاکستان (ازمحمد عبداللہ ملک)، صفحہ ۶۴

۲۴ مئی ۱۸۷۳ء سر سید کے خوابوں کی اولین تعبیر، مدرسہ علی گڑھ کے قیام کی صورت میں، منظر عام پر آ گئی، جولائی ۱۸۷۶ء میں سر سید، ملازمت سے مستعفی ہو کر علی گڑھ چلے آئے، اور اپنی زندگی کو پوری طرح، اس محبوب مقصد کے لیے وقف کر دیا جس سے ملت کی نشاۃ ثانیہ اور مستقبل کی کامرانیاں وابستہ تھیں۔ اب ان کی شب و روز کی مسلسل مساعی سے کام کی رفتار تیز ہو گئی چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو وہ مبارک دن بھی آ گیا جب لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے علی گڑھ پہنچ کر، کالج کا سنگ بنیاد رکھا، اور یہ دارالعلوم، قومی یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچنے کے لیے، ارتقائی منازل طے کرنے لگا۔ [1]

اس سے واضح ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کو، ''مفکر قرآن'' نے سر سید کے خلاف، جس علی گڑھ کالج کے بالمقابل، علما کا ایک ''منظم عملی قدم'' قرار دیا ہے، وہ اس وقت سرے سے موجود ہی نہ تھا، علی گڑھ کے اس کالج کا سنگ بنیاد، دیوبند کی درسگاہ کے آٹھ دس سال بعد رکھا گیا تھا، نیز اس سے یہ بات بھی، آفتاب نیمروز کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یا تو وہ برصغیر کی تاریخ سے مطلق جاہل و بے خبر تھے، یا پھر وہ، حقائق کو مسخ کرنے، اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے عادی تھے، اور اپنے مخالفین کے خلاف، جھوٹ بولنے میں، انھیں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی، لیکن، بہر حال، اس اعتبار سے وہ انتہائی خوش قسمت تھے کہ اندھے مقلدین کا ایک ٹولہ انھیں نصیب ہو گیا، جو ان کے ان گھٹیا ہتھکنڈوں اور پرویزی حیلوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے، ان کے حق میں، حقیقت کے برعکس، یہ پراپیگنڈہ کیا کرتا تھا کہ

۱- جہاں تک، ان کے حسن کردار کا تعلق ہے، میں اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ ہم نے، اپنے پچیس سالہ تعلقات میں، انھیں ہمیشہ معاملات کا کھرا، بات کا سچا اور وعدہ کا پکا پایا ہے۔ [2]

۲- پرویز صاحب ایک روشن شمع تھے، ان کا نام، رہتی دنیا تک یاد رہے گا .... وہ بڑے با اصول اور با کردار تھے، تاریخ شاہد ہے کہ ایسے انسان کبھی کبھی اور بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ [3]

۳- معاملات کے کھرے، بات کے سچے، وعدے کے پکے، یہ ہے ان کا ہمارے ساتھ اندازِ روابط و مراسم [4]

۴- اس بے اعتماد دنیا میں کم از کم ایک انسان تو ایسا ہے جس پر میں پورا پورا اعتماد کر سکتی ہوں، یہ قابلِ اعتماد انسان ہے پرویز، کہ جو کچھ اس کی زبان پر ہوتا ہے، وہی کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے۔ [5]

نتیجة البحث

یہ پوری بحث، اس تفسیر (مطالب الفرقان) کی قدر و قیمت کو واضح کر دیتی ہے، جسے لکھنے والا، نہ تو صحتِ عقائد اور سلامتی فکر ہی کا حامل ہے، اور نہ ہی تقویٰ و دیانت کا جوہر ہی اس کے طرزِ عمل میں پایا جاتا ہے، جس کا منطقی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے عقائد فاسدہ اور افکارِ زائفہ، نہ صرف یہ کہ نصوص کی تحریف پر، اسے ابھارتے رہے ہیں بلکہ نقلِ اخبار میں بھی خیانت و

[1] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵۱
[2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۳۵
[3] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۱۶
[4] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۹
[5] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۵ء، صفحہ ۵۲

بدیانتی پر اکساتے رہے ہیں، پھر ایک جذباتی، جوشیلی اور تندمزاج اور غیر متوازن شخصیت ہونے کی بنا پر، اپنے مخالفین کی مخالفت میں بھی، عدل و انصاف کی روش اپنانے کی بجائے، ایسا غلط طرز عمل اپناتے رہے ہیں، جو ان کے کبرِ نفس کے لیے موجب تسکین رہا ہے، غیروں کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے کاٹنا، ان کی غلط ترجمانی کرنا، دوسروں کے الفاظ میں اپنے ہی مفاہیم و مطالب کی تلاش و جستجو کرنا، اور واقعات و حقائق کو مسخ کرتے رہنا، کسی صورت بھی ایک شریف النفس شخص کے شایانِ شان نہیں کجا یہ کہ ایسی باتیں، اس ذات کے لیے سزاوار ہوں جو کلام اللہ کی تفسیر لکھ رہا ہو، اور وہ بھی اس اہلیت و قابلیت کے ساتھ، کہ عربی زبان پر عبور و مہارت کا ہونا تو ایک طرف، اسے اس زبان کا، اور اس کے قواعد و ضوابط کا ابتدائی علم تک نہ ہو، افعال کی معرفت سے یکسر عاری ہو، فعل امر اور فعل مضارع میں فرق و امتیاز سے قاصر ہو، عربی مفردات میں زیر(ِ) اور زبر(َ) کے تغیر سے، جو فرقِ معانی واقع ہوتا ہے، اسے جہالت و بے علمی کی بنا پر، یا دیدہ دانستہ شرارت کی بنا پر، نظر انداز کر کے، محض اپنے ہی مدعا و مقصد کی دھن میں، قواعدِ زبان کی مخالفت کرتا رہا ہو، تاریخی حقائق کا یا تو نہایت سطحی مطالعہ رکھتا ہو، یا پھر جان بوجھ کر، انھیں معکوس و منقلب کر دینے کا عادی رہا ہو، ایسی شخصیت کے حامل ''مفکرِ قرآن'' کی تفسیر کا، میزانِ علم و حقیقت میں جو وزن قرار پا سکتا ہے، اس کا ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

اس تفسیر کی حقیقی قدر دانی، تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دل و جان سے مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں، لیکن شومئی قسمت سے، اپنی مرضی کے خلاف مسلم گھرانوں میں پیدا ہو چکے ہیں، اس لیے وہ آرزومند ہیں کہ روش تو مغربی آقاؤں ہی کی اختیار کی جائے، لیکن قرآن کی سند بھی، ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، یا پھر اس کے اصلی قدر دان، وہ لوگ ہیں، جو اپنا عقیدہ و ایمان، بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ، صاحبِ تفسیر کی جیب میں ڈال کر، خود غور و فکر اور سوچ بچار کی صلاحیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اور اب ان لوگوں نے اپنی آنکھوں پر، صاحبِ تفسیر کے ساتھ عقیدت و الفت کی ایسی عینک چڑھا رکھی ہے، جس میں انھیں اپنی محبوب شخصیت کے عیوب و مثالب بھی فضائل و کمالات دکھائی دیتے ہیں، اور دوسروں کی اچھائیاں اور خوبیاں بھی، برائیاں اور نقائص ہی دکھائی دیتی ہیں۔

باب ۳

تفسیر مطالب الفرقان
اور
علوم القرآن

باب ۳

تفسیر مطالب الفرقان اور علوم القرآن

قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے، جو خاتم الکتب ہے، اور ایسے پیغمبر پر نازل ہوئی، جو خاتم الانبیا ہیں، اور ایسی شریعت لے کر آئی، جو خاتم الادیان ہونے کے ساتھ ساتھ، خاتم الشرائع بھی ہے۔

یہ خالق کی طرف سے لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے، ایک دستور العمل ہے، اہل زمین کے لیے، ایک سماوی قانون ہے، جس میں اس کے نازل کرنے والے نے، اپنے قانون کو انتہائی شکل میں پیش کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہر سعادت کو وابستہ کر دیا ہے۔

قرآن مجید، دین قیم کا ایک ایسا قلعہ ہے، جو اپنے عقائد و ایمانیات میں، عبادات و احکام میں، آداب اور اخلاق میں، قصص اور مواعظ میں، نیز علوم اور معارف میں معتمد علیہ ہے۔

یہ کتاب بلند پایہ عربی ادب کا ایک ایسا معیار ہے کہ عربی زبان، خود اپنی بقا و سلامتی کے لیے محتاجِ قرآن ہے، اور یہ زبان، اپنے جملہ علوم --- باوجودیکہ ان میں کثرت بھی ہے اور تنوع بھی --- قرآن ہی سے اخذ کرتی ہے، قرآن ہی کی بدولت، عربی زبان کو دیگر السنہ پر اسلوبِ بیان اور موضوعِ بیان کے اعتبار سے تفوق حاصل ہے۔

المختصر یہ کہ، قرآن اول و آخر ایک ایسی قوت ہے، جس نے دنیا کی شکل و صورت بدل ڈالی، ملکوں کی حدود و ثغور میں تبدیلی پیدا کی، تاریخ کا دھارا موڑ دیا، اور پستیوں میں گری پڑی، انسانیت کو عروج و کمال بخشا۔

چونکہ قرآن کریم، دین اسلام کی اولین اساس ہے، اس لیے اہل اسلام کے اعتنا و توجہ کا سب سے زیادہ مرکز، یہی کتاب رہی ہے، رسول اکرم ﷺ صحابہ کرامؓ، تابعین و تبع تابعینؒ الغرض، امت مسلمہ کے سلف و خلف سب کی دلچسپی کا محور، یہی کتاب رہی ہے اور یہ وابستگی، دورِ نزولِ قرآن سے لے کر اب تک برقرار ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک باقی و برقرار رہے گی، چنانچہ قرآن کریم کے ساتھ، ملت اسلامیہ کی اس دلچسپی نے کئی شکلیں اختیار کی ہیں، کبھی یہ اعتناء، الفاظِ قرآن اور اس کی صحتمند ادائیگی کے علم کا سرچشمہ ٹھہرا، اور کبھی یہ دلچسپی، قرآن کی کتابت اور اس کے رسم الخط پر معلومات کی فراہمی کا ذریعہ بنی، اور کہیں اس نے اسلوبِ قرآن اور اعجاز القرآن کے پہلو سے وسیع جولانگاہِ تحقیق پیدا کی، اور کہیں قرآن سے تعلق، الفاظ کی لغوی تحقیق اور اس کے ادبی مقام کو اجاگر کرنے کا محرک قرار پایا، اور کہیں قرآن کے ساتھ یہ اعتناء، تشریع و تقنین کا مخزن ثابت ہوا، اور اسے فقہی قوانین کا قیمتی ذخیرہ میسر آیا، اور کبھی یہ رغبتِ قرآن، تشریح و تفسیرِ قرآن کے قالب میں ڈھل گئی، الغرض قرآن کے ساتھ یہ تعلق و اعتناء، بہت سے علوم و فنون کا سرچشمہ بنا، اور اس کے ہر پہلو پر علمائے امت نے تصنیفات و تالیفات

کا وافر سرمایہ فراہم کیا۔ ان تمام پہلوؤں پر مشتمل علوم کو،''علوم القرآن'' کا نام دیا جاتا ہے اور علمائے تفسر، دورانِ تفسیر، ان علوم کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ تفسیر نویسی کے دوران، قرآن میں بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں، جو خصوصی توجہ کے لائق ہونے کی بنا پر، علوم القرآن کی صف میں نمایاں جگہ پاتے ہیں، مثلاً حروفِ مقطعات، محکم ومتشابہ، شانِ نزول یا اسبابِ نزول ، ناسخ ومنسوخ، اعجاز القرآن وغیرہ۔ علاوہ ازیں، دورِ نبوت سے رفتہ رفتہ بُعدِ زمانی نے، اور اسلام کی فتوحات کی وسعت نے، نئے مسائل وحوادث پیدا کیے جن میں اسلام کی رہنمائی کی ضرورت نے تفسیری رجحانات میں تنوع پیدا کیا، اور بعض لوگوں نے تفسیرِ قرآن میں، ان روایات کو بھی مؤثر قرار دیا، جو اہل کتاب سے منقول تھیں، اور انھیں بھی اپنی تفسیروں میں داخل کر ڈالا۔ ان روایات کو اسرائیلیات کا نام دیا گیا۔ اسطرح ان اسرائیلیات کے مقام ومرتبہ کا جائزہ لینا بھی، تفسیر قرآن کا ایک اہم عنوان قرار پایا، ان تمام پہلوؤں سے، تفسیر مطالب الفرقان کا جائزہ چونکہ، بسط واطناب کا ذریعہ ہوگا، اس لیے طولِ بحث سے احتراز کرتے ہوئے، صرف چند پہلوؤں سے جائزہ لینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۱) حروفِ مقطعات اور تفسیر مطالب الفرقان

قرآن کریم میں، متعدد ایسی سورتیں ہیں، جن کا افتتاح حروف ابجد سے ہوتا ہے، یہ حروف، اگر الفاظ کی صورت میں ممزوج ومقرون بھی ہوں، تب بھی انھیں الگ الگ حروف ہی کی طرح پڑھا جاتا ہے، علما تفسیر کی اصطلاح میں ایسے حروف کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں۔ ایسی سورتوں کا آغاز کبھی ایک، کبھی دو، کبھی تین، کبھی چار اور کبھی پانچ حروف پر مشتمل الفاظ سے ہوتا ہے۔

جن سورتوں کا آغاز، صرف حرفِ واحد سے ہوتا ہے، وہ تعداد میں تین ہیں سورہ ص، سورہ ق اور سورہ القلم، جس کا آغاز حرفِ ن سے ہوتا ہے۔ پہلی دونوں سورتوں کا نام ہی ان کے آغاز میں پائے جانے والے، حروف مقطعات پر رکھا گیا ہے۔

جن سورتوں کا آغاز، دوحرفی الفاظ سے کیا گیا ہے، ان کی تعداد دس ہے، جن میں سے سات سورتوں کا افتتاح، ایک ہی جیسے الفاظ سے ہوتا ہے، یعنی حم۔ اوران ساتوں سورتوں کو حوامیم کہا جاتا ہے، جو حم کی جمع ہے، یہ تمام سورتیں قرآن میں یکجا، یکے بعد دیگرے (سورہ نمبر ۴۰ تا ۴۶ تک) واقع ہوئی ہیں، یعنی سورہ المومن، حم السجدہ، الشوریٰ، الزخرف، الدّخان ، الجاثیہ اور الاحقاف۔ ان میں سے سورہ شوریٰ (۴۲) میں حم کے بعد عسق کا اضافہ بھی موجود ہے، بقیہ تین سورتیں جو دوحرفی الفاظ سے شروع ہوتی ہیں، ان میں سورہ طٰہٰ، سورہ طٰس اور سورہ یٰسین شامل ہیں، جن کے نمبر بالترتیب ۲۰، ۲۷ اور ۳۸ ہیں۔

رہیں وہ سورتیں جن کے آغاز میں تین حرفوں پر مشتمل الفاظ آئے ہیں، تو وہ تیرہ سورتیں ہیں، جن میں سے چھ

سورتوں میں الم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں اور یہ چھ سورتیں مع نمبر یہ ہیں۔سورہ بقرہ ۲، ال عمران ۳، العنکبوت ۲۹، الروم ۳۰ ،لقمان ۳۱، السجدہ ۳۲۔ان کے علاوہ پانچ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز الر سے ہوتا ہے، یعنی سورہ یونس ۱۰، سورہ ھود ۱۱، سورہ یوسف ۱۲، سورہ ابراہیم ۱۴، اور سورہ الحجر ۱۵، دو سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز طسم سے ہوتا ہے، یعنی سورہ الشعرا ۲۶، اور القصص ۲۸۔دو سورتیں ایسی ہیں جن کا افتتاح چار حرفی الفاظ سے ہوتا ہے، یعنی سورہ الاعراف ۷، جس کی ابتدا المص سے ہوتی ہے اور سورہ الرعد ۱۳، جس کی پیشانی پر المر کے حروف کا جھومر چمک رہا ہے اور سورہ مریم ۱۹، وہ واحد سورہ ہے، جس کے آغاز میں پانچ حرفی لفظ، کھیعص، موجود ہے، یہ کل انتیس سورتیں ہیں جن کا آغاز، حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔

حروفِ مقطعات کے معانی ومفاہیم

حروف مقطعات کے معانی ومفاہیم اوران کی حکمت ومصلحت کے بارے میں، اہلِ علم کے ہاں طویل وعریض بحثیں پائی جاتی ہیں، جو علما کے باہمی اختلافات کو ظاہر کرتی ہیں۔علامہ ابن کثیر نے بڑے اختصار کے ساتھ، ان اختلافات کی تفصیل کو چند سطروں میں سمیٹ دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

اختلف المفسرون فی الحروف المقطعةالتی فی اوائل السورفمنهم من قال هی ممااستاثرالله بعلمه فردواعلمهاالی الله تعالیٰ ولم یفسروهاحکاه القرطبی فی تفسیره۔

ومنهم من فسر هاواختلف هئولاء فی معناهافقال بعضهم هی اسماء السور قال الزمخشری وعلیه اطباق الاکثروقیل هی اسم من اسماء الله تعالیٰ یفتتح بهاسور، فکل حرف منهادل علی اسم من اسمائه وصفةمن صفاته ،فالف مفتاح اسم الله واللام مفتاح اسمه لطیف والمیم مفتاح اسمه مجید وقال اخرون انماذکرت هذه الحروف فی اوائل السور التی ذکرت فیهابیاناللاعجاز القرآن وان الخلق عاجزون عن معارضته بمثله مع انه مرکب من هذه الحروف المقطعةالتی یتخاطبون بها،حکاه الرازی عن المبرد وجمع من المحققین وحکاه القرطبی عن الفراء وقرره الزمخشری ونصره اتم نصر والیه ذهب الامام ابن تیمیةو شیخنا الحافظ ابوالحجاج المزی [1]

قرآن کریم کی سورتوں کے آغاز میں جو حروف مقطعات آئے ہیں، مفسرین نے ان میں باہم اختلاف کیا ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے، جن کا علم، اللہ نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہے، چنانچہ ان علما نے ان حروف کی تفسیر کرنے کی بجائے اسے اللہ ہی کے سپرد کر ڈالا ہے، اس نقطہ نظر کو امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے، بعض دیگر علما نے ان الفاظ کی تفسیر تو کی ہے، مگر وہ باہم مختلف ہوئے ہیں، ان میں سے ایک گروہ کا یہ قول ہے کہ یہ حروف، سورتوں کے نام ہیں، زمخشری کا قول ہے کہ اکثر علما اس قول کے موافق ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے ناموں میں سے ہیں، جن سے سورتوں کا افتتاح ہوتا ہے، پس ان میں سے ہر حرف، اللہ کے کسی نام یا صفت پر دلالت کرتا ہے، مثلاً الف، اللہ کے نام کی اور لام، لطیف کی اور میم، مجید کی

[1] مختصر تفسیر ابن کثیر، جلد ۱، صفحہ ۲۷

کنجی ہے اور بعض دیگر علما کا قول ہے کہ ان سورتوں کے آغاز میں رکھے جانے والے یہ حروف، اعجاز القرآن کے لیے رکھے گئے ہیں کہ مخلوق انہی حروف سے ترتیب پائے ہوئے الفاظ پر مشتمل، قرآن جیسی، کوئی سورت بھی پیش کرنے سے عاجز ہے، حالانکہ وہ خود بھی اپنے خطابات میں انہی حروف سے مرکب الفاظ پر مشتمل گفتگو کرتے ہیں۔ اس نظریہ کو امام رازی نے مبرد اور محققین کے ایک گروہ سے حکایت کیا ہے اور اسی کو قرطبی نے فرا سے بیان کیا ہے اور زمخشری نے اسے نہ صرف یہ کہ برقرار رکھا ہے، بلکہ اس کی خوب حمایت بھی کی ہے اور اسی کی طرف امام ابن تیمیہ اور ہمارے شیخ ابوالحجاج المزی گئے ہیں۔

دورِ حاضر کی تفاسیر میں تفہیم القرآن کو جو تلقی بالقبول ملی ہے، وہ کسی اور تفسیر کو نہیں ملی ہے، صاحبِ تفہیم القرآن، اس ضمن میں فرماتے ہیں:

> یہ حروف مقطعات، قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں، جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، اس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا، خطیب اور شعرا دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے، چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں، ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں، اس استعمالِ عام کی وجہ سے یہ حروفِ مقطعات، کوئی چیستاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہیں سمجھتا ہو، بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ اس سے کیا مراد ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف، نبی ﷺ کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنی حروف کیسے ہیں جو تم بعض سورتوں کی ابتدا میں بولتے ہو، اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے اس کے معنی پوچھے ہوں، بعد میں یہ اسلوب، عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا، اور اس بنا پر مفسرین کے لیے ان کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گئے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنیکا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ کوئی شخص ان کے معانی نہ جانے گا، تو اس کے راہ راست پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا، لہٰذا ایک عام ناظر کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو [1]

حروفِ مقطعات اور موقفِ پرویز

حروفِ مقطعات کے بارے میں، پرویز صاحب، مولانا مودودیؒ کے موقف کا اساسی تصور لے کر، اس میں ''ماڈرنزم'' کا ایک عنصر شامل کر کے، اسے یوں پیش کرتے ہیں۔

> انگریزی زبان میں جنھیں مخففات (Abbreviations) کہا جاتا ہے، وہ مختلف الفاظ سے لیے گئے، حروف ہوتے ہیں جنھیں الگ الگ طور پر پڑھا جاتا ہے، جیسے (e.g)؛ (p.s)؛ (r.s.v.p) وغیرہ۔ عربوں کے ہاں بھی اس کا رواج تھا، عربوں کے ہاں ہی نہیں بلکہ عبرانی زبان میں بھی یہ چیز ملتی ہے، قرآن کریم چونکہ عربوں کی زبان میں نازل ہوا، لہٰذا اس میں اسلوبِ بیان بھی وہی اختیار کیا گیا ہے، (یہ الگ بات ہے کہ قرآن کا یہ اسلوب، بجائے خویش، ایک معجزانہ حیثیت رکھتا ہے) ان کے اسلوب بیان کے تتبع میں، قرآن کریم میں بعض حروفِ مقطعات آئے ہیں، چونکہ ان کے ہاں یہ اسلوب عام طور پر رائج تھا، اس لیے (قران میں کہیں نہیں آیا کہ) انہوں نے پوچھا ہو کہ ان حروف سے مقصود کیا ہے، (اگر چہ ان کی طرف سے پوچھے گئے کئی ایک سوالات کا ذکر، قرآن میں آیا ہے) وہ جانتے تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔ [2]

---

[1] تفہیم القرآن، جلد ۱، صفحہ ۴۹

[2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۷۰ تا صفحہ ۷۱

گویا اسلوب بیان کا تصور، مودودیؒ صاحب سے لے کر، اس میں مخففات کا تصور، دور جدید سے اخذ کرتے ہوئے ''جدت طرازی'' کے ساتھ ایک نیا تصور اختیار کر لیا گیا اور اسے قدیم وجدید کے امتزاج کے طور پر پیش کیا گیا، لیکن دور جدید کا انسان، پھر بھی اس پر مطمئن نہیں، اس لیے کہ عصرِ حاضر کا انسان جن مخففات سے مانوس ہے، ان میں یہ قاعدہ معروف ومسلم ہے کہ یہ مخففات ان الفاظ کے پہلے حرف ہی ہوتے ہیں جن کی یہ نمائندگی کرتے ہیں، لیکن عربی زبان کے حروف مقطعات میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ اس چیز کو معلوم ہوتا ہے کہ خود پرویز صاحب نے بھی محسوس کر لیا تھا، چنانچہ وہ پھر اس کی خود ساختہ توجیہ بایں الفاظ کرنے پر اتر آئے:

> یہ ضروری نہیں کہ یہ ان الفاظ کے پہلے حروف ہی ہوں، تعینِ مفہوم کے لیے ان الفاظ میں سے کوئی سا حرف بھی لیا جا سکتا ہے۔ [1]

اس کی دلیل؟ خدائے قرآن جانے یا ''مفکر قرآن'' جانے۔

''مفکر قرآن'' کی تفسیر قرآن کا ایک ماخذ، ان کی اپنی ''بصیرت'' اور ان کا اپنا ''ذوق لطیف'' بھی ہے، چنانچہ یہ ناممکن تھا کہ حروفِ مقطعات کی توضیح وتشریح، ان کی ''بصیرت'' اور ''اشارۂ ذوقِ لطیف'' کے بغیر ہو سکے:

> جہاں تک میری بصیرت میری رہنمائی کرتی ہے، یہ (باستثنائے چند) خدا کے اسم ذات (اللہ) یا اس کی صفات (الاسماء الحسنی) کے الفاظ سے تراشیدہ حروف ہیں، مثلاً الم میں الف، اللہ کے لیے ہے، لام، علیم کے لیے اور میم، حکیم کے لیے..... قرآن کریم نے صوتی اعتبار سے بھی انسان کے ذوقِ لطیف کی رعایت رکھی ہے اور (میرے احساسِ لطیف کا اشارہ ہے کہ) ان حروف کے انتخاب میں یہ امر بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، بہرحال یہ ہے وہ انداز، جس کی رو سے میں نے (مفہوم القرآن میں) حروفِ مقطعات کا مفہوم متعین کیا ہے، اس اعتبار سے الم کا مفہوم ہوگا، اللہ علیم وحکیم کا ارشاد ہے کہ..........'' [2]

حقیقت یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' کی یہ ساری سخن سازی، بیکارِ محض ہے۔ حروف مقطعات کا تعلق بامعنی الفاظ سے ہے ہی نہیں، انھیں اگر بامعنی الفاظ قرار دیا جائے تو ان کے مفہوم کے تعین کا مسئلہ، بجائے خود، ایک مستقل سرچشمۂ اختلاف بن جاتا ہے۔ انھیں انگریزی زبان کی طرح کے مخففات بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ یہ مخففات بھی بہرحال بامعنی الفاظ ہیں، اور جہاں یہ الفاظ (مخففات) مستعمل اور مروج ہوں، وہاں ان کے بولنے پر، سامع، ان کا مفہوم خود سمجھ لیتا ہے، بعض انگریزی لغات وقوامیس (Dictonaries) میں اختتامی صفحات پر، ان مخففات کا معنی ومفہوم درج بھی کیا جاتا ہے، جس کا صاف معنی یہ ہے کہ یہ بہرحال جس ماحول اور معاشرے میں رائج ہیں۔ وہاں ان کی مراد ومفہوم کو سمجھا اور جانا جاتا ہے، دراصل حروف مقطعات کا تعلق، بامعنی الفاظ کی بجائے، اسلوبِ بیان کے ساتھ ہے اور اسلوبِ بیان، تغیر ادوار کے ساتھ، خود تغیر پذیر ہے۔ دورِ نزولِ قرآن میں، یہ اسلوب رائج ومتداول تھا۔ بعد میں متروک ہو گیا اور اسلوبِ بیان یا اندازِ نگارش وہ چیز نہیں ہے، جسے لغات وقوامیس میں محفوظ رکھا جا سکے، کیونکہ کتبِ لغات میں بامعنی الفاظ کے مفاہیم ومدلولات ہی کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے، رہا اسلوب یا

[1] + [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۷۱

اندازِ کلام، تو اس کی حفاظت کا ذریعہ اُس دور کا پورا ادبی ذخیرہ ہوا کرتا ہے، جس دور میں وہ انداز و اسلوب رائج ہو، اور چونکہ حروفِ مقطعات کا تعلق بھی اسلوب ادب سے ہے، اس لیے دورِ نزولِ قرآن میں، اس کے رائج ہونے کی بنا پر، اس دور کے ادب میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ بعد کے ادوار میں اس اسلوب کے مہجور و متروک ہو جانے کے باعث، ایسے حروف کا استعمال بھی ختم ہو گیا۔ الغرض جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ حروفِ مقطعات کا تعلق، اسلوبِ بیان سے ہے، (خواہ یہ بیان تحریری ہو یا تقریری، نثر میں ہو یا شعر میں) تو اس میں پرویز صاحب اور مودودیؒ صاحب ہم رائے ہیں اور صائب الرائے بھی۔ لیکن جہاں تک ان کے مخففات ہونے کا تعلق ہے، یا پھر اسمائے الٰہیہ یا صفات خداوندی کے الفاظ میں سے، ماخوذ ہونے کا تعلق ہے، تو ان دونوں صورتوں میں، ان حروف کا بامعنی ہونا لازم ٹھہرتا ہے، جس کا منطقی تقاضا یہ بنتا ہے کہ جس طرح دوسرے بامعنی الفاظ کا ذخیرہ کتبِ لغات میں، اپنے مدلولات و مفہومات کے ساتھ موجود ہے، اسی طرح انھیں بھی اپنے قطعی معانی کے ساتھ، کتبِ لغات میں محفوظ ہونا چاہیے تھا، تاکہ تعینِ مفہوم کا سوال، اختلافِ معانی کا مستقل باب نہ وا کر دے اور اگر یہ دروازہ کھل گیا تو پھر ہر فرد اپنی ''بصیرت'' اور اپنے ''احساسِ لطیف'' کا اشارہ پا کر، الگ الگ معانی و مفاہیم پر اتر آئے گا، اور پھر کثرتِ تعبیر سے یہ خواب ہی پریشان ہو جائے گا اس لیے اس پہلو سے پرویز صاحب اور مولانا مودودیؒ، باہم مفترق ہیں۔

(۲) شانِ نزول یا اسبابِ نزول

قرآنِ کریم، حضرت رسولِ اکرم ﷺ پر تقریباً ۲۲، ۲۳ سال میں نازل ہوا ہے۔ اسبابِ نزول کے اعتبار سے، قرآن کریم دو قسموں پر مشتمل ہے، ایک قسم وہ ہے، جس میں قرآن کا نزول، کسی خاص سبب کے ساتھ مربوط نہیں ہے، بلکہ وہ محض ہدایتِ انسانی کے لیے، اس طرح نازل ہوا ہے کہ کوئی حادثہ یا واقعہ اس کے ساتھ منسوب نہیں ہے اور قرآن کریم کا غالب حصہ اسی طرح نازل ہوا ہے، دوسری قسم وہ ہے، جس میں نزولِ آیت، کسی مخصوص حادثہ یا واقعہ کے ساتھ مرتبط ہے۔ ہمارے موضوع کا تعلق دراصل اسی قسمِ ثانی سے ہے، علما نے اس پر مستقل تصانیف پیش کی ہیں، جن میں اس قسم کی آیات کا شانِ نزول بیان کیا گیا ہے، علامہ علیؒ بن مدینی (جو امام بخاریؒ کے استاد تھے) علامہ واحدیؒ، علامہ جوہریؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے بھی خاص اس موضوع پر اپنی کتب تصنیف کی تھیں۔ امام سیوطیؒ کی کتاب ''لباب النقول فی اسباب النزول'' اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہے، آیت کا نزول اگر کسی پس منظر، واقعہ، حادثہ یا سبب سے مربوط ہے تو اس کا جان لینا فہمِ قرآن کے لیے از حد ضروری ہے، اس سے بے خبری یا تو بجائے خود فہمِ قرآن میں رکاوٹ بنتی ہے، یا پھر سوئے فہم میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اسبابِ نزول کی معرفت کے فوائد

اسبابِ نزول کی معرفت کے مندرجہ ذیل فوائد ہیں، جنھیں علما نے تفصیلاً اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔

۱ ---- اللہ تعالیٰ نے جو قانون نازل فرمایا ہے، اس کی حکمت کا جاننا، اہل ایمان اور کافر شخص، دونوں کے لیے

نافع ہے۔ رہا مومن، تو جب وہ منزل من اللہ قانون کی حکمت کو، اسباب نزول کے آئینہ میں دیکھ کر جان لیتا ہے، تو یہ علم اس کے لیے ازدیادِ ایمان کا سبب بن جاتا ہے اور قانون کی یہ حکمت، اس کی تنفیذ اور تعمیل کی راہ کھول دیتی ہے۔ رہا کافر، تو شانِ نزول کے ذریعہ جب وہ حکمت آیت کو پالیتا ہے، تو جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ احکام محض استبداد و تحکم پر مبنی نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندوں کے حِکَم و مصالح پر مبنی ہیں، ایسی معرفت کے بعد، اگر وہ سلیم الفطرت ہے، تو وہ قبولِ حق سے تادیر دور نہیں رہ سکتا، اور بالآخر ایسے حکیمانہ دین اور مصالح عباد کی رعایت کرنے والی شریعت کو اپنا لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

۲ ----- اسباب نزول کی معرفت، حکمتِ حکم کے علاوہ، آیت کا صحیح مفہوم بھی واضح کرتی ہے اور اس کے متعلق اشکال کا ازالہ کرتی ہے، جبکہ علامہ واحدیؒ نے تو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، یہاں تک فرما دیا کہ مفہوم آیت کی صحیح معرفت اور پھر تفسیرِ آیت، اس کے پسِ منظر اور بیانِ نزول کے بغیر ممکن نہیں ہے، جبکہ علامہ ابن تیمیہ کا فرمان ہے کہ:

معرفة سبب النزول یعین علی فهم الآیة فان العلم بالسبب یورث العلم بالمسبب [۱]

سببِ نزول کی واقفیت، آیت کے فہم میں مدد دیتی ہے، کیونکہ سبب کو جان لینا، مسبب کو جاننے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس نکتہ کی وضاحت کے لیے درج ذیل مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ - ۱۱۵) مشرق و مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں، تم جس طرف بھی رخ کرو، اللہ کی ذات اُسی طرف ہے، بیشک اللہ کشادگی والا اور صاحب علم ہے۔

الفاظِ آیت کا ظاہر مفہوم، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان جس طرف بھی چاہے، منہ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے اور مسجد حرام کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں ہے، خواہ وہ حالتِ سفر میں ہو یا حضر میں، لیکن اگر وہ آیت کا یہ شان نزول جان لیتا ہے کہ یہ حالتِ سفر کی نفلی نماز سے متعلق ہے، یا اس صورتحال سے متعلق ہے کہ اسے قبلہ کی سمت کا علم نہیں اور وہ غلطی سے غلط سمت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتا ہے، مگر بعد میں اسے اپنی غلطی کا علم ہو جاتا ہے، تو ایسی صورت میں وہ معذور مانا جائے گا اور مؤاخذۂ خداوندی سے بالاتر قرار پائے گا۔ اسطرح آیت کا سببِ نزول، اس تخفیف کا مظہر ہو گا جو کسی طرف بھی منہ کر کے نماز پڑھنے والے کو، حالت سفر میں حاصل ہو گی، یا سمتِ قبلہ سے عدم واقفیت کی بنا پر، غلط رخ پر نماز پڑھ لینے کی حالت میں، اسے بصورتِ عدمِ مواخذہ (معافی و چشم پوشی) حاصل ہو گی۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت، اس مسافر کی نماز کے متعلق نازل ہوئی ہے، جو سواری پر نماز پڑھ رہا ہو اور سواری کے جانور کا رخ تغیر پذیر ہو، نیز روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ کچھ لوگوں نے قبلہ کی سمت سے عدمِ واقفیت کے سبب، اطراف متفرقہ میں، رخ کر کے نماز پڑھی۔ جب صبح ہوئی تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر وہ معذور قرار دیے گئے۔ مقصودِ پیشِ نظر کے لیے، اتنا ہی کافی ہے، ورنہ بہت سے واقعات کے ذریعہ، شانِ نزول کی روشنی میں، مفہومِ آیت کی توضیح کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

---

[۱] بحوالہ مناہل العرفان فی علوم القرآن، جلد ۱، صفحہ ۱۰۲

۳-----آیت کا کسی متعین اور مخصوص شخص کے بارہ میں نازل ہونا اور اسمیں مذمت یا مدحت کے پہلو کا پایا جانا اور پھر اس کی معرفت کا حصول، نہ صرف یہ کہ آیت کے مراد و مفہوم کو واضح کر دیتا ہے، بلکہ اس کا صحیح مصداق بھی اجاگر کر دیتا ہے، بلکہ اس سے کسی پاک دامن شخص کو متہم کرنے یا کسی واقعی قصوروار کو الزام سے بالاتر کرنے کی راہ مسدود ہو جاتی ہے، مثلاً مروان بن الحکم نے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے، ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے متعلق، یہ الزام عائد کیا کہ یہی وہ فرد ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی ہے۔

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ أُفٍّ لَّكُمَا (الاحقاف-۱۷) اور وہ شخص جس نے اپنے والدین سے بےزار ہو کر کہا "اف! تنگ کر دیا تم نے"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

والله ماھو به، ولو شئت ان اسمیه لسمیته[۱] قسم بخدا، وہ نہیں (جس کے متعلق یہ آیت اتری ہے) اگر میں چاہوں تو اس شخص کا نام بھی لے سکتی ہوں (جس کے متعلق یہ آیت اتری ہے، مگر میں پردہ پوشی ہی کروں گی)

ام المؤمنینؓ کی یہ تردید ظاہر ہے کہ صرف اسی صورت میں ہی ممکن ہوئی، کہ انھیں آیت کے سبب نزول کا صحیح علم تھا اور انہوں نے بہتانِ مروان کو رد فرمایا تھا۔

۴-----آیت کے شانِ نزول کا علم، حفظ میں آسانی اور فہم میں سہولت پیدا کرتا ہے اور ہر سننے والے کے ذہن میں، بشرطیکہ وہ اس کے سبب نزول کو جانتا ہو، وحی کو ثبت کر لینا آسان بنا دیتا ہے، کیونکہ اسباب کا مسببات کے ساتھ، احکام کا حوادث کے ساتھ اور واقعات کا اشخاص اور امکنہ وازمنہ کے ساتھ، رابطہ ایک ایسی چیز ہے، جو آیات کو ذہن میں نقش کر دیتی ہے اور اسبابِ نزول کے ان جملہ متعلقات کے علاوہ، فہم قرآن کے ساتھ ساتھ آیات کا دل و دماغ میں مستحضر رہنا، اور عندالضرورت اس کا استحضار اور استذکار، آسان ہو جاتا ہے۔

موقفِ پرویز در معرفتِ اسبابِ نزول

لیکن "مفکر قرآن" اسبابِ نزول کے جاننے کے ان تمام فوائد اور مصالح و حِکَم کے علی الرغم، یہ فرماتے ہیں:

خدا کی یہ کتاب عظیم اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لیے نہ تو شانِ نزول کی محتاج ہے اور نہ کسی اور ترتیب کی۔ یہ خود مکتفی ہے اور اپنی وضاحت آپ کرتی چلی جاتی ہے۔ [۲]

سوال یہ ہے کہ اگر "یہ کتاب عظیم ایسی ہی خود مکتفی ہے" کہ "اپنی وضاحت آپ کرتی چلی جاتی ہے" تو پھر آپ کی یہ تفسیر "مطالب الفرقان"، یہ "مفہوم القرآن"، یہ "قرآنی فیصلے"، اور یہ سلسلہ ہائے "معارف القرآن"، کیا محض قتلِ اوقات

---

۱ تفسیر الکشاف، للزمخشری، جلد ۴، صفحہ ۳۰۴ + صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الاحقاف

۲ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۳۱۶

(Time killing) کے پیشِ نظر ہی منظر عام پر آئے ہیں؟ کیا ایسا تو نہیں کہ زبان پر تو ''کتابِ عظیم کے خود مکتفی'' ہونے کے اعلانات ہوں اور دل میں یہ سمجھا جا رہا ہو کہ یہ کتاب فی الواقع کسی ''مفکر قرآن'' کی تشریحات و توضیحات کی محتاج ہے؟

''مفکر قرآن'' خواہ کتنا ہی چیخ چلا کر یہ کہیں کہ ''یہ کتاب خود مکتفی ہے اور اپنی وضاحت آپ کرتی چلی جاتی ہے'' ۔لیکن منزّلِ قرآن (اللہ تعالیٰ) کے نزدیک بہرحال، یہ کتاب خود مکتفی نہیں ہے، بلکہ اپنی وضاحت کے لیے اُس پیغمبر ﷺ کی محتاج ہے، جو اسے لے کر آیا ہے، وہ خود فرماتا ہے:

وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ (النحل-۴۴) ہم نے تیری طرف کتاب نازل کی تاکہ تو خود لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت پیش کرے۔

غور فرمایئے کہ خالق کائنات اور منزّلِ قرآن تو خود اس کتاب کو توضیح و تشریح کے لیے، محتاجِ رسول قرار دیتا ہے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' فرمانِ خداوندی کے علی الرغم، اسے ایسا خود مکتفی قرار دیتے ہیں کہ یہ کسی اور کی وضاحت کی، حتیٰ کہ رسول کی وضاحت کی بھی حاجتمند نہیں ہے، لیکن وہ خود، اس کی توضیح و تشریح اور تبیین و تفسیر کے لیے، تفسیری اور مفہومی کتب بھی لکھتے ہیں۔سیدھی سی بات ہے کہ جب، کتاب نازل کرنے والا خدا، خود، اسے تبیینِ رسول کا محتاج سمجھتا ہے، تو پھر مدعی سست کے مقابلے میں، اُس گواہ چست کی چیخ و پکار کوئی معنی نہیں رکھتی، جو دوغلہ پن اختیار کرتے ہوئے، ایک طرف، قرآن کو ''خود مکتفی'' بھی قرار دیتا ہے اور دوسری طرف، خود اپنی جانب سے، اس کی توضیح و تشریح اور تبیین و تفسیر بھی کرتا چلا جاتا ہے۔

تبیینِ رسول یا تبیینِ پرویز؟

حقیقت یہ ہے کہ'' مفکر قرآن ''قرآن کے نام کی آڑ میں، تشریحِ رسول سے، امتِ رسول کا دامن چھڑوا کر، انھیں خود اپنی توضیحات و تشریحات پر لانا چاہتے ہیں۔مرزا غلام احمد نے یہی کام، دعوائے نبوت کے ساتھ کیا تھا، اور تمام مسلمانوں کو یکلخت، اپنا دشمن بنالیا۔غلام احمد پرویز نے، اس تجربہ سے سبق سیکھتے ہوئے ذرا ذہانت سے کام لیا، اور بغیر نبوت کا دعویٰ کئے، یہ ''حکمت عملی'' اختیار کی، کہ ایک طرف تو، بڑی بلند آہنگی کے ساتھ، قرآن قرآن کی دہائی دی، اور دوسری طرف، نبی کی تشریحات و توضیحات کو، اپنی ارتیابی اور تشکیکی تحریک کے ذریعہ، سے شکوک و شبہات کی بھینٹ چڑھایا، اور تیسری طرف، قرآن کی خود ساختہ، وہ تشریح پیش کی، جو مغرب کے فاسد تمدن و معاشرت، اور اشتراکیت کے جابرانہ معاشی نظام پر، محض قرآنی ٹھپہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس طرح ''مفکر قرآن'' کی طرف سے، قرآنی کیپسول میں پیش کردہ زہر کو قبول کرنے والا شخص، اطاعتِ رسول کے تریاق کے کسی طرح بھی، قریب نہیں پھٹک سکتا۔وہ قرآن کے نام پر، اس دامِ ہمرنگِ زمین کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، جس کا ایک ایک تار، ذہنِ پرویز کا تراشیدہ ہوگا، وہ، اس اسلام کو، جو اطاعتِ رسول پر مبنی ہو گا، ''عجمی اسلام'' قرار دے گا، اور ان تصورات و نظریات کو، جن کو قرآن کے نام پر پیش کیا گیا ہو، ''قرآنی اسلام'' گردانے

گا۔اس طرح، اسلام کا بجائے خود، کوئی متعین اور متفق علیہ مفہوم ہی نہیں ہوگا، کیونکہ قرآن کے نام پر، نہ صرف یہ کہ ہر شخص کی اپنی اپنی تعبیر ہوگی، بلکہ ایک ہی شخص کی، بھی مرورِ ایام کے ساتھ، بدلتی ہوئی کئی تعبیریں ہوں گی، اور جو چیز متفق علیہ ہوگی، وہ صرف، قرآن کا نام ہی ہوگا، نہ کہ وہ تعبیرات، جو قرآن کا نام لے کر پیش کی جائیں گی۔یہ ہے وہ کھیل، جو منکرین حدیث، قرآن کے نام پر، اسلام کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔

شانِ نزول پر اشکالات واعتراضات

''مفکر قرآن'' نے اپنی تفسیر کی، ساری جلدوں میں، کسی مقام پر بھی، دلائل کے ساتھ، یہ بیان نہیں کیا کہ اسباب نزول کا علم کیوں غیر ضروری ہے؟ اور اس کا نہ جاننا، کس طرح فہمِ قرآن میں روکاوٹ نہیں ہے؟ البتہ اپنی ایک دوسری کتاب میں، وہ لکھتے ہیں کہ:

> اگر شانِ نزول کے نظریہ کو صحیح مانا جائے تو اس کی رو سے صورت یہ سامنے آئے گی کہ:
>
> (۱) فلاں واقعہ سرزد ہوا، جس سے فیصلہ نہ ہو پایا کہ کیا کرنا چاہیے، یا جو فیصلہ ہوا ہے، اسے خدا نے پسند نہ کیا، اس پر اس نے فلاں حکم یا قانون نازل کر دیا۔ بالفاظ دیگر، اگر وہ واقعہ رونما نہ ہوتا، تو وہ حکم یا قانون نازل ہی نہ ہوتا، یہ محض ایک اتفاقی امر تھا کہ وہ ظہور میں آ گیا، تو یہ حکم نازل ہو گیا۔
>
> (۲) رسول اللہ ﷺ نے تریسٹھ سال کی عمر پائی۔ اگر حضور ﷺ کچھ اور عرصہ تک زندہ رہتے، تو ہو سکتا تھا کہ اس قسم کے اور واقعات بھی رونما ہو جاتے، جن کی وجہ سے قرآن میں کچھ اور احکام دے دیے جاتے۔
>
> (۳) اب بھی یہ ممکن ہے کہ ایسے واقعات ظہور میں آتے رہیں، جو اگر رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں، رونما ہوتے تو ان کے متعلق بھی، خدا کی طرف سے احکام وضوابط مل جاتے۔ حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے، اور نبوت (یعنی خدا کی طرف سے نزول وحی) حضور ﷺ کے ساتھ ختم ہو گئی، اس لیے اب اس قسم کے واقعات کے متعلق، خدا کی طرف سے رہنمائی مل ہی نہیں سکتی۔
>
> یہ اور اس قسم کے دیگر سوالات (اور اعتراضات) ہیں، جو ''شانِ نزول'' کے نظریہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، اور جن کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا جا سکتا۔ [1]

اشکالات واعتراضات کا جائزہ

''مفکر قرآن'' کے اس اقتباس کو بار بار پڑھئے اور پھر سوچیے کہ۔۔۔۔ یہ اور اس قسم کے سوالات (یا اعتراضات) ''شانِ نزول'' کے نظریہ سے پیدا ہوتے ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ کی، اس اسکیم سے پیدا ہوتے ہیں، جس کے تحت، اس نے، قرآن کو یکبارگی نازل کرنے کی بجائے، تدریجاً، آہستہ آہستہ، نجماً نجماً، بالاقساط نازل کیا ہے؟ اگر خالی الذہن ہو کر سوچا جائے، تو

[1] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۶

''مفکرِ قرآن'' کے یہ سوالات (واعتراضات)، دراصل خدائے قدوس کی اس اسکیم پر وارد ہوتے ہیں، جس کی رو سے، اللہ تعالیٰ نے، قرآن کریم کو ۲۳ سال کی مدت مدید میں، بالاقساط نازل کیا ہے، (نہ کہ شانِ نزول کے نظریہ پر)، لیکن اللہ تعالیٰ کی اس اسکیم پر اعتراض کرنے کی بجائے، ''مفکرِ قرآن'' نظریہ شانِ نزول پر اعتراض کرتے ہیں، تاکہ علما کے خلاف، ان کے جلائے ہوئے الاؤ میں، کچھ اور ایندھن ڈالا جا سکے، حالانکہ ان اعتراضات واشکالات کا مکمل سدِ باب، تو صرف اور صرف، اسی صورت میں ممکن تھا، کہ اللہ تعالیٰ، پورے قرآن کو یکبارگی نازل کر دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ کفار و مشرکین کی خواہش کے علی الرغم، جملۃً واحدۃً، نازل کرنے کی بجائے، تقریباً ۲۳ سال کی مدت میں، اس طرح نجمًا نجمًا نازل کیا، کہ قرآن کا ہر نازل ہونے والا ٹکڑا یا حصہ، وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتا رہا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن:

> ان وحیوں کا مجموعہ ہے، جو ایک تحریک کی رہنمائی کے لیے، ۲۳ سال تک تحریک کے ہر مرحلے میں، ہر اہم موقع پر، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ایک برگزیدہ انسان، اسلامی تحریک کی قیادت کے لیے مبعوث ہوا ہے، اور قدم قدم پر، خدا کی وحی، اس کی راہنمائی کر رہی ہے۔ مخالفین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں، اور جواب، ان کا آسمان سے آتا ہے۔ طرح طرح کی مزاحمتیں، راستے میں حائل ہوتی ہیں، اور تدبیر اوپر سے بتائی جاتی ہے، کہ یہ مزاحمت اس طرح سے دور کرو، اور اس مخالفت کا یوں مقابلہ کرو۔ پیرؤوں کو طرح طرح کی مشکلات سے سابقہ پیش آتا ہے، اور ان کا حل، اوپر سے بتایا جاتا ہے کہ تمھاری فلاں مشکل یوں حل ہو سکتی ہے، اور فلاں مشکل یوں رفع ہو سکتی ہے۔ پھر یہ تحریک جب ترقی کرتے ہوئے، ایک ریاست کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے، تو جدید معاشرے کی تشکیل اور ریاست کی تعمیر کے مسائل سے لے کر، منافقین اور یہود اور کفارِ عرب سے کشمکش تک، جتنے معاملات بھی دس سال کی مدت میں پیش آتے ہیں ان سب میں، وحی، اس معاشرے کے معمار، اور اس ریاست کے فرمانروا، اور اس فوج کے سپہ سالار کی راہنمائی کرتی ہے، نہ صرف یہ کہ اس تعمیر اور کشمکش کے ہر مرحلے میں، جو مسائل پیش آتے ہیں، ان کو حل کرنے کے لیے آسمان سے ہدایات آتی ہیں، بلکہ کوئی جنگ پیش آتی ہے، تو اس پر لوگوں کو ابھارنے کے لیے، سپہ سالار کو خطبہ، آسمان سے ملتا ہے۔ تحریک کے کارکن کہیں کمزوری دکھاتے ہیں تو ان کی فہمائش کے لیے تقریر، آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ نبی کی بیوی پر دشمن تہمت رکھتے ہیں تو اس کی صفائی، آسمان سے آتی ہے۔ منافقین، مسجدِ ضرار بناتے ہیں تو اس کے توڑنے کا حکم، وحی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ جنگ پر جانے سے جی چراتے ہیں۔ تو ان کے معاملے کا فیصلہ براہ راست اللہ میاں کر کے بھیجتے ہیں۔ کوئی شخص، دوسرں کو جاسوسی کا خط لکھ کر بھیجتا ہے، تو اس سے نمٹنے لیے بھی اللہ میاں، خود توجہ فرماتے ہیں۔ [1]

اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن، ۲۳ سال کی مدت میں بالاقساط نازل ہوا ہے، اور متغائر احوال و ظروف، میں متفرق واقعات و حوادث میں، متبائن امکنہ و ازمنہ میں، مختلف اشخاص و احزاب سے وابستہ پس منظر میں اترا ہے، تو اس پسِ منظر کی وضاحت ہی کو، شانِ نزول یا اسبابِ نزول کا نام دیا جاتا ہے، جسے سمجھے بغیر، نہ ہی فہمِ قرآن حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہی کما حقہ اس پر عمل کرنا ممکن ہے۔ قرآن کے اندر ایسے کئی واقعات موجود ہیں، جو احکامِ خداوندی کے نزول کا سبب بنے ہیں، بقول پرویز:

---

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۰۷ تا صفحہ ۱۰۸

اس میں شبہ نہیں ہے کہ قرآن میں بہت سے واقعات کا ذکر آتا ہے، لیکن جو احکام ان واقعات کے ضمن میں سامنے آئے ہیں ان کی صورت یہ نہیں کہ وہ واقعہ ظہور میں آ گیا تو وہ حکم نازل ہو گیا، اگر وہ ظہور میں نہ آتا تو وہ حکم بھی نازل نہ ہوتا۔ [1]

خودساختہ اعتراضات اور پھر خود ہی تردید

سوال یہ ہے کہ ایسے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے، یہ بات، کس نے کہی ہے کہ ''ان واقعات کی صورت یہ تھی کہ یہ واقعات ظہور میں آ گئے تو ان کا حکم نازل ہو گیا، اگر وہ ظہور میں نہ آتے تو وہ حکم بھی نازل نہ ہوتے'' کہ ''مفکر قرآن'' کو اس کی تردید کرنا پڑی۔ جب یہ بات کسی نے کہی ہی نہیں تو پھر اس کی تردید کے کیا معنیٰ؟ ''مفکر قرآن'' کی یہ عادت تھی کہ وہ خود اپنے جی سے ایک کمزور سی بات گھڑ کر، انھیں، علمائے کرام کی طرف منسوب کر ڈالتے تھے، اور پھر بہادروں کی سی شان کے ساتھ، حملہ آور ہو کر، اس کی تردید کے درپے ہو جایا کرتے تھے۔

''مفکر قرآن'' کے وہ تینوں سوالات (یا اعتراضات) جو شاہکار رسالت سے مقتبس ہیں، دراصل شان نزول کے نظریہ سے پیدا نھیں ہوتے، بلکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس اسکیم سے پیدا ہوتے ہیں، جس کی رو سے، قرآن کریم کو، ۲۳ سال کی مدت میں، اللہ تعالیٰ نے بالاقساط نازل کیا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے، اللہ میاں کو براہ راست نشانۂ اعتراض بنانے کی بجائے، نظریۂ شانِ نزول کو نشانۂ اعتراض بنانا، زیادہ قرین قیاس سمجھا۔

نجمًا نجمًا نزولِ قرآن سے پہلے، یکبارگی نزول

اب اللہ تعالیٰ کی یہ اسکیم، خواہ منکرین حدیث کو پسند ہو یا ناپسند، اس نے بہرحال، نبیؐ کی برپا کی ہوئی اسلامی تحریک کی رہنمائی ہی کے پیش نظر، قرآن کو آسمان سے نجمًا نجمًا اتارا تھا، جبکہ اس سے قبل، اسے یکبارگی ہی نازل کر کے، لوح محفوظ میں رکھا تھا، جیسا کہ، بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ ٥ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ کی آیات سے واضح ہے۔

اللہ تعالیٰ نے، قرآن کریم کو تین تنزلات کا شرف بخشا ہے، جن میں سے دو کا ذکر، قرآن میں صراحتاً مذکور ہے، جبکہ ایک کے متعلق، غیر مصرح اشارہ ہی پایا جاتا ہے، لیکن یہاں قرآن میں، صراحتاً مذکور دو تنزلات ہی کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اولا ----قرآن مجید کا لوح محفوظ پر اتارا جانا، خود قرآن میں بایں الفاظ موجود ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (البروج-۲۱، ۲۲) بلکہ یہ بزرگ قرآن ہے، اس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے۔

لوح محفوظ میں، یہ قرآن، کس طرح اترا؟ بواسطہ جبریل؟ یا کسی اور طرح؟ اور کتنی مدت تک لوح محفوظ میں پڑا رہا؟ اللہ کے سوا یہ کسی کو بھی معلوم نہیں، اور لوح محفوظ میں بھی یہ متفرق اجزا میں نہ تھا، بلکہ جملۃً مجموع تھا۔ لوحِ محفوظ ہی کی ترتیب کے مطابق، زمین پر نزول کے بعد، اسے مرتب کیا گیا تھا، جیسا کہ خود طلوعِ اسلام نے تسلیم کیا ہے کہ:

قرآن، اگرچہ، حسبِ اقتضائے ضرورت ٹکڑے ٹکڑے نازل ہوا، لیکن اس کی اصل ترتیب، جو لوح محفوظ میں تھی، اس کے

---

[1] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۷

مطابق، آیتیں بھی، اور سورتیں بھی، آنحضرت ہی نے مرتب فرما دیں۔ [1]

ثانیا ----- ذاتِ نبوی پر، آسمان سے قرآن، بالاقساط اُترا، اور کرہ ارض، نور قرآن سے جگمگا اٹھا۔ یہی نزولِ قرآن، جبریل کے واسطہ سے ہوا، جو قرآن لے کر، قلب نبوی پر اترا، جیسا کہ سورۃ الشعرا میں مذکور ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (الشعرا - ۱۹۳ تا ۱۹۵) اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے، تاکہ تو متنبہ کرنے والوں میں شامل ہو، (یہ) صاف صاف عربی زبان میں ہے۔

اس سے واضح ہے کہ سارے کا سارا قرآن، سب سے پہلے لوحِ محفوظ میں، یکبارگی اتار کر رکھا گیا تھا۔ یہ مسجل اور جامع قرآن تھا، اور موجودہ ترتیبِ قرآن بھی اسی کے مطابق ہے۔ نیز یہ بھی کہ، اللہ تعالیٰ کے ازلی وابدی علم میں، انسانیت کو جس قدر علم وہدایت اور احکام قرآن کی ضرورت تھی، اسے اللہ تعالیٰ نے، قرآن میں جمع کر دیا تھا، جسے بعد میں نجما نجما، زمین پر، لیکن قلب نبیؐ پر اتارا گیا، اس لیے ''مفکر قرآن'' کی وہ سخن سازی، جو مذکورہ تین سوالات (واعتراضات) پر مشتمل ہے، وہ صرف، اس امرِ واقعہ سے جہالت وبے خبری کا نتیجہ ہے کہ قرآن، ذات نبوی پر بالاقساط نازل ہونے سے قبل، یکبارگی نازل ہوکر کاملاً اور مجتمعاً لوحِ محفوظ میں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے لیے، اللہ تعالیٰ، نے اِنْزَال کالفظ بھی استعمال فرمایا ہے، (جو یکبارگی نازل کئے جانے کا مفہوم ظاہر کرتا ہے) اور جس کا ماضی معروف اَنْزَلَ اور ماضی مجہول اُنْزِلَ ہے، اور تَنْزِيْل کالفظ بھی استعمال کیا ہے، جس کا ماضی معروف نَزَّلَ اور ماضی مجہول نُزِّلَ ہے، (جو نجما نجما آہستہ آہستہ بالتدریج نازل کئے جانے کو ظاہر کرتا ہے) ان دونوں قسم کے افعال میں کیا فرق ہے؟ وہ ''مفکر قرآن'' ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:

اُنزِلَ اور نُزِّلَ میں عام طور پر فرق یہ ہے کہ تنزیل (نُزِّلَ) آہستہ آہستہ اتارنے کو کہتے ہیں اور اِنْزَال میں یہ شرط نہیں۔ [2]

الغرض، قرآن کریم یکبارگی بھی نازل کیا گیا ہے اور بالاقساط بھی۔ یکبارگی انزال کے بعد، اسے لوح محفوظ میں رکھا گیا تھا، اور بالاقساط تنزیل کے بعد، اس کا اصل مہبط، قلب نبوی تھا۔ اگر ''مفکر قرآن'' نے قرآن سے ہدایت لینے کے لیے، (نہ کہ الٹا قرآن کو ہدایت دینے کے لیے) مطالعہ قرآن کیا ہوتا، تو قرآن میں مذکور، ان دونوں تنزّلات کا انہیں علم ہوتا، اور پھر اس پر وہ سوالات (اور اعتراضات) ہی پیدا نہ ہوتے، جن کے بارے میں، وہ فرماتے ہیں کہ ''ان کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا جا سکتا''۔

شانِ نزول کے انکار کے ساتھ ساتھ اقرار بھی

بڑے دکھ سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ''مفکر قرآن'' کا سب سے بڑا وصف یہ تھا، کہ انتہائی تضاد گو تھے، اور تضاد گوئی میں، انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ جس بات کی ایک مقام پر تردید کیا کرتے تھے، دوسرے مقام پر اسی کی تائید وحمایت

[1] طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۲۱ [2] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۰۲

میں سرگرم تھے۔ ''مفکرِ قرآن'' کی شانِ نزول یا اسبابِ نزول کے نظریہ کی تردید و مخالفت کے بعد، اب ان اقتباسات کو بھی ملاحظہ فرمائیے، جن میں اس نظریہ کی تائید و حمایت کا پہلو پایا جاتا ہے۔

وہ خود، بعض آیات کے کما حقہ فہم کے لیے، آیت سے وابستہ واقعہ (شانِ نزول) کی معرفت کو ضروری قرار دیتے ہیں، مثلاً

پہلی تائیدی مثال

سورۃ الحشر کی آیت ۷، کا ایک قطعہ پیش کرتے ہوئے، شانِ نزول کی معرفت کی اہمیت کو، طلوعِ اسلام میں بایں الفاظ واضح کیا گیا ہے:

> اسلام، مال سے انتفاع کے لیے بھی، اس کا روادار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے ایک خاص گروہ میں قید ہو کر رہ جائے، کہ ہر پھر کر انھیں میں گھومتا رہے اور دوسرے لوگ اس کو نہ پا سکیں۔ سورہ حشر کی اس آیت پر غور فرمائیں، کَیْ لایکون دولة بین الاغنیاء منکمْ ''تا کہ مال، تم میں سے، صرف دولتمندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے''، اس کے ساتھ ایک واقعہ بھی متعلق ہے، جسے سمجھ لینے سے آیت کو سمجھنے میں ہمیں سہولت ہوگی۔ [1]

آخر نظریہ شانِ نزول بھی اس کے سوا کیا ہے؟ فہمِ آیات میں، ان کے ساتھ متعلق واقعات، سہولت بھی پیدا کرتے ہیں، اور صحتِ مفہوم بھی۔

دوسری تائیدی مثال

ایک اور مقام پر اسلامی تشریع و تقنین کے پس پردہ، احوال و ظروف اور واقعات و حادثات کے جاننے کی اہمیت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> اسلام آیا تو حجاز کے ان دونوں شہروں ۔۔۔ مکہ اور مدینہ ۔۔۔ کی بڑی علمی شان تھی، لیکن یہ محض دینی علم تھا جس پر عربی چھاپ لگی ہوئی تھی، مکہ تو اس لیے کہ وہ اسلام کا سرچشمہ تھا، اور وہیں محمد ﷺ کی پیدائش اور نشو و نما ہوئی تھی، اور وہیں وہ ابتدائی واقعات پیش آئے تھے، جو قریش کو اسلام کی دعوت دینے اور اس دعوت کا مقابلہ کرنے میں ظہور پذیر ہوئے، مکہ ہی سے ان تشریعی مسائل کا تعلق ہے، جو وہاں مقرر ہوئے، ان کو کما حقہ سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان احوال و ظروف کو نہ سمجھا جائے، جو مکہ میں وہاں کے لوگوں پر حاوی تھے۔ [2]

اور مدینہ منورہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> رہ گیا مدینہ منورہ تو وہ نبی اکرم ﷺ کی ہجرت گاہ تھی۔ اکثر اسلامی تشریعات وہیں ظہور پذیر ہوئیں، مدینہ منورہ صدر اسلام کے اکثر تاریخی حوادث کا سرچشمہ تھا، وہیں رسول اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات اور اقوال، ارشاد فرمائے، ان کو بھی پوری طرح سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک مدینہ منورہ کے ان احوال و ظروف کو نہ سمجھا جائے، جو اُس زمانہ میں اس شہر پر اثر انداز ہوئے تھے۔ [3]

---

[1] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء، صفحہ ۵۴

[2] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۷۴

[3] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۷۵

کیا صحابہ شانِ نزول سے بے اعتنا تھے؟

کیا صحابہ کرامؓ بھی ''مفکرِ قرآن'' کی طرح ''اسبابِ نزول'' کی معرفت کو شئے بیکار جانتے تھے؟ طلوعِ اسلام لکھتا ہے کہ:

صحابہؓ میں وہ لوگ بھی تھے جو ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے، اور ان اسباب کا مشاہدہ کرتے رہے، جن کے بارہ میں آیات نازل ہوتی تھیں، دوسرے وہ صحابہؓ تھے جنھیں یہ مواقع حاصل نہیں تھے۔ اسبابِ نزول کی معرفت، آیت کا مقصود سمجھنے میں بڑی مددگار ہوتی ہے اور ان اسباب سے ناواقفیت، انسان کو غلطی میں ڈال دیتی ہے۔ [۱]

تفسیری روایات کے ضمن میں حضرت علیؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

زیادہ روایتیں حضرت علیؓ سے کی گئی ہیں، جو شوق دلاتے رہتے تھے کہ لوگ قرآن سیکھیں اور سمجھیں، اور اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ تم کو آیات اللہ کی بابت جو کچھ پوچھنا ہے، میری زندگی ہی میں مجھ سے پوچھ لو، کیونکہ میں علم رکھتا ہوں کہ کون سی آیت کہاں اتری اور کس بابت اتری، اور دربارِ نبوی میں، مَیں سوال کی جرأت بھی زیادہ رکھتا تھا۔ [۲]

ایک مفسر، کے لیے کن چیزوں کا جاننا ضروری ہے؟ طلوعِ اسلام کی زبان سے ملاحظہ فرمائیے:

......صحیح اسناد کے ساتھ، اسبابِ نزول کے بارہ میں، جو روایات پائی جاتی ہیں، اسے ان کا بھی علم ہو۔ [۳]

اسبابِ نزول کی معرفت کی اس قدر اہمیت کے بعد، اب یہ فرمان بھی ملاحظہ فرمایئے کہ:

قرآن کسی شانِ نزول کے موقعِ نزول یا واقعہ نزول کا پابند نہیں ہے اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ بالاتر ہیں۔ [۴]

حقیقت یہ ہے کہ شانِ نزول یا اسبابِ نزول کی معرفت کے بغیر فہمِ قرآن از حد مشکل ہے، لیکن اسبابِ نزولِ قرآن کی روشنی میں، قرآن کو سمجھ لینے کے بعد، پھر یہ اصول ہی کافی ہے کہ **العبرة لعموم الالفاظ لالخصوص الموارد** یعنی ''اعتبار، الفاظِ قرآن کے عموم کا ہے، نہ کہ ان خصوصی موارد و مواقع کا، جن میں قرآن نازل ہوا ہے'' اس اصول کو نظر انداز کرتے ہوئے، یا اس اصول کی تحریف کرتے ہوئے، یوں کہنا کہ وہ، شانِ نزول، موقعِ نزول یا واقعۂ نزول کا پابند نہیں ہے، از حد غلیظ سوئے تعبیر ہے۔

''مفکرِ قرآن'' کے خود ساختہ شانِ نزول

فہمِ قرآن کی صحت کے لیے، جن شرائط کا لازمی ہونا مسلّم ہے، ان میں سے ایک اسبابِ نزول کی معرفت بھی ہے، جس کے بغیر فہمِ قرآن ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص تفسیرِ قرآن میں، ان اسبابِ نزول سے صرفِ نظر کرے گا جو کتبِ احادیث و آثار میں منقول ہیں، تو وہ مجبور ہوگا کہ کوئی خود ساختہ شانِ نزول اختیار کرے۔ ''مفکرِ قرآن'' کو مجبور ہو کر ٹھیک یہی طرزِ عمل

---

[۱] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۷

[۲] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۳۹

[۳] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۵۹ء، صفحہ ۴۰

[۴] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۱

اختیار کرنا پڑا ہے، چنانچہ بہت سی آیات کے مفہوم کی وضاحت کے لیے، کتب احادیث میں مذکور واقعاتِ شانِ نزول کو نظر انداز کر دینے کے نتیجہ میں، من گھڑت اسبابِ نزول کو اپنانا پڑا ہے، چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

خودساختہ شانِ نزول کی پہلی مثال

سورۃ الاحزاب میں، چوتھے رکوع کی ابتدا ہی سے، امہات المومنات کو، حضور ﷺ کی زبان مبارک سے بعض باتیں کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ''مفکر قرآن'' اس پر فرماتے ہیں:

> يَاَيُّهَاالنَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ .... مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۲۸، ۲۹/۳۳) اے رسول! تم اپنی بیویوں پر اس حقیقت کو واضح کر دو کہ اگر تمہیں میری رفاقت میں رہنا ہے، تو تمھاری زندگی کا مقصد، اس مشن کی تکمیل ہوگا جسے میں لے کر اٹھا ہوں (لیکن) اگر تمھارے پیش نظر محض طبیعی زندگی کا مفاد اور دنیاوی زیب و زینت کی زندگی بسر کرنا ہے، تو پھر ہماری زندگی، باہمی رفاقت کی نہیں ہوسکتی۔ رفاقت، مقصد کی ہم آہنگی کا نام ہے، اگر مقصد میں اشتراک نہیں تو پھر ہم آہنگی کیسی؟ یہ لڑائیوں سے پیدا شدہ ہنگامی حالات میں تیرے پاس آئی ہیں اس وقت اولین مقصد ان کو حفاظت اور پناہ دہی تھا اب جبکہ حالات، اعتدال پر آ چکے ہیں، انھیں اپنے سابقہ فیصلہ پر نظر ثانی کی اجازت ہونی چاہیے [۱]

خط کشیدہ الفاظ ''مفکر قرآن'' کے خود ساختہ شان نزول پر مشتمل ہیں، نزولِ آیت کے وقت نبی ﷺ کی چار بیویاں تھیں، جنھیں آپؐ نے ان آیات کی رو سے آپؐ کی رفاقت میں رہنے یا نہ رہنے کا اختیار دیا تھا، یعنی حضرت سودہؓ حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ۔ اگر ''مفکر قرآن'' کے خودساختہ شانِ نزول کی روشنی میں، ازواجِ مطہرات کو رفاقت نبوی میں رہنے یا نہ رہنے کا اختیار دیا جاتا، تو صرف حفصہؓ اور ام سلمہؓ ہی کو دیا جاتا، کیونکہ یہی دونوں خواتین (بقولِ پرویز صاحب) ''لڑائیوں سے پیدا شدہ جنگی حالات میں'' حبالۂ عقدِ نبوی میں آئی تھیں حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ کو ہرگز یہ اختیار نہ دیا جاتا، کیونکہ یہ دونوں لڑائیوں سے پیدا شدہ، ''جنگی حالات'' میں حبالۂ عقد میں نہیں آئی تھیں، ان دونوں کے نکاح، تو قبل از ہجرت، مکہ ہی میں ہو گئے تھے، البتہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی، ہجرت کے بعد، مدینہ میں ہوئی تھی، لیکن ہم آیت کے الفاظ پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے اُن ازواج مطہرات کو بھی یہ اختیار دیا تھا، جنھیں آپؐ نے ''لڑائیوں کے پیدا شدہ ہنگامی حاالات''، سے بہت پہلے، اپنی زوجیت میں قبول فرمالیا تھا، لہٰذا ''مفکر قرآن'' کی یہ خود ساختہ علت، اور پھر اس بنائے فاسد پر، اس نظریہ فاسد کی اینٹ جمانا، کہ ''لڑائیوں کی پیدا کردہ ہنگامی حالت'' کے دوران، محض حفاظت و پناہ میں آنے والی خواتین ہی کو یہ اختیار دیا جائے، قطعی غلط ہے۔ علتِ اختیار، خود قرآن کی آیت میں مذکور ہے، کہ وہ دنیا کا مال و دولت اور معاشی معیار زیست کی بلندی کی خواہشمند تھیں، اور حضور ﷺ اپنی معاشی تنگدستی کے باعث، انکا مطالبہ پورا کرنے سے قاصر تھے۔ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ کے الفاظ تخییر کے پس منظر کو واضح کر دیتے ہیں۔

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۳۴۹

اس کے بعد، یہ کہنا کہ ''اب حالات اعتدال پر آ چکے ہیں لہٰذا ان کو سابقہ فیصلوں پر نظر ثانی کی اجازت ہونی چاہیے'' اس وقت کی واقعی صورت حال کا قطعی غلط نقشہ ہے۔ کیا واقعہ تخییر کے وقت، غزوات و سرایا، اور ''لڑائیوں سے پیدا شدہ ہنگامی حالات'' کا دور ختم ہو چکا تھا؟ اگر نہیں اور بالیقین نہیں، تو پھر اس کا کیا مطلب کہ ''حالات اعتدال پر آ چکے تھے''؟ حقیقت یہ ہے کہ جنگوں کا سلسلہ آخری دور رسالت، بلکہ پورے عہد خلافت تک میں، جاری و ساری رہا ہے، اور اسلامی قلمرو میں آئے دن اضافہ ہوتا رہا ہے۔ آیتِ تخییر کے وقت بھی، ''حالات کا وہ اعتدال'' موجود نہ تھا، جس کا ذکر ''مفکر قرآن'' نے کیا ہے، اور پھر بعد میں بھی غزوات و سرایا کا طویل سلسلہ قائم تھا، اس پر مستزاد یہ کہ منافقین مدینہ کی بیرونی دنیا سے سازشیں، ایک مستقل خطرہ تھیں:

> جنگ احزاب، بنو قریظہ کا محاصرہ، اور یہود کا مدینہ سے اخراج، غزوہ بنی لحیان، غزوہ الغابہ، سریہ زیر کمان عکاشہ بن محصن، سریہ زیر سرکردگی محمد بن مسلمہ، سریہ زیر قیادت زید بن حارثہ خلاف بنی سلیم، سریہ خلاف قافلہ اہل مکہ، سریہ خلاف بنی ثعلبہ، سریہ خلاف بنی فزارہ، سریہ زیر کمان عبدالرحمٰن بن عوف خلاف بنی کلب، سریہ زیر قیادت علی ابن ابی طالب خلاف بنی سعد بن بکر، سریہ در قیادت عبداللہ بن رواحہ خلاف اسیر بن رزام (یہودی خیبر)، سریہ زیر قیادت کرز بن جابر الفہری خلاف قبائل عقل وعرینہ، غزوہ خیبر، فتح فدک، فتح وادی القریٰ، سریہ عمر بن خطاب خلاف بنی ہوازن، سریہ زیر قیادت بشیر بن سعد الانصاری، عمرۃ القضا، سریہ زیر کمان ابن عبداللہ اللیثی خلاف بنی الملوح، جو کدید میں آباد تھے، سریہ غالب خلاف بنی مرہ بموضع فدک، سریہ زیر قیادت کعب بن عمیر الغفاری جن کو ارض شام میں، ذات اطلاح کے مقام پر روانہ کیا گیا، غزوہ موتہ، سریہ عمرو ابن العاص خلاف بنی قضاعہ الی وادی القری، سریہ زیر قیادت ابی عبیدۃ ابن الجراح خلاف قبیلہ جہینہ، جو ساحل سمندر پر آباد تھے، فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ طائف، وغیرھا، غزوات و سرایا اور مہمات، جو آخری دور رسالت تک برقرار رہے تھے۔[1]

آخر وہ ''حالات کا اعتدال'' کب اور کہاں پیدا ہوا تھا؟ جسے ''مفکر قرآن'' نے بیان فرمایا ہے؟

خودساختہ شانِ نزول کی دوسری مثال

مفکر قرآن نے آیات کے مفہوم کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے، جن آیات کا شانِ نزول، خود گھڑا ہے، ان میں آیتِ نسخ بھی شامل ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ان اہل کتاب کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب خدا کی کتابیں پہلے سے موجود تھیں، تو پھر ایک نئی کتاب (قرآن) کی ضرورت کیوں پڑ گئی، نیز یہ بھی کہ اگر یہ کتاب، خدا کی طرف سے ہے، تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو خدا کی پہلی وحی (تورات) کے خلاف ہیں۔[2]

آیت نسخ کا یہ سبب نزول، خواہ خودساختہ ہو یا کتب احادیث سے ماخوذ ہو، بہرحال، اس بات کی دلیل ہے کہ سبب نزول کے بغیر، قرآن فہمی اور توجیہ آیات ممکن نہیں ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ آیت کو محض اپنے مزعومہ تصور کے سانچے میں ڈھالنے

---

[1] نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین، خلاصہ از صفحہ ۱۰۲ تا ۲۵۵ + جوامع السیرۃ، خلاصہ از صفحہ ۱۰۰ تا ۲۴۹

[2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۴۵۰

کے لیے، اسے تراشا گیا ہے۔

خودساختہ شانِ نزول کی بہت سی مثالیں کتب پرویز میں مذکور ہیں، لیکن طوالت کے خوف کے پیشِ نظر ان دو پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

دریائے خوں بہانے سے، اے چشمِ فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں، اگر کچھ اثر کریں

''مفکرِ قرآن'' کی غلط تفسیر، بوجہ عدمِ معرفتِ شانِ نزول

خودساختہ شانِ نزول کی دو مثالوں کے بعد، اب ایک مثال اس امر کی بھی ملاحظہ فرمایئے، کہ صحیح شانِ نزول سے ناواقفیت کے باعث، انسان کس طرح دورانِ تفسیر غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔

قرآن کریم میں، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی جانی حفاظت کا وعدہ بایں الفاظ فرمایا ہے:

وَاللّٰهِ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ-۶۷) اللہ تمہیں لوگوں سے بچائے رکھے گا۔

حفاظت خداوندی کے اس وعدہ پر، ''مفکرِ قرآن'' لکھتے ہیں کہ:

ہمارا خیال ہے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کی جسمانی حفاظت کا وعدہ نہیں، اس لیے کہ دوسری جگہ، قرآن میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ......(۳/۱۴)''اگر وہ مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو......'' اس میں حضور ﷺ کے قتل ہونے کا امکان موجود ہے، نیز تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کو جنگ احد میں زخم بھی لگے تھے، ان حقائق کے پیشِ نظر، سورہ مائدہ کی مندرجہ بالا آیت سے، حفاظتِ رسالت مقصود نظر آتی ہے۔ [1]

ایک اور مقام پر، سورہ مائدہ کے انہی الفاظ کا مراد و مفہوم بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے:

وَاللّٰهِ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵/۶۷) سے مراد حضور ﷺ کی جسمانی حفاظت نہیں، حضور ﷺ کے مشن اور ما انزل اللہ کی حفاظت مقصود ہے۔ جہاں تک حضور ﷺ کی جسمانی حفاظت کا تعلق ہے، جنگ احد میں حضور ﷺ کو کئی زخم آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ عند الضرورت خود میدان جنگ میں جایا کرتے تھے، بلکہ اپنی فوج کی قیادت کیا کرتے تھے۔ میدان جنگ میں قتل ہو جانا ناممکنات میں سے نہیں، روایات میں ہے کہ حضور ﷺ نے، اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا، کہ اس مرض کا بنیادی سبب وہ زہر ہے، جو ایک یہودیہ نے حضور ﷺ کو کھانے میں دیا تھا، اگرچہ آپ نے وہ لقمہ اگل دیا تھا لیکن زہر غیر محسوس طور پر اثر انداز ہو گیا تھا، اور اس نے رفتہ رفتہ یہ شکل اختیار کر لی تھی، یہ بھی تو قتل انبیا کی شق میں آتا ہے۔ [2]

دلائل پرویز کا تجزیہ

''مفکرِ قرآن'' کا یہ اقتباس، چند در چند، غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے، جن کا تجزیہ اور پھر ازالہ درج ذیل سطور میں پیش

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۸ء، صفحہ ۲۷ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۳۰۲

خدمت ہے۔

۱-----آیت عصمة من الناس سے مراد، جسمانی حیات پیغمبر کی حفاظت ہی ہے، رہا حضور ﷺ کے مشن کو محفوظ اور قائم رکھنا، تو اس کا وعدہ، مندرجہ ذیل آیات میں مذکور ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (التوبہ- ۳۲) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں، مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر، ماننے والا نہیں ہے، خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (الصف- ۸) یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے، اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

۲-----اور جہاں تک ما انزل اللّٰہ کی حفاظت کا تعلق ہے، تو یہ الذکر کے وسیع مفہوم میں داخل ہے، جس کی حفاظت کی ذمہ داری، خود، خدائے قدوس نے، یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی ہے، کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر-۹) ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

۳-----رہا جنگ احد میں آپ کا زخمی ہونا، تو یہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ جس عصمة من الناس کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ سیاقِ تبلیغ سے متعلق ہے، جیسا کہ پوری آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ-۶۷) اے پیغمبرؐ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں تک پہنچادے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو حق پیغمبری ادا نہ کیا، اللہ تجھے لوگوں سے بچانے والا ہے

اللہ تعالیٰ کا عصمة من الناس کا یہ وعدہ، آیت کی روشنی میں سیاقِ تبلیغ ہی سے وابستہ ہے۔ میدانِ جنگ میں آپ کی جسمانی حفاظت کا یہ وعدہ ہے ہی نہیں۔ اس وعدہ کا مفاد، پیغمبر کو یہ تسلی دینا ہے کہ آپ بے دھڑک اور بے خطر و خوف تبلیغ فرمائیں، حق کا اعلان کریں، باطل کی مخالفت کریں، مخالفین آپ کی زندگی کو ختم کرنے پر قادر نہ ہو پائیں گے۔ اللہ، تبلیغ کے دوران، خود تمھاری حفاظت فرمائے گا، اور لوگوں کے قاتلانہ عزائم و دسائس سے محفوظ رکھے گا، رہا میدان جنگ میں آپؐ کا امکان قتل، تو یہ نہ صرف یہ کہ موجود تھا بلکہ آپؐ راہِ خدا میں شہادت کے بشدت آرزومند تھے:

وَاللّٰهِ لَوَدِدْتُّ اَنْ اُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلَ[1] خدا کی قسم، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب تمنی الشهاده + سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب تمنی القتل فی سبیل اللّٰہ

رہا یہود یہ کے ہاتھوں، نبی اکرم ﷺ کو زہر دیے جانے کا واقعہ، تو یہ بھی **عصمة من الناس** کے منافی نہیں ہے، کیونکہ وعدۂ عصمت صرف سیاقِ تبلیغ کے ضمن میں آیا ہے، اور یہ واقعہ وعدہ ایزدی کی حدود سے خارج ہے۔

وَاللّٰہِ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ کے وعدہ کا سیاقِ تبلیغ میں جسمانی حفاظت سے متعلق ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے، کہ ان الفاظ کے نزول سے قبل، حضور ﷺ نے جانثار صحابہؓ پر مشتمل، ایک حفاظتی دستہ، اپنے لیے، فراہم کر رکھا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو آپؐ نے ان لوگوں کو اس فریضہ سے سبکدوش کر دیا، اور انھیں فرمایا کہ ''اب اللہ نے خود میری حفاظت جسمانی کا ذمہ لے لیا ہے'':

> حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے چند صحابہ کرامؓ، آنحضرت ﷺ کی حفاظت کے لیے، عام طور پر ساتھ لگے رہتے تھے، اور سفر وحضر میں آپؐ کی حفاظت کرتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد، آپ نے، ان سب کو رخصت کر دیا، کہ اب کسی پہرہ اور حفاظت کی ضرورت نہیں رہی، اللہ تعالیٰ نے یہ کام خود اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ [1]

یہاں، یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جنگ احد میں، آپؐ کا زخمی ہونا، اور سورہ آل عمران کی اس آیت کا نازل ہونا، جس میں آپؐ کے قتل کا امکان موجود ہے، یہ دونوں باتیں، **عصمة من الناس** کے وعدۂ خداوندی سے پہلے کے واقعات ہیں۔

بہر حال صحیح اور مستند شانِ نزول، اور آیت کے پسِ منظر کو نظر انداز کر کے، جو تفسیر کی جائے گی، وہ بعید از قیاس، بلکہ بعید از صحت ہوگی۔

(۳) آیات محکمات و متشابہات

قرآن کریم میں محکم و متشابہ دو طرح کی آیات پائی جاتی ہیں، جن کا ذکر سورہ آل عمران کی درج ذیل آیت میں ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران-۷) وہی تو ہے، جس نے آپؐ پر کتاب نازل کی، اس میں محکم (پختہ) آیات ہیں، وہی کتاب کی اصل ہیں، اور دوسری متشابہات (کئی معنی دینے والی) ہیں، جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، سو وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں، بغرض فساد بھی، اور غلط معنی ڈھونڈنے کی غرض سے بھی، حالانکہ اس کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور پختہ علم والے کہتے ہیں، ''ہم اس پر ایمان لائے سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے''، اور نہیں سمجھتے مگر عقل والے۔

محکمات سے کیا مراد ہے؟ درج ذیل لغوی بحث سے واضح ہے۔ امام راغب ح۔ک۔م کے مادہ کے تحت لکھتے ہیں:

[1] تفسیر معارف القرآن (از مفتی محمد شفیعؒ)، جلد ۳، صفحہ ۱۹۵

حکم:حکم اصله منعه منعاالاصلاح ومنه سميت اللجام حكمةالدابةفقيل حكمته وحكمت الدابة منعتهابالحكمةواحكمتها(اى)جعلت لهاحكمة .... والحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل .... فالمحكم مالايعرض منه شبهة من حيث اللفظ ولامن حيث المعنى [1]

حَکَمَ اس کا معنی ہے کہ "اس نے اصلاح کے پیش نظر روکا، منع کیا" اور اسی سے جانور کی لگام کو حَکَمَةٌ کہا جاتا ہے، حَکَمْتُهٗ اور حَکَمْتُ الدَّابَّةَ کا معنی ہوگا "میں نے اسے لگام کے ذریعہ منع کیا (روک دیا)" اور اَحْکَمْتُھَا جَعَلْتُ لَھَا حَکَمَةً اور اَحْکَمْتُھَا کا معنی ہے کہ "میں نے اسے لگام دی"......اور حکمت، علم و عقل کے ذریعہ حق کو پالینا ہے، (جس سے وہ جہل سے رک جاتا ہے)............اور مُحْکَم وہ ہے، جس میں لفظ یا معنی کے اعتبار سے، کوئی شبہ نہ پایا جائے (یعنی بحیثیت لفظ اور بحیثیت معنی، وہ مضبوط اور پختہ ہو، جو اس کی ضد سے اسے مانع ہو)

امام ابن فارس، اسی مادے کے تحت، لکھتے ہیں:

حكم :الحاء والكاف والميم اصل واحد وهو المنع اول ذالک الحكم وهوالمنع من الظلم وسميت حكمةالدابة لانهاتمنعها يقال حكمت الدابة واحكمتهاويقال حكمت السفيه واحكمته اذاخذت على يديه : ابنى حنيفة احكموا سفهاء كم : انى اخاف عليكم ان اغضبا

والحكمةهذاقياسهالانهاتمنع من الجهل وتقول حكمت فلانا تحكيما منعته عمايريد [2]

ح۔ک۔م، اصلِ واحد ہے، جس کا معنی "منع کرنا" ہے اور اس سے اولین (مشتق) حکم ہے، جس کا معنی "ظلم سے روکنا" ہے اور جانور کی لگام کو یہ نام اس لیے دیا گیا، کہ یہ لگام جانور کو روکے رکھتی ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ حَکَمْتُ الدَّابَّةَ وَاَحْکَمْتُھَا یعنی میں نے جانور کو لگام دی، (ثلاثی مجرد اور باب اِفعال سے دونوں اَفعال کا یہی معنی ہے) اور اسی طرح ثلاثی مجرد اور باب اِفعال سے کہا جاتا ہے کہ حَکَمْتَ السَّفِیْهَ وَاَحْکَمْتَهٗ جبکہ تو نے (بیوقوفی سے روکے رکھنے کے لیے) اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اسی مفہوم میں، جریر کا یہ شعر ہے۔

اے بنی حنیفہ! اپنے بیوقوفوں کو روک لو، میں اس امر سے، ڈرتا ہو کہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے۔

اور لفظ حکمت کو اسی پر قیاس کیا گیا ہے، کیونکہ حکمت، جہالت سے روکتی ہے، کبھی تو یہ کہتا ہے، کہ حَکَّمْتُ فُلَانًا تَحْکِیْمًا (باب تفعیل سے) یعنی میں نے اسے روکدیا، اس امر سے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔

لغوی تحقیق میں "مفکر قرآن" کی چالبازی

"مفکر قرآن" اپنی لغوی تحقیق کا آغاز، قولاً ولفظاً "بنیادی معنی" سے کرتے ہیں، لیکن عملاً بنیادی معنی کی توضیح وتشریح کے دوران، کی کسی منزل میں، جو الفاظ زیر بحث آتے ہیں، ان میں سے کسی ایسے لفظ کو وہ لے لیتے ہیں، جو خود، ان کے مفہوم و مطلوب تک ان کی تحقیق کو پہچانے کے لیے، زینہ کا کام دے سکے۔ چنانچہ وہ اپنی لغوی تحقیق کا آغاز، حَکَم بمعنی مَنَعَ (یعنی اس نے روک دیا) سے کرنیکی بجائے "گھوڑے کی لگام" سے کرتے ہیں:

محکمات: اس کا مادہ (ح۔ک۔م) ہے، الحکمۃ گھوڑے کی لگام کو کہتے ہیں بلکہ گھوڑے کو لگام دیکر اس کے دونوں جبڑوں کو، اس

[1] المفردات للرّاغب، صفحہ ۱۲۶ تا صفحہ ۱۲۸ [2] معجم مقاییس اللغۃ، جلد ۲، صفحہ ۹۱

طرح کس کر باندھنے کو، کہ وہ ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔ ۱

یہ عجیب بات ہے کہ علمائے لغت، اَلْحَکَمَۃُ سے مراد ہر لگام کو لیتے ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ گھوڑے کو دی جائے یا کسی دوسرے جانور کو، لیکن ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، اَلْحَکَمَۃُ سے مراد گھوڑے ہی کی لگام ہے، پھر اہل لغت، ''منع کرنے'' کے بنیادی مفہوم سے، اپنی لغوی تحقیق کا آغاز کرتے ہیں، اور دوران تحقیق، اَلْحَکَمَۃُ میں اسی بنیادی مفہوم کو پاتے ہیں، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' اہل لغت کے خلاف، الٹی سمت سے اپنے سفرِ تحقیق کا آغاز کرتے ہیں، اس طرح بنیادی معنی، جو علمائے لغت کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، وہ ہمارے ''مفکر قرآن'' کی آخری منزل ہوتی ہے، اور جسے علمائے لغت اپنے سفرِ تحقیق کے دوران، بیچ کی کوئی منزل قرار دیتے ہیں، اسے ''مفکر قرآن'' اچک کر، اپنا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں، فی الواقع بعض اوقات، لغوی تحقیق میں، اصل حقیقت سے انتہائی بُعد اور انحراف پیدا ہو جاتا ہے۔

اب یہاں غور فرمایئے کہ پہلے تو اَلْحَکَمَۃُ کو مطلق جانور کی لگام قرار دینے کی بجائے، صرف گھوڑے تک مخصوص و محدود کر دیا گیا، اور لگام کے وظیفہ (Function)، اور اس کی کیفیت کو یوں بیان کرنا کہ---''گھوڑے کو لگام دیکر اس کے جبڑوں کو، اس طرح کس کر باندھ دینا، کہ وہ ادھر ادھر نہ ہونے پائے''---''مفکر قرآن'' کا ایک ایسا خود تراشیدہ مفہوم ہے، جسے اس لفظ کے لغوی مفہوم میں، محض سینہ زوری کے بل پر داخل کیا گیا ہے، اور جسے میں نے کسی لغت کی کتاب میں نہیں دیکھا۔ اس طرح کی الحاقی اور اضافی عبارات، دراصل، اس تمہیدی اساس کی حیثیت رکھتی ہیں، جن پر ''مفکر قرآن'' کو آگے چل کر، اپنے مطلوبہ تصورات کی عمارت کو تعمیر کرنا، مقصود ہوتا ہے۔ ''مفکر قرآن'' کے لغوی انحرافات کی پوری تفصیل، حسبِ اقتضائے ضرورت، ہر باب میں موجود ہے۔ یہاں بات کو زیرِ بحث امر تک محدود رکھتے ہوئے، محکمات کا مفہوم، الفاظِ پرویز ہی میں پیش کیا جاتا ہے۔

محکم و متشابہ......موقف پرویز

وہ اپنی تفسیر مطالب الفرقان میں، محکمات اور متشابہات کی، جو طویل و عریض تفسیر و توضیح پیش کرتے ہیں، وہ ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

> محکمات، وہ آیات ہوں گی، جن کے الفاظ کے معانی متعین ہوں، مثلاً نکاح کے ضمن میں ارشاد ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ (۴/۲۳) ''تمھاری مائیں تم پر حرام ہیں''، اس میں لفظ ام (جمع امھات) کے معنی، ماں کے ہیں، جو بالکل واضح اور متعین ہیں۔ ۲

آگے چل کر محکمات و متشابہات کا مفہوم، یوں واضح کیا گیا ہے:

۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۲۰

۲ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۲۰

قرآن کریم میں انسانی راہنمائی کے لیے قوانین وضوابط دیے گئے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان احکام وقوانین کے الفاظ ایسے ہونے چاہیں،جن کا مطلب،ان الفاظ سے محکم طور پر متعین ہو جاتا ہو،جیسا کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ کی مثال میں بتایا گیا ہے، اس قسم کی آیات محکمات ہیں،لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن میں ایسے حقائق کا بھی ذکر ہے،جن کا تعلق اُس عالم سے ہے، جو ہماری سرحدادراک سے باہر ہے،مثلاً اللہ کی ذات اور اس کی صفات،مرنے کے بعد کی زندگی اور اسمیں اعمال کے نتائج،وہاں کی جنت اور جہنم،یا انسانی زندگی کا منتہی اور مآل۔ظاہر ہے کہ اس قسم کے مجرد حقائق،(Abstract Truth) کو جب بھی بیان کیا جائے گا،تشبیہ واستعارہ اور تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا جائے گا،یعنی ان کا بیان،(Symbolically) ممکن ہوگا،مثلاً اللہ کے متعلق کہا گیا ہے،ثم استوی علی العرش (۷/۵۲) وہ عرش پر مستوی ہو گیا،اور کان عرشه علی المآء (۷/۱۱) اس کا عرش پانی پر ہے۔ظاہر ہے کہ ان آیات میں عرش سے مراد،لکڑی (یا کسی اور چیز کا) کا بنا ہوا تخت مراد نہیں ہے،نہ ہی مآء سے مراد پانی ہے۔یہ بیان تمثیلی یا تشبیہی ہے،یعنی ان حقائق کو تشبیہ اور مثال کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، لہٰذا یہ آیات متشابہات ہیں،یعنی ایسی آیات،جن میں حقائق کو تشبیہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ [1]

متشابہات کے ضمن میں دو امور ممتاز ومتمیز ہیں۔

اولا ---- یہ کہ ان میں وہ امور شامل ہیں،جو ہمارے حواسِ خمسہ کی گرفت سے،باہر کی دنیا سے متعلق ہیں مثلاً خدا تعالیٰ اور اس کی صفات،فرشتے،اعمال کا وزن،عذاب قبر وغیرہ۔

ثانیا ---- ان امور کی تفصیلی کیفیت،ہیئت،حالت۔

امر اول......امور متشابہات کی حقیقت

ہمارے حواس کی گرفت سے باہر،جن امور کو متشابہات قرار دیا گیا ہے،ان کی کنہ وحقیقت کا جان لینا،ہمارے لیے،اس دنیا کی زندگی میں ممکن نہیں ہے،کیونکہ وہ ایسے امور ہیں،جنھیں نہ ہماری آنکھوں نے دیکھا،نہ کانوں نے سنا،نہ ہاتھوں نے ٹٹولا،نہ زبان نے چکھا،اور نہ ہی ہماری قوت شامہ نے انھیں سونگھا ہے۔اس لیے،ایسے امور کی تفصیلی کیفیت کو پالینے کی کوشش اور کھوج کرید کرنا،نہ صرف یہ کہ نتیجہ کے اعتبار سے بے سود ہے، بلکہ اپنے وقت اور صلاحیتوں کو بھی غلط مصرف میں لگا کر،انھیں ضائع کرنا ہے،یہ پہلو کہ یہ امور از قبیل متشابہات ہیں،اور جن آیات میں یہ امور مذکور ہیں،وہ آیات متشابہات ہیں،علمائے سلف وخلف اور پرویز صاحب کے درمیان (بہت حد تک) ایک متفق علیہ چیز ہے۔

امر ثانی......امور متشابہات کی کیفیت کو متعین کرنا

امور متشابہات (جو قطعی طور پر ہمارے حواس کی گرفت سے خارج ہیں) کی تفصیلی کیفیت کو متعین کرنے کی کوشش کا نتیجہ،ناکامی اور تحیر وپریشانی کے سوا اور کچھ نہیں۔اللہ تعالیٰ نے،اگر انھیں ایسی زبان میں بیان کیا ہوتا،جو عالم الغیب کے حقائق کو

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۲۲

ٹھیک ٹھیک، اپنی تفصیلی کیفیت کیساتھ بیان کرنے والی ہوتی، تو چونکہ وہ زبان بھی عالم غیب ہی کی زبان ہوتی، اس لیے، وہ ہمارے فہم سے بالاتر ہوتی اور ہم اس زبان میں مذکور حقائق کو نہ جان پاتے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے، انھیں، قرآن میں، ہماری زبان میں بیان کیا ہے، تو اس زبان کا یہ نقص ہے، کہ یہ صرف ہماری دنیا ہی کے حقائق کو بیان کرسکتی ہے۔ رہے، عالم غیب کے حقائق، تو، نہ انھیں بیان کرنے کے لیے، ہماری زبان، معرض وجود میں آئی ہے، اور نہ ہی یہ ان حقائق کا واضح اور تفصیلی تصور، پیش کرسکتی ہے، لیکن چونکہ ہم یہی زبان جانتے اور سمجھتے ہیں، اس لیے، اللہ تعالیٰ نے ہماری ہی زبان میں عالم غیب کے حقائق بیان کیے ہیں، اس لیے عالم غیب کے حقائق کا ایک دھندلا سا تصور ہی ہمارے سامنے آسکتا ہے، جس پر اکتفا کرتے ہوئے، ہمیں اپنی ساری توجہ، متشابہات سے ہٹا کر، محکمات ہی پر مرکوز رکھنی چاہیے، جو لوگ، متشابہات کی تفصیلی کیفیت کو متعین کرنے بیٹھ جاتے ہیں، وہ، از روئے قرآن مبتلائے فتنہ ہیں، اور راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس، وہ لوگ، جو پختہ علم رکھتے ہیں، وہ ان امور کو، جیسا کہ وہ مذکور فی القرآن ہیں، بغیر اس کے کہ ان کی تفصیلی کیفیت کو متعین کریں، ایمان لاتے ہیں، اور اپنی تمام تر توجہ محکمات پر مبذول رکھتے ہیں۔

متشابہات کے بارے میں علمائے راسخین کا رویہ

از روئے قرآن، علما راسخین فی العلم کا جو رویہ ہوتا ہے، وہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں، اس کی واضح اور ٹھوس مثال پیش کی جاتی ہے، جو امام مالکؒ بن انس کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق مذکور ہے، کہ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ''پھر اللہ عرش پر مستوی ہوا'' امامِ موصوف سے استوا باری تعالیٰ کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے نہایت جامع، نہایت مناسب، اور نہایت محتاط جواب دیا:

> الاستوآء معلوم والكيفية مجهولة والايمان به واجب والسوال عنه بدعة [1]
>
> استواء، ازروئے قرآن ایک معلوم (حقیقت) ہے اور اس کی (تفصیلی) کیفیت غیر معلوم ہے، اس پر ایمان لانا ضروری ہے، اور (اس کی کھوج کرید کے لیے) سوال کرنا بدعت ہے۔

چنانچہ علمائے سلف نے، اس معتدل اور محتاط رویہ کی بنا پر، نہ صرف یہ کہ تجسیم و تنزیہ کے خارزار سے بھی اپنا دامنِ ایمان بچائے رکھا، بلکہ ان حقائق کو تشبیہ و استعارہ قرار دیکر بھی، ان کے خود ساختہ مفہومات سے گریز بھی کیا، اور زیغ کے رویہ کو اپنانے سے اجتناب کیا، جن کی ساری دلچسپیاں متشابہات کی بال کی کھال اتارنے کے ساتھ ہی وابستہ ہوتی ہیں۔

متشابہات کی بابت موقفِ پرویز

''مفکر قرآن'' صاحب، آیات متشابہات کے وجود کو تسلیم کرنے میں، تو علمائے سلف سے متفق ہیں، لیکن اس اتفاق

[1] کتاب الاسماء والصفات (للبیہقی)، صفحہ ۴۰۸، (داراحیاء التراث العربی، بیروت)

کے بعد علما کا رویہ، ایسے حقائق کی کیفیات کو، اللہ کے علم پر چھوڑ دینے کا رویہ ہوتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب، ان کی کیفیت کو متعین کرنے بیٹھ جاتے ہیں، اور مجاز کی آڑ لے کر، ان کے ایسے معانی تراشتے ہیں، جو قرآن کی تعلیم میں تضاد کا باعث بنتے ہیں، چنانچہ وہ قرآن میں مذکور اللہ کی صفت، استواعلی العرش کو متشابہ بھی قرار دیتے ہیں، اور پھر اس کا مفہوم بھی متعین کرنے پر اتر آتے ہیں۔

پہلا مرحلہ تخلیق کائنات کا تھا، دوسرا نظم ونسق عالم کا۔ اس تدبیرِ امور، نظم ونسق، تمکن وتسلط، اور جہاں بانی وجہانداری کو، قرآن کریم نے استواعلی العرش سے تعبیر کیا ہے، جس سے مراد کائنات کا مرکزی کنڑول ہے۔ [1]

جہاں تک، اللہ تعالیٰ کے، مدبرِ امور اور صاحبِ تمکن وتسلط، جہاں بان وجہاں دار ہونے کا تعلق ہے، وہ قرآن کریم کی ان صدہا آیات سے ثابت ہے، جو محکمات میں داخل ہیں، مثلاً قرآنی الفاظ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ، لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، مَالِکَ الْمُلْکِ، فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ اوران جیسے دیگر بیشمار الفاظ، اس حقیقت کو ثابت کر دیتے ہیں، جسے ثابت کرنے کے لیے، متشابہ آیت کو ''مفکرِ قرآن'' نے، اپنی تخنسازی کا نشانہ بنایا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو حقیقت، آیات محکمات سے بآسانی ثابت ہو جاتی ہے، اسی کے اثبات کے لیے آیات محکمات سے صرف نظر کرتے ہوئے، آیات متشابہات پر مشق آزمائی کرنا، یقیناً، راسخون فی العلم کے رویہ کے منافی ہے۔

قرآن کریم میں استوائے انسان کے اس مفہوم کو کہ، ''محکم اور پائیدار طریقہ سے جم کر بیٹھنا'' اللہ تعالیٰ کے اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ پر قیاس کرتے ہوئے، یہ معنی کر ڈالنا کہ، ''اللہ تعالیٰ محکم طریق پر تسلط وتمکن رکھتا ہے''، اور اس امر کو بھول جانا، کہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ کی رو سے، خالق کے استوا کو مخلوق کے استوا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، یقیناً، اہل زیغ سے ملتا جلتا طرزِ عمل ہے۔

اسی طرح ''مفکرِ قرآن'' کا کَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ کی متشابہ آیت میں یہ کہنا، کہ ''یہاں ما سے مراد پانی نہیں ہے''، بلکہ یہ ایسا تمثیلی اور تشبیہی بیان ہے، جس کا مفہوم، پانی کی اصل حقیقت سے ہٹ کر یہ ہے کہ:

عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے سرچشمہ پر اسی کا قبضہ واختیار ہے۔ [2]

اب اگر عرش کا معنی ''قبضہ واختیار، تمکن وتسلط'' وغیرہ ہی ہیں، تو یہ مفہوم صریح طور پر قرآنی آیت سے متصادم ہے، جس میں یہ مذکور ہے۔

وَیَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّکَ فَوْقَھُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ (الحاقۃ - ۱۷) اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اگر واقعی عرش کا معنی ''قبضہ واختیار'' اور ''تمکن وتسلط'' ہے، تو آٹھ فرشتوں کا اسے اٹھانا، آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

---

[1] من ویزداں، صفحہ ۲۸۱

[2] من ویزداں، صفحہ ۲۸۴

کیا تفسیر قرآن اسی چیز کا نام ہے کہ اگر ایک جگہ کوئی ''بات بنالی جائے''، تو دوسری جگہ وہی ''بات بگڑتی چلی جائے''؟

متشابہ الصفات آیات میں صحیح تفسیری رویہ

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی متشابہ الصفات آیات کا مفہوم متعین کرنے میں ''مفکر قرآن'' صاحب، حدودِ الفاظ سے صریح تجاوز کرتے ہیں، جبکہ ایسی آیات کے بارہ میں، علمائے راسخین کا موقف وہ ہے، جو امام مالکؒ کے حوالہ سے پہلے ہی مذکور ہو چکا ہے، بلاشبہ، استوائے باری تعالیٰ، ایک معلوم حقیقت ہے، مگر یہ انسانی استواء کے معنوں میں، ''کسی کجی سے اعتدال پر آنے''، یا کسی ''خاص جگہ قرار پکڑنے'' کے مفہوم میں نہیں ہے، اور نہ ہی یہ استوائے الٰہیہ، کسی پہلو سے بھی مخلوق کے استواء سے مس رکھتا ہے، وہ مستوی عرش ہے جیسا کہ قرآن نے خبر دی ہے، مگر بغیر کسی کیفیت یا مقام کے تعین کے۔ پھر جیسا استواء مخلوق میں پایا جاتا ہے، وہ اس جیسے استواء سے بالاتر ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ''آنے'' کا بھی ذکر ہے، مگر اس کا آنا، مانند مخلوق، ''ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ پہنچنا'' نہیں ہے، اور نہ اس کا ''آنا'' بصورت حرکت ہے۔ بس اس کا آنا اسی کی شان کے لائق ہے، بغیر اس کے کہ اس کے اتیان کو، ''انسانی آمد و رفت'' پر قیاس کیا جائے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے نزول کا بھی ذکر ہے، مگر اس کا نزول بھی انتقال ذات یا ہبوط جسمانی کا ہم معنی نہیں ہے، بلکہ یہ نزول بھی اس کے حسبِ شان ہے، بغیر اس کے کہ ہم اس کی کوئی تفصیلی کیفیت متعین کریں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے نفس کا بھی ذکر ہے، لیکن اس کا نفس، جسم نہیں ہے۔ بس ہم اس کے نفس کو مانتے ہیں جیسا کہ وہ اس کے شایانِ شان ہے، بغیر اس کے کہ نفسِ خداوندی کو، انسانی نفس پر قیاس کرتے ہوئے، اس کی کوئی کیفیت متعین کی جائے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے چہرہ، ہاتھ اور آنکھوں وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ ہمارا ان سب چیزوں پر ایمان ہے، بغیر اس کے کہ ان اعضا کو انسانی اعضا پر قیاس کرتے ہوئے، اس کے چہرہ کی کوئی شکل و صورت متعین کی جائے، یا اس کے ہاتھ کو کوئی آلۂ کارکردگی قرار دیا جائے، یا اس کی آنکھوں کو حدق و بصر کا عضو قرار دیا جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے وہ اوصاف ہیں جن کو قرآن نے جیسا بیان کر دیا ہے، ہم بیان کریں گے، مگر اس کی کیفیت کو متعین نہیں کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔

لاریب، قرآن میں مذکور، ان الفاظ کے معانی ہمیں معلوم ہیں۔ ان کے معانی میں نہ تو کوئی ابہام ہے، اور نہ ہی بے خبری۔ ہمارے لیے اگر ابہام کا کوئی پہلو ہے، (اور یقیناً ہے) تو وہ صرف، ان اوصاف خداوندی کی کیفیات کے بارے میں ہے، جس میں پختہ علم رکھنے والے علما کا رویہ یہ ہے، کہ وہ معانی کرتے ہوئے، الفاظ کی حدود سے آگے قدم نہیں بڑھاتے، اور یہی اعتدال و احتیاط پر مبنی رویہ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے ''مفکر قرآن'' کو اس اعتدال و احتیاط سے بعید پایا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے راسخ العلم علما کی خوبی قرار دیا ہے۔

(۴) اسرائیلیات اور تفسیر مطالب الفرقان

اسرئیلیات؟

قبل اس کے کہ، اسرائیلیات کے متعلق شرعی موقف کی وضاحت کی جائے، یہ مناسب اور موزوں ہے کہ اسرائیلیات کا مفہوم بیان کیا جائے۔

اسرائیلیات، سے مراد، دراصل، وہ آثار ہیں، جو تفسیر قرآن میں یہود و نصاریٰ کے ذریعہ در آئے ہیں۔ نصاریٰ کی نسبت، یہودی ثقافت کا اثر غالب ہے، کیونکہ اپنی طبیعی عمر کے لحاظ سے، یہودیت، نصرانیت کی نسبت، لمبے دور پر حاوی رہی ہے، اور ہجرت کے بعد، اہل اسلام کو، یہود ہی سے زیادہ سابقہ پڑا تھا، اور ان میں سے جو اسلام لے آئے، ان ہی سے منقول روایات (عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں تو نہیں، لیکن بعد کے ادوار میں) تفسیر قرآن میں داخل ہوئیں، کیونکہ صدر اسلام میں، بہر حال یہود اور اہل اسلام میں، نصاریٰ کی نسبت، بہت زیادہ میل جول رہا، لیکن اسلام سے پختہ وابستگی، صدر اول میں ایسی روایات کو لینے میں حارج تھی۔

بعض لوگوں نے اسرائیلیات کا اطلاق، ان تمام عقائد و روایات پر بھی کیا ہے، جو غیر اسلامی ہیں، اس طرح، وہ اساطیر بھی، اسرائیلیات کے زمرہ میں داخل ہیں جو دشمنان اسلام کی سازشوں کے باعث، دین میں داخل ہو گئے، قطع نظر اس کے کہ یہ اعدا اسلام یہودی تھے، عیسائی تھے، یا ان کے علاوہ کسی اور کفر میں مبتلا تھے، اور یہ سلسلہ بڑے جاذب نظر نقابوں کے تحت، آج تک جاری ہے، ہمارے نزدیک بھی اسرائیلیات کا یہی وسیع مفہوم پیش نظر ہے، اور ہر وہ غیر اسلامی تصور یا عمل، اس میں داخل ہے، جس کا مصدر و منبع، خواہ غیر اسرائیلی روایات ہوں یا اسرائیلی قصص و اخبار ہوں۔

اسرائیلیات کے بارے میں شرعی حکم

منع و جواز کے اعتبار سے اسرائیلیات کی تین اقسام ہیں، اور ہر قسم کے لیے الگ الگ شرعی حکم ہے۔

(۱) وہ روایات، جو کتاب و سنت کے مطابق ہیں، انھیں قبول کیا جا سکتا ہے۔

(۲) وہ روایات، جو شریعت کے منافی ہیں، اور عقل عام بھی ان سے ابا کرتی ہے، انھیں قبول کرنا درست نہیں ہے۔

(۳) وہ روایات جو نہ پہلی قسم میں داخل ہیں اور نہ ہی دوسری میں، ایسی روایات میں توقف کیا جائے گا، نہ ان کی تصدیق کیجائے گی اور نہ ہی تکذیب۔ کیونکہ یہ روایات خود ہماری شریعت کے میزان میں، بھی اس قابل قرار نہیں پاتیں کہ ان کی تصدیق یا تکذیب کی جائے۔

اسرائیلیات کا بڑا حصہ، اسی تیسری قسم پر مشتمل ہے، جس کی حکایت و روایت کا کوئی فائدہ، ہمارے دین کو نہیں پہنچتا،

اگر چہ بجائے خود، اس قسم کی حکایت وروایت، حد جواز ہی میں آتی ہو، لیکن اس کا کتاب اللہ کی تفسیر میں راہ پانا، مفسر کی طرف سے تائید وتصدیق کا ہم معنی بن جاتا ہے، جس سے بہر حال احتراز واجتناب لازم ہے۔

اسرائیلیات کی بابت، مفسرین کا موقف

تفسیری کتب پر نگاہ رکھنے والا شخص، اور بالخصوص، ان کتب پر، جو تفسیر بالماثور کی قبیل میں سے ہوں، کچھ تفاسیر کو اسرائیلیات سے خالی نہیں پائیگا، ماسوااس کے کہ ان میں کثرت وقلت کے لحاظ سے فرق ہو، یا بعض اسرائیلیات پر تنبیہ کی گئی ہو، اور بعض کو بغیر نقد وتنبیہ کے چھوڑ دیا گیا ہو، حالانکہ مسلم مفسرین کے پاس، اسرائیلیات کے بارے میں، نبی اکرم ﷺ کی طرف سے، ایک واضح اصولی ہدایت موجود رہی ہے۔

عن ابی هريرة قال كان اهل الكتب يقرء ون التوراة بالعبرانية ويفسرونها بالعربية لاهل الاسلام فقال رسول الله ﷺ لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم وقولوا امنابالله وما انزل الينا وما انزل اليكم [1]

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اس کی تفسیر اہل اسلام کے لیے عربی زبان میں پیش کرتے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب اور یوں کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس وحی پر جو ہماری طرف نازل کی گئی اور اس پر بھی جو تمہاری طرف نازل کی گئی۔

اے کاش، اس ارشاد نبوی کی روشنی میں، کتب تفسیر میں وہ اسرائیلیات داخل نہ کی جاتیں، جن کی حیثیت، ایک بیدار مغز مسلمان کے لیے پراگندہ خیالی کے سوا کچھ نہیں۔

اسرائیلیات کے متعلق موقفِ پرویز

پرویز صاحب کے موقف کے حوالہ سے ہم اسرائیلیات کو تین اقسام میں تقسیم کرسکتے ہیں:

(i) وہ اسرائیلیات، جن میں عقلی سخافت پائی جاتی ہے۔

(ii) وہ روایات، جن کی مخالفت، عقلاً تو نہیں کی جاسکتی، لیکن وہ پرویز صاحب کے قرآنی تصورات کے ساتھ میل نہیں کھاتی ہیں۔

(iii) ایسی روایات، جو قرآن کے اس تصور کے مطابق ہیں جسے انہوں نے منسوب الی القرآن کر رکھا ہو۔

ان میں سے پہلی اور دوسری قسم کی روایات کو وہ بالکلیہ مسترد کر دیتے ہیں لیکن تیسری قسم کی روایات، وہ اس لیے قبول کرتے ہیں، کہ وہ، قرآن کے اس تصور کے مطابق ہیں جسے انہوں نے قرآن کے گلے مڑھ رکھا ہو "مفکر قرآن" "نعرہ" یہ لگایا کرتے تھے کہ "ہم صرف وہ چیز قبول کرتے ہیں جو قرآن کے مطابق ہو" "مطابق قرآن" ہونے کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ لفظاً تو صحیح بات کیا کرتے تھے لیکن معناً وہ غلط بات کہتے تھے کیونکہ جس بات کو وہ "مطابق قرآن" کہا کرتے تھے وہ، فی الواقع، مطابق قرآن

[1] جامع صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة ، باب قول النبی لا تسئلوا اهل الکتاب عن شیءٍ

نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ صرف اس تصور کے مطابق ہوتی تھی جسے وہ قرآن کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے، اور یہ بات معلوم ومتعارف ہے کہ ایک وقت میں وہ، جس بات کو قرآن اور اسلام کی طرف نسبت دیا کرتے تھے، دوسرے وقت، اسی بات کو، وہ خلافِ اسلام اور منافیٔ قرآن قرار دیا کرتے تھے، اور یہ فرق بھی محض جزئیات اور تفصیلات کے ضمن میں ہی نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ ایسے اصولی اور کلی امور میں ہوا کرتا تھا، کہ ایک وقت میں جو چیز عین اسلام تھی دوسرے وقت میں وہی چیز، عین کفر اور شرک قرار پاگئی، اس سلسلہ، میں صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

''مفکرِ قرآن'' کے بدلتے ہوئے قرآنی مواقف

ایک زمانہ تھا، جب ''مفکرِ قرآن'' شخصی ملکیت اور پرائیویٹ پراپرٹی کے وجود کو، اسلام اور قرآن کی بنیاد پر، قبول ہی نہیں بلکہ ثابت کیا کرتے تھے اور، اشتراکیت کی ''نفیِ ملکیت'' کی، بنیادی اور اصولی تعلیم کی، پرزور تردید، یہ کہہ کر کیا کرتے تھے کہ:

> اشتراکیت، ذاتی اور انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن اسلام، ہر شخص کی کمائی کو، اس کی ذاتی ملکیت قرار دیتا ہے۔ زمانہ ظہورِ اسلام میں، جائداد واملاک، عموماً مویشیوں کی شکل میں تھی، ان کے متعلق فرمایا:
>
> اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ (۳۶/۷۰)
>
> ''کیا ان لوگوں نے، اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے، اپنے دستِ قدرت سے مویشی پیدا کئے ہیں، جن کے یہ لوگ مالک ہیں''
>
> جب خدا کی بنائی ہوئی چیزیں، انسان کی ملکیت ہوسکتی ہیں، تو انسان کی اپنی کمائی اور مصنوعات، تو یقیناً اس کی ملکیت ہوں گی۔[1]

اور یہ ظاہر ہے کہ --- ''خدا کی بنائی ہوئی چیزوں'' میں زمین بھی شامل ہے، جب یہ خدا کی مصنوعات انسان کی ملکیت ہوسکتی ہیں، تو انسان کی اپنی کمائی اور مصنوعات تو بدرجۂ اولی، اس کی ملکیت میں ہوں گی۔

پھر ایک وقت آیا، جب انفرادی اور ذاتی ملکیت کا وہی تصور، جو کبھی اسلامی اور قرآنی تصور تھا، خلافِ اسلام اور خلافِ قرآن تصور قرار پاگیا، اور پھر، اسی قرآن سے، جس سے انفرادی اور ذاتی ملکیت کا تصور پیش کیا گیا تھا، اب یہ قانون بھی نچوڑ لیا گیا کہ:

> قرآن کریم کی رو سے، زمین کے ایک انچ رقبہ پر بھی، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔[2]

حتی کہ وہ وقت بھی آیا، جب ''ارضی ملکیت'' کفر وشرک، قرار پاگئی اور ''تکذیبِ دین'' بھی:

> یہ قرآن کے معاشی نظام کی عملی بنیاد ہے کہ زمین، تمام نوعِ انسان کے لیے، ذریعۂ پرورش ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ ارض اللہ پر نظری عقیدہ رکھنا، اور عملاً اسے زید، بکر، عمر کی ملکیت میں دے دینا، قرآن کی رو سے شرک ہے، کفر ہے، تکذیبِ دین ہے۔[3]

---

[1] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۵۷ + تحریکِ پاکستان اور پرویز، صفحہ ۳۰۳
[2] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۲ء، صفحہ ۱۲
[3] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۶

الغرض، پرویز صاحب کے موقف آئے دن بدلتے رہتے تھے، اور ان بدلتے ہوئے مواقف میں، کفر و اسلام اور توحید و شرک کا سا فرق ہوا کرتا تھا، جو چیز ایک وقت میں ''مطابق اسلام اور موافق قرآن'' ہوا کرتی تھی، دوسرے وقت میں وہی چیز ''منافیء اسلام اور خلاف قرآن'' ہوا کرتی تھی، اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو وہ ''مطابق قرآن یا خلاف قرآن'' کہا کرتے تھے، وہ فی الواقع ایسا نہیں ہوا کرتی تھی، بلکہ وہ صرف اس تصور کے مطابق ایسا ہوا کرتی، جسے وہ منسوب الی القرآن کر ڈالتے تھے، ''مفکر قرآن'' نے ''مطابق قرآن'' امور کو قبول کرنے کا نعرہ، بڑی بلند آہنگی سے لگایا ہی اس لیے تھا، کہ وہ، اس کی آڑ میں، جس غیر اسلامی تصور کو چاہیں، اسے ''مطابق قرآن'' قرار دیکر قبول کر لیں، اور جسے چاہیں، اسے ''خلاف قرآن'' کہہ کر رد کر دیں۔ یہی وہ ''قرآنی معیار'' ہے، جس پر وہ ہر چیز کو پرکھنے کے دعویدار تھے، قطع نظر اس کے کہ وہ احادیثِ رسول ہوں، یا تاریخی حقائق ہوں، یا اسرائیلیات۔ علمائے امت نے احادیثِ رسول کو جانچنے کے لیے، دیگر اصولوں کے علاوہ، راویوں کو پرکھنے کا بھی اصول، پیش نظر رکھا تھا لیکن پرویز صاحب نے اس اصول کو چنداں اہمیت نہیں دی۔ ان کے نزدیک، حدیث کا راوی خواہ ابوبکر، عمر فاروق، عثمان غنی یا علی مرتضی جیسی عظیم ہستیاں ہی کیوں نہ ہوں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھکر، جبریل جیسی معصوم مخلوق ہی کیوں نہ ہو، اگر ان کی روایت، ''مطابق قرآن'' نہیں ہے، تو وہ دیوار پر دے مارنے کے لائق ہے۔ لیکن اگر، ان ہستیوں کے مقابل، راوی اگر کارل مارکس ہو، رام داس ہو، مکھن مسیح ہو، جان مائیکل ہو، یا بابا رتن سنگھ ہی کیوں نہ ہو، اگر ان کی روایت ''مطابق قرآن'' ہے، تو وہ سر آنکھوں پر رکھے جانے کے قابل ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ہمارے نزدیک دین کا معیار فقط کتاب اللہ ہے، جو عقیدہ یا تصور اس کے مطابق ہے، وہ صحیح ہے، اور جو اس کے مطابق نہیں وہ بلا تامل و تذبذب غلط اور باطل ہے، (خواہ اس کی تائید میں ہزار حدیثیں بھی ایسی کیوں نہ پیش کر دی جائیں، جن کے راویوں میں جبرائیل و میکائیل تک کا بھی نام شامل کر دیا گیا ہو) [1]

ایک دوسرے مقام پر حنیف رامے کی درج ذیل رائے پر، نہ صرف یہ کہ صاد کیا گیا ہے، بلکہ خراج تحسین بھی پیش کیا گیا ہے:

> اللہ نے محکم فیصلہ کر دیا ہے کہ قانون بس خدا ہی کا ہے، (الانعام۔۵۷)، وہی ہر معاملہ کا آخری فیصل ہے (آل عمران-۱۰۵) جب یہ صورت ہو تو قرآن عزیز ہی دوسرے ہر معاملہ کی طرح، اقتصادی میدان میں بھی، میزان اور سرچشمۂ ہدایت ٹھہرتا ہے، صرف اسے حرف آخر سمجھنا چاہیے اور ہر معقول بات، خواہ وہ امام ابوحنیفہ کی ہو یا کارل مارکس کی، اگر قرآن کی کسوٹی پر سچی ثابت ہوتی ہے، تو اسے قبول کرنے میں عار نہ ہونی چاہیے۔ [2]

چنانچہ ''مفکر قرآن'' کے تصور کے مطابق، اگر کسی محرف یا متبدل کتاب سے بھی (جس میں انسانی ہاتھوں سے جہالتاً یا شرارتاً باطل داخل ہو چکا ہو) کوئی چیز ''مطابق قرآن'' مل جائے، تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ اس کی واضح مثال، تفسیر سورہ یوسف میں، بائیبل کا وہ اقتباس ہے، جسے نظام یوسفی کا نام دے کر، جزو تفسیر بنایا گیا ہے:

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۷

[2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۷۵

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے زمین کے متعلق، انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا، اور انھیں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک کو قحط سے دوچار ہونے کا خطرہ ہے، اسکی روک تھام (بلکہ ملک کے معاشی نظام) کے سلسلہ میں، انہوں نے کیا تدبیر اختیار کی تھیں؟ قرآن کریم میں ان کا کوئی ذکر نہیں آیا، تورات میں البتہ اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ [1]

تورات میں کیا تفصیل دی گئی ہے؟ اسے ''مفکر قرآن'' نے بایں الفاظ پیش کیا ہے:

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی، اس لیے کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی، حضرت یوسف نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی، اس غلہ کے بدلہ میں جو لوگوں نے مول لیا جمع کی، اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا، جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی، تو سارے مصریوں نے آ کر یوسفؑ سے کہا، کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چک گئی۔ یوسف نے کہا کہ اپنے چوپائے دو، اگر نقدی چک گئی، کہ میں تمھارے چوپایوں کے بدلے تمہیں روٹی دوں گا۔ وہ اپنے چوپائے یوسف کے پاس لائے اور یوسف نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں، اور اس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انھیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گزر گیا وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے، اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد ختم ہو چکا، ہمارے خداوند نے ہمارے چوپاؤں کے گلے بھی لے لیے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بندوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا، پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے، اور دانہ دے تا کہ ہم جئیں اور نہ مریں، کہ زمین ویران نہ ہو جائے، اور یوسف نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لیے مول لی، کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی، کہ کال نے ان کو نپٹ تنگ کیا تھا، سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ، سو اس نے انھیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی، کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے، اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انھیں دی تھی کھاتے تھے، اس لیے انہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسف نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو۔ میں نے آج کے دن تم کو اور تمھاری زمین کو، فرعون کے لیے مول لیا، لو یہ بیج تمھارے لیے ہے، کھیت بوؤ، اور جب یہ زیادہ ہو تو، یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے، اور چار حصے کھیت میں بیج بونے، اور تمھاری خوراک، اور ان کی جو تمھارے گھرانے کے ہیں، اور تمھارے بچوں کی خوراک کے لیے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں۔ ہم اپنے خداوند کے حضور میں مورد رحم ہوں، اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے، اور یوسف نے ساری مصر کی زمین کے لیے یہ آئین بنایا، جو آج کے دن تک مقرر ہے، کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا، مگر کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔ [2]

چونکہ بائبل کی کتاب پیدائش، باب ۴۷ سے ماخوذ یہ عبارت، ''مفکر قرآن'' کے، اُس ''نظام ربوبیت'' سے کسی حد تک میل کھاتی ہے، جسے انہوں نے اشتراکیت کی ذہنی غلامی میں، مبتلا ہو کر، قرآن کریم سے کشید کیا ہے، اس لیے تورات کے محرف اور نا قابل اعتماد ہونے کے باوجود بھی، قابل قبول ہے، وہ فرماتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۴۹ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۵۰

تورات کے بیانات یقینی نہیں سمجھے جا سکتے کیونکہ اس میں تحریف ہو چکی ہے، لیکن ان ارضی انتظامات کے سلسلہ میں، اس میں، جو کچھ آیا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ حضرت یوسف نے اس ضمن میں کس قسم کی تدابیر اختیار کی تھیں۔ [1]

یعنی تورات میں تحریف ہو چکی ہے۔ اور وہ بھی، اس حد تک، کہ "اس کے بیانات یقینی نہیں سمجھے جا سکتے" لیکن پھر بھی اس کے اقتباسات، تفسیر قرآن میں ملحوظ رکھے جانے کے قابل ہیں سچ ہے۔ ۔

دل نہ چاہے ، تو رسالت کا بھی ارشاد ، غلط
من کو بھا جائے تو بھانڈوں کی خرافات بجا

"مفکر قرآن" نے محرف تورات کا اقتباس پیش کر کے، اس سے جو نتیجہ برآمد کیا ہے، ایک نظر اسے بھی دیکھ لیجئے، فرماتے ہیں:

> اقتباس بالا سے ظاہر کہ حضرت یوسف نے جب علت مرض پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں، انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے، کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں، اس طرح تمام مزروعہ زمینیں انفرادی ملکیت سے نکل کر، حکومت کی ملکیت میں آ گئیں، اس کے بعد حضرت یوسف نے اس زمین کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا اور انھیں آسانیاں بہم پہنچائیں تا کہ وہ خود کاشت کر سکیں، اب یہ کاشتکار اپنی محنت کے ماحصل کے آپ مالک تھے زمیندار کاشت کار کی محنت کے ماحصل میں شریک نہیں تھے۔ [2]

"مفکر قرآن" کے استنتاج پر تفصیلاً کچھ عرض کرنے سے پہلے، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ تورات کا یہ اقتباس پیش کرتے ہوئے، اس کے بعد کا حصہ حذف کر دیا ہے، کیونکہ وہ ذاتی ملکیت پر دال ہے، جو "مفکر قرآن" کے قرآنی نظام ربوبیت کے خلاف ہے، چنانچہ محذوف جملہ ان الفاظ پر مشتمل ہے:

> اور اسرائیلی، ملک مصر میں، جن کے علاقہ میں رہتے تھے، انہوں نے اپنی جائیدادیں کھڑی کر دیں، اور وہ بڑھے، اور بہت زیادہ ہو گئے۔ [3]

اقتباسِ تورات اور استنتاجِ پرویز پر تبصرہ

"مفکر قرآن" کی استنتاجی عبارت میں یہ کہا گیا ہے کہ "اس طرح تمام مزروعہ زمینیں، انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئیں"۔ سوال یہ ہے کہ جب زمین، اللہ ہی کی ملکیت ہے، اور غیر اللہ کی ملکیتِ زمین ازروئے قرآن، (بقول پرویز) شرک ہے، تو اس ملکیت زمین کو افراد کے ہاتھوں سے نکال کر دست حکومت میں دینا، کیا "لات" کی

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۵۰

[2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۵۱

[3] تورات، کتاب پیدائش، باب ۴۷

خدائی کو ختم کر کے ''مناۃ'' کو خدا بنا دینے کے مترادف نہیں؟ اور پھر اس سے بھی بڑھ کر ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کام کو یکے از پیغمبران خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جن کی دعوت کا مرکزی نکتہ ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر غیر اللہ کی خدائی کو ختم کر کے، الوہیت حقہ کے اعتراف پر، مبنی نظام زندگی قائم کیا جائے۔ کیا حضرت یوسف نے یہاں اپنے پیغمبرانہ مشن کے خلاف کام کیا ہے؟ کیا بحیثیت پیغمبر، ان کا کام یہی تھا کہ مصری آبادی کو فرعون کی غلامی مین سونپا جائے؟ یا یہ تھا کہ انھیں ایک اللہ ہی کا غلام بنایا جائے؟ کیا حضرت یوسف کا یہ طرز عمل ان کے پیغمبرانہ مشن سے میل کھاتا ہے؟۔

(۲)------''مفکر قرآن'' کے پیش کردہ اقتباس تورات، اور انکی اپنی ''استنتاجی عبارت'' سے یہ واضح ہے کہ:

(الف) زمینِ مصر، ملکیتِ حکومت قرار پائی (ب) کاشتکار اس پر کاشتکاری کی محنت صرف کرتے ہیں (ج) پیداوار کا پانچواں حصہ مالک زمین کو دیا جاتا ہے۔

کیا یہ واضح طور پر بٹائی کا معاملہ نہیں، کہ زمین ایک فریق (حکومت) کی ہے، اور محنتِ کاشتکاری، دوسرے فریق (رعایا) کی ہے اور پیداوار اس طرح تقسیم ہوتی ہے، کہ اس کا ایک خمس مالک زمین (حکومت) کو ملتا ہے، اور چار خمس کاشتکار (رعایا) کو ملتے ہیں۔ کیا ''مفکر قرآن'' کے لیے بٹائی کا یہ معاملہ قابلِ قبول ہے؟

(۳)-----اور یہ بھی کیا خوب کہا ہے کہ نظام یوسفی کو قائم کر کے، حضرت یوسف نے ''ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا جو دبلی گایوں کو کھائے جا رہی تھیں'' یہ کہہ کر ''مفکر قرآن'' نے گویا اپنی تحریر میں ''قرآنی ادب کی چاشنی'' پیدا کر دی، ''موٹی گائیوں'' سے مراد (''مفکر قرآن'' کے نزدیک) ''بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار'' تھے جبکہ ''پتلی گایوں'' سے مراد ''چھوٹے کاشتکار'' تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ، (الف) قرآن موٹی گایوں کی تعداد بھی سات بیان کرتا ہے، اور پتلی گائیوں کی تعداد بھی اتنی ہی بیان کرتا ہے، إِنِّىٓ أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ۔ کیا واقعی مصر میں ''بڑے بڑے زمیندار سات'' ہی تھے اور ''چھوٹے کاشتکار'' بھی سات ہی تھے (ب) قرآن جو کچھ بیان کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ ''پتلی گائیں موٹی گایوں کو کھا رہی تھیں''۔ لیکن ''مفکر قرآن'' اس کے برعکس یہ فرماتے ہیں کہ ''موٹی گائیں پتلی گائیوں کو کھا رہی تھیں''، یہ معکوس صورتحال کیوں پیدا ہوئی؟ صرف اس لیے کہ ''مفکر قرآن'' کے ذہن پر، قرآنی الفاظ کی بجائے، دورِ حاضر کا ''سرمایہ دارانہ نظام'' مسلط تھا، جس میں بڑے بڑے سرمایہ والے چھوٹے اور غریب افراد کو اپنے معاشی مفاد کی بھینٹ چڑھاتے ہیں، اس ذہنی کیفیت میں ''مفکر قرآن''، قرآنی حقیقت کو بدل کر یہ فرماتے ہیں کہ، ''حضرت یوسف نے ان موٹی گائیوں کو ذبح کر دیا، جو پتلی گایوں کو کھائے جا رہی تھیں''، کیا یہ اشتراکیت کی محبت اور سرمایہ دارانہ نظام کی شدید عداوت کا فطری نتیجہ نہیں، کہ انسان، خود بدلنے کی بجائے قرآنی حقائق کو بدل دیتا ہے؟ اگر ''مفکر قرآن'' کی کسی سے محبت بھی للہ فی اللہ ہوتی، اور نفرت و بغض بھی للہ فی اللہ ہوتے، تو وہ کبھی یوں بے اعتدالی اور ہر معاملہ میں افراط و تفریط کا مظاہرہ نہ کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذاتی عداوت تو شیطان سے بھی نہیں ہونی چاہیے، اس

میں بھی اللہ کا واسطہ درمیان میں رہنا چاہیے، ورنہ نفسانی محبت ونفرت، آدمی کو ہمیشہ غیر متوازن، اور قرآنی حقائق سے بے خبر رکھتی ہے، خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی بڑا ''علامہ'' اور ''مفکر قرآن'' سمجھے بیٹھا ہو۔

(۴) ----- پھر یہ کیسا ''نظام ربوبیت یا نظام یوسفی'' تھا، جس میں فرعون سے، براہ راست جاگیریں اور اراضی رقبے پانے والے کاہن، اپنی ''جاگیروں اور سرمایہ داریوں'' پر برقرار رکھے گئے، اور ان کی ملکیت میں واقع اراضی، حکومت کی دسترس سے باہر ہی رہی؟ کیا نبی کے ہاتھوں قائم کیا جانے والا ''نظام ربوبیت'' ایسا ہی مبنی بر عدل ہوا کرتا ہے؟ اور پھر اس کے ساتھ، ہمارے ''مفکر قرآن'' یہ ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں کہ --- ''حضرت یوسف نے علت مرض پر غور کیا تو انھوں نے دیکھا، کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں'' --- لیکن صحیح معنوں میں، جو بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار تھے، وہ تو کاہن تھے جو براہ راست، فرعون کے ہاں سے یہ مراعات پائے ہوئے تھے، ان کی اراضی سے، تو تعرض کیا ہی نہیں گیا، کیا یہ سارا ''نظام ربوبیت''، چھوٹے کاشتکاروں اور پست حال افراد کی زمینیں چھیننے کے لیے ہی قائم کیا گیا تھا؟ اور وہ بھی ایک پیغمبر کے ہاتھوں؟

حقیقت یہ ہے کہ دور ماضی کی مزدکیت ہو یا دور جدید کی اشتراکیت، جب ''مفکر قرآن'' کا ذہن، اس رنگ میں رنگ گیا، تو پھر ساون کے اندھے کی طرح، انھیں ہر چیز ہری ہی ہری نظر آیا کرتی تھی، اور قرآن، انھیں، اشتراکیت کے نظام کا جدید ایڈیشن ہی دکھائی دیا کرتا تھا، اور ہر وہ فکر، اور نظریہ، جو ''مفکر قرآن'' کے لیے دل پسند ہوتا، وہ پہلے اسے منسوب الی القرآن کر ڈالتے، اور پھر ''مطابقِ قرآن'' ہونے کی دہائی دے کر اسے قبول کر لیا کرتے تھے۔ پھر جو چیز بھی، انھیں اس طرح ''مطابق قرآن'' نظر آتی، اسے اختیار کر لیتے تھے، خواہ اس کا ماخذ کوئی تحریف شدہ آسمانی کتاب ہو، یا کسی یہودی کی ''داس کیپٹل''۔ انھیں، بہر حال، نام تو قرآن ہی کا لینا تھا، لیکن عملاً، یہی رویہ اپنائے رکھنا تھا، کہ گندی مکھی کی طرح، غلاظت ہی پر بیٹھے رہیں، اور اسی عفونت وسنڈ اس ہی سے ''استفادہ'' کرتے رہیں، اور فی الواقع، وہ عمر بھر، قرآن کے نام پر، یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔

الغرض، اگر اسرائیلیات کو وسیع مفہوم میں لیا جائے، کہ ہر وہ چیز جو غیر اسلامی ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اسرائیلی ماخذ سے آئی ہو، یا غیر اسرائیلی ماخذ سے، وہ بہر حال اسرائیلیات میں داخل ہے، تو ''مفکر قرآن'' کا پورا نظام ربوبیت، اسرائیلیات ہی سے ماخوذ ہے، بالخصوص جبکہ، اس کو فکری بنیاد بھی کارل مارکس جیسے یہودی (اسرائیلی) نے ہی فراہم کی تھی، مزید برآں، انہوں نے تہذیبِ مغرب کے جملہ لوازمات (مثلاً مخلوط تعلیم، مخلوط معاشرت، تعدد ازواج کو معیوب گردانا، عورت کو خانگی مستقر سے نکال کر اسے مردانہ کارگاہوں میں دھکیلنا وغیرہ) سب کچھ، ان ہی یہود ونصاریٰ سے، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا ہے، جو آج مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے علمبردار ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہمارے ''مفکر قرآن''، اسرائیلیات سے شغف رکھنے والے، قدیم مفسرین سے، کسی صورت، پیچھے نہیں رہے، کہ انھوں نے تو چند روایات ہی لی تھیں، لیکن ''مفکر قرآن'' نے ان کی پوری معاشرت اور پوری معیشت ہی کو لے رکھا ہے۔

(۵) اعجاز القرآن اور تفسیر مطالب الفرقان

اعجاز کا معنیٰ ''کسی کو عاجز کر دینا'' ہے، روزمرہ کی گفتگو میں اس سے مراد، کسی فعل کو انجام دینے سے قاصر ہونا ہے، اعجزت فلانا کا معنیٰ ''میں نے فلاں کو عاجز کر دیا'' ہے۔ اسی مفہوم میں قرآن میں یہ الفاظ آئے فَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللهِ ''جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے''

اعجاز القرآن سے مراد ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا دعوائے رسالت میں اظہار صدق کرنا اس ذریعہ سے کہ آپؐ کی لائی ہوئی کتاب کے معارضہ سے عرب وعجم اور ان کی آئندہ نسلیں عاجز و قاصر ہیں۔ اس پہلو سے اعجاز القرآن ایک ایسی اٹل حقیقت ہے، جس پر تاریخ گواہ ہے اور اس نے تمام دنیا کو بھی اس پر گواہ ٹھہرایا ہے کہ پورا قرآن تو رہا ایک طرف عربوں نے اس کی مثل ایک سورت تک عملاً بنالانے سے عاجزی کا اظہار کر دیا تھا اور قرآن کی تحدی آمیز آیات نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر ڈالی ہے، اس پہلو سے اعجاز القرآن کا معاملہ علوم القرآن کے حوالہ سے نہایت اہم امر ہے، جسے قدیم وجدید تمام علمائے کرام اپنی تصنیفات میں جگہ دیتے آئے ہیں۔

اعجاز القرآن کے مختلف پہلو

علمائے سلف وخلف نے کئی زاویہ ہائے نگاہ سے قرآن کے معجزہ ہونے پر بحث کی ہے، مثلاً فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے، مستقبل کے متعلق اخبار غیب کے اعتبار سے، علوم ومعارف کے لحاظ سے، انسانی قدرت سے اس کی مثل لانے سے خارج ہونے کے اعتبار سے، اپنی تعلیمات اور اپنے قوانین کی جامعیت اور توازن بدوش ہونے کے اعتبار سے، بیمار اور مریض انسانیت کے لیے نسخہ شفا ہونے کے اعتبار سے، نیز وہ اپنے الفاظ کے چناؤ، بیان کے اسلوب اور نظم کے اعتبار سے بھی معجزہ کی شان رکھتا ہے، پھر قرآن اس لحاظ سے بھی معجزہ ہے کہ اس نے اس قوم کو جو بھیڑ بکریاں اور مویشی چرانے کا بھی سلیقہ نہ رکھتی تھی جہاں گیر، جہاں باں، جہاں دار اور جہاں آرا بنا دیا، الغرض، قرآن کی معجزانہ شان کے متعدد پہلوؤں سے علمانے سیر حاصل بحث کی ہے۔

پرویز صاحب اور اعجاز القرآن

لیکن صاحبِ تفسیرِ مطالب الفرقان نے اگرچہ قرآن کریم کے معجزہ ہونے کا ذکر کیا ہے، مگر کسی پہلو پر بھی اطمینان بخش بحث نہیں کی، چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں مندرجہ ذیل آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ۔ ۲۳) اور اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہمنواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر، باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو، تو

یہ کام کر دکھاؤ۔

کفار کی معجزہ طلبی کے ضمن میں ''مفکر قرآن'' لکھتے ہیں:

رسول اللہ کے مخاطبین یہی مطالبہ حضور ﷺ سے کرتے تھے اور خدا کی طرف سے رسول اللہ کی زبانی اس کا یہ جواب ملتا تھا کہ میرا معجزہ تو یہی کتاب ہے، اس کے سوا مجھے کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ [1]

یقیناً قرآن ایک معجزہ ہے اور اس عبارت میں اسے تسلیم بھی کیا گیا ہے، لیکن حضور ﷺ نے یہ بات کہیں بھی نہیں کہی کہ اس کے سوا مجھے کوئی معجزہ نہیں دیا گیا، یہ دراصل ''مفکر قرآن'' کا اپنا نظریہ ہے، جس کے تحت وہ ماسوائے قرآن ہر معجزۂ رسولؐ کے منکر تھے اور یہاں اپنے اس خود ساختہ نظریہ کو منسوب الی الرسول قول کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ **سبحانک ھذا بھتان عظیم**

قرآن نے کفار مکہ کے منہ مانگے معجزات کے بارے میں صرف یہ کہا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ کیا ان کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ ہم نے ایک ایسی کتاب تجھ پر نازل کی جو ان پر پڑھی جاتی ہے

پرویز صاحب نے قرآن کے معجزہ ہونے کا ذکر درج ذیل آیت کے تحت بھی کیا ہے:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یونس-۳۷،۳۸) اور قرآن وہ چیز نہیں ہے، جسے اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے اور بلا شبہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے، کیا یہ، یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کیا ہے، کہو اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو اس جیسی ایک ہی سورت تصنیف کر لاؤ اور خدا کے علاوہ جسے بھی مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو۔

اس آیت کے مفہوم القرآن میں ---تحدی، قرآن کے مثل بنا کر دکھاؤ--- کے زیر عنوان لکھا گیا ہے:

واقعہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی قرآن جیسا ضابطہ قانون مرتب کر سکے اس لیے جھوٹا قرآن بنایا ہی نہیں جا سکتا (ذرا غور کرو کہ اس قرآن کی خصوصیات کیا ہیں سب سے پہلے یہ کہ (ایک عملی نظام کے ذریعے) یہ ان تمام اصول قوانین کو سچ کر دکھانے والا ہے، جو اس سے پہلے بذریعہ وحی دیے جاتے رہے، پھر یہ قوانین کو اس طرح نکھار کر اور ابھار کر بیان کرتا ہے کہ ان میں نہ شک و شبہ کی گنجائش رہتی ہے اور نہ ہی کوئی اضطراب اور ذہنی کشمکش اور یہ قوانین اس خدا کی طرف سے دیے گئے ہیں جو تمام کائنات اور عالمگیر انسانیت کی نشو و نما کا ضامن ہے، (لہٰذا اس میں نہ کسی خاص قوم سے رعایت برتی گئی ہے اور نہ ہی کسی کی خواہ مخواہ مخالفت کی گئی، یہ ضابطہ انسان اور انسان میں فرق نہیں کرتا۔

غور کرو کہ یہ لوگ اس قسم کے ضابطۂ حیات کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں، اس رسول کا خود ساختہ ہے، ان سے کہو کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ اس قسم کا ضابطۂ حیات، انسان بنا سکتا ہے، تو اس دعوے کو......ثابت کرنے کا آسان طریق یہ

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۳۱۰

ہے کہ تم (سارا قرآن نہیں صرف) اس کی ایک سورت کی مانند بنا کر دکھاؤ اور اس مقصد کے لیے تم خدا کو چھوڑ کر جس جس کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو (اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اس چیلنج کو قبول کرو، ۲۳/۲۰، ۱۳/۱۱، ۸۸/۱۷)۔(۳۸)

قرآن کریم کا یہ چیلنج کہ اس کی مثال بنا کر دکھاؤ، پہلے بھی گزر چکا ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث...... مطالب الفرقان جلد اول (صفحات ۳۱۴۔ الآخر) میں آ چکی ہے۔ [1]

آیئے اس حوالہ کے مطابق اس مقام کو بھی دیکھ لیا جائے جو یہاں پیش کیا گیا ہے:

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ان سے کہا گیا کہ میرا معجزہ یہ کتاب ہے، کیا یہ تمھارے لیے کافی نہیں؟

جب ان سے یہ کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے، تم ہمارے سامنے یہ کتاب پیش کرتے ہو لیکن ہمارا تو اعتراض ہی یہ ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ یہ کتاب میری تصنیف کردہ نہیں خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے، تو ہم اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اس قسم کی کتاب ہم خود بھی تصنیف کر سکتے ہیں۔ وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰـذَآ إِنْ هٰـذَآ إِلَّآ أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ (۳۱/۸) جب ان کے سامنے اس قرآن کی آیات کو پیش کیا جاتا ہے، تو یہ بڑی بے اعتنائی سے کہتے ہیں کہ ہم نے انھیں سن لیا ہے، اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسی کتاب تصنیف کر سکتے ہیں اس میں اس کے سوا رکھا ہی کیا ہے کہ اقوام سابقہ کے قصے کہانیاں ہیں جنھیں یکجا کر دیا گیا ہے''۔ اس جواب پر ان سے کہا گیا کہ ''بہت اچھا ہمیں یہ منظور ہے، چلیے فیصلہ کن بات یہی رہی اگر تم اس کتاب کی مثیل و نظیر کوئی کتاب تصنیف کر دو تو ہمارا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) جھوٹا ہوگا کہ یہ انسانی تصنیف نہیں خدا کی کتاب ہے''۔ خدا نے ان کا چیلنج قبول کیا اور اپنے رسول سے کہا کہ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى أَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰـذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۸۸/۱۷)۔ ''تم تو ایک طرف اگر ساری دنیا کے انسان حضری اور بدوی سب کے سب مل کر بھی کوشش کریں کہ اس جیسا قرآن بنالیں تو وہ ایسا نہیں کر سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے کتنے ہی مددگار کیوں نہ بن جائیں''۔ یہ قرآن جیسا کہ یہ کہتے ہیں اقوام سابقہ کی داستانوں کا مجموعہ نہیں۔ اس میں تو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے متعلق ابدی حقائق اور ازلی راہنمائی دی گئی ہے، جسے ہم مختلف اسالیب و انداز سے لوٹا لوٹا کر سامنے لاتے ہیں تاکہ ہر بات کی وضاحت ہو جائے، اس جیسا مکمل اور غیر متبدل ضابطہ حیات کون بنا سکتا ہے۔

یہاں کہا گیا جیسا کہ تم نے خود ہی دعویٰ کیا ہے، اس قرآن جیسا پورا قرآن بنا کر دکھاؤ، دوسری جگہ اس مطالبہ میں خود اپنی طرف سے تخفیف کر کے یہ کہہ دیا کہ أَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيَاتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۳/۱۱) ''یہ کہتے ہیں کہ اس رسول نے یہ قرآن خود بنا لیا ہے اور اسے خدا کی طرف یونہی منسوب کر رہا ہے، ان سے کہو کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ خدا کی کتاب نہیں، انسان کا کلام ہے، تو تم پورے کا پورا قرآن تو ایک طرف اس جیسی صرف دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور خدا کو چھوڑ کر جسے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہو کر لو، بات صاف ہو جائے گی''۔

یہاں دس سورتیں کہا گیا اور سورہ یونس میں اس میں مزید تخفیف کر کے کہا أَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۸/۱۰) دس سورتیں بھی نہیں ان سے کہو کہ ان جیسی ایک ہی

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۳۰۱ تا ۳۰۲

سورت بنا کر پیش کر دو۔

اس کے بعد یہ کہہ کر بات کو آخری حد تک پہنچا دیا کہ فَلْيَأْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهِ إِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۳۴/۵۲) ''ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک سورت بھی نہیں جو حقائق اس میں بیان کئے گے ہیں ان جیسی صرف ایک حقیقت صرف ایک بات ہی وضع کر کے دکھاؤ''۔

کس قدر خود اعتمادی ہے، اس دعوی پر کہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان وحی کی کسی حقیقت کی مثل و نظیر پیش کر سکے اور یہی تھی وہ انتہا درجے کی خود اعتمادی جس کی بنا پر ان کا چیلنج قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ [۱]

قرآنی سورتوں کی مثل دس سورتیں بنا کر لے آنے کا چیلنج جو سورہ ھود میں دیا گیا ہے، اس کا ذکر اگرچہ مندرجہ بالا اقتباس میں آ چکا ہے، لیکن پھر بھی آیت (۱۴/۱۱،۱۳) کا مفہوم القرآن پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن اپنی طرف سے بنالیا ہے۔ اور اسے خدا کی طرف یونہی منسوب کر دیا ہے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ (یہ خدا کی کتاب نہیں، انسان کا کلام ہے) تو تم اس قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور جسے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہو کر لو، بات صاف ہو جائے گی (۲۳ / ۲،۲۸ / ۱۰) لیکن اگر (نہ تو تم خود ہی ایسا کر سکو اور نہ ہی) وہ لوگ تمھاری اس دعوت کو قبول کریں جنھیں تم اس مقصد کے لیے اپنے ساتھ ملانا چاہو تو اس کے بعد تمہیں جان لینا چاہیے کہ یہ قرآن، علم خداوندی کی رو سے ہی نازل ہوا ہے۔ (رسول کا خود ساختہ نہیں) اور اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ کائنات کا تمام اقتدار صرف خدا کے لیے ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ان سے پوچھو کہ کیا تم اس کے بعد بھی اس ضابطہ خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرو گے (۱۴) [۲]

یہ اعجاز القرآن پر وہ مواد ہے۔ جو تفسیر مطالب الفرقان کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ اعجاز القرآن کے جملہ پہلوؤں میں سے کسی ایک جگہ بھی سیر حاصل بحث نہیں کی گئی بس اجمالاً قرآن کے معجزہ ہونے کا ہی ذکر ہے۔ مختلف مقامات پر خال خال اس قسم کے جملے جیسا کہ درج ذیل ہے۔ مل بھی جائیں تو وہ اعجاز القرآن کی اصل حقیقت اور قدر و قیمت کو نمایاں نہیں کرتے ہیں:

میں اپنی بصیرت کے مطابق حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اس کی یہ ترتیب بھی اس اعجاز القرآن کا ایک حصہ ہے۔ جس کا چیلنج دنیا کو دیا گیا ہے۔ [۳]

حالانکہ اعجاز القرآن علوم القرآن کا ایک اہم پہلو ہے، جس پر مفکر قرآن کو ہر پہلو سے روشنی ڈالنا چاہیے تھا مگر معلوم نہیں کہ انہوں نے اسے کیوں نظر انداز کیا تاہم اس موضوع پر سید مودودیؒ نے اپنی تفہیم القرآن میں (ج ۵ ص ۱۷۵ تا ۱۸۰ پر) جو کچھ لکھا ہے، وہ مولانائے محترم کی بہترین قلمی کاوشوں میں سے ایک انتہائی خوبصورت اور اہم قلمی شاہکار ہے۔

---

۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۳۱۴ تا صفحہ ۳۱۵

۲ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۳۴۹ تا صفحہ ۳۵۰

۳ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۳۱۶

(۶) ناسخ و منسوخ (نسخ فی القرآن)

مفہوم نسخ

عربی زبان میں ''نسخ'' کا لفظ مندرجہ ذیل معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اولا-----''ازالہ وابطال''۔اس معنی میں یہ لفظ درج ذیل آیت میں آیا ہے۔

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَايُلْقِي الشَّيْطٰنُ (الحج۔ ۵۲) پس اللہ تعالیٰ اس چیز کا ازالہ کر دیتا ہے، جسے شیطان القا کرتا ہے۔

ثانیا-----''نقل وتحویل''۔اس معنی کی تائید درج ذیل الفاظ آیت سے ہوتی ہے۔

اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ۔۲۹) جو کچھ بھی تم کرتے ہو ہم اسے لکھواتے جا رہے تھے۔

عربوں میں'' تناسخ المواریث'' کا کلمہ بھی اسی معنی کو ظاہر کرتا ہے، یعنی ورثا کی موت کے بعد میراث کے یکے بعد دیگرے مختلف افراد تک منتقل ہوتے رہنا۔

نسخ میں مفہوم اول کو مفہوم اصلی کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے کہ نقل وتحویل کے نتیجہ میں جب ایک صفت معدوم ہو جاتی ہے، تو اس کی جگہ دوسری صفت آئے یا نہ آئے بہر حال پہلی صفت کا ازالہ تو ہو ہی جاتا ہے، اس لیے نسخ کے اصلی اور بنیادی مفہوم میں اصل معنی کی حیثیت ''ازالہ وابطال'' ہی کو حاصل ہے، نہ کہ ''نقل وتحویل'' کو۔ یہی وجہ ہے کہ علما نے نسخ کے اصطلاحی مفہوم کو بایں الفاظ پیش کیا ہے، ''بعد میں آنے والے حکم کا پہلے حکم کو زائل کر دینا نسخ ہے''۔

متاخر حکم، کسی سابق حکم کی جگہ، نئے عمل کو واجب کرے یا محض حکم سابق کو ختم کر دے، یہ دونوں صورتیں، مفہوم نسخ میں لغت اور شریعت کے اعتبار سے پائی جاتی ہیں۔

نسخ احکام کی صورتیں

دنیا کی حکومتوں میں نسخ احکام کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لیکن خدائی احکام میں نسخ کا وقوع ان وجوہ ومصالح سے مختلف ہے، جن کی بنا پر حکام دنیا اپنے احکام کو منسوخ کرتے رہتے ہیں۔

انسانی احکام میں نسخ کبھی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ پہلا حکم غلط فہمی کی بنا پر جاری ہوتا ہے اور بعد میں جب اس کے غلط نتائج ابھر کر سامنے آتے ہیں تو اسے بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ایک دوسرے حکم کے ذریعہ سابق حکم کو منسوخ کر دیا جاتا ہے۔

نسخ احکام کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حاکم نیک نیتی سے ایک حکم جاری کرے لیکن اسے حالات کا صحیح اندازہ نہ ہو اور وہ تبدیلی شؤن واطوار کا پیشگی علم نہ رکھتا ہو، اس طرح حالات کے متغیر ہونے پر اسے نئے حکم کے اجرا کی ضرورت محسوس ہو

لیکن اللہ تعالیٰ کے احکام میں نسخ کا وقوع ، نہ تو اس وجہ سے ہے کہ اس نے پہلا حکم کسی غلط فہمی کی بنا پر دیا تھا، جسے بعد میں بدلنے کی ضرورت پڑ گئی ، اور نہ ہی اس وجہ سے کہ اسے معاذ اللہ تبدیلیٔ احوال کا پیشگی علم نہ تھا، اور بعد کے تغیر شدہ حالات میں اسے نیا حکم دینا پڑا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے بالاتر ہے کہ کسی وقت کسی چیز سے وہ جاہل اور بے خبر ہو، تخلیقِ کائنات سے قبل، اس کے بعد، حتیٰ کہ فنائے کائنات کے بعد بھی، ہر چیز کے جملہ کلیات و جزئیات کا علم، بلا لحاظِ تفریقِ زمان و مکان، ہمیشہ اور ہر وقت اسے حاصل ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے احکام میں نسخ کی وجوہ و مصالح وہ نہیں ہیں، جو انسانی احکام کے نسخ میں پائی جاتی ہیں۔

نسخِ احکام کی ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ حکم دینے والا پہلے سے جانتا ہو کہ حالات بدلیں گے اور موجودہ حکم اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک موجودہ حالات برقرار رہیں گے۔ احوال و اطوار کے بدلتے ہی اسے دوسرے احکام کا اجرا کرنا پڑے گا۔ تبدیلیٔ احکام کی یہ وہ صورت ہے، جس کا ہم روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مصالح و حکم ، اشخاص و اقوام، احوال و اطوار اور امکنہ و ازمنہ کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ ایک طبیب ایک مریض کو دوا کھانے کا حکم دیتا ہے، وہ جانتا ہے کہ دو چار دن کی اس دوا کے بعد، مریض کا حال بدل جائے گا، پھر واقعتاً جونہی مریض کی حالت بدلتی ہے، وہ دوسری دوا تجویز کر ڈالتا ہے اور پہلی دوا کو منسوخ کر دیتا ہے، پہلی دوا کا وقتی اور عارضی حکم اور دوسری دوا کے حکمِ استعمال کے باعث پہلی دوا کا حکمِ نسخ ، یہ سب کچھ مریض کے معالج کے علم میں تھا۔

اسی طرح ، ایک بچے کو پالنے والی ماں، ابتداءً، دودھ جیسی نرم اور ہلکی غذا بچے کو دیتی ہے، پھر ایک عرصہ کے بعد وہ بچہ ہلکی غذا سے ثقیل غذا کی طرف منتقل ہوتا ہے، اسی طرح مرورِ ایام کے ساتھ ثقیل سے ثقیل تر غذاؤں کی طرف وہ بڑھتا رہتا ہے۔

یہی حال، ایک معلم کا ہے کہ وہ آغازِ تعلیم میں اپنے تلامذہ کو آسان ترین معلومات فراہم کرتا ہے، پھر وہ درجہ بدرجہ آسان ترین سے آسان تر اور آسان تر سے آسان اور پھر آسان سے مشکل اور مشکل سے مشکل تر اور پھر مشکل تر سے مشکل ترین معلومات کی طرف اپنے طلبہ کو لے جاتا ہے، جس سے طلبہ مرحلہ وار عقلی کمال اور فکری عروج کی طرف بڑھتے جاتے ہیں، جن میں ہر حالت کے احکام بعد والی حالت کے احکام کے لیے جگہ خالی کرتے چلے جاتے ہیں۔

اقوامِ عالم بھی ، اس قاعدہ و کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ افراد کی طرح اقوام بھی مختلف حالات سے گزرتی ہیں۔ ہر حالت کے لیے مناسب قوانین دیے جاتے ہیں، حالات کے بدل جانے پر احکامِ سابقہ کی جگہ ، نئے احکام آ جاتے ہیں، جو موجودہ حالات کے لیے ، اسی طرح سازگار ہیں، جسطرح سابقہ احکام، گذشتہ حالت کے لیے سازگار تھے۔ تغیرِ احوال کے ساتھ ، اگر تبدیلیٔ احکام نہ واقع ہو، تو احکام اور حکمتوں اور قوانین اور ان کی مصلحتوں میں اختلال واقع ہو جاتا ہے۔

یہ ہے، نسخِ احکام کی اصل حقیقت۔ مسلم عقلا نے کبھی اس کا انکار نہیں کیا۔ یہود بے بہبود نے، نسخ کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے پہلو سے دیکھنے کی بجائے ، اس کے علم میں نقص و جہالت کے پہلو سے دیکھا، اور اس پر زبانِ طعن دراز کی۔ اسلامی تاریخ میں فرقہ معتزلہ کے ایک عالم، ابومسلم اصفہانی نے اعتراضاتِ یہود سے مرعوب ہو کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ ”احکام الٰہیہ

میں وقوعِ نسخ، اگرچہ ممکن ہے، لیکن عملاً اس کا وقوع کبھی ہوا نہیں ہے''۔

نسخ اور پرویز

لیکن دورِ حاضرہ کے معتزلہ میں سے غلام احمد پرویز، ابومسلم اصفہانی سے بھی، دو قدم آگے بڑھ گئے اور یہود کی طرح، انہوں نے بھی مسئلہ نسخ کو، اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے پہلو سے دیکھنے کی بجائے، اس کے نقص علم کے پہلو سے دیکھا، پھر مزید ستم بالائے ستم یہ کہ اس غلط زاویہ نظر سے اس مسئلہ کو خود دیکھ کر اس کی نسبت ان علمائے امت کی طرف کر دی، جو بانگ دہل اس نقطہ نظر سے دیکھنے کے منکر ہیں، چنانچہ وہ آیت نسخ کا ایک ایسا مفہوم خود گھڑ کر علمائے امت کے کھاتے میں ڈالتے ہیں، جس کو آج تک علما میں سے نہ کسی نے لکھا ہے اور نہ ہی بیان کیا ہے:

> اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا، اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہیے، چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا یہ حکم اس پہلے حکم سے بہتر تھا۔[1]

''مفکر قرآن'' آیت نسخ کا یہ خود ساختہ مفہوم خود گھڑتے ہیں اور اسے علما کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں، پھر اس بنائے فاسد پر مزید بنائے فاسد کا اضافہ کرتے ہوئے، بڑی سینہ زوری سے یہ کہتے ہیں کہ:

> اس عقیدہ کی رو سے دیکھئے کہ خدا، قرآن اور رسول کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے، خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لیے وہ قرآن کے اس حکم کو منسوخ کر کے، اس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔ قرآن کے متعلق یہ کہ اس میں بیشمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تلاوت برابر ہو رہی ہے اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کون سی آیت منسوخ ہے اور کون سی ناسخ، اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود فیصلہ کر لیں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اس کی ناسخ۔ اور رسول کے متعلق یہ تصور کہ حضور، خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے۔[2]

پرویز صاحب کے علما کی طرف منسوب کردہ، اپنے اس خود ساختہ عقیدہ سے، جس قسم کے تصورات، خدا، رسول اور قرآن کے متعلق پیدا ہوتے ہیں، ان پر تو پھر گفتگو ہوگی۔ فی الحال، تو صرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ، کس عالم دین کی، کون سی کتاب میں مکتوب ہے؟ اس کا کوئی حوالہ بھی ہے؟ یا اس کی صرف یہی دلیل ہے کہ:

مستند ہے پرویز کا فرمایا ہوا

حیرت یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب عمر بھر ایسی ہی افترا پردازیاں کرتے رہے ہیں، لیکن کسی مقام پر بھی، نہ تو خوفِ خدا ہی انھیں محسوس ہوا، اور نہ مخلوق کی شرم و حیا ہی دامن گیر ہوئی۔ میں نے علمائے قدیم و جدید کی وہ تمام تفاسیر دیکھ ڈالی ہیں جو مجھے میسر آ سکی ہیں، مجھے کہیں وہ عقیدہ، کسی کتاب میں نہ ملا، جسے ''مفکر قرآن'' نے علما کی طرف منسوب کیا ہے۔

---

[1] + [2] لغات القرآن، جلد ۴، صفحہ ۱۶۰۸

سبحانک هذا بهتان عظیم

''مفکر قرآن'' جو کچھ عمر بھر کرتے رہے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا نام لے کر، وہ، قرآنی مفاہیم ہی سے گریز کرتے رہے ہیں اور اپنے من گھڑت مفاہیم کو قرآن کے منہ میں ڈالتے رہے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ اصطلاح کی آڑ میں، علما کو بدنام و رسوا کرنے کے لیے، ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے رہے ہیں جن سے ان کا دامن پاک ہے، تشریح اسلام میں قرآنی مفردات سے فری سٹائل کشتی لڑتے اور کھینچ تان کے ذریعہ، الفاظِ قرآن سے روحِ قرآن کے خلاف مفاہیم کشید کرتے رہے ہیں۔ کہیں قرآن میں اپنے من پسند معانی کو جگہ دینے کے لیے خدع وفریب سے کام لیتے ہوئے الفاظ قرآن کی ایسی معنوی تحریف کرتے کہ الامان والحفیظ۔ ''مفکر قرآن'' صاحب کے سیرت و کردار کی ایک جھلک، زیرنظر مقالہ میں، قارئین کرام، خود ملاحظہ کرسکتے ہیں، جس میں لغوی تحقیق اور تشریح آیات کے دوران، یہ سب کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

لغوی تحقیق میں پرویزی حیلے

آیئے! لغوی تحقیق کے دوران ''مفکر قرآن'' صاحب نے، جن پرویزی حیلوں سے کام لیا ہے، انھیں ایک نظر دیکھ لیں۔

ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ نسخ کے لغوی مفہوم میں دو معانی شامل ہیں

(۱) ازالہ وابطال اور (۲) نقل وتحویل

نسخ کے معنی میں، کسی حکم کے بالکلیہ ختم ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، جسے ازالہ وابطال کہا جاتا ہے اور ازالۂ حکم کے بعد، کسی نئے حکم کا گزشتہ حکم کے قائم مقام بن جانے کا معنی بھی پایا جاتا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' کو چونکہ کسی حکم کے مجرد مٹ جانے، زائل ہوجانے اور فقط مرفوع ہوجانے کا معنی تسلیم نہیں ہے، اس لیے وہ نسخ کا ایک ادھورا مفہوم بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو لے آنا دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کردینا (ابن فارس) [1]

''مفکر قرآن'' نے، یہاں اپنی ذہنی چابکدستی کا یہ مظاہرہ کیا ہے کہ ابن فارس کی ادھوری عبارت نقل کی ہے، اور بعض لوگوں کے اس قیاس کو کہ ''ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو لاکر پہلی چیز کا قائم مقام کردینا، نسخ ہے''۔ تمام علمائے لغت کے متفقہ فیصلے کے طور پر پیش کیا ہے، حالانکہ یہ تمام علمائے لغت کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ بعض لوگوں کا قیاس ہے، جبکہ بعض دیگر علما ایک دوسرا قیاس پیش کرتے ہیں کہ ''کسی چیز کا کسی دوسری چیز کی طرف تحویل کرنا نسخ ہے''۔ لیجئے ابن فارس کی اصل عبارت ملاحظہ فرمایئے۔

> **النون والسین والخآء اصل واحد الاانه مختلف فی قیاسه قال قوم قیاسه رفع شیء واثبات غیره مکانه وقال قوم اخرون قیاسه تحویل شیء الی شیء** [2]

---

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۰۶ [2] معجم مقاییس، جلد ۵، صفحہ ۴۲۴

ن-س-خ، ہی اس کی اصل واحد ہے، لیکن مفہوم نسخ کے قیاس میں اختلاف واقع ہوا ہے، ایک گروہ نے کہا کہ ایک چیز کو اٹھا کر اس کی جگہ کسی دوسری چیز کو ثابت کر دینا نسخ ہے، جبکہ دوسرے لوگوں نے کہا کہ کسی چیز کو دوسری چیز کی طرف تحویل کر دینا نسخ ہے۔

''مفکر قرآن'' نے ایک گروہ کے قیاس کو مفید مطلب پایا اور قبول کر لیا اور دوسرے گروہ کے اختلاف کا ذکر تک نہ کیا۔ ایسا کرتے ہوئے، اپنے قارئین کو یہ یکطرفہ تاثر دیا کہ نسخ کا جو معنی وہ بیان کر رہے ہیں وہ گویا علمائے امت کے نزدیک ایک متفق علیہ مفہوم ہے، جس میں نہ کسی اختلاف کی گنجائش ہے اور نہ ہی کسی نے اختلاف کیا ہے، ''مفکر قرآن'' کی یہی وہ مطلب جویانہ ذہنیت ہے، جس کا شاہکار، ان کی پوری لغات القرآن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نسخ کے لغوی مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک حکم دوسرے حکم کے لیے اس طرح اپنی جگہ خالی کر دے کہ حکم ثانی حکم اول کی جگہ کسی نئے عمل کو پرانے عمل کا قائم مقام بنائے اور یہ بات بھی کہ متاخر حکم، سابق حکم کا محض ازالہ اور فقط خاتمہ کر دے بغیر اس کے کہ کسی نئے عمل کو عملِ سابق کی جگہ رائج کرے، کلام عرب میں ان دونوں معانی کی مثالیں پائی جاتی ہیں لیکن ''مفکر قرآن'' چونکہ نسخ کے ایسے مفہوم کے قائل نہیں ہیں جس میں بعد والا حکم پہلے حکم کو محض زائل اور ختم کر دینے پر اکتفا کرے، اس لیے وہ کلام عرب میں سے ان اقوال کی تحریف کے درپے رہے ہیں، جن میں یہ معنی پایا جاتا ہے، مثلاً

والعرب تقول :نسخت الشمس الظل وانتسخته :ازالته اذهبت الظل وحلت مكانه [۱]

عرب کہتے ہیں کہ ''دھوپ نے سائے کا نسخ یا انتساخ'' کر دیا یعنی دھوپ نے سائے کو زائل کر دیا دھوپ سائے کو لے گئی اور خود اس کی جگہ پر آ گئی (یعنی کسی اور چیز کو اس کی جگہ پر لانے کی بجائے خود اس کی جگہ پر آ گئی)۔

یہی مقولہ عرب ابن فارس نے بھی پیش کیا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' جب اس مقولہ عرب کو اپنی لغات القرآن میں درج کرتے ہیں تو نسخ بمعنی ''ازالہ محض'' سے بچنے کے لیے اور پھر نسخ کے مفہوم میں، بہر حال، قائم مقامی کا تصور گھسیڑنے کے لیے جو پاپڑ بیلتے ہیں، وہ ترجمہ ذیل سے ظاہر ہے۔

آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ [۲]

نسخت الشمس الظل کا سیدھا سادا ترجمہ یہ ہے کہ ''دھوپ نے سایہ کو ہٹا دیا'' لیکن ''مفکر قرآن'' نے الفاظ کا مسرفانہ استعمال کرتے ہوئے اور دور کی کوڑی لاتے ہوئے اس تین لفظی مقولے کو پورے دو جملوں میں مترجم کیا حالانکہ اگر وہ پہلے ہی جملے میں ''آفتاب'' کی جگہ ''دھوپ'' لکھ دیتے تو بات واضح ہو جاتی اور دوسرے جملے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

کیا ''مفکر قرآن'' کو یہ علم نہ تھا کہ انگریزی زبان کے لفظ (SUN) کی طرح، عربی زبان کا لفظ شمس بھی ''آفتاب اور دھوپ'' کے دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے؟ یقیناً علم تھا وہ خود اپنی لغات القرآن میں (ش-م-س)

---

[۱] لسان العرب، جلد ا، صفحہ ۶۱ [۲] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۰۶

کے مادہ کے تحت یہ لکھ چکے ہیں:

الشمس آفتاب (۲/۲۵۸)، دھوپ [۱]

پھر ''مفکرِ قرآن'' نے یہ جانتے ہوئے بھی (کہ لغات عربیہ میں شمس بمعنی دھوپ بھی مستعمل ہے) کیوں تجاہل عارفانہ سے کام لیا؟ اور نسخت الشمس الظل کے تین لفظی مقولے کا ترجمہ پورے دو جملوں میں پھیلا کر کیوں پیش کیا؟ صرف اور صرف اس نظریہ ضرورت کے تحت کہ کہیں نسخ بمعنی ''ازالۂ محض'' کا مفہوم نہ ظاہر ہونے پائے۔

دوسرے مقولہ عرب کے مفہوم میں تحریف

علمائے لغت نے ''محض ازالہ وابطال'' کے مفہوم کی وضاحت میں، ایک اور مقولۂ عرب بھی پیش کیا ہے، اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ''مفکرِ قرآن'' نے اسے بھی، اپنے نظریہ ضرورت کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ملاحظہ فرمایئے:

نسخت الريح اثار الديار ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات وعلامات) کو تبدیل کر دیا (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انھیں ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا)...... [۲]

حالانکہ نسخت الريح آثار الديار کا سیدھا سادا ترجمہ یہ ہے کہ --- ہوا نے آبادی کے آثار کو مٹا ڈالا --- لیکن نسخ میں سے ''ازالۂ محض'' کے مفہوم کو خارج کرنے کے لیے، اس مقولہ کا ترجمہ لمبی چوڑی عبارت کے ذریعہ ''تبدیل کر دیا اور ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا'' جیسے الفاظ کی بھرمار سے کر دیا۔

پرویزی مفہومِ نسخ

''مفکرِ قرآن'' کے نزدیک نسخ کا مفہوم، کسی آسمانی شریعت کا (یا اس کے بعض احکام کا) کسی بعد والی آسمانی شریعت (یا اس کے بعض احکام) سے بدل جانا اور اس کے قائم مقام ہو جانا ہے، اس لیے ان کے ''تصور'' نسخ میں کسی حکم کا ''فقط خاتمہ یا محض ازالہ'' اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک کہ منسوخ احکام کی جگہ، قائم مقام احکام نہ مانے جائیں، مجرد احکام کا ازالہ یا صرف ان کا معدوم ہو جانا، چونکہ انھیں قابل قبول نہیں، اس لیے وہ ان مقامات میں بھی، جہاں کوئی حکم، کسی حکمِ سابق کا قائم مقام بنے بغیر، اس کا محض ازالہ یا خاتمہ کر رہا ہو، وہ وہاں بھی کوئی نہ کوئی متبادل یا قائم مقام تلاش کرنے پر تل جاتے ہیں، پھر چونکہ ان کے نزدیک، ناسخ ومنسوخ کا وجود، ایک ہی نبی کی شریعت میں، اس کے حین حیات نہیں پایا جا سکتا (بلکہ کوئی بعد کی شریعت ہی، اس کے احکامِ شریعت کو ختم کر سکتی ہے) اس لیے وہ قرآن میں، اس نسخ کے تو قائل ہیں کہ قرآنی احکام، شرائعِ سابقہ کے احکام کو منسوخ کر دیں، لیکن اس بات کے قائل نہیں کہ قرآنی آیات میں سے کسی کو منسوخ مانا جائے، کیونکہ نسخِ آیاتِ قرآنیہ کی صورت میں، بعد از قرآن، کسی وحی یا آسمانی شریعت کے نزول کا قائل ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز چونکہ ختم نبوت کے منافی ہے،

[۱] لغات القرآن، صفحہ ۹۷۸ [۲] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۰۶

لہٰذا وہ قرآنی آیات کے نسخ کے منکر ہیں۔ یہ ہے، ''مفکرِ قرآن'' کا مزعومہ تصورِ نسخ، جس پر انکارِ نسخ کی پوری عمارت کو، اساس پذیر کیا گیا ہے، اسی تصور کے زیر اثر، وہ اپنی لغوی تحقیق کے دوران، اپنی ذہنی چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حدِ تحریف کو پھاندتے ہوئے، آیت نسخ کی تفسیر کرتے ہیں۔

آیتِ نسخ اور پرویز صاحب

اب آیئے! اور پرویز صاحب کے بیان کردہ مفہومِ نسخ کا جائزہ لیجئے لیکن اصل مفہوم اور تفسیر آیت سے قبل، وہ، بطور تمہید فرماتے ہیں:

> پیچھے سے کلام کا سلسلہ یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن مجید اور رسالت محمدیہ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن مجید ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے،) اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا ☆) کہ جب خدا نے انبیا سابقین (مثلاً حضرت موسیٰ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دیے تھے اور وہ احکام تورات وغیرہ میں موجود ہیں تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی کیا ضرورت تھی؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ [1]

''مفکرِ قرآن'' کی یہ عادت تھی کہ قرآنی آیات کو خود ساختہ معانی کا لباس پہنانے کیلیے وہ ایک ایسی تمہید باندھا کرتے تھے، جس سے وہ اپنے ذہنی مقصود تک پہنچنے کے لیے زینے کا کام لیا کرتے تھے، چنانچہ آیت نسخ کی تشریح سے قبل، ان کی یہ تمہید بھی، اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

''مفکرِ قرآن'' نے یہ تو بتا دیا ہے کہ ''پیچھے سے سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہ پر مختلف اعتراضات کرتے تھے'' لیکن یہ واضح نہ کر سکے کہ اعتراضات کا یہ سلسلہ کس آیت سے شروع ہوا، اور کس آیت پر ختم ہوا؟ جبکہ ہم صریح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آیت نسخ جس رکوع میں واقع ہے، اس کی ابتدا ہی یآیھا الذین امنوا کے خطاب سے ہو رہی ہے، اس آیت کے بعد والی آیات بھی، اہل ایمان ہی سے مخاطب ہیں۔ آخر کس دلیلِ قرآنی کی بنا پر، ان آیات کے خطاب کا رخ، اہل ایمان سے موڑ کر اہل کتاب کی طرف پھیرا جائے؟ پھر ''مفکرِ قرآن'' نے یہ بھی نہیں بتایا کہ یہود کی طرف سے نئے نبی اور نئی کتاب کی آمد کے اعتراض کا ماخذ، کون سی قرآنی آیت ہے؟

''مفکرِ قرآن'' کا دورخا پن

یہاں ''مفکرِ قرآن'' کے سیرت و کردار اور ان کے اصول تفسیر کی پاسداری کا ایک اور پہلو بھی ملاحظہ فرمایئے جوان

☆ جی ہاں! جسطرح قرآن پر یہود ''اہم اعتراضات'' کیا کرتے تھے، بالکل اسی طرح، پرویز صاحب بھی، حدیث پر ''اہم اعتراضات'' کیا کرتے تھے۔ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۰۹

کے تضادِ عمل اور دورخے پن کا منہ بولتا ثبوت ہے، ایک طرف وہ آیت نسخ کی توضیح وتشریح کے لیے اعتراضاتِ یہود پر مبنی، آیت کا ''شانِ نزول'' خود گھڑتے ہیں اور دوسری طرف قرآن کریم کی تحسین وتعریف میں یہ ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں کہ:

خدا کی یہ عظیم کتاب اپنے مطالب کے واضح کرنے کے لیے نہ تو شانِ نزول کی محتاج ہے اور نہ کسی اور ترتیب کی۔ [1]

آیاتِ قرآن یا آیاتِ کتبِ سابقہ

حقیقت یہ ہے کہ یہود کا یہ اعتراض، قرآن میں کہیں موجود نہیں، کجا یہ کہ، وہ آیت سے قبل یا متصل بعد ہی موجود ہو، اسے ''مفکرِ قرآن'' نے اپنی ٹکسال میں خود ڈھالا، تاکہ اس کی بنیاد پر آیتِ نسخ کی تشریح کرتے ہوئے، وہ، اپنے مقصود ذہنی تک پہنچ جائیں، چنانچہ اس خودساختہ ''شانِ نزول'' کو وہ اپنی ذہنی مقصود کی بنیاد بنا کر اس پر اگلا ردایوں چڑھاتے ہیں:

آیت کے معنی صرف قرآن کریم کی آیت نہیں، قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیات اللہ کہا ہے، مثلاً اسی سورہ بقرہ میں قصہ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ''جب میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی پیروی کرے گا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوتا'' اور اس کے آگے ہے، وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ...... (۳۹/۲) ان کے برعکس جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے اور ان سے انکار کریں گے...... یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آتی ہے، اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ [2]

''مفکرِ قرآن'' کی یہ دلیل، صرف اسی صورت میں درست قرار پا سکتی تھی، جبکہ آیت (۳۹/۲) میں فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى کی جگہ ''کتاب یا وحی'' کے الفاظ ہوتے اور پھر اگلی آیت کی روشنی میں، اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا جا سکتا تھا، لیکن جو لفظ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، وہ ''کتاب یا وحی'' کا لفظ نہیں بلکہ ھدی کا لفظ ہے اور ہدایت کی آیات ضروری نہیں کہ ''وحی یا کتاب'' ہی کی آیات ہوں، بلکہ وہ آفاق وانفس میں پھیلے ہوئے معرفت کردگار کے آثار وعلائم بھی ہو سکتے ہیں قرآن کی یہ آیات اس پر گواہ ہیں۔

۱---سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم السجدہ-۵۳) عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے، اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔

۲---وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (النحل-۱۶) اور علامات ہیں اور لوگ ستاروں سے راہ پاتے ہیں۔

۳---وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (یوسف-۱۰۵) زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں، جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ ھدی یا ہدایت کی آیات، آفاق وانفس کے وہ آثار وعلائم بھی ہو سکتے ہیں، جو خدا کی طرف

[1] مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۳۱۶ [2] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۱۱

سے نازل کردہ وحی یا کتاب کی آیات کے علاوہ ہوں، اس لیے، آیتِ نسخ، میں بغیر کسی دلیل، یا قرینہ سیاق وسباق کے، لفظ ایا تنا کو وحی شدہ کتاب کی آیات تک محدود و محصور کر دینا ''مفکر قرآن'' کی ایک ایسی سینہ زوری ہے، جو الفاظ قرآن سے ان کی عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کا عمر بھر محرک بنی رہی ہے، اس بے جا سخن سازی کے ساتھ ہی، وہ اپنی تحقیق کا نتیجہ یوں بیان کرتے ہیں:

> لہٰذا ماننسخ من اية میں، آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے، کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی، بعد کی وحی کی آیات سے، جیسا کہ سورہ نحل کی آیات میں کہا گیا ہے، واذا بدلنااية مكان اية (۱۰۱/۱۶) ''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں''۔ [۱]

''مفکر قرآن'' کی یہ توجیہ، دلیل سے عاری مجرد ایک دعویٰ ہے، جو خود محتاج دلیل ہے، اس کے بطلان پر مندرجہ ذیل امور شاہد عدل ہیں:

اولا-----آیت کا لفظ جب مطلق بولا جائے تو اس سے مراد آیات قرآن ہی ہوتی ہیں کیونکہ:

وہی ہمارے ہاں معہودِ ذہنی ہوا کرتی ہیں اس سے خواہ مخواہ تورات وانجیل کی آیات مراد لینا، جب کہ ان کتب سابقہ کا سیاق وسباق میں سرے سے ذکر ہی نہ ہو، ایک بیجا سخن سازی ہے۔

ثانیا-----آیت نسخ کے مخاطب اہل ایمان ہیں، نہ کہ اہل کتاب، کیونکہ آیت جس رکوع میں شامل ہے، اس کا آغاز ہی يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے ہوتا ہے، لہٰذا جب اہل ایمان کو خطاب کر کے یہ کہا جائے کہ ماننسخ من اية (ہم جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں......) تو اس سے بالیقین آیات قرآن ہی مراد ہوں گی نہ کہ تورات وانجیل کی آیات۔

ثالثا-----اگر آیت سے مراد سابقہ وحی ہوتی تو قرآن ماننسخ من وحی یاماننسخ من کتاب یاماننسخ من شرعة کے الفاظ استعمال کرتا اور اسی طرح واذا بدلنا اية من اية کے قرآنی الفاظ میں اية کی جگہ بھی وحی یا کتاب یا شرعة کے الفاظ ہی ہوتے، جو مفہوم پرویز کو ادا کرنے کے لیے زیادہ مناسب اور موزوں الفاظ ہیں۔

رابعا-----جہاں تک سورہ نحل کی آیت وَإِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ کا تعلق ہے، تو یہ مکی دور کی سورت ہے، جس میں دعوت، اہل مکہ کو پیش کی گئی ہے اور اہل مکہ ہی کے اعتراضات سے تعرض کیا گیا ہے، تبدیلی آیت والے قرآنی جملے سے متصل ہی پہلے وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تبدیلی آیت پر انما انت مفتر کے الفاظ سے خطاب کرنے والے، اہل کتاب نہیں، بلکہ اہل شرک تھے۔ اس سیاق وسباق میں تبدیلی آیت والے قرآنی جملے کو، اہل کتاب سے متعلق قرار دیکر، سابقہ کتب کی آیات مراد لینا بے محل اور بے جوڑ سی بات ہے، آخر ''مفکر قرآن'' صاحب کی بات کو بلا دلیل کیسے مان لیا جائے کہ سورہ النحل کی محولہ بالا آیت میں ''آیات کی تبدیلی'' سے مراد ''قرآن کی آیات کی تبدیلی نہیں'' بلکہ ''تورات وانجیل کی آیات کی تبدیلی'' ہے؟

---

[۱] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۱۱

لفظ ننسھا کا پرویزی مفہوم

اس کے بعد ''مفکرِ قرآن'' نے آیت نسخ کے اگلے حصہ ''ننسھا'' کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے ملاحظہ فرمایئے:

اس کے بعد لفظ ننسھا ہے، یہ لفظ نسی سے ہے، نسی کے معنی، کسی چیز کو ترک کر دینا یا فراموش کر دینا، آتے ہیں اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آ جاتی ہے کہ سابقہ کتب آسمانی اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں چنانچہ قرآن میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سرِ نو محکم کر دیتا (۵۲ / ۲۲) ؎۱

آیت (۵۲ / ۲۲) کے مفہوم میں پرویزی تحریفات کا جائزہ

اسی چیز کو ''مفکرِ قرآن'' ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ کتب سابقہ میں یہ احکام بھی تھے:

ان میں ایسے احکام بھی تھے جنھیں اہلِ کتاب نے اپنی طرف سے وضع کر کے شامل کر رکھا تھا اس کی شہادت قرآن پاک کے مختلف مقامات پر موجود ہے، مثلاً (۱۳/۵)۔ ان تحریفات کو جدید وحی منسوخ کر کے ان کی جگہ اصلی احکام دے دیتی تھی۔ سورہ حج میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنّٰٓى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۵۲/۲۲) اور ہم نے (اے رسول) تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ اس کے بعد، اس کے تلاوت کردہ (پیغامات خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ ملا نہ دیا ہو (شیاطین یہ کرتے تھے اور) اللہ ان کی آمیزش کو دوسرے رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا اور اپنے پیغامات کو پھر محکم بنا دیتا تھا اللہ علیم و حکیم ہے۔ ؎۲

''مفکرِ قرآن'' کی یہ عبارت، ان کی تحریف کو تین پہلوؤں سے طشت از بام کر رہی ہے۔

اولاً ---- سورہ حج کی آیت میں جس القا شیطانی کا تذکرہ ہے، وہ کب واقع ہوا؟ پیغمبر کی وفات کے بعد؟ یا اس کی زندگی میں جبکہ وہ تلاوت کر رہا ہو؟ اللہ تعالیٰ کا جواب یہ ہے کہ إِذَا تَمَنّٰٓى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (شیطان نے یہ کام، پیغمبر کے بعد نہیں، بلکہ اس کی زندگی میں، دورانِ تلاوت کیا) لیکن ''مفکرِ قرآن'' کو اللہ تعالیٰ سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک یہ شیطانی آمیزش، پیغمبر کے بعد ہوئی۔ چنانچہ الفاظِ قرآن کی قیود سے آزاد ہو کر اور حدودِ مفرداتِ قرآنیہ میں، انسلاخِ آیات کرتے ہوئے، ترجمہ میں، وہ، اضافی الفاظ یوں داخل کرتے ہیں کہ تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر اور نبی نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ اس کے بعد...... آخر یہ ''اس کے بعد'' کے الفاظ، کن قرآنی مفردات کا ترجمہ ہیں؟

ثانیاً ---- ان آمیزشوں اور ملاوٹوں کا ارتکاب کس نے کیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا مرتکب شیطان کو قرار دیا ہے، إِذَا تَمَنّٰٓى أَلْقَى الشَّيْطَانُ لیکن ''مفکرِ قرآن'' کے نزدیک، یہ ارتکاب، اہل کتاب اور ان کے سرکش و مفسد افراد نے کیا ہے، یہ ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کا اللہ تعالیٰ سے دوسرا اختلاف ہے، حالانکہ شیطان کا لفظ جب مطلق بولا جائے اور کوئی قرینہ ایسا نہ

؎۱ لغات القرآن، صفحہ ۱۶۱۱ ؎۲ قرآنی فیصلے، ج ۲، صفحہ ۴۰

پایا جائے کہ اس سے مراد، افرادِ انسانی لیے جائیں، تو اس سے مراد، وہ شیاطین الجن ہی ہوتے ہیں، جو نظر نہیں آیا کرتے، اور جن کے متعلق، خود قرآن، یہ کہتا ہے کہ إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں دیکھ نہیں سکتے) پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ کوئی فردِ انسانی، خواہ، وہ، پیغمبر اور اس کے مشن کا کتنا ہی زبردست مخالف ہو، وہ اس امر پر قدرت نہیں رکھتا کہ پیغمبر کی تلاوت کے عین دوران میں، وہ، آمیزش اور ملاوٹ کر پائے، یہ کام، غیر مرئی ہونے کی بنا پر، اور نگاہوں کی گرفت میں نہ آسکنے کے باعث، وہ شیطان ہی کر سکتا ہے، جو شیاطین الجن میں سے ہو۔

ثالثاً----ان شیطانی آمیزشوں اور القائے ابلیسی کو، اللہ، کب اور کس وقت منسوخ کرتا ہے؟ جس پیغمبر کی تمنا و تلاوت کے دوران شیطان القا کرتا ہے، اسی پیغمبر کے زمانہ میں اور اسی کے ذریعہ؟ یا اس کے بعد آنے والے کسی دوسرے پیغمبر کے ذریعہ؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيٓ أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهِ--- ”جب رسول یا نبی تلاوت کرتا، تو اس کی تلاوت میں شیطان القا کر ڈالتا، پھر اللہ، القائے شیطانی کو منسوخ کر دیتا اور اپنی آیات کو محکم کر دیتا تھا“---لیکن ہمارے ”مفکرِ قرآن“ کو یہاں بھی، اللہ میاں سے اختلاف ہی رہا۔ ان کے نزدیک، القائے شیطانی کا واقعہ، کسی پیغمبر کی زندگی میں نہیں بلکہ ان کے بعد ہوتا رہا، اور پھر القائے شیطانی، اس وقت تک برقرار رہتا تھا جب تک کہ اس کے بعد، کوئی نیا رسول آ کر، ان آمیزشوں کو مٹا نہیں دیتا تھا۔ اس مفہوم کو بیچارے اللہ میاں مناسب الفاظ میں پیش نہ کر سکے تو ”مفکرِ قرآن“ نے ترجمہ میں، اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا اضافہ کر کے، اللہ میاں کی بات بنا دی اور اس کی لاج رکھ لی (العیاذ باللہ)۔

آیت (۵۲/۲۲) کا صحیح مفہوم

اگر آیت (۵۲/۲۲) کے الفاظ پر سے ”مفکرِ قرآن“ کے فکر کے اغلال و اصرار اتار پھینکے جائیں تو آیت کا سیدھا سادا ترجمہ یہ ہوگا:

> ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول یا نبی نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ اس کی تلاوت میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ ملا نہ دیا پھر اللہ اس کی خلل اندازی کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پھر محکم بنا دیتا ہے، اللہ علیم و حکیم ہے۔

اصل اور تحریفی ترجمہ کے نتائج میں فرق

”مفکرِ قرآن“ کے الحاقی یا اضافی الفاظ سے پاک یہ ترجمہ واضح کرتا ہے کہ جس پیغمبر نے بھی تلاوت کی، شیطان نے اس میں القا کیا، اور اللہ نے اس کے القا کو مٹا دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا، لیکن اگر ”مفکرِ قرآن“ کے فکر کا نشانہ بننے والا، بھاری بھرکم مفہوم اپنایا جائے تو صورتِ حال کچھ یوں بنتی ہے کہ--”ایک نبی (مثلاً حضرت عیسیٰؑ) نے اپنی وحی کی تلاوت کی، شیطان نے القا کیا، یہ القا شیطانی اور آمیزشِ ابلیسی صدیوں تک برقرار رہی، آخر کئی صدیوں کے بعد، ایک دوسرے پیغمبر (مثلاً حضرت محمد ﷺ) تشریف لائے، اور اپنی وحی کے ذریعہ، صدیوں پہلے واقع ہونے والے القا شیطانی کا آج ازالہ کر دیا۔

خدارا ذرا سوچئے! کیا اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیات کو مستحکم کیا کرتا ہے کہ ایک پیغمبر کی تلاوت کے وقت، ہونے والے القا شیطانی کو، اللہ تعالیٰ، اُسی وقت، اُسی پیغمبر کے ذریعہ نہ مٹائے جس کی تلاوت کے دوران، شیطان نے یہ دخل اندازی کی ہے، اور اس شیطانی ملاوٹ اور ابلیسی آمیزش کو صدیوں تک برقرار رہنے دے، تاکہ حق و باطل کا یہ مخلوطہ، قرنہائے قرن تک جادۂ ہدایت اور راہِ حق کو مسدود رکھے۔ لوگ نسل در نسل گمراہی کے کھڈوں میں گرتے رہیں، مدت دراز تک حق اور ہدایت، افراد انسانی کی رسائی سے دور، بلکہ نظروں سے اوجھل رہیں، اور شیطانی آمیزشوں کا یہ زہر (جسے شیطان نے پیغمبر کی تمنا و تلاوت کے وقت اس کی وحی کے چشمہ ءصافی میں شامل کر دیا تھا) لوگوں کو صدیوں تک کفر و ضلالت کے قبرستان میں پہنچاتا رہے، اور اللہ میاں اُس وقت، اور اسی جگہ (There and Then) تو، اس زہر کا ازالہ نہ کرے لیکن صدیاں گزر جانے کے بعد، ایک اور پیغمبر بھیجے اور شیطانی ملاوٹوں سے اپنے پیغام کو پاک کرے؟ کیا یہی وہ خدائی علم و حکمت ہے، جس کی بنا پر، آیت کے آخر میں وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ کہا گیا ہے؟

کیا کبھی ''مفکر قرآن'' نے، اپنے فکر کی بلند پروازی سے نیچے اتر کر، یہ بھی سوچا تھا کہ ان کی اس تشریح سے، قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے، جس کا طعنہ، وہ ہمیشہ قائلینِ نسخ کو دیا کرتے تھے؟ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' کو صرف اور صرف، اس سے غرض تھی کہ انہوں نے اپنی دیانت اور امانت کو بالائے طاق رکھ کر، مسخ و تحریف کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر، تراجمِ آیات میں اپنے الحاقی اور اضافی الفاظ سے جو جدت طرازی کی ہے، اس میں کہیں فرق نہ آنے پائے، خواہ یہ جدت طرازیاں، اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں یا نصاریٰ کی مفتریات، مجوس کی مخترعات ہوں یا صنادید عجم کی خرافات، مفکرینِ مغرب کی ہفوات ہوں یا مستشرقین کی ہرزہ سرائیاں۔

تحریفِ پرویز کے تدریجی مراحل

حقیقت یہ ہے کہ آیت (۵۲/۲۲) کا، مسئلہ ناسخ و منسوخ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ چودہ صدیوں پر مشتمل اسلامی لٹریچر میں، کہیں اس آیت کو، نسخ کے اصطلاحی مفہوم میں، زیر بحث نہیں لایا گیا۔ علما نے نسخ بمعنی ازالہ کے لغوی مفہوم کی وضاحت کے لیے، اس آیت کو استشہاداً پیش کیا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب نے تعلیماتِ قرآنیہ کو اپنی ذاتی خواہشات و آرا کی بھینٹ چڑھا دینے کے لیے:

(۱) پہلے تو یہ کہا کہ آیت نسخ (۱۰۶/۲) یہود سے خطاب کرتے ہوئے، ان کے اعتراض کا جواب پیش کرتی ہے، حالانکہ آیت کا خطاب صریحاً اہل ایمان سے ہے، نہ کہ کسی اور گروہ سے۔

(۲) اس کے بعد دوسرے قدم پر مَا نَنسَخْ مِنْ اٰيَةٍ میں آیت سے مراد، قرآنی آیات لینے کی بجائے، کتب سابقہ اور گذشتہ وحی کی آیات لی گئی ہیں۔

(۳) اور پھر تیسرے قدم پر بھی غنیمت تھا اگر ''مفکر قرآن'' یہیں تک محدود رہتے، لیکن وہ آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ سابقہ وحی کی آیات میں اب یہود و اہل کتاب کی مفتریات ومخترعات بھی داخل ہو گئیں۔

یاد رکھئے، قرآن کریم، یہود ونصاریٰ کے خود ساختہ احکام واعمال کی تردید تو کرتا ہے، لیکن ان کی تنسیخ نہیں کرتا، اس لیے کہ نسخ وتنسیخ اس حکم پر وارد ہوتی ہے، جس کی اصل، خدا یا رسول سے ثابت ہو، اور جو حکم ہوں ہی بے اصل (جیسے یہود ونصاریٰ کی مکذوبات ومخترعات) تو، ان کی صرف تردید ہوتی ہے، نسخ وتنسیخ نہیں۔ لیکن ''مفکر قرآن'' اہل کتاب کے خود ساختہ احکام اور من گھڑت قوانین کو بھی، نسخ کے اصطلاحی مفہوم کی بحث میں گھسیٹ لائے ہیں۔ کیا اہل ایمان، ان انسانی قوانین پر عمل پیرا تھے کہ انھیں اب منسوخ کرنے کی ضرورت پڑ گئی؟ اہل کتاب اگر ان خود ساختہ قوانین کو مان بھی رہے تھے، تو قرآن، خود ان کے قوانین کو، خود ان کے لیے کیسے منسوخ کر سکتا تھا جبکہ وہ قرآن کو مانتے ہی نہیں تھے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ یہود کے سرکش اور مفسد افراد کے خود ساختہ قوانین کو اصطلاحی نسخ کی بحث میں کھینچ لانا ''مفکر قرآن'' صاحب کی جہالت نہیں تو شرارت ضرور ہے، کیا دنیا میں، کبھی کوئی ایسی حکومت، کسی نے دیکھی ہے جو دھوکہ اور فریب کی راہ سے جعلی حکمران بن جانے والے بہروپیوں کے قوانین کی تردید کرنے کی بجائے ،ان کے قوانین کو منسوخ کرے؟ شاید ''مفکر قرآن'' صاحب ''تردید کرنے'' اور ''منسوخ کرنے'' کے درمیان جو فرق ہے، اس سے قطعی بے خبر تھے۔

انسا اور نسیان میں پرویز صاحب کا خلط بحث

اب آیے، آیتِ نسخ کے دوسرے جز وأَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا کی طرف۔ ''مفکر قرآن'' لکھتے ہیں:

اس کے بعد لفظ ننسها ہے، یہ لفظ نسی سے ہے، نسی کے معنی کسی چیز کو ترک کر دینا یا فراموش کر دینا آتے ہیں۔ [1]

بسوخت عقل زحیرت ایں چہ بوالعجبی است

جب کسی شخص کے خیالات، قدم قدم پر، قرآن سے ٹکراتے ہوں اور وہ اپنے خیالات کو بھی چھوڑ نا نہ چاہتا ہو، اور قرآن سے اپنے تمسک کا ڈھونگ بھی برقرار رکھنے پر مجبور ہو، تو وہ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ میں، کتر بیونت کرنے پر تل جاتا ہے، تاکہ قرآن سے ہدایت لینے کی بجائے، الٹا قرآن کو ہدایت دی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب، عمر بھر، اُدھیڑ بُن کی ایسی ہی کیفیت سے دوچار رہے ہیں۔

لفظ ننسها کے متعلق ان کا یہ کہنا کہ یہ لفظ نسی سے ہے، ان کے کتر بیونت اور خدع وفریب کی ایک مثال ہے، ایک مبتدی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ ننسها کا لفظ نسی سے نہیں بلکہ اَنسیٰ (یُنسِی) سے ہے، نسی ثلاثی مجرد میں فعل ماضی ہے، جب کہ انسی ثلاثی مزید فیہ میں فعل ماضی ہے، نسی کا مصدر نسیان ہے، جب کہ اَنسیٰ (یُنسِی) کا مصدر انساء

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۱۱

ہے، جس سے مضارع کا فعل ینسی متکلم جمع کے صیغہ میں مجزوم ہو کر، ضمیر مفعول ھا سے ملتے ہوئے ننسھا بنا ہے، نسی کے معنی فراموش کر دینا اور ترک کر دینا دونوں ہی ہیں، جبکہ انسا کے معنی صرف فراموش کرا دینے یا بھلا دینے کے ہیں، اس میں ترک کروا دینا کا معنی موجود نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب خود بھی تلاش بسیار کے باوجود انسا بمعنی "ترک کروا دینا" کی کوئی نظیر اپنی لغات القرآن میں پیش نہ کر سکے اور خود انھیں بھی --------------- انساہ ایاہ "اس نے اس کو بھلا دیا" (۱) ------------ کے معنی پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔

نسیان اور انسا میں جو واضح فرق ہے، اسے "مفکر قرآن" نظر انداز کرتے ہوئے أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> وہ اس وحی کے کچھ حصہ کو ترک کر دیتے تھے اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں شامل کر دیتا تھا [۱]

"وحی کے کچھ حصہ کو ترک کرنے والوں" سے مراد، اقوام گذشتہ کے مفسد اور سرکش لوگ ہیں۔ ایک اور مقام پر "مفکر قرآن" فرماتے ہیں:

> اہل کتاب کے، اپنی کتابوں کے بعض پیغامات کے فراموش کر دینے کا بھی ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (۱۳/۵) اگر ان فراموش کردہ پیغامات کا موجود رکھنا مقصود ہوتا تو جدید وحیِ خداوندی انھیں بحال کر دیتی۔ [۲]

"مفکر قرآن" کا اللہ تعالیٰ سے اختلاف

اس میں شک نہیں کہ اہل کتاب، بعض احکام خداوندی میں تحریف کر ڈالتے تھے، بعض کو گلدستہ طاق نسیاں بنا ڈالتے تھے، یہ ایک الگ بحث ہے، جسے نسخ آیات یا انسا آیات سے کوئی تعلق نہیں، یہاں تو صرف اس بات پر غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کیا فرما رہے ہیں اور اس کے مقابلے میں تشریحاتِ "مفکر قرآن" کیا کہہ رہی ہیں؟

اولاً ---- اللہ بزرگ و برتر تو یہ فرما رہے ہیں کہ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا یعنی اگر ہم کسی آیت کو فراموش کرا دیتے ہیں (غور فرمایے "فراموش کر دیتے ہیں" نہیں بلکہ "فراموش کرا دیتے ہیں") تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں، لیکن "مفکر قرآن" کی فکر زدہ تفسیر یہ کہتی ہے کہ --- اہل کتاب اگر خود اپنی کتابوں کے پیغامات کو فراموش کر دیتے تو اللہ تعالیٰ جدید وحی کے ذریعہ انھی پیغامات کو بحال کر دیتا تھا ---

ثانیاً ---- اللہ تعالیٰ تو یہ فرما رہے ہیں کہ --- "ہم اگر کسی آیت کو فراموش کرا دیتے ہیں تو اس فراموش شدہ آیت کو نہیں بلکہ اس جیسی کسی دوسری آیت کو لے آتے ہیں" --- أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا۔ لیکن "مفکر قرآن" کے نزدیک، فراموش شدہ پیغامات کی مثل دیگر پیغامات نہیں، بلکہ انھی نسیان شدہ پیغامات کو بحال کر دیا جاتا ہے۔

کس قدر زمین و آسمان کا فرق ہے، کلام خداوندی میں اور ان تشریحاتِ کلام الٰہی میں، جنھیں "مفکر قرآن" نے

---

۱ لغات القرآن، صفحہ ۱۶۱۱ ۲ قرآنی فیصلے، جلد ۲، صفحہ ۴۰

اپنے فکر کی بھینٹ چڑھا رکھا تھا، ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ "مفکر قرآن" قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے یا تحریف؟ ایسے ہی مفسرین کے متعلق اقبال نے کہا تھا۔

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر — تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

قرآن کو پاژند بنانے کے لیے ایک اور پرویزی حیلہ

آیت نسخ میں ننسھا کی تشریح میں ایک اور حیلہ بھی اختیار کیا گیا ہے، "مفکر قرآن" فرماتے ہیں:

نسی کے معنی کسی چیز کو علی حالہ چھوڑ دینے کے بھی ہیں اس اعتبار سے آیت ننسھا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں علی حالہ رہنے دیا جائے انھیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے ہیں۔ [1]

سبحان اللہ "مفکر قرآن" کے اس تفسیری نکتے کے کیا کہنے!

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

قطع نظر اس کے کہ نسی کے معنی "کسی چیز کو علی حالہ چھوڑ دینے" کے ہیں بھی یا کہ نہیں؟ اگر نسی کے یہی معنی ہوں تو انسی ینسی کے معنی کسی چیز کو علی حالہ چھڑوا دینے" کے ہوں گے کیونکہ آیت میں باب افعال کا مضارع ہی آیا ہے، لیکن معنی خواہ نسیان کا لیا جائے یا انسا کا، دونوں میں سے کوئی معنی بھی آیت میں نصب نہیں ہوتا۔ الفاظ قرآن یہ ہیں مَا نَنْسَخْ مِنْ ايَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا "ہم جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا جس آیت کو بھی علی حالہ چھوڑتے ہیں (یا چھڑوا دیتے ہیں) تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں"۔ خود سوچئے کہ جب ایک آیت کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی وحی یا کتاب اللہ میں علی حالہ چھوڑ دیا (یا چھڑوا دیا) تو پھر اس جیسی یا اس سے بہتر آیت لے آنے کا کیا فائدہ؟ بہتر یا اس جیسی آیت تو اسی صورت میں لائی جا سکتی تھی جب اللہ تعالیٰ اسے اٹھا لیتے خواہ بذریعہ نسخ یا بذریعہ انسا۔ لیکن جب آیت کو علی حالہ چھوڑ دیا گیا تو اس جیسی یا اس سے بہتر آیت لے آنے کا محل کیا رہا؟ لیکن "مفکر قرآن" کو اپنی جدت طرازیوں کی دھن میں، ان امور پر سوچنے کی فرصت کہاں؟

جائزہ بانداز دِگر

اب اس معنی کا جائزہ جسے "مفکر قرآن" نے پیش کیا ہے، ایک اور پہلو سے بھی لیجیے۔

عقیدہ توحید پر ایمان، عقیدہ رسالت پر ایمان، اور عقیدہ آخرت پر ایمان لانے، کا حکم نیز والدین سے حسن سلوک، اخلاقی فضائل کو اختیار کرنے اور اخلاقی رذائل و ذمائم کو ترک کرنے کا حکم، وغیرہ وہ امور ہیں جنھیں اللہ نے ہر وحی میں شامل کیا ہے، ان جملہ احکام کو اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے آنے والے ہر پیغمبر کی وحی میں علی حالہ چھوڑے رکھا ہے، کیا ان احکام

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۱۱

کا ہر وحی میں علی حالہ چھوڑے رکھنا واقعی خدائے بزرگ و برتر کا نسیان ہے،؟

سَنُقْرِؤُکَ فَلَا تَنْسٰی إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ

حقیقت یہ ہے کہ آیت نسخ کا اصل مفہوم وہی ہے، جسے علمائے امت چودہ صدیوں سے بیان کرتے چلے آ رہے ہیں اور جسے ''مفکر قرآن'' نے اپنے شوقِ تنقید اور ذوقِ تحریف کے باعث نشانہ اعتراض بنایا ہے، اولاً اس لیے کہ ننسها کے اصل معنی ''بھلا دینے'' ہی کے ہیں۔ ثانیاً اس لیے کہ قرآن کریم نے حضور اکرم ﷺ کے نہ بھولنے کو مطلق نہیں رکھا بلکہ اپنی مشیت کے تابع رکھا ہے، الفاظ قرآن ملاحظہ فرمایے۔

سَنُقْرِؤُکَ فَلَا تَنْسٰی (٦) إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (الاعلیٰ-٦) ہم تجھے پڑھا دیں گے پھر تم نہیں بھولو گے الا یہ کہ خود اللہ یہ چاہے (کہ تجھے بھلا دے)

اس آیت میں واقع استثناء، استثنائے متصل نہیں ہے، بلکہ استثنائے منقطع ہے، جس کی وجہ سے ترجمہ میں فرق واقع ہو جاتا ہے، استثنائے متصل کے لحاظ سے ترجمہ یہ ہوگا ''ہم تجھے پڑھا دیں گے پھر تو نہیں بھولے گا مگر وہ جو اللہ چاہے کہ تو بھول جائے''، جبکہ استثنائے منقطع کے اعتبار سے ترجمہ یوں ہوگا ''ہم تجھے پڑھا دیں گے پھر تو نہیں بھولے گا مگر وہ جو اللہ چاہے کہ تجھے بھلا دے''۔ اور یہ بُھلا دینے کا معاملہ لفظ نُنْسِهَا میں مذکور ہے، جسے ''مفکر قرآن'' نے تصریف آیات کی آڑ میں، آیات پر تصرف کرتے ہوئے ''بھلا دینے'' کے ایک صحیح مناسب اور راست بیٹھنے والے معنی کو چھوڑ کر دوسرے دور خیز معانی کا سہارا لیا ہے۔

ایک عذر لنگ کا سہارا

لیکن ''مفکر قرآن'' کو یہ مفہوم آیت (٧/٨٧) اس لیے قابل قبول نہیں کہ یہ بقول ان کے ''خلاف قرآن'' ہے، چنانچہ وہ اپنے موقف کی حمایت میں فرماتے ہیں:

> قرآن کریم میں ہے، وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِهٖ عَلَیْنَا وَکِیْلًا (١٧/٨٦)
> اگر ہم چاہتے تو جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے، اسے اٹھا کر لیجاتے اور پھر کوئی قوت تیری طرف سے ہمارے خلاف وکالت کر کے (اسے واپس نہ لا سکتی تھی) ''اگر ہم چاہتے'' سے واضح ہے کہ اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا بھی کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا چاہا نہیں اس لیے ایسا کیا نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضور پر نازل کیا اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں لیا گیا[1]

''اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں لیا گیا''۔ یہ الفاظ مفہوم قرآن کو بصحت ادا نہیں کرتے اگر یہ کہا جاتا کہ ''اسے واپس نہیں لیا گیا''، تو مفہوم صحیح طور پر ادا ہو جاتا۔ ویسے بھی کسی چیز کو پورے کا پورا واپس لینا اور چیز ہے اور اس میں سے معمولی حصہ واپس لینا اور چیز ہے، معمولی حصہ تو بذریعہ نسخ یا بذریعہ انسا (از روئے آیت نسخ) واپس لیا جا سکتا ہے، لیکن مکمل قرآن اور پوری وحی واپس نہیں لی جا سکتی جیسا کہ آیت (١٧/٨٦) سے ظاہر ہے۔

[1] قرآنی فیصلے، ج ۲، صفحہ ۴۱

آیت وَلَئِنْ شِئْنَا ......کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن دیکر جس رسالت سے آپؐ کو سرفراز کیا ہے، وہ آپؐ سے سلب نہیں کی گئی (یا نہیں کی جائے گی) نبوت کا جو تاج آپؐ کے سر پر رکھا گیا ہے، اسے واپس نہیں لیا گیا (یا نہیں لیا جائیگا) قرآن جس قدر بھی آپؐ پر نازل ہو چکا ہے، اس سے آپؐ کو محروم نہیں کیا گیا (یا نہیں کیا جائیگا) ا آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی ایک آدھ آیت بھی بذریعہ نسخ یا بذریعہ نسیان واپس نہیں لی جائے گی، کیونکہ اَلَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ سے مراد وہ پورا قرآن ہے، جو اس وقت تک آپؐ کی طرف نازل کیا جا چکا تھا نہ کہ اس کا کوئی جزو یا ایک آدھ آیت۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں اَلَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کہنے کے بعد، اگلی آیت میں بعض القرآن کہنے کی بجائے، پورے قرآن کا ذکر، بایں الفاظ کیا گیا ہے۔

کہہ دو! اگر انسان اور جن، سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے چاہے، سب کے سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

الغرض یہ آیت (۸۶/۱۷) جس چیز کی نفی کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ سے پورا قرآن واپس لے کر آپ کو منصب نبوت سے معزول کر دیا جائے، وحی میں سے کسی آیت کو بذریعہ انسایا بذریعہ نسخ واپس لینا اس آیت کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے آیت نسخ میں ننسھا کا لفظ بول کر خود یہی معنی مراد لیا ہے، (۲) آیت (۶/۸۷،۷) میں پیغمبرؑ کے خود بھولنے (فلا تنسی) کی نفی کرتے ہوئے بذریعہ استثنائے منقطع ''بھلا دیے جانے'' (ننسھا) کا خود اثبات کیا ہے، (۳) قرآن کی بعض آیات خود اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بعض آیات کو خارج از قرآن کر دیا گیا ہے (اس کا ثبوت آگے آرہا ہے)۔

تنکے کا سہارا

آیت (۶،۷/۸۷) میں مذکور استثنا کو غیر مؤثر قرار دینے کے لیے ''مفکر قرآن'' نے ایک اور تنکے کا سہارا بھی لیا ہے، چنانچہ وہ علامہ محمد عبدہ کی تفسیر المنار کے حوالہ سے (جسے رشید رضا نے مرتب کیا ہے،) لکھتے ہیں کہ:

> اگر اس آیت کے معنی بھول جانے کے بھی لیے جائیں تو بھی الا ماشاء اللہ اس کی نفی کر دیتا ہے، کیونکہ استثنائے بالمشیت، اسلوب قرآن میں، ہر جگہ ثبوت واستمرار کے لیے آتا ہے، یعنی جہاں الا کے بعد ماشاء اللہ وغیرہ الفاظ آئیں، جن سے مراد مشیت خداوندی ہوتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہا گیا ہے، اس کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا۔ [۱]

اس میں شک نہیں کہ بعض آیات میں ایسا استثنائے ثبوت واستمرار کے لیے آیا ہے، لیکن یہ کوئی قطعی قاعدہ یا حتمی کلیہ نہیں ہے، جو قرآن کریم کے ہر مقام پر راست آتا ہو مثلاً قرآن کریم میں ہے۔

فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (النمل-۸۷) اہل زمین وآسمان ہول کھا جائیں گے ماسوا ان لوگوں کے جنھیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا۔

---

[۱] قرآنی فیصلے، ج ۲، صفحہ ۴۲

فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ (الزمر-٦٨)اور وہ سب جو زمین و آسمان میں ہیں بیہوش ہو جائیں گے سوائے ان کے جنھیں اللہ زندہ رکھنا چاہے گا۔

یہ دونوں آیات، استثنا بالمشیئت ہی کی قبیل سے ہیں اور ظاہر ہے کہ الا کے کلمہ استثنا سے پہلے، جن لوگوں کا ذکر ہے، ان کے لیے دہشت سے سراسیمہ ہونے کا ایسا ثبوت اور استمرار نہیں ہے کہ ہر شخص ہی خوف، گھبراہٹ اور بیہوشی میں لازماً مبتلا ہو، اور کوئی بھی ان کیفیات سے بچا ہوا نہ ہو، ورنہ یہ استثنا بے فائدہ اور بیکار محض ہوگا ایک اور آیت جس میں استثنا بالمشیئت کا یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا حضور اکرم ﷺ سے متعلق ہے۔

قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (الاعراف-۱۸۸) کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لیے نفع ونقصان کا (بھی) مالک نہیں مگر یہ کہ جو اللہ چاہے۔

یہاں نفع ونقصان کی ملکیت کی جو نفی پیش کی گئی ہے، وہ بھی استثنا بالمشیئت کے ساتھ ہے، بعد میں حضور ﷺ کو جو نقصان پہنچے (مثلاً جنگ احد میں جیتی ہوئی بازی کا ہر جانا اور آپ کے دانت مبارک کا زخمی ہونا) یا دیگر لڑائیوں میں جو فوائد پہنچے، خواہ بصورتِ فتح وظفر، یا بصورت ملکیتِ مالِ غنیمت، یا افراد کی ملکیت کے ذریعہ جنھیں قرآن نے آپ کے داہنے ہاتھ کی ملکیت سے تعبیر فرمایا، یہ سب کچھ بھی مشیئت خداوندی ہی کے تحت تھے اور اس آیت میں بھی استثنا بالمشیئت کا یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا کیونکہ لا املک میں مذکور عدم ملکیت میں ثبوت واستمرار مفقود ہے۔

الغرض اس قاعدے کلیے کی بنیاد پر یہ دعوی کرنا کہ سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی o اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ میں حضور اکرم ﷺ کے عدم نسیان کو ثبوت واستمرار بخشا گیا ہے اور اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کا استثنا واقع ہی نہیں ہوا ہے، قطعی غلط بات ہے، اس کے درست ہونے کی اگر کوئی صورت ممکن تھی تو وہ صرف یہ ہوسکتی تھی کہ آیت میں واقع استثناء، استثنائے متصل ہوتا مگر یہاں تو یہ استثناء، استثنائے منقطع ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنے طور پر تو نہیں بھولیں گے مگر اللہ تعالیٰ اپنی مشیئت سے انسا کا معاملہ صادر فرمادیں گے جسے اللہ تعالیٰ نے آیت اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا کو اپنے دستور کے طور پر پیش کیا ہے۔

ثبوتِ انسائے آیت

اب اگر، ایک طرف، اللہ تعالیٰ، آیت نسخ میں، اِنسا کو اپنے دستور کے طور پر پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف، پیغمبرؐ کو قرآن پڑھا دینے کے بعد، ان کے ''بھلا دیے جانے'' کو اپنی مشیئت کے تابع رکھ کر، استثنا کرتے ہیں اور تیسری طرف قرآن مجید میں ایسی آیات نازل کرتے ہیں جو انسا پر صریحاً دلالت کرتی ہیں تو اس کے بعد نسخ کے اُس موقف میں کیا وزن رہ جاتا ہے، جسے ''مفکر قرآن'' عمر بھر پیش کرتے رہے ہیں۔ اب ایک ایسی آیت پیش کیجاتی ہے، جو انسا پر واضح دلیل ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَةً فَمَا فَوۡقَهَا فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهَـٰذَا مَثَلًا (سورہ البقرہ-۲۶) بیشک اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں وہ جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے، جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے اور جو ماننے والے نہیں وہ انھیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟

یہ آیت اس امر کو واضح کرتی ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی آیت ضرور نازل ہوئی تھی، جس میں مچھر جیسی حقیر مخلوق کی مثال بیان کرتے ہوئے، کوئی حکم دیا تھا، اور جسے کفار نے محض اس وجہ سے اضحوکہ بنالیا تھا کہ خالق کائنات کی عظیم ہستی کے لیے، مچھر جیسی حقیر مخلوق کی مثال بیان کرنا شان خداوندی سے فروتر بات ہے، ان کے اس اعتراض کا قرآن نے اسی آیت (۲/۲۶) میں جواب دیا ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ نے مچھر والی تمثیل پر مشتمل کوئی آیت نازل ہی نہیں کی تھی تو مشرکین کا اعتراض کس چیز پر تھا جس کا جواب اس آیت (۲/۲۶) میں دیا گیا ہے؟ اور اگر اللہ نے ایسی آیت نازل کی تھی تو وہ شامل قرآن کیوں نہ ہوسکی؟ نزول آیت کے بعد، اگر پیغمبرؐ اسے بھولا بھی نہیں، اور اللہ نے اسے منسوخ بھی نہیں کیا، اور انسا کے ذریعہ سے اسے قلوب واذہان سے محو بھی نہیں کیا، تو آخر وہ آیت گئی کہاں؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے بذریعہ انسا، اس آیت کو لوگوں کے قلوب واذہان سے محو کردیا۔

توضیح آیتِ نسخ، اپنے سیاق وسباق میں

آیت نسخ پر ''مفکر قرآن'' کے مفکرانہ نکات کا جائزہ لینے کے بعد، اب آیت کی وضاحت، اس کے سیاق وسباق میں پیش خدمت ہے، ہم آیات کے متن سے صرف نظر کرتے ہوئے محض ترجمہ پر اکتفا کررہے ہیں:

> اے ایمان والو! راعنا نہ کہا کرو بلکہ اُنظُرنَا کہا کرو اور توجہ سے بات سنا کرو، یہ کافر تو عذاب الیم کے مستحق ہیں یہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے، خواہ وہ مشرک ہوں یا اہل کتاب میں سے ہوں، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے اوپر کوئی بھلائی نازل ہو مگر اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔
>
> ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر آیت لے آتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی، کیا تم نہیں جانتے ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی، اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے علاوہ کوئی تمھاری خبرگیری کرنے والا اور تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔
>
> پھر کیا تم اپنے رسول سے، اس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے کئے جاچکے ہیں، حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا، وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔ (سورہ البقرہ ۱۰۴)

ان آیات مبارکہ سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہیں۔

اولاً ---- آیت نسخ جن آیات میں واقع ہے، ان کا خطاب اہل ایمان سے ہے، یہود یا اہل کتاب سے نہیں ہے کہ ان کے کسی مطالبہ پر ان آیات کا نزول ہوا ہو۔

ثانیاً ----- آیت نسخ سے قبل اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے، ان کے لیے راعنا کہنے کے حکم کو منسوخ کیا گیا اور انظرنا کہنے کے حکم کو بطور ناسخ اس کا قائم مقام اور نعم البدل قرار دیا گیا ہے، حکمِ ناسخ اور حکمِ منسوخ، دونوں شریعت محمدیہ ہی کے احکام ہیں، نہ کہ دو مختلف شرائع کے، جن میں سے بعد کی شریعت کا کوئی حکم سابقہ شریعت کے کسی حکم کا ناسخ بن رہا ہو۔

ثالثاً ----- اہل ایمان سے خطاب کر کے، شریعت محمدیہ کے ایک حکم کو شریعت محمدیہ ہی کے ایک دوسرے حکم سے منسوخ کرنے کے بعد، اگر مَا نَنسَخُ مِنۡ اٰیَةٍ کہا جائے تو آیت سے کسی سابق وحی کی آیات، مراد لینا تکلفِ بیجا ہے، آیت سے بالیقین شریعت محمدیہ کا حکم یا قرآن ہی کی آیت مراد ہے، جس سیاق وسباق میں یہ بات کہی جا رہی ہے، اس میں یہی کچھ مراد لیا جا سکتا ہے، نہ کہ کچھ اور۔

رابعاً ----- آیت نسخ کے بعد اہل ایمان سے یہ کہا گیا کہ وہ اپنے رسول سے ایسے سوالات نہ کریں جیسے سوالات اور مطالبات، قوم موسیٰ نے حضرت موسیٰ سے کئے تھے۔ اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ قوم موسیٰ کے یہ مطالبات وسوالات، ان کی اپنی شریعت کے احکام سے متعلق تھے یا کسی سابقہ شریعت سے متعلق تھے جسے حضرت موسیٰ سے قبل کوئی پیغمبر لے کر آئے تھے، اگر بنی اسرائیل کے سوالات، کسی سابقہ شریعت کے متعلق تھے، تو اس امر کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ بعد والی شریعت، اپنے سے پہلے والی شریعت کے کسی حکم کو منسوخ کر ڈالے لیکن اگر ان سوالات کا تعلق موسوی شریعت ہی کے احکام سے ہو تو پھر یہ مانے بغیر چارہ کار نہیں کہ ایک ہی شریعت کا کوئی حکم کسی دوسرے حکم کی تنسیخ یا تخصیص کر سکتا ہے۔

بنی اسرائیل کے سوالات ومطالبات

بنی اسرائیل کے ان سوالات ومطالبات کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے، جو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کئے تھے مثلاً:

(۱) ----- بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ ان کے لیے ایک بت تراش دیں تاکہ وہ اس کی بندگی کرتے رہیں یٰمُوۡسَی اجۡعَل لَّنَآ اِلَـٰهًا كَمَا لَهُمۡ اٰلِهَةٌ (۱۳۸/۷) ''اے موسیٰ ہمارے لیے ان لوگوں کے معبود جیسا ایک معبود بنا دیں'' اس مطالبے کا براہ راست نتیجہ یہ تھا کہ وَمَآ اُمِرُوۡٓا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡٓا اِلَـٰهًا وَّاحِدًا (۱۳۸/۹) کا حکم ساقط اور منسوخ ہو کر رہ جائے۔

(۲) ----- ذبح بقرہ کے حکم سے جان چھڑانے کے لیے انہوں نے پے در پے سوالات کئے جن کی تفصیل سورۃ البقرہ میں موجود ہے، وہ گائے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے (وَمَا كَادُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ)۔ ذبح بقرہ کا حکم ملتے ہی وہ جس گائے کو بھی ذبح کر ڈالتے، حکم کا تقاضا پورا ہو جاتا۔ لیکن ان کی معصیت کوش طبیعت نے انھیں اکسایا اور وہ سوال در سوال کا سلسلہ اٹھاتے چلے گئے، جس کے نتیجہ میں ذبح بقرہ کا حکم تو برقرار رہا لیکن ان کے ہر سوال پر قیود وشرائط بڑھتی گئیں اور انتخاب گائے کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا گیا، اور حکم کے عملی امتثال میں وہ دقت اور دشواری کا شکار ہوتے چلے گئے۔

(۳) ----- ان کا ایک مطالبہ، اللہ کو بے نقاب دیکھنے کا بھی تھا۔ یہ مطالبہ باری تعالیٰ کے شوق دیدار کے باعث نہ تھا، بلکہ بنی

اسرائیل کے فسادِ مزاج کی بنا پر، اتباعِ موسیٰ کے لیے بطور شرط تھا، تا کہ اتباعِ پیغمبر سے ان کی جان چھوٹ جائے، بالفاظ دیگر، اتباعِ پیغمبر کا حکم ساقط و منسوخ ہو جائے۔

آیت نسخ اور ملحقہ آیات کا تفسیری مفہوم

الغرض، بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر سے جتنے بھی سوالات کیے، ان کا تعلق کسی سابقہ شریعت سے نہ تھا، بلکہ ان کی اپنی موسوی شریعت ہی سے تھا، اگر ان مطالبات کو مان لیا جاتا تو دین کے اساسی احکام ہی نسخ وسقوط کا شکار ہو کر رہ جاتے۔ اس صورتحال میں، جب مسلمانوں سے یہ کہا گیا --- '' کیا تم اپنے رسول سے، اسی طرح سوالات و مطالبات کرنے کا ارادہ رکھتے ہو، جیسے حضرت موسیٰ سے کیے گئے'' --- تو امت محمدیہ کو امت موسویہ کی نظیر و مثال قرار دیا گیا، جس طرح، امت موسیٰ نے سوالات کر کے، اپنے احکام پر قیود و شرائط کا اضافہ کرتے ہوئے، انھیں مشکل بنا دیا، اسی طرح امت محمدیہ کو اس روش سے باز رہنے کا حکم دیا گیا، تا کہ وہ بھی اسلامی احکام پر اپنے سوالات کی بدولت شروط و قیود کا اضافہ کر کے، اپنے لیے نا قابل عمل یا کم از کم عسیر العمل نہ بنا لیں۔ دوسری صورتحال یہ تھی کہ اسلامی احکام کے نسخ پر، یہود، ان مسلمانوں کے دلوں میں، جن سے ان کے تعلقات زمانہ جاہلیت سے چلے آ رہے تھے، شکوک وشبہات کے کانٹے ڈالنے لگے، تا کہ مسلمان بھی قیل وقال اور سوال در سوال کی بیماری میں مبتلا ہو جائیں۔ بعض منسوخ احکام سے یہود کو خاصی تکلیف ہوئی مثلاً راعنا کہنے سے منع کیے جانے پر انھیں اس لیے تکلیف ہوئی کہ اس لفظ کی آڑ میں، ان کے لیے اپنے خبث باطن کے اظہار کا موقع باقی نہ رہا، تحویلِ قبلہ کے حکم سے، انھیں، اس لیے دکھ ہوا کہ جو قبلہ متروک ہوا تھا وہ ان کا آبائی قبلہ تھا جس سے ان کی آبا پرستی پر چوٹ پڑی تھی۔ تاہم بات کچھ بھی ہو، اہل ایمان کے دلوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے، یہود نے ڈالے ہوں، یا یہ سوالات خود بخود ان کے ذہنوں میں پیدا ہوئے ہوں، قرآن نے اہل ایمان ہی سے خطاب کیا اور یہ بتایا کہ:

> ہم جو حکم بھی تبدیل کرتے ہیں بذریعہ نسخ یا بذریعہ انساء، تو ہم اس سے بہتر حکم لے آتے ہیں، دنیا میں سہولتِ عمل کے پیش نظر یا آخرت میں اجر وثواب کے پیش نظر، یا لوگوں کی منفعت کے اعتبار سے ویسا ہی حکم لے آتے ہیں، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم اور قدرت والا ہے، جس سے خیر واحسان کے علاوہ کچھ صادر نہیں ہوتا، اور اس نے یہ سیدھی سادی آسان شریعت تمھیں عطا کی ہے، تا کہ اپنے بندوں پر سے اغلال واصر کے بوجھ اتار دیے جائیں۔
>
> یہ گمان نہ کرو کہ یہ تبدیلیٔ احکام، اس کی قدرت میں عجز یا مصلحت میں جہل کے باعث ہے، بلکہ یہ تبدیلی، لوگوں کی مصلحت ومنفعت کے ساتھ وابستہ ہے، وہ لوگوں کے احوال میں مالک و متصرف ہے، جو چاہے، فیصلہ فرمائے جو چاہے، حکم دے، جس حکم کو چاہے، نسخ وانسا کے ذریعہ سے تبدیل یا محو کر دے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں ہے، جو تمھارے تغیر پذیر احوال وشئون کی رعایت کرے، اس کے سوا کوئی حامی و مددگار نہیں ہے، جو تمھاری مدد کرے، پس تم اس کے علاوہ کسی پر وثوق اور اعتماد نہ کرو، وہی بہترین کارساز و مددگار ہے۔
>
> کیا تم اے مومنو! یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول کو اسی طرح اپنے سوالات و مطالبات کا نشانہ بناؤ جیسا کہ موسیٰ کو بنایا گیا، پھر تم بھی

اسی طرح گمراہ ہو جاؤ جس طرح وہ ہوئے تھے، اور تمھاری مثال، ان یہود کی طرح ہو جائے جنھوں نے تعنت اور تکبر کے ساتھ ''اللہ کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ کر دیا'' اور اپنے نبیؑ سے وہ کچھ طلب کیا جس کا طلب کرنا، روا نہ تھا یعنی یہ کہ ''ہمارے لیے ایک معبود تراش دو''۔ پھر کیا تمھارے لیے اے مومنو! یہ مناسب ہے کہ اپنے نبیؐ سے تعنت برتو؟ اور مشتہیات کے مطالبے کرو؟ جس کے نتیجہ میں تم بھی یہود کی طرح گمراہ ہو جاؤ۔

اور جو کوئی، ایمان کے بدلے میں کفر اور ہدایت کے عوض گمراہی کو اختیار کرتا ہے، تو وہ جادۂ حق سے منحرف اور راہِ راست سے الگ ہو جاتا ہے، اور ہلاکت کے گڑھوں میں گر جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو عذاب الیم کے خطرہ میں ڈال دینے کے باعث خسران مبین سے دوچار کر دیتا ہے۔ [1]

نسخِ شرائعِ سابقہ

اس پس منظر میں، آخر، اس بات کی کیا گنجائش ہے کہ آیتِ نسخ میں، کتبِ سابقہ کی آیات کا نسخ مراد لیا جائے؟ باقی رہا شرائع سابقہ کا نسخ، تو ''مفکر قرآن'' نے اس میں خواہ مخواہ طول بحث سے کام لیا اور یہ ثابت کرنے کے لیے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے کہ آیتِ نسخ میں، آیات سے مراد کتب سابقہ کی آیات ہیں، حالانکہ یہ آیت (۲/۱۰۶) جس رکوع میں شامل ہے، اس کی ابتدا ہی سے خطاب، اہل ایمان کو کیا گیا ہے اور اہل ایمان کا تعلق، اگر کتبِ سابقہ اور شرائع گزشتہ سے تھا، تو صرف اور صرف ایمان کا تعلق تھا، نہ کہ عملی اتباع و پیروی کا، کیونکہ اہل ایمان، ان شرائع کی اطاعت و پیروی پر مامور نہ تھے کہ ان احکام کو منسوخ کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ ہر پیغمبر کی شریعت، اسی وقت تک مامور بالعمل اور واجب الاتباع رہتی ہے، جب تک کوئی نئی شریعت، اس کے بعد، خدا کی طرف سے نازل نہ ہو جاتی تھی۔ ہر نئے پیغمبر کی آمد پر، سابق پیغمبر کی شریعت اور اس کی اطاعت، از خود ختم ہو جاتی تھی، بالکل اسی طرح، جس طرح، نئے حاکم کی آمد پر، سابق حاکم کی اطاعت باقی نہیں رہتی۔ اس سیدھے سادے معاملے کو لفاظی کے زور پر، متفرق مقامات کی آیات کو جوڑ توڑ کا نشانہ بناتے ہوئے، لمبی چوڑی بحثوں میں پیش کرنا، پانی میں مدھانی چلانے کا ایسا فعل ہے، جس کا کوئی فائدہ ''مفکر قرآن'' کے ''مفکرانہ اظہار فکر'' کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

عبوری دور کے احکام یا منسوخ احکام

اب ہم قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتے ہیں، جو نسخ کا صریح ثبوت فراہم کرتی ہیں، لیکن ہم خوب سمجھتے ہیں کہ اگر ان آیات کو علمائے امت کے اصول پر پیش کیا جائے اور ان کی تشریحات کی روشنی میں، ان آیات کی توضیح کی جائے، تو وابستگانِ طلوعِ اسلام، اپنی عادت و فطرت کے تحت، ان کی تاویل و تحریف پر اتر آئیں گے۔ وہ اس کا مفہوم کچھ بیان کریں گے اور ہم کچھ اور۔ اور قارئین کسی نتیجہ بحث تک نہ پہنچ پائیں گے، اس لیے ہم ان آیات کو، خود ''مفکر قرآن'' ہی کے اصول پر، اور ان ہی کی تشریحات کی روشنی میں پیش کریں گے، اس لیے بھی کہ:

[1] ترجمۂ عبارت ماخوذ از روائع البیان، تفسیر آیات الاحکام، جلد ۱، صفحہ ۹۳

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے ، گواہی تیری

''مفکر قرآن'' صاحب کے نزدیک، قرآن کریم کی رو سے، مال و دولت کی انفرادی ملکیت قطعی ناجائز بلکہ شرک ہے، یہ بات انہوں نے اپنے لٹریچر میں، بتکرار بسیار، اس قدر شرح وبسط سے بیان کی ہے کہ اس پر ان کا کوئی اقتباس پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، مال و دولت، ذرائع پیداوار یا زمین کی شخصی ملکیت کی نفی کا یہ تصور، ان کے نزدیک قرآن کریم ہی سے ماخوذ ہے، لیکن قرآن کریم کی بعض آیات، پرویز صاحب کی اپنی توضیح وتشریح کے مطابق، شخصی ملکیت مال پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً آیت (۳۲/۴) کے تحت وہ لکھتے ہیں:

(۱)......لہٰذا عورتیں اپنا حق ملکیت الگ رکھتی ہیں یہ نہیں کہ ہر چیز کا مالک مرد ہوتا ہے، عورت مالک ہی نہیں ہو سکتی [۱]

(۲) ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں اس تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے، جس کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حقوق ملکیت صرف مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں ہوتے......عورت اپنے مال وجائیداد کی آپ مالک ہوتی ہے، اس طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا صرف مرد کا کام ہے، عورت ایسا نہیں کر سکتی، مرد اور عورت دونوں اکتساب رزق کر سکتے ہیں، جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے، جو کچھ عورت کمائے وہ اس کا۔ [۲]

(۳) مردوں اور عورتوں کے جداگانہ حقوق ملکیت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرنے والے کے ترکہ میں ان سب کا حصہ ہو، صرف مردوں ہی کا نہ ہو۔ [۳]

حق یہی ہے کہ قرآن، مال و دولت کی شخصی ملکیت کا قائل ہے، اور اپنی اقتصادیات کی بنیاد، اسی حق ملکیت پر رکھتا ہے، جو مرد و زن میں سے ہر ایک کے لیے ثابت ہے، پھر اسی ملکیت مال کی بناپر، زکوٰۃ وصدقات، وصیت و وراثت اور لین دین کے وسیع احکام جاری کرتا ہے، ظاہر ہے کہ اگر از روئے قرآن کریم، کوئی شخص، زائد از ضرورت دولت کا مالک ہو ہی نہیں سکتا (جیسا کہ ''مفکر قرآن'' کا عقیدہ ہے،) تو اسے زکوٰۃ وصدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہی نہیں جا سکتا، اور نہ ہی ترکہ ومیراث یا غنائم کی تقسیم کا حکم دیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی اُسے مال نہ خرچ کرنے کی بناپر بخیل قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ بخیل تو وہی ہو سکتا ہے، جس کے پاس زائد از ضرورت مال ہو اور پھر وہ اس میں سے خرچ نہ کرے۔ اس طرح ترکہ ومیراث، لین دین، زکوٰۃ وصدقات، تقسیم غنائم اور انفاق فی سبیل اللہ کے یہ سب احکام، بجائے خود، شخصی ملکیت مال کے زبردست ثبوت ہیں، جن کا اعتراف خود پرویز صاحب کو بھی اپنے مندرجہ بالا اقتباسات میں کرنا ہی پڑا، لیکن پھر وہ قرآن ہی کی بنیاد پر اثبات ملکیت کے علاوہ نفی ملکیت کا ''قرآنی اصول'' بھی پیش کرتے ہیں اور لین دین، ترکہ ووصیت کے احکام کے متعلق وہ فرماتے ہیں:

(۱)---وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ وخیرات وغیرہ سے متعلق احکام، اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں سے گزر

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۷۷ [۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۸۷

[۳] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۸۸

کر معاشرہ انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔ [1]

(۲)---قرآن کریم میں صدقہ وخیرات کے ذریعہ غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنے یا ترکہ اور وراثت وغیرہ کے سلسلہ میں جو احکام آئے ہیں، ان کا تعلق بھی عبوری ادوار سے ہے۔ [2]

اب غور فرمایئے قرآن کریم کی اساس پر ''مفکر قرآن'' کے ان اقتباسات کی رو سے :

(۱) عورت اور مرد دونوں حق ملکیت رکھتے ہیں اور اپنے مال مکسوب کے خود مالک ہوتے ہیں۔

(۲) حق ملکیت کا اصول، خلافِ قرآن اور خلافِ اسلام ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں، باہم متناقض ہیں، عملاً دونوں کو بیک وقت اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ملکیت شخصی کے مسئلہ پر، علمائے امت اور ''مفکر قرآن'' سب کے سب متفق الرائے ہیں اور پھر علما کے نقطہ نظر سے، ان متضاد اور متصادم احکام کی توجیہ کی جائے، تو وہ ناسخ ومنسوخ کے اصول پر ہوگی، لیکن ''مفکر قرآن'' ان آیات میں توفیق وتطبیق یوں کرتے ہیں کہ---''اثبات ملکیت کی آیات، عبوری دور سے تعلق رکھتی ہیں جب ان کا خود تراشیدہ نظام ربوبیت نفاذ پذیر نہیں ہوا تھا''--- بہر حال، علمائے اسلام ہوں یا پرویز صاحب، قرآنی آیات میں موجود بظاہر تضاد وتصادم کے دونوں قائل ہیں، دونوں ہی بعض آیات کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں، ایک فریق یہ کہہ کر انھیں ناقابل عمل قرار دیتا ہے کہ ''یہ آیات منسوخ ہیں''، جب کہ دوسرا فریق یہ کہہ کر کہ ''یہ احکام عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں سے معاشرہ گزر کر اب اگلی منزل میں پہنچ چکا ہے''، انفرادی ملکیت کے مسئلہ میں، قرآنی آیات کے باہم تناقض پر، اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ یہ تضاد وتناقض در آیات کیوں؟ جبکہ قرآن خود کہتا ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا تو اس سوال پر، علمائے امت کا جواب، ناسخ ومنسوخ کے اصول پر ہوگا جبکہ ''مفکر قرآن'' کا جواب ''عبوری دور کے احکام'' کے اصول پر اساس پذیر ہوگا۔

''مفکر قرآن'' کا محض لفظی نزاع

اس صورتحال میں، کیا یہ بات قابل تعجب نہیں کہ ایک ہی حقیقت کو اگر علمائے کرام، ناسخ ومنسوخ کے حوالہ سے بیان کریں، تو پرویز صاحب، اسے مضحکہ خیز قرار دیں، لیکن اگر اسی حقیقت کو وہ خود ''عبوری دور کے احکام'' کے حوالہ سے بیان کریں تو وہ ''مفکر قرآن'' قرار پائیں۔ حالانکہ ناسخ ومنسوخ کا لفظ نہ سہی اس لفظ کے مادہ سے چند مشتقات قرآن میں موجود ہیں، جبکہ ''عبوری دور کے احکام'' کا کسی درجے میں بھی قرآن میں ذکر نہیں ہے، پھر پرویز صاحب، خود تو، عمر بھر، ناسخ ومنسوخ پر زبان طعن دراز کرتے رہے، لیکن ناسخ ومنسوخ کی حقیقت کو ''عبوری دور کے احکام'' کے لیبل کے تحت تسلیم کرتے رہے ہیں۔ آخر یہ واضح تو کیا جائے کہ علمائے کرام کے ''تصورِ ناسخ ومنسوخ'' میں اور ''مفکر قرآن'' کے ''عبوری دور کے احکام'' کے تصور میں کیا جوہری فرق ہے کہ اگر اس کو ایک نام سے موسوم کیا جائے تو ناقابل قبول قرار پائے اور دوسرے نام سے پیش کیا جائے

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۷ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۳۶۳

تو قابل قبول؟ کیا یہ محض ایک لفظی نزاع نہیں ہے جس کی آڑ میں ''مفکر قرآن'' نے عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی بنا پر عمر بھر اکھاڑہ بحث گرم کئے رکھا؟ کیا کہیں ایسا تو نہیں کہ ''مفکر قرآن'' نے ناسخ ومنسوخ کا کوئی ایسا مفہوم سمجھ رکھا ہو جو علمائے کرام کے بھی سان گمان میں نہ ہو؟

حقیقت یہی ہے کہ انھوں نے ناسخ ومنسوخ کا ایک ایسا مفہوم اپنے ذہن میں جما رکھا تھا جو خود علمائے کرام کو بھی قابل تسلیم نہ تھا اسی غلط مفہوم کے باعث انہوں نے یہ لکھا کہ:

> قرآن پاک کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے، جو منسوخ ہو۔ [1]

لیکن سوال یہ ہے کہ منسوخ کسے کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ''مفکر قرآن'' نے یہ دیا ہے،

> منسوخ اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے قرآن میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ [2]

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ نسخ کے قائل ہیں، ان کے نزدیک بھی کوئی حکم، اس معنی میں منسوخ نہیں ہے کہ ''وہ ہمیشہ کے لیے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے'' بلکہ وہ بھی نسخ کو عارضی اور غیر ابدی امر قرار دیتے ہیں۔ لیکن منسوخ کا یہ مفہوم، جو ''مفکر قرآن'' نے بیان کیا ہے، یا تو ان کی بے علمی اور جہالت پر مبنی ہے، یا پھر ان کے تجاہل عارفانہ یا شرارت پر، تا کہ اس کی آڑ میں، علما کے خلاف، اپنے خبث باطن کا اظہار کیا جاتا رہے۔ ''مفکر قرآن'' نے عمر بھر، مولانا مودودی کی مخالفت کو اپنا وظیفہ حیات بنائے رکھا، انہوں نے بھی کسی حکمِ منسوخ کو دائماً ساقط العمل قرار نہیں دیا، وہ لکھتے ہیں کہ:

> قرآن میں نسخ، دراصل تدریج فی الاحکام کی بنیاد پر ہے، یہ نسخ ابدی نہیں ہے، متعدد احکام منسوخہ ایسے ہیں کہ اگر معاشرے میں کبھی ہم کو پھر ان حالات سے سابقہ پیش آ جائے جن میں وہ احکام دیے گئے تھے تو ان ہی احکام پر عمل ہوگا، وہ منسوخ صرف اس صورت میں ہوتے ہیں، جبکہ معاشرہ ان حالات سے گزر جائے، اور بعد والے احکام کو نافذ کرنے کے حالات پیدا ہو جائیں۔ [3]

بہر حال، قرآن کریم کے احکام کا دائماً منسوخ رہنا اور کبھی نافذ نہ ہو سکنا، نہ تو پرویز صاحب کے نزدیک قابل قبول ہے اور نہ دیگر علمائے امت ہی کے نزدیک۔ سب لوگ منسوخ احکام کے عارضی نسخ کے قائل ہیں، جس سے یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ثابت ہوگئی کہ قرآن کریم میں (دائمانہ سہی عارضی طور پر ہی سہی) کچھ آیات ایسی ہیں جو نا قابل عمل یا متروک العمل ہیں، خواہ اس بنا پر کہ وہ منسوخ ہیں یا اس بنا پر کہ وہ عبوری دور سے تعلق رکھتی ہیں، بہر حال، ایسی آیات کا وجود قرآن مجید میں موجود ہے، ان کی تلاوت بھی ہو رہی ہے، اس کے باوجود کہ وہ متروک العمل ہیں۔

نسخ الحكم مع بقاءِ التلاوة

یہی وہ بات ہے، جسے علمائے کرام نے **نسخ الحكم مع بقاء التلاوة** کی اصطلاح سے موسوم کر رکھا ہے، اس کا انکار جیسا کہ اس بحث سے واضح ہے، خود پرویز صاحب بھی نہیں کر سکے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان آیات کو قرآن میں باقی

---

[1] + [2] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۱۳ [3] رسائل ومسائل، جلد ۲، صفحہ ۱۰۷

رکھنے کی کیا ضرورت ہے، جن کا حکم منسوخ یا متروک ہو چکا ہے؟ اس کے جواب میں، جو کچھ علمائے امت نے کہا ہے، بالکل وہی کچھ ''مفکرِ قرآن'' نے کہا ہے، مثلاً مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

> عام طور پر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جن آیات کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، ان کی قرآن میں اب کیا ضرورت ہے، کیوں نہ ان کی تلاوت بھی منسوخ ہو گئی؟ اس کو رفع کرنے کے لیے میں نے قرآن میں ان احکام کے باقی رہنے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اگر معاشرے میں کبھی ہم کو پھر ان حالات سے سابقہ پیش آئے جن میں یہ احکام دیے گئے تھے تو ہم ان پر عمل کر سکتے ہیں مثلاً کسی ملک میں مسلمان اسی دور کے حالات سے دوچار ہوں جو مکی زندگی میں آپؐ کو اور آپؐ کے اصحابؓ کو پیش آئے تھے تو مکی دور کی تعلیم صبر و تحمل پر عمل کیا جائے گا نہ کہ مدنی دور کی تعلیم جہاد و قتال پر، حالانکہ بیشتر علما نے احکام قتال سے مکی دور کی ان آیات کو منسوخ قرار دیا ہے، اسی طرح اس حالت میں مسلمان، ان بہت سے احکام و قوانین کی پابندی سے آزاد رکھے جائیں گے جو مدنی دور میں نازل ہوئے اور جن پر عملدرآمد اسلامی حکومت کی موجودگی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ [1]

''عبوری دور'' کے جو احکام ساقط العمل ہو جاتے ہیں، ان کو قرآن میں باقی کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کے متعلق ''مفکرِ قرآن'' فرماتے ہیں:

> وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ و خیرات وغیرہ سے متعلق احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جن میں سے گزر کر معاشرہ انتہائی منزل تک پہنچتا ہے، اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ دنیا میں ایسے ممالک بھی ہوں گے جہاں مسلم اقلیت میں، غیر مسلم (غیر قرآنی) نظام حکومت کے تابع زندگی بسر کر رہے ہوں گے، وہاں ان کی انفرادی زندگی، مسلمانوں کی سی ہو گی، اس لیے ان کے لیے انھی قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونا ممکن ہو گا جنھیں ہم نے عبوری دور کے احکام کہہ کر پکارا ہے، ان کے لیے کشادگی کی راہ تو یہی ہو گی کہ وہ آخر الامر اس مملکت کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں قرآنی نظام نافذ ہو، لیکن جب تک یہ ممکن نہ ہو، انھیں بہر حال انفرادی احکام پر عمل پیرا رہنا ہی ہو گا۔ [2]

ان اقتباسات سے کیا واضح ہوا؟ یہی کہ علمائے امت ہوں یا ''مفکرِ قرآن'' ہر گروہ کے نزدیک قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم تلاوت باقی ہے، لیکن ان پر عمل منسوخ یا متروک ہے، ان آیات کو قرآن میں کیوں رکھا گیا؟ ان کی تلاوت کو بھی ان کے عمل کی طرح کیوں نہ ساقط کیا گیا؟ اس کا جواب بھی دونوں گروہوں کے نزدیک متفق علیہ ہے، لیکن محض اس بنا پر کہ ''مفکرِ قرآن'' نے خود جس حقیقت کو ''عبوری دور کی آیات'' کے نام سے قبول کیا ہے، اسی حقیقت کو علما نے ''منسوخ آیات'' کے نام سے کیوں قبول کیا؟ ان پر ہمیشہ زبانِ طعن دراز کرتے رہے، اور ان پر ایسے اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے رہے، جن کی زد میں، وہ خود بھی آئے بغیر نہیں رہ سکتے مثلاً وہ ایک اعتراض، از روئے قرآن، یہ کیا کرتے ہیں اور طنزاً یہ کہا کرتے ہیں کہ قرآن کے متعلق، یہ اور یہ تصوات پیدا ہوتے ہیں مثلاً:

> قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بیشمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، لیکن اس کے باوجود، ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے، اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کون سی آیت منسوخ ہے اور کون سی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس

[1] رسائل و مسائل، جلد ۳، صفحہ ۸۴ تا صفحہ ۸۵ [2] نظامِ ربوبیت، صفحہ ۲۷

کا فیصلہ کریں کہ کون سی آیت منسوخ ہے اور کون سی اس کی ناسخ۔ [1]

نہیں معلوم کہ پرویز صاحب یا ان کی طلوعِ اسلام سے وابستہ ذریت کے پاس، کیا جواب ہوگا، جب کہ علمائے کرام، پلٹ کر ہمارے ''مفکرِ قرآن'' سے، ان کے ''عبوری دور کے نظریہ'' پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے، یہ فرمائیں کہ خود ان کے اس نظریہ کی بنا پر بھی، قرآن کے متعلق، ایسا تصور و تاثر ابھرتا ہے، مثلاً یہ کہ ''اس میں بیشمار آیت ایسی ہیں جن کا حکم متروک ہو چکا ہے اور ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کون سی آیت (عبوری دور سے متعلق ہونے کی بنا پر) متروک العمل ہے اور کون سی (انتہائی منزل سے وابستہ ہونے کی بنا پر) ناسخ آیت ہے، اسے صدیوں بعد پیدا ہونے والے ''مفکر قرآن'' پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود فیصلہ فرمائیں کہ کون سی آیت (کسی درمیانی مرحلے سے تعلق رکھنے کی بنا پر) منسوخ یا متروک العمل ہے اور کون سی آیت (بالکل آخری مرحلے سے وابستہ ہونے کے باعث) ناسخ ہے۔

خلاصۃ الباب

کتبِ تفاسیر میں سے کسی بھی کتاب کو اٹھا کر دیکھا جائے، تو علوم القرآن کے مختلف پہلوؤں پر، آپ، اُس میں سیر حاصل بحث پائیں گے۔ صاحبِ مطالب الفرقان نے بھی، اگر چہ، اپنی تفسیر میں، ان مباحث پر قلم اٹھایا ہے اور علوم القرآن کے ان پہلوؤں کو قطعی نظر انداز نہیں کیا، لیکن ان پر ایسی تفصیلی بحث نہیں کی، جو علیل کے لیے وجہِ شفا اور پیاسے کے لیے باعثِ سیرابی ہو سکے۔ حروفِ مقطعات پر ان کی نگارش، اگر چہ قدیم و جدید کا امتزاج ہے، لیکن پھر بھی، اس میں تشنگی موجود ہے۔ شانِ نزول یا اسبابِ نزول کی بحث میں، ان کا موقف، جملہ علمائے تفسیر سے قطعی مختلف بلکہ برعکس ہے، وہ تفسیرِ قرآن میں اسبابِ نزولِ آیات کی معرفت کے قائل نہیں ہیں، حالانکہ یہ معرفت قرآن فہمی کی صحت کے لیے از حد ضروری ہے، لیکن یہ امر ایک عام قاریٔ تفسیر (مطالب الفرقان) کے لیے، موجبِ حیرت قرار پاتا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب ایک طرف تو، اسبابِ نزول کی معرفت و واقفیت کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں، اور دوسری طرف، وہ خود، بعض آیات کی تشریح و تفسیر میں، تسویلِ نفس کے زور پر، ''شانِ نزول'' گھڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محکم و متشابہ آیات میں، اگر چہ، ان کے اور علمائے سلف و خلف کے موقف میں، کچھ زیادہ فرق نہیں پایا جاتا ہے، لیکن متشابہ الصفات آیات کی تفسیر میں، وہ، ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جو متدین، متقی اور خدا ترس راسخین فی العلم علما کی روش سے ہٹا ہوا رویہ ہے۔ اسرائیلیات کے باب میں اگر چہ وہ قولاً اور لفظاً ان کے خلاف ہیں لیکن عملاً وہ ہر اُس اسرائیلی اور غیر اسرائیلی روایت کو قبول کرتے ہیں، جسے ان کی ''بصیرت'' نے ''مطابقِ قرآن'' قرار دے رکھا ہو۔ اور ایسا کرتے ہوئے، اگر انھیں، محرف سماوی کتب (مثلاً انجیل و تورات و زبور وغیرہ) سے بھی استفادہ کرنا پڑے، تو وہ کوئی قلبی تضیّق محسوس نہیں کرتے۔ اعجاز القرآن کی بحث میں، اگر چہ، وہ قرآن کو معجزہ تسلیم کرتے ہیں لیکن قرآن کے کسی مقام پر بھی

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۰۸

اس کے معجزانہ پہلوؤں کو اجاگر نہیں کرتے، بلکہ اس بحث میں لگے ہاتھوں، وہ، رسول اللہ ﷺ کی طرف بہتانا یہ قول بھی منسوب کر دیتے ہیں کہ ''مجھے قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا''۔ ناسخ ومنسوخ کی بحث میں ''مفکر قرآن'' نے اپنی تحریفی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اس باب میں ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن میں نہ کوئی آیت منسوخ ہے اور نہ ہی کوئی متروک العمل حکم پایا جاتا ہے۔ ناسخ ومنسوخ کے مسئلہ کو، انھوں نے، اللہ تعالیٰ کی حکمت ومصلحت کے پہلو سے دیکھنے کی بجائے، باری تعالیٰ کے نقصِ علم کے پہلو سے دیکھا ہے، اور اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی ہے۔ اپنے موقف کی حمایت وپاسداری میں، لغوی انحرافات سے لے کر، غلط تراجمِ آیات تک سے نہیں چوکے ہیں۔ لیکن اس ساری کارگزاری کے باوجود، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، کہ قرآن میں بعض آیات، فی الواقع، ایسی موجود ہیں، جو متروک العمل ہیں، لیکن مفکر قرآن انھیں ''منسوخ آیات'' کے نام سے ماننے کی بجائے، ''عبوری دور کے احکام'' کے نام سے تسلیم کرتے ہیں۔

باب ۴

چند اصولی مباحث
اور
تفسیر مطالب الفرقان

باب ۴

چند اصولی مباحث اور تفسیر مطالب الفرقان

اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کے نتیجہ میں، ہمارے تعلیمیافتہ طبقہ میں، جو ذہنی مرعوبیت پیدا ہوئی ہے، اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی کے مقابلہ میں، مغرب کا اپنایا ہوا طرزِ عمل، انھیں عزیز تر اور بالاتر دکھائی دیتا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ ذہنی غلامی اور فکری اسیری کے اس عیب کے ساتھ، ان عیوب کا بھی اضافہ ہو چکا ہے، جو تین صد سالہ انگریزوں کی غلامی کا نتیجہ ہیں، وہ عیوب ونقائص، جو غلامی اور محکومی کے پیدا کردہ ہیں، وہ، ان رذائل وذمائم سے کہیں زیادہ گھناؤنے ہوتے ہیں، جو نشۂ قوت کی بدمستی اور جذبۂ تغلب کی بدلگامی سے پیدا ہوتے ہیں۔ غلامی کے پیدا کردہ ذمائم، پرویز صاحب کے نزدیک درج ذیل ہیں۔

> پہلی شق میں، دنائیت، کمینگی، بے حمیتی، بے غیرتی، دون ہمتی، پست فطرتی، تنگ نظری، کور ذوقی، بدعہدی، غداری، منافقت، دروغ بافی، بہانہ سازی، فریب کاری، مکاری، عیاری، تلون مزاجی، بددیانتی، عدم اعتماد، سہل انگاری، تن آسانی، گدیہ گری، جیسی رذیل عادات شامل ہیں۔ [1]

خود علامہ اقبال نے، غلامی ومحکومی کا سب سے بڑا اور نمایاں اثر یہ بیان فرمایا ہے کہ ؎

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اگرچہ صدیوں کی غلامی نے، پوری امت مسلمہ کے ضمیر کو بدل ڈالا ہے، لیکن تبدیلیٔ ضمیر کا سب سے بڑا شکار، ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی ہے، جس کی نشو ونما ہی مغربی افکار ونظریات کا دودھ پی پی کر ہوئی ہے، ہماری قوم کا ناخواندہ طبقہ، تو بیچارہ ان پڑھ جاہل ہے، لیکن یہ تعلیم یافتہ طبقہ، ماشاء اللہ، ''پڑھے لکھے جاہلوں'' پر مشتمل ہے، جن کی بے حمیتی اور بے غیرتی کا یہ عالم ہے کہ اپنے مبنی بروحی، دین کی ہر قدر، انھیں مغربی اقدار کے مقابلہ میں، نہ صرف یہ کہ فروتر نظر آتی ہے، بلکہ دریا برد کر دینے کے لائق بھی۔ ضعف وبزدلی اور دوں ہمتی کی یہ حالت، کہ جن اقدار ومعیارات کو وہ قبول کر چکے ہیں، مسلم معاشرہ میں رہتے ہوئے، انھیں علی الاعلان قبول کرنے کی اخلاقی جرأت سے محروم ہیں۔ منافقت کی یہ کیفیت کہ جن اسلامی معتقدات پر سے ان کا اعتقاد و ایمان اٹھ چکا ہے، ان کا قولاً اقرار مگر معناً انکار کرتے ہیں، سہل انگاری اور تن آسانی کا یہ عالم، کہ اسلامی نظامِ حیات پر، عالمانہ تحقیقی مطالعہ اور مجتہدانہ غور وفکر کرنے کی بجائے، تقلید کا رویہ اپناتے ہیں، مگر یہ تقلید بھی، ائمہ اربعہ، سفیان ثوری، امام اوزاعی، داؤد ظاہری، ابن حزم یا ابن تیمیہ جیسے جید زعمائے ملت، فقہائے امت کی نہیں، بلکہ کارل مارکس، لینن، ماؤزے تنگ، کانٹ، برگسان اور ڈارون جیسے ملاحدہ وکفرہ کی تقلید ہے۔ دروغ بافی اور بہانہ سازی کی یہ حالت، کہ قرآن، ہاتھ میں لے کر، اپنے

[1] شاہکار رسالت، (باب اول)، صفحہ ۳

فکری مخالفین پر بہتان تراشی کرنے اور ان کی عبارتوں کو سیاق وسباق سے کاٹ کر، غلط معانی پہنانے سے بھی، گریز نہیں کرتے۔ فریب کاری، عیاری اور مکاری کی یہ کیفیت کہ نصوص قرآن کی مسخ وتحریف اور قطع و برید تک سے نہیں چوکتے، اور یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ ان کے نزدیک، اصل معیار اور کسوٹی، اب اسلام نہیں رہا، بلکہ مغرب کا نظام حیات، قرار پاچکا ہے، اور اسلام کو "دورحاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے" کے لیے، ان کے نزدیک، یہ ضروری ہے کہ اجتہاد کی قینچی سے، اسلامی تعلیمات میں کتر بیونت کا عمل اختیار کیا جائے، لیکن ان کے راستے میں، سب سے بڑا سنگ گراں، سنت نبویہ کا وجود ہے، جس کے انکار کے بعد ہی، قرآن کو من مانے معانی پہنائے جاسکتے ہیں، اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کو، مسخ وتحریف کا نشانہ بنا کر، اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں "نظریۂ ضرورت" ہمارے ان متجددین کے کام آتا ہے، اور وہ، اس کی روشنی میں، وحی، منصب نبوت اور حدیث وسنت جیسے اصولی مسائل کو، تاک تاک کر نشانہ بناتے ہیں اور دینِ اسلام کی بنیادوں پر کلہاڑا چلاتے ہیں، اس باب میں ایسے ہی چند اصولی مباحث پر قلم اٹھایا گیا ہے، یہ مباحث درج ذیل ہیں۔

(۱) وحی، (حقیقت، مفہوم ومعنٰی اور اقسام) (۲) منصب نبوت ورسالت (۳) حدیث اور انکار حدیث

مبحث اول: وحی

وحی کا لفظ، لغوی طور پر، "تیز اور مخفی اشارہ" کا مفہوم، اپنے اندر لیے ہوئے ہے، امام راغب فرماتے ہیں۔

اَصَلُ الوحی الاِشَارَۃُ السَّرِیْعَۃُ ولتضمن السرعۃ قیل اَمْرٌ وحیٌ وذَالِک یکُونُ بالکلام عَلٰی سبیل الرّمز والتعریض، وقد یکون بصوتٍ مجرد عن الترکیب وَباشارۃ ببعض الجوارح و بالکتابۃ [۱]

وحی کی اصل "تیز اشارہ" ہے، اور اس "تیزی" کے باعث، اسے امروحی کہا جاتا ہے اور یہ (وحی یا تیز اشارہ) کبھی رمزو کنایہ پر مشتمل کلام کے ذریعہ ہوتا ہے اور کبھی، ترکیب سے عاری، محض آواز کے باعث اور اعضائے جسم کے اشارہ یا کتابت (لکھنے) کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔

خود پرویز صاحب، وحی پر بحث کرتے ہوئے، آغاز ہی، اس جملہ سے کرتے ہیں۔

اَلْوَحی : اشارہ، جس میں تیزی اور سرعت ہو، وَحَیْتُ لَکَ بِخَبْرٍ کَذَا : میں نے تمہیں فلاں بات کا اشارہ کردیا، یا چپکے سے مطلع کردیا۔ [۲]

"چپکے سے مطلع کرنا"، اِخفَا کا مفہوم، اپنے اندر رکھتا ہے، جبکہ "تیزی سے اشارہ کرنا" سرعت کا مفہوم لیے ہوئے ہے، اور یہ دونوں باتیں، وحی کے لغوی مفہوم میں شامل ہیں، تاہم، قرآنِ کریم میں، یہ لفظ مندرجہ ذیل مفاہیم اور صورتوں پر مشتمل ہے۔

(۱) وحی بمعنٰی "اشارہ کرنا"

آنکھ، ہاتھ یا کسی بھی عضوِ بدن کے ذریعہ، اشارہ کرنے کا مفہوم، مندرجہ ذیل آیتِ قرآنیہ میں پایا جاتا ہے۔

[۱] المفردات فی غریب القرآن، (للراغب)، صفحہ ۵۱۵ [۲] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۹۱

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحٰی إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (مریم-۱۱) پھر وہ اپنی قوم پر، محراب پر سے برآمد ہوا، اور انھیں اشارہ سے کہا کہ وہ صبح وشام، اس (خدا) کی پاکیزگی کا دم بھرتے رہیں۔

(۲) وحی بمعنی ''تدبیر امر'' در عالم جمادات

بے جان اور مادی دنیا میں، تدبیر امر کے تحت، جو کچھ بھی، جس ضابطے کے تحت، ہو رہا ہے، وہ اس وحی کی بناء پر ہے، جو اللہ تعالیٰ نے، عالم جمادات میں کی ہے، مندرجہ ذیل آیات میں، وحی کا لفظ، اسی مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔

۱------ وَأَوْحٰی فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ أَمْرَهَا (حم السجدہ-۱۲) ور ہر آسمان میں، (اس کے قانون کی) اسے وحی کر دی گئی۔

۲--- يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحٰی لَهَا (الزلزال-۴،۵) اس روز وہ (زمین، اپنے اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کر دے گی، کیونکہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کے لیے) وحی کر دی ہو گی۔

(۳) جبلّی وحی

حیوانات کا، اپنی جبلّی استعدادات کے تحت، اپنے امور و معاملات کو انجام دینا بھی، وحی کہلاتا ہے، اسے وحی فطری یا الہامِ فطری بھی کہا جاتا ہے۔

شہد کی مکھی، چھتہ بنانے میں، اپنے جس فن تعمیر کا مظاہرہ کرتی ہے، وہ اس تعلیمِ وحی کا نتیجہ ہے، جسے جبلّی وحی کہا جاتا ہے۔

وَأَوْحٰی رَبُّكَ إِلَی النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ (النحل-۶۸) اور تیرے رب نے شہد کی مکھی پر، یہ بات وحی کر دی کہ تو پہاڑوں میں، درختوں میں، اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں چھتے بنا۔

اس آیت پر حاشیہ لکھتے ہوئے، وحی کے لغوی مفہوم پر، مولانا مودودیؒ نے یوں روشنی ڈالی ہے۔

> وحی کے لغوی معنی ہیں ''خفیہ اور لطیف اشارہ''۔ جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا، کوئی محسوس نہ کر سکے، اس مناسبت سے، یہ لفظ، القاء (دل میں بات ڈال دینے)، اور الہام (یعنی تعلیم و تلقین) کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے۔ [۱]

وحی بمعنی القاء والہام

عالم جمادات اور عالم حیوانات کے بعد، اب انسانی دنیا کی طرف آیئے، اور دیکھئے کہ یہاں، وحی، کن معنوں (اور صورتوں) میں ہو رہی ہے۔ وحی کی ایک شکل یہ ہے کہ ''دل میں کوئی بات ڈال دی جائے''۔ دل میں القاء والہام کی جانے والی، یہ بات، کوئی ''اچھا خیال'' یا ''اچھی تجویز'' بھی ہو سکتی ہے، اور اس کے برعکس، ''بُرے وساوس'' اور ''گھناؤنی اور گھٹیا تدابیر'' بھی ہو سکتی ہیں۔ اول الذکر وحی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور مؤخر الذکر، القاء والہام، شیطان کی جانب سے ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔

۱ ---وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰی ۝ إِذْ أَوْحَيْنَآ إِلٰی أُمِّكَ مَا يُوْحٰی (طٰہٰ-۳۷،۳۸) (اے موسیٰؑ) ہم نے پھر

[۱] ترجمہ قرآن (از سید مودودیؒ)، زیر آیت (النحل - ۶۸)، صفحہ ۷۰۳

ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا، یاد کرو وہ وقت، جبکہ تیری ماں کے دل میں بات ڈال دی، جو کہ وحی تھی۔

۲---وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي (المائدہ-۱۱۱) وہ وقت یاد کرو جبکہ میں نے عیسیٰ کے حواریوں پر الہام کیا تھا کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں۔

ان دونوں آیات میں، ''اچھی فکر'' اور ''عمدہ تجویز'' کو دل میں ڈال دینے کو، خدا کی طرف سے ہونے والی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے، جبکہ مندرجہ ذیل آیات میں، ''وسوسہ اندازی'' یا ''بری تجویز'' کے سوجھ جانے کو، شیطان کی طرف سے وحی قرار دیا گیا ہے۔

۱---وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا (الانعام-۱۱۲) اور ہم نے اسی طرح، شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا، جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں، دھوکے اور فریب کے طور پر القاء کرتے رہتے ہیں۔

۲---وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ (الانعام-۱۲۱) اور شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے کج بحثی کریں۔

(۴) وحی نبوت و رسالت

علاوہ ازیں، ایک ''وحی'' وہ ہے، جو انبیائے کرام اور مرسلینِ عظام کا خاصہ ہے۔ اس وحی کا مقصد، پوری انسانی زندگی کے لیے، فکر و عمل کا ایک ضابطہ عطا کرنا ہے، تاکہ وہ اسے لوگوں تک پہنچائیں، اور انھیں جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر، روشنی علم کی طرف لائیں۔ یہ وحی، انبیاء و رسل کو اس طرح دی جاتی ہے کہ انھیں، اس کے منجانب اللہ ہونے، اور اس کے، شیطان کی دراندازی سے بالکل محفوظ ہونے، اور خود اپنے ذاتی خیالات، تصورات اور خواہشات کی آلائشوں سے پاک ہونے کا پورا پورا یقین ہوتا ہے، نیز، اس وحی کا علم، حجتِ شرعیہ ہے، جس کی پابندی، ہر شخص پر لازم ہے، انبیائے کرام، اس وحی کو انسانوں تک پہنچانے اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دینے پر مامور ہوتے ہیں، اور یہی وہ وحی ہے جس پر ایمان لانا، لازمۂ فوز و فلاح اور جس سے روگردانی کرنا، موجبِ زوال و خسران ہے، مندرجہ ذیل آیات میں، اسی وحی کا ذکر ہے۔

۱---إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا (النساء-۱۶۳) (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح، نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی، ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان علیہم السلام کی طرف وحی بھیجی، ہم نے داؤد کو زبور دی۔

۲ --- وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (الانبیاء-۲۵) اور ہم

نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

ایسی کثیر التعداد آیات، قرآن کریم میں موجود ہیں، جن میں انبیاء و رسل کی مخصوص وحی کا ذکر کیا گیا ہے۔

سہ گونہ وحی

خدا کی یہ وحی، اس کے نبیوں اور رسولوں کو کن شکلوں اور صورتوں میں کی جاتی تھی؟ سورۃ الشوریٰ میں، اس کا تذکرہ، بایں الفاظ موجود ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ إِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (الشوریٰ-۵۱) کسی بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ، اس سے رو برو بات کرے، اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے، یا پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے، جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے، وہ برتر و حکیم ہے۔

اس آیت میں وحی کی تین صورتیں مذکور ہیں۔

(۱) اِلقاء و الہام، یعنی کسی خیال یا بات کو براہِ راست دل میں ڈال دینا، یا خواب کے ذریعہ، کوئی بات سجھا دینا، یا دکھا دینا، جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کو دکھایا گیا۔

(۲) پس پردہ کلام، جیسا کہ از روئے قرآن، حضرت موسیٰؑ سے کیا گیا، کہ وہ، اللہ تعالیٰ کو بغیر دیکھے، اس سے ہمکلامی کا شرف پا رہے تھے۔

(۳) بذریعہ فرشتہ القاء و الہام، یہ فرشتہ (جبرائیل) کبھی اپنی اصلی، غیر مرئی شکل میں بھی آیا کرتا تھا، اور کبھی انسانی شکل میں اس طرح مرئی و مشاہد ہوا کرتا تھا کہ دیکھنے والے، اس کے اصلاً فرشتہ ہونے سے ناواقف و بے خبر ہوا کرتے تھے، اِلَّا یہ کہ خود، اللہ تعالیٰ کا رسولؐ، اس کے بارے میں حقیقت کو واضح فرما دیتا۔

پرویز صاحب کی تاویلِ آیت

لیکن پرویز صاحب، سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں مذکور، خدا سے ہمکلامی کے پہلے دو طریقوں کو تو انبیائے کرام کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور تیسرے طریقہ کو عام انسانوں سے وابستہ کرتے ہیں۔

> وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (۵۱/۴۲) ''کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے، بجز ان دو طریقوں کے، یعنی جبریل کی وساطت سے قلب نبوی میں خدا کی وحی کا القاء، یا پس پردہ خدا کی بات اس حد تک پہنچ جائے''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلوہ گاہِ طور پر، یہ دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا تھا، لیکن اس کی نوعیت جو بھی تھی، وہ سلسلہ اب ختم ہو گیا، وحی کا دروازہ بند ہو گیا، اس لیے اب خدا کسی انسان سے براہِ راست بات نہیں کرتا، نہ کریگا، اب انسانوں

کے ساتھ خدا اپنی کتاب کے ذریعہ ہی باتیں کرتا ہے، یعنی جب کوئی شخص، قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے تو خدا، اس سے باتیں کر رہا ہوتا ہے، اس لیے اس نے، اسے کلام اللہ کہا ہے، یہ وہ تیسرا طریق ہے جسے سورۂ شوریٰ کی مندرجہ بالا آیت کے آخری حصہ میں یوں بیان فرمایا ہے، أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (۵۱/۴۲) غیر از نبی، انسانوں تک، خدا کا کلام، رسولوں کی وساطت سے پہنچتا تھا، اس کا یہ کلام، اب ہم تک، اس کی کتاب کے توسط سے پہنچتا ہے۔ [۱]

پرویز صاحب، اسی آیت کا ''مفہوم القرآن'' میں، مطلب، بایں الفاظ بیان کرتے ہیں۔

(یہ قانونِ فطرت جو کائنات میں اس طرح کارفرما ہے، انسانی معاشرے کے لیے وحی کی رو سے ملتا ہے جو انبیائے کرام کی وساطت سے بھیجی جاتی ہے، ہر فرد کی طرف، انفرادی طور پر نہیں بھیجی جاتی، خدا ہر انسان سے براہِ راست مخاطب نہیں ہوتا) اُسکی ہمکلامی کے تین طریقے ہیں...... دو طریقے انبیاء کے لیے مخصوص ہیں اور تیسرا طریقہ عام انسانوں کے لیے۔ انبیاء سے خدا کی ہمکلامی کا طریق یہ ہے کہ کبھی خدا کی بات، نبی کے دل میں ڈال دی جاتی ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پسِ پردہ خدا کی باتیں، ان کے کان تک پہنچ جاتی ہیں (جیسے موسیٰؑ کے ساتھ ہوا، ۲/۲۵۳؛ ۴/۱۶۴)۔ یہ دونوں طریقے انبیاء کے ساتھ خاص ہیں۔ باقی رہے غیر از انبیاء (عام انسان) سو ان کی طرف رسول بھیجا جاتا ہے جو ان تک وحی پہنچاتا ہے جسے خدا اپنے قانونِ مشیئت کے مطابق اس رسول کو دیتا ہے (کوئی غیر از نبی، خدا سے براہِ راست ہمکلام نہیں ہوسکتا) یہ انتظام اس خدا کی طرف سے ہوتا ہے جو علم کی انتہائی بلندیوں کا مالک ہے، اور جس کا ہر فیصلہ اور انتظام، حکمت پر مبنی ہے [۲]

جائزہ تاویلِ آیت

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں، خدا کی طرف سے ہمکلامی کے یہ تینوں مذکور طریقے، انبیاءؑ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں پہلے دو طریقوں کو، انبیاء کے ساتھ خاص کرنا اور تیسرے طریقے کو جملہ افرادِ انسانی سے وابستہ کرنا، ایسی سخت بیجا بات ہے، جس کے متحمل، الفاظ قرآن ہو ہی نہیں سکتے۔ آخری طریقہ، جسے عام انسانوں کے ساتھ ہمکلامی کا طریقہ کہا گیا ہے، بایں الفاظ مذکور ہے۔

أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ، یا پھر وہ کوئی ایسا پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔

مولانا مودودیؒ، ''مفکر قرآن'' کی اس تاویل کی غلطی کو واضح کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں۔

بعض لوگوں نے اس فقرے کی غلط تاویل کر کے، اس کو یہ معنی پہنائے ہیں کہ ''اللہ کوئی رسول بھیجتا ہے، جو اس کے حکم سے عام لوگوں تک اس کا پیغام پہنچاتا ہے'' لیکن قرآن کے الفاظ فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (پھر وہ وحی کرتا ہے، اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے)، ان کی تاویل کا غلط ہونا بالکل عیاں کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے سامنے، انبیاء کی تبلیغ کو ''وحی کرنے'' سے نہ تو قرآن میں کہیں تعبیر کیا گیا ہے اور نہ عربی زبان میں انسان کی انسان سے علانیہ گفتگو کو ''وحی'' کے لفظ سے تعبیر کرنے کی کوئی گنجائش ہے، لغت میں وحی کے معنی ہی خفیہ اور سریع اشارے کے ہیں، انبیاء کی تبلیغ پر اس لفظ کا اطلاق، صرف وہی شخص کر سکتا ہے، جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہو۔ [۳]

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۴۲۹ [۲] مفہوم القرآن، آیت (۵۱/۴۲)، صفحہ ۱۱۳۹ [۳] تفہیم القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۱۶

تاویلِ پرویز کے بطلان پر دلیلِ ثانی

آیت میں مذکور، خدا سے ہمکلامی کے تینوں طریقوں کا انبیاء کے ساتھ مخصوص ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے، کہ ان تینوں کے ذکر کے بعد، قرآن یہ کہتا ہے کہ

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ أَمْرِنَا (الشوریٰ - ۵۲) اور اسی طرح (اے نبیؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح، تمہاری طرف وحی کی ہے۔

كَذٰلِكَ (اسی طرح) سے مراد، اگر ''آخری طریقہ'' مراد لیا جائے، تب بھی پرویز صاحب کی یہ تاویل باطل قرار پاتی ہے، کیونکہ وہ آخری طریقہ کو غیر از انبیاء (عام لوگوں) سے متعلق قرار دیتے ہیں، اور یہاں كَذٰلِكَ کے الفاظ، اسے انبیاء کے ساتھ وابستہ کرتے ہوئے، آخری نبی کو یہ کہا جا رہا ہے کہ ''اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح، تمہاری طرف بھی وحی کی ہے''۔

لیکن اگر كَذٰلِكَ سے مراد تینوں طریقہ ہائے کلام مراد لیے جائیں، تب بھی تاویل پرویز کا باطل ہونا عیاں ہے، کیونکہ كَذٰلِكَ کا کلمہ، ان تینوں طریقوں کو، نہ صرف یہ کہ انبیاء کے ساتھ مخصوص کرتا ہے، بلکہ حضور اکرم ﷺ کی طرف کی جانے والی وحی بھی، ان تینوں طریقوں ہی پر مشتمل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب، اتباعِ قرآن کی آڑ میں، خود قرآن کو اپنے ذہن و دماغ کے تابع رکھا کرتے تھے، اور چونکہ ان کے قلب و ذہن، تبدیلیٔ آراء کا شکار ہوتے رہتے تھے، اس لیے وہ قرآن کو بھی، اپنی تغیر پذیر آراء کی بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے۔

اسی آیت کا صحیح مفہوم، بقلم پرویز

آج وہ جس آیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے، اس کے ابتدائی دو حصوں کو، انبیاء کے ساتھ اور آخری حصۂ آیت کو، غیر از انبیاء کے ساتھ، وابستہ کر رہے ہیں، کل وہ اسی آیت کے تینوں حصوں کو، انبیاء ہی کے ساتھ مخصوص مانتے تھے، لیکن کیا کیا جائے، جب کسی ''مفکرِ قرآن'' کی رائے بدلتی ہے تو خیالات ہی نہیں، بلکہ قرآنی آیات کے تراجم تک میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، لیجئے، سورہ شوریٰ کی اسی آیت کی وہ تشریح مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیے، جسے وہ ماضی کے دور میں پیش کیا کرتے تھے۔

قرآن کریم نے، اللہ کے اپنے بندوں سے ہمکلام ہونے کی تین صورتیں بتائی ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ إِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (الشوریٰ - ۵۱) اور (دیکھو) کسی انسان کی یہ حیثیت نہیں کہ خدا اس سے ہمکلام ہو مگر (صرف تین صورتوں میں) بطور وحی کے، یا حجاب (پردہ) کے پیچھے سے، یا یہ کہ کوئی قاصد (فرشتہ) بھیج دے اور وہ خدا کے حکم سے جو وہ چاہے، اس کے دل میں ڈال دے، بلاشبہ وہ بہت بلند مرتبہ اور صاحب حکمت ہے۔

وحیٔ رسالت پہلی قسم۔ فرشتہ یا آواز کے توسط کے بغیر کوئی بات، دل میں ڈال دینا

دوسری قسم- پردہ کے پیچھے سے، بذریعہ آواز کے۔ جیسے

وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا (۵۲/۱۹) ہم نے اسے کوہ طور کی داہنی جانب سے پکارا، اور (وحی کی) سرگوشیوں کے لیے اپنے سے قریب کیا۔

پس پردہ اس لیے کہ کسی انسانی آنکھ کے لیے ممکن نہیں کہ اس دنیا میں خدا کو بے حجاب دیکھ لے۔

اور تیسری قسم، یہ کہ ملائکہ (پیغام رسانِ ملاءِ اعلیٰ) کی وساطت سے اس کا نزول ہو۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۲/۹۷) اے پیغمبر! جبریل کا کون دشمن ہوسکتا ہے؟ یہ تو اللہ کا کلام ہے جو جبریل نے اللہ کے حکم سے تمہارے قلب میں اتارا ہے، اور یہ اس کلام کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکا ہے، اس میں انسان کے لیے ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لیے، جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح و کامیابی کی) بشارت۔ [1]

الغرض، پرویز صاحب کا یہ اقتباس، خدا کی ہمکلامی کے ان تینوں طریقوں کو انبیاء ہی کے ساتھ مخصوص کرتا ہے، ان میں سے کوئی طریقہ بھی، غیر از انبیاء، افراد کے ساتھ، وابستہ نہیں ہے۔

حکمِ وحی بذریعہ خوابِ انبیاء

قرآن کریم کا مطالعہ، اس امر کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ وحی، جس سریع اور خفیہ اشارہ کے ذریعہ سے کی جاتی ہے، اس کی صورتوں میں سے ایک صورت، دل میں کسی بات کا ڈال دینا ہے، اور دوسری صورت، بذریعہ خواب، کوئی حکم دینا ہے، پہلی صورت میں سرعت اور دوسری میں اخفاء کا مفہوم پایا جاتا ہے، اس طرح انبیاء کا خواب بھی، از قبیل وحی ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ کو ذبحِ پسر کا جو حکم ملا تھا، وہ خواب ہی کی صورت میں ملا تھا، جس کی تصدیق، خود قرآن کریم کرتا ہے۔

يَا بُنَيَّ إِنِّيْ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (الصّٰفّٰت-۱۰۳) (ابراھیم نے) کہا "بیٹے! میں نے تجھے خواب میں خود دیکھا ہے کہ میں ذبح کر رہا ہوں، بتا، تیری کیا رائے ہے" عرض کیا "ابا جان! جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے وہ کر گزریئے"۔

یہاں، خوابِ ابراھیمؑ کو محض خواب قرار نہیں دیا گیا، بلکہ خدائی حکم قرار دیا گیا ہے، حتّٰی کہ بیٹا بھی، خود باپ سے یہی کہتا ہے کہ "ابا جان! جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے، اسے کر گزریئے"۔ اور جب وہ کر گزرتے ہیں، تب بھی اللہ تعالیٰ، یہ نہیں فرماتا کہ "ابراھیم! یہ تو نے کیا غضب کیا کہ محض خواب کو، میرا حکم جان کر، بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی" بلکہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی روح کو پیش کرنے والے اس شاندار طرزِ عمل کی یوں تحسین فرمائی۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَآ إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ تو نے خواب سچ کر دکھایا، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

---

[1] معارف القرآن، جلد ۲، صفحہ ۲۸۴

لیکن اس کے علی الرغم، "مفکر قرآن"، قرآن، بلکہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ، سے اختلاف کرتے ہوئے، یہ فرماتے ہیں کہ

حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں ذبح کر رہے ہیں، انھوں نے اسے خدا کے حکم پر محمول کر لیا اور بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس مقام پر خود خدا نے ان سے کہا- "یہ تو تمہارا خواب تھا جسے تم نے حقیقت سمجھ لیا ہے، یہ خدا کا حکم نہیں تھا"- [1]

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآنِ کریم کی بدترین تحریف اور خدائے قدوس پر از حد گھناؤنا بہتان ہے، قرآن کریم تو رہا ایک طرف، آج تک کسی گری پڑی شخصیت نے بھی، یہ کہیں نہیں کہا کہ- "خوابِ ابراہیمؑ محض خواب تھا، حکم خدا نہ تھا"- خدا پر اعتقاد و ایمان رکھنے والا، جسے آخرت میں اپنی جوابدہی کا احساس ہو، خدا پر تہمت طرازی کی ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

پھر پیغمبر خدا، حضرت خلیل اللہ کی عقل و دانش، فہم و تفقہ، اور بصیرت و فراست پر حملہ کرتے ہوئے، "مفکر قرآن" لکھتے ہیں کہ

آپؑ نے، اپنے ایک خواب کی رو سے یہ سمجھا کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ اس بیٹے کو (اللہ کی راہ میں) قربان کر دیا جائے۔ [2]

اب ذرا غور فرمایئے، کہ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے؟ یہ کہ وہ بحیثیت پیغمبر، خواب دیکھتے ہیں، مگر خدا کے نبی، اللہ کے رسول، اور خلیل باری تعالیٰ ہو کر بھی، (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ)، ایسے غبی الذہن، بلید الفہم اور کودن دماغ واقع ہوئے ہیں کہ اپنے خواب کو بھی نہ سمجھ سکے کہ--- "یہ محض خواب ہے، حکم خدا نہیں"--- اس واقعہ کے تقریباً سوا یا ساڑھے چار ہزار سال بعد، ہمارے ہاں "مفکر قرآن" پیدا ہوتے ہیں، جو اس خواب کی حقیقت جان لیتے ہیں کہ یہ محض خواب تھا، خدائی حکم نہ تھا۔ اب ہم کیا گمان کریں، اُس بیچارے پیغمبر خدا کے متعلق، کہ خدا سے نبوت و رسالت تو پائی، مگر فہم اتنا بھی نہ پایا تھا، جتنا پرویز صاحب کو ملا تھا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ کو، صحیح ترجمہ و مفہوم کے آئینہ میں دیکھا جائے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خواب، اور اس کے ذریعہ دیا جانے والا حکم بھی، از قبیل وحی قرار پاتا ہے، جو اس امر کی دلیل ہے، کہ خواب انبیاء بھی، وحی کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے، جس کا انکار خود وحی کا انکار ہے۔

حضور ﷺ کا خواب اور علماء کا مؤقف

خوابِ ابراہیمؑ کے بعد، ایک اور خواب بھی، قرآن کریم میں مذکور ہے، جسے حضور نبی اکرم ﷺ نے دیکھا، پھر اس کے حقیقت اور وحی ہونے کی تصدیق، بعد میں خود، اللہ تعالیٰ نے فرما دی۔ مودودیؒ صاحب، اسی خواب کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ بھی از قبیل وحی تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ مدینہ میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپؐ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے، آپؐ اس

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۸۳ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۵۰

کی خبر، صحابہؓ کو دیتے ہیں اور ۱۴ سو صحابہ کو لے کر عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں، کفارِ مکہ، آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں، صلح حدیبیہ واقع ہوتی ہے، بعض صحابی اس پر خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ، ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ ''یارسول اللہ! کیا آپؐ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟'' آپؐ نے فرمایا ''کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہوگا؟'' اس پر اللہ تعالیٰ، قرآن میں ایسا فرماتا ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُؤُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (الفتح - ۲۷) اللہ نے اپنے رسول کو یقیناً سچا خواب دکھایا تھا، تم ضرور مسجد حرام میں ان شاء اللہ داخل ہو گے، امن کے ساتھ، سر منڈواتے ہوئے اور بال ترشواتے ہوئے، بغیر کسی خوف کے، اللہ وہ کچھ جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے، اس لیے اس کے علاوہ یہ قریبی فتح عطا فرما دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو خواب کے ذریعہ سے مکہ میں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر، مکہ کی طرف جائیں، کفار روکیں گے، آخر کار صلح ہوگی، جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا، اور آئندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائے گا، کیا یہ قرآن کے علاوہ، دوسرے طریقوں سے ہدایات ملنے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟[1]

خوابِ رسولؐ پر تاویلِ پرویز

لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، خواب رسولؐ کو، (تصدیقِ خداوندی کے باوجود بھی) مبنی بر وحی قرار نہیں دیتے، وہ فرماتے ہیں۔

دوسرا خواب، نبی اکرمؐ کا صلح حدیبیہ سے متعلق تھا، آپ ہجرت فرما کر، مکہ سے مدینہ تشریف لے آئے، یہاں آپؐ کے مشن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، لیکن چونکہ نظامِ خداوندی کا مرکز کعبہ تھا، اس لیے، اس کی تولیت کی آرزو، آپؐ کے دل میں بڑی شدت سے بیتاب رہتی تھی، انڈکس میں آپ قبلہ کا عنوان دیکھئے، یہ حقیقت واضح طور پر، آپ کے سامنے آجائے گی، اسی شدتِ آرزو کا نتیجہ تھا کہ آپؐ نے ٦ ھ میں خواب دیکھا کہ آپؐ مع صحابہ مکہ میں داخل ہو کر، کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔

اس وقت تک، مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہوا تھا، لیکن زمانہ قبل از اسلام میں، عرب، حج بھی کیا کرتے تھے، اور عمرہ بھی۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے خواب کی بناء پر، عمرہ کے ارادے سے مکہ کا قصد فرمایا، اور شدتِ شوق میں صحابہ کی قریب ڈیڑھ ہزار کی جماعت، آپ کے ہمرکاب ہوگئی، ابھی آپ مکہ سے ایک منزل دور، حدیبیہ کے مقام پر تھے کہ قریش نے پیغام بھیج دیا کہ وہ آپؐ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، آپ اگلے سال آیئے، چنانچہ اس کے مطابق، قریش کے ساتھ معاہدہ بھی ہو گیا، اور حضور ﷺ واپس مدینہ تشریف لے گئے، اس سے صحابہؓ کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ جب آپؐ نے اپنے خواب کی بناء پر عزم فرمایا تھا تو پھر اس میں کامیابی کیوں نہ ہوئی (روایت میں یہ بھی ہے کہ) حضرت عمرؓ نے آپؐ سے براہِ راست دریافت کیا کہ کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم کعبہ کا طواف کریں گے؟'' آپؐ نے فرمایا ''لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس سال کریں گے'' (سیرت النبی، حصہ اول، شبلی نعمانی صفحہ ۴۲۰) قریش نے آپؐ کے خواب اور اس ناکامی کا (معاذ اللہ) مضحکہ اڑایا۔ قرآن کے الفاظ میں وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (۱۷/۶۰) یہ خواب لوگوں کے لیے فتنہ کا موجب بن

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۲۱ تا صفحہ ۱۲۲

گیا۔ دو سال بعد، جب مکہ فتح ہوا اور حضور ﷺ فاتح و منصور اس میں داخل ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (۲۷/۴۸) ''خدا نے رسولؐ کا خواب سچ کر دکھایا۔'' [1]

جائزہ

اقتباسِ پرویز کا جائزہ لیتے ہوئے، چند باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) ------ سب سے پہلی بات تو یہ کہ پیغمبر خدا ﷺ بذاتِ خود خواب دیکھتے ہیں کہ وہ فدا کاروں کے ساتھ، حرم مکہ میں عمرہ کر رہے ہیں، آپؐ، اپنے خواب کو خود بھی خوابِ محض قرار نہیں دیتے، بلکہ خدائی حکم جان کر، اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں، سفر کی تیاری فرماتے ہیں، صحابہؓ میں اعلانِ سفر فرماتے ہیں، اور خود صحابہؓ بھی، حضور ﷺ کے خواب کو محض خواب نہیں سمجھتے بلکہ وحی سمجھتے ہیں اور عمرہ کے لیے، شرفِ ہمرکابی پاتے ہیں، حالانکہ ان صحابہؓ میں سے، اگر کوئی خود بھی ایسا خواب دیکھتا، تو وہ کبھی بربنائے خواب، عازمِ سفر نہ ہوتا، اور اپنے خواب کو، خوابِ محض سے زیادہ کوئی حیثیت نہ دیتا، لیکن نبیٔ اکرمؐ کے خواب پر، یہ لوگ، چودہ پندرہ سو کی تعداد میں، آپؐ کے ساتھ، شریکِ سفر ہونے کی سعادت پاتے ہیں، پھر اس معاملے کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، جس نے یہ اعلان فرما رکھا تھا، کہ آپؐ ہر وقت ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطور-۴۸)، آپؐ اور آپؐ کے فدا کاروں کو، عزمِ سفر، پھر تیاریٔ سفر، کیا معنٰی، بلکہ خود ہفتہ عشرہ بھر کے سفر میں مصروفِ جادہ پیمائی دیکھتا ہے، اور قریش کی طرف سے مخالفت اور جھڑپوں کا خطرہ بھی اس کے علمِ غیب میں ہے، قریش مکہ اور حضور اکرم ﷺ کے درمیان، سلسلۂ جنبانی، پھر باہمی گفت و شنید، پھر سفارتِ عثمانؓ، پھر افواہِ شہادتِ عثمانؓ، اور پھر بیعتِ رضوان میں سرفروشانہ عزمِ قصاصِ عثمان، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، اور ایک لمحہ کے لیے بھی، آپؐ کے دل میں یہ بات نہیں ڈالتا کہ --- ''آپ کا دیکھا ہوا خواب تو محض ایک خواب ہے، کوئی خدائی حکم نہیں ہے'' --- اور نہ ہی جبریل کے ذریعہ یہ وحی کرتا ہے کہ --- ''آخر آپ کیوں، ایک خواب کو فی الواقع حکمِ خدا جان کر، اپنے صحابہؓ کی جان جوکھوں میں ڈال رہے ہیں، بلکہ سارے منازل طے ہو جانے کے بعد، واپس مدینہ پہنچنے سے قبل ہی، الٹا وحی کے ذریعہ، اس خواب کی بایں الفاظ تصدیق کی جاتی ہے، کہ --- ''فی الواقع اللہ نے رسولؐ کو، سچا خواب دکھایا تھا، جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا کہ تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے ....'' --- آخر یہ کیوں؟

(۲) ------ دوسری بات یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے اس واقعہ کو، اپنے مطلب کے سانچہ میں ڈھالنے کے لیے، خواب کے متعلق، حضرت عمرؓ کے براہِ راست استفسار کو تو، سیرت النبی از شبلی نعمانی، سے نقل کر دیا، مگر اس کے بعد، حضور ﷺ کا جواب نقل کرنے سے گریز کیا، اور پھر اس گریز کے لیے، یہ وجۂ جواز فراہم کر ڈالی کہ

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۸۳

ہم نے اس مقام پر ان واقعات کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا، کیونکہ اس وقت، زیر بحث، صرف خوابوں کا ذکر ہے۔ ۱

ملاحظہ فرمایئے، حضور اکرم ﷺ کا اپنا جواب، جو استفسار عمر پر آپؐ نے پیش فرمایا۔

حضور ﷺ کا جواب یہ تھا کہ لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس سال کریں گے۔ ۲

حضور اکرم ﷺ کا یہ جواب، خود یہ ظاہر کر دیتا ہے، کہ آپؐ کو اپنے خواب کے خدائی حکم ہونے پر یقین ہے، ورنہ آپؐ ضرور یہ فرماتے کہ --- ''بھئی! میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں، جیسے تم خواب دیکھتے ہو، ویسے میں خواب دیکھتا ہوں، مجھ سے یہ غلطی ہوگئی کہ میں نے اپنے خواب کو فی الواقع ایک حقیقت سمجھ لیا'' ---

پھر ''مفکر قرآن'' کی یہ ''قلمی عیاری'' بھی قابل داد ہے کہ واقعات کا تفصیلی تذکرہ، نہ کرنے کی آڑ میں، اِس اقتباس کو بھی نظر انداز کر دیا جس میں، حضرت عمرؓ، حضور اکرم ﷺ سے، اپنے استفسار کا جواب پا کر، ابوبکرؓ سے گفتگو کرتے ہیں، اسے کیوں نظر انداز کیا گیا؟ اقتباس پڑھ کر خود سوچ لیجیے۔

حضرت عمرؓ، اٹھ کر، حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے، اور حضرت ابوبکرؓ نے کہا ''وہ پیغمبر خدا ہیں جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں۔ ۳

چونکہ خواب پر مبنی اس سفر کو، خود ابوبکرؓ نے، خدا کے حکم پر مبنی سفر قرار دیا تھا، اس لیے، اسے نظر انداز کر دیا گیا۔

(۳) ------ تیسری بات، یہ کہ قریش نے (بقولِ پرویز صاحب) آپؐ کے خواب اور آپؐ کی اس ناکامی کا مضحکہ اڑایا، یہ اصل صورتحال کی قطعی غلط تعبیر ہے، جس کی توقع صرف ''مفکر قرآن'' ہی سے کی جا سکتی ہے۔

قریش، جس بات کو، حضور ﷺ کی ناکامی قرار دے رہے تھے اور جس بات سے وہ خوش ہو رہے تھے، وہ معاہدۂ حدیبیہ کی وہ شرائط تھیں جنھیں اہل مکہ اپنے حق میں سمجھ رہے تھے اور جنھیں بعض صحابہؓ بھی، ناگوارِ خاطر جان رہے تھے، جبکہ قرآن نے اہل ایمان کو یہ یقین دلایا کہ معاملہ، اس کے برعکس ہے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' ہیں کہ صلح حدیبیہ سے متعلقہ صورتحال کو، خوابِ عمرہ سے وابستہ کر کے، جھوٹ اور سچ کا ملغوبہ بایں الفاظ پیش کر رہے ہیں کہ --- قریش نے، آپؐ کے خواب اور آپؐ کی ناکامی کا (معاذ اللہ) مضحکہ اڑایا، قرآن کے الفاظ میں وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ (۱۷/۶۰) یہ خواب لوگوں کے لیے فتنہ بن گیا --- پھر دلیل میں سورہ بنی اسرائیل کی جو آیت پیش کی گئی ہے، اس میں خوابِ عمرہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے، خواب عمرہ کا واقعہ، ۶ھ میں پیش آیا، جبکہ سورہ بنی اسرائیل، اس سے تقریباً سات آٹھ سال قبل، مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی تھی، اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ دراصل معراج کا واقعہ ہے جس میں حالت بیداری میں، آپؐ نے اتنا لمبا زمینی اور آسمانی سفر کیا، کہ یہ امر لوگوں کے لیے باعث فتنہ بن گیا، اور بعض نومسلم، جنھیں ابھی استحکامِ ایمان حاصل نہ ہو پایا تھا، اس فتنہ کا شکار ہو کر، کفر کی طرف پلٹ گئے، یہ صرف ''مفکر قرآن'' کے قلم اور ذہن کا کرشمہ

---

۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۸۴ ۲ + ۳ سیرت النبی (شبلی نعمانی)، جلد ۱، صفحہ ۴۲۰

ہے کہ وہ، ادھر ادھر سے متفرق امور لے کر، انھیں ایک مربوط واقعہ بنا ڈالتے ہیں۔

(۴) ------ پھر اس بنائے فاسد علی الفاسد کو، آگے بڑھاتے ہوئے، ''مفکر قرآن'' صاحب فرماتے ہیں۔

یہ خواب، لوگوں کے لیے فتنہ بن گیا، دو سال بعد، جب مکہ فتح ہوا، اور حضور ﷺ فاتح و منصور اس میں داخل ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (۲۷/۴۸) ''خدا نے رسول کا خواب سچ کر دکھایا۔'' [1]

''غلطی ہائے مضامین''

اس چھوٹے سے اقتباس میں، ''مفکر قرآن'' نے، جو ''غلطی ہائے مضامین'' کی ہیں، وہ، ان کی عربی استعداد اور علمی لیاقت کو طشت از بام کر دیتی ہیں۔

(الف) ------ اولین غلطی تو یہ ہے کہ سورۃ الفتح کی وہ آیت، جس میں خوابِ عمرہ کی تصدیق کی گئی ہے، اس کا زمانۂ نزول، فتح مکہ کے بعد کا قرار دیا گیا ہے، حالانکہ یہ، پوری کی پوری سورہ، معاہدہ حدیبیہ کے طے پا جانے پر، مدینہ کی طرف، واپسی سفر کے دوران، نازل ہوئی تھی، سیدھی سی بات ہے کہ خوابِ عمرہ کی تصدیق کا فائدہ بھی اسی وقت تک ہے جب تک عمرہ نہ ہو سکنے کی بناء پر، قلوب و اذہان، عدم اطمینان کا شکار رہتے ہیں، ۶ھ میں ہونے والی صلح حدیبیہ کی شرائط کی رو سے، مسلمان اگلے سال (۷ھ) مکہ گئے اور عمرہ کی سعادت پائی، تصدیقِ خوابِ عمرہ والی آیت، اس سے قبل نازل ہو چکی تھی، جو اہل ایمان کے لیے، باعثِ سکون و اطمینان ہو چکی تھی، اس آیت کو، فتح مکہ کے بعد والے دور میں نازل شدہ قرار دینا، اور پھر اسے اہل ایمان کے لیے موجبِ سکینت و طمانیت قرار دینا، تحصیلِ حاصل ہے۔

(ب) ------ دوسری غلطی، پرویز صاحب نے ترجمۂ آیت میں کی ہے کہ ''اللہ نے رسول کا خواب سچ کر دکھایا''، یہ ترجمہ غلط اور قطعی غلط ہے، اور اِسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پچاس سال تک، قرآن کا تحقیقی مطالعہ کرنے والے ''مفکر قرآن'' کی عربی زبان جاننے کے حوالے سے، مبلغ علم کیا تھا، اگر آیت کا یہی ترجمہ ہوتا جو ''مفکر قرآن'' نے کیا ہے تو الفاظِ آیت کی ترتیب یوں ہوتی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رُؤْيَا الرَّسُولِ (نہ یہ کہ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا)، ترجمہ آیت کی یہ غلطی، اس امر سے بھی واضح ہے کہ آیت کے اگلے الفاظ ہیں لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ...... ''تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے'' یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی وہ (صحابہ کرام) مسجد حرام میں داخل نہیں ہوئے اور خواب نبوی، ابھی پورا نہیں ہوا۔ اس صورتحال میں، انھیں یقین دلایا گیا ہے کہ ''تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے'' اگر فتح مکہ کے بعد، مسجد حرام میں داخل ہو جانے کے بعد یہ آیت اتری ہوتی (جیسا کہ ''مفکر قرآن'' نے گمان کر رکھا ہے) تو الفاظِ آیت قَدْ دَخَلْتُمُ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ہوتے یعنی ''تم مسجد حرام میں داخل ہو چکے ہو'' (نہ کہ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ یعنی ''تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے'')۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۷، صفحہ ۸۴

صحیح ترجمہ آیت بقلمِ پرویز

لیجئے! اب اسی آیت کا وہ صحیح ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیے جو ''مفکر قرآن'' ہی کے قلم سے اس وقت برآمد ہوا تھا، جب یہ بات، ان کے سان گمان میں بھی نہ تھی کہ اس آیت سے، خوابِ انبیاء کے یکے از اَقسامِ وحی ہونے کا ثبوت بھی فراہم ہوسکتا ہے، اور جب یہ ثبوت، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فراہم کر دیا، تو پھر ''مفکر قرآن'' نے، قواعدِ زبان ہی نہیں بلکہ خوفِ خدا کو بھی بالائے طاق رکھ کر، آیت کا غلط ترجمہ کرنے اور پھر اس پر اصرار کرنے کی روش اپنالی، ورنہ، اس سے قبل، وہ اسی آیت کا صحیح ترجمہ بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے۔

بیشک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے جو (بالکل) مطابقِ واقعہ ہے کہ تم لوگ انشاء اللہ، مسجد حرام (یعنی مکہ) میں امن و امان کے ساتھ ضرور داخل ہوگے، تم میں کوئی سر منڈائے ہوئے ہوگا، تو کوئی بال کترے ہوئے، کہ تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہوگا، اللہ ان باتوں کو اچھی طرح جانتا ہے جن کو تم نہیں جانتے، پھر (یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ نے) اس کے علاوہ تم کو، ایک قریبی (فوری) فتح عطا فرمادی۔ [1]

الغرض، یہ آیت، اس امر میں واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خواب کی حالت میں، عمرہ کرنے کا جو حکم، نبیٔ اکرم ﷺ کو دیا تھا، وہ مبنی برحق اور یکے از اقسامِ وحی تھا اور اللہ تعالیٰ نے بعد میں، اس کی تصدیق بھی فرمادی، اس سے قبل، زیر بحث، وہ آیت جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذبحِ پسر کا ذکر ہے، وہ بھی خوابِ انبیاء کا یکے از وحی ہونا، ثابت کرتی ہے، نیز یہ دونوں آیات، اس حقیقت کو بھی واضح کر دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ، کتاب کے علاوہ بھی، بذریعہ خواب، یا بذریعہ اشارۂ خفی و سریع، اپنے انبیاء کو، احکام و ہدایات دیا کرتا تھا۔

قرآن کے علاوہ وحی کا ثبوت، بقلمِ پرویز

کتابی یا قرآنی وحی کو تو لوگوں پر، پڑھ کر سنا دیا جاتا تھا، کیونکہ اس کے بارے میں، خود قرآن ہی کا یہ حکم تھا۔

۱ - اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ (العنکبوت-۴۵) (اے نبی!) تلاوت کرو، اس کتاب کی، جو تیری طرف وحی کی گئی۔

۲ - وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتٰبِ رَبِّکَ (الکہف - ۲۷) (اے نبی!) تیرے رب کی کتاب میں سے جو کچھ وحی کیا گیا ہے، اسے پڑھ کر سنادو۔

صحابہ کرامؓ، خود بھی، اس کتاب کو سینوں اور صحیفوں میں محفوظ رکھ کر، اس کی تلاوت کیا کرتے تھے، اس لیے کتابی وحی کے ہر حکم کو، صحابہ کرامؓ بالعموم جانتے ہی تھے، کتاب کے علاوہ، جو وحی آتی تھی، (خواہ بصورتِ القائے قلب ہو، یا بصورتِ خواب) اسے حضور اکرم ﷺ، خود اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر، یا اسے اپنے عمل کے قالب میں ڈھال کر پیش فرماتے تھے۔ آپؐ کے ایسے ہی مبنی بر وحی، اقوال و افعال کے بارے میں، اگر کوئی تفصیل صحابہؓ کو مطلوب ہوتی تو وہ استفسار کر لیتے تھے، کہ آیا

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۶۰

آپ کا یہ عمل یا فرمان، مبنی بر وحی ہے؟ یا آپؐ کی ذاتی رائے پر موقوف ہے؟ اور حضور اکرم ﷺ اس کی وضاحت فرما دیتے تھے، ایسے بہت سے واقعات، کتبِ احادیث میں موجود ہیں لیکن ہم صرف ان ہی واقعات کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو "مفکر قرآن" کی بصیرت پر، پورے اتر کر، استشہاداً اور تائیداً، ان کی کتب میں جگہ پا چکے ہیں۔

پہلا ثبوت جنگ بدر میں، جب حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک جگہ ڈیرہ ڈال دیا تو حبابؓ بن منذر ایک صحابی نے دریافت کیا کہ آیا اس مقام کا انتخاب، حضور ﷺ نے وحی کے اشارے پر کیا ہے یا اپنی رائے سے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وحی کا حکم نہیں، اس پر حضرت حباب بن منذر نے عرض کیا کہ پھر اس مقام کی نسبت، فلاں مقام زیادہ مناسب ہے ہمیں وہاں جا کر اپنا مورچہ بنانا چاہئے، حضور ﷺ نے ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جو حضرت حباب نے پیش کیے تھے اور فرمایا کہ حباب کی رائے، زیادہ صائب ہے، چنانچہ آپؐ نے اسی پر عمل فرمایا۔ [1]

دوسرا ثبوت اسی طرح غزوہ خندق میں، جب دشمن کی فوج کا محاصرہ طویل ہو گیا تو مشکلات کے ہجوم کے پیش نظر، حضور ﷺ کو خیال گزرا کہ کہیں انصار ہمت نہ ہار جائیں، کیونکہ وہ اس قسم کی جنگ کے عادی نہ تھے، اس لیے آپؐ نے چاہا کہ غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کر لیا جائے، کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث، ان کو دے دیا جائے، چنانچہ رؤسائے انصار سے مشاورت طلب کی گئی، انھوں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ، اگر یہ فیصلہ، وحی کے حکم کی رو سے ہے تو کسی کو انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر حضور ﷺ، اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہم معافی چاہتے ہیں، ہم اس کے لیے تیار نہیں، حضور ﷺ، انصار کے اس استقلال سے بہت خوش ہوئے، اور اُنکی رائے کو قبول فرمایا۔ [2]

تیسرا ثبوت ایک دفعہ، نبی اکرمؐ نے (جو سربراہِ مملکت بھی تھے) ایک لونڈی سے کچھ ارشاد فرمایا، تو اس نے بغیر کسی جھجک کے پوچھا کہ "یہ خدا کا حکم ہے یا حضور ﷺ کا ذاتی مشورہ؟" جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ "یہ آپ کا ذاتی مشورہ ہے، تو اس نے بلا تامل کہہ دیا کہ "پھر معاف فرمایئے، میں اپنے معاملات کو، آپؐ سے بہتر سمجھتی ہوں۔" [3]

یہ تمام واقعات، اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں کہ نبی اکرم ﷺ پر، خارج از قرآن اور غیر از کتاب اللہ بھی وحی نازل ہوا کرتی تھی، صحابہؓ کا حضور ﷺ کے متعلق یہ عقیدہ، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ انھیں قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی، اسی بناء پر، وہ یہ پوچھ لیا کرتے تھے کہ آپؐ کا یہ حکم، حکمِ وحی ہے؟ یا آپؐ کی ذاتی رائے پر مبنی ہے؟ وہ لوگ، صرف اُن ہی احکام کو، مؤسس بروحی نہیں سمجھتے تھے، جو قرآن میں موجود ہیں، بلکہ حضور ﷺ کے ان احکام کو بھی، وہ احکامِ وحی سمجھتے تھے، جو قرآنی احکام کے علاوہ تھے، اور جہاں معاملہ قابل استفسار ہوتا، تو وہ خود حضور ﷺ سے استیضاح کر لیتے تھے جیسا کہ مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہے۔

خود قرآن ہی سے، قرآن کے علاوہ، وحی کے دلائل

اس کے علاوہ، قرآن خود بھی، متعدد آیات میں، اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر، خارج از قرآن بھی

---

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۴ء، صفحہ ۶۱ [2] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۴ء، صفحہ ۶۲ [3] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۸۳ء، صفحہ ۵

وحی کا نزول ہوتا تھا، چند آیات ملاحظہ فرمائیے۔

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ أَنْ يُّحِقَّ الحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَo لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (الانفال-۷ تا۸) اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا، تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے، اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تا کہ حق، حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوارِ خاطر ہو۔

اس آیت میں، رسولِ خدا اور صحابہ کرامؓ سے کیے جانے والے، اِس وعدۂ خداوندی کا ذکر ہے، کہ ''ان دونوں گروہوں میں سے، تمہیں کوئی ایک ضرور مل جائے گا''، اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کا یہ وعدہ، قرآن میں کہیں مذکور نہیں۔ لامحالہ یہ وعدہ، اس وحی پر مبنی ہے جو قرآن کے علاوہ، پیغمبر کو خدا کی طرف سے ملا کرتی تھی، یہ ایک صریح ثبوت ہے، اس امر کا، کہ قرآن کے علاوہ بھی، اللہ کی طرف سے نبیؐ پر وحی اُترا کرتی تھی، اس ''خارج از قرآن'' یا ''زائد از قرآن'' وحی کے انکار کے لیے، ''مفکر قرآن'' نے جو پرویزی حیلہ اختیار کیا ہے، اسے بھی ایک نظر ملاحظہ فرمالیجئے۔

> پھر جب تم آگے بڑھے تو حالات بتا رہے تھے کہ اللہ کے اس وعدے کے مطابق جو اس نے ایمان اور اعمال صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض کے لیے کر رکھا ہے (۵۵/۲۴)، فریقِ مقابل کے دو گروہوں میں سے، ایک پر تم ضرور غالب آ جاؤ گے۔ تم یہ چاہتے تھے کہ تمہارا ٹکراؤ، اس گروہ کے ساتھ ہو، جو غیر مسلح تھا اور لڑائی کی طاقت نہیں رکھتا تھا، لیکن اللہ، یہ چاہتا تھا کہ تمہارا مقابلہ، ان کے لشکر سے ہو، تا کہ اس طرح یہ ثابت ہو جائے کہ حق، باطل پر غالب آیا کرتا ہے، اور اس سے انکار کرنے والوں کی جڑ کٹ جایا کرتی ہے۔
>
> اس طرح حق، حق اور باطل، باطل بن کر دنیا کے سامنے آ جائے، خواہ مجرمین پر یہ بات کیسی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ [1]

جائزۂ تاویلِ پرویز

قبل اس کے کہ، وعدۂ خداوندی کی بابت، تاویلِ پرویز کو زیرِ بحث لایا جائے، یہ بات زیادہ موزوں اور انسب ہے کہ ''مفکر قرآن'' کی اس غلطی کو واضح کر دیا جائے جو جنگ بدر کے متعلق، اُس وقت کی صورتحال کو بیان کرنے میں، انھوں نے کی ہے، ان کا یہ کہنا کہ --- ''حالات بتا رہے تھے کہ فریقِ مخالف کے دو گروہوں میں سے ایک پر تم ضرور غالب آ جاؤ گے'' --- قطعی غلط بات ہے، اس وقت صورتحال یہ تھی کہ قافلے پر غالب آنا تو یقینی تھا، مگر لشکر پر غالب آنا قطعاً یقینی نہ تھا، اس لیے صحابہؓ یہی چاہتے تھے کہ قافلہ پر حملہ کر کے غلبہ پایا جائے، تا کہ غلبہ کے ساتھ قافلے کا مال و دولت بھی ہاتھ آئے، لیکن لشکر کے ساتھ جب وہ اپنا موازنہ نہ کرتے تو کفار مکہ کے وافر اسلحہ اور ساز و یراق کے مقابلہ میں، وہ خود کو، اسلحہ کی انتہائی قلت بلکہ فقدان کی

[1] مفہوم القرآن، آیات (۷ تا ۸)/۸، صفحہ ۳۹۴ تا صفحہ ۳۹۵

حالت میں پاتے، اور ایسے لشکر کے مقابلہ میں نکلنے کو، وہ خود، موت کے منہ میں جانے کے مترادف جانتے تھے، قرآن، اسی زیر بحث آیت سے متصل قبل، یہ بیان کرتا ہے۔

وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ○ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ (الانفال-۵ تا ۶) اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا، وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے، درآں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا، ان کا یہ حال تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے تھے۔

کیا آیت میں مذکور وعدہ، وعدۂ استخلاف ہی ہے؟

رہا آیتِ زیر بحث میں، مذکور وعدہ، تو اسے آیت استخلاف کے وعدہ سے وابستہ کرنا، بوجوہ غلط ہے۔

اولاً ------ اس لیے کہ آیت استخلاف میں مذکور وعدہ، ایک ایسا عام وعدہ ہے جو حق و باطل کی کشمکش کی درمیانی منزلوں میں سے کسی منزل کے ساتھ وابستہ ہونے کی بجائے، اُس آخری منزل سے منوط ہے جس میں باطل، مکمل طور پر سرنگوں اور حق کامل طور پر غالب ہو جاتا ہے، جبکہ زیر بحث آیت میں مذکور وعدہ، حق و باطل کی کشمکش کے درران پیش آنے والی، اس خاص منزل سے متعلق ہے جس میں ایک طرف، قریش کا کیل کانٹے سے لیس لشکر جرار تھا، اس پر غلبہ پانا، نظر بظاہر مشکل بلکہ ناممکن تھا، اللہ کا وعدہ یہ تھا کہ ''دونوں گروہوں (فوجی لشکر اور تجارتی قافلہ) میں سے کسی ایک پر غلبہ تمہیں مل جائے گا''۔ اب حق و باطل کی اس درمیانی منزل سے متعلقہ وعدۂ خاص کو، اُس آخری منزل سے وابستہ وعدۂ عام کے ساتھ منتھی کرنا، (جس میں حق کی باطل پر مکمل فتح کا یقین دلایا گیا ہے) ایک بیجا تاویل ہے۔ اگر پرویز صاحب کی تاویل کو مان لیا جائے تو لازم آتا ہے کہ جنگ احد میں مسلمان شکست سے دوچار نہ ہوتے، کیونکہ ایسا ہونا بھی وعدۂ استخلاف کے منافی ہے۔

ثانیاً ------ اس لیے کہ، اگر آیتِ زیر بحث کا وعدہ، سورۂ نور میں مذکور، عام وعدہ سے وابستہ ہوتا تو پھر دونوں گروہوں پر ہی غلبہ مراد ہوتا، نہ کہ کسی ایک گروہ پر، کیونکہ سورہ نور میں مذکور وعدۂ استخلاف، ایک مطلق، مکمل اور عام فتح وظفر اور غلبہ و استیلاء کا وعدہ ہے، نہ کہ دو گروہوں میں سے کسی خاص گروہ پر حاوی ہونے کا وعدہ۔

ثالثاً ------ اس لیے کہ سورہ نور ۶ھ کے نصف آخر میں، سورۂ احزاب کے کئی مہینے بعد، نازل ہوئی ہے اور سورہ انفال ۲ھ میں، جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے، اس لیے آیت زیر بحث میں، جس وعدہ کا ذکر ہے، وہ کسی طرح بھی سورہ نور میں مذکور وعدۂ استخلاف سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ سورہ انفال میں مذکور وعدہ، اس وقت ہوا تھا جب کہ استخلاف فی الارض والی آیت کیا معنی، پوری سورت (نور) نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔

لہذا، آیت زیر بحث، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ، نبی اکرم ﷺ کو، قرآن کے علاوہ بھی وحی بھیجتا رہا ہے۔ خارج از قرآن، یا قرآن کے علاوہ، وحی کا ثبوت، یہ آیت بھی فراہم کرتی ہے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَٰئِكَةِ مُرْدِفِينَ (الانفال-۹) اور وہ وقت یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے جواباً فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لیے، ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ صحابہؓ کی فریاد کے جواب میں، اللہ تعالیٰ کی یہ یقین دہانی کہ --- ''میں پے در پے، ایک ہزار فرشتوں سے، تمہاری مدد کرنے والا ہوں'' --- قرآن مجید میں کہیں مذکور نہیں ہے، لامحالہ، یہ یقین دہانی، خارج از قرآن، وحی ہی کے ذریعہ کی گئی تھی۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ ایک ہے'' قولی وعدہ''، اور دوسرا ہے'' عملاً ایفائے وعدہ''۔'' قولی وعدہ'' اور'' عملاً ایفائے عہد'' دو الگ الگ امور ہیں، آیت زیر بحث کی رو سے، اللہ تعالیٰ نے پہلے قولاً وعدہ فرمایا کہ'' میں ایک ہزار پے در پے اترنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا''۔ اور پھر جب معرکہ جنگ برپا ہوا تو حق تعالیٰ نے'' عملاً اس وعدہ کو پورا فرما دیا''۔ عملاً ایفائے عہد کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ (آل عمران-۱۲۳) بیشک اللہ تعالیٰ بدر میں تمہاری مدد کر چکا ہے جبکہ تم کمزور تھے۔

لیکن خدائے قدوس کا یہ قولی وعدہ کہ'' میں پے در پے نازل ہونے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا'' قرآن مجید میں کہیں مذکور نہیں، لامحالہ، یہ قرآن کے علاوہ نازل ہونے والی وحی ہی کے ذریعہ کیا گیا اور اس کی تصدیق، بعد میں قرآن کی زیر بحث آیت نے کر دی۔

یہ کسی نبیؑ یا رسولؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ پہلے بطور خاص، بذریعہ وحی'' قولی وعدہ'' کرے، اور پھر عملاً اس کا ایفاء کرے، حضور اکرم ﷺ کے بعد، اگر، عام مومنین ہی نہیں، بلکہ صحابہ کرامؓ بھی، اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں تو یہ ممکن نہیں کہ اب اللہ پہلے'' قولی وعدہ'' فرمائیں اور پھر'' عملاً اسے پورا کریں'' کیونکہ وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے، اب اگر رب ذوالجلال چاہیں تو لوگوں کی فریاد کا جواب،'' عملاً کاروائی'' ہی کے ذریعہ ممکن ہے بغیر اس کے کہ اس سے پہلے کوئی'' قولی عہد و پیمان'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظہور میں آئے جیسا کہ قرآن کریم بیان کرتا ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرہ-۱۸۶) (اے نبی!) میرے بندے اگر تجھ سے میرے متعلق پوچھیں، تو انھیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

خدا کا یہ جواب، دراصل، وہ ''عملی کاروائی'' ہے، جو کسی شخص کی درخواست، التجاء، دعا یا فریاد پر من جانب اللہ ہوا کرتی ہے۔

اس طرح یہ آیت (انفال-۹) بھی، قرآنی وحی کے علاوہ، خارج از قرآن وحی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

تیسری دلیل

قرآن کریم، حضور اکرم ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی میں نجماً نجماً نازل ہوتا رہا، آج قرآن مجید جس ترتیب کے ساتھ مجموع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہ اسی ترتیب کے ساتھ نازل نہیں ہوا تھا، قرآن کی ترتیب نزول، اس کی جمعی ترتیب سے قطعی

مختلف ہے، سوال یہ ہے کہ یہ ترتیبِ جمع، آیا نبیؐ اکرم کی نفسانی خواہش کا نتیجہ ہے؟ یا وحی خداوندی کا؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیامہ-۱۷) اس کو جمع کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔

اب، قرآن کو جمع کرا دینے کی، اس خدائی ذمہ داری کو پورا کر دینے کی صورت، اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ بذریعہ وحی، رسولؐ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ بتایا جائے، کہ فلاں آیت اور فلاں سورت کو فلاں مقام پر، فلاں آیت یا سورت سے پہلے یا فلاں کے بعد رکھئے، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی وحی، جس میں جمع قرآن کی ترتیب بتائی گئی ہو، قرآن میں کہیں موجود نہیں ہے، لامحالہ، یہ قرآن کے علاوہ اترنے والی وحی ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے، قرآن کی جمع و ترتیب کا کام، بحکم خداوندی (یا بذریعہ وحی) ترتیب پانا، ایک ایسی حقیقت ہے جسے طلوعِ اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے، چنانچہ ایک کتاب پر تبصرہ کے دوران، اُس کے مصنف سے اختلاف کرتے ہوئے، خود اس نے یہ لکھا ہے کہ

سورتوں کو حضرت عثمانؓ نے ترتیب نہیں دیا، بلکہ ترتیب آیات وسُوَر، بحکمِ خداوندی، خود نبی اکرمؐ نے فرمائی تھی۔ [1]

اس طرح، آیتِ زیرِ نظر، اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ پر، قرآن کریم کے علاوہ بھی وحی نازل ہوا کرتی تھی، اور اسی خارج از قرآن یا زائد از قرآن وحی کی روشنی میں قرآن مجید کو موجودہ ترتیب پر جمع کیا گیا تھا۔

چوتھی دلیل

حضور نبی اکرم ﷺ، اپنی ازواج مطہرات میں سے، ایک بیوی کو خلوت میں ایک راز کی بات بتاتے ہیں، وہ اس راز کو افشاء کر دیتی ہیں، حضور ﷺ، اس پر اپنی بیوی سے پوچھ گچھ کرتے ہیں، تو وہ جواباً استفسار کرتی ہے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے راز کی بات افشاء کر دی ہے؟ حضور ﷺ جواباً فرماتے ہیں کہ مجھے علیم وخبیر (یعنی اللہ) نے اس کی اطلاع دی ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (التحریم-۳) اور جبکہ نبیؐ نے اپنی ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور اس بیوی نے اس کی (دوسروں کو) خبر دیدی، اور اللہ نے نبیؐ کو اس پر مطلع کر دیا تو نبیؐ نے اس بیوی کو اس کے قصور کا ایک حصہ تو جتا دیا اور دوسرے حصہ سے درگزر کیا، پس جب نبیؐ نے اس بیوی کو اس کا قصور جتایا تو اس نے پوچھا "آپ کو کس نے اِسکی خبر دی؟" نبیؐ نے کہا "مجھے علیم وخبیر خدا نے بتایا"۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں، ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہارے راز کو افشاء کر دیا ہے، لامحالہ، نبی کو یہ اطلاع، خدائے قدوس نے اس وحی کے ذریعہ ہی دی تھی، جو قرآن کے علاوہ آپ پر آتی تھی، یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ، قرآن کے علاوہ بھی، اپنے نبیؐ کے پاس پیغامات وہدایات بھیجا کرتا تھا۔

---

[1] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۴ + ستمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۸ اور صفحہ ۲۲

''مفکرِ قرآن'' کی تاویلِ فاسد

لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کو چونکہ، قرآن کے علاوہ، کسی وحی کا وجود قابلِ تسلیم نہیں ہے، اس لیے، اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں، جو ہر پہلو سے تحریفِ قرآن قرار پاتی ہے۔

(یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ) ہمارے نبیؐ نے کوئی بات، اپنی کسی بیوی سے پوشیدہ طور پر کہی تھی (میاں بیوی میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں)۔ اس کی بیوی نے، اس بات کا کسی اور عورت سے ذکر کر دیا (حالانکہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا) خدا نے اس بات کو (اس عورت کے ذریعے) نبیؐ پر ظاہر کر دیا، تو اس نے اس میں سے کچھ حصہ اپنی بیوی کو جتا دیا اور کچھ حصہ سے اعراض برتا (یعنی بات بتادی اور یہ نہیں بتایا کہ اسے کس سے معلوم ہوئی ہے) چنانچہ اس پر، اس بیوی نے، نبیؐ سے پوچھا کہ آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے یہ بات اس (عورت نے) بتائی ہے جس پر تو نے اس راز کو افشا کیا تھا، اور وہ اس طرح اس سے باخبر ہو گئی تھی۔ [1]

قرآنی آیت کے مفہوم کی تحریف و تغییر کے لیے ''مفکرِ قرآن'' نے سب سے پہلے وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ کے ترجمہ کو نشانہ بنایا ہے، اور اس میں، بین القوسین اضافے کے ذریعہ، اصل حقیقت کو مسخ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اِن الفاظ کے اس ترجمہ میں کہ --- ''خدا نے اس بات کو (اس عورت کے ذریعے) نبیؐ پر ظاہر کر دیا'' --- بین القوسین الفاظ، آخر کن قرآنی مفردات کا ترجمہ ہیں؟

پھر ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' کے مصداق، اس بین القوسین اضافۂ عبارت کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ حاشیہ آرائی کی گئی ہے کہ

جو باتیں، انسان کو عام طور پر معلوم ہو جاتی ہیں یا جن کا علم وہ عام طریق کے مطابق حاصل کر سکتا ہے، انھیں بھی بعض اوقات خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے مثلاً (۴/۵) میں دیکھئے، شکاری کتوں کو سدھانے کے طریق کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ یہ عام علم انسانی کی چیز ہے جسے ہر شخص، اس سے سیکھ سکتا ہے، جو اس فن کا ماہر ہو (نیز ۲/۲۸۲؛ ۴-۵/۹۶؛ ۴/۵۵)[2]

اگر نبی ﷺ کو عام انسانی ذرائع سے اس بات کی اطلاع ہوئی ہوتی، تو محض اتنا سا واقعہ کہ بیوی نے آپ کا راز کسی اور سے کہہ دیا اور کسی مخبر نے آپ کو اس کی اطلاع دیدی، سرے سے قرآن میں قابلِ ذکر ہی نہ ہوتا، اور نہ ہی اس بات کو اس طرح بیان کیا جاتا کہ ''اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا'' اور ''مجھے العلیم الخبیر نے بتایا''، قرآن میں اس واقعہ کو، اس شان سے بیان کرنے کا مقصد ہی لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہارا معاملہ کسی عام انسان سے نہیں بلکہ اس رسول سے ہے جس کی پشت پر، خود اللہ تعالیٰ، اپنی طاقت اور علم کے ساتھ موجود ہے، جس نے براہِ راست، اپنے نبیؐ کو راز کی بات کے افشا ہونے کی اطلاع دے دی وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، اور اسی اللہ کے متعلق آخر میں ''الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ'' الفاظ آئے ہیں، یہ الفاظ علی الاطلاق، اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مستعمل ہیں، نہ کہ کسی اور ''صاحبِ علم و خبر'' کے لیے۔

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۳۳۱ [2] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۳۳۲

''مفکر قرآن'' کی یہ عام عادت تھی، کہ جس آیت سے، کسی صاحب علم نے، اُن کے خلاف کوئی دلیل و حجت پیش کر دی، تو وہ بجائے اس کے کہ اس دلیل کو قبول کر لیتے، الٹا اپنے موقف پر اصرار کرتے ہوئے، اس کے ترجمہ ومفہوم ہی کو اپنی تحریف کا نشانہ بنا ڈالتے تھے، اور اس طرح، بزعمِ خویش، وہ مطمئن ہو جاتے تھے، کہ اب ان کے خلاف، اُس آیت سے استدلال ممکن نہیں رہا۔ مثلاً اسی زیر بحث آیت کو دیکھئے کہ اس آیت سے، ۱۹۶۱ء میں، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، منکرین حدیث کے خلاف یہ استدلال کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر، قرآن کے علاوہ بھی وحی اُترا کرتی تھی، اور یہ بات چونکہ منکرینِ حدیث کے نظریات کے خلاف تھی کیونکہ وہ زائد از قرآن یا خارج از قرآن، کسی وحی کے قائل نہیں ہیں، اس لیے ''مفکر قرآن'' نے، اس وقت سے، اس آیت کے مفہوم ہی کو بدلنے کی روش اپنائے رکھی، حالانکہ اس سے قبل، وہ اسی آیت کا ترجمہ، ان الفاظ میں کیا کرتے تھے۔

> اور جب نبیؐ نے اپنی کسی بیوی سے کوئی بات پوشیدگی سے کہی، پھر جب اسی بیوی نے وہ بات (دوسری کسی بیوی پر) ظاہر کر دی، تو اللہ نے پیغمبر کو اس (واقعہ) کی خبر کر دی، چنانچہ نبیؐ نے (ظاہر کرنے والی بیوی پر) کچھ بات تو جتلا دی، اور کچھ حصہ سے اعراض برتا۔ چنانچہ جب آپ نے اس بیوی کو وہ بات بتلائی تو انھوں نے کہا کہ مجھ کو تو (سب سے) بڑے جاننے والے اور (سب سے) بڑے خبر رکھنے والے نے کی ہے۔ [1]

اگرچہ اس ترجمہ میں، قَالَتْ مَنْ اَبْنَاَکَ هٰذَا کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے، لیکن پھر بھی، آیت کے جن حصوں کو وہ اپنی تحریف کا نشانہ، ۱۹۶۱ء کے بعد بناتے رہے ہیں، مندرجہ بالا اقتباس میں، ان کا ترجمہ درست ہے، یاد رہے کہ یہ ترجمہ ۱۹۶۱ء سے بہت پہلے تقریباً ۱۹۴۹ء میں کیا گیا تھا، اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان کو اپنے نظریات، قرآن کریم کے نظریات سے کہیں زیادہ عزیز تھے، وہ اپنے معتقدات کی خاطر، قرآنی آیات میں تحریف وتغییر تک کر ڈالتے تھے، لیکن قرآنی آیت کے صحیح تراجم کی بنیاد پر، اپنے نظریات کو نہیں بدلا کرتے تھے۔

پانچویں دلیل

جنگ احد میں، اہل ایمان، کفار مکہ پر مشتمل تین ہزار لڑاکا افراد کے مقابلے میں، صرف ایک ہزار جاں نثار ہی فراہم کر سکے اور اس میں سے بھی، تین سو افراد، رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبیّ کے ورغلانے پر، اسلامی لشکر سے الگ ہو گئے، اس موقع پر، نبی اکرم ﷺ نے، اپنے مخلص جاں نثاروں سے جو کچھ فرمایا، اسے قرآن، بایں الفاظ پیش کرتا ہے۔

إِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ أَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ أَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ٥ بَلٰى إِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَأْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (آل عمران-۱۲۴-۱۲۵)

(اے نبیؐ) یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے، ''کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے''؟ بیشک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے، اسی آن تمہارا

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۷۵۱

رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

عبداللہ بن اُبیّ کے بہکاوے میں آ کر، تین سو افراد کی اسلامی لشکر سے علیحدگی کے نازک موقع پر، حضور اکرم ﷺ نے جو اہل ایمان سے یہ فرمایا کہ--- "اللہ تعالیٰ، تین صد افراد کی اس کمی کو، تین صد ملائکہ سے نہیں بلکہ تین ہزار ملائکہ سے پورا کر دے گا، لیکن دشمن کی طرف سے فوری حملے کی صورت میں، اللہ تعالیٰ، تین ہزار کی بجائے پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعہ سے تمہاری مدد کرے گا" --- تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ حضور اکرم ﷺ کو اس بات کا علم کیسے ہوا کہ اللہ تعالیٰ تین ہزار یا پانچ ہزار ملائکہ سے مدد فرمانے والے ہیں؟ ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ خدا نے یہ بات، اپنے نفس سے گھڑ کر تو، اہل ایمان سے نہیں کہہ دی تھی، لامحالہ، خود اللہ تعالیٰ ہی نے اہل ایمان کے اطمینان اور تسلی کے لیے، حضور ﷺ سے یہ وعدہ کیا ہوگا، لیکن اگر یہ وعدۂ خداوندی قرآن میں کہیں مذکور نہیں --- اور یقیناً موجود نہیں --- تو آپؐ کو اس کا علم، خارج از قرآن یا غیر قرآنی وحی کے ذریعہ سے ہی ہونا ممکن ہے، اس طرح، یہ آیت بھی منجملہ اُن آیات میں سے ہے، جو قرآن کے علاوہ بھی پیغمبرِ خدا ﷺ کی طرف، وحی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

لیکن ہمارے "مفکر قرآن" صاحب، جو بڑے فخر و انبساط کے ساتھ، اپنی پچاس سالہ قرآنی تحقیق کی تشہیر کیا کرتے تھے، ایسی آیات پر سے سرسری طور پر گزر جانے ہی میں عافیت سمجھا کرتے تھے تاکہ انھیں قرآن کے علاوہ، کسی وحی کو ماننے کا خطرہ نہ مول لینا پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیات ہیں، جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ انبیائے کرام کو، کتاب اللہ کے علاوہ بھی، وحی آیا کرتی تھی، ایسی مزید آیات پیش کرنے کی بجائے، فی الحال، اِن ہی پانچ آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

چند مغالطاتِ پرویز

وحی کے بارے میں چند مغالطات ایسے ہیں جنھیں، پرویز صاحب نے بڑے تکرار و اعادہ کے ساتھ پیش کیا ہے، ان مغالطات کی تہہ میں، جو اصل لِم کارفرما ہے، وہ یہ ہے کہ کسی حال میں بھی، قرآن کے علاوہ، کسی اور قسم کی وحی کو تسلیم نہ کیا جائے، تاکہ مسلک انکار سنت کی راہ ہموار کرتے ہوئے، اور اتباعِ رسول سے جان چھڑاتے ہوئے، نیز قرآن کریم ہی کو تنہا وحی قرار دیتے ہوئے، اتباعِ کتاب اللہ کے نام پر، اسے من مانی تعبیرات کا نشانہ بنا دیا جائے۔

(۱) وحی کی ایک ہی قسم اور وہ بھی صرف قرآن میں

چنانچہ "مفکر قرآن" صاحب، اپنے اس عقیدہ کو کئی جگہ بار بار پیش کرتے ہیں کہ

> وحی کی ان دو قسموں کا عقیدہ بھی غیر قرآنی ہے، وحی کی ایک ہی قسم ہے، اور وہ سب کی سب، قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہے، خارج از قرآن کہیں نہیں۔ [۱]

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۴۳۵

حالانکہ قرآن مجید، دوقسمی وحی تو رہی ایک طرف، تین قسمی وحی کا اثبات کرتا ہے، جیسا کہ اس سے قبل، سورہ شوریٰ کی آیت کے حوالے سے گزر چکا ہے، پھر قرآن کریم کی پانچ آیات کو بھی، اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جا چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر قرآن کے سوا بھی وحی نازل ہوا کرتی تھی، خود پرویز صاحب کی اپنی تحریروں سے بھی یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ صحابہؓ کرام بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے، کہ پیغمبرِ خدا کو قرآنی وحی کے علاوہ بھی، خدائی ہدایات و پیغامات ملا کرتے تھے، اور جہاں کہیں وہ محسوس کرتے، حضور ﷺ سے یہ استفسار بھی کرلیا کرتے تھے کہ آپ کا یہ حکم مبنی پر وحی ہے؟ یا آپؐ کی ذاتی رائے پر موقوف ہے؟ ان حقائق سے جحود و مکابرہ کی روش، دراصل، قرآن سے جحود و مکابرہ کی روش اپنانا ہے، جو شخص فی الوقع، نیک نیتی سے قرآن کی پیروی کا خواہشمند ہے، وہ ان حقائق کا انکار کر ہی نہیں سکتا۔

(۲) کیا وحی و کتاب، لازم و ملزوم ہیں؟

''مفکر قرآن'' وحی اور کتاب کو لازم و ملزوم جانتے ہیں ان کے نزدیک، وحی ملنے کا معنی لازماً کتاب ہی کا ملنا ہے، حالانکہ ہر کتاب اللہ، تو یقیناً وحی ہی کے ذریعہ ملتی ہے، لیکن ہر وحی کا ملنا ضروری نہیں کہ کتاب اللہ ہی کی شکل میں ہو، وحی، تو کتاب اللہ کے بغیر بھی، آ سکتی ہے، لیکن کتاب اللہ، وحی کے بغیر نہیں آ سکتی، علاوہ ازیں، دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ کے الفاظ و معانی (اور ترتیب الفاظ) خدا ہی کی طرف سے وحی کیے جاتے ہیں، جبکہ مطلق وحی، اس صورت میں بھی ممکن ہے کہ معانی و مفاہیم تو منجانب اللہ ہوں، لیکن انھیں، الفاظ کا جامہ پہنانے کا کام، یا انھیں، اعمال کے کسی خاص قالب میں ڈھالنے کا کام، خود اُس نبی یا رسول نے انجام دیا ہو، جس پر یہ وحی (بذریعہ القاء والہام، یا بذریعہ خواب) نازل ہوئی ہے، لہذا، مفکر قرآن کا یہ فرمان کہ

> یہ کہنا کہ میری طرف وحی تو ہوئی ہے، لیکن کتاب نہیں ملی، وحی اور کتاب کی حقیقت سے بےخبری کا بین ثبوت ہے۔ [1]

بجائے خود، اس بات کا ثبوت ہے کہ خود ''مفکر قرآن'' کتاب اور وحی کی حقیقت سے بے خبر ہیں، کیونکہ از روئے قرآن، یہ عین ممکن ہے کہ خدا کا رسول، اللہ تعالیٰ سے وحی تو پا رہا ہو، لیکن ابھی کتاب نہ ملی ہو، خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ زندگی، اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے، مثلاً مندرجہ ذیل، آیات کو بنظر غائر ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) -- فَلَمَّآ اَتَاهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰیO اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ (طٰهٰ - ۱۱ تا ۱۲) جب موسیٰ (علیہ السلام) آگ کے پاس پہنچے تو ان کو پکارا گیا، ''اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، اپنی جوتیاں اتار دے''۔

(۲) --- فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی (طٰهٰ - ۱۳) سن جو کچھ کہ وحی کی جا رہی ہے۔

(۳) --- اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِکْرِیْ (طٰهٰ - ۱۴) میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔

(۴) --- وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی (طٰهٰ - ۱۷) اور اے موسیٰ! تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟

(۵) --- اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (طٰهٰ - ۲۴) فرعون کے پاس جا، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۲۶۵

(۶) --- قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يٰمُوسٰى (طٰهٰ - ۳۶) اے موسیٰ! جو کچھ مانگا گیا، وہ تجھے دیا گیا۔

(۷) -- إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَآ أَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (طٰهٰ-۴۸) ہمیں وحی کی گئی کہ عذاب ہے اس کے لیے، جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔

(۸) ---قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلٰى ٥ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا (طٰهٰ-۶۸ تا ۶۹) ہم نے کہا'' مت ڈر، تو ہی غالب رہے گا، پھینک جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگلے جاتا ہے۔

(۹) --- وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلٰى مُوسٰى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (طٰهٰ - ۷۷) ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات، میرے بندوں کو لے کر، چل پڑ، اور ان کے لیے سمندر میں سے سوکھی سڑک بنالے۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف، خدا کے وہ وحی کردہ احکام و ہدایات ہیں، جو مصر چھوڑنے (یعنی ہجرت کرنے) سے پہلے کے ہیں، صحرائے سینا میں ہجرت کے بعد بھی، بغیر کتاب، وحی کا سلسلہ قائم رہتا ہے، چند آیات ملاحظہ فرمائیے۔

ہجرت کے بعد، صحرائے سینا میں، سب سے اہم مسئلہ، جو پیدا ہوتا ہے وہ ہزاروں افراد پر مشتمل، اسرائیلیوں کے لیے، پانی اور خوراک کی فراہمی کا مسئلہ ہے، اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَأَوْحَيْنَآ إِلٰى مُوسٰى إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهٗ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى (الاعراف - ۱۶۰) اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اسے اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر لاٹھی مارو، چنانچہ اس سے یکا یک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پینے کی جگہ متعین کر لی، اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا اور ان پر من وسلویٰ (بسلسلۂ فراہمی غذا) اتارا۔

یہ سب وہ وحیاں ہیں، جو قبل از ہجرت اور بعد از ہجرت، کتاب اللہ کے علاوہ ہی نہیں بلکہ اس کے بغیر بھی، نازل ہوتی رہی ہیں پھر اس کے بعد، انھیں ایک موقع پر کتاب دی جاتی ہے، اور ہدایت کی جاتی ہے کہ

فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِينَ ٥ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (الاعراف-۱۴۴-۱۴۵)'' پس جو کچھ میں تجھے دوں، اسے لے اور شکر بجالا'' اس کے بعد، ہم نے موسیٰ کو ہر شعبہ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دیدی۔

اب غور فرمائیے کہ کتاب تو بعد از ہجرت اور بعد از غرقابی فرعون، اب صحرائے سینا میں ملی ہے، لیکن اس سے قبل، اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر کثیر التعداد مواقع پر، وحی کر چکا تھا، اور کتاب دیئے جانے سے قبل کی یہ وحیاں، بھی اسی طرح قابل اتباع اور واجب الاطاعت تھیں، جس طرح کتابی وحی کا اتباع لازم اور ضروری ہوتا ہے اور فرعون جس وحی کا کفر و انکار کرتے ہوئے غرقاب ہوا ہے، وہ کتابی وحی نہیں تھی، بلکہ غیر کتابی وحی ہی تھی، پھر کتاب دیئے جانے کے بعد بھی، اس وحی کا سلسلہ قائم و برقرار رہتا ہے، اور ایتائے کتاب کے بعد، سب سے پہلی وحی، موسیٰ علیہ السلام کو یہ کی جاتی ہے۔

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوْا بِأَحْسَنِهَا (الاعراف-۱۴۵) اسے مضبوطی سے تھام اور قوم کو یہ حکم دے کہ وہ بہتر مفہوم کی پیروی کرے۔

کتاب کے علاوہ، وحی کا یہ سلسلہ، موسیٰ علیہ السلام کو الواحِ تورات دیئے جانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے، بقولِ قرآنِ مجید، حضرت موسیٰ علیہ السلام، ستر افراد کو کوہ طور پر لے جاتے ہیں، یہ لوگ، اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں، ایک بجلی نمودار ہوتی ہے اور سب اس کی لپیٹ میں آ کر مر جاتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں، تو جواب ملتا ہے۔

عَذَابِيْٓ أُصِيْبُ بِهٖ مَنْ أَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف - ۱۵۶) میں اپنا عذاب پہنچاتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت، ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔

الغرض، کتاب الٰہی سے پہلے بھی، وحی کا سلسلہ جاری رہا اور کتاب کے بعد بھی، یہ سلسلہ برقرار رہا ہے۔

ہاں، البتہ یہ درست ہے کہ ہر نبی و رسول، صاحب کتاب ہوتا ہے، مگر اس کا یہ معنٰی ہرگز نہیں کہ اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں، اُس کتابی وحی کے سوا، جس کے الفاظ و معانی، دونوں خدا کی طرف سے آتے ہیں، اُسے ایسی کوئی وحی نہیں ملتی، جس میں ''کوئی بات اس کے دل میں ڈال دی جائے''، یا ''بذریعہ خواب اسے کسی بات کا حکم دیا جائے'' (جیسا کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کو دیا گیا) یا اسے کسی بات کا ''مخفی اور سریع اشارہ کیا جائے''، اور پھر وہ، ایسی وحی کو خود اپنے الفاظ و عمل کا جامہ پہنا کر پیش کرے، مزید برآں، نہ ہی نبی و مرسل کے صاحبِ کتاب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی حیاتِ نبوت اور دورِ رسالت کے اولین سانس سے لے کر، آخری سانس تک کتابی وحی کا حامل رہا ہو، بلکہ عین ممکن ہے کہ منصب نبوت و رسالت پاتے ہی، وہ دولتِ وحی سے تو سرفراز کر دیا گیا ہو، لیکن کتاب اللہ، اسے ایک مدت کے بعد ملی ہو، جیسا کہ حیات موسوی کے ضمن میں، قرآنی تصریحات سے واضح ہے۔

(۳) حضور ﷺ کی نبوی اور بشری حیثیت

یہ وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں منکرین حدیث، لوگوں کے قلوب و اذہان میں طرح طرح کی غلط فہمیاں ڈالتے رہتے ہیں، اور اس مسئلہ کی آڑ میں، یہ لوگ اپنی تشکیکی مہم اور ارتیابی تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں، اور حضور ﷺ کی بشری حیثیت کی آڑ میں، ''اطاعت رسول'' سے دستکش ہوتے ہیں، اس تحریک کے علمبردار، نبوت و رسالت کے مفہوم کو فقط ''وحی پانے'' اور پھر اسے لوگوں تک ''پہنچا دینے'' تک محدود قرار دیتے ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے عیاں ہے۔

نبوت کے معنٰی ہیں خدا سے وحی کا ملنا، اور رسالت کا معنٰی ہے اس وحی کا دوسروں تک پہنچانا، نبوت (یعنی خدا کی طرف سے وحی کا ملنا) نبی اکرم صلعم پر ختم ہوگئی، آپ کے بعد کسی کو وحی نہیں مل سکتی۔ باقی رہا فریضۂ رسالت (یعنی قرآن کو دوسروں تک پہنچانا) سو یہ فریضہ اس امت کے سپرد کیا گیا ہے جسے خدا نے وراثتِ کتاب کے لیے منتخب کیا تھا۔ [1]

چنانچہ ''خدا سے وحی پانے'' اور پیغامِ خدا کو لوگوں تک پہنچا دینے'' کے بعد، حضور ﷺ کی حیثیت، محض بشری حیثیت ہے، جس میں پیغمبر سے اجتہادی سہو اور لغزشوں کا وقوع عین ممکن ہے، لہٰذا اس حیثیت میں، ان کی اطاعت کا کیا سوال؟

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۸

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی نبوی حیثیت اور بشری حیثیت میں نمایاں فرق کر دیا ہے، نبیؐ کی حیثیت سے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی، جس میں آپؐ کی اپنی مرضی یا خیال یا خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کے بعد آپؐ، جو کچھ ارشاد فرماتے یا فیصلے کرتے، وہ آپ کی بشری حیثیت سے تھا جس میں اجتہادی سہو کا امکان تھا۔ [۱]

چھوڑیئے اس سوال کو کہ --- قرآن کی کس سورہ، کس آیت اور کن الفاظ میں حضور ﷺ کی نبوی اور بشری حیثیت میں فرق کیا گیا ہے؟ --- قابل غور چیز تو یہ ہے کہ قرآن جگہ جگہ اطاعتِ رسول کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ (جو اصلاً مطاعِ حقیقی ہے) خود بھی، اپنی اطاعت کا واحد ذریعہ، اطاعت رسول ہی کو قرار دیتا ہے۔

وَمَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (النساء - ۸۰) اور جس نے رسول کی اطاعت کی، وہی مطیعِ خدا ہے۔

اس لیے، خود خدا کی اطاعت کا تقاضا یہی قرار پاتا ہے کہ رسولِ خدا کے قول و فعل کی اقتداء و پیروی کی جائے، جو اتباعِ حدیث اور پیرویٔ سنتِ رسول کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر حدیث و سنت کی پیروی سے جان چھڑانے کے لیے، یہ بہانہ گھڑا جاتا ہے کہ

حدیث کی کسی کتاب میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ رسول اللہ نے فلاں بات، رسالت کی حیثیت سے کی تھی، اور فلاں بات بشری حیثیت سے۔ فلاں بات اپنے شخصی مذاق یا قومی طرز معاشرت کی رو سے کی تھی اور فلاں بات دینی حیثیت سے۔ حدیث کی کسی کتاب میں یہ تفریق و تمیز نہیں کی گئی۔ [۲]

پھر اس گفتگو کی ٹیپ کا بند یہ ہوتا ہے کہ

لہٰذا، اس کے لیے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ احادیث کے تمام مجموعوں سے ان دونوں قسموں کے امور کو الگ الگ کیا جائے اور اس طرح سنتِ رسول کو متعین کیا جائے۔ [۳]

حقیقت یہ ہے کہ کتب احادیث میں، اس ''عیب'' کی نشان دہی، اور سنت کے بارے میں، یہ ساری ژاژ خائی، اسے نہ ماننے کے لیے محض حیلے اور بہانے ہیں، اور یہ ایک عام حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص، کسی چیز کو نہ ماننا چاہے یا کسی چیز کو نہ کرنا چاہے تو ایسے شخص کے لیے حیلوں اور بہانوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی، خوئے بدرا بہانہ ہائے بسیار است۔ ورنہ اگر کوئی شخص، نیک نیتی سے، اتباعِ سنت اور اطاعتِ رسول کا خواہشمند ہے، تو اس کے لیے یہ جاننا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ رسولِ خدا نے کیا کچھ بحیثیتِ نبی و رسول فرمایا ہے، اور کیا کچھ بحیثیتِ بشر کہا یا کیا ہے۔ اس قسم کی تفریق و تمیز کا حدیث میں نہ ہونے کا ''عیب'' خود قرآنِ کریم میں بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ کتاب اللہ میں بھی یہ کہیں نہیں واضح کیا گیا کہ فلاں فعلِ رسول یا قولِ نبی، بحیثیتِ رسول، وارد ہوا ہے یا بحیثیتِ بشر؟ لیکن اس کے باوجود، وہاں اتباعِ قرآن کی نیت و خواہش (قطع نظر اس کے کہ اس کی تہہ میں کیا مصلحت کارفرما ہے) خود یہ تفریق پیدا کر لیتی ہے، مثلاً قرآن کریم میں یہ مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کو، جنھیں حضور ﷺ نے اپنا بیٹا قرار دے رکھا تھا، یہ فرمایا تھا کہ اَمْسِکْ عَلَيْکَ زَوْجَکَ (اپنی بیوی کو اپنے عقد نکاح میں تھامے رکھ) سوال یہ ہے کہ آپؐ کا یہ فرمان، بحیثیتِ رسول و نبی تھا؟ یا بحیثیتِ حاکم و فرمانروا؟ یا بحیثیتِ بشر آپؐ کا نجی اور

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۳ [۲] + [۳] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۸ء، صفحہ ۸

ذاتی مشورہ تھا؟ خود پرویز صاحب، اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

حضور ﷺ کا یہ حکم، نہ بحیثیت رسول تھا، اور نہ بمنصبِ سربراہِ مملکت، یہ ایک ذاتی مشورہ تھا۔ [۱]

اب اگر قرآن کریم میں مذکور، فرامینِ رسول یا اعمالِ پیغمبر میں، ایسی تفریق ممکن ہے، تو کتب احادیث میں کیوں ممکن نہیں؟ لیکن اصل چیز تو قلبی نیت اور باطنی خواہش ہے، اگر یہ چیز، اطاعتِ رسول کے اخلاص پر مبنی ہے، تو ایسے مخلص اطاعت شعار شخص کے لیے، یہ عدمِ تفریق، سنتِ رسول سے گریزاں ہونے کا بہانہ نہیں بنتی، لیکن اگر نیت میں کھوٹ اور دل میں روگ ہو، تو پھر بہانے بیشمار ہیں، اور ایک عیار اور شاطر آدمی، اپنی نیت کے کھوٹ کو چھپانے کے لیے، بہانوں کی اوٹ اختیار کر لیتا ہے۔

تحقیق بحث

حضور اکرم ﷺ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت کے فرق و امتیاز میں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے، ایک قلمی مناظرہ میں، بڑی وضاحت سے یہ فرمایا تھا کہ

> یہ بات مسلماتِ شریعت میں سے ہے کہ سنتِ واجب اتباع صرف وہی اقوال و افعالِ رسول ہیں جو حضور ﷺ نے رسول کی حیثیت سے کیے ہیں، شخصی حیثیت سے جو کچھ آپؐ نے فرمایا یا عملاً کیا ہے وہ واجب الاحترام تو ضرور ہے مگر واجب الاتباع نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں --- باب بیان اقسام علوم النبی ﷺ -- کے عنوان سے اس پر مختصر مگر بڑی جامع بحث کی ہے، صحیح مسلم میں امام مسلم نے ایک پورا باب ہی اس اصول کی وضاحت میں مرتب کیا ہے اور اس کا عنوان یہ رکھا ہے **بَاب وجوب امتثال ماقالہٗ شرعًا دون ماذکرہ ﷺ من معائش الدنیا علی سبیل الرای** (یعنی باب اس بیان میں کہ واجب صرف ان ارشادات کی پیروی ہے جو نبی ﷺ نے شرعی حیثیت سے فرمائے ہیں نہ کہ ان باتوں کو، جو دنیا کے معاملات میں، آنحضور ﷺ نے اپنی رائے کے طور پر بیان فرمائی ہیں)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں فرق کر کے یہ فیصلہ آخر کون کرے گا اور کیسے کریگا کہ آپؐ کے افعال و اقوال میں سے سنتِ واجب الاتباع کیا چیز ہے اور محض ذاتی و شخصی کیا چیز؟ ظاہر ہے کہ ہم بطور خود، یہ تفریق و تحدید کر لینے کے مجاز نہیں ہیں، یہ فرق دو ہی طریقوں سے ہوسکتا ہے یا تو حضور ﷺ نے اپنے کسی قول و فعل کے متعلق خود تصریح فرمادی ہو کہ وہ ذاتی اور شخصی حیثیت میں ہے، یا پھر جو اصولِ شریعت، آنحضور ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوتے ہیں، ان کی روشنی میں محتاط اہل علم یہ تحقیق کریں کہ آپؐ کے اقوال و افعال میں سے کس نوعیت کے اقوال و افعال، آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کس نوعیت کی باتوں اور کاموں کو شخصی و ذاتی قرار دیا جاسکتا ہے۔ [۲]

ایک اور مقام پر، اپنے طویل مضمون کا خلاصہ، وہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

> اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا جو حکم دیا ہے وہ آپ کے کسی ذاتی استحقاق کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اس بناء پر ہے کہ آپؐ کو اس نے اپنا رسول بنایا ہے۔ اس لحاظ سے باعتبار نظریہ، تو آپ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں یقیناً فرق ہے، لیکن عملاً چونکہ ایک ہی ذات میں شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت، دونوں جمع ہیں اور ہم کو

---

[۱] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۹ء، صفحہ ۳۷ [۲] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۵۳ تا ۵۴

آپ کی اطاعت کا مطلق حکم دیا گیا ہے، اس لیے ہم بطور خود یہ فیصلہ کر لینے کے مجاز نہیں ہیں کہ ہم حضور ﷺ کی فلاں بات مانیں گے کیونکہ وہ بحیثیت رسول، آپ نے کی یا کہی ہے، اور فلاں بات نہ مانیں گے کیونکہ وہ آپ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کام خود حضور ﷺ ہی کا تھا کہ شخصی نوعیت کے معاملات میں، آپ نہ صرف لوگوں کو آزادی عطا فرماتے تھے بلکہ آزادی برتنے کی تربیت بھی دیتے تھے، اور جو معاملات، رسالت سے تعلق رکھتے تھے، ان میں آپ بے چوں و چرا اطاعت کراتے تھے، اس معاملہ میں، ہم کو جو کچھ بھی، آزادی حاصل ہے وہ رسول پاک کی دی ہوئی آزادی ہے، جس کے اصول اور حدود، حضور ﷺ نے خود بتا دیئے ہیں، یہ ہماری خود مختارانہ آزادی نہیں ہے۔ [1]

مزید وضاحت مثالوں کے ذریعہ سے

پھر اس سلسلہ میں، بات کی مزید وضاحت کے لیے، مولانا مودودیؒ کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے۔

جو معاملات، بظاہر بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا پینا، کپڑے پہننا، نکاح کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل اور طہارت اور رفع حاجت وغیرہ۔ وہ بھی نبی ﷺ کی ذات میں خالص نجی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں بلکہ انھی میں شرعی حدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے.................. مثلاً حضور ﷺ کے لباس اور آپؐ کے کھانے پینے کے معاملہ کو لیجیے، اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپؐ، ایک خاص وضع قطع کا لباس پہنتے تھے، جو عرب میں اس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپؐ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا، اسی طرح آپؐ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپؐ کے عہد میں، اہل عرب کے گھروں میں پکتے تھے، اور ان کے انتخاب میں بھی آپؐ کے اپنے ذوق کا دخل تھا، دوسرا پہلو یہ تھا کہ اسی کھانے اور پہننے میں، آپؐ، اپنے عمل اور قول سے، شریعت کے حدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضور ﷺ ہی کے سکھائے ہوئے اصول شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہلی چیز، آپؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری چیز حیثیت نبویہ سے۔ اس لیے کہ شریعت نے جس کی تعلیم دینے کے لیے، آپؐ، اللہ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اس معاملہ کو اپنے دائرہ عمل میں نہیں لیا ہے، کہ لوگ اپنے لباس، کس تراش خراش اور وضع قطع پر سلوائیں، اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں۔ البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرہ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملہ میں حلال اور حرام، جائز اور ناجائز کے حدود معین کرے اور لوگوں کو ان آداب کی تعلیم دے جو اہل ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں۔ [2]

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے، آخری بات، جو مولانائے محترم نے ارشاد فرمائی، وہ یہ تھی۔

حضور ﷺ کی شخصی اور نبوی حیثیتوں میں حقیقت کے اعتبار سے جو بھی فرق ہے وہ عند اللہ اور عند الرسول ہے، اور ہمیں اس سے اس لیے آگاہ کیا گیا ہے کہ ہم کہیں عقیدے کی گمراہی میں مبتلا ہو کر محمدؐ بن عبد اللہ کو، اللہ کی بجائے، مطاع حقیقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ لیکن امت کے لیے عملاً آپ کی ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت۔ حتیٰ کہ محمد بن عبد اللہ کے مقابلے میں اگر ہم کو آزادی حاصل بھی ہوتی ہے تو وہ محمد رسول اللہ کے عطا کرنے سے ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ ہی اس کے

---

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۵۰ [2] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۵۰ تا ۱۵۱

حدود متعین کرتے ہیں اور اس آزادی کے استعمال کی تربیت بھی ہم کو محمد رسول اللہ ہی نے دی ہے۔ ۱

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بخلوصِ قلب، اطاعتِ رسول کا خواہش مند ہو، اس کے لیے حضور ﷺ کی حیثیت نبوی اور حیثیت بشری کی یہ وضاحت، سکونِ خاطر اور اطمینانِ قلب کا باعث ہے۔ لیکن اگر،

تیرا ہی جی نہ چاہے ، تو باتیں ہزار ہیں

(۴) حضور ﷺ کی اجتہادی لغزشوں سے غلط استدلال

منکرین حدیث، نبیٔ اکرم ﷺ کی اجتہادی لغزشوں سے، جو استدلال کرتے ہیں، اس کی ایک تقریر ''حضور ﷺ کا اجتہادی سہو'' کے زیرِ عنوان، ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔

> اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی نبوی اور بشری حیثیت میں، نمایاں طور پر فرق کر دیا ہے، نبیؑ کی حیثیت سے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی، جس میں آپ کی اپنی مرضی یا خیال یا خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کے بعد، آپؐ جو کچھ ارشاد فرماتے یا فیصلے کرتے، وہ آپؐ کی بشری حیثیت سے تھا، جس میں اجتہادی سہو کا امکان تھا، قرآن کریم میں (زیرِ نظر آیت عَفَا اللّٰهُ عَنكَ لِمَ اَذِنتَ لَهُم .... کے علاوہ) دیگر مقامات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، لیکن ہمارے ہاں جب دین، مذہب میں بدلا تو یہ عقیدہ وضع ہوا کہ حضور ﷺ اپنی زندگی کے ہر سانس میں نبی تھے، حضور ﷺ کا ہر قول، ہر عمل اور ہر فیصلہ وحی کی رو سے ہوتا تھا (اس موضوع پر ہم، وحی کے عنوان کے تحت سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں) زیرِ نظر آیت بھی، ان کے اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے، ظاہر ہے کہ اگر حضور ﷺ کا (ان لوگوں کو اجازت دینے کا) فیصلہ، وحی کی رو سے ہوتا، تو خدا کی طرف سے تادیب کیوں ہوتی؟ ۲

استدلال کی تہہ میں واقع سوءِ فہم اور اس کا ازالہ

یہ استدلال، ایک غلط فہمی کی بناء پر، ایک اہم حقیقت کو پس پشت ڈال دینے کا نتیجہ ہے۔

منکرین حدیث، شاید یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کے جملہ اقوال و ارشادات اور جملہ اعمال و افعال سے قبل وحی اترا کرتی تھی، اور پھر رسولؐ خدا کا ہر قول و فعل، فرداً فرداً نازل ہونے والی، اس وحی پر اساس پذیر ہوتا تھا، اور نبیؐ کی فکر و اجتہاد کی قوتیں اور صلاحیتیں گویا معطل ہو کر رہ گئی تھیں، کیونکہ وحی کی موجودگی میں تعقل و تدبر اور تفکر و اجتہاد کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے، پھر منکرین حدیث، اپنے نفس کی اس غلط فہمی کو، ایک امرِ واقعہ قرار دے کر، اسے اپنے مخالفین کی طرف بطور عقیدہ منسوب کر ڈالتے ہیں، اس کے بعد، وہ نبیؐ کی ''لغزشوں'' اور اس کے ''اجتہادی امورِ سہو'' کو دیکھتے ہوئے، یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ --- ''اگر حضور ﷺ کا یہ کام، یہ قول اور یہ فیصلہ، وحی کی رو سے ہوتا تو خدا کی طرف سے تادیب کیوں نازل ہوتی'' --- حالانکہ یہ مفروضہ اور اس پر قائم استدلال کی یہ فلک بوس عمارت، سب کچھ قطعی بے بنیاد ہے۔

---

۱ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۵۲ ۲ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۳

اصل حقیقت یہ ہے کہ نبیؐ پر ہر وقت، وحی کا کڑا پہرہ قائم رہتا ہے، رسولؐ خدا، زندگی کی ہر سانس میں، اللہ تعالیٰ کی نگاہ (اور نگہبانی) میں رہتا ہے فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا (الطور - ۴۸)۔ وہ خود ایسا سلیم الفطرت اور مرضاتِ الٰہیہ کا پابند ہوتا ہے کہ اس کا ہر فکری اجتہاد اور ہر قول و فعل، رضائے الٰہیہ کے تابع ہوتا ہے، جہاں کہیں، وہ، بال برابر بھی اس راستہ سے ہٹتا ہے، وحی اسے متنبہ کر کے، پھر سے اس کے قدم کو راہِ راست پر جما دیتی ہے، یہ ہے وہ حقیقت، جس کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ نبی کا ہر اجتہاد، ہر فیصلہ، ہر قول، اور ہر عمل، حدودِ وحی میں گھرا ہوا ہوتا ہے، اور جہاں کہیں، زلتِ قدم کی نوبت آتی ہے، وہیں وحی مداخلت کر کے اسے سنبھال لیتی ہے، حضور اکرم ﷺ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں چار پانچ ہی ایسے مواقع آئے ہیں، جہاں وحی نے مداخلت کر کے، آپؐ کی پوری سنت کو اس طرح لغزشوں سے پاک اور زلات سے منزہ کر دیا ہے، کہ اتباعِ سنت نبویہ کا خواہشمند، پورے اطمینان سے اس کی پیروی کر سکتا ہے۔

پھر یہی غلط استدلال، اور اس کا تفصیلی جواب

منکرین حدیث کے، اسی استدلال کو، مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ قلمی مناظرہ میں بھی بایں الفاظ پیش کیا گیا تھا، اس اقتباس میں، منکرین حدیث کے اس نمایاں فرد نے قرآنی آیات کے پیش کرنے میں جو غلطیاں کی ہیں وہ ان کی علمی قابلیت کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہیں، ان کا من و عن اقتباس (مع اغلاط کے) درج ذیل ہے، یاد رہے کہ یہ قلمی مناظر، ڈاکٹر عبدالودود صاحب تھے۔

> قرآن کی آیات سے واضح ہے کہ حضور ﷺ، نظام مملکت کی سرانجام دہی میں ایک بشر کی حیثیت رکھتے تھے اور کبھی آنحضرت سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں، قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیٓ اِلَیَّ رَبِّیْ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (۵۰/۳۰)۔ اگر یہ اجتہادی غلطیاں ایسی ہوتیں جن کا اثر، دین کے اہم گوشے پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اس کی تادیب بھی آ جاتی، جیسے کہ ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہنے کی اجازت چاہی اور حضور ﷺ نے دیدی، اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی، عَفَا اللّٰهُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْکٰذِبِیْنَ (۹/۴۳)۔ اسی طرح سورہ تحریم میں تادیب آ گئی یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ (۶۶/۱) ، اسی طرح سورہ عبس میں ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَکّٰی اَوْیَذَّکَرُ فَتَنْفَعَهُ الذِکْرَ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَتَزَکّٰی وَ اَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی وَهُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی (۸۰/۱ تا ۱۰)[1]

تفصیلی تردید استدلال

اگرچہ اس استدلال کا اجمالی ردّ اوپر پیش کیا جا چکا ہے، لیکن پھر بھی یہ زیادہ مناسب ہے کہ خود مولانا مودودیؒ نے

---

[1] بحوالہ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۰۲

اس کا جو تفصیلی رد پیش کیا ہے، اسے ان ہی کے الفاظ میں پیش کیا جائے۔

یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ کس قدر سرسری مطالعہ کی بناء پر لوگ کتنے بڑے اور نازک مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے بیٹھ جاتے ہیں، کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک رسول بھی بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے اور اسے غلط کار و گمراہ ثابت کرنے کے لیے یہ آیات بھی قرآن میں نازل کر دیں تا کہ کہیں لوگ اطمینان کے ساتھ، اس کی پیروی نہ کرنے لگیں؟ کاش آپ نے قرآن کا آپریشن کرنے سے پہلے، ان آیات پر، اتنا ہی غور کر لیا ہوتا، جتنا اپنے کسی مریض کی ایکسرے رپورٹ پر غور کرتے ہیں۔

پہلی آیت قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ سے آپ یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ خود قرآن کی رو سے رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی گمراہ بھی ہو جاتے تھے، اور آپ کی زندگی دراصل، ہدایت و ضلالت کا مجموعہ تھی (معاذ اللہ) یہ استدلال کرتے وقت، آپ نے کچھ نہ دیکھا کہ یہ آیت کس سیاق و سباق میں آئی ہے، سورہ سباء میں اللہ تعالیٰ، پہلے کفار مکہ کا یہ الزام نقل فرماتا ہے کہ وہ نبی ﷺ کے متعلق کہتے تھے أَفْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا أَم بِهٖ جِنَّةٌ (آیت-۸) "یہ شخص یا تو اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے، یا یہ مجنون ہے" پھر اس کا جواب دیتے ہوئے، آیات ۴۶ تا ۵۰ میں، الزام نمبر ۲ کے متعلق فرماتا ہے کہ تم لوگ فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی، ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خالصۃً للہ غور کرو۔ تمہارا دل، خود گواہی دے گا کہ یہ شخص، جو تمہیں اسلام کی تعلیم دے رہا ہے، اس میں جنون کی کوئی بات نہیں۔ اس کے بعد، ان کے پہلے الزام (یعنی "یہ شخص اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے") کے جواب میں، اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے، کہ اے نبی! ان سے کہو، اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ ، درحقیقت یہ سچا کلام میرا رب القاء فرما رہا ہے، اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں (جیسا کہ تم الزام لگا رہے ہو) تو میری اس گمراہی کا وبال مجھ پر ہے۔ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ اور اگر میں راہِ راست پر ہوں تو اس وحی کی بناء پر ہوں، جو میرا رب مجھ پر نازل کرتا ہے، اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ وہ سب کچھ سننے والا اور قریب ہے یعنی اس سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں گمراہ ہوں یا اُس (خدا) کی طرف سے ہدایت یافتہ۔ اس سیاق و سباق میں جو بات کہی گئی ہے اس کا آپ یہ مطلب لے رہے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے سامنے، اپنے رسول سے یہ اعتراف کروا دیا کہ واقعی میں کبھی گمراہ بھی ہو جاتا ہوں مگر کبھی سیدھے راستے پر بھی چل لیتا ہوں، سبحان اللہ! کیا خوب قرآن فہمی ہے۔

دوسری آیات، جو آپ نے پیش فرمائی ہیں ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطور نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تا کہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ حالانکہ دراصل، ان سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی تھیں جن کی اللہ نے فوراً اصلاح فرما دی، اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ، اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ، اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا، جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔

پھر آپ نے کچھ تو سوچا ہوتا کہ وہ لغزشیں ہیں کیا، جن پر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں، اپنے نبی کو ٹوکا ہے؟ جنگ میں فوجی خدمت سے استثناء کی درخواست پر، کسی کو مستثنیٰ کر دینا، کسی حلال چیز کو نہ کھانے کا عہد کر لینا، ایک صحبت میں چند اہم شخصیتوں

کو، دین کی دعوت دیتے ہوئے، بظاہر ایک غیر اہم شخصیت کی طرف توجہ نہ کرنا، کیا یہ ایسے ہی بڑے معاملات ہیں، جن کا دین کے اہم گوشوں پر اثر پڑتا ہے؟ کون سا ایسا لیڈر یا فرمانروا، یا آپ کی اصطلاحِ خاص میں، ''مرکز ملت'' ہے، جس کی زندگی میں بارہا اس طرح کے، بلکہ اس سے بہت زیادہ بڑے معاملات نہ پیش آتے ہوں؟ پھر کیا ان لغزشوں کی تصحیح کے لیے، ہمیشہ آسمان ہی سے وحی اترا کرتی ہے؟ آخر وہ کیا خاص وجہ ہے کہ اتنی معمولی لغزشیں، جب رسولِ پاک سے صادر ہوئیں تو فوراً ان کی اصلاح کے لیے وحی آ گئی اور اسے کتاب میں ثبت کر دیا گیا؟ آپ اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے، تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ رسالت کے منصب کو سمجھنے میں، آپ نے کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے، کوئی رئیس یا لیڈر یا مرکز ملت، اللہ تعالیٰ کا نمایندہ نہیں ہوتا، اس کا مقرر کیا ہوا شارع (Law Giver) اور اس کا مامور کیا ہوا نمونہ تقلید نہیں ہوتا، اس لیے اس کی کوئی بڑی سے بڑی غلطی بھی قانون اسلامی پر اثر انداز نہیں ہوسکتی کیونکہ اس سے خدا کی شریعت کے اصول نہیں بدل سکتے، لیکن رسولِ پاکؐ، چونکہ خدا کے اپنے اعلان کی رو سے، دنیا کے سامنے مرضاتِ الٰہی کی نمایندگی کرتے تھے، اور خدا نے خود اہل ایمان کو حکم دیا تھا کہ تم ان کی اطاعت اور ان کا اتباع کرو، جو کچھ یہ حلال کہیں اسے حلال مانو، اور جو کچھ یہ حرام قرار دیں اسے حرام مان لو، اس لیے ان کے قول و عمل میں یہ چھوٹی لغزشیں بھی بہت بڑی تھیں، کیونکہ وہ ایک معمولی بشر کی لغزشیں نہ تھیں، بلکہ اس شارع مجاز کی لغزشیں تھیں جس کی ایک ایک حرکت اور سکون سے قانون بن رہا تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمے لی تھی، کہ اپنے رسول کو ٹھیک راستے پر قائم رکھے گا، ان کو غلطیوں سے محفوظ کر دے گا، اور ان سے ذرا سی چوک بھی ہو جائے تو وحی کے ذریعہ سے ان کی اصلاح فرما دے گا۔ [1]

منکرینِ حدیث کے استدلال اور مولانا مودودیؒ کے استنباط، اُن ہی آیات سے ماخوذ ہیں، جن میں حضور اکرم ﷺ کی چند زلات مذکور ہیں، لیکن دونوں کے استدلالی اور استنباطی نتائج، نہ صرف یہ کہ مختلف ہیں بلکہ باہم برعکس بھی ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ جن آیات سے ایک صالح الفکر اور صحیح العقیدہ شخص، منصبِ رسالت کا عالیشان تصور پاتا ہے، ان ہی آیات سے فاسد ذہنیت اور بداعتقادی کا شکار فرد، پست تصورِ نبوت کو اخذ کرتا ہے۔

نطقِ رسول، وحیِ ربِّ رسول ہے

وحی کی اس بحث میں، اس آیت کی وضاحت سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا، جس میں نطقِ رسول کو وحی قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم-۳ تا ۴) وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو (اس پر نازل) کی جاتی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، جو کچھ لکھا ہے، ایک طرف، تو وہ نطقِ رسولؐ میں، وحی کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے، اور دوسری طرف، مولانائے محترم کی اس بیدار مغزی اور حاضر دماغی کو بھی بے نقاب کر دیتا ہے، جس کے باعث وہ اپنے دور کے گمراہ فرقوں سے نہ صرف یہ کہ باخبر رہا کرتے تھے، بلکہ جہاں ضرورت مقتضی ہوتی، وہ ان کی تردید بھی

[1] بحوالہ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۶

خوب کیا کرتے تھے، جیسا کہ ان کے درج ذیل تفسیری حاشیہ سے واضح ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن باتوں کی وجہ سے تم اس پر یہ الزام لگاتے ہو کہ وہ گمراہ یا بدراہ ہو گیا ہے، وہ اس نے اپنے دل سے نہیں گھڑلی ہیں، نہ ان کے محرک، اس کی اپنی خواہشِ نفس ہے، بلکہ وہ خدا کی طرف سے، اس پر وحی کے ذریعہ سے نازل کی گئی ہیں اور کی جا رہی ہیں، اس کا خود نبی بننے کو جی نہیں چاہا تھا کہ اپنی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے، اس نے دعوائے نبوت کر دیا ہو، بلکہ خدا نے جب وحی کے ذریعہ سے اس کو اس منصب پر مامور کیا تب وہ تمہارے درمیان تبلیغِ رسالت کے لیے اٹھا اور اس نے تم سے کہا کہ میں تمہارے لیے خدا کا نبی ہوں۔ اسی طرح اسلام کی یہ دعوت، توحید کی یہ تعلیم، آخرت اور حشر نشر اور جزائے اعمال کی یہ خبریں، کائنات و انسان کے متعلق یہ حقائق، اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے یہ اصول، جو وہ پیش کر رہا ہے، یہ سب کچھ بھی، اس کا اپنا بنایا ہوا کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ خدا نے وحی کے ذریعہ سے اس کو ان باتوں کا علم عطا کیا ہے۔ اسی طرح یہ قرآن، جو وہ تمہیں سناتا ہے، یہ بھی اس کا اپنا تصنیف کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کا کلام ہے جو وحی کے ذریعہ سے، اس پر نازل ہوتا ہے۔ [1]

رسول کی کن باتوں پر وحی کا اطلاق ہوتا ہے؟

یہ کچھ لکھنے کے بعد، مولانا مودودیؒ، قلوب و اذہان میں پیدا ہونے والے ایک اشکال کو پیش کرتے ہیں اور پھر اس کا تفصیلی جواب دیتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے بارے میں، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ''آپؐ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے بلکہ جو کچھ آپ کہتے ہیں وہ ایک وحی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے''۔ آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلنے والی کن کن باتوں سے متعلق ہے؟ آیا اس کا اطلاق اُن ساری باتوں پر ہوتا ہے جو آپ بولتے تھے، یا بعض باتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور بعض باتوں پر نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے، اس پر تو اس ارشاد کا اطلاق بدرجۂ اولیٰ ہوتا ہے۔ رہیں وہ دوسری باتیں جو قرآن کے علاوہ، آنحضرت ﷺ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوتی تھیں، تو وہ لامحالہ تین ہی قسموں کی ہو سکتی تھیں۔

ایک قسم کی باتیں وہ جو آپؐ تبلیغِ دین اور دعوت الی اللہ کے لیے کرتے تھے، یا قرآن مجید کے مضامین، اس کی تعلیمات اور اس کے احکام و ہدایات کی تشریح کے طور پر کرتے تھے، یا قرآن ہی کے مقصد و مدعا کو پورا کرنے کے لیے وعظ و نصیحت فرماتے اور لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ اُن کے متعلق ظاہر ہے کہ یہ شبہ کرنے کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یہ باتیں معاذ اللہ، آپ اپنے دل سے گھڑتے تھے، ان امور میں تو آپ کی حیثیت درحقیقت، قرآن کے سرکاری ترجمان، اور اللہ تعالیٰ کے نمایندۂ مجاز کی تھی، یہ باتیں اگرچہ اس طرح لفظاً لفظاً آپ پر نازل نہیں کی جاتی تھیں، جس طرح قرآن، آپ پر نازل کیا جاتا تھا، مگر یہ لازماً تھیں، اس علم پر مبنی جو وحی کے ذریعہ سے آپ کو دیا گیا تھا، ان میں اور قرآن میں فرق صرف یہ تھا کہ قرآن کے الفاظ اور معانی سب کچھ اللہ کی طرف سے تھے، اور ان دوسری باتوں میں معانی و مطلب وہ تھے جو اللہ نے آپ کو سکھائے تھے اور ان کو ادا، آپ، اپنے الفاظ میں کرتے تھے، اسی فرق کی بناء پر قرآن کو وحیِ جلی، اور آپ کے ان دوسرے ارشادات کو وحیِ خفی کہا جاتا ہے۔

دوسری قسم کی باتیں وہ تھیں جو آپ اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد اور اقامتِ دین کی خدمات کے سلسلے میں کرتے تھے۔ اس

[1] تفہیم القرآن، جلد ۵، صفحہ ۱۹۳

کام میں آپؐ کو مسلمانوں کی جماعت کے قائد و رہنما کی حیثیت سے مختلف نوعیت کے بیشمار فرائض انجام دینے ہوتے تھے جن میں بسا اوقات، آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ بھی لیا ہے، اپنی رائے چھوڑ کر اُنکی رائے بھی مانی ہے، ان کے دریافت کرنے پر کبھی کبھی یہ صراحت بھی فرمائی کہ یہ بات میں، خدا کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی رائے کے طور پر کہہ رہا ہوں، اور متعدد بار ایسا بھی ہوا ہے کہ آپؐ نے اپنے اجتہاد سے کوئی بات کی ہے اور بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اس کے خلاف ہدایت آ گئی ہے۔ اس نوعیت کی جتنی باتیں بھی، آپؐ نے کی ہیں، ان میں سے بھی کوئی ایسی نہ تھی اور قطعاً نہ ہوسکتی تھی جو خواہش نفس پر مبنی ہو۔ رہا یہ سوال کہ کیا وہ وحی پر مبنی تھیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بجز اُن باتوں کے، جن میں آپؐ نے خود تصریح فرمائی ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے نہیں ہیں، یا جن میں آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ طلب فرمایا ہے اور ان کی رائے قبول فرمائی ہے، یا جن میں آپؐ سے کوئی قول و فعل صادر ہونے کے بعد، اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف، ہدایت نازل فرمادی ہے، باقی تمام باتیں، اسی طرح وحی خفی پر مبنی تھیں جس طرح پہلی نوعیت کی باتیں، اس لیے کہ دعوتِ اسلامی کے قائد اور رہنما اور جماعت مومنین کے سردار اور حکومت اسلامی کے فرمانروا کا جو منصب آپؐ کو حاصل تھا، وہ آپؐ کا خود ساختہ یا لوگوں کا عطا کردہ نہ تھا، بلکہ اس پر آپؐ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے تھے اور اس منصب کے فرائض کی ادائیگی میں آپؐ جو کچھ کہتے اور کرتے تھے، اُس میں آپؐ کی حیثیت، مرضیٔ الٰہی کے نمائندہ کی تھی، اس معاملے میں آپؐ نے جو باتیں، اپنے اجتہاد سے کی ہیں، ان میں بھی آپؐ کا اجتہاد، اللہ کو پسند تھا، اور علم کی اس روشنی سے ماخوذ تھا جو اللہ نے آپؐ کو دی تھی، اسی لیے جہاں آپؐ کا اجتہاد، ذرا بھی، اللہ کی پسند سے ہٹا ہوا ہے وہاں فوراً وحی جلی سے، اس کی اصلاح کردی گئی ہے، آپؐ کے بعض اجتہادات کی یہ اصلاح، بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ کے باقی تمام اجتہادات، عین مرضیٔ الٰہی کے مطابق تھے۔

تیسری قسم کی باتیں وہ تھیں، جو آپؐ، ایک انسان ہونے کی حیثیت سے زندگی کے عام معاملات میں کرتے تھے، جن کا تعلق فرائضِ نبوت سے نہ تھا، جو آپؐ نبی ہونے سے پہلے بھی کرتے تھے، اور نبی ہونے کے بعد بھی کرتے رہے، اس نوعیت کی باتوں کے متعلق، سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے بارے میں کفار سے کوئی جھگڑا نہ تھا، کفار نے ان کی بناء پر آپؐ کو گمراہ اور بدراہ نہیں کہا تھا، بلکہ پہلی دو قسم کی باتوں پر وہ یہ الزام لگاتے تھے، اس لیے وہ سرے سے زیر بحث ہی نہ تھیں، کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں یہ آیت ارشاد فرماتا، لیکن اس مقام پر، ان کے خارج از بحث ہونے کے باوجود، یہ امرِ واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کوئی بات اپنی زندگی کے اس نجی پہلو میں بھی کبھی خلافِ حق نہیں نکلتی تھی، بلکہ ہر وقت، ہر حال میں، آپؐ کے اقوال و افعال، اُن حدود کے اندر محدود رہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبرانہ اور متقیانہ زندگی کے لیے آپؐ کو بتادی تھیں، اس لیے درحقیقت وحی کا نور ان میں بھی کارفرما تھا۔ یہی بات ہے جو بعض صحیح احادیث سے رسول اللہ ﷺ سے منقول ہوئی ہے، مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا لَا اَقُولُ اِلَّا حَقًّا ''میں کبھی حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا'' کسی صحابیؓ نے عرض کیا کہ فَاِنَّکَ تُدَاعِبُنَا یَا رَسُولَ اللہ ''یارسول اللہ! کبھی کبھی، آپؐ، ہم لوگوں سے ہنسی مذاق بھی تو کر لیتے ہیں'' فرمایا اِنِّی لَا اَقُولُ اِلَّا حَقًّا ''فی الواقع میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا''۔ مسند احمد اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں جو کچھ بھی رسول

اللہ ﷺ کی زبان سے سنتا تھا، وہ لکھ لیا کرتا تھا، تا کہ اسے محفوظ کرلوں، قریش کے لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا اور کہنے لگے کہ تم ہر بات لکھتے چلے جاتے ہو حالانکہ رسول اللہ ﷺ انسان ہیں، کبھی غصے میں بھی کوئی بات فرما دیتے ہیں۔ اس پر میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ بعد میں اس کا ذکر، میں نے حضور ﷺ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا اُكْتُبْ فَوَالَّذِىْ نَفْسِى بِيَدِهٖ مَاخَرَجَ مِنِّى اِلَّا الحَقُّ ''تم لکھتے جاؤ، اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میری زبان سے، کبھی کوئی بات، حق کے سوا نہیں نکلی''۔ ؎

مولانا مودودیؒ کی یہ مفصل عبارت، ایک جویائے حق کے لیے راہِ صواب اور جادۂ ہدایت کو کھول دیتی ہے، اور اُس قلبِ مخلص کے شکوک وشبہات کا ازالہ کر دیتی ہے، جو ہر قسم کے ضد، تعصب اور عناد سے کنارہ کش ہو کر، واقعی اطاعتِ رسول پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ رہا وہ شخص جو اپنے یک رخے مطالعے کی بنا پر، اس حد تک گمراہ ہو چکا ہے کہ اپنی اس گمراہی پر اصرار، ضد اور تعصّب کے سبب، وہ فاستحبوا العمیٰ علی الھدی کا مصداق بن چکا ہو تو اس کے لیے آفتابِ نصف النہار کی روشنی بھی بیکار ہے۔

آنکھیں اگر ہوں بند تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں بھلا قصور کیا ہے آفتاب کا

مبحث ثانی: منصبِ نبوت ورسالت

وحی کی حقیقت واقسام پر مشتمل مبحث کے بعد، دوسرا اہم مبحث، منصبِ نبوت ورسالت کا تصور ہے جس کی حقیقت سے بے خبری، نہ صرف یہ کہ فسادِ عقیدہ وایمان پیدا کرتی ہے بلکہ زندگی کے عملی رویئے میں بھی اسلام سے بُعد پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ منکرین حدیث اور علمائے ملتِ اسلامیہ کے مابین، حقیقی اختلاف، دراصل، منصبِ رسالت ہی کے تصور کا اختلاف ہے، باقی جتنے بھی اختلافات، ان دونوں گروہوں میں پائے جاتے ہیں، وہ سب درحقیقت، اسی اصولی اور بنیادی اختلاف ہی سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں، اس لیے اس موضوع پر، قرآن کریم کی روشنی میں، اظہارِ حقیقت بہت ضروری ہے۔

منکرین حدیث کا تصورِ نبوت ورسالت

ان لوگوں کے نزدیک، نبوت ورسالت کی حقیقت، اس کے سوا کچھ نہیں کہ ''خدا سے وحی پانا'' نبوت ہے، اور پھر اسے ''بندوں تک پہنچا دینا'' رسالت ہے، اس کے بعد، رسول، کلمۂ خدا کو بلند وبالا کر دینے کے لیے، اور کلمۂ کفر کو نیچا دکھانے کے لیے، جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ بحیثیت رسول نہیں بلکہ بحیثیتِ بشر کرتا ہے، چنانچہ پرویز صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی نبوی اور بشری حیثیت میں، نمایاں طور پر فرق کیا ہے، نبی کی حیثیت سے آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، جس میں آپ کی اپنی مرضی، یا خیال یا خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کے بعد، آپ جو کچھ فرماتے یا فیصلے

؎ تفہیم القرآن، جلد ۵، صفحہ ۱۹۳ تا صفحہ ۱۹۵

کرتے، وہ آپؐ کی بشری حیثیت سے تھا جس میں اجتہادی سہو کا امکان تھا۔ [1]

لیکن نبوت و رسالت کا یہ تصور، کہ حضور اکرم ﷺ، صرف ''وحی پانے'' کی حد تک نبی تھے، اور اسے ''لوگوں کو پہنچا دینے'' کی حد تک رسول تھے، اس کے بعد، اُن کی حیثیتِ نبوت و رسالت، ختم یا کم از کم معطل ہو جاتی تھی اور آپ محض ایک فردِ بشر ہو کر رہ جاتے تھے، تاوقتیکہ دوبارہ ''وحی پانے'' اور ''اسے معاشرہ تک پہنچانے'' کی نوبت آ جاتی اور آپ کی حیثیت نبوت ورسالت پھر سے بحال ہو جاتی، ایک قطعی غلط تصور ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نبی کا منصب اور رسول کا مقام، محض ایک ڈاکیے کا سا مقام و منصب ہے جس کا کام، (اللہ تعالیٰ سے) ڈاک وصول کر کے بندوں تک پہنچا دینے کی حد تک ہی محدود ہے، رسول کی حیثیت گویا، اس ریڈیو سیٹ سے مختلف نہیں ہے، جو جب چل رہا (On) ہو، تو وہ واقعی ریڈیو ہو، لیکن جب بند (Off) ہو، تو محض، ایک ڈبہ ہی ہو۔ منکرین حدیث کے نزدیک (خواہ وہ دورِ حاضر کے ہوں یا دورِ ماضی کے) نبوت و رسالت کا یہی تصور ہے، جو ان کے مسلکِ انکارِ حدیث کے ساتھ میل کھاتا ہے، ایک زمانہ تھا، جب پرویز صاحب، یا تو اس مسلک سے فی الواقع الگ تھلگ تھے، یا وہ بر بنائے مصلحت، اپنے مسلک کو چھپائے ہوئے تھے، اور قائلین سنت میں اپنا اعتبار و اعتماد قائم کرنے کے لیے اس بات پر مجبور تھے، کہ اُس زمانے کے منکرینِ حدیث کی تردید میں، یہ کہہ دیں کہ

> رسول کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہی نہیں (جیسے چٹھی رساں کے ذمے چٹھی پہنچا دینا ہوتا ہے) بلکہ وہ اس تعلیم خداوندی کا عملی پیکر ہوتا ہے اور یوں انسانوں کو بتاتا ہے کہ وہ تعلیم ناممکن العمل نہیں۔ منصب رسالت کے مختلف گوشوں اور رسول کی متنوع حیثیتوں کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئے گا، اس مقام پر صرف اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ رسول کی حیثیت محض آلۂ ابلاغ کی نہیں ہوتی کہ وہ (معاذ اللہ) ریڈیو سیٹ کی طرح محطۂ نشر الصوت (Broadcasting Station) سے نشر شدہ پیغام کو فضا کی لہروں سے اخذ کر کے سامعین تک پہنچا دیتا ہے، اور اس کے بعد، لکڑی کا ایک ڈبہ رہ جاتا ہے، ایسا تصور، منصبِ رسالت اور مقام نبوت سے انتہائی بے بصری کا ثبوت ہے۔ [2]

لیکن، آج، خود پرویز صاحب کا بھی، اور دیگر منکرین حدیث کا بھی یہی تصورِ نبوت و رسالت ہے، جسے کل تک ''مقام نبوت و رسالت سے انتہائی بے بصری کا ثبوت'' قرار دیا جاتا تھا۔ آج وہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو، شارحِ قرآن، معلّمِ قرآن، معلّمِ حکمت، مربّی و مزکّی، قائد و رہنمائے جماعتِ مسلمین، منصفِ عدالت اور فرمانروائے ریاست مانتے بھی ہیں تو مامور من اللہ ہونے کی بناء پر، نہیں مانتے، اور ان تمام حیثیتوں سے وقوع پذیر ہونے والی کارکردگی کو بحیثیتِ رسول تسلیم نہیں کرتے بلکہ بحیثیتِ بشر تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ خود، پرویز صاحب نے ایک مقام پر لکھا ہے۔

> رسول کا فریضہ، وحیٔ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ خود اس پر عمل کرتا ہے اور ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں وحی کی یہ تعلیم، ایک عملی نظام بن کر سامنے آتی ہے، اس کے لیے اسے سخت ترین مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۳

[2] معارف القرآن، جلد ۲، صفحہ ۳۰۹

ہے، بیسیوں لڑائیاں لڑنی پڑتی ہیں، پھر جب یہ نظام متشکل ہو جاتا ہے تو اسے وہ تمام امور سرانجام دینے ہوتے ہیں جو ایک مملکت کے سربراہ کے فرائض کہلاتے ہیں، وہ یہ تمام امور ایک سربراہ کی حیثیت سے انجام دیتا ہے اور اس میں اپنے حسنِ تدبر، اور سیرت و کردار کا ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جسے شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کہا جائے، جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ رسول یہ سب کچھ ایک انسان کی حیثیت سے کرتا ہے۔ [۱]

اور اسی نظریہ کو قدرے زیادہ واضح انداز میں، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے، سنت کی آئینی حیثیت پر، مولانا مودودیؒ سے اپنے قلمی مناظرہ کے دوران، ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

مجھے آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ حضور ﷺ معلم بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی۔ آپ نے افراد کی تربیت کی اور تربیت یافتہ افراد کی جماعت کو منظم جماعت کی شکل دی اور پھر ایک ریاست قائم کی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں کہ ''تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں حضور ﷺ نے جو کچھ کیا، یہ وہ سنت ہے، جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل کرتی ہے۔'' [۲]

اور اس سے ذرا آگے چل کر، ڈاکٹر صاحب، مولانا مودودیؒ کا ایک سوال نقل کرتے ہوئے، اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

آپ کا اگلا سوال یہ ہے کہ جو کام، حضور ﷺ نے تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں سرانجام دیئے، ان میں آنحضرت کی پوزیشن کیا تھی؟ میرا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جو کچھ کر کے دکھایا وہ ایک بشر کی حیثیت سے، لیکن مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مطابق کر کے دکھایا، میرا یہ جواب کہ حضور ﷺ کے فرائضِ رسالت کی سرانجام دہی، ایک بشر کی حیثیت سے تھی، میرے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں، بلکہ خود کتاب اللہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، حضور ﷺ نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ قرآن کی آیات سے واضح ہے کہ حضور ﷺ نظام مملکت کی انجام دہی میں ایک بشر کی حیثیت رکھتے تھے۔ [۳]

اس تصوّر پر تنقیدِ مودودیؒ

ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے اس موقف پر، (جو تنہا اُن ہی کا ذاتی موقف نہیں ہے، بلکہ جملہ منکرین حدیث کا متفقہ موقف ہے) مولانا مودودیؒ نے تنقید کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ

یہ سو فیصد اتفاق، جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، دراصل ایک فیصدی، بلکہ ۱/۱۰۰۰ فی صد بھی نہیں ہے، اس لیے کہ آپ نے حضور ﷺ کو محض معلم، حاکم اور قاضی وغیرہ مانا ہے، مامور من اللہ کی لازمی صفت کے ساتھ نہیں مانا ہے، حالانکہ سارا فرق، اسی صفت کے ماننے اور نہ ماننے سے واقع ہوتا ہے، آگے چل کر آپ نے خود یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کے نزدیک، نبی ﷺ کے یہ سارے کام، رسول کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت میں تھے اور اسی وجہ سے اس حیثیت میں، آپ نے جو کام کیا ہے، اسے آپ وہ سنت نہیں مانتے جو ماخذ قانون ہو، دوسرے الفاظ میں، آنحضور ﷺ، آپ کے نزدیک

۱۔ طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲۶ ۲۔ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۶۴ ۳۔ سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۶۸

ایک معلّم تھے، مگر خدا کے مقرر کردہ نہیں بلکہ جیسے دنیا میں اور استاد ہوتے ہیں ویسے ہی ایک، حضور ﷺ بھی تھے، اسی طرح آپ قاضی تھے، مگر خدا نے آپؐ کو اپنی طرف سے قاضی مقرر نہیں کیا تھا، بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح، ایک جج یا مجسٹریٹ آپؐ بھی تھے، یہی پوزیشن، حاکم اور مزکی اور قائد و رہنما کے معاملہ میں بھی آپ نے اختیار کی ہے کہ ان میں سے کوئی منصب بھی، آپ کے خیال میں، نبی ﷺ کو مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے حاصل نہ تھا۔ [1]

منکرین حدیث سے مولانا مودودی کے دو فیصلہ کن سوالات

اس کے بعد، مولانا مودودیؒ، منکرینِ حدیث کے قلمی مناظر، جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے سامنے دو سوال پیش کرتے ہیں، جس سے منکرین حدیث کے موقف کی کمزوری بلکہ لغویت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ پھر یہ مناصب، حضور ﷺ کو حاصل کیسے ہوئے؟ کیا مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں نے باختیار خود، آپؐ کو اپنا لیڈر منتخب کیا تھا اور اس قیادت کے منصب سے وہ آپؐ کو ہٹا دینے کے بھی مجاز تھے؟ کیا مدینہ پہنچ کر، جب اسلامی ریاست کی بناء ڈالی گئی، اس وقت انصار و مہاجرین نے کوئی مجلسِ مشاورت منعقد کر کے یہ طے کیا تھا کہ محمد ﷺ، ہماری اس ریاست کے صدر اور قاضی اور افواج کے قائد اعلیٰ ہوں گے؟ کیا حضور ﷺ کی موجودگی میں کوئی دوسرا مسلمان بھی، ان مناصب کے لیے منتخب ہو سکتا تھا؟ اور کیا مسلمان، اس کے مجاز تھے کہ آپؐ سے یہ سب مناصب، یا ان میں سے کوئی منصب واپس لے کر، باہمی مشورے سے کسی اور کو سونپ دیتے؟ پھر کیا یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینے کی اس ریاست کے لیے، قرآن کے تحت تفصیلی قوانین اور ضابطے بنانے کی غرض سے کوئی لیجسلیچر، حضور ﷺ کے زمانہ میں قائم کی گئی تھی جس میں آپؐ، صحابہ کے مشورہ سے، قرآن کا منشا معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہوں اور اس مجلس کی رائے سے قرآن کا جو مفہوم متعین ہوتا ہو، اس کے مطابق ملکی قوانین بنائے جاتے ہوں؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو براہ کرم اس کا کوئی تاریخی ثبوت ارشاد فرمائیں، اور اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نبی ﷺ، خود رہنما، فرمانروا، قاضی، شارع اور قائد اعلیٰ بن بیٹھے تھے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ کی جو حیثیت آپ قرار دے رہے ہیں کیا قرآن بھی، آپ کی وہ حیثیت قرار دیتا ہے؟ [2]

منصب نبوت اور اس کے فرائض از روئے قرآن

منکرین حدیث کی اُس حیثیت کے مقابلے میں، جو انھوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دے رکھی ہے، قرآن، آپؐ کے منصبِ رسالت اور پیغمبرانہ فرائض کو اور ہی انداز میں پیش کرتا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) رسول بحیثیت معلّم و مزکّی

قرآن کریم میں چار مقامات پر، نبی اکرم ﷺ کے منصب رسالت کی یہ تفصیل، بایں الفاظ بیان کی گئی ہے۔

(۱) --- وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ .... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۷۲ تا صفحہ ۷۳ [2] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۷۳ تا صفحہ ۷۴

عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (البقرہ - ۱۲۹) اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ، اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے، (انھوں نے دعا کی) ...... اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں خود انھی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انھیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اُن کا تزکیہ کرے۔

(۲) --- كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ - ۱۵۱) جس طرح ہم نے تمہارے اندر، خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

(۳) --- لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران - ۱۶۴) اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر، خود ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انھیں، اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

(۴) --- هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعۃ - ۲) وہی تو ہے جس نے امّیوں کے درمیان، خود انھی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں منصب رسالت کے چار فرائض بیان کیے گئے ہیں، اور انھیں تاکیداً دہرایا گیا ہے۔

ایک، یہ کہ، آپؐ، لوگوں پر قرآن پڑھ کر سنائیں، تلاوتِ آیات کا یہ فریضہ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا میں مذکور ہے۔

دوسرے، یہ کہ، آپؐ، لوگوں کو کتاب (قرآن) کی تعلیم دیں۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ میں اس فریضہ کا ذکر ہے۔

تیسرے یہ کہ، آپؐ، اس کتاب کی منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں وَيُعَلِّمُهُمْ .... الْحِكْمَةَ کے الفاظ اسی پر دال ہیں۔

چوتھے یہ کہ، آپؐ، افراد کا بھی، اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں، یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظامِ اجتماعی کو نشو و نما دیں، اس ذمہ داری کا ذکر يُزَكِّيْهِمْ میں آیا ہے۔

ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم، صرف قرآن کے الفاظ سنا دینے (تلاوتِ قرآن) سے زائد ہی کوئی چیز تھی ورنہ اس کا الگ ذکر کرنا بے معنی تھا، اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے، آپ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے، وہ بھی قرآن کے الفاظ پڑھ کر سُنا دینے سے زائد ہی کچھ تھیں، ورنہ تربیت کی اس الگ خدمت کا بھی ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے۔

اب غور فرمایئے کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ، یہ معلّم اور مربیّ و مزکیّ کے مناصب، جو حضور ﷺ کو حاصل تھے ان پر آپؐ خود فائز

ہو بیٹھے تھے، یا اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کو، ان پر مامور فرمایا تھا؟ کیا قرآن کی ان صاف اور مکرر تصریحات کے بعد، اس کتاب پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص، یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناصب، رسالت کے اجزاء نہ تھے اور آنحضرت ﷺ، ان مناصب کے فرائض اور خدمات، بحیثیتِ رسول نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے، اگر نہیں کہہ سکتا تو بتائیے کہ فریضۂ تلاوتِ قرآن کی ادائیگی سے زائد تر باتیں جو حضور ﷺ نے تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیہ نفس کے پیش نظر کی تھیں، انھیں بحیثیت رسول، منجانب اللہ ماننے اور سند تسلیم کرنے سے انکار، خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

یہی وضاحت بقلم پرویز

یہاں یہ بات، قارئین کرام کے لیے باعثِ دلچسپی بھی ہوگی اور حیرت انگیز بھی، کہ جس زمانے میں، پرویز صاحب، عقیدتاً یا مصلحتاً، احادیث کی دینی حیثیت کے قائل تھے، اُس زمانے میں، وہ خود، سورۃ الجمعہ کی آیت ۲، (جو اوپر درج ہو چکی ہے) کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے، منکرینِ حدیث کے خلاف، یوں استدلال فرمایا کرتے تھے۔

> اس آیت میں، رسولِ اکرم کے منصب رسالت میں، تین بین اور مستقل چیزیں بیان کی گئی ہیں (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیۂ نفس (۳) تعلیم کتاب وحکمت
>
> اگر لِيُبَيِّنَ (تا کہ وہ ظاہر کردے) میں تبیین سے مراد، وحی الٰہی کو لوگوں پر محض ظاہر کر دینا ہے، اگر مَا عَلَى الرَّسُولِ اِلَّا الْبَلَاغ میں، بلاغ کے معنٰی پہنچا دینا (یعنی وضاحت نہ کرنا، بلکہ محض پہنچا دینا) ہی ہیں، تو ظاہر ہے کہ اتنا کام منصب نمبر ۱ (یعنی تلاوتِ آیات) میں پورا ہو گیا، جب رسول نے خدا کی آیات پڑھ کر لوگوں کو سنا دیں تو مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (جو کچھ ان کی طرف بھیجا گیا ہے) کا اظہار (بقول معترضین، تبیین) ہو گیا، تو اس کے بعد، جو بھی دو شقیں اور باقی ہیں تو ان سے کیا مطلب ہے، شق نمبر ۲ کو سرِ دست الگ رہنے دیجئے، لیکن شق نمبر ۳ میں ''تعلیم کتاب وحکمت'' تو تلاوت سے علیحدہ چیز ہے، کتاب وحکمت کے واؤ عطف کی بحث میں نہ الجھئے، کہ یہ تفسیری ہے یا فصلی۔ بہر کیف، تلاوتِ آیات اور تعلیمِ کتاب، دو جداگانہ اور مستقل عنوان ہیں، اظہار وابلاغ تو تلاوت میں آ گیا، اس تعلیم کے لیے کیا باقی رہ گیا؟ یہ ہے وہ منصب عظمیٰ، جس کو نظر انداز کر دینے سے، یہ تمام گتھیاں پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی ہیں، ذرا بھی تدبر سے کام لیا جاتا تو یہ حقیقت کھل جاتی کہ اظہار وتبیین میں وہی فرق ہے، جو تلاوت وتعلیم میں ہے، اور یہی تعلیم وتبیین ہی کی ضرورت تھی جس کی وجہ سے رسول بھیجے گئے، اور پھر وہ زبان بھی وہی بولتے تھے، جو ان لوگوں کی تھی جن میں وہ مبعوث ہوتے تھے، کفار کا یہی اعتراض تھا کہ رسول، کوئی فرشتہ کیوں نہیں بنایا گیا، جواب ملا،
>
> قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل-۹۵)
>
> کہہ دیجئے، اگر زمین میں فرشتے رہتے ہوتے اور اس میں چلتے بستے، تو ہم ان پر آسمان سے فرشتے رسول بنا کر بھیجتے۔
>
> ورنہ اگر غور وفکر اور ہدایت ونجات کے لیے، کتاب کی آیات ہی کافی ہوتیں، تو کتاب، کسی پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دی جاتی، عوام کے دلوں میں القاء کر دی جاتی، (جیسا کہ وہ اکثر اعتراض بھی کیا کرتے تھے، کہ ہم پر وحی کیوں نہیں بھیجی جاتی) لیکن اس علیم وحکیم کو خوب علم تھا کہ تعلیم بلا عمل اور کتاب بلا رسول ناقص رہ جاتی ہے، یہی ضرورت تھی جس کے پورا کرنے کے لیے فرمایا

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ تمہارے لیے رسول خدا (کی زندگی) میں عمدہ نمونہ ہے۔ [1]

نیرنگیٔ زمانہ دیکھئے کہ کل تک پرویز صاحب، جو بات، جس استدلال کے ساتھ، منکرین حدیث کو سمجھا رہے تھے، آج، مولانا مودودیؒ، وہی بات، اُسی استدلال کے ساتھ، خود پرویز صاحب کو سمجھا رہے ہیں، کیونکہ آج نہ صرف یہ کہ پرویز صاحب، خود منکر حدیث ہیں بلکہ اس فرقۂ ضالّہ کے پیشوا بھی ہیں۔

(۲) رسول بحیثیت شارح کتاب اللہ

رسول خدا ہونے کی حیثیت سے آپ کا منصب، صرف معلم کتاب وحکمت اور مزکیٔ نفوس انسانیہ ہی نہ تھا بلکہ آپ شارحِ قرآن بھی تھے جیسا کہ سورہ نحل میں ارشاد ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ (النحل - ۴۴) اور (اے نبی!) یہ ذکر ہم نے تیری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے اس تعلیم کو واضح کردو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے سپرد، یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ، جو احکام و ہدایات دے، اُن کی آپؐ توضیح وتشریح فرمائیں، ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی، کم از کم، اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی کتاب کی توضیح وتشریح محض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ تشریح کرنے والا، اُس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا، کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے، اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح، عملی مظاہرہ (Practical Demonstration) کر کے بتاتا ہے کہ مصنف کا منشا، اس طرح عمل کرنا ہے، یہ نہ ہو تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پوچھنے والے کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا، کسی طفلِ مکتب کے نزدیک بھی، تشریح وتوضیح قرار نہیں پا سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے، نبی ﷺ، شارحِ قرآن، اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپؐ کو شارح مقرر کیا تھا؟ یہاں تو اللہ تعالیٰ، اپنے رسول پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسول، اپنے قول وعمل سے، اس کا مطلب واضح کرے، پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارحِ قرآن کی حیثیت سے، آپؐ کے منصب کو، رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے، اور آپؐ کے پہنچائے ہوئے الفاظِ قرآن کو لے کر، آپ کی شرح وتفسیر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ انکار، خود رسالت کا انکار نہ ہوگا؟

صاحب تفہیم القرآن کا نہایت جامع اور گرانقدر حاشیہ

اسی آیت کی تفسیر میں، مولانا مودودیؒ نے نہایت جامع، موثر اور قیمتی حاشیہ بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

یہ آیت، جس طرح، اُن منکرینِ نبوت کی حجت کے لیے قاطع تھی، جو خدا کا ''ذکر'' بشر کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے، اسی طرح، آج یہ ان منکرینِ حدیث کی حجت کے لیے بھی قاطع ہے جو نبی کی توضیح وتشریح کے بغیر، صرف ''ذکر'' کو لے

[1] معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۷۸ تا صفحہ ۲۷۹

لینا چاہتے ہیں، وہ خواہ اس بات کے قائل ہوں کہ نبیؐ نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی تھی، صرف ذکر پیش کر دیا تھا، یا اس کے قائل ہوں کہ ماننے کے لائق صرف ذکر ہے، نہ کہ نبیؐ کی تشریح۔ یا اس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لیے صرف ذکر کافی ہے، نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابل اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے، نبی کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی، یا باقی ہے بھی، تو بھروسے کے لائق نہیں ہے، غرض ان چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں، ان کا مسلک بہر حال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔

اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ نے اس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے یا براہ راست لوگوں تک پہنچانے کی بجائے، اسے واسطۂ تبلیغ بنایا گیا تھا۔

اور اگر وہ دوسری یا تیسری بات کے قائل ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں نے معاذ اللہ یہ فضول حرکت کی کہ اپنا ''ذکر'' ایک نبیؐ کے ذریعہ سے بھیجا، کیونکہ نبیؐ کی آمد کا حاصل بھی وہی ہے جو نبیؐ کے بغیر، صرف ذکر کے مطبوعہ شکل میں نازل ہو جانے کا ہو سکتا تھا۔

اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل، یہ قرآن اور نبوتِ محمدی، دونوں کے نسخ کا اعلان ہے جس کے بعد اگر کوئی مسلکِ معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف، ان لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نئی نبوت اور نئی وحی کے قائل ہیں، اس لیے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ، خود قرآن مجید کے مقصدِ نزول کی تکمیل کے لیے نبیؐ کی تشریح کو ناگزیر ٹھہراتا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرینِ حدیث کا یہ قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح و تشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھلے ہوئے ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ کہ نمونۂ اتباع کی حیثیت سے نبوتِ محمدی ختم ہو گئی اور ہمارا تعلق محمد ﷺ کے ساتھ صرف اُس طرح کا رہ گیا جیسا ہود اور صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں، مگر اُن کا کوئی اسوہ ہمارے پاس نہیں ہے، جس کا ہم اتباع کریں، یہ چیز نئی نبوت کی ضرورت، آپ سے آپ ثابت کر دیتی ہے، صرف ایک بیوقوف ہی، اس کے بعد، ختم نبوت پر اصرار کر سکتا ہے، دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن، نبی کی تشریح و تبیین کے بغیر، خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لیے ناکافی ہے، اس لیے قرآن کے ماننے والے، خواہ کتنے ہی زور سے چیخ چیخ کر، اسے بجائے خود کافی قرار دیں، مدعی سُست کی حمایت میں، گواہانِ چست کی بات ہرگز نہیں چل سکتی، اور ایک نئی کتاب کے نزول کی ضرورت، آپ سے آپ، خود قرآن کی رو سے ثابت ہو جاتی ہے قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ۔ اس طرح یہ لوگ حقیقت میں، انکار حدیث کے ذریعے سے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔ [1]

(۳) رسول بحیثیت پیشوا و نمونۂ تقلید

پیغمبر خدا، من حیث الرسول، لوگوں کا متبوع اور مطاع ہوا کرتا ہے، اس کی زندگی، نمونۂ پیروی ہوا کرتی ہے تا کہ لوگ، اُسکے اسوہ کے مطابق خود کو ڈھالے رکھیں۔ قرآن، اس حقیقت کو متعدد مقامات پر پیش کر دیتا ہے، لیکن ہم صرف دو آیات پر اکتفاء کر رہے ہیں۔

[1] تفہیم القرآن، جلد ۲، صفحہ ۵۴۳ تا صفحہ ۵۴۵

(۱) --- قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ...... قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران-۳۱ تا ۳۲) (اے نبی) کہو، اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا ...... کہہ دیجیے کہ اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) --- لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (الاحزاب-۲۱) تمہارے لیے، اللہ کے رسول میں، ایک نمونۂ تقلید ہے، ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

ان دونوں آیات میں، خود اللہ تعالیٰ، اپنے رسولؐ کو پیشوا مقرر کر رہا ہے، ان کی پیروی کا حکم دے رہا ہے، اُن کی زندگی کو نمونۂ تقلید قرار دے رہا ہے اور صاف فرما رہا ہے کہ یہ روش اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، میری محبت تمہیں اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اس سے منہ موڑنا کفر ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور ﷺ، رہنما اور لیڈر خود بن بیٹھے تھے؟ یا مسلمانوں نے آپؐ کو منتخب کیا تھا؟ یا اللہ نے اس منصب پر آپؐ کو مامور کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضور ﷺ کو مامور من اللہ رہنما اور پیشوا قرار دے رہے ہیں، تو پھر آپؐ کی پیروی اور آپؐ کے نمونۂ زندگی کی تقلید سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں، یہ کہنا، سراسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے، اگر یہ مراد ہوتی تو فَاتَّبِعُوا الْقُراٰنَ فرمایا جاتا، نہ کہ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔ اور پھر اس صورت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اسوہ حسنہ کہنے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔

اسوہ حسنہ کی وضاحت از قلم پرویز

جس دور میں، پرویز صاحب، از روئے عقیدہ یا از روئے مصلحت، حدیث کی حجیت کا دم بھرتے ہوئے، منکرینِ حدیث کے خلاف لکھا کرتے تھے، اس دور میں، سورۂ احزاب کی آیت ۲۱ میں واقع، مرکب توصیفی أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کے متعلق، انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ

> قرآن کریم میں صرف دو ہستیوں کے اسوۂ مقدسہ کو مسلمانوں کے لیے بطور نمونہ کے پیش کیا گیا ہے، ایک تو خود نبی اکرمؐ اور دوسرے حضرت ابراہیم (اور ان کے ساتھی۔ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ممتحنہ ۵-۶) ظاہر ہے کہ صحف ابراہیمی مسلمانوں کے پاس موجود نہیں، سو اگر اسوہ کا مطلب، کتاب کی تعلیم ہی ہوتا، تو اسوۂ ابراہیمی، آج کہاں سے لیا جاتا، لیکن قرآن کریم نے صحف ابراہیمی کے الفاظ کو کہیں نہیں دہرایا، بلکہ ان کے اُن اعمالِ حیات کا بوضاحت ذکر کیا ہے، جن کی بناء پر وہ امت مسلمہ کے امام اور ملت حنیفہ کے قائد اعظم قرار دیے گئے ہیں، سو اس سے ظاہر ہے کہ کتاب کے حروف، اسوہ نہیں بن سکتے، بلکہ نقوشِ قدم ہی اسوہ ہو سکتے ہیں، اور یہی وہ نقوش ہیں جو اپنی آغوش میں رموز و اسرار کی ہزار داستانیں پنہاں رکھتے ہیں۔ ولِلّٰہ درّ ما قَال شعر:-
>
> جہاں کا ہو قصد آپ جائیں، مگر نہ ان کو مٹاتے جائیں کہ صاحبانِ جنوں سے باتیں ہزار یہ نقشِ پا کریں گے [1]

---

[1] معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۷۹

(۴) رسول بحیثیت شارع

بحیثیتِ رسول، نبی اکرم ﷺ کی متعدد اور متنوع حیثیتوں میں سے ایک اہم حیثیت، شارع کی بھی ہے، سورۂ اعراف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف - ۱۵۷) وہ (رسولؐ) اُن کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے، اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو تشریعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کیے ہیں، اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے، بلکہ جو کچھ نبی ﷺ نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور ﷺ نے حکم دیا ہے، یا جس چیز سے منع کیا ہے، وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے، اس لیے وہ بھی قانونِ خداوندی کا ایک حصہ ہے، یہی بات سورۂ حشر میں اس صراحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے۔

وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الحشر-۷) جو کچھ رسول تمہیں دے، اسے لے لو اور جس چیز سے منع کرے، اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سے کسی کی یہ تاویل نہیں کی جاسکتی کہ ان میں قرآن کے امر و نہی اور قرآن کی تحلیل و تحریم کا ذکر ہے۔ یہ تاویل نہیں، بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہوگی، اللہ نے تو یہاں امر و نہی اور تحلیل و تحریم کو رسول کا فعل قرار دیا ہے، نہ کہ قرآن کا۔ پھر کیا کوئی شخص، اللہ میاں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہوگئی، آپ بھولے سے قرآن کی بجائے، رسول کا نام لے گئے؟

(۵) رسول بحیثیت قاضی

قرآن میں، ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر، اللہ تعالیٰ، اس امر کی تصریح فرماتا ہے کہ اس نے اپنے نبیؐ کو قاضی مقرر کیا ہے، چند آیات ملاحظہ فرمایئے:

(۱) --- إِنَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَاكَ اللّٰهُ (النساء-۱۰۵) (اے نبیؐ!) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم، لوگوں کے درمیان، اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو۔

(۲) --- وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (الشوریٰ-۱۵) اور (اے نبی!) کہہ دیجئے کہ

میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر، جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

(۳) ---إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (النور-۵۱) اہل ایمان کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ، اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

(۴) --- وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا (النساء-٦١) اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ آؤ، اللہ کی نازل کردہ کتاب اور رسول کی طرف، تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے کنی کتراتے ہیں۔

(۵) ---فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء-٦۵) پس (اے نبیؐ!) تیرے رب کی قسم، وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے، جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنیوالا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے، اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی نہ پائیں اور اسے بسر و چشم قبول کرلیں۔

یہ تمام آیتیں، اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی ﷺ خود ساختہ یا مسلمانوں کی طرف سے مقرر کیے ہوئے جج نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے جج تھے، تیسری آیت یہ بتا رہی ہے کہ آپ کی جج ہونے کی حیثیت، رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی، بلکہ رسول ہی کی حیثیت سے آپ جج بھی تھے، اور ایک مومن کا ایمان بالرسالت، اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ آپ کی اس حیثیت کے آگے بھی سمع و طاعت کا رویہ نہ اختیار کرلے، چوتھی آیت میں مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اور رسول، دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دو مستقل مرجع ہیں، ایک مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ، قانون کی حیثیت سے، اور دوسرے رسولؐ، جج کی حیثیت سے، اور ان دونوں سے منہ موڑنا، منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ آخری آیت میں بالکل بے لاگ طریقے سے کہہ دیا گیا ہے کہ رسولؐ کو، جو شخص، جج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا، وہ مومن ہی نہیں ہے، حتی کہ اگر رسول کے دیئے ہوئے فیصلے پر، کوئی شخص، اپنے دل میں بھی تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے، کیا قرآن کی ان تصریحات کے بعد بھی آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضور ﷺ، رسول کی حیثیت سے قاضی نہ تھے، بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح، آپ بھی ایک جج اور مجسٹریٹ تھے، اس لیے ان کے فیصلوں کی طرح، حضور ﷺ کے فیصلے بھی ماخذ قانون نہیں بن سکتے؟ کیا دنیا کے کسی جج کی یہ حیثیت ہوسکتی ہے کہ اس کا فیصلہ اگر کوئی نہ مانے، یا اس پر تنقید کرے، یا اپنے دل میں ہی اسے غلط سمجھے، تو اُس کا ایمان ہی سلب ہو جائے؟

سچی بات بقلم پرویز درزمانہ ماضی

پرویز صاحب، اپنی زندگی کے اُس دور میں، جس میں وہ اپنے مخلصانہ اعتقاد کی بناء پر، یا کسی مصلحتِ فقیہانہ کی اساس

پر، حجیتِ حدیث کے قائل تھے، نبی اکرم ﷺ کی منصفانہ حیثیت کو اُسی طرح تسلیم کیا کرتے تھے جس طرح پوری امت تسلیم کرتی چلی آ رہی ہے چنانچہ وہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ

> امیر کی اطاعت میں تنازعہ اور اختلاف کا امکان ہے لیکن سارے قرآن پر نظر دوڑائیے کسی ایک جگہ بھی نہیں پائیں گے کہ اگر تم میں اور رسول میں کبھی تنازعہ ہو جائے، کبھی اختلاف پیدا ہو جائے، تو اس کے لیے خدا کی طرف رجوع کرو، بلکہ رسول کے فیصلے کے متعلق تو ارشاد ہے کہ
>
> فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (سورہ نساء-۶۵) قسم ہے اپنے رب کی، یہ لوگ کبھی صاحب ایمان نہیں ہو سکتے، جب تک آپ کو اپنا حکم نہ بنائیں پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کسی قسم کی کدورت نہ پائیں اور آپ کے حکم کو پوری طرح برضا و رغبت مان لیں۔
>
> یعنی رسول کو اپنے فیصلوں میں حکم بنانا شرط ایمان ہے (یہی معنی رسول پر ایمان لانے کے ہیں) اور پھر جس طرح ایک امیر کے خلاف اپیل ہو سکتی ہے، رسول کا فیصلہ نہ صرف ایسا ہی ہے کہ اس کی کہیں اپیل نہیں بلکہ اس کے تسلیم کرنے کی شرط یہ ہے کہ طوعاً یا کرہاً نہیں بلکہ دل میں بھی کسی قسم کا خیال نہ گزرے اور رضا و رغبت سے ان فیصلوں پر سر تسلیم خم کر دیں، اولی الامر کے فیصلے اور رسول کے فیصلے میں اس سے زیادہ بین فرق اور کیا ہو سکتا ہے یوں سمجھئے کہ امیر ایک عدالتِ ماتحت کی طرح ہے، جس کے فیصلے کی اپیل ہو سکتی ہے لیکن عدالتِ رسول، ایک پریوی کونسل ہے کہ جس کے فیصلے کی پھر کہیں اپیل نہیں، اور یہ بات تو دنیا کی کسی پریوی کونسل کو بھی حاصل نہیں کہ اس کے فیصلے کے خلاف دل میں کوئی خیال پیدا کرنا بھی جرم ہو، لہذا رسول کی اطاعت محض بحیثیت امیر قوم نہیں بلکہ بحیثیت رسول بھی فرض ہے۔ [1]

(۶) رسول بحیثیت حاکم و فرمانروا

قرآن مجید اسی صراحت اور تکرار کے ساتھ، بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے نبی ﷺ، اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم و فرمانروا تھے اور آپ کو یہ منصب بھی، رسولؐ ہی کی حیثیت سے عطا ہوا تھا۔

(۱) --- وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء-۶۴) ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔

(۲) --- مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء - ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

(۳) --- اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح- ۱۰) (اے نبی!) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

(۴) --- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (محمد-۳۳) اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔

[1] معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۸۵

(۵) ---وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِيْنًا (الاحزاب-۳۶)اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ، اللہ اور اس کا رسول کردے تو پھر ان کے لیے، اُس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے، اور جس نے بھی اللہ اور اُسکے رسول کی نافرمانی کی، وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

(۶) ---يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء-۵۹)اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے، تو اس کو پھیر دو، اللہ اور رسول کی طرف، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ آیات، خود بتا رہی ہیں کہ رسول، کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو، یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنایا ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی، اس کے منصبِ رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا رسول ہونا ہی، اللہ کی طرف سے حاکم مطاع ہونا ہے، اس کی اطاعت، عین اللہ کی اطاعت ہے، اس سے بیعت، دراصل، اللہ سے بیعت ہے، اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو، اس کے مقابلے میں، اہل ایمان کو (جن میں ظاہر ہے کہ پوری امت اور اس کے حکمران اور اس کے ''مرکز ملت'' سب شامل ہیں) قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کر چکا ہو، اس میں لوگ خود کوئی فیصلہ کریں۔

ان تمام تصریحات سے بڑھ کر، صاف اور قطعی تصریح، آخری آیت کرتی ہے جس میں یکے بعد دیگرے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے، اللہ کی اطاعت۔

اس کے بعد، رسول کی اطاعت۔

پھر تیسرے درجے میں اولی الامر (یعنی منکرین حدیث کے ''مرکز ملت'') کی اطاعت۔

اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول، اولی الامر میں شامل نہیں ہے بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے، اور اس کا درجہ خدا کے بعد، دوسرے نمبر پر ہے۔

دوسری بات، جو اس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔

تیسری بات، یہ معلوم ہوئی کہ نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع دو ہیں، ایک اللہ، اور دوسرا اس کا رسول۔ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسول کا الگ ذکر محض بے معنیٰ ہوتا۔ پھر جب اللہ کی طرف، رجوع کرنے سے

مراد، کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تو رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہدِ رسالت میں، خود ذاتِ رسول کی طرف، اور اُن کے عہد کے بعد، سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے، بلکہ اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود عہدِ رسالت میں بھی بہت بڑی حد تک سنتِ رسولؐ ہی مرجع تھی، اس لیے کہ نبی ﷺ کے آخری زمانے میں اسلامی حکومت پورے جزیرۂ عرب پر پھیلی ہوئی تھی، دس بارہ لاکھ مربع میل کے اس وسیع و عریض ملک میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر معاملہ کا فیصلہ، براہِ راست، نبی ﷺ سے کرایا جائے، لامحالہ اس زمانے میں بھی، اسلامی حکومت کے گورنروں قاضیوں اور دوسرے حکام کو معاملات کے فیصلے کرنے میں، قرآن کے بعد، جس دوسرے ماخذ قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا تھا وہ سنتِ رسولؐ ہی تھی۔

سنت کا ماخذ قانون ہونے پر امت کا اتفاق

اب اگر منکرین حدیث واقعی قرآن کو مانتے ہیں اور اس کتابِ مقدس کا نام لے کر، خود اپنے من گھڑت نظریات کے معتقد نہیں بنے ہوئے ہیں، تو انھیں خود دیکھ لینا چاہیے کہ قرآن مجید صاف وصریح اور قطعاً غیر مشتبہ الفاظ میں، رسول اللہ ﷺ کو ، خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا معلم، مربیّ، مزکیّ، پیشوا، رہنما، شارحِ کلام اللہ، شارع (Law Giver) قاضی اور حاکم و فرمانروا قرار دے رہا ہے، اور حضور ﷺ کے یہ تمام مناصب، اس کتاب پاک کی رو سے، منصبِ رسالت کے اجزائے لاینفک ہیں، کلام الٰہی کی یہی تصریحات ہیں جن کی بناء پر، صحابہ کرام کے دور سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں نے بالاتفاق یہ مانا ہے کہ مذکورہ بالا تمام حیثیات میں حضور ﷺ نے جو کام کیا ہے وہ قرآن کے بعد دوسرا ماخذ قانون (Source of Law) ہے، جب تک کوئی شخص، انتہائی برخود غلط نہ ہو، وہ اس پندار میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ تمام دنیا کے مسلمان اور ہر زمانے کے سارے مسلمان قرآن پاک کی ان آیات کو سمجھنے میں غلطی کر گئے ہیں، اور ٹھیک مطلب بس اس نے ہی سمجھا ہے کہ حضور ﷺ، صرف قرآن پڑھ کر سنا دینے کی حد تک رسول تھے اور اس کے بعد، آپ کی حیثیت، ایک عام مسلمان کی تھی۔ آخر اس کے ہاتھ وہ کون سی نرالی لغت آ گئی ہے، جس کی مدد سے، قرآن کے الفاظ کا وہ مطلب اس نے سمجھا جو پوری امت کی سمجھ میں کبھی نہ آیا؟

کیا قرآنی قانون نامکمل ہے کہ سنت اس کی تکمیل کرے؟

منکرینِ حدیث، لوگوں کو سنتِ رسولؐ سے بدگمان کرنے کے لیے، یہ مغالطہ آرائی بھی کیا کرتے ہیں کہ جب قرآن بجائے خود ایک مکمل، جامع اور واضح قانون ہے تو پھر سنت کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے، قرآن کے ساتھ، سنت کو بھی آئینی اور قانونی حیثیت دینا، قرآن کو نامکمل قرار دینے کے مترادف ہے، چنانچہ، اس ''مغالطہ'' کو ایک معرکۃ الآراء دلیل کے طور پر، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے یوں پیش کیا تھا۔

مجھے آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ حضور ﷺ معلم بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی تھے، آپ نے افراد کی تربیت

کی اور پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دی اور پھر ایک ریاست قائم کی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں کہ "تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں، حضور ﷺ نے جو کچھ کیا، یہ وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر، حاکمِ اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے، بیشک حضور ﷺ نے حاکمِ اعلیٰ کے قانون کے مطابق، معاشرہ کی تکمیل تو فرمائی لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا اور جو کچھ حضور ﷺ نے عملاً کیا، اس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی، میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ [1]

اسی بات کو آگے چل کر وہ پھر ان الفاظ میں دہراتے ہیں۔

نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بناء پر، کتاب اللہ کے قانون کو نامکمل قرار دیتے ہیں، کم از کم میرے لیے تو یہ تصور بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے، کیا آپ قرآن کریم سے کوئی ایسی آیت پیش فرمائیں گے، جس سے معلوم ہو کہ قرآن کا قانون نامکمل ہے۔ [2]

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، اس مغالطہ کی پردہ دری کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا، وہ ایک سلیم الفطرت شخص کے اطمینانِ قلب کے لیے کافی ہے۔

ان فقروں میں، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو علم قانون کے مسلّم قاعدے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آپ کو لاحق ہوئی ہے، دنیا بھر میں یہ قاعدہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قانون سازی کا اختیارِ اعلیٰ جس کو حاصل ہو، وہ اگر ایک مجمل حکم دے کر، یا ایک عمل کا حکم دے کر، یا ایک اصول طے کر کے، اپنے ماتحت کسی شخص یا ادارے کو، اس کی تفصیلات کے بارے میں، قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے اختیارات تفویض کر دے تو اس کے مرتب کردہ قواعد و ضوابط، قانون سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتے بلکہ اسی قانون کا ایک حصہ ہوتے ہیں، قانون ساز کا اپنا منشا یہ ہوتا ہے کہ جس عمل کا حکم اس نے دیا ہے، ذیلی قواعد (By Laws) بنا کر اس پر عملدرآمد کا طریقہ (Procedure) مقرر کر دیا جائے، جو اصول، اس نے طے کیا ہے اس کے مطابق مفصل قوانین بنائے جائیں اور جو مجمل ہدایت اس نے دی ہے اس کے منشا کو تفصیلی شکل میں واضح کر دیا جائے، اسی غرض کے لیے وہ خود اپنے ماتحت شخص یا اشخاص یا اداروں کو قواعد و ضوابط مرتب کرنے کا مجاز کرتا ہے، یہ ذیلی قواعد بلاشبہ اصل ابتدائی قانون کے ساتھ مل کر اس کی تشکیل و تکمیل کرتے ہیں، مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ قانون ساز نے غلطی سے ناقص قانون بنایا تھا اور کسی دوسرے نے آ کر اس کا نقص دور کیا۔ بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ قانون ساز نے اپنے قانون کا بنیادی حصہ خود بیان کیا اور تفصیلی حصہ اپنے مقرر کیے ہوئے اُس شخص یا ادارے کے ذریعہ سے مرتب کرا دیا۔ [3]

امرِ واقعہ یہ ہے کہ منکرینِ حدیث، خود قرآن کو غیر مکمل اور ادھورا تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس حرکتِ بد کو چھپانے کے لیے الزام دوسروں پر عائد کرتے ہیں۔ یہ لوگ، قرآن کی تکمیل کو صرف اس وقت مانتے ہیں جب کسی "آنے والے مرکزِ ملت" کی طے شدہ جزئیات، شاملِ قرآن ہوتی ہیں۔ نرا اتباعِ قرآن (امامِ وقت کی اطاعت کے بغیر)، ضروریاتِ دین کے لیے کافی نہیں ہے۔ جیسا کہ درجِ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

---

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۶۴
[2] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۶۶
[3] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۸۶

دین کی ضروریات، قرآن کے اتباع سے اور امامِ وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ [1]

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ منکرینِ حدیث کو ضد، چڑ، مخالفت، عناد اور تعصب، جو کچھ بھی ہے، وہ صرف اطاعتِ رسول کے حوالے سے ہے۔ ان کے خود ساختہ ''مرکزِ ملت'' کے حوالے سے نہیں ہے۔

حضور ﷺ کے تشریعی کام کی نوعیت

اللہ تعالیٰ نے اپنی قانون سازی میں یہی قاعدہ استعمال فرمایا ہے، اس نے قرآنِ مجید میں مجمل احکام وہدایات دے کر، یا کچھ اصول بیان کر کے، یا اپنی پسند وناپسند کا اظہار کر کے، یہ کام اپنے رسول کے سپرد کیا کہ وہ نہ صرف لفظی طور پر اس قانون کی تفصیلی شکل مرتب کریں بلکہ عملاً اسے برت کر اور اس کے مطابق کام کر کے بھی دکھا دیں، یہ تفویضِ اختیارات کا فرمان، خود قانون کے متن (یعنی قرآن مجید) میں موجود ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ ما نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (النحل - ۴۴) اور (اے نبی!) ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم، لوگوں کے لیے اس تعلیم کو واضح کر دو جو اُن کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس صریح فرمانِ تفویض کے بعد، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کا قولی اور عملی بیان، قرآن کے قانون سے الگ کوئی چیز ہے، یہ درحقیقت قرآن ہی کی رو سے، اس کے قانون کا ایک حصہ ہے، اس کو چیلنج کرنے کے معنی، خود قرآن کو اور خدا کے پروانۂ تفویض کو چیلنج کرنے کے ہیں۔

اس تشریعی کام کی چند مثالیں

اس تشریعی کام کی تفہیم کے لیے، چند مثالیں صرف اس لیے پیش کی جا رہی ہیں تاکہ قرآن اور حضور اکرم ﷺ کی شرح و بیان کے درمیان پائے جانے والے تعلق کو سمجھا جا سکے۔

(۱) --- قرآن مجید میں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ پاکیزگی کو پسند کرتا ہے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ (التوبہ -۱۰۸) اور نبی ﷺ کو ہدایت کی کہ اپنے لباس کو پاک رکھیں۔ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ (المدثر - ۴)، حضور ﷺ نے اس منشاء پر عملدرآمد کے لیے، استنجاء اور طہارتِ جسم ولباس کے متعلق مفصل ہدایات دیں، اور ان پر خود عمل کر کے بتایا۔

(۲) --- قرآن میں، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر تم کو جنابت لاحق ہوگئی تو پاک ہوئے بغیر، نماز نہ پڑھو (النساء-۴۳ اور المائدہ - ۶)۔ نبی ﷺ نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ جنابت سے کیا مراد ہے، اس کا اطلاق کن حالتوں پر ہوتا ہے اور کن حالتوں پر نہیں ہوتا، اور اس سے پاک ہونے کا طریقہ کیا ہے۔

(۳) --- قرآن میں، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنا منہ اور (کہنیوں تک) اپنے ہاتھ دھولو، سر پر

---

[1] مقامِ حدیث، صفحہ ۸۴

مسح کرو، اور پاؤں دھوؤ، یا ان پر مسح کرو (المائدہ - ٦) نبی ﷺ نے بتایا کہ منہ دھونے کے حکم میں کُلّی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے، کان، سر کا ایک حصہ ہیں اور سر کے ساتھ ان پر بھی مسح کرنا چاہیئے، پاؤں میں موزے ہوں تو مسح کرنا چاہیئے اور موزے نہ ہوں تو ان کو دھونا چاہیئے، اس کے ساتھ، آپ نے تفصیل کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ وضو کن حالات میں ٹوٹ جاتا ہے اور کن حالات میں باقی رہتا ہے۔

(۴) --- قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزہ رکھنے والا رات کو اس وقت تک کھا پی سکتا ہے جب تک فجر کے وقت، کالا دھاگہ، سفید دھاگے سے ممیّز نہ ہو جائے۔ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (البقرہ - ۱۸۷) نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد، تاریکیٔ شب کے مقابلہ میں، سپیدۂ صبح کا نمایاں ہونا ہے۔

(۵) --- قرآن میں، اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی چیزوں میں، بعض اشیاء کے حرام اور بعض کے حلال ہونے کی تصریح کرنے کے بعد، باقی اشیاء کے متعلق، یہ عام ہدایت فرمائی کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کی گئیں (المائدہ - ۴) نبی ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے، اس کی تفصیل بتائی کہ پاک چیزیں کیا ہیں، جنھیں ہم کھا سکتے ہیں اور ناپاک چیزیں کون سی ہیں، جن سے ہم کو بچنا چاہیئے۔

(٦) --- قرآن میں اللہ تعالیٰ نے قانونِ وراثت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میت کی نرینہ اولاد کوئی نہ ہو اور ایک لڑکی ہی ہو تو وہ نصف ترکہ پائے گی، اور دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی ملے گا (النساء - ۱۱)۔ اس میں یہ بات واضح نہ تھی کہ اگر دو لڑکیاں ہوں تو وہ کتنا حصہ پائیں گی، نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے توضیح فرمائی کہ دو لڑکیوں کا بھی اُتنا ہی حصہ ہے جتنا دو سے زائد لڑکیوں کا مقرر کیا گیا ہے۔

(۷) --- قرآن، مردوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کر لیں (النساء-۳) یہ الفاظ، اس معاملہ میں قطعاً واضح نہیں ہیں کہ ایک مرد، بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا، حکم کے اس منشا کی وضاحت نبی اکرمؐ نے فرمائی اور جن لوگوں کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں تھیں، انھیں آپؐ نے چار سے زائد بیویوں کو طلاق دینے کا حکم دیا۔

(۸) --- قرآن، حج کی فرضیت کا عام حکم دیتا ہے اور یہ صراحت نہیں کرتا کہ اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے، آیا ہر مسلمان کو، ہر سال حج کرنا چاہیئے، یا عمر میں ایک بار کافی ہے، یا ایک سے زیادہ مرتبہ جانا چاہیئے (آل عمران-۹۷)۔ یہ نبی ﷺ ہی کی تشریح ہے جس سے ہم کو معلوم ہوا کہ عمر میں صرف ایک مرتبہ حج کر کے، آدمی فریضۂ حج سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔

(۹) --- قرآن، سونے اور چاندی کے جمع کرنے پر سخت وعید فرماتا ہے، سورۂ توبہ کی آیت ۳۴ کے الفاظ ملاحظہ فرمالیجئے۔ اس کے عموم میں، اتنی گنجائش بھی نظر نہیں آتی کہ آپ روزمرہ کے خرچ سے زائد ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھ

سکیں، یا آپ کے گھر کی خواتین کے پاس، سونے یا چاندی کا ایک تار بھی، زیور کے طور پر رہ سکے، یہ نبی ﷺ ہی ہیں جنھوں نے بتایا کہ سونے اور چاندی کا نصاب کیا ہے، اور بقدر نصاب یا اس سے زائد سونا چاندی رکھنے والا آدمی، اگر، اس پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کر دے، تو وہ قرآنِ مجید کی اس وعید کا مستحق نہیں رہتا ہے۔

(۱۰) --- قرآن کریم میں، اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا (النساء-۲۳)۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے بتایا کہ پھوپھی، بھتیجی اور خالہ، بھانجی کو بھی ایک ہی نکاح میں جمع کرنا، اسی حکم میں داخل ہے۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

آخری مثال پر ایک اعتراض اور اس کا جائزہ

آخری مثال پر منکرینِ حدیث، یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ سنت رسول کو، یا خود نبیٔ اکرم کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قرآنی محرمات کی فہرست میں اضافہ کر دے، ''دو بہنوں کو بیک وقت ایک نکاح میں جمع کرنے کی ممانعت'' کے حکم کی تشریح کرتے ہوئے، یہ کہنا کہ اس حکم میں ''پھوپھی بھتیجی اور خالہ و بھانجی کو بھی درنکاحِ واحد جمع کرنے کی ممانعت'' داخل ہے، قرآنی حکم کی تفسیر و توضیح نہیں، بلکہ احکامِ قرآن کی فہرست میں اضافہ ہے، چنانچہ اسی اعتراض کو انتہائی سوقیانہ انداز میں، ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے بھی، سنت کی آئینی حیثیت پر، قلمی بحث کے دوران، مولانا مودودیؒ کے سامنے بایں الفاظ پیش کیا تھا۔

> آپ تھوڑی سی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی پوچھئے کہ (بقول آپ کے) رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ پھوپھی و بھتیجی اور خالہ و بھانجی کو (بھی ایک نکاح میں) جمع کرنا حرام ہے، قرآن کے حکم (یعنی دو بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے) کی توضیح و تشریح ہے یا محرمات کی قرآنی فہرست میں اضافہ ہے۔ ہر سمجھ دار شخص (بشرطیکہ وہ آپ کی طرح ضدی نہ ہو، یا تجاہل عارفانہ نہ کرتا ہو) یہ کہہ دے گا کہ یہ فہرست میں اضافہ ہے۔ اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآنی فہرست میں پھوپھیوں، خالاؤں، رضاعی ماؤں اور بہنوں، بیویوں کی ماؤں اور بیٹوں کی بیویوں حتّٰی کہ پالی ہوئی لڑکیوں تک کا ذکر کر دیا، اور یہ بھی کہہ دیا کہ دو بہنوں کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیئے، وہاں کیا اللہ میاں کو (معاذ اللہ) یہ کہنا نہیں آتا تھا کہ پھوپھی و بھتیجی اور خالہ و بھانجی کو بھی اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ [1]

غیر شائستہ انداز میں کیے جانے والے، اس اعتراض کا نہایت اطمینان بخش اور مسکت جواب، مولانا مودودیؒ نے بایں الفاظ دیا تھا۔

> اس ساری تقریر کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ، شارحِ قرآن بھی تھے اور خدا کے مقرر کردہ شارع بھی۔ اُن کا منصب یہ بھی تھا کہ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (لوگوں کے لیے، خدا کے نازل کردہ احکام کی تشریح کریں) اور یہ بھی کہ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (پاک چیزوں کو، لوگوں کے لیے حلال کریں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کریں)۔ اس لیے حضور ﷺ، جس طرح، قرآن کے قانون کی تشریح کرنے کے مجاز تھے، اور آپؐ کی تشریح، سند و حجت تھی

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۲۰۱

،اسی طرح آپؐ تشریع کے بھی مجاز تھے،اور آپؐ کی تشریع،سند و حجت تھی،ان دونوں باتوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے۔
رہا پھوپھی اور خالہ کا معاملہ،تو منکرینِ حدیث،اگر کج بحثی کی بیماری میں مبتلا نہ ہوتے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آسکتی تھی کہ قرآن نے جب ایک عورت کو،اس کی بہن کے ساتھ نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا تو اس سے مقصود محبت کے اُسی تعلق کی حفاظت کرنا تھا جو بہن اور بہن کے درمیان فطرۃً ہوتا ہے اور عملاً ہونا چاہیے، نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہی علت، باپ کی بہن اور ماں کی بہن کے معاملے میں بھی پائی جاتی ہے،لہٰذا پھوپھی اور بھتیجی کو،اور خالہ اور بھانجی کو بھی نکاح میں جمع کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے،یہ خواہ تشریح و تعبیر ہو،یا استنباط،یا تشریع۔بہر حال،خدا کے رسولؐ کا حکم ہے،اور آغازِ اسلام سے لے کر آج تک تمام امت نے بالاتفاق اسے قانون تسلیم کیا ہے۔خوارج کے ایک فرقے کے سوا،کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔اور اس فرقے کا استدلال بعینہٖ وہی تھا جو منکرینِ حدیث کا ہے کہ یہ حکم چونکہ قرآن میں نہیں ہے لہٰذا ہم نہیں مانتے۔
دوسری بحثیں، جو ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں اٹھائی ہیں وہ سب قلتِ علم اور قلتِ فہم کا نتیجہ ہیں،شریعت کے اہم اصولوں میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک معاملہ میں جو چیز،علتِ حکم ہو،وہی اگر کسی دوسرے معاملے میں پائی جائے تو اس پر بھی وہی حکم جاری ہوگا مثلاً قرآن میں صرف شراب (خمر) کو حرام کیا گیا تھا،حضور ﷺ نے بتایا کہ اس میں علتِ حکم،اس کا نشہ آور ہونا ہے،اس لیے ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔اب صرف ایک کم علم اور نادان آدمی ہی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اگر یہی تھا تو کیا قرآن میں بھنگ، چرس، تاڑی وغیرہ تمام مسکرات کی فہرست نہیں دی جاسکتی تھی؟ [1]

''مفکرِ قرآن'' کا منزّلِ قرآن سے اختلاف

مولانا مودودیؒ کے اس اقتباس میں بھی،اور اس سے قبل بھی یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایک مامور من اللہ شارع بھی تھے،جنھیں اللہ تعالیٰ نے تشریعی اختیارات سے بھی نواز رکھا تھا،اور اوامر و نواہی اور حلال و حرام جو نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے بیان فرمائے،قرآنی احکام ہی کی طرح واجب الاتباع ہیں،رسول اکرمؐ کا منصب،صرف یہی نہیں تھا کہ وہ قرآنی قوانین کی تشریح و توضیح فرمائیں، بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ بحیثیتِ مامور من اللہ شارع، وضعِ قانون کریں، ضابطہ سازی کریں،قواعد بنائیں،جن پر عمل پیرا ہونے سے قرآنی منشا کی تکمیل ہو جائے،لیکن،ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کو،خود صاحبِ قرآن (رسول اکرمؐ) اور منزّلِ قرآن (اللہ تعالیٰ) سے اختلاف ہے،چنانچہ وہ،شارعِ مجاز (رسولِ اکرمؐ) کو نظر انداز کرتے ہوئے، یہ لکھتے ہیں کہ

(۱) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔
(۲) خدا کے علاوہ،اس کا حق،کسی اور کو حاصل نہیں۔ [2]

حالانکہ قرآن نے بالفاظ صریح وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ کہہ کر، نبی اکرم ﷺ کو بھی بحیثیت مامور من اللہ شارع، یہ اختیار دیا ہے،لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، نہ ماننے پر اُتر آئیں تو،قرآن، خدا اور رسولؐ،کسی کی بھی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے،لیکن اگر تسلیم کرنے پر مائل ہوں،تو محمد علی جناح کے اِس قول کو ہاتھوں

[1] سنت کی آئینی حیثیت، صفحہ ۲۰۲ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۱۴۲

ہاتھ لے کر، تائیداً (نہ کہ تردیداً) جگہ جگہ نقل کرتے چلے جاتے ہیں، جو انھوں نے دورانِ تقریر، ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو تقریبِ میلاد النبی میں فرمایا تھا۔

> آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، حضور ﷺ کی عزت وتکریم، کروڑوں مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں، آپ کی بارگاہ میں سر جھکاتی ہیں، میں ایک عاجز، انتہائی خاکسار بندۂ ناچیز، ایسی عظیم، بلکہ عظیموں کی بھی عظیم ترین ہستی کو بھلا کیا اور کیسے نذرانہ عقیدت پیش کر سکتا ہوں، رسول اکرمؐ عظیم مصلح تھے، عظیم ترین رہنما تھے، عظیم واضعِ قوانین تھے، عظیم سیاستدان تھے، عظیم حکمران تھے (ﷺ)۔ [۱]

ایک اور مقام پر، سبی دربار میں، ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء میں کی گئی، قائد اعظم کی تقریر کا ایک اقتباس بایں الفاظ دیا گیا ہے۔

> میرے پیشِ نظر، ہمیشہ اسلامی ڈیما کریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے جنھیں ہمارے مقنّنِ اعظم، حضور نبی اکرم ﷺ نے ہمیں عطا فرمایا ہے لہذا ہمیں، اپنی ڈیما کریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہیے۔ [۲]

قائد اعظم کی طرف سے، حضور اکرم ﷺ کو واضع قانون اور مقننِ اعظم، قرار دیئے جانے پر، حرام ہے جو کبھی طلوعِ اسلام یا ''مفکر قرآن'' نے، اس کی تردید میں کبھی ایک لفظ بھی کہا ہو، لیکن حضور ﷺ کی اسی حیثیت کو جب علمائے امت بالعموم اور مولانا مودودیؒ بالخصوص، ایک مامور من اللہ شارع کی حیثیت سے، قرآنی دلائل کی روشنی میں بیان کریں تو ان کی تردید و مخالفت کرنا، لازم ہو جاتا ہے۔

مبحث ثالث : حدیث اور انکار حدیث

تہذیب مغرب کی بالا دستی کے اثرات میں سے، ایک بڑا اہم اثر یہ ہے کہ دنیا بھر میں ''حریت فکر'' اور ''آزادئ خیال'' کی روچل پڑی ہے، لیکن اس کا نتیجہ، بجائے اس کے کہ یہ نکلتا کہ اہل ایمان، فرسودہ رسوم ورواج، جاہلی عادات واطوار، اور بیرونی افکار ونظریات سے منہ موڑ کر، اسلام کے اصل اور ابتدائی سرچشمہ --- قرآن وسنت --- کی طرف رجوع کرتے، الٹا یہ نکلا ہے کہ ہمارا تعلیمیافتہ طبقہ، جس کی نشو ونما ہی مغربی ثقافت کی گود میں، مغربی نظریات کا دودھ پی پی کر ہوئی ہے، ''حریتِ فکر'' اور آزادئ خیال'' کے اس نعرہ کی آڑ میں، دینِ اسلام کی حدود وقیود سے جان چھڑا کر، مغرب کی اباحیت پسندانہ ثقافت کی طرف مائل ہے، اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، حدیث وسنت کی تعلیمات ہیں، جس نے فی الواقع، اسلامی ثقافت ومعاشرت کی صورت گری کی ہے، قرآن تو فقط بڑے بڑے اصول وکلیات کی کتاب ہے، جس میں اسلامی معاشرت کے متعلق، صرف اصولی اور کلی قوانین موجود ہیں، جملہ جزئیات کا اس میں استقصاء نہیں ہے اور نہ یہ ہو ہی سکتا تھا، ان اصول وکلیات کی تشریحات کا دارومدار تمام تر حدیث وسنت پر ہے، اس لیے آزاد پسند طبائع، سرے سے حدیث وسنت کی صحت کا اور اس کے

---

۱ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۸۱ء، صفحہ ۶۳ + مارچ ۱۹۸۶ء، صفحہ ۶۴ ۲ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۷۷ء، صفحہ ۲۳

واجب العمل ہونے کا انکار کرتے ہیں، کہ جب حدیث وسنت ہی کوئی شے نہ رہ جائے گی، تو دین کی گرفت، خود بخود ڈھیلی پڑ جائے گی، اور مذہب صرف چند عقائد اور مراسم عبودیت کا نام رہ جائے گا، اور پھر وہ بھی جدید مجتہدین کی تفسیر کے مطابق، نت نئی شکلوں میں ڈھلتا چلا جائے گا۔ کسی تجدد پسند مفسر کے ہاں، دو تین وقت کی نماز ہی کافی ہوگی، اور کوئی مجتہد، اس سے بھی آگے بڑھ کر، نماز کو صرف دعاء اور توجہِ قلب کے معنوں میں لے کر، راہ چلتے، سیر وتفریح کرتے ہوئے، سرراہ صرف گردن جھکا لینے ہی کو کافی تصور فرمائیں گے۔

اگر یہ حریتِ فکر، صرف اس طبقے کے افراد تک ہی محدود رہتی تو ہمیں کوئی چنداں پرخاش نہ تھی، کیونکہ ہر شخص اپنے خیالات کا مختار و ذمہ دار اور اللہ کے ہاں جوابدہ ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ رجعت اِلَی القرآن کی آڑ میں، تمام مسلمانوں کو، ان مزعومات پر ایمان لانے کی دعوت دیجاتی ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ حدیث وسنت کی مخالفت، اس کے انکار، اس کے غیر واجب العمل ہونے اور ناقابل حجت ہونے کے ثبوت میں، حدیث وسنت ہی سے، بلکہ اس سے بھی نیچے، اُتر کر، طبقات ورجال کی کتب سے دلیل کشید کی جاتی ہے۔

لیکن حدیث، تاریخ، تفسیر، طبقات ورجال کی کتب پر، ان ''مجتہدین'' کی نظر نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات، یہ لوگ عربی زبان سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے اس کوشش میں، اپنی ناواقفیت کے عجیب وغریب اور نہایت مضحکہ خیز نمونے پیش کرتے ہیں۔ کہیں ترجمہ غلط، کہیں مفہوم غلط، کہیں نتیجہ غلط، کہیں کسی عبارت کے ادھورے ٹکڑے سے استدلال غلط، کہیں تاریخ سے بے خبری، کہیں اپنے ہی مفروضات سے استدلال، کہیں طبعزاد شہادتیں، غرض، جہالت، تدلیس، خیانت، کم نظری، اور ناواقفیت کا کوئی ایسا نمونہ نہیں ہوتا جوان کی تحریروں میں نظر نہ آتا ہو، اور یہ تحریریں ہر شخص کی نظر سے گزرتی ہیں اور دینی علوم سے بے بہرہ اشخاص پر اس کا برا اثر پڑتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ان متجدّدین کی خیانتوں کو اچھی طرح فاش کیا جائے، اور حدیث و سنت کے خلاف، جس قدر شکوک وشبہات پیش کیے جاتے ہیں، ان پر تفصیلی بحث کر کے، اصل حقیقت واضح کی جائے، آئندہ سطور میں، ان ہی شکوک اور مغالطات پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔

حدیث وسنت کی مخالفت کے ''دلائل'' پر ایک نظر

حدیث وسنت کے واجب العمل اور حجت شرعی ہونے کی مخالفت میں، حسب ذیل ''دلائل'' پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) --- رسول اللہ ﷺ نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا ہے۔

(۲) --- خلفائے راشدین، احادیث کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے۔

(الف) حضرت ابوبکرؓ، احادیث کی روایت سے روکتے تھے اور انھوں نے خود اپنا مرتب شدہ مجموعہ احادیث نذر آتش کر ڈالا تھا۔

(ب) حضرت عمرؓ صحابہ کو روایتِ احادیث سے منع کرتے تھے، اور ایسا کرنے والوں کو سزا دیتے تھے۔

(ج) حضرت عثمانؓ، احادیث کو قبول نہیں کیا کرتے تھے۔

(۳) --- روایات احادیث، ایسے صحابہؓ سے مروی ہیں، جنھیں قرآن نے مردود الشہادۃ قرار دیا ہے۔

(۴) --- صحابہ اور ائمہ نے حدیثوں کے متعلق بُری رائے ظاہر کی ہے، ان احادیث کی تدوین، آنحضرت ﷺ کے کئی صدی بعد کی گئی ہے، اور ان میں ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں شامل ہیں۔

یہ وہ اصولی دلائل ہیں، جو حدیث وسنت کے لائقِ احتجاج ہونے کی مخالفت میں دیئے جاتے ہیں، اس کے ضمن میں جو واقعات، پیش کیے جاتے ہیں، وہ عنقریب اپنے موقع پر زیرِ بحث آئیں گے۔

لیکن یہ تمام اعتراضات، معترضین کی کوتاہ نظری، قرآن وحدیث، رجال اور تاریخِ اسلام سے ناواقفیت اور منصبِ رسالت کی نامرتبہ شناسی کا ثبوت ہیں۔

لیکن پہلے ایک تمہیدی گذارش

ان اعتراضات پر نظر ڈالنے سے پہلے ایک مختصر سی تمہید، پیشِ خدمت کرنا ضروری ہے، حدیث وسنت کے قابلِ احتجاج اور ناقابلِ احتجاج ہونے کے ثبوت میں، سب سے مقدم یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ کا منصب کیا تھا؟ خود پرویز صاحب نے، کسی زمانہ میں، اسی سوال کا سامنا کرتے ہوئے، یہ جواب دیا تھا۔

> ''حدیث کی دینی حیثیت کیا ہے؟'' (....) حقیقت یہ ہے کہ حدیث کی دینی حیثیت متعین کرنے کے لیے، خود رسول کی ''دینی حیثیت'' کا تعین سب سے ضروری ہے، منکرینِ حدیث (یعنی حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ کے ان انوکھے مفسرین) کے نزدیک، رسول کی حیثیت اس کے لغوی معنوں تک ہی محدود ہے، یعنی وہ ایک قاصد یا پیغامبر ہے، جو ایک بند لفافہ لے کر آیا ہے، اور اس کا منصب فقط اتنا ہے کہ اسے بحفاظت تمام، مکتوب الیہ تک پہنچا دے اور جس طرح پیغام دینے کے بعد اس قاصد کا وجود عضوِ معطل ہو جاتا ہے، فریضۂ پیغام رسانی کے بعد، رسول کی حیثیت بھی بس ایسی ہی کچھ رہ جاتی ہے اور اس کے بعد، اس پیغام کے متعلق کچھ اور کہنا سننا گویا اس کا اپنے فرضِ منصبی سے تجاوز کرنا ہے، اور اس لیے قابل پذیرائی نہیں، رسول کے لیے وہ دوسرا لفظ ''مبلغ'' استعمال کرتے ہیں، اور اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ (خاکم بدہن) رسول ایک (Broadcasting Station) کی طرح آلۂ ابلاغ ہے، یعنی اس کا فرض صرف ''پہنچا دینا'' ہے، اور اس فرض رسانیدن کے بعد، آلہ بس آلہ رہ جاتا ہے۔ [1]

قطع نظر اس کے کہ منکرین حدیث کی مخالفت میں، یہ الفاظ، ان کے قلم سے کس مصلحت کے تحت نکلے تھے، ان سے بہرحال، یہ بات واضح ہے کہ احادیث کی دینی حیثیت کا انحصار، خود منصب رسالت کے صحیح تصور پر ہے۔

اگر نبی ورسول کی حیثیت، خاکم بدہن، محض ایک پوسٹمین کی تھی کہ خط پہنچا دینے کے بعد، اس کا کام ختم ہوگیا، اور

[1] معارف (اعظم گڑھ-انڈیا)، مارچ ۱۹۳۵ء، صفحہ ۱۷۵ اور صفحہ ۱۷۶

مکتوب الیہ کی کسی اور چیز سے اسے کوئی بحث نہیں، تو بیشک حدیث وسنت، قابل احتجاج نہیں ہے، لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، رسول اللہ کی حیثیت، محض خالص پیام بر کی نہیں تھی کہ قرآن کی آیات پہنچا دینے کے بعد، آپ کی ذمہ داری ختم ہوگئی بلکہ وہ اس پیام کا شارح، مرسل الیہ، قوم کا معلم اور طبیب بھی تھا، اور عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، غرض تمام دینی اور دینوی ضروریات میں، ہادی اور رہنما بنا کر بھیجا گیا تھا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ -۲) وہی تو ہے جس نے امیوں میں اُنہی میں سے رسول بھیجا جو ان پر، اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، انھیں سنوارتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیتِ پاک میں رسول کا کام تنہا یہی نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ امیوں پر آیاتِ خداوندی کی تلاوت کرتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ انھیں پاک کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، جہاں تک خالص پیام بری کی ذمہ داری ہے، وہ تلاوتِ آیات پر ختم ہو جاتی ہے، پھر یہ تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت کیا چیز ہے؟

یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے، کہ کتاب عربی میں تھی، اور عربوں پر نازل ہوئی تھی، وہ اسے خود سمجھ سکتے تھے، پھر تعلیم کتاب وحکمت کے کیا معنٰی؟ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ، تنہا اور خالص پیام بر ہی نہ تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی تھے، اسے خود قرآن نے بیان کیا ہے کہ وہ اور کیا کچھ تھے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب-۲۱) رسول اللہ کی ذات میں (اے مسلمانو!) تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

اس آیۂ پاک میں ذاتِ نبیؐ کو کس چیز میں نمونہ قرار دیا گیا ہے؟ کیا محض احکام قرآنی کے مان لینے میں؟ اگر یہ مقصد ہوتا تو رسول اللہ کی ذات کو اسوہ کہنے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صاف الفاظ میں کہا گیا ہوتا کہ ”قرآن کو مان لو“۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسوہ کا کوئی اور مفہوم ہے جو احکام قرآنی کے ماننے سے زیادہ وسیع ہے، اور وہ خود لفظ اسوہ سے ظاہر ہے، اسوہ یا نمونہ، عرف عام میں بھی، اسی کو کہتے ہیں جس کا ہر قول وعمل، جس کی ہر نقل وحرکت، اور جس کی ہر ادا، قابل تقلید ہے اور ان ہی اقوال و اعمال کو حدیث وسنت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس موقع پر، اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ کلام اللہ بڑی حد تک ایک اصولی کتاب ہے جس میں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، کے متعلق کلّی اصول ہیں، باقی ان کی تفصیلات اور جزئیات کے استقصاء کی اس میں نہ تو گنجائش تھی اور نہ ہے ہی۔ ان کلیات کی جزئیات اور ان اصول کی فروعات اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے ذاتِ پاکِ محمدی، ایک زندہ کتاب ہے، جس کا ہر قول وعمل، متنِ قرآنی کی شرح ہے، اور جس قدر اہمیت، الفاظِ قرآن یا متنِ کتاب کی ہے، اُسی قدر اہمیت، اس تبیینِ نبوی اور شرحِ محمدی کی ہے، قرآن کے اصولوں کی تشریح، بغیر نبی کی وضاحت کے، نہیں ہوسکتی، کیونکہ یہ کتاب الٰہی،

بر بنائے فرمانِ الٰہی، محتاجِ وضاحتِ رسول ہے، چنانچہ

وَمَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمْ (النحل - ۶۴) اور نہیں اتاری ہم نے کتاب مگر اس لیے کہ تُو لوگوں کے لیے اسے کھول کر واضح کر دے۔

وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ (النحل - ۴۴) ہم نے تمہاری طرف اس لیے نصیحت اتاری کہ تم، لوگوں کے لیے کھول کر اس کی وضاحت کر دو۔

ظاہر ہے کہ جہاں تک، قرآن کی عربی عبارت کا تعلق ہے، ہر عرب سمجھ سکتا تھا، پھر اس تبیین اور وضاحت کے کیا معنٰی؟ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں کچھ اور بھی ہے جس کی وضاحت نبی ہی کر سکتا ہے، اور یہی وضاحت، حدیث وسنت ہے، حدیث میں، اس مفہوم کو، اس سے زیادہ صاف اور واضح بیان کیا گیا ہے۔

عن زياد بن لبيد قال ذكر النبيُّ ﷺ شيئا فقال ذاک عند اوان ذهاب العلم قلت يا رسول الله، وكيف يذهب العلم و نحن نقرء القرآنَ ونقرء ه ابناء نا ويقرء ه ابناء نا ابناء هُم اِلى يوم القيامة قَالَ ثكلت امک، زياد، ان كنت لاراک من اَفْقَهِ رَجَلٌ بَالْمَدِيْنَةِ، اوليس هٰذا اليهود والنصارى يقرء ون التوراة والانجيل، لايعلمون بشئٍ مِمَّا فِيْهِمَا[1] زیاد بن لبید بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے سامنے کوئی چیز بیان کی گئی، آپ نے فرمایا یہ علم کے جانے کے وقت ہوگی، میں نے عرض کیا "یارسول اللہ علم کیونکر چلا جائیگا، جبکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں، اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں اور ہمارے بیٹے، اپنی اولاد کو پڑھائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا" فرمایا "زیاد! تیری ماں تجھ کو روئے، میں مدینہ میں تمہیں سب سے زیادہ سمجھدار جانتا تھا، کیا یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کی تلاوت نہیں کرتے ہیں، لیکن ان میں جو کچھ ہے، اس سے بے خبر ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے محض لفظی معنٰی سمجھ لینے سے، اس کا پورا علم حاصل نہیں ہوتا، اسی لیے نبیؐ کو اس کی وضاحت کا حکم دیا گیا ہے، اور وہ جو کچھ بیان کرتا ہے، وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا ہی کی طرف سے بیان کرتا ہے، خواہ وحی کی زبان میں ہو، یا وحی کی حدود میں، خدا کی دی ہوئی روشنی میں، اسے نبیؐ نے خود جامۂ الفاظ پہنایا ہو، اور یہی حدیث وسنت ہے جیسا کہ قرآن خود کہتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم - ۳، ۴) نبیؐ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اسے کی جاتی ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰكَ اللهُ (النساء - ۱۰۵) اور ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ صرف اس لیے کتاب اتاری ہے کہ تم لوگوں کے درمیان، اللہ کی دی ہوئی روشنی کے مطابق فیصلہ کرو۔

---

[1] سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب ذهاب القرآن والعلم

اس لیے، کسی دینی یا دنیاوی معاملہ میں رسول اللہ کے فیصلہ کے بعد چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب-۳۶) اور مومن مرد اور مومن عورت کو یہ اختیار نہیں رہتا کہ جب اللہ اور اس کا رسول، ان کے کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کر دے تو وہ اس میں چوں و چرا کریں، اور جس شخص نے خدا اور اُسکے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں جا پڑا۔

ان آیات سے یہ ثابت ہو گیا کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ خدا ہی کی دی ہوئی روشنی میں کہتا ہے اور اس کے فیصلہ کے بعد، کسی مسلمان کو اس میں چون و چرا کا حق باقی نہیں رہتا، اس لیے اس کا ہر قول و فعل، واجب العمل ہوا، اور اس کی اتباع ہی میں خدا اور قرآن کی اتباع ٹھہری۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء-۶۴) ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو، مگر اس لیے کہ خدا کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔

اور خود، رسول ہی کی زبان سے، اتباع رسول کو فرض قرار دیا گیا۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران-۳۱) اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔

اس آیۂ پاک میں، خدا کی محبت اور خدا کی بارگاہ میں محبوب بننے کے لیے، رسول اللہ کی اتباع ضروری قرار دی گئی، یہ نہیں فرمایا گیا کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو قرآن کو مان لو (یا قرآن کی پیروی کرو) خدا تمہیں دوست رکھے گا، بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ "میری اتباع کرو"۔ ظاہر ہے کہ یہ اتباع، اتباع بالحدیث والسنۃ کے سوا، کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں، دوسری قابل غور بات، ایک اور چیز ہے، مگر اس سے قبل حدیث وسنت کا مفہوم اور منشا واضح ہو جانا چاہئے، محدثین کے نزدیک، تو حدیث وسنت کا مفہوم نہایت وسیع ہے، لیکن زیر بحث موضوع کے اعتبار سے، ہم اسے محدود کر کے، یہ کہتے ہیں کہ حدیث وسنت سے مراد، آنحضرت ﷺ کے وہ اقوال و اعمال ہیں جو آپ نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں فرمائے ہیں، غالباً اس تعریف میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہ ہوگی، اس معنٰی کی تعیین کے بعد، سوال یہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو دینی یا دنیاوی تعلیم دی، یا کسی مسلمان کے سوال یا پیش آمدہ صورت کے متعلق کوئی جواب فرمایا، یا کوئی حکم صادر فرمایا، تو یہ تعلیم، یہ جواب، اور یہ فیصلہ، عارضی یا وقتی مانا جائے گا؟ اور آپ کے بعد، ان کی ہدایت و رہنمائی اور عملی حیثیت ختم ہو جائے گی؟ اِسے کون عقل تسلیم کر سکتی ہے؟ اس کی مثال، روزانہ کے دنیاوی معاملات میں لیجئے، ایک باپ یا معلم، اپنے بچہ یا شاگرد کو، جو تعلیم و تربیت دیتا ہے اور جو زریں اصولِ اخلاق یا علوم سکھاتا ہے، کیا وہ محض سنانے کے لیے اور عارضی و وقتی ہوتے ہیں؟ ان پر دائما عمل کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور مکتب درس سے نکلنے کے بعد، انھیں طاقِ نسیاں پر رکھ دینا چاہئے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ بچہ اور شاگرد کی

بچپن کی صالح تعلیم وتربیت، اُسکی آئندہ زندگی کی رہنما ہوتی ہے، پھر جب ایک باپ اور دنیاوی استاد کی تعلیم وتربیت، انسان کے لیے دائمی لائحہ عمل ہے، تو استادِ کُل اور معلم خداوندی کی تعلیم، جو ساری دنیا کی تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ اخلاق کے لیے آیا تھا، اور اس دعویٰ کے ساتھ آیا تھا کہ وہ دنیا کا آخری معلّم، اور اس کی تعلیم دنیا کے لیے دائمی اور آخری تعلیم ہے، کیا اس لائق ہے کہ اس کے بعد اُسے سپردِ طاقِ نسیاں کر دیا جائے؟ كَلَّا ثُمَّ كَلَّا، اور اس کی یہی تعلیم وتربیت، حدیث وسنت ہے۔

اتباعِ رسول اور احادیث وسنت

یہاں تک ''اتباعِ رسول'' کے متعلق، قرآنی احکام سے بحث تھی، اب حدیث کے احکام ملاحظہ ہوں، ایک نہیں، بیسیوں صحیح احادیث میں اتباعِ حدیث وسنت کو، مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

عن ابی ھریرۃَ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ اَنَّہٗ قال من اطاعنی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَن عَصَانی فقد عَصَی اللّٰہ[1] ابوہریرہؓ، رسولِ خدا سے روایت کرتے ہیں، آپؐ فرماتے تھے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرنی کی، اس نے خدا کی نافرمانی کی۔

اس حدیث میں، آپؐ نے اپنی اطاعت کو خدا کی اطاعت اور اپنی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی قرار دیا، اس کے برعکس، خدا کی اطاعت کو خود اپنی اطاعت اور اُس (کے حکم) کی نافرمانی کو خود اپنی نافرمانی نہیں بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی احکام کے ساتھ، نبیؐ کے احکام کی اطاعت بھی لازم ہے، جو قرآن ہی کی رو سے، ٹھیک ویسی ہی ضروری ہے، دوسری حدیث میں، اس اطاعت کی خود تشریح فرمادی گئی ہے۔

عن ابی ھریرۃَ قال قال رسول اللہ ﷺ مَا امرتکم بہٖ فخذ وہ وَمَا نھیتکم عنہ فانتھوا[2] ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس چیز کا میں، تمہیں حکم دوں، اسے اختیار کرلو اور جس چیز سے منع کروں، اس سے رک جاؤ۔

اس حدیث میں قرآن کی تخصیص نہیں ہے کہ جس چیز کا قرآن حکم دے، اسے اختیار کرو، اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ، بلکہ فرمایا کہ جس چیز کا میں حکم دوں اسے اختیار کرو اور جس چیز سے میں روک دوں، اس سے رک جاؤ، اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی احکام کے علاوہ، آپؐ کے دوسرے احکام وفرامین بھی، قرآنی احکام ہی کی طرح واجب الطاعۃ ہیں، صحیح مسلم میں یہی روایت ان الفاظ میں ہے۔

کان ابو ھریرۃ یحدث انہ سَمِعَ رَسُول اللّٰہِ ﷺ یقولُ ما نھیتکم عنہ فاجتنبوہ وما امرتکم بہ فافعلوہ[3] ابوہریرہؓ بیان کیا کرتے تھے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ''میں، جس چیز سے تم کو منع کروں، اس سے رک

---

[1] الجامع الصحیح لمسلم، کتاب الامارہ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ و تحریمھافی المعصیۃ

[2] سنن ابن ماجہ، المقدمۃ، باب اتباع سنۃ رسول اللہ

[3] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب توقیرہ واکثار سوالہ عما لاضرورۃ الیہ ......

جاؤ، اور جس چیز کا تمہیں حکم دوں، اسے اختیار کرو"۔

احکام نبیؐ کے واجب الطاعۃ ہونے کی اس سے زیادہ واضح سند کیا چاہیے؟ ممکن ہے کہ کوئی صاحب یہ اعتراض کر دیں کہ "احادیث میں ذاتِ نبوی کی اطاعت مذکور ہے، احادیثِ نبیؐ کی نہیں"۔ تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگرچہ حدیث، رسول اللہ ﷺ کے احکام ہی کی ایک قسم ہے، تاہم معترضین کی تشفی کے لیے، مندرجہ ذیل تشریحی روایت پیش کی جاتی ہے جس کے بعد، کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

عن مقدام بن معدیکرب الکندی ان رسول ﷺ قال یوشک الرجل متکئًا علی اریکته یحدث بحدیث من حدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب اللہ عزوجل ، فما وجدنا فیه من حلال استحللناہ وما وجدنا فیه من حرام حرمناہ ، الا و ان ماحرّم رسول اللہ ﷺ مثل ما حرم اللہ[1] مقدام بن معدیکرب الکندی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قریب ہے کہ ایک آدمی جب اپنے پرتکلف اور آراستہ تخت پر بیٹھا ہو، اور اس سے میری کوئی حدیث بیان کی جائے، تو وہ کہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے، ہم اس میں پائے جانے والے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھیں گے، (ایسے لوگوں کو) آگاہ رہنا چاہیے کہ رسول کا حرام کردہ بھی خدا ہی کے حرام کردہ کی طرح ہے۔

کیا اس کے بعد بھی، حدیث کے واجب العمل اور واجب الطاعۃ ہونے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے؟ تمسک بالکتاب کے دعویداروں کو خصوصیت کے ساتھ اس حدیث پر غور کرنا چاہیے، یہ تو حدیث ہی کے متعلق ہے، گویا حدیث اور سنت نتیجۃً ایک ہی چیز ہیں، تاہم لفظ "سنت" کے ساتھ بھی یہ حدیث ملاحظہ فرمایئے۔

عن عرباض بن ساریة قال صلی بنا رسول اللہ ﷺ صلوة الفجر ثم و عظنا موعظة بلیغة ذرفت منها العیون ووجلت منها القلوب فقال قائل"یا رسول اللہ، کانها موعظة مودع فاوصنا" فقال "اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعة وان کان عبدا حبشیا فانه من یعش بعدی فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین، عضو اعلیها بالنواجذ، وایاکم والمحدثات فان کل محدثة بدعة[2] عرباض بن ساریہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز فجر پڑھائی، نماز کے بعد ایک بلیغ وعظ فرمایا جس سے آنسو بہہ نکلے اور دل دہل گئے، کسی کہنے والے نے کہا "یا رسول اللہ! یہ الوداعی وعظ معلوم ہوتا ہے اس لیے ہمیں کچھ اور وصیت فرمایئے" آپؐ نے فرمایا "میں تم کو خدا سے خوف کی اور اطاعت وفرمانبرداری کی وصیت کرتا ہوں، خواہ (تمہارا حاکم) حبشی غلام ہی ہو۔ جو شخص، میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا ایسے وقت میں تم میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی

---

[1] سنن ابن ماجه، المقدمة، باب تعظیم حدیث رسولؐ اللہ والتغلیظ ......

[2] سنن ابو داؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة

پیروی کرنا اور اسے اپنے دانتوں سے پکڑے رکھنا۔ محدثات سے بچنا کہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي کے واضح حکم کے بعد، کون اقتداء بالسنۃ کے خلاف لب کشائی کی جرأت کر سکتا ہے؟ کتاب اللہ کے بعد، مسلمانوں کے لیے، سنتِ رسول ہی رہنما ہے، آپؐ نے اسی کا حکم دیا ہے اور صحابہؓ کا اسی پر عمل تھا، جب آپؐ نے معاذ بن جبل کو یمن کا عامل مقرر کیا تو روانگی سے پہلے ان سے امتحاناً پوچھا ''فیصلہ کس طرح کرو گے'' معاذ نے کہا ''قرآن سے''۔ فرمایا ''اگر اس میں نہ ملے''، عرض کیا ''سنتِ رسول اللہ کے مطابق'' فرمایا ''اگر اس میں نہ ملے''۔ عرض کیا ''تو پھر میں خود اجتہاد کروں گا'' یہ جواب سن کر آنحضرتؐ بہت مطمئن اور مسرور ہوئے، اور فرمایا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے ''رسول'' کو ایسی چیز کی توفیق دی، جس کو اس کا رسول پسند کرتا ہے۔ (صحیح بخاری و مسلم، نیز مسند احمد، جلد ۵، صفحہ ۲۳۵)

اس واقعہ میں، حضرت معاذ بن جبل نے کتاب اللہ کے بعد، سنتِ رسول اللہ ہی کو رہنما بتایا، اور آنحضرت ﷺ نے، ان کے بیان پر، پسندیدگی ظاہر فرمائی، اگر سنت، کوئی شے نہ ہوتی تو آپؐ، معاذ کو اس سے روکتے، یا ناپسندیدگی ظاہر فرماتے، غالباً اتنی مستند روایات کے بعد، حدیث و سنت کے واجب الطاعۃ ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہ جائے گا۔

معترضین کے ''دلائل'' کا جائزہ

اس تمہید کے بعد، اب معترضین کے ان ''دلائل'' کی طرف رجوع کیا جاتا ہے کہ یہ ''دلائل'' بھی، اسی حدیث و سنت سے پیش کیے جاتے ہیں، جو ان کے نزدیک، ناقابل احتجاج ہے، چونکہ یہ دلائل بھی حدیث و سنت پر مؤسس ہیں اس لیے، ان کے تتبع میں، ہم نے بھی اپنے دلائل (قرآن کے علاوہ) حدیث و سنت ہی سے پیش کیے ہیں، تاکہ حدیث و سنت کی حجیت واضح ہو جائے۔

پہلی دلیل - منعِ کتابتِ حدیث

سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

لَا تَكْتُبُوا عَنِّي وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرآنِ فَلْيَمْحُهُ [1] مجھ سے کچھ مت لکھو، اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہو اُسے چاہئے کہ وہ اُسے مٹا ڈالے۔

اس حکم سے حدیث و سنت کے ناقابل حجت اور ناقابل سند اور غیر واجب العمل ہونے کا نتیجہ نکالا جاتا ہے، کہ اگر حدیث واجب ہوتی تو اس کے لکھنے کی کیوں ممانعت فرمائی جاتی۔

جائزہ

(۱) --- نہ معلوم، یہ کونسی منطق ہے، آخر دعویٰ کو دلیل سے کوئی تعلق ہونا چاہئے، کسی کے قلمبند کیے جانے کی ممانعت سے، اس

[1] صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب التثبت فی الحدیث وحکم کتابة العلم.

کا نفاذ، کہاں سے ساقط ہو جائے گا، کیونکہ ممانعتِ کتابت اور شے ہے، اور اس کا واجب العمل ہونا اور شے ہے، دونوں میں کوئی ایسا تلازم نہیں کہ ایک شے کی ممانعت کا نتیجہ دوسری شے کے سقوطِ نفاذ میں برآمد ہو۔

(۲) --- دوسرے یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ ممانعت کن حالات میں، اور کن مصالح کی بناء پر کی گئی تھی، نیز یہ بھی کہ وہ وقتی تھی یا دائمی؟

بیشک ابتداء میں، رسول اللہ ﷺ نے کتابت حدیث کی ممانعت کی تھی، لیکن مطلق اور دائمی نہیں بلکہ خاص مصالح کی بناء پر اور وہ بھی وقتی اور عارضی طور پر۔ ابتداء میں بہت کم مسلمانوں کو لکھنا آتا تھا، اور جو جانتے تھے وہ بھی یونہی معمولی سا۔ اس لیے ان کے حدیثوں کی کتابت میں غلط سلط لکھے جانے کا خطرہ تھا، کیونکہ اچھے اور معیاری کاتبوں کو کتابتِ قرآن نے مشغول کر رکھا تھا۔ دوسرے، شروع میں خاص اور فہیم صحابہؓ کے علاوہ، عام مسلمانوں میں کلام اللہ اور حدیثِ رسولؐ کے درمیان، فرق و امتیاز قائم رکھنے کا صحیح مذاق بھی پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے دونوں کے مخلوط ہو جانے کا خطرہ تھا، اس اہم خطرہ سے حفاظت کے لیے، آپؐ نے ابتداء میں ممانعت کی تھی لیکن جب فن کتابت ترقی کر گیا، اور صحابہؓ کرام میں خدا کے کلام اور رسولؐ کی گفتگو کے درمیان، فرق و امتیاز کی پوری صلاحیت آ گئی تو آپؐ نے یہ ممانعت اٹھا لی، اور جو لوگ لکھنے میں مہارت رکھتے تھے، انھیں کتابت کی اجازت دیدی، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے:

عن عبداللہ بن عمر وقال کنت اکتب کل شیء اسمعه من رسول اللہ ﷺ ارید حفظه فنهتنی قریش و قالوا اتکتب کل شیءٍ تسمعه ورسول اللہ ﷺ بشریتکلم فی الغضب والرضا فامسکت عن الکتاب فذکرت ذالک الی رسول اللہ ﷺ فاومیٰ باصبعه اِلی فیه فقال اکتب فوالذی نفسی بیده ما یخرج منه الا الحق۔ [1] عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ میں حفظ کرنے کے ارادہ سے، رسولؐ اللہ سے جو کچھ سنتا تھا لکھ لیتا تھا، قریش نے مجھ کو منع کیا اور کہا، ''کیا تم رسولؐ اللہ سے جو کچھ سنتے ہو لکھ لیتے ہو؟ حالانکہ آپؐ انسان ہیں وہ کبھی راضی خوشی اور کبھی غصہ کی حالت میں بولتے ہیں''، ان کے کہنے پر میں لکھنے سے رک گیا، اور رسولؐ اللہ سے اس کا تذکرہ کیا، آپؐ نے اپنی انگلی سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، ''تم لکھتے رہا کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس میں سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا''۔

مسند دارمی کی روایت ہے۔

عن عبداللہ بن عمرو انه اتیٰ رَسول اللہ ﷺ، فقال یا رسول اللہ! انی ارید ان اروی من حدیثک فاردت ان استعین بکتاب بیدی مع قلبی ان رَءَ یت ذالک، فقال رسول اللہ ﷺ ان کان حدیثی ثم استعن بیدک مع قلبک [2] عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا، اور عرض کیا ''یا رسول

[1] سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب کتابة العلم + بخاری + مسلم

[2] سنن الدارمی، مقدمه، من رخص فی کتابة العلم

اللہ! میں چاہتا ہوں کہ آپؐ کی حدیث روایت کروں، میرا ارادہ ہے کہ اپنے قلب کی یادداشت کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بھی مدد لوں، اگر آپ اسے مناسب خیال فرمائیں'' آپؐ نے فرمایا ''اگر میری حدیث ہے تو تم اپنے قلب کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بھی مدد لے سکتے ہو (یعنی لکھ سکتے ہو)۔

واضح رہے کہ یہ اجازت تنہا عبداللہ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ بہت سے صحابہؓ احادیث لکھا کرتے تھے، اور یہ سب کچھ آپ کے علم و اجازت سے تھا۔

عن ابی قبیل قال سمعت عبداللہ بن عمرو قال بینما نحن حول رسول اللہ ﷺ نکتب ، اذ سئل رسول اللہ ﷺ ای المدینتین تفتح اولاً قسطنطنیه او رومیه۔ [۱] ابوقبیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو سے سنا، وہ کہتے تھے، کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے گرد (بیٹھے، احادیث) لکھتے تھے، اتنے میں آپؐ سے پوچھا گیا'' دونوں شہروں میں سے کون سا پہلے فتح ہوگا؟ قسطنطنیہ یا رومیہ؟

بعض اوقات، دوسروں کی درخواست پر، آنحضرتؐ خود لکھوا دیا کرتے تھے، چنانچہ فتح مکہ میں جب آپ نے تحریم حرم پر خطبہ دیا، تو ایک یمنی باشندے ابوشاہ نے درخواست کی'' یا رسول اللہ! مجھ کو یہ احکام لکھوا دیئے جائیں''، ان کی درخواست پر آپؐ نے فرمایا۔

اکتبوا لابی شاہ [۲] ابوشاہ کے لیے لکھ دو۔

آپؐ کے مرض الموت کا مشہور واقعہ بخاری اور مسلم سب میں ہے کہ جب آپؐ کی حالت غیر ہوئی، تو آپ نے کچھ لکھنے کے لیے قلم دوات مانگی، حضرت ابن عباس، بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کا مرض بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا ''قلم دوات یا کاغذ اور دوات لاؤ، میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو''۔ [۳]

سوال یہ ہے کہ آپؐ نے کس چیز کے لکھنے کے لیے قلم دوات منگوائی تھی؟ ظاہر ہے کہ یہ حدیث تھی، آپ جو کچھ بھی لکھتے وہ حدیثِ رسول ہی ہوتی، اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا آخری فعل ہے۔

آپؐ نے، اپنے عمال کو بہت سے احکام لکھوا کر بھیجے، جن پر حضرات خلفائے راشدین کے عہد میں بھی عمل ہوتا رہا ہے، اور وہ تحریری روایات، علم حدیث کا اولین مجموعہ ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر بالفرض، یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ آپؐ نے کتابت حدیث کی دائمی ممانعت فرمائی، تو اس سے روایتِ حدیث اور حدیث وسنت کے ناواجب العمل اور غیر واجب الطاعۃ ہونے کا ثبوت کہاں سے ملتا ہے؟ کتابتِ حدیث کی ممانعت اور شے ہے اور حدیث کی روایت اور اس کا واجب العمل ہونا اور شے ہے، کسی قانون کے نفاذ اور واجب العمل

[۱] دارمی، مقدمه، باب من رخص فی کتابة العلم [۲] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تحریم مکه
[۳] صحیح بخاری، کتاب العلم ، باب کتابة العلم

ہونے کے لیے اس کا تحریری ہونا ضروری نہیں، خصوصاً عہد رسالت میں تو اس مقصد کے لیے تحریر کی ضرورت ہی نہ تھی۔ باقی رہی حدیث کی روایت اور اس کی اشاعت، جو اس وقت موضوع بحث ہے تو اس کی آپ نے خود اجازت مرحمت فرمائی تھی، بلکہ تاکیدی حکم ارشاد فرمایا تھا۔

احفظوا واخبروا من وراء کم [1] اسے یاد کرلو اور اپنے پیچھے آنے والوں کو اس کی خبر کردو۔

بلکہ حضور اکرم ﷺ نے مبلّغِ حدیث کے لیے دعا فرمائی ہے۔

عن زید بن ثابت قال سمعت رسول الله ﷺ یقول نضر الله امرءً ا سمع منا حدیثا فحفظه حتی یبلغه فرب حامل فقه الی من هو افقه منه ورب حامل فقه لیس بفقیه [2] زید بن ثابت روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ ''خدا اس شخص کو تر و تازہ اور شاداب رکھے جس نے ہم سے حدیث سنی، اسے حفظ کیا، یہاں تک کہ دوسروں تک پہنچایا، کیونکہ کبھی علم کا حامل اسے ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حاملِ علم خود سمجھ دار نہیں ہوتا''۔

آپؐ نے حجۃ الوداع میں، جو آخری اور مشہور خطبہ دیا تھا، اور جس میں مسلمانوں کے لیے بہت سے احکام و ہدایات بیان فرمائے تھے، وہ بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ، حدیث کی تقریباً جملہ کتب میں کُلاً یا جزءاً موجود ہے، اس کے آخر میں یہ حکم ہے کہ ''**فلیبلغ الشاهد الغآئب**'' یعنی وہ لوگ، جو موجود ہیں، ان احکام اور ہدایات کو ان مسلمانوں تک پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں''۔ یہ تبلیغ کا حکم کس چیز کے لیے تھا؟ کیا حدیث کے علاوہ کوئی اور شے تھی؟ اور یہ حضور ﷺ کے آخری اعمالِ حیات میں سے ایک عمل ہے، کیونکہ حجۃ الوداع کے بعد، آپ کی زندگی میں کبھی مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع نہیں ہوا۔ غالباً اتنے واقعات سلیم الفطرت منکرین حدیث کی تشفی کے لیے کافی ہوں گے۔

دوسری دلیل - دلیل یا اتہام بر خلفائے راشدین

دوسری دلیل، یہ پیش کی جاتی ہے کہ خلفائے راشدین، خصوصاً شیخین، حدیثوں کو حجت و سند نہیں سمجھتے تھے، یہ دلیل نہیں بلکہ صریح اتہام ہے، جس کی تائید میں، حسب ذیل واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) --- آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد، ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ تم لوگ، رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں بیان کرتے ہو اور اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے، ان میں تم سے زیادہ اختلاف پیدا ہوگا، اس لیے تم لوگ، رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث بیان نہ کرو، جو شخص تم سے حدیث پوچھے، اس سے کہہ دو کہ ہمارے تمہارے درمیان، کتاب اللہ موجود ہے، اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام۔ [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب تحریض النبی وفد عبدالقیس

[2] سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب نشر العلم + جامع ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الحثّ علی تبلیغ السماع

[3] تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۳ + مقام حدیث، صفحہ ۶

(۲) --- حضرت ابوبکرؓ نے پانسو حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا تھا، ایک رات کو آپ بہت بے چین رہے، آپ کی بے چینی سے حضرت عائشہؓ پریشان ہوئیں، اور پوچھا "آپ کسی بیماری کی وجہ سے پریشان ہیں یا کوئی ناگوار بات پیش آئی"؟ صبح ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ "بیٹی! حدیثوں کا وہ مجموعہ لے آؤ، جو تمہارے پاس رکھا ہے"، حضرت عائشہؓ اسے لے آئیں، آپ نے اسے جلا دیا، حضرت عائشہؓ نے پوچھا "آپ نے جلا کیوں دیا"، فرمایا "مجھے خوف معلوم ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ مجموعہ محفوظ رہ جائے، ممکن ہے میں نے اس میں ایسے لوگوں سے احادیث لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں، اور مجھے ان پر وثوق ہے، لیکن وہ حدیثیں ایسی نہ ہوں"۔ [1]

(۳) --- حضرت عمرؓ کی مخالفتِ حدیث میں یہ واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

(الف) --- آپ فرماتے ہیں حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ

(ب) --- لوگوں کو احادیث کی اشاعت سے روکتے تھے، قرظہ بن کعب راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو خود مشایعت کو نکلے، اور ہم سے پوچھا کہ "تم کو معلوم ہے میں تمہارے ساتھ کیوں آیا ہوں؟" لوگوں نے عرض کیا "ہماری عزت افزائی کے لیے"۔ فرمایا "ہاں، لیکن یہ بھی غرض ہے کہ تم لوگ ایسے مقام پر جا رہے ہو جہاں کے باشندوں کی آوازیں، قرآن پڑھنے میں، شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں، تم ان کو احادیث میں روک کر، قرآن سے غافل نہ کر دینا، قرآن میں آمیزش نہ کرو، اور رسول اللہ ﷺ سے کم روایت کرو، میں تمہارا شریک ہوں" قرظہ جب عراق پہنچے تو لوگوں نے کہا "ہم سے حدیث بیان کرو"۔ انھوں نے کہا "ہم کو عمرؓ نے منع کیا ہے"۔ [2]

(۴) --- ابوسلمہ نے ابوہریرہؓ سے پوچھا "کیا تم اسی طریقہ سے عمرؓ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟" انھوں نے کہا "اگر میں عمرؓ کے زمانہ میں اس طرح حدیثیں بیان کرتا، تو وہ مجھ کو دُرّے سے مارتے"۔ [3]

(۵) --- حضرت عمرؓ نے، عبداللہ بن مسعودؓ، ابودرداءؓ اور ابومسعود انصاریؓ کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا، اور کہا "تم لوگ، رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہو"۔ [4]

(۶) --- حذیفہؓ، رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرتے تھے، سلمان فارسی نے کہا "تم اس سے باز آؤ ورنہ میں عمرؓ کو لکھوں گا"۔ [5]

ممکن ہے اس طرح کے دو ایک اور واقعات بھی مل جائیں، منکرین حدیث، ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، حدیثوں کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے، ورنہ احادیث اور رواۃ کے متعلق، ان کا یہ مخالفانہ طرز عمل کیوں ہوتا۔

جائزہ

اوپر کے ان واقعات میں سے اکثر کا ماخذ، تذکرۃ الحفاظ (از علامہ ذہبی) ہے، ان سے حدیث وسنت کے خلاف، نتیجہ نکالنا، کچھ تو، کوتاہیٔ نظر اور قصورِ فہم کے باعث ہے، اور کہیں مخالفتِ حدیث وسنت کی دھن ایسی شدت اختیار کر گئی ہے، کہ یہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابوبکر + مقام حدیث، صفحہ ۷ [2]+[3] تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۶ + مقام حدیث، صفحہ ۹

[4] تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۷ + مقام حدیث، صفحہ ۹ [5] سنن ابی داؤد، كتاب السنة، باب فى النهى عن سبّ اصحاب رسول الله

نظر ہی نہیں آ سکا کہ جس روایت سے وہ استنتاج کر رہے ہیں، وہ تو خود مصنف کے نزدیک بھی بے اصل ہے، اور کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض روایات کا مطلب غلط سمجھ کر ان سے غلط نتیجہ اخذ کیا گیا ہے، حالانکہ ان سے مخالفت حدیث کا نتیجہ ہی نہیں نکلتا، اور خود حافظ ذہبی بھی، اس نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں، جن کی کتاب سے منکرینِ حدیث، بعض روایات لے کر مطلب برآری کر رہے ہیں، وہ اگر یہ نتیجہ نکالتے، تو اپنی اسی کتاب میں ان بیسیوں واقعات کو نقل نہ کرتے، جو اس نتیجہ کی تردید بلکہ تغلیط کرتے ہیں کیونکہ خود انھوں نے متعدد واقعات خلفائے راشدین کے احتجاج بالحدیث والسنۃ کے لکھے ہیں، پھر ان کثیر التعداد واقعات کو چھوڑ کر، بعض قلیل اور مشتبہ واقعات کو لے لینا، جن سے بزعمِ منکرین حدیث، مخالفتِ حدیث نکلتی ہے، کہاں تک جائز ہے، اوپر کی روایات کو، اگر جملہ واقعات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ان سے صرف احتیاط فی الروایہ ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھتا ہے، اور خود حافظ ذہبی بھی یہی سمجھتے ہیں، اور یہی سمجھ کر، ان کو اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں۔

ابوبکرؓ کا طرز عمل

قبل اس کے کہ ان واقعات پر، تحقیقی نظر ڈالی جائے، سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ خود خلفائے راشدین کا، احتجاج بالحدیث والسنۃ کے باب میں کیا طرز عمل رہا ہے، بالخصوص، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی، بحیثیت خلیفۂ راشد کے، کیا سرکاری پالیسی رہی ہے۔

ہمارے ان ''جدید محدثین'' کے علاوہ، تمام علمائے حدیث اور ائمۂ اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ خلفائے راشدین، کتاب اللہ کے بعد، حدیث وسنت ہی کو رہنما جانتے تھے، اسی لیے وہ خلفائے راشدین کہلاتے تھے، کہ کسی معاملے میں بھی، وہ، عملِ نبوی سے سرمو تجاوز نہ کرتے تھے، حدیث وطبقات کی کتابیں، اس قسم کے واقعات سے معمور ہیں، خصوصاً شیخین تو اس بارہ میں اور بھی زیادہ متشدد تھے، حضرت ابوبکرؓ کا دستورِ عمل یہ تھا کہ جب کوئی صورت پیش آتی، تو پہلے کتاب اللہ، اور پھر اس کے بعد سنتِ رسول اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، چند حوالے ملاحظہ فرمائیے۔

كان ابوبكر اذا ورد عليه الخصم نظر فى كتاب فان وجد فيه ما يقضى بينهم قضى به وان لم يكن فى الكتاب و علم من رسول الله ﷺ فى ذالك الامر سنة قضى به فان اعياه خرج فسأل المسلمين۔[1]

ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو پہلے کتاب اللہ میں دیکھتے تھے، اگر اس میں پاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اور اگر کتاب اللہ میں نہ ہوتا اور رسول اللہ ﷺ سے اس بارہ میں کوئی سنت، ان کے علم میں آ جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کر ڈالتے، اگر اس میں بھی حل نہ ملتا تو مسلمانوں سے پوچھتے۔

علامہ ابن القیم، بحوالۂ کتاب القضاء، لابی عبید لکھتے ہیں۔

كان ابوبكر الصديق اذا ورد عليه حكم نظر فى كتابه تعالىٰ فان وجد فيه مايقضى به قضى به وان لم

[1] سنن الدارمی، مقدمہ، باب الفتیا وما فیہ من الشدۃ

یجد فی کتاب اللہ نظر فی سنۃ رسول اللہ ﷺ فان وجد فیھا ما یقضی بہ قضی بہ فان اعیاہ ذالک سئل الناس ھل علمتم ان رسول اللہ ﷺ قضی فیہ بقضاءٍ فربما قام الیہ القوم فیقولون قضی فیہ بکذا و کذا فان لم یجد سنۃ سنھا البنی ﷺ جمع رؤساء الناس فاستشارھم فاذا اجتمع رأیھم علیٰ شئ قضی بہ۔[1]

ابوبکر کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو پہلے کتاب اللہ میں دیکھتے تھے اگر اس میں مواد مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے، اور اگر کتاب اللہ میں نہ ملتا تو سنت رسول اللہ میں دیکھتے، اگر اس میں کچھ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے، جب اس سے بھی عقدہ کشائی نہ ہوتی تو لوگوں سے پوچھتے کہ کیا تم لوگوں کو علم ہے کہ اس بارہ میں رسولؐ اللہ نے کوئی فیصلہ کیا تھا؟ بسا اوقات، کچھ لوگ کھڑے ہو جاتے اور کہتے کہ اس معاملہ میں رسولؐ اللہ نے ایسا اور ایسا فیصلہ کیا ہے اور جب نبی ﷺ کی کوئی سنت بھی نہ پاتے تو سربرآوردہ مسلمانوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جس رائے پر اجماع ہو جاتا، اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔

بیعت خلافت کے بعد، آپ نے جو پہلا خطبہ دیا، اس میں کتاب اللہ کے بعد، سنت رسول ہی کو اپنا امام ورہنما قرار دیا۔

اما بعد، ایھا الناس قد ولیت امرکم ولست بخیرکم ولکن نزل القرآن وسن النبی السنن فعلّمنا فعلمنا .... ایھا الناس انما انا متبع ولست بمبتدعٍ فان احسنت فاعینونی وان زغت فقوّمونی[2] اما بعد، میں تمہارے معاملات کا، اے لوگو، ولی بنایا گیا ہوں مگر میں تم سے بہتر نہیں ہوں، لیکن قرآن نازل ہو چکا، اور رسول اللہ نے اپنی سنن قائم فرما دیں، انھوں نے ہمیں تعلیم دی پس ہم صاحب علم ہوئے ....لوگو! میں متبع رسول ہوں، اور نئی بات گھڑنے والا نہیں ہوں، اگر میں اچھا کام کروں تو اعانت کرو، اور اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر ڈالو۔

خلیفہ بنتے ہی، یہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی وہ پہلی تقریر ہے، جس میں انھوں نے اپنی متبعانہ حیثیت کو بیان کیا ہے، اور مبتدعانہ حیثیت کی نفی کی ہے، اور کتاب اللہ کے بعد سنت رسول ہی کو اپنا رہنما تسلیم کیا ہے۔

ان اعلانات کے بعد ان کے طرز عمل کو بھی ملاحظہ فرمائیے، جس میں وہ قرآن کے بعد، حدیث وسنت ہی کو ماخذ قانون مانتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ہی، جبکہ آپ کا جسد خاکی ابھی، آنکھوں سے نہاں نہ ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ صدیق کو حدیثِ رسول کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد، یہ سوال پیدا ہوا کہ جسدِ اطہر کو کہاں دفن کیا جائے، کچھ لوگ کہتے تھے کہ مسجد نبوی میں دفن کیا جائے، بعضوں کی رائے یہ تھی کہ آپؐ کو صحابہؓ کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے حدیثِ نبوی کی بنیاد پر اس کا فیصلہ کیا۔

فقال ابوبکر: انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول "ما قبض نبی الا دفن حیث یقبض"[3] ابوبکر نے کہا کہ

---

[1] اعلام الموقعین، جلد ۱، صفحہ ۶۲ [2] طبقات ابن سعد، جلد ۱، ق ۱، صفحہ ۱۲۹

[3] سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ذکر وفاتہ ودفنہ

میں نے رسولِ خدا کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جہاں پر کسی نبی کی روح قبض کی جاتی ہے، اسے وہاں ہی دفن کیا جاتا ہے"۔

چنانچہ اس حدیث کے مطابق، آنحضرت ﷺ کا بستر اٹھا کر اسی جگہ قبر کھودی گئی۔

وفاتِ رسول کے بعد، جب حضرت فاطمہؓ نے میراثِ نبوی کا مطالبہ کیا تو آپؓ نے حدیثِ نبوی ہی کی بنیاد پر فیصلہ فرمایا۔

فقال ابوبکر ان رسول الله ﷺ قال "لا نورث، ماتر کناه صدقة"، انما یاکل ال محمد فی هذا المال وانی والله لا اغیر شیئاً من صدقة رسول الله ولا عملن فیها بما عمل به رسول الله [۱] ابوبکرؓ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "ہماری میراث (تقسیم) نہیں ہوتی، ہم نے جو کچھ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے"، البتہ آلِ محمد، اس میں سے کھا پی سکتے ہیں، خدا کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ کے صدقات میں تغیر نہیں کروں گا اور اس میں وہی کروں گا جو رسول اللہ نے کیا ہے۔

منکرینِ حدیث کو غور کرنا چاہئے کہ حضرت ابوبکرؓ نے میراثِ نبوی میں بھی جو حضرت فاطمہ کو ملنے والی تھی، حدیث نبوی پر عمل ضروری سمجھا، اور حضرت فاطمہ کو صاف جواب دے دیا، ایسی حالت میں اور مسائل کا کیا ذکر ہے؟

علاوہ ازیں، ابوبکرؓ کے عمل بالحدیث کا یہ واقعہ طلوعِ اسلام میں بھی موجود ہے۔

> حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی، انھوں نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تیرا حصہ نہیں پاتا، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے دادی کو ایک سدس دلوایا ہے، فرمایا کوئی تمہارے اس قول پر شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ نے کہا میں شہادت دیتا ہوں، اسوقت اس کو ایک سدس دلوایا۔ [۲]

اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جنھیں کتب احادیث سے پیش کیا جا سکتا ہے، یہ چند واقعات، مشتے نمونہ از خروارے حاضر ہیں۔

حضرت عمرؓ کا طرز عمل

حضرت ابوبکرؓ کے بعد، حضرت عمرؓ کا بھی یہی طرز عمل رہا، وہ بھی کتاب اللہ کے بعد، سنتِ رسول ہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، بلکہ انھوں نے سنتِ رسولؐ کے ساتھ سنتِ ابی بکر کو بھی جمع کر لیا تھا، کہ یہ بھی سنتِ رسولؐ ہی پر مبنی ہے چنانچہ وہ خود اس کا اظہار بایں الفاظ فرماتے ہیں۔

انه مضیٰ لی صاحبان لی یعنی النبی ﷺ و ابابکر عملا عملاً وسلکا طریقاً فانی ان عملت بغیر هما سلک بی غیر طریقهما [۳] میرے دو ساتھی یعنی نبی ﷺ اور ابوبکرؓ آگے جا چکے، انھوں نے خاص اعمال کیے اور مخصوص راستہ اختیار کیا، اب اگر میں کسی اور راستے پر چلوں تو میری وجہ سے ایک اور راہ کھل جائے گی۔

اس میں خود انھوں نے اپنے لیے، عملِ رسولؐ اور عملِ ابی بکرؓ کی پیروی ضروری قرار دی ہے۔

۱؎ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر
۲؎ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۰، صفحہ ۶۳
۳؎ طبقات ابن سعد، جزو ۳، ق ۱، صفحہ ۲۷

حافظ ابن القیمؒ، حضرت عمرؓ کی اس روش کو بیان کرنے کے بعد، لکھتے ہیں کہ

وکان عمر یفعل ذالک، فاذا اعیاہ ان یجد ذالک فی الکتاب والسنۃ ، سئل، ھل کان ابوبکر قضی فیہ بقضاءٍ؟ فان کان لابی بکر قضاء قضیٰ بہ والا جمع علماء الناس واستشارھم فاذا اجتمع رایھم علی شیءٍ قضی بہ [1] حضرت عمرؓ بھی ایسا ہی (یعنی رجوع الی الکتاب والسنۃ) کیا کرتے تھے، اور جب کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں بھی کچھ نہ ملتا تو لوگوں سے پوچھتے کہ ابوبکر نے اس میں کوئی فیصلہ کیا ہے؟ اگر ابوبکر کا فیصلہ پاتے تو اس کے مطابق معاملہ طے کر دیتے، ورنہ پھر اہل علم بزرگوں کو جمع کر کے باہم مشورہ کرتے اور جس رائے پر اتفاق ہوتا اس کے مطابق فیصلہ کر ڈالتے۔

قاضیوں کو عہدۂ قضاء پر مقرر کرتے وقت، خاص طور سے کتاب اللہ اور پھر سنتِ رسولؐ اللہ کے مطابق فیصلوں کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب تاریخ اسلام کے مشہور قاضی شریح کو کوفہ کا جج مقرر کیا تو انھیں یہ تاکید فرمائی کہ

انظر مایتبین لک فی کتاب اللہ فلا تسئل عنہ احداً، ومالم یتبین لک فی کتاب اللہ فاتبع فیہ سنۃ رسول اللہ، ومالم یتبین لک فیہ سنۃ فاجتھد فیہ رأیک [2] جو مسئلہ پیش آئے، اس میں پہلے کتاب اللہ کو دیکھو، جو کچھ کتاب اللہ سے ظاہر ہو تو پھر کسی سے نہ پوچھو اور جب کتاب اللہ سے ظاہر نہ ہو تو سنتِ رسول کا اتباع کرو، اور جب سنت سے بھی ظاہر نہ ہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو۔

چونکہ آپؓ کے زمانہ میں بکثرت فتوحات ہوئیں، نئے نئے ممالک زیرنگیں ہوئے، نئی نئی قومیں، حلقہ بگوش اسلام ہوئیں، اس لیے آپ نے ان ملکوں کے عمال کو انتظام ملکی کے ساتھ ساتھ، وہاں کی رعایا کی دینی تعلیم میں سنتِ نبوی کی تعلیم کا بھی حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے اپنی شہادت کے وقت، خدا کو اپنے جن اعمال پر شاہد بنایا تھا، ان میں ایک عمل تعلیمِ سنتِ رسول بھی تھی۔ جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے۔

اللھم انی اشھدک علی امراء الامصار فانی انما بعثتھم لیعلموا الناس دینھم وسنۃ نبیھم ویعدلوا علیھم ویقسموا فیئھم ویرفعوا الی ما اشکل علیھم من امرھم [3] خدایا! میں تجھ کو شہروں کے حکام پر گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے ان کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو ان کے دین اور ان کے نبی کی سنت کی تعلیم دیں اور ان میں عدل کریں اور مالِ غنیمت کا حصہ تقسیم کریں اور انھیں جو مشکل پیش آئے، اسے میرے سامنے پیش کریں۔

امراء وعمال کے علاوہ، صاحبِ علم صحابہؓ کو، اشاعتِ حدیث کے لیے مختلف ملکوں کو بھیجتے تھے، چنانچہ فقیہ الامت، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ، معقل بن یسارؓ، عبداللہ بن معقلؓ اور عمران ابن حصینؓ کو بصرہ، اور

---

[1] اعلام الموقعین، جلد ۱، صفحہ ۶۲ [2] اعلام الموقعین، جلد ۱، صفحہ ۶۳

[3] الصحیح مسلم ، کتاب المساجد و مواضع الصلوۃ، باب نھی من اکل ثوماً او بصلا

عبادہ بن صامتؓ اور ابودرداءؓ کو شام روانہ کیا، اور امیر معاویہؓ، والیٔ شام کو لکھا کہ یہ لوگ حدیث سے سرِ مو تجاوز نہ کرنے پائیں، شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں، اسے بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

چنانچہ فاروق اعظم، عبداللہ ابن مسعود را با جمعے بکوفہ فرستاد و معقل بن یسار و عبداللہ بن معقل و عمران بن حصین را بہ بصرہ، و عبادہ بن صامت و ابودرداء را بشام، و معاویہ ابن سفیان کہ امیرِ شام بود قدغن بلیغ نوشت کہ از حدیثِ ایشاں تجاوز نکند[۱]

یہ تمام مندرجہ بالا روایات، احتجاج بالحدیث والسنۃ کے بارہ میں حضرت عمرؓ کے اصولی اور نظریاتی پہلو سے وابستہ ہیں۔ اب واقعات کی صورت میں ان کی عملی مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

شیبہ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے جبکہ وہ مسجد (کعبہ) میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، مجھ سے کہا کہ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ تمام سونا چاندی، مسلمانوں میں تقسیم کردوں اور اس گھر میں کچھ نہ رہنے دوں (یعنی کعبہ میں)۔ میں نے کہا، کہ ''تم کو اس کا کیا حق ہے؟'' فرمایا'' کیوں؟'' میں نے کہا'' اس لیے کہ تمہارے دونوں پیشرو ساتھیوں (رسولؐ اللہ اور ابوبکرؓ) نے ایسا نہیں کیا'' عمر نے کہا'' میں انھی دونوں کی اقتداء کرتا ہوں''۔ صحیح بخاری میں یہ واقعہ یوں مذکور ہے۔

.... **فقال هممت ان لا ادع فيها صفراء ولا بيضاء الا قسمتها بين المسلمين قلت ما انت بفاعلٍ قال لم قلت لم يفعله صاحبك قال هما المرأن يقتدى بهما**[۲] ......حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ'' میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اس گھر (کعبہ) میں کوئی سونا اور چاندی نہ چھوڑوں بلکہ اسے مسلمانوں میں تقسیم کردوں''، میں نے کہا'' تم ایسا نہیں کرسکتے'' انھوں نے کہا'' کیوں؟'' میں نے کہا تم سے قبل دونوں تیرے ساتھیوں نے ایسا نہیں کیا'' فرمایا'' دونوں قابل اقتداء ہیں''۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ، ایک مجنون زانیہ عورت کو سنگسار کرنا چاہا، حضرت علیؓ کو معلوم ہوا، تو آپ نے فرمایا۔

سمعت رسول الله ﷺ يقول رفع القلم عن ثلاثةٍ، عن النائم حتى يستيقظ وعن الطفل حتى يحتلم وعن المجنون حتى يبرء او يعقل فادرء عنها عمر[۳] میں نے نبی اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ'' تین شخص، مرفوع القلم ہیں، سونے والا، جب تک کہ بیدار نہ ہو جائے، بچہ جب تک کہ بالغ نہ ہو جائے، اور مجنون جب صحیح یا صاحب عقل نہ ہو جائے''، یہ حدیث سنکر حضرت عمرؓ نے عورت پر سے حد ٹال دی۔

کیا یہ واقعہ اس امر میں صریح نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ، ہر حال میں، کتاب اللہ کے بعد، عمل بالحدیث اور تمسک بالسنۃ پر عامل تھے؟

یہی نہیں کہ آپ مسائل و احکام ہی میں سنت رسولؐ کو دلیلِ راہ بناتے تھے، بلکہ بعض ان سنتوں میں بھی، جن سے

---

[۱] ازالۃ الخفاء، جلد ۲، صفحہ ۶

[۲] صحیح البخاری، کتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله + صحیح البخاری، کتاب الحج، باب کسوۃ الکعبۃ

[۳] صحیح البخاری، کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق والکرہ

بظاہر کوئی فائدہ مقصود نہ ہوتا تھا، محض سنتِ رسولؐ ہونے کی بناء پر، ان پر عمل کرتے تھے، حجر اسود کا بوسہ لینا ارکانِ حج میں نہیں ہے، بلکہ محض سنت ہے، اور ایسی سنت، جس سے بظاہر کوئی غرض بھی مقصود نہیں، اور جس کا ترک کرنا کسی دینی مضرت کو بھی مستلزم نہیں، لیکن حضرت عمرؓ محض سنت کے خیال ہی سے اسے چومتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

لولا انی رءیت رسول اللہ ﷺ قبلک ما قبلتک[1] اگر میں نے آنحضرت ﷺ کو، تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھ کو قطعاً نہ چومتا۔

کیا یہ حیرت اور استعجاب کی بات نہیں کہ جو شخص، ایسے امور میں بھی اتباعِ حدیث و سنت میں شدت اختیار کرتا ہے، جن میں کسی دنیوی غرض، یا مادی ضرورت کے پورا ہونے کا امکان بھی نہیں، اور وہ صرف اسے اس لیے اپناتا ہے کہ یہ محض عملِ رسول ہے، اس کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ وہ احادیثِ رسول اور سننِ نبی کی مخالفت کرے گا؟ یا کم از کم انھیں ناقابلِ التفات سمجھے گا؟

احادیث و سنن کے بارے میں حضرت عمرؓ کی دائمی روش اور مستقل عادت کیا تھی؟ اس کے بارے میں، مولانا شبلی نعمانی، ''احادیث کا تفحص'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ

> احادیث کے متعلق پہلا کام، جو حضرت عمرؓ نے کیا یہ تھا کہ روایتوں کی تفحص و تلاش پر توجہ دی، آنحضرتؐ کے زمانہ میں احادیث کے استقصاء کا خیال نہیں کیا گیا تھا، جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا تھا، خود آنحضرت سے دریافت کر لیتا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ کسی ایک صحابیؓ کو فقہ کے تمام ابواب کے متعلق حدیثیں محفوظ نہ تھی، حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں زیادہ ضرورتیں پیش آئیں، اس لیے مختلف صحابہ سے استفسار کرنے کی ضرورت پیش آئی اور احادیث کے استقراء کا راستہ نکلا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں چونکہ زیادہ کثرت سے واقعات پیش آئے، کیونکہ فتوحات کی وسعت اور نومسلموں کی کثرت نے سینکڑوں نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے، اس لحاظ سے انھوں نے احادیث کی زیادہ تفتیش کی تاکہ یہ مسائل آنحضرت کے اقوال کے موافق طے کیے جائیں، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جب کوئی نئی صورت پیش آتی تو حضرت عمرؓ مجمعِ عام میں، جس میں اکثر صحابہ کرام موجود ہوتے، پکار کر کہتے کہ اس مسئلے کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے؟ تکبیر جنازہ، غسلِ جنابت، جزیہ مجوس اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں، جن کی نسبت، کتب احادیث میں نہایت تفصیل سے مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجمعِ صحابہؓ سے استفسار کر کے احادیث نبوی کا پتہ لگایا۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام کا اصل ماخذ اور سرچشمہ، صرف اور صرف، قرآن و سنت ہے، اسلام کا تمام تر نظام ریاست، اسی اساس پر قائم ہے، خلفائے راشدین کا نظامِ حکومت بھی اسی بنیاد پر استوار تھا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار، پرویز صاحب کے استاد، جناب اسلم جیراجپوری صاحب بھی نہ کر سکے، حالانکہ وہ اپنے دور میں فتنۂ انکارِ حدیث کے علم برداروں میں سے ایک اہم فرد تھے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

> (۱) --- خلافت راشدہ میں تشریع کی بنیاد، قرآن و سنت پر تھی۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آجاتا جس کے بارے میں کوئی

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب استحباب تقبیل الحجر [2] الفاروق، (شبلی نعمانی)، صفحہ ۵۵۴

صریح حکم ان دونوں میں نہ ملتا تو امثال ونظائر پر قیاس کر کے اس کا حکم نکالتے تھے۔ [۱]

(۲) --- خلافتِ راشدہ میں سیاست کتاب وسنت کے مطابق تھی، لیکن عہد بنی امیہ میں قوت، غلبہ اور قہر کی حکمرانی ہوئی۔ [۲]

طلوعِ اسلام اور اعترافِ حقیقت

لیکن انسان، خواہ کتنا ہی حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے کبھی ان کی چلمنی سی جھلک، واقعی صورتحال کو واشگاف کر دیتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص، تصنع، تکلف اور بناوٹ کر کے کوئی بات گھڑتا ہے، تو وہ چند لمحات وساعات، یا ایام و اسبوعات کے لیے تو بیداریٔ مغز کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے ''تَصَنُّعَات'' کی نگہداشت کر لیتا ہے، مگر عمر بھر وہ اپنے اس تکلف کو نبھا نہیں سکتا اور کبھی نہ کبھی، اس کے منہ سے سچی بات نکل ہی جاتی ہے، کچھ ایسے ہی لمحات تھے، جن میں ''مفکر قرآن'' کو اس حقیقت کا بیساختہ اقرار کرنا پڑا کہ

> جب حضرت ابوبکر صدیق، حضور ﷺ کے جانشین (خلیفہ) مقرر ہوئے، تو آپؓ نے اعلان کیا کہ میں قرآن کریم اور سنتِ رسول اللہ کی اتباع کروں گا، اس کا مطلب یہی تھا کہ میں کسی نئی حکومت کی طرح نہیں ڈال رہا، میری حکومت، سابقہ حکومت ہی کا تسلسل ہے، اسی طرح حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں سنت رسول اللہ اور سنتِ ابوبکرؓ کی اتباع کروں گا، اس سے بھی مقصود وہی تھا۔ [۳]

''مفکر قرآن'' کی عادت تھی، کہ اگر کسی جگہ، ان سے اعترافِ حقیقت ''سرزد'' ہو گیا ہے، تو کسی دوسرے مقام پر، وہ اپنی عبارت کو اس طرح بدل دیا کرتے تھے، کہ ''اعترافِ حقیقت'' کا شائبہ تک نہ پایا جاتا تھا، اس کی واضح اور نمایاں مثال، معارف القرآن جلد چہارم ہے، جس میں بہت سے حقائق کا اعتراف موجود ہے، لیکن جب اسی کتاب کو معراج انسانیت کے نام سے پیش کیا، تو ان حقائق کو اس قدر حذف وازالہ کا نشانہ بنایا گیا کہ ۸۳۲ صفحات کی اول الذکر کتاب، صرف ۴۶۴ صفحات کی موخر الذکر کتاب میں سمٹ کر رہ گئی، لیکن یہاں نسیان و ذہول کا ایسا پردہ، ''مفکر قرآن'' پر پڑا کہ وہ اس عبارت کو ''سنت رسول اللہ'' کے الفاظ سے ''پاک کرنا'' بھول گئے، اور من وعن، اسی عبارت کو سلیم کے نام، جلد دوم کے صفحہ ۱۲۷ پر ثبت کر بیٹھے، لیکن پھر اس کا کفارہ، مفہوم سنت کو بدل کر ادا کر دیا گیا۔

شیخینؓ کے بارے میں، ایسا ہی اعتراف، طلوعِ اسلام کے ایک مقام پر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

> ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو اول، آپ کتاب اللہ میں دیکھتے، اگر اس میں کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے، اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز نہ ملتی اور ان کے علم میں، رسول اللہ کی سنت میں کوئی چیز ایسی ہوتی جس سے اس کا فیصلہ کیا جا سکے، تو آپ اس کے مطابق فیصلہ فرما دیا کرتے، اگر سنت میں بھی کچھ نہ ملتا تو پھر آپ باہر نکل کر مسلمانوں سے اس کے متعلق دریافت فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس ایسا ایسا معاملہ آیا ہے کیا تم لوگوں کو کچھ معلوم ہے کہ رسول اللہ نے اس جیسے کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمایا ہو؟ اکثر ایسا ہوتا کہ بہت سے لوگ جمع ہو جاتے اور وہ بیان کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے

[۱] تاریخ الامت، جلد ۲، صفحہ ۲۵۷ [۲] تاریخ الامت، جلد ۳، صفحہ ۱۶۱ [۳] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۶ء، صفحہ ۲۱

اس قسم کے معاملہ میں یہ فیصلہ فرمایا تھا .... اگر اس طرح رسول اللہ ﷺ کی کسی سنت کا پتہ نہ لگتا تو پھر آپ بڑے بڑے سمجھدار لوگوں کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ لیتے، اگر کسی بات پر ان کا اتفاق ہو جاتا تو پھر اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے، حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا، کہ اگر قرآن اور سنت میں انھیں کوئی چیز نہ ملتی، تو وہ اس کے بعد بھی یہی دیکھتے کہ آیا اس بارے میں حضرت صدیق اکبرؓ کا کوئی فیصلہ موجود ہے یا نہیں۔ اگر صدیق اکبرؓ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے ورنہ پھر قوم کے سربرآوردہ لوگوں کو اکٹھا کر کے، ان سے مشورہ فرماتے، اور جو بات، وہ متفقہ طور پر طے کر دیتے، اس کے مطابق فیصلہ فرما دیا کرتے۔ [۱]

الغرض، یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ قرآن کے بعد، سنتِ رسول، اسلامی قانون کا ماخذ و سرچشمہ ہے اور جملہ صحابہؓ بشمول حضرات خلفائے راشدین، قرآن کے بعد عمل بالحدیث اور تمسک بالسنۃ کی روش اپنائے ہوئے تھے۔

تذکرۃ الحفاظ کی روایات کی توضیح و تنقیح

اس تفصیل کے بعد، امام ذہبی کی کتاب ''تذکرۃ الحفاظ'' کی ان روایات کی تنقید و تنقیح کی جاتی ہے، جن کو فتنۂ انکار حدیث کے علمبردار، اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں، ناظرین کرام سے درخواست ہے کہ ان مخالف روایات کو، جو اوپر گزر چکی ہیں، انھیں پیش نظر رکھ کر، درج ذیل گذارشات کا مطالعہ فرمائیں۔

ابوبکرؓ کے منعِ روایتِ حدیث کی اصل حقیقت

حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو روایتِ حدیث سے اس لیے نہیں روکا تھا کہ ان کے نزدیک یہ قابل حجت نہ تھیں، بلکہ خود ان کی تشریح کے مطابق، اس کا سبب یہ تھا کہ

انکم تحدثون عن رسول اللہ ﷺ احادیث تختلفون فیھا و الناس بعدکم اشدُّا اختلافاً فلا تحدّثوا عن رسول اللہ ﷺ شیئاً فمن سئلکم فقولوا بیننا وبینکم کتاب اللہ [۲] تم لوگ، رسول اللہ ﷺ سے ایسی احادیث بیان کرتے ہو کہ جن میں تم اختلاف کرتے ہو، جب تمہارا یہ حال ہے تو تمہارے بعد آنے والوں میں اس سے زیادہ اختلاف ہوگا، اس لیے رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو، جو شخص تم سے پوچھے، اس سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کتاب اللہ ہے۔

اولاً اس کا سبب مسلمانوں کو اختلاف سے بچانا ہے، نہ کہ حدیث کا انکار اور اس کا نا قابلِ حجت ہونا۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض لوگ بلا امتیاز ہر قسم کی احادیث بیان کیا کرتے تھے، جو باہم مختلف ہوتی تھی، اس سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہونے کا خطرہ تھا، اس لیے، اس اختلاف سے بچاؤ کے لیے روایت حدیث کی ممانعت کر دی گئی، لیکن اس سے روایت حدیث کا دروازہ بند کرنا مقصود نہ تھا، ورنہ وہ خود احادیث و سنن سے کیوں تمسک کرتے، خود حافظ ذہبی، اس روایت کے بعد ہی اپنی یہ رائے لکھتے ہیں۔

---

[۱] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۹ء، صفحہ ۵۷ تا ۵۸ [۲] تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۳

فھذا المرسل یدلک علی ان مراد الصدیق التثبت فی الاخبار والتحری، لا سدباب الروایة ، الا تراہ لما نزل بہ امر الجدّة ولم یجدہ فی الکتاب کیف سئل عنہ فی السنن فلما اخبرہ الثقة ما اکتفی حتی استظھر ثقة اخر ولم یقل حسبنا کتاب اللہ کما تقولہ الخوارج[1] یہ مرسل روایت، یہ بتاتی ہے کہ ابوبکر صدیق کا مقصد، حدیثوں کی تصدیق اور توثیق تھی، نہ کہ احادیث کا دروازہ بند کرنا، تم نے نہیں دیکھا کہ جب ان کے پاس دادی کے ترکہ کا معاملہ آیا اور کتاب اللہ میں انھوں نے نہیں پایا تو کیسے اس مسئلہ میں سنتِ رسول کو دریافت کیا اور جب ایک ثقہ نے ان کو خبر دی تو اسے کافی نہ جانا جب تک کہ دوسرے نے تصدیق نہ کی۔ اس وقت خوارج کی طرح انھوں نے یہ نہیں کہا کہ کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔

ثانیاً یہ روایت، مرسل ہے جیسا کہ حافظ ذہبی نے تصریح کر دی ہے فقط ایک تابعی کا بیان ہے۔

ایسی حالت میں، اُس روایت سے، جو مرسل ہے، حضرت ابوبکرؓ کے انکارِ حدیث کا نتیجہ کس طرح درست ہے، اس کی صحت کی حالت میں صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے عوام کو جو بلا امتیاز، ہر طرح کی حدیثیں روایت کرتے تھے، اختلاف کے خطرہ سے روکا ہے۔

پانچ صد احادیث کے جلانے کا واقعہ

رہا یہ واقعہ، کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پانچ سو احادیث پر مشتمل، اپنے مجموعہ کو نذرِ آتش کر دیا، تو یہ جس روایت میں مذکور ہے، وہ روایت ہی صحیح نہیں، اس کا راوی، ابراہیم بن عمر بن عبید اللہ التیمی مجہول ہے، رجال کی کتابوں میں اس کا ذکر ہی نہیں، جس روایت کا راوی ایسا مجہول ہو اس کی روایت کا کیا پایہ ہو سکتا ہے، خود حافظ ذہبی بھی جنھوں نے بحیثیت واقعہ نگار، یہ روایت نقل کی ہے، اسے قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے، اور آخر میں لکھتے ہیں کہ

لا یصح ذالک[2] یہ روایت ہی صحیح نہیں ہے۔

پھر اس سے استدلال کیسا؟ اس علمی خیانت کو دیکھئے کہ منکرین حدیث، (بشمول ہمارے "مفکرِ قرآن" صاحب) اوپر کا واقعہ تو امام ذہبی سے نقل کرتے ہیں، مگر اس کا آخری حصہ، جس میں اس روایت کے عدمِ صحت کا ذکر ہے، چھوڑ دیتے ہیں، باقی منکرین حدیث تو صرف اس علمی خیانت ہی کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن ہمارے "مفکرِ قرآن" صاحب، اس علمی خیانت کے ساتھ ساتھ، روایت کے عدمِ صحت کو جان لینے کے بعد بھی، جب اسے پیش کرتے ہیں، تو اس "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کا سہارا بھی لیتے ہیں۔

> ممکن ہے ان روایات کی صحت کو محلِ نظر قرار دے دیا جائے، حالانکہ ہمارے نزدیک، ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی اور عملِ رسول کے عین مطابق ہیں۔[3]

لیکن بالفرض، اگر علامہ ذہبی کی اس روایت کو، (جس کی عدمِ صحت کی صراحت بھی خود انھوں نے کر دی ہے) صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکرؓ حدیثوں کو قابلِ حجت نہیں سمجھتے تھے، اگر وہ ایسا سمجھتے تو پہلے لکھتے ہی

---

[1] تذکرہ الحفاظ، جلد ا، صفحہ ۳ [2] تذکرہ الحفاظ، جلد ا، صفحہ ۵ [3] مقام حدیث، صفحہ ۹

کیوں؟ اس کا سبب خود ان ہی کی زبان سے یہ تھا۔

خشیت ان اموت وھی عندی فیکون فیھا احادیث عن رجل قد ائتمنته ووثقت ولم یکن کما حدثنی[1]

مجھے خوف ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ مجموعہ میرے پاس رہ جائے، اور اس میں ایسی احادیث ہوں جنھیں میں نے ایسے شخص سے لیا ہو، جسے میں نے امین اور قابل وثوق سمجھا ہو، لیکن درحقیقت وہ ایسا نہ ہو۔

اس تشریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے مجموعہ کو اس لیے نہیں جلایا تھا کہ آپ سرے سے حدیث ہی کے منکر تھے، بلکہ اس لیے کہ آپ کو، ان کے راویوں پر پورا اعتماد نہ تھا، ایسی حالت میں ان کا جلا دینا، انھیں ضروری معلوم ہوا، منکرینِ حدیث کا یہ استدلال، صرف اُسی وقت درست ہو سکتا تھا، جبکہ ابوبکرؓ نے ایسے مجموعہ احادیث کو نذر آتش کیا ہوتا جس کے راوی قابل اعتماد اور لائق اعتبار ہوتے، لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ یہ واقعہ ہی صحیح نہیں ہے، اور خود، اس عبارت میں ''احادیث'' اور ''وثوق'' کے دو الفاظ ایسے ہیں جو ان معنوں میں قرونِ اولیٰ میں مستعمل نہ تھے، اس سے یہ روایت سراسر نا قابل اعتبار اور بے اصل ثابت ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر کی مخالفت حدیث کی بنیاد، ان ہی دو واقعات پر استوار کی جاتی ہے جن کی حقیقت ظاہر کر دی گئی ہے۔

حضرت عمرؓ پر الزامِ مخالفتِ حدیث کا جائزہ

آیئے! اب ہم حضرت عمرؓ کے حوالہ سے ان واقعات کا جائزہ لیں، جن کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے، کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود مخالفِ حدیث تھے، بلکہ ان صحابہؓ کو سزا بھی دیا کرتے تھے، جو راویانِ حدیث تھے۔

(۱) حسبنا کتاب اللہ

حضرت عمرؓ کی مخالفت حدیث کے ثبوت میں ایک واقعہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ آپ فرماتے تھے **حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ** یعنی ''ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے'' اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ جب آپ خدا کی کتاب کو کافی سمجھتے تھے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ حدیثوں کو لائقِ التفات نہ خیال کرتے تھے۔

بیشک یہ جملہ حضرت عمرؓ کا ہے، لیکن اس کو حدیث کی مخالفت سے دور کا بھی تعلق نہیں، اور نہ اس کے وہ معنی ہی ہیں جو منکرین حدیث نکالتے ہیں، حدیث و رجال کی کسی کتاب میں یہ معنٰی و مفہوم کہیں نہیں ہے، حدیث کیا طبقات و تاریخ میں بھی اس معنٰی میں یہ جملہ کہیں نہیں مل سکتا۔ حدیث کی کتابوں میں بصحتِ سند یہ جملہ صرف ایک موقع پر آیا ہے اور یہ موقع وہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے مرضِ الموت میں فرمایا کہ قلم دوات لاؤ میں تمہارے لیے کچھ لکھ دوں تا کہ تم گمراہ نہ ہو تو حضرت عمرؓ نے اس خیال سے کہ آپؐ نے غفلت کی حالت میں ایسا فرمایا ہے اور درد کی تکلیف آپؐ کو زیادہ ہے، ایسی حالت میں آپؐ کو لکھنے

[1] تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۵

لکھانے کی زحمت دینا مناسب نہیں، پھر یہ جملہ کہا، اصل الفاظِ روایت یہ ہیں۔

قد غلب علیه الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب الله[1] اسوقت آپ پر درد کا غلبہ ہے تمہارے پاس قرآن موجود ہے، ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کو مخالفتِ حدیث سے کوئی تعلق نہیں، اور نہ اس موقع پر یہ بحث ہی جاری تھی کہ سند و حجت کیا چیز ہے اور کیا نہیں ہے کہ موضوعِ سخن، یہ معنی لینے میں قرینہ بن جائے، بلکہ اس کا تعلق خاص اس واقعہ سے ہے جو مرض الموت میں پیش آیا ہے۔

دوسرے موقع پر یہ جملہ، تاریخ اور بعض رجال کی کتابوں میں بھی ملتا ہے جب مسلمانوں نے عجم فتح کیا تو وہاں کچھ عجمی کتابیں ہاتھ آئیں، حضرت عمرؓ کو ان کی اطلاع دی گئی یا وہ کتب آپ کے پاس لائی گئیں، تو فرمایا ''ہم کو ان کی ضرورت نہیں حسبنا کتاب الله ''۔ کہاں کا جملہ! اور کہاں پیش کیا جاتا ہے، کجا فرمانِ رسول اور کجا عجم کی زہر آلود فلسفیانہ کتابیں،'' چہ نسبت خاک را با عالم پاک''۔ ممکن ہے اسی قبیل کے واقعات میں کہیں اور بھی یہ جملہ آیا ہو جسے ہم نہ جانتے ہوں، لیکن اسے بہر حال، مخالفتِ حدیث سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

(۲) واقعہ قرظہ بن کعب

دوسرا واقعہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ آپ نے قرظہ بن کعب کو عراق بھیجتے وقت روایتِ حدیث کی ممانعت کی تھی، اور جب ممانعت کی تھی تو لامحالہ آپ مخالف رہے ہوں گے۔

لیکن اولاً، تو یہی صحیح نہیں کہ آپ نے مطلقاً روایت کی ممانعت فرمائی تھی، بلکہ تقلیل روایت کا حکم دیا تھا، اور وہ بھی ایک خاص مصلحت کی بناء پر، جس کو انھوں نے خود بیان کر دیا ہے۔

فانکم تاتون اهل قریة لهم دوی بالقرآن کدوی النحل فلا تصدو هم بالاحادیث فتشغلوهم ، جردوا القرآن واقلّوا الروایة عن رسول الله[2] تم لوگ ایسے مقام پر جا رہے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں، تم لوگ ان کو حدیثوں میں روک کر قرآن سے غافل نہ کر دینا، قرآن کو بے آمیز رکھو اور رسولؐ اللہ سے کم روایت کرو۔

حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ آپ نے مطلق روایتِ حدیث سے نہیں روکا، بلکہ **اقلّوا الروایة عن رسول الله** کہہ کر، قرآن کے مقابلہ میں، ذرا کم روایت کرنے کا حکم دیا تھا، اور یہ بھی صرف اس خطرہ سے بچنے کے لیے کہ یہ لوگ ابھی نومسلم ہیں، پہلے انھیں قرآنی اسباق ہی سیکھنے چاہئیں، اس سے فرصت ملے تو انہیں درس حدیث دیا جائے، ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ حدیث کی طرف اس قدر متوجہ ہو جائیں کہ قرآن کو چھوڑ بیٹھیں۔

اس کے علاوہ، **جردوا القرآن** کا حکم بھی، قرآن کو حدیث کے ساتھ خلط ملط ہونے سے بچائے رکھنے کی مصلحت

---

[1] جامع صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ و مرضه

[2] تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، صفحہ ٦

کو واضح کر رہا ہے تاکہ قرآن کو خالص اور بے آمیز رکھا جائے، کیونکہ نو مسلموں سے یہ بعید نہ تھا کہ قرآنی عبارت اور حدیث کی عبارت میں فرق و امتیاز کی اُس صلاحیت سے بہرہ مند نہ ہونے کی بناء پر، غیر شعوری طور پر تلبیس و تدلیس کر گزرتے جس سے پختہ مزاج کے قدیم الاسلام لوگ بہرہ ور تھے۔

(۳) روایت ابی ھریرۃؓ، اور عمرؓ کا کوڑا

تیسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوسلمہؒ نے ابوہریرۃؓ سے پوچھا کہ تم عمرؓ کے زمانہ میں بھی اس طرح حدیثیں بیان کرتے تھے، انھوں نے کہا کہ اگر میں اسی طرح، ان کے زمانہ میں، احادیث بیان کرتا، تو وہ مجھے مارتے۔

لیکن یہ روایت، کئی وجوہ سے ناقابل اعتبار ہے۔

اولاً --- اس کی سند مجروح ہے، اس کا سلسلۂ سند یہ ہے۔ دراوردی عن محمد بن عمرو عن ابی سلمہ عن ابی ھریرۃ۔ اس روایت میں دراوردی راوی (جن سے امام ذہبی نے یہ روایت نقل کی ہے) دراصل محدّث عبدالعزیز دراوردی ہیں جو ۱۸۶ھ میں فوت ہوئے تھے، (دیکھئے تذکرہ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۲۴۵)، اور ذہبی چھٹی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے، اس لیے، دراوردی سے ان کی روایت موقوف ہے۔

ثانیاً --- محمد بن عمرو بن علقمہ، جن سے دراوردی نے یہ روایت لی ہے، ناقدینِ حدیث کے نزدیک کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے۔

لیکن اگر بالفرض، اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے، تب بھی اس سے حضرت عمرؓ کی مخالفتِ حدیث کا نتیجہ نہیں نکلتا۔ ایسا نتیجہ نکالنا، قبولِ حدیث کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کی کڑی شرط اور حضرت ابوہریرۃؓ کے حالات سے بے خبری کا ثبوت ہے، حضرت عمرؓ کا کڑا اصول یہ تھا کہ وہ خبر آحاد کو بغیر تائیدی شہادت کے قبول نہیں کیا کرتے تھے، جبکہ حضرت ابوہریرۃؓ کا حال یہ تھا کہ وہ بال بچوں کی فکر اور پریشانی سے آزاد تھے، اور سارا وقت، خدمت نبوی میں گزارتے تھے، خلوت و جلوت میں، ہر وقت ساتھ رہتے تھے، وہ خود فرماتے ہیں۔

ان اخواننا من المهاجرين كان يشغلهم الصفق بالاسواق وان اخواننا من الانصار كان يشغلهم العمل فی اموالهم وان ابا هريرة كان يلزم رسول الله ﷺ يشبع بطنه ويحضر مالا يحضرون ويحفظ مالا يحفظون [1]

بیشک ہمارے بھائی مہاجرین، تو بازاروں میں خرید و فروخت میں پھنسے رہتے اور ہمارے انصاری بھائی اپنی کھیتی باڑی کے کام میں لگے رہتے تھے، اور ابوہریرہ (جو نہ تاجر تھے اور نہ ہی کسان) اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آنحضرت ﷺ کے ساتھ چمٹا رہتا اور ایسے مواقع پر حاضر رہتا جہاں یہ لوگ حاضر نہ رہتے تھے اور وہ باتیں یاد رکھتا تھا جس کو دوسرے لوگ یاد نہیں رکھتے تھے۔

حضور ﷺ کی خلوت و جلوت میں ساتھ رہنے کی وجہ سے، انھوں نے حضور ﷺ سے صدہا ایسی روایات سنی تھیں،

[1] جامع صحيح بخاری، كتاب العلم، باب حفظ العلم

جن کے سماع میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہ تھا، ایسی حالت میں وہ ہر روایت کے ثبوت میں تائیدی شہادت کہاں سے پیش کرتے؟ اور جب ثبوت پیش نہ کر سکتے تو بہت ممکن تھا کہ حضرت عمرؓ اپنے کڑے اصول کی بناء پر، تائیدِ شہادت کی عدم موجودگی میں سزا دیتے، اس لیے ابو ہریرہؓ کے بیان کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ احادیث کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے، اس لیے وہ راویوں کو سزا دیتے تھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ خبر آحاد کو بغیر تائیدی شہادت کے وہ قبول نہ کرتے تھے، اور یہ قبولِ احادیث کے معاملہ میں ان کی انتہائی احتیاط تھی۔

ثالثاً --- پھر بالفرض اگر انھوں نے کسی ایک شخص کو کسی خاص مصلحت کی بناء پر کثرتِ روایت سے روک بھی دیا تو فرد واحد کو روکنا اور بات ہے اور مطلق روایتِ احادیث کو بند کر دینا اور بات ہے، اگر وہ مطلق روایت کو بند کر دیتے تو البتہ اس کو حدیث کی مخالفت میں پیش کیا جا سکتا تھا، لیکن اوپر کی روایت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

(۴) کثرت روایت پر صحابہؓ کو قید کرنا

کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبداللہؓ بن مسعود، ابودرداءؓ اور ابومسعودؓ انصاری کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ حضرت عمرؓ کی مخالفتِ حدیث کا نتیجہ نکالا جاتا ہے بلکہ یہ بھی کہ یہ تینوں صحابہؓ روایت کے اہل نہ تھے لہذا ان کی روایات بھی قابل حجت نہیں ہوسکتی ہیں۔

اولاً --- یہ روایت ہی سرے سے نا قابل قبول ہے، اس کی سند میں چند در چند نقائص ہیں، پوری سند یہ ہے۔

معن بن عیسٰی بن مالک، عن عبداللہ بن ادریس، عن شعبہ، عن سعید بن ابراھیم، عن ابیہ ۔ اس کے اولیں راوی، معن بن عیسٰی اور امام ذہبی میں کئی صدیوں کا فصل ہے، معن نے ۱۹۸ھ میں وفات پائی (تہذیب التہذیب، جلد ۱، صفحہ ۲۵۳) اور حافظ ذہبی، چھٹی صدی کے آخر میں پیدا ہوئے، اس لیے بغیر مسلسل سند کے، اس روایت کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی، پھر سعید بن ابراھیم کے نام کا کوئی راوی بھی، جرح سے خالی نہیں ہے، لیکن اگر طباعت کی غلطی مان لی جائے، تو سعد بن ابراھیم ہوسکتا ہے، اس نام کے ایک بزرگ، شعبہ کے شیوخ میں سے ہیں، لیکن پھر بھی یہ روایت موقوف ہی رہتی ہے، اس لیے کہ امام بیہقی کے نزدیک، ابراھیم کا سماع، حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں ہے (تہذیب التہذیب، جلد ۱، صفحہ ۱۳۹)، اس لیے حضرت عمرؓ کے کسی واقعہ میں بلا تسلسلِ سند کے تنہا ان کا بیان لائقِ اعتبار نہیں ہوسکتا۔

ثانیاً --- پھر اس واقعہ کے بے اصل ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس روایت میں مذکور تینوں بزرگ، کثرتِ روایت کے الزام کی زد میں آتے ہی نہیں۔ ابن مسعودؓ کی ہر قسم کی مرویات ۸۴۸ سے زائد نہیں ہیں، ان میں سے بھی کل ۶۴ متفق علیہ ہیں، ان کے علاوہ ۲۱ میں امام بخاری، اور ۳۵ میں امام مسلم منفرد ہیں (تہذیب الکمال، صفحہ ۲۱۴)۔ رہیں ابودرداء اور ابومسعودؓ کی روایات، تو ان کی تعداد (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا) ان سے بھی کم ہے۔ پھر حضرت ابن مسعودؓ،

روایتِ حدیث میں اس قدر محتاط تھے کہ سال سال بھر گزر جاتا تھا، اُن کی زبان سے قَالَ رَسُولُ اللهِ کا کلمہ نہ نکلتا تھا، جب کوئی حدیث بیان کرتے تھے، تو خوف سے بدن میں رعشہ طاری ہو جاتا تھا، حدیث کے الفاظ کو بجنسہٖ آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب نہ کرتے تھے بلکہ بہ سبیلِ احتیاط یہ کہہ دیتے تھے کہ رسول نے اسی طریقہ سے یا اس کے قریب قریب یا اس کے مشابہ فرمایا ہے، حدیثوں میں رسولؐ اللہ کے اصل الفاظ کو یاد رکھنا ضروری سمجھتے تھے، اور اپنے شاگردوں کو اس کی سخت تاکید کرتے تھے (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۱۲-۱۳)، عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ میں ایک سال تک ابن مسعودؓ کے پاس آتا جاتا رہا، لیکن اُن کی زبان سے رسولؐ اللہ کی کوئی حدیث نہیں سنی، اور قَالَ رَسُولُ اللهِ تو کسی روایت میں کہتے ہی نہ تھے، ایک مرتبہ، ایک حدیث بیان کرنے میں بیساختہ اُن کی زبان سے قَالَ رَسُولُ اللهِ نکل گیا تو ایسی شدید ہیبت طاری ہوئی کہ سخت کرب میں مبتلا ہو گئے، پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگا، پھر سنبھل کر کہا ان شاءاللہ، یا اس سے زیادہ یا کچھ کم، (طبقات ابن سعد، جلد ۳، ق ۱، صفحہ ۱۱)، ایسی شدید احتیاط کے باوجود، انھیں حدیثوں میں غیر محتاط کون کہہ سکتا ہے، ان کے ذاتی فضائل اور علمی کمالات کی بحث بہت طویل ہے جس کا یہ موقع نہیں، وہ اپنی دینی معلومات کے اعتبار سے، تمام صحابہؓ کی جماعت میں، نہایت ممتاز شخصیت تھے، کلام اللہ کی ستر سورتیں، براہِ راست، رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنکر یاد کی تھیں، کوئی سورت ایسی نہ تھی جس کے شانِ نزول کا انھیں علم نہ رہا ہو، نیز حفظ اور علم قرآن میں، حضور ﷺ انھیں، تمام صحابہؓ میں ممتاز سمجھتے تھے، اور اس امتیاز کی سند بھی عطا فرمائی تھی، چنانچہ آپؐ نے مسلمانوں کو چار آدمیوں سے قرآن کی تعلیم پانے کی ہدایت فرمائی تھی، ان میں سب سے پہلا نام، ابن مسعودؓ ہی کا تھا، اصل الفاظِ حدیث یہ ہیں۔

.... **فذکرنا یوماً عبداللہ بن مسعود فقال لقد ذکرتم رجلًا لا ازال احبّه بعد شیءٍ سمعته من رسول اللہ ﷺ سمعت رسول اللہ یقول خذوا القران من اربعة من ابن ام عبد فبدء به و معاذ ابن جبل و ابی بن کعب و سالم مولیٰ ابی حذیفة** [1] .... پھر ایک دن ہم نے عبداللہ ابن مسعودؓ کا تذکرہ کیا تو اس (شخص) نے کہا کہ تم نے ایسے آدمی کا ذکر کیا ہے جس کے بارہ میں حضور ﷺ سے سننے کے بعد، میں اس سے ہمیشہ محبت کرتا ہوں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ چار آدمیوں سے قرآن کا علم سیکھو، ابن ام عبد، اولاً انھی کا نام لیا، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی والدہ کا نام ام عبد تھا، علاوہ ازیں اس قدر عالمِ قرآن ہونے کے، ابن مسعودؓ کو، رسول اللہ ﷺ کا خادم خاص ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، آپؐ کی مسواک کا انتظام کرنا، آپؐ کو جوتا پہنانا، جوتا اتارنا، آپؐ کا بستر درست رکھنا، وضو کا پانی رکھنا، عصا کو لے کر چلنا، سفر میں سواری وغیرہ کا انتظام کرنا، اُن ہی سے متعلق تھا، اس قرب و خدمت کی وجہ سے یہ سفر و حضر میں ہر وقت ساتھ رہتے تھے، اور کاشانۂ نبوی میں کثرتِ آمد و رفت اور نشست و برخاست کی وجہ سے، وہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل عبداللہ ابن مسعود

اعمالِ نبوی سے سب سے بڑے واقف کار مانے جاتے تھے، اور صحابہؓ انھیں رُکنِ اہل بیت تصور کرتے تھے، ایسی حالت میں اگر ان کی روایات، قابل اعتماد نہیں ہو سکتیں تو پھر کس کی ہوں گی؟

خود حضرت عمرؓ اور دوسرے اکابر صحابہؓ، ان کے علمی کمالات کے معترف اور مداح تھے، اسی تذکرۃ الحفاظ میں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ، انھیں علم کا بھرا ہوا ظرف قرار دیا کرتے تھے۔

زید بن وہب راوی ہیں کہ لوگوں کے ساتھ، عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک دبلا پتلا مختصر آدمی آیا، اُسے دیکھ کر حضرت عمرؓ کا چہرہ بشاش ہو گیا، اور فرمایا ''علم کا بھرا ہوا ظرف ہے، علم کا بھرا ہوا ظرف ہے، علم کا بھرا ہوا ظرف ہے''، یہ ابن مسعودؓ تھے۔ [1]

حضرت عمرؓ، انھیں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے نمونہ اور معلّم بنا کر بھیجتے تھے، اور ان کی تقلید کا حکم دیتے تھے، چنانچہ ۲۰ھ میں جب عمار بن یاسر کو کوفہ کا امیر بنا کر بھیجا تو عبداللہ بن مسعودؓ کو بحیثیت وزیر اور معلّم ان کے ساتھ روانہ کیا اور اہل کوفہ کے نام لکھا کہ

قد بعثت الیکم عمار بن یاسر امیراً و عبداللہ بن مسعود معلما و وزیراً وھما من نجباء من اصحاب رسول اللہ ﷺ من اھل بدر فاقتدوا بھما واسمعوا وقد اثرتکم بعبد اللہ علی نفسی [2] میں نے عمار بن یاسر کو بطور امیر اور عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے، یہ دونوں، رسول اللہ ﷺ کے مقتدر صحابہ میں سے ہیں اور بدری صحابہ ہیں، تم لوگ ان کی اقتداء کرو، اور ان کی سنتے رہو، میں نے تمہیں اپنے اوپر ترجیح دے کر عبداللہ کو تمہارے پاس بھیجا ہے۔

یہی نہیں، بلکہ جو شخص، دینی معاملات میں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جدال و حجت پر اتر آتا، تو حضرت عمرؓ، اسے سزا دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود نے ایک شخص سے جو، تہ بند ٹخنوں سے نیچے لٹکائے ہوئے تھا، کہا ''تہ بند ذرا اوپر کر کے باندھو''، اس نے کہا ''ابن مسعود! تم بھی اپنا تہبند اوپر کرو'' وہ بولے ''میں تمہارے جیسا نہیں ہوں، میری ٹانگیں پتلی ہیں'' حضرت عمرؓ نے اس ردوقدح کا حال سنا تو اس شخص کو کوڑے لگوائے کہ تو نے عبداللہ بن مسعودؓ جیسے شخص سے منہ زوری کی۔ [3]

ایسی حالت میں کہاں تک یہ روایت قابل قبول ہو سکتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر ڈالا تھا۔

ابودرداءؓ

حضرت ابودرداءؓ بھی بڑے صاحب علم صحابی تھے، خود امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابودرداء، امام ربانی، حکیم الامت ان صحابہ میں سے تھے، جنھیں خدا نے علم عطا کیا تھا، (تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، صفحہ ۲۱-۲۲) تذکرۃ الحفاظ کے اسی مقام پر، بحوالہ مسروق یہ مذکور ہے کہ رسول اللہؐ کے چھ بڑے اصحابِ علم میں، ایک حضرت ابودرداءؓ بھی تھے، حضرت معاذؓ بن جبل سے لوگوں نے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، صفحہ ۱۳

[2] طبقات ابن سعد، جلد ۳، ق ا، صفحہ ۱۱۰

[3] الاصابہ، جلد ۳، صفحہ ۱۳۰ بحوالہ سیر الصحابہ، جلد ۲، صفحہ ۳۰۰

درخواست کی کہ ہمیں کچھ وصیت فرمایئے، ارشاد فرمایا

علم وایمان، اپنی اپنی جگہ پر ہیں، جو اسے تلاش کرے گا وہ پائے گا، تم لوگ ابودرداء، سلمان بن مسعودؓ اور عبداللہ بن سلامؓ کے پاس علم تلاش کرو"۔ [۱]

یہ اس شخص کے علمی کمالات کی سندیں ہیں، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسے قید کر ڈالا تھا۔

پھر حضرت ابودرداء، مکثرین حدیث کے زمرہ ہی میں نہیں آتے، ان کی مرویات، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی کمتر ہیں، یعنی کل ۱۷۹ ہیں، ان میں بھی صرف دو احادیث متفق علیہ ہیں، ۳ میں امام بخاری اور ۸ میں امام مسلم منفرد ہیں۔ (دیکھئے تہذیب الکمال، صفحہ ۲۹۹)

ابومسعودؓ

حضرت ابومسعودؓ بھی صاحب کمال اور بدری صحابی تھے، ان کی مرویات کی تعداد، حضرت ابودرداء سے بھی کمتر ہے، یعنی کل ۱۰۲، اور ان میں سے صرف ۹ متفق علیہ ہیں، اور ایک میں امام بخاری، اور ۷ میں امام مسلم منفرد ہیں۔ [۲]

ایسی حالت میں آخر الذکر دونوں صحابی، کسی طرح مکثرین حدیث میں آ ہی نہیں سکتے، پھر حضرت عمرؓ انھیں اس جرمِ (ناکردہ) کے باعث سزا کیسے دے سکتے تھے؟

بدری صحابہؓ

اور آخر میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ابن مسعودؓ اور ابومسعودؓ انصاری دونوں بدری صحابہ ہیں، جن کے گناہ معاف ہو چکے ہیں، اس لیے اگر یہ کوئی جرم بھی کرتے تب بھی، حضرت عمرؓ، انھیں سزا نہیں دے سکتے تھے، حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا مشہور واقعہ ہے، جس میں آنحضرتؐ نے مکہ پر چڑھائی کی خفیہ تیاریاں کیں، اس زمانہ میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ، آنحضرتؐ کے پاس، مدینہ میں تھے اور ان کے بال بچے مکہ میں، اور عزیزوں میں کوئی ان کی حفاظت کرنے والا نہ تھا، اس لیے حاطب نے اپنے کسی مکی دوست کو بال بچوں کی حفاظت کے خیال سے، مسلمانوں کی تیاریوں کی خبر دی، لیکن یہ خط راستہ ہی میں پکڑا گیا، اور آنحضرتؐ کے سامنے پیش ہوا، آپؐ نے حاطبؓ سے پوچھا "یہ کیا؟" انھوں نے معذرت میں صحیح صحیح واقعہ بیان کر دیا، کہ مکہ میں میرا کوئی عزیز نہ تھا، اس لیے میں نے بال بچوں کی حفاظت کے خیال سے ایسا کیا۔ آپؐ نے ان کا عذر سنکر فرمایا، انھوں نے سچ کہا ہے، حضرت عمرؓ، بہت غضبناک ہو رہے تھے، انھوں نے عرض کی "اس نے اللہ، اور رسولؐ اور مومنین سے خیانت کی ہے، اجازت ہو تو اس منافق کی گردن اڑا دوں"، آپؐ نے فرمایا "کیا یہ بدر میں شریک نہ تھے؟ خدا نے ان کے تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں، اور فرمایا ہے، جو تمہارا دل چاہے کرو، تمہارے لیے جنت واجب ہو چکی۔ میں نے تمہارے تمام گناہ معاف کر دیئے"، یہ سنکر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے، اور عرض کیا "اللہ اور رسولؐ، زیادہ بہتر جانتے ہیں"، کتب

---

[۱] تذکرہ الحفاظ، جلد ۱، صفحہ ۲۳ [۲] تہذیب الکمال، صفحہ ۲۶۹ بحوالہ معارف، مئی ۱۹۳۳ء، صفحہ ۴۱۲

احادیث میں یہ الفاظ منقول ہیں۔

فقال عمرؓ انه قدخان الله ورسوله والمؤمنين فد عنى فلا ضرب عنقه فقال اليس من اهل بدر فقال لعل الله اطّلع الى اهل بدرٍ فقال اعملوا ما شئتم فقد و جبت لكم الجنة او فقد غفرت لكم فد معت عينا عمر و قال الله ورسوله اعلم[1] عمرؓ نے کہا کہ ''اس نے اللہ، رسول اور اہل ایمان کے ساتھ دغا بازی کی، مجھے چھوڑ دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں'' حضور ﷺ نے فرمایا'' کیا (تمہیں معلوم نہیں کہ) وہ بدر کی لڑائی میں شریک تھا؟'' پھر فرمایا'' اللہ نے اہل بدر کو (آسمان پر سے) دیکھ لیا، فرمایا'' اب تم جیسے چاہو، عمل کرو، تمہارے لیے بہشت واجب ہوگئی، میں نے تمہیں بخش دیا'' یہ سنتے ہی عمرؓ آب دیدہ ہو گئے اور کہا'' اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں''۔

ایک طرف بدری صحابہ کا یہ مرتبہ تھا کہ ایک شدید اور سنگین قومی جرم میں، جس کی اگر بروقت اطلاع نہ ہوگئی ہوتی، تو اس کا نتیجہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک تھا، آنحضرتؐ، حاطب بن ابی بلتعہ کو محض بدری ہونے کی وجہ سے معاف فرما دیتے ہیں، اور حضرت عمرؓ کے غیظ وغضب پر ارشاد فرماتے ہیں، کہ'' تم کو معلوم نہیں کہ یہ بدری صحابی ہیں جن کے تمام گناہ، خدا نے معاف کر کے بہشت انھیں دیدی ہے'' اس ارشاد نبویؐ پر، حضرت عمرؓ کا سارا غیظ وغضب، آنسوؤں سے بدل جاتا ہے، دوسری طرف یہی عمر، ایک بدری صحابی کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر ڈالتے ہیں، کیا کوئی عقل اسے تسلیم کر سکتی ہے؟

(۵) روایت حدیث پر عمرؓ کو اطلاع دینے کی دھمکی

حضرت عمرؓ کو مخالفِ حدیث قرار دینے کے لیے پانچواں واقعہ، ایک طویل روایت کے ناقص اور مسخ شدہ ٹکڑے سے پیش کیا جاتا ہے، کہ'' حذیفہ، رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرتے تھے، تو سلمان نے کہا تم اس سے باز آ ؤ، ورنہ میں عمر کو لکھ دوں گا''۔ اس غلط اور مسخ شدہ ٹکڑے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ، روایتِ حدیث کے مخالف نہ ہوتے، تو سلمان، حذیفہ کو یہ دھمکی کیوں دیتے کہ وہ عمرؓ کو لکھ دیں گے۔ لیکن یہ واقعہ ہی اس شکل میں صحیح نہیں ہے، پوری روایت میں اس کا مطلب ہی کچھ اور سامنے آتا ہے، لیکن منکرینِ حدیث، اول تو ادھورے اقتباسات کو پیش کرتے ہیں، اور پھر اسے بھی مسخ وتحریف کا نشانہ بناتے ہیں تا کہ مطلب برآری کی جا سکے۔ لیجئے، پوری روایت ملاحظہ فرمائیے۔

عن عمرو بن ابى قرة قال كان حذيفة بالمدائن فكان يذكر اشياء قالها رسول الله ﷺ لاناس من اصحابه فى الغضب فينطلق ناس ممن سمع ذالک من حذيفة فيا تون سلمان فيذكرون به قول حذيفة فيقول سلمان حذيفة اعلم بما يقول فير جعون الٰى حذيفة فيقولون له قد ذكرنا قولک لسلمان فما صدقک ولا كذبک ، فاتٰى حذيفة سلمان فهو فى مبقلة فقال يا سلمان! ما يمنعک ان تصدقنى بما

---

[1] جامع صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب من شهد بدراً

سمعت من رسول اللہ ﷺ فقال سلمان ان رسول اللہ کان یغضب فیقول فی الغضب لناس من اصحابہ ویرضی فیقول فی الرضا لناس من اصحابہ، اماتنتھی حتی تورث رجالاً حب رجال و رجالاً بغض رجال حتی توقع اختلافاً وفرقۃ و لقد علمت ان رسول اللہ ﷺ خطب فقال ایما رجلٍ من امتی سببتہ سبۃً او لعنتہ لعنۃً فی غضبی فانما انا من ولد اٰدم اغضب کما یغضبون و انما بعثنی رحمۃ للعالمین فاجعلھا صلوۃً علیھم یوم القیامۃ، واللہ لتنتھین او لا کتبنّ الٰی عمر[1] عمرو ابن ابی قرہ روایت کرتے ہیں کہ حذیفہ مدائن میں تھے تو ایسی باتیں کرتے تھے، جنھیں رسول اللہ ﷺ نے غصہ کی حالت میں اپنے بعض اصحابؓ کے متعلق فرمائی تھیں لوگ انھیں حذیفہ سے سن کر بغرض تصدیق سلمان کے پاس جاتے تھے اور ان سے حذیفہ کی مذکورہ باتیں بیان کرتے، یہ سنکر سلمان کہتے ہیں کہ حذیفہ جو کہتے ہیں اسے وہ خود بہتر جانتے ہیں، یہ جواب پا کر لوگ پھر حذیفہ کی طرف لوٹ آتے اور کہتے کہ ہم نے تمہارا قول سلمان کے سامنے پیش کیا، وہ نہ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تردید، پھر (ایک دن) حذیفہ سلمان کے پاس آئے جبکہ وہ اپنی سبزیوں کی کھیتی میں تھے اور ان سے کہا ''سلمان! جو کچھ تم نے رسولؐ اللہ سے سنا ہے، اس کے بارہ میں میری تصدیق کرنے سے تمہیں کون سی چیز مانع ہوتی ہے؟'' سلمان نے کہا ''خدا کے رسول (بحیثیت انسان) کبھی غصہ میں ہوتے تھے اور ایسی حالت میں بعض اصحاب کے متعلق کچھ کلمات فرما دیتے تھے، اور کبھی خوش ہوتے تھے، اور خوشی کی حالت میں بھی، اپنے بعض اصحابؓ کے متعلق کچھ فرما دیتے تھے، تم اس وقت تک (ان باتوں کے بیان کرنے سے باز نہ آؤ گے جب تک انھیں بیان کر کے) کچھ آدمیوں کی طرف سے کچھ آدمیوں کے دل میں محبت اور کچھ دوسرے لوگوں کی طرف سے کچھ اور لوگوں کے دل میں بغض پیدا کر کے، اختلاف اور تفرقہ نہ پیدا کر دو گے، تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ میں فرمایا تھا کہ میں نے غصہ کی حالت میں، اپنی امت کے جن آدمیوں کو برا بھلا کہا یا ان پر لعنت بھیجی تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں بھی آدم کی اولاد ہوں اور انھیں کی طرح غصہ ہوتا ہوں، مگر خدا نے مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے، اس لیے قیامت کے دن ان گالیوں اور لعنتوں کو ان لوگوں کے حق میں دعا بنا دوں گا''، یہ بتا کر سلمان نے حذیفہ سے کہا ''تم (اس قسم کی اختلاف انگیز روایتوں سے) باز آؤ، ورنہ میں عمرؓ کو لکھ بھیجوں گا''۔

کہاں مسلمانوں میں، بغض اور منافرت پھیلانے والے واقعات کی اشاعت سے منع کرنا (جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے) اور کہاں مطلق اشاعت حدیث کی مخالفت؟ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو جن باتوں کی اشاعت سے منع کیا تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دینے کی دھمکی دی تھی، وہ دین اسلام سے متعلق اوامر ونواہی کی احادیثِ رسولؐ یا اسوۂ رسولؐ نہ تھا، بلکہ ایسی وقتی اور جذباتی باتیں تھیں، جو آپؐ نے غصہ یا رضا کی حالت میں بعض لوگوں کے متعلق فرمائی تھیں، اور ان کا کوئی دائمی اثر نہ تھا، بلکہ وہ ایسی تھیں کہ بعد میں جن کی اشاعت سے مسلمانوں میں بغض ومنافرت پیدا

[1] سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی النھی عن سب اصحاب رسول اللہ ﷺ

ہو جانے کا قوی احتمال تھا، بہت ممکن ہے کہ یہ باتیں، بعض قبائل کی اسلامی تحریک کے اثر سے دب جانے والی قدیم عصبیتوں اور چشمکوں کو ہوا دے کر بھڑک اٹھنے کا سبب بن جاتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قبیل کے واقعات سے اگر وہ کسی حد تک صحیح مان بھی لیے جائیں، تو یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ حضرت عمرؓ، مخالفِ حدیث تھے اور حدیث کی حجیت کے قائل نہ تھے، ایسا نتیجہ پیدا کرنا، حدیث کے ردّ وقبول کے بارہ میں، حضرت عمرؓ کے اصول سے لاعلمی کا ثبوت ہے، اگرچہ محدثین کے ہاں اصولاً یہ بات طے اور متفق علیہ ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں، اور کسی صحابیؓ کے متعلق بھی، بعد از تتبع آثار، اور بعد از تحقیقِ بسیار، یہ ثابت نہیں ہو پایا کہ اس نے روایتِ حدیث میں کذب بیانی سے کام لیا ہو، لیکن اس کے باوجود، حضرت عمرؓ، بہر حال اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ سہو ونسیان، خصائص بشری میں سے ہیں، جن سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں، صحابہؓ کی عدالت مسلم ہے اور ان کی جانب سے رسولؐ اللہ پر کذب کا کوئی امکان نہیں، لیکن سہو ونسیان کی انسانی خصوصیت سے تو انھیں بالاتر قرار نہیں دیا جاسکتا، نیز خلفاء کے زمانہ میں، خلافت الٰہیہ کی تشکیل ہو رہی تھی، روزانہ نئے نئے واقعات اور نئے نئے مسائل پیش آ رہے تھے، جن کے متعلق خلفاء کے فیصلوں کو بھی، اصولِ دین اور اسلامی نظائر کی حیثیت میں ڈھل جانا تھا، اس لیے ان تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر، حضرت عمرؓ نے احادیث کی چھان بین میں، ان کی تحقیق وتصدیق اور ان کے ردوقبول میں وہ تمام احتمالات ملحوظ رکھے، جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوا کرتا ہے، چنانچہ اسی احتیاط کے تحت، وہ خبرِ آحاد کو بغیر تائیدی شہادت کے قبول نہ کرتے تھے کہ ایک انسان سے بھول چوک کا امکان تو ہے ہی، لیکن تائیدی شہادت کے بعد، جب انھیں حدیث کی صحت کا پورا یقین ہو جاتا تھا، تو اسے بلا تامل قبول کر لیتے تھے، اور اس کے مطابق، فیصلہ دیتے تھے، چنانچہ اسقاط حمل کی دیت میں مغیرہ بن شعبہ کی روایت، محمد بن مسلمہ انصاری کی شہادت کے بعد، مکان کی بیع میں حضرت عباسؓ کی روایت چند انصاری بزرگوں کی شہادت کے بعد قبول کی، جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ کی جلد اول کے صفحہ ۷ پر یہ دونوں امور مذکور ہیں، علاوہ ازیں، جامع صحیح مسلم میں کتاب الآداب کے تحت، باب الاستیذان میں، استیذان ہی کے سلسلہ میں، حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت، حضرت ابوسعید کی تائیدی شہادت کے بعد قبول فرمائی، لیکن ان شہادتوں سے صرف احادیث کی تصدیق ہی مقصود تھی، نہ کہ انکار۔ اگر سرے سے انکار مقصود ہوتا تو اول تو تصدیق ہی نہ طلب کرتے، اور ثانیاً پھر، تصدیق کے بعد، اس پر عمل ہی نہ کرتے، ان کا تصدیق طلب کرنا اور بعد از تصدیق، اس پر عمل کرنا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ متبع حدیث تھے، نہ کہ مخالفِ حدیث۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی نئی صورت پیش آتی، یا کسی مسئلہ کے متعلق، آنحضرت ﷺ کا کوئی فرمان معلوم نہ ہوتا تھا، تو صحابہ کے مجمع میں کھڑے ہو کر پوچھتے تھے کہ اس معاملہ سے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے؟ تکبیر جنازہ، غسل میت، جزیہ مجوس، اور اس قسم کے متعدد مسائل کے متعلق، حضرت عمرؓ نے مجمع صحابہؓ سے پوچھ کر احادیث کا پتہ چلایا۔ کیا کسی مخالفِ حدیث کا یہی رویہ ہوا کرتا ہے؟

روایتِ حدیث میں، دوسرا امر انھوں نے یہ ملحوظ رکھا (جسے بعض ظاہر بین اور سطحی قسم کے لوگ، ان کی مخالفتِ حدیث

میں پیش کرتے ہیں) کہ آپ انھی احادیث کے ساتھ زیادہ اعتناء کرتے تھے، جو دین، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن جنھیں مذہب سے چنداں تعلق نہ تھا، مثلاً قصص، حکایات، پیشینگوئیاں، لباس و معمولاتِ نبویہ وغیرہ کی طرف چنداں توجہ نہ کی، کہ انھیں مذہب اور اصولِ دین سے کوئی تعلق نہیں، لیکن عام رواۃ کی نظر اس قدر دقیقہ رس نہ تھی، اور وہ ہر قسم کی روایتیں، خواہ وہ دین سے متعلق ہوں یا غیر متعلق، انھیں بیان کرنا ضروری سمجھتے تھے، اور بیان کرتے پھرتے تھے، ایسی حالت میں اگر حضرت عمرؓ نے کسی راوی کو روکا بھی ہوگا تو اسی قسم کی روایات سے روکا ہوگا۔ اور ناواقف لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ آپ حدیثوں کے مخالف تھے حالانکہ حضرت عمرؓ کی یہ انتہائی دقت نظری تھی کہ دونوں قسم کی احادیث میں تفریق قائم فرمائی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس سلسلہ میں ایک احتمال اور پیدا ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین سے، جو بارگاہِ نبوی کے سب سے زیادہ مقرب ہیں بہت کم حدیثیں مروی ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیثوں کی طرف توجہ نہ کرتے تھے، اس استدلال میں ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ خلفائے راشدین نے فی الواقع احادیث روایت کی ہیں یا نہیں۔ کم یا زیادہ کی بحث نہیں (نفسِ روایتِ حدیث سے، خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں) اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر خلفاء، مخالفینِ احادیث ہوتے، تو ان کی سرے سے کوئی روایت ہی نہ ہوتی، جبکہ اس حقیقت سے کوئی بڑے سے بڑا منکر حدیث بھی انکار نہیں کر سکتا کہ خلفائے راشدین کی مرویات، کتب احادیث میں موجود ہیں، مثلاً:

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ۱۴۲ حدیثیں مروی ہیں۔ [۱]

حضرت عمرؓ بن خطاب سے ۵۳۹ احادیث مروی ہیں۔ [۲]

حضرت عثمان بن عفانؓ کی تعداد مرویات ۱۴۶ ہے۔ [۳]

حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی تعداد روایات ۵۸۶ ہے۔ [۴]

جب اس قدر مسلم ہے کہ خلفاء نے روایتِ حدیث کی ہے، خواہ وہ کم ہی سہی، تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ حدیثوں کے مخالف نہ تھے، باقی رہا یہ احتمال کہ ان کے تقرب بارگاہ نبوی کے باوجود، دوسرے کثیر الروایہ صحابیوں کی روایات کے مقابلہ میں، ان کی مرویات، اس قدر کم کیوں ہیں، کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ محدثین کے نزدیک یہ اصول مسلم ہے کہ صحابی جب کوئی ایسا مسئلہ بیان کرے جس میں رائے اور اجتہاد کو دخل نہ ہو، تو اس میں خواہ وہ رسول اللہ ﷺ کا نام لے یا نہ لے، اس کا مطلب یہی ہوگا، کہ اس نے رسول ﷺ سے ہی اسے سنا ہے، اور جب عام صحابیوں کے متعلق، جن میں خلفائے راشدین بھی شامل ہیں، یہ حکم ہے تو خلفاء

---

۱ تہذیب الکمال، صفحہ ۲۰۴، بحوالہ معارف، جون ۱۹۳۳ء صفحہ ۴۱۷ ۲ تہذیب الکمال، صفحہ ۲۴۲، بحوالہ اصحاب بدر، صفحہ ۳۷

۳ تہذیب الکمال، صفحہ ۲۶۱، بحوالہ اصحاب بدر، صفحہ ۴۰ ۴ تہذیب الکمال، صفحہ ۲۷۴، بحوالہ اصحاب بدر، صفحہ ۳۷

کے متعلق تو یہ حکم بدرجہ اولیٰ ہوگا، اور یہ اصول بالکل قرین عقل و دانش (Rational) ہے، معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مثلاً حضرت عمرؓ نے تمام ممالکِ محروسہ میں لکھ بھیجا تھا، کہ زکوٰۃ، فلاں فلاں چیزوں پر فرض ہے، تو اس میں اس کا احتمال ہی نہیں کہ انھوں نے اپنی رائے سے لکھا ہوگا، اس لیے کہ وہ شارع نہ تھے کہ اس کے مجاز ہوتے بلکہ انھوں نے رسولؐ اللہ ہی سے اس کو سنا ہوگا، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے حکم رسول کا حوالہ نہیں دیا، اور انھیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ وہ خود صاحب امر (اولی الامر) تھے جن کا کام متبع رسولؐ ہوکر، حکم رسولؐ کو نافذ کرنا تھا، اس اصول کے تحت، خلفائے راشدین کے نافذ کردہ وہ تمام قوانین، جو دین و مذہب سے متعلق ہیں اور جن میں ان کے اجتہاد کو دخل نہیں ہے، درحقیقت، حدیث ہی پر مبنی ہیں، اس لیے ان کے عہد کے تمام مذہبی قوانین کو، ان کی مرویات ہی میں شمار کرنا چاہیے۔

عثمانؓ اور الزام انکارِ حدیث

حضرت عثمانؓ کے انکار حدیث کے ثبوت میں صرف یہ ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے، جو ''توجیہ النظر'' سے لیا گیا ہے۔

> ایک بار حضرت علیؓ کے بیٹے محمد، اپنے والد سے ایک پرچہ لے کر جس میں نبی ﷺ کا حکم، زکوٰۃ کے متعلق لکھا ہوا تھا، ان کے پاس لے گئے، آپؓ نے فرمایا مجھے اس سے معاف رکھو۔

اولاً --- اس واقعہ کی صحت ہی مشکوک ہے، معلوم نہیں کہ طاہر جزائری نے کہاں سے یہ واقعہ لیا، اور بلا حوالہ نقل کر ڈالا، حدیث کی کسی کتاب میں، یہ واقعہ بایں معنی و مفہوم درج نہیں ہے، لیکن اگر اسے صحیح مان لیا جائے، تو اس کی شکل یہ نہیں ہے، جو پیش کی جاتی ہے، منکرین حدیث نے حسب عادت، اسے بھی ناتمام درج کر کے، اس سے غلط نتیجہ نکالا ہے، پورا واقعہ یوں ہے۔

ان عثمان حمل الیه محمد بن علی ابن ابی طالب من عند ابیه کتاب النبی ﷺ فی الزکوٰۃ فقال اغنها عنا۔[1] علی ابن ابی طالب کے بیٹے، محمد، اپنے باپ (علیؓ) کی طرف سے، زکوٰۃ کے بارے میں ایک نبوی تحریر لے کر حاضر ہوئے، تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا، مجھ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے، اس نوشتہ کو اس لیے واپس نہیں کیا تھا کہ اسے قابل حجت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس لیے کیا تھا کہ آپ کو اس کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ زکوٰۃ کا مسئلہ کوئی مشتبہ مسئلہ نہ تھا، آنحضرت ﷺ کی زندگی سے اس پر عمل ہو رہا تھا، اور احادیث میں بھی تفصیلی احکام موجود تھے، آپؐ کی وفات کے بعد، ارتداد کا فتنہ اٹھا اور بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے اسی دلیل سے، ان پر تلوار اٹھائی کہ رسولؐ اللہ کے زمانہ میں جو شرحِ زکوٰۃ مقرر تھی اور جو جو لوگ، جتنی جتنی زکوٰۃ ادا کیا کرتے تھے، اگر وہ اس میں ایک اونٹ کی رسی کے برابر بھی کمی کرنا چاہیں گے تو میں، ان سے جہاد کروں گا۔ ایسی حالت میں، زکوٰۃ کے متعلق تمام مسائل اسی زمانہ میں منقح ہو چکے تھے، اور اس وقت سے حضرت عثمانؓ کے عہد تک ان پر عمل ہوتا چلا آ رہا تھا، اس لیے محمد بن علی کے نوشتہ سے، حضرت عثمان کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا، اس لیے،

[1] توجیہ النظر، بحوالہ مقام حدیث، صفحہ ۵۲

اگر انھوں نے نوشتہ واپس کر دیا، تو اسے مخالفت حدیث پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

اصل الفاظ جو اوپر درج ہوئے ہیں، ان سے دوسری بات، یہ واضح ہوئی کہ منکرینِ حدیث میں سے ''اغنها عنا'' کا ترجمہ، جس نے بھی یہ کیا کہ '' مجھے اس سے معاف رکھو'' اس نے غلط ترجمہ کیا ہے، صحیح ترجمہ یہی ہے کہ '' مجھے اس کی ضرورت نہیں لہذا مجھے اس سے مستغنی سمجھو''۔

تمسک بالحدیث میں عثمانی طرزِ عمل

ثانیاً --- یہ کہ تمسک بالحدیث والسنۃ میں، حضرت عثمانؓ کا طرز عمل بھی وہی تھا، جو ان کے پیشرؤں کا تھا۔

احکام و قوانین کی احادیث کا تو ذکر ہی کیا، حضرت عثمانؓ تو آنحضرت ﷺ کے تمام اقوال، حتّٰی کہ آپ کے حرکات و سکنات کی پیروی بھی طابق النعل بالنعل کیا کرتے تھے، چند واقعات ملاحظہ فرمایئے۔

تبسمِ رسول میں اتباعِ رسول

ایک مرتبہ، حضرت عثمانؓ نے پانی طلب فرمایا، کلی کی، استنشاق کیا، اور بڑے اہتمام سے وضو کو مکمل کیا، اور پھر تبسم فرمایا اور ہنسے، پھر کیا ہوا؟

فقال لاصحابه الا تسألونى عما اضحكنى فقالوا مم ضحكت يا امير المومنين قال رء يت رسول الله ﷺ دعا بماء قريبا من هذه البقعة فتوضا كما توضات ثم ضحك [1] انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا'' کیا تم یہ نہیں پوچھو گے کہ مجھے کس چیز نے ہنسایا؟'' انھوں نے کہا'' فرمایئے امیر المومنین! آپ کیوں ہنسے؟'' فرمایا'' میں نے رسولؐ خدا کو دیکھا تقریباً اسی جگہ پر کہ آپؐ نے وضو کے لیے پانی طلب فرمایا، پھر اسی طرح وضو فرمایا جیسے میں نے وضو کیا ہے، پھر آپ نے تبسم فرمایا (ہنسے)

معمولی جزئیات تک میں اتباعِ رسولؐ

ایک مرتبہ، دیکھنے والوں نے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ مسجد نبوی میں تشریف فرما ہوئے۔

جلس على الباب الثانى من مسجد رسول الله ﷺ فدعا بكتف فتعرقها ثم قام فصلى ولم يتوضا ثم قال جلست مجلس النبى ﷺ واكلت ما اكل النبى ﷺ وصنعت ما صنع النبى ﷺ [2] عثمانؓ مسجد نبوی کے دروازے میں بیٹھے اور بکری کی ران (بھنی ہوئی) منگوائی اسے کھایا، پھر اٹھے اور نماز پڑھی اور (تازہ) وضو نہ کیا، پھر فرمایا '' میں وہیں بیٹھا جہاں رسولؐ اللہ بیٹھے تھے، وہی کچھ کھایا جو انھوں نے کھایا اور وہی کچھ کیا جو انھوں نے کیا تھا''۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل، جلد ۱، صفحہ ۵۸ [2] مسند احمد بن حنبل، جلد ۱، صفحہ ۶۲

احترامِ جنازہ میں اتباعِ رسول

احترام جنازہ میں بھی حضرت عثمانؓ، اتباعِ رسول کا دم بھرتے تھے۔

عن ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ انّہ رء ی جنازۃً مقبلۃ فلما رأھا قام وقال رأیت عثمان یفعل ذالک واخبرنی انہ رأی النبی ﷺ یفعلہ [1] ابان بن عثمان بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے آتے ہوئے جنازہ کو دیکھا، جونہی اسے دیکھا کھڑے ہوگئے، اور کہا کہ میں نے عثمان کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا اور انھوں نے خبر دی کہ خود انھوں نے نبی اکرمؐ کو (احترام جنازہ میں) یہی کچھ کرتے دیکھا۔

عندالموت تمسک بالحدیث

حدیث رسول کی اطاعت اور پابندی کی اس سے بڑھ کر سند کیا ہوسکتی ہے کہ اس کی پابندی میں جان تک دیدی، جب مدینہ میں شورش برپا ہوئی، تو بعض جاںنثاروں نے حضرت عثمانؓ کو مختلف مشورے دیئے، مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ

> مغیرہؓ بن شعبہ نے آکر عرض کیا "امیر المومنین! تین باتیں ہیں، ان میں سے ایک قبول کیجئے، آپ کے طرف داروں اور جاں نثاروں کی ایک جماعت یہاں موجود ہے جو طاقتور بھی ہے، اسے لے کر نکلیے اور ان باغیوں کا مقابلہ کر کے ان کو مدینہ سے نکال دیجئے، آپ حق پر ہیں اور وہ باطل پر، لوگ حق کا ساتھ دیں گے، اگر یہ منظور نہیں تو پھر صدر دروازہ چھوڑ کر، دوسری طرف سے دیوار توڑ کر، اس محاصرہ سے نکلیے، اور سواریوں پر بیٹھ کر مکہ معظمہ چلے جائیے، وہاں کے لوگ وفادار ہیں، وہ حرم ہے اور وہاں یہ لوگ لڑ بھی نہیں سکیں گے، یا پھر یہ کہ شام چلے جائیے، وہاں کے لوگ وفادار ہیں اور معاویہؓ موجود ہیں" حضرت عثمان نے فرمایا "میں باہر نکل کر ان سے جنگ کروں تو میں وہ پہلا خلیفہ نہیں بننا چاہتا جو امت محمدی میں خونریزی کرے۔ اگر مکہ معظمہ چلا جاؤں تو بھی اس کی امید نہیں کہ یہ لوگ، حرم الٰہی کی توہین نہ کریں گے اور جنگ سے باز آجائیں گے، اور میں حضور اکرم ﷺ کی پیشینگوئی کے مطابق، وہ شخص نہیں بننا چاہتا، جو مکہ جا کر اس کی بے حرمتی کا باعث ہوگا، اور شام بھی نہیں جا سکتا کہ اپنے ہجرت کے گھر اور رسول اللہ ﷺ کے جوار کو نہیں چھوڑ سکتا۔ [2]

جب باغیوں نے آپؓ کے گھر کا محاصرہ کیا، تو اس وقت صحابہؓ اور عام مسلمان ملا کر تقریباً سات سو آدمی، آپ کے گھر میں موجود تھے (طبقات ابن سعد، جلد ۳، ق ۱، صفحہ ۴۹)، بعض جاں نثاروں نے مشورہ دیا کہ آپ مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا "رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا، اور میں اسی پر صابر ہوں، (ایضاً، صفحہ ۴۶)۔ الغرض، پاسِ فرمانِ رسول کی وجہ سے طاقت رکھتے ہوئے بھی، مقابلہ نہیں کیا اور جان دیدی، ایسی حالت میں، آخر اس بات کو، کون عقلمند تسلیم کر سکتا ہے؟ کہ

> خلیفۂ سوم، حضرت عثمانؓ کو روایت کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی، اور وہ اس کو مسترد کر دیا کرتے تھے۔ [3]

مردود الشہادۃ صحابہؓ کی روایت پر اعتراض

منکرین حدیث کی طرف سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ محدثین، ہر صحابی کو مستند، قابلِ یقین اور سچا مان کر، اس کی

[1] مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۶۸ [2] خلفائے راشدین (شاہ معین الدین ندوی) صفحہ ۲۱۸ [3] مقامِ حدیث صفحہ ۵۲

روایتوں کو قبول کر لیتے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض ایسے صحابہؓ بھی ہیں جن کو کتاب اللہ نے مردود الشہادۃ قرار دیا ہے، اور مثال میں حضرت حسان بن ثابت کا نام پیش کیا جاتا ہے کہ واقعہ افک میں حضرت عائشہ پر تہمت لگانے والوں میں یہ بھی تھے، جن کے متعلق کلام پاک کا یہ فیصلہ ہے، کہ

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا (النور-۴) جو لوگ، عفیفہ اور پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں، اور پھر اس کے ثبوت میں چار گواہ نہ لاسکیں، انھیں اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو۔

جائزہ

اولاً --- یہ کہ معترضین کا یہ اعتراض، اس بے علمی اور جہالت کے باعث ہے، جس کی بناء پر وہ روایت حدیث اور عدالتی شہادت میں پائے جانے والے فروق و امتیازات سے قطعی بے بہرہ ہیں، حالانکہ معاملات و مقدمات میں شہادت اور چیز ہے اور روایتِ حدیث چیزے دیگر است۔ اور آیت میں جس چیز کو ابداً قبول نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ عدالتی شہادت ہے، نہ کہ روایتِ حدیث۔

ثانیاً --- یہ کہ یہاں بھی منکرین حدیث نے حسب عادت، اس حکم کا وہی ٹکڑہ پیش کیا ہے، جسے انھوں نے اپنی مطلب برآری کے قابل سمجھا، اور اسی حکم کا دوسرا حصہ ترک کر دیا، جو ان کے لیے مفید مطلب نہ تھا۔ ایک انصاف پسند اور بے لاگ تحقیق کرنے والے مخلص پیروکار کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ پورے حکم کو لیتا ہے، نہ کہ حسبِ منشا ایک ٹکڑا لے لے اور باقی حصہ کو، جو خلافِ منشا پڑتا ہو، اسے نظر انداز کر دے۔ اس حکم کے ساتھ ہی قرآن میں یہ استثناء بھی درج ہے۔

إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور-۴) ماسوا ان لوگوں کے جنھوں نے اس کے بعد توبہ کی، اور پھر اپنی اصلاح کی، تو اللہ (ان کے لیے) غفور بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، مقتدر صحابی ہیں، دربار رسالت کے شاعر تھے، اور آنحضرت ﷺ کی جانب سے کفار کو جواب دیا کرتے تھے، آپؐ نے ان کے متعلق فرمایا ہے کہ روح القدس، حسان کے ساتھ ہے، لیکن منافقوں کے دام میں آ گئے، مگر جب تحقیقات سے واقعہ غلط ثابت ہوا، اور قرآن نے خود اس کی تردید کی تو حسانؓ کو اپنے کیے پر پشیمانی ہوئی، خود حضرت عائشہؓ نے انھیں معاف کر دیا تھا، چنانچہ جب آپؐ کے سامنے، حسانؓ کو کوئی برا کہتا تھا، تو اسے منع کرتی تھیں، کہ وہ آنحضرت ﷺ کی جانب سے کفار کو جواب دیا کرتے تھے، اور آپ کی مدافعت کیا کرتے تھے، اس لیے حضرت حسانؓ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا کے ٹکڑے کے مصداق ہو گئے، اور ان پر سے مردود الشہادۃ ہونے کے کا الزام ساقط ہو گیا۔

ثالثاً --- یہ کہ، اگر کسی کو اس کے بعد بھی، ان کے مردود الشہادۃ ہونے پر اصرار ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ بس یہی کر سکتا ہے کہ ان کی روایات کو قابل تسلیم نہ مانے، اکیلے صرف حسانؓ ہی کو مردود الشہادۃ قرار دیتے ہوئے، جملہ صحابہؓ کی مطلق روایات کو ناقابل اعتماد

قرار دینے کا کیا جواز ہے؟ قصوروار ایک شخص ہو اور ملزم ساری جماعت ٹھہرائی جائے، یہ کون سا اصول اور قانون ہے؟

رابعاً --- یہ کہ حسان بن ثابتؓ کی مرویات کو تسلیم نہ بھی کیا جائے، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، اس لیے کہ فی الواقع، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مقتدر صحابہؓ کی جماعت میں غالباً حضرت حسان بن ثابتؓ ہی وہ بزرگ ہیں، جن سے صرف ایک حدیث مروی ہے۔

حدیث کے متعلق صحابہؓ کی رائے؟

منکرین حدیث کی طرف سے، ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ احادیث کے متعلق صحابہؓ کی رائے اچھی نہ تھی، اور وہ انھیں قابل اعتماد نہ سمجھتے تھے، اس لیے صحابہ کم روایت کرتے تھے، اس کے ثبوت میں حسب ذیل واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ہم اس وقت رسول اللہ سے حدیث بیان کرتے تھے جب آپ سے جھوٹی حدیثیں روایت نہیں کی جاتی تھیں لیکن جب سے لوگ ہر قسم کی رطب ویابس روایتیں بیان کرنے لگے، اس وقت سے ہم نے حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا۔ (مسند دارمی)

ابن عباس کہتے ہیں کہ تم کو قال رسول اللہ اور قال فلاں کہتے وقت، اس کا خوف نہیں معلوم ہوتا کہ تم پر عذاب نازل کیا جائے یا زمین تم کو لے کر دھنس جائے۔ (ایضاً)

امیر معاویہ سے ایک حدیث بیان کی گئی جس کو انھوں نے غلط سمجھا، اور تصدیق کے لیے ام المؤمنین ام سلمہ کے پاس گئے اور کہا یا ام المومنین، جھوٹی باتیں رسول اللہ کی طرف منسوب ہو گئی ہیں، ہمیشہ کہنے والا یہی کہتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے حالانکہ وہ بات آپؐ نے نہیں فرمائی تھی۔ (ابن مردویہ)

امام شعبی کہتے ہیں کہ میں، ابن عمر کے ساتھ سال بھر بیٹھا، اس عرصہ میں انھوں نے کوئی حدیث نہیں بیان کی (مسند دارمی)

سائب بن یزید بیان کرتے ہیں کہ میں مکہ کے راستہ میں سعد بن ابی وقاص کا ہم سفر رہا، پھر وہاں سے مدینہ واپس آیا، سفر میں، میں نے ان سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ (مسند دارمی)

مجاہد کہتے ہیں کہ میں مدینہ تک ابن عمرؓ کے ساتھ رہا مگر میں نے ان کو حدیث روایت کرتے ہوئے نہیں سنا (مسند دارمی)

ثابت بن قطبہ انصاری کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ مہینہ میں ایک بار حدیث بیان کرتے تھے۔ (مسند دارمی)

ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ تمام بزرگ، حدیثوں کے مخالف تھے، ورنہ وہ حدیثوں کے متعلق بری رائے کیوں ظاہر کرتے؟ اور اتنی کم روایت کیوں کرتے؟

جائزہ

اس موقع پر پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ان واقعات سے، یہ استدلال، کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے، آخر کسی موقع پر کسی صحابی کا حدیث بیان نہ کرنا، کب یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ مخالفِ حدیث تھے؟ ''قال الرسول'' اور ''قال فلان'' کے درمیان فرق نہ رکھنے والوں کو عذاب سے ڈرانے کا آخر یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ فریضۂ انذار ادا کرنے والا منکر حدیث ہے؟ اگر ان جملہ

بزرگوں کے حالاتِ حیات پر اور احادیث پر معترضین کی نظر ہوتی تو وہ ہرگز انکار حدیث کا نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے تھے، اب ان واقعات کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

پہلے ابن عباسؓ اور امیر معاویہؓ کے بیان کو لیجئے۔ ان سے زیادہ سے زیادہ بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں نے غلط روایتیں شروع کر دی تھیں، آخر اس سے احادیث کا انکار، یا خود ان کا احادیث کو برا خیال کرنے کا تصور کہاں سے نکلتا ہے؟ ابن عباسؓ خود کہتے ہیں کہ ''ہم حدیثیں روایت کرتے تھے''، کیا یہ روایت کرنا، کسی مخالف حدیث کا کام ہوسکتا ہے؟ یا کیا یہ ممکن ہے کہ وہ حدیثوں کو برا جانتے ہوئے، ان کی روایت بھی کر رہے تھے؟ پھر وہ فرماتے ہیں کہ ''لیکن جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس حدیثیں بیان کرنا شروع کر دیں، اس وقت سے ہم نے روایت چھوڑ دی'' چھوڑیئے اس بات کو کہ اجتہاداً، ان کا ایسا کرنا درست تھا یا نہیں، غور کے قابل تو یہ بات ہے کہ انھوں نے روایت کرنا، اس لیے نہیں چھوڑا تھا، کہ وہ حدیث کے منکر تھے (یا اسے قابل حجت نہیں سمجھتے تھے) بلکہ اس لیے کہ لوگوں نے قول رسول میں آمیزش شروع کر دی تھی۔ اس لیے ابن عباسؓ کا ترکِ روایت، (جس کے معنی اس موقع پر صرف قلت روایت ہی کے ہیں) بر بنائے احتیاط تھا، نہ کہ بر بنائے انکارِ حدیث۔ ورنہ وہ کبھی بھی حدیثوں کی مطلق روایت نہ کرتے، حالانکہ ایسا نہیں، وہ ہمیشہ ہی سے (کم یا زیادہ) روایت کرتے ہی رہے ہیں، اور یہاں بھی ترک روایت کا مفہوم، محض قلت روایت ہے، اس لیے کہ ابن عباسؓ کی اس احتیاط کے باوجود حدیث کی کتابوں میں:

> ان کی مرویات کی تعداد ۲۶۶۰ ہے، ان میں ۷۵ متفق علیہ ہیں یعنی بخاری و مسلم، دونوں میں ہیں، اس کے علاوہ ۱۸ روایتوں میں بخاری منفرد ہیں اور ۴۹ میں مسلم۔ [1]

حضرت ابن عباس، مکثرینِ حدیث میں سے ہیں اور حفاظِ حدیث صحابہؓ کے زمرۂ اول میں ان کا شمار ہے، ایسی حالت میں ترک روایت کو حقیقی معنیٰ میں لینا، اور ابن عباس کو منکرین حدیث میں شمار کرنا، کہاں تک صحیح ہے؟ باقی رہا، ان کا یہ قول کہ ''تم کو قال رسول اللہ کہتے وقت، یہ خوف نہیں معلوم ہوتا، ....'' غیر محتاط راویوں کے متعلق ہے، ظاہر ہے کہ رسولِ خدا کی طرف، حدیث کا غلط انتساب کرنے والا، اس سے زیادہ کہے جانے کا مستحق ہے، لیکن اس سے سچے راویوں پر کیا اعتراض عائد ہوتا ہے؟

امیر معاویہؓ کے بیان سے بھی صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ بعض غیر محتاط راویوں نے رسول کی جانب غلط حدیثیں منسوب کرنا شروع کر دی تھیں، خود امیر معاویہؓ کا، حدیثوں سے انکار ہرگز ثابت نہیں ہوتا، اگر وہ نفس حدیث ہی کے منکر ہوتے یا کم از کم حدیث کو برا سمجھنے والے ہوتے، تو حضرت ام سلمہؓ کے پاس، تصدیقِ حدیث کے لیے کیوں جاتے؟ حدیث کو حجت جانتے ہوئے، اپنی ولایت میں کسی کے مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے، تلاشِ حدیث میں، انھیں اپنے حریف سے بھی استفادہ کرنے میں کوئی عار و انقباض نہ تھا، ملاحظہ فرمائیے مندرجہ ذیل واقعہ، جس میں حضرت معاویہؓ، اپنے حریف، حضرت علیؓ سے

[1] سیر الصحابہ، جلد ۲، صفحہ ۲۵۸

فصلِ قضیہ میں، حدیثِ رسولؐ طلب کرتے ہیں۔

عن سعيد بن المسيب ان رجلا من اهل الشام وجدمع امرء ته رجلا فقتلهٗ اوقتلها، فاشكل على معٰوية ابن ابى سفيان القضاء فيه فكتب الى ابى موسٰى الاشعرى يسئل له على ابن ابى طالب فسئل ابو موسٰى على ابن ابى طالب عن ذالك[1] سعید بن میبّب سے روایت ہے کہ ایک شامی نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک مرد کو پایا، پھر اس نے اسے (بیوی یا مرد کو) قتل کر دیا، اس کا فیصلہ معاویہ کے لیے مشکل مسئلہ بن گیا، اُس نے ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ علی سے اس بارہ میں استفسار کریں، چنانچہ ابوموسیٰ نے علی ابن ابی طالب سے، اس بارے میں پوچھا۔

کیا وہ شخص جو اپنے مقدمات کے فیصلہ کرنے کے لیے، جویائے حدیثِ رسول ہے، اور اس کے لیے اپنے حریف سے بھی استفادہ کرنے سے نہیں ہچکچاتا، اس پر یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے کہ وہ منکر حدیث ہے یا کم از کم حدیث کو برا جانتا ہے؟

اگر ایسا ہوتا تو وہ سرے سے کوئی حدیث بھی روایت نہ کرتے جبکہ حدیثِ رسولؐ کے ساتھ، ان کے تعلق کا حال یہ تھا کہ

احادیث نبوی کا کافی ذخیرہ، ان کے سینہ میں محفوظ تھا، چنانچہ حدیث کی کتابوں میں، ان کی ۱۶۳ روایتیں ملتی ہیں، جن میں سے چار متفق علیہ ہیں، یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہیں، ان کے علاوہ، ۴ میں بخاری، اور ۵ میں امام مسلم منفرد ہیں۔[2]

ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ

باقی صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کے کم روایت کرنے کے واقعات محض اتفاقی ہیں، یعنی جن لوگوں کا یہ بیان ہے، اتفاق سے ان کے سامنے، ان بزرگوں نے بیان نہ کیا ہوگا، یا ان لوگوں کو خود اس دوران میں، ان سے سننے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا، اس لیے کہ ان بیانات کے باوجود:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرویات کی تعداد ۱۶۳۰ ہے، ان میں ۱۷۰ متفق علیہ ہیں اور ۸۱ میں بخاری اور ۳۱ میں مسلم منفرد ہیں۔[3]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جملہ مرویات کی تعداد ۸۴۸ ہے، ان میں سے ۶۴ بخاری میں اور مسلم دونوں میں مشترک ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۱ بخاری میں اور ۳۵ مسلم میں ہیں۔[4]

حضرت سعد بن ابی وقاص کی مرویات کی تعداد ۲۱۵ ہے، جن میں ۱۵ متفق علیہ ہیں اور ۵ میں بخاری اور ۸ میں مسلم منفرد ہیں۔[5]

اب سوال یہ ہے کہ ان صحابہؓ کی ان روایات کی روشنی میں کون انصاف پسند شخص ایسا ہوگا جو انھیں منکر حدیث اور احادیث رسول سے بے اعتناء کہے، حقیقت یہ ہے کہ مخالفین حدیث اور منکرین سنت اگر رتی برابر بھی انصاف و دیانت اور صداقت و امانت رکھتے ہوتے، تو حقائق کو نہ تو مسخ و تحریف کا نشانہ ہی بناتے اور نہ ہی ادھورے واقعات پیش کرتے، اب منکرین حدیث کی دیانت ملاحظہ فرمائیے، کہ وہ امام شعبی کے حوالے سے، ابن عمر کے بارے میں یہ تو لکھ دیتے ہیں کہ --- ''امام شعبی کہتے ہیں کہ میں ابن عمرؓ کے ساتھ سال بھر بیٹھا لیکن اس عرصہ میں انھوں نے کوئی حدیث بیان نہیں کی'' --- مگر امام شعبی ہی کا

---

[1] موطا امام مالک، کتاب الاقضیة، باب القضاء فيمن وجد مع امرأته رجلاً [2] سیر الصحابہ، جلد ۴ ح۲، صفحہ ۱۳۱
[3] معارف، جون ۱۹۳۳ء، صفحہ ۴۲۳ [4] تہذیب الکمال صفحہ ۲۴۴، بحوالہ سیر الصحابہ، جلد ۲ ح۱، صفحہ ۲۹۳ [5] معارف، جون ۱۹۳۳ء، صفحہ ۴۲۳

یہ قول بھولے سے بھی بیان نہیں کریں گے کہ

امام شعبی فرماتے تھے کہ ابن عمرؓ کی روایت، بہت درست ہوتی تھی۔ [1]

الغرض، ان بزرگوں کے ''انکارِ حدیث'' یا ''انکارِ سنت'' کے ثبوت میں، جن واقعات کو بھی پیش کیا جاتا ہے، ان سے بیش از بیش جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اور صرف ''احتیاط فی الحدیث'' ہے، نہ کہ ''مخالفتِ حدیث''۔ اسی ''احتیاط فی الحدیث'' کے زیرِ عنوان، یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے، جو اگرچہ عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق لکھا گیا ہے لیکن یہ طرزِ عمل، ان تمام صحابہؓ کا تھا جو روایتِ حدیث میں انتہائی محتاط تھے۔

> لیکن اس فضل و کمال، اس وسعتِ علم اور اس دقتِ نظر کے باوجود، حدیث بیان کرنے میں حد درجہ محتاط تھے، محمد بن علی راوی ہیں کہ صحابہ کی جماعت میں، عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ حدیث بیان کرنے میں کوئی محتاط نہ تھا، وہ حدیث میں کمی بیشی سے بہت ڈرتے ہیں، ابوجعفر کا بیان ہے، کہ ابن عمرؓ، رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں میں کمی و زیادتی سے بہت زیادہ خائف رہتے تھے، سعید اپنے والد کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ حدیثِ نبوی میں، ابن عمرؓ سے زیادہ محتاط، میری نظر سے نہیں گزرا، اس لیے آپ عام طور پر حدیث بیان کرنے سے گریز کرتے تھے، مجاہد کا بیان ہے کہ مدینہ کے راستہ میں میرا اور ابن عمرؓ کا ساتھ ہوا، اس درمیان انھوں نے کوئی حدیث بیان نہیں کی، اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ روایتِ حدیث کو برا سمجھتے تھے، یا کم بیان کرتے تھے بلکہ یہ کہ وہ بلاضرورت بیان نہیں کرتے تھے۔ ....
>
> اس احتیاط کی بناء پر اکابر علماء، آپ کی مرویات کو اتنی قابلِ اعتماد سمجھتے تھے کہ پھر کسی مزید توثیق کی ضرورت باقی نہیں رہتی، امام شعبی فرماتے ہیں کہ ابن عمر کی روایت، بہت درست ہوتی تھی، ابن شہاب زہری ان کی رائے کے بعد، پھر کسی دوسری رائے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ [2]

یہ ہے اصل حقیقت۔ لیکن انسان اگر اپنی آنکھوں پر ایک مخصوص رنگ کی عینک چڑھا لے، تو اسے دنیا کی ہر چیز، اسی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے جو اس کی عینک کا رنگ ہے، ''انکارِ حدیث'' کے رنگ میں مصبوغ آنکھوں کو ''احتیاط فی الحدیث'' پر مشتمل واقعات میں بھی ''انکارِ حدیث'' ہی کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔

کتبِ حدیث اڑھائی صدیوں بعد؟

''سب سے اہم دلیل'' یہ پیش کی جاتی ہے کہ حیاتِ نبوی سے لے کر، بنی امیہ کے اختتام تک حدیثیں نہیں لکھی گئیں، اور اس طویل مدت میں، بغیر حدیثوں کے مسلمانوں کا کام چلتا رہا، اس کے بعد، جب بنی عباس کا زمانہ آیا اور دنیاوی علوم کی طرف توجہ ہوئی، تو کتابتِ احادیث کا بھی خیال پیدا ہوا، اس طرح آنحضرت ﷺ کی وفات کے دوڈھائی سو برس بعد، حدیث کی موجودہ کتابیں لکھی گئیں ہیں، چنانچہ امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور تمام بڑے بڑے محدثین، اسی زمانہ میں تھے، اور جو قولِ رسولؐ، آنحضرت ﷺ کے دوڈھائی سو برس بعد لکھا گیا ہو، اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس لیے حدیثوں کا سارا سرمایہ

---

[1] سیر الصحابہ، جلد ۲، ح ۲، صفحہ ۲۵ + اسد الغابہ، جلد ۳، صفحہ ۲۲۸   [2] سیر الصحابہ، جلد ۲، ح ۲، صفحہ ۲۴ تا صفحہ ۲۵

ناقابل اعتماد اور غیر لائقِ اعتبار ہے۔

جائزہ اعتراض

اس دلیل کے دو حصہ ہیں، ایک یہ کہ --- حیات نبوی، اور خلافت راشدہ اور بنی امیہ کے زمانہ میں حدیثیں نہیں لکھی گئیں، اور یونہی کام چلتا رہا۔

دوسرا یہ کہ --- حدیث کی موجودہ کتب، آنحضرت ﷺ کی وفات کے دو ڈھائی سو برس بعد لکھی گئیں اس لیے اعتبار کے قابل نہیں۔

پہلا حصہ تو سراسر غلط اور خلاف واقعہ ہے ان میں سے بعض اجزاء کی تردید پہلے گزر چکی ہے، اس موقع پر، پھر اس پر تفصیلی بحث کی جاتی ہے، اس قسم کا دعویٰ، معترضین کی کوتاہ نظری اور تاریخ حدیث سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، واقعہ یہ ہے کہ عہد رسالت، عہد خلفائے راشدین اور عہد بنی امیہ میں سے کوئی دور بھی ایسا نہ تھا جس میں حدیثوں کے مجموعے نہ مرتب کیے گئے ہوں، یہ الگ بات ہے کہ زمانہ کی دستبرد سے وہ آج بعینہٖ محفوظ نہ رہ سکے، لیکن اس حیثیت میں وہ اب تک محفوظ ہیں کہ بعد کی کتب مدونہ میں وہ تمام مجوعے شامل ہوگئے، اس لیے گو وہ ممتاز و مستقل شکل میں نہیں، مگر موجودہ کتب کے اجزاء بن گئے ہیں۔

عہد رسالت میں اہتمام حدیث

منکرین حدیث یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ عہد نبوی میں مکی دور، ظلم و ستم سہنے کا دور تھا، اور مدنی دور، نوزائیدہ ننھی سی مملکتِ اسلامیہ کو مضبوط و مستحکم بنانے کا، اسے وسعت دینے کا، نشر اسلام اور تعمیر ملت کا دور تھا، جس میں ساری توجہ انھی امور پر صرف ہو رہی تھی، لہذا، یہ بات عین قرینِ قیاس ہے کہ حدیث کے اہتمام کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی ہو، لیکن یہ خیال قطعی غلط ہے، حضور اکرم ﷺ نے بھی، صحابہ نے بھی، تابعین نے بھی اور تبع تابعین نے بھی، ہر دور میں، اہتمام حدیث و سنت پر توجہ قائم رکھی، سب سے پہلے عہد نبوی میں، مندرجہ ذیل شواہد ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) --- قبیلہ عبدالقیس کے لوگ، جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپؐ نے ان کو بہت سے امور دین کی تعلیم دی اور فرمایا۔

احفظو هن واخبر وابهن من ورائكمْ [۱] ان احکام کی حفاظت کرنا اور اپنے پیچھے والوں کو بھی ان سے باخبر کردینا۔

(۲) --- عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

كان النبی ﷺ يتخولنا بالموعظة فی الايام كراهة السامة علينا [۲] آنحضرت ﷺ نے ہمیں وعظ فرمانے

[۱] بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان

[۲] بخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی یتخولهم بالموعظة والعلم

کے لیے چند دن مقرر کر رکھے تھے، ہماری اکتاہٹ کے خیال سے روزانہ وعظ نہیں فرماتے تھے۔

(۳) --- حضرت انس فرماتے ہیں۔

انهٗ كان اذا تكلم اعادها ثلاثاً حتى تفهم [۱] جب آپ کوئی بات فرماتے تو تین مرتبہ دہراتے تاکہ وہ سمجھ میں آ جائے۔

(۴) --- آنحضرت ﷺ نے چند احادیث بیان کرنے کے بعد فرمایا۔

ليبلغ الشاهد الغائب فان الشاهد عسى ان يبلغ من هوا وعى له منه [۲] موجود شخص کو چاہئے کہ وہ غیر موجود اشخاص کو میری باتیں پہنچا دے، ممکن ہے کہ حاضر شخص، ایسے غائب شخص کو پہنچائے جو اس سے زیادہ میری باتوں کو محفوظ کر سکے۔

متعدد صحابہؓ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، یہ پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہوئی، محدثین کرام نے صحابہؓ سے احادیث کو اخذ کیا، اور پھر ان کو بالکل محفوظ کر دیا۔

(۵) --- یمن کے لوگ، خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا۔

ابعث معنا رجلا يعلمنا السنة و الاسلام [۳] ہمارے ساتھ ایسے شخص کو بھیج دیجئے جو ہمیں سنت اور اسلام کی تعلیم دے۔

چنانچہ ان کے مطالبہ پر، آپؐ نے حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح کو بھیج دیا۔

(۶) --- مردوں کی طرح، عورتوں کے لیے بھی، آنحضرت ﷺ نے حدیث کی تعلیم کے لیے، خود اُن کے مطالبہ پر کچھ دن مقرر کر رکھے تھے، ایک عورت آئی، اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول:-

ذهب الرجال بحديثك فاجعل لنا من نفسك يوما ناتيك فيه تعلمنا مما علمك الله قال اجتمعن يوما كذا و كذا [۴] مرد تو آپ کی احادیث حاصل کرتے ہی رہتے ہیں، ہمارے لیے بھی کوئی دن مقرر فرما دیجئے، تاکہ اس دن ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں، اور اللہ کے سکھائے ہوئے علم میں سے آپ ہمیں بھی سکھائیں، فرمایا "فلاں دنوں میں جمع ہو جایا کرو"۔

زبانی تعلیم کے بعد کتابت احادیث کا اہتمام بھی

احادیث کی تعلیم اور اس کی حفاظت کے اہتمام کے ساتھ ساتھ، خود آنحضرت ﷺ نے بہت سی احادیث کو لکھوایا بھی تھا، مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) --- حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔

كتب رسول الله ﷺ كتاب الصدقة [۵] رسول اللہ ﷺ نے کتاب الصدقہ تحریر فرمائی تھی۔

---

[۱] بخاری، کتاب العلم، باب من اعاد الحديث ثلاثا …………

[۲] بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی رب مبلغ اوعی …………

[۳] صحیح مسلم، کتاب فضائل صحابہ، باب فضائل ابی عبیدہ بن الجراح

[۴] مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من يموت له ولد ………… [۵] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی زکوٰۃ السائمة

(۲) --- ابوراشد الحرانی فرماتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے میرے سامنے ایک کتاب رکھی اور مجھے بتایا کہ

هٰذا ما کتب لی رسول اللہ ﷺ [۱] یہ وہ کتاب ہے جو رسول اللہ نے لکھ کر مجھے دی تھی۔

(۳) --- آنحضرت ﷺ نے ایک نوشتہ، منذر بن ساوی کو بھیجا، جس میں مختلف ہدایات تھیں۔ [۲]

(۴) --- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ

وجد فی قائم سیفِ رسول اللہ ﷺ کتابان [۳] حضور ﷺ کی تلوار کے قبضہ پر دو نوشتے پائے گئے۔

(۵) --- موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں۔

عند نا کتاب معاذ عن النبی ﷺ [۴] ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو معاذ کے لیے رسول اللہ نے لکھی تھی۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے، اس کتاب کو، جو آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ کے ساتھ بھیجی تھی، منگوایا، اور اس کو پڑھوا کر سنا۔ [۵]

(۶) --- حضرت عبداللہ بن عکیم، ایک نوشتۂ رسول کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ

قُرِئَ علینا کتاب رسول اللہ ﷺ بارض جهینة وانا غلام شاب ان لا تستمتعوا من المیتة با هاب ولا عصب [۶] جہینہ کی سرزمین میں، ہم پر رسول اللہ ﷺ کی کتاب پڑھ کر سنائی گئی جبکہ میں اس وقت نوجوان تھا، کہ تم مردار کی کھالوں سے (بغیر دباغت کے) اور پٹھوں سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔

(۷) --- تین نوشتے آنحضرت ﷺ نے حضرت وائل کو عطا فرمائے تھے۔ [۷]

(۸) --- یزید بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کے پاس، ایک سرخ چمڑے کا قطعہ تھا، اس پر مختلف احکام درج تھے، ہم نے پوچھا:

من کتب لک هٰذا الکتاب قال رسول اللہ ﷺ [۸] تم کو یہ کتاب کس نے لکھ دی، تو انھوں نے جواباً کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے۔

(۹) --- آنحضرت ﷺ نے ایک کتاب لکھ کر، زیاد بن جہور کو روانہ فرمائی تھی۔ [۹]

(۱۰) --- آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چند کلمات کی منادی کے لیے روانہ فرمایا اور ان کے پیچھے حضرت علیؓ کو مع ایک کتاب بھیجا حضرت علیؓ نے یہ کتاب ابوبکرؓ کے حوالہ کی۔ [۱۰]

(۱۱) --- حضرت جابرؓ کہتے ہیں:

---

[۱] ترمذی، ابواب الدعوات، باب ماجاء فی عقد التسبیح بالید [۲] کتاب الاموال، لابی عبید، صفحہ ۲۰

[۳] دارقطنی، کتاب الحدود [۴] دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، باب لیس فی الحضراوات صدقة

[۵] نصب الرایہ، کتاب الزکوٰۃ، جلد ۳، صفحہ ۳۵۲ [۶] ابوداؤد، کتاب اللباس، باب من روی ان لا ینتفع باهاب المیتة

[۷] المعجم الصغیر للطبرانی، صفحہ ۲۴۹ [۸] کتاب الاموال، صفحہ ۱۲ [۹] المعجم الصغیر (طبرانی)، صفحہ ۸۴

[۱۰] ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورة توبة

کتب النبی ﷺ علی کل بطن عقولہٗ ثم کتب انہ لا یحل لمسلم ان یتوالی مولیٰ رجل مسلم بغیر اذنہٖ ثم اخبرت اَنّہٗ لعن فی صحیفتہ مَن فعل ذالک [۱] رسول اللہ ﷺ نے تحریر فرمایا تھا کہ دیت، عصبہ کے ذمہ واجب الادا ہے، پھر یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کے مولیٰ کو بغیر اس کی اجازت کے، اپنا مولیٰ بنا لے، پھر مجھے خبر دی گئی کہ آپؐ نے اپنے اس صحیفہ میں، ایسا کرنے والے پر لعنت کی ہے۔

(۱۲) --- امام زہری فرماتے ہیں کہ ایک کتاب، آنحضرت ﷺ نے تحریر فرمائی تھی، پھر انھوں نے اس کا مضمون بیان کیا۔ (اور یہ ایک طویل حدیث ہے) [۲]

(۱۳) --- ایک کتاب، آنحضرت ﷺ نے تمام مومنین کے نام لکھی تھی۔

وشھد علیٰ نسخۃ ھذہ الصحیفۃ صحیفۃ رسول اللہ ﷺ، علی ابن ابی طالب و حسن بن علی و حسین بن علی [۳] اور اس کتاب کے ایک نسخہ پر، بطور شہادت، کہ واقعی یہ رسول اللہ ﷺ کا صحیفہ ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے گواہی دی تھی۔

(۱۴) --- امام طاؤس فرماتے ہیں:

وعند نا فی کتاب رسول اللہ ﷺ وفی الانف اذا قطع مارنہ مائۃ من الابل [۴] ہمارے پاس، رسول اللہ ﷺ کی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ناک کا اگلا نرم حصہ کٹ جائے تو دیت میں سو اونٹ ادا کرنے ہوں گے۔

(۱۵) --- نبی اکرم ﷺ نے جب حضرت عمرو بن حزم کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو حضور ﷺ نے ایک ایسی کتاب لکھ کر (یا لکھوا کر) اس کے حوالے کی تھی، جس میں دین کے بہت سے احکام درج تھے۔

ان رسول اللہ ﷺ کتب الی اھل الیمن کتابا فیہ الفرائض والسنن والدیات وبعث بہ عمرو ابن حزم [۵] رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو ایک کتاب لکھ کر بھیجی اس میں فرائض، سنن اور دیات کے مسائل کی تفصیل تھی اور اسے عمرو بن حزم کے ہاتھ ارسال فرمایا۔

(الف) عن ابن شھاب قَالَ قَرَءْتُ کتاب رسول اللہ ﷺ الذی کتب لعمرو ابن حزم حین بعثہ علی نجران وکان الکتاب عند ابی بکر بن حزم۔ [۶] ابن شہاب سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود حضور ﷺ کی اس کتاب کو پڑھا ہے، جو آپؐ نے عمرو ابن حزم کے لیے اس وقت لکھی تھی جبکہ انھیں نجران (وادیٔ یمن) پر عامل بنا کر مبعوث فرمایا تھا۔

(ب) خلیفۂ راشد، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کتاب کی صحت کی شہادت دی ہے۔

قالَ الحاکم قد شھد عمر بن عبدالعزیز و امام عصرہ الزھری بالصحۃ لِھٰذا الکتاب [۷] امام حاکم نے

---

[۱] مسلم، کتاب العتق، باب تحریم تولی العتیق غیر موالیہ [۲] کتاب الاموال، صفحہ ۱۲۵
[۳] کتاب الاموال، صفحہ ۱۹۳ [۴] نیل الاوطار، جلد ۷، صفحہ ۲۱۴
[۵] + [۶] سنن نسائی، کتاب القسامۃ والقود والدیات، باب حدیث عمرو بن حزم فی العقول
[۷] نیل الاوطار، جلد ۷، صفحہ ۱۶۴

کہا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ان کے عہد کے امام زہری دونوں نے اس کتاب کی صحت پر گواہی دی ہے۔

(ج) اسی کتاب کے متعلق، امام یعقوب فرماتے ہیں۔

لَا اعلم فی جمیع الکتب المنقولۃ کتاباً اصحَّ من کتاب عمرو ابن حزم فان اصحاب رسول اللہ ﷺ والتابعین یرجعون الیہ و یدعون رأیَھُمْ [1]

ضمناً --- اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی یوں تو لکھوائی ہوئی بہت سی کتابیں تھیں، اور وہ سب صحیح تھیں، لیکن ان کے علم کے مطابق، سب سے زیادہ صحیح کتاب عمرو بن حزم کی کتاب تھی، کیونکہ شہرت، مقبولیت عامہ اور تواتر کا جو درجہ اسے حاصل ہوا، وہ کسی اور کتاب کے حصہ میں نہیں آیا۔ امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں۔

(د) امام ابن عبدالبر، اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ھٰذا کتاب مشھور عندا اھل السیر معروف مافیہ عند اھل العلم [2] یہ کتاب، اہل سیرت کے ہاں بھی مشہور کتاب ہے، اور اس کا مواد، اہل علم کے ہاں بھی معروف ہے۔

(۱۶) --- امام محمد بن مسلم فرماتے ہیں۔

ھذہ نسخۃ کتاب رسول اللہ ﷺ الذی کتبہ فی الصدقۃ وھی عند ال عمر بن الخطاب [3] یہ اس کتاب کا نسخہ ہے جسے رسولؐ خدا نے صدقات کے متعلق لکھوایا تھا، اور یہ خاندانِ عمر بن خطاب کے پاس تھی۔

پھر فرماتے ہیں۔

اقرأنیھا سالم بن عبداللہ بن عمرؓ فوعیتھا علی وجھھا وھی التی انتسخ عمر بن عبدالعزیز من عبداللہ بن عبداللہ بن عمر و سالم بن عبداللہ بن عمر فذکر الحدیث [4] یہ کتاب حضرت عمرؓ کے پوتے سالم بن عبداللہ نے مجھے پڑھائی تھی اور میں نے اسے پوری طرح محفوظ کر لیا، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس کتاب کو، حضرت عمرؓ کے پوتوں، عبداللہ اور سالم سے لے کر لکھوایا تھا، پھر اس کے بعد مضمون حدیث بیان کیا۔

(۱۷) --- سوید بن غفلہ فرماتے ہیں:-

عن سوید بن غفلۃ قالَ اَتانا مصدق النبی ﷺ فاخذت بیدہ و قرأت فی عھدہ لا یجمع بین مفترق ولا یفرق بین مجتمع خشیۃ الصدقۃ [5] ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا تحصیلدار آیا، میں نے اس کی کتاب میں پڑھا کہ زکوٰۃ کے خوف سے متفرق مال جمع نہ کیا جائے، اور مجتمع مال کو متفرق نہ کیا جائے۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تحصیلداروں کے پاس، آنحضرت ﷺ کی کتاب موجود ہوتی تھی، جس میں زکوٰۃ کی وصولی اور زکوٰۃ سے متعلقہ دیگر احکام درج ہوتے تھے۔

(۱۸) --- متعدد صحابہؓ کرام احادیث کو، حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں لکھا کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں۔

بینما نحن حول رسول اللہ ﷺ نکتب اذسئل رسولُ اللہ ﷺ ای المدینۃ تفتح اولاً قسطنطنیۃ او رومیۃ فقال النبیّ بل مدینۃ ھرقل اولاً [6] ہم رسول اللہ ﷺ کے گرد بیٹھے لکھ رہے تھے، اس حالت میں رسولؐ خدا سے یہ پوچھا

---

[1] + [2] نیل الاوطار، جلد۷، صفحہ ۱۶۳ — [3] سنن ابی داوٗد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی زکوٰۃ السائمۃ

[4] + [5] سنن ابی داوٗد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی زکوٰۃ السائمۃ — [6] سنن الدارمی، باب من رخص فی کتابۃ العلم

گیا کہ سب سے پہلے کون سا شہر فتح ہوگا؟ قسطنطنیہ یا رومیہ؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا" بلکہ ہرقل کا شہر ہی پہلے فتح ہوگا"۔

کیا اب بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے احادیث کو محفوظ کرنے کا کوئی اہتمام نہیں فرمایا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے، اپنی سلطنت کے مختلف شعبوں کے کارپردازوں کو اپنی تحریری ہدایات وفرامین اور فرائض وسنن پر مشتمل کتب فراہم کی تھیں، جو گورنروں، تحصیلداروں اور دیگر عمال کے ہاتھوں میں رہ کر، انھیں، ان کے سرکاری فرائض کی بجا آوری میں مدد دیتی تھیں، کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ آپؐ نے بنفس نفیس حفاظت احادیث کا انتظام واہتمام فرمایا؟ مزید برآں آپ نے صحابہؓ کو بھی کتابتِ حدیث کا حکم دیا، اور وہ خود آپؐ کی مجلس میں احادیث کو ضبطِ تحریر میں لایا کرتے تھے۔

کتابتِ حدیث کا حکمِ رسولؐ

مختلف مقامات پر، متعدد صحابہؓ کرام کو، آپؐ نے احادیث کے لکھنے کا حکم دیا، چند احادیث ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) خطبہ حجۃ الوداع کو تحریری شکل میں حاصل کرنے کی درخواست کی گئی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

اکتبوا لا بی شاہ [۱] یہ احادیث (خطبہ حجۃ الوداع) ابوشاہ کو لکھ کردے دو۔

(۲) حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے آپؐ نے فرمایا۔

اُکتب فوالذی نفسی بیدہ مایخرجُ مِنہ اِلّا حَقٌ [۲] لکھے جاؤ، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے اس زبان سے صرف حق ہی نکلتا ہے۔

(۳) ایک شخص نے آپؐ سے عرض کیا۔

انی لا سمع منک الحدیث فیعجبنی ولا احفظہ فقال رسول اللہ ﷺ استعِن بیَمِینِک وَاَوْمٰی بیدہ الخط [۳] میں آپؐ سے احادیث سنتا ہوں، مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں، لیکن یاد نہیں رہتیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو" اور ساتھ ہی آپؐ نے ہاتھ سے لکھنے کا اشارہ فرمایا۔

(۴) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

قَیِّدُوا العلم بالکتاب [۴] علم کو قیدِ تحریر میں لے آؤ۔

(۵) آنحضرت ﷺ نے، حدیث کی حفاظت کا حکم ہی نہیں دیا، بلکہ حفاظت حدیث میں مشغول ہونے والے کے لیے دعا بھی فرمائی۔ آپؐ نے فرمایا۔

نضّر اللہ امرءً ا سَمِعَ مِنّا حدیثا فحفظہ حتّی یبلغہ فرب حامل فقہٍ الی من ھوا فقہ منہ ورب حامل فقہ لیس بفقیہٍ [۵] اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جو میری احادیث کی سماعت کرے، اسے محفوظ رکھے اور پھر آگے پہنچائے، کتنے لوگوں میں ایسے ہیں جو جن کو پہنچاتے ہیں وہ زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں اور کبھی صاحب (علم) فقہ خود سمجھدار نہیں ہوتا۔

---

[۱] جامع صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب من قتل لہ قتیل فھو بخیر النظرین

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب کتابۃ العلم [۳] جامع ترمذی، ابواب العلم، باب فی الرخصۃ فیہ

[۴] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۲ [۵] سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب فضل فی نشر العلم

اس حدیث کو متعدد صحابہ نے روایت کیا ہے، ان ہی احادیث کی تعمیل میں صحابہ کرام اور دیگر محدثین نے احادیث کو اپنے سینوں اور صحیفوں میں محفوظ فرمایا، اور انھیں بعد والی نسل تک منتقل کیا، حتیٰ کہ احادیث کتابی شکل میں مدون ہو گئیں، پھر اس کے بعد، اس کی تعلیم اور حفاظت اب تک اور اب سے قیامت تک ان شاءاللہ جاری رہے گی۔

خلافت راشدہ میں کتابت حدیث

عہد نبوی کے بعد، خلافت راشدہ میں بھی، احادیث کی کتابت کا سلسلہ حتیٰ کہ خلفائے راشدین کے ہاتھوں بھی یہ مبارک عمل جاری رہا۔

مندرجہ ذیل واقعات، اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔

(۱) ابوبکرؓ کی کتاب حدیث

منکرین حدیث تو حضرت ابوبکرؓ صدیق کو حارق حدیث قرار دیتے ہیں اور وہ بھی ایک ایسی بے اصل روایت کی بنیاد پر، جسے پیش کرنے والا خود اسے بے اصل قرار دیتا ہے۔لیکن اس کے مقابلہ میں، کتب احادیث میں سے معتبر ترین کتاب، یہ حقیقت بیان کرتی ہے کہ

عن انس ان ابا بکر رضی اللہ عنہ کَتَبَ له هٰذا الکتاب لما وجّهَهٗ الی البحرین ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم هذه فریضة الصدقة التی فرض رسول اللہ ﷺ علی المسلمین و التی امر اللہ بها رسولهٗ [۱] حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے، جب ان کو بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تو ایک کتاب لکھ کر دی، جس کا مضمون یہ تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ زکوٰۃ کے فرائض ہیں جن کو رسول نے مسلمانوں پر فرض کیا، اور وہ امور بھی جن کا اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے۔

اس حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی حماد بن سلمہ کہتے ہیں:

اخذت هٰذا الکتاب من ثمامة [۲] میں نے یہ کتاب (حضرت انس کے پوتے) ثمامہ سے حاصل کی تھی۔

(۲) عمرؓ کی کتب حدیث

منکرین حدیث، حضرت عمرؓ کو خلفائے راشدین میں سے سب سے بڑے ''منکر حدیث'' کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ حدیث کی کتب، سب سے زیادہ، انھیں کی ہیں، چند حوالے ملاحظہ فرمائیے:

پہلی کتاب: ان عمر بن عبدالعزیز حین استخلف ، ارسل الی المدینة یلتمس عهد رَسُولِ اللہ ﷺ فی الصدقات فوجده عند اٰل عمرو ابن حزم کتاب النبی ﷺ الی عمرو بن حزم فی الصدقات و وجد عند اٰل عمر بن الخطاب، کتاب عمر الی عماله فی الصدقات بمثل کتاب النبی ﷺ الی عمرو بن حزم فامر عمر بن عبدالعزیز عماله علی الصدقات ان یاخذوا بما فی ذینک الکتابین .... [۳]

---

[۱] جامع صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ الغنم [۲] سنن دارقطنی،کتاب الزکوٰۃ،باب زکوٰۃ الابل والغنم
[۳] سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ الابل والغنم

حضرت عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے لوگوں کو مدینہ بھیج کر کتاب الصدقہ تلاش کرائی، وہ کتاب، عمرو بن حزم کے خاندان کے ہاں سے ملی، یہ وہ کتاب تھی، جو آپؐ نے عمرو بن حزم کو لکھ کر مرحمت فرمائی تھی، جو مسائل صدقات پر مشتمل تھی، اور حضرت عمرؓ کی وہ کتاب، خاندانِ عمر کے ہاں سے ملی، جو انھوں نے (کئی نسخوں کی صورت میں) اپنے عمال کو لکھ کر دی تھی، یہ بھی عمر بن حزم کے نوشتۂ رسول ہی کی مانند ایک کتاب تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال صدقات کو حکم دیا کہ ان کتابوں کے مطابق صدقات وصول کیے جائیں، (یا جو کچھ ان کتابوں میں ہے اسے حاصل کر لیں)۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ

دوسری تحریر: انه قرء کتاب عمر بن الخطاب فی الصدقة[۱] خود انھوں نے عمرؓ سے یہ کتاب پڑھی ہے۔

عن ابی امامة قال کتب معی عمر بن الخطاب الی ابی عبیدة ان رسول الله ﷺ قال الله ورسوله مولٰی من لا مولٰی له والخال وارث من لا وارث له [۲] حضرت عمرؓ نے ابوامامہ کے ہمراہ، یہ لکھ کر روانہ فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کا (دنیا میں) کوئی وارث نہ ہو، اس کا وارث، اللہ اور اس کا رسول ہوگا، اور ماموں، اس شخص کا وارث ہوگا جس کا (اس دنیا میں) کوئی اور وارث نہ ہوگا۔

تیسری تحریر: کتب عمرؓ الی عقبة بن فرقد ان النبی ﷺ نهی عن الحریر الا ماکان هکذا و هٰکذا اصبعین اوثلاثة واربعة [۳] حضرت عمرؓ نے عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے حریر پہننے سے منع فرمایا تھا، مگر ہاں، دو، تین چار انگل تک کے (حاشیہ کے) برابر اجازت دی ہے۔

چوتھا نوشتہ میراث کے متعلق، ایک مقدمہ پیش ہوا، تو حضرت عمرؓ نے فرمان رسول ﷺ کی بنیاد پر فیصلہ فرمایا اور پھر مع فرمانِ رسولؐ، فیصلہ لکھ کر کچھ صحابہؓ کی اس پر شہادت ثبت کر کے، آیندہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ حتیٰ کہ ان ہی کے فیصلہ کے مطابق، عبدالملک نے اپنے عہد میں ایسے ہی ایک مقدمے کا فیصلہ کیا۔

فقال عمر قال رسول الله ﷺ ما احرز الولد او الوالدُ فهو لعصبتهٖ من کان، فکتب له کتابا فیه شهادةُ عبدالرحمن بن عوف و زید بن ثابت ورجل آخر فلما استخلف عبدالملک .... فقضی لنا بکتٰب عمر بن الخطاب [۴] تو عمرؓ نے کہا کہ فرمانِ نبوی ہے جو مال بیٹا یا باپ جمع کرے، وہ اس کے عصبہ کے لیے ہے، خواہ وہ کوئی ہو، تب حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ لکھ کر دیدیا اور اس پر عبدالرحمٰن بن عوف، زید بن ثابت اور ایک اور آدمی کی شہادت ثبت کی، پھر جب عبدالملک خلیفہ بنا .... تو اس نے عمر بن خطاب کے اسی نوشتہ کے مطابق فیصلہ کیا۔

ابوبکرؓ و عمرؓ کے ہاتھوں نوشتۂ رسول کی حفاظت

حضور اکرم ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں زکوٰۃ وصدقات پر مشتمل جو "کتاب الصدقہ" تحریر فرمائی (تحریر کروائی) تھی، وہ نہ صرف یہ کہ بعد میں لفظاً اور دستاویزی حیثیت سے محفوظ رہی بلکہ وہ عملی زندگی میں نافذ ہو کر بھی محفوظ رہی۔

عن سالم عن اَبِیْهِ قال کتب رسول الله ﷺ کتاب الصدقة .... فعمل به ابوبکر حتی قبض ثمَّ عمل

---

[۱] موطا امام مالک، کتاب الزکوٰة، باب صدقة الماشیة [۲] جامع ترمذی، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الخال

[۳] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی لبس الحریر [۴] سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، باب فی الولاء

به عمر حتّٰی قبض ۱؎ سالم اپنے باپ (عبداللہ بن عمر) سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے کتاب الصدقہ لکھوائی تھی .... اس پر حضرت ابوبکرؓ اپنی وفات تک عمل پیرا رہے، پھر، حضرت عمرؓ اپنی وفات تک اس پر عمل کرتے رہے۔

عمرؓ کی طرف سے سنن نبویہ کی تعلیم و تعلم کی تاکید

حضرت عمرؓ، اپنے خطبات جمعہ کے علاوہ بھی قولاً اور عملاً حدیث نبوی اور سننِ رسول کی تعلیم و تعلم پر زور دیا کرتے تھے، مثلاً ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ

تعلموا الفرائض و السنة کما تتعلمون القرآن ۲؎ تم فرائض و سنن کو اسی طرح سیکھا کرو جیسے قرآن سیکھتے ہو۔

ایک اور مقام پر علم حدیث کو ضبط تحریر میں لانے کی تاکید یوں فرماتے ہیں۔

قیّدوا العلم بالکتاب ۳؎ علم کو کتابی شکل میں رکھ کر قید کرلو۔

حضرت عثمانؓ اور ان کا نوشتہ حدیث

حضرت عثمانؓ، جس نظام حکومت کو چلا رہے تھے، اس کی مکمل صورت گری، سننِ رسول ہی کی مرہون منت تھی، مزید برآں، وہ ذخیرۂ حدیث سینوں میں یا صحیفوں میں محفوظ رکھتے تھے، جس کی بناء پر، وہ بہت سی ایسی احادیث کی ضرورت سے خود کو بالاتر جانتے تھے، جو پہلے ہی ان کے پاس محفوظ تھیں۔ جیسا کہ درج ذیل واقعہ سے ظاہر ہے۔

عَنِ ابن الحنفیة قال ارسلنی ابی خذ هذا الکتاب فاذهب الی عثمان فان فیه امر النبی ﷺ فی الصدقة فقال اغنها عنا۔ ۴؎ علیؓ نے اپنے بیٹے محمدؒ بن حنفیہ سے فرمایا، اس کتاب کو عثمانؓ کے پاس لے جاؤ اور ان پر اس سے عمل کے لیے کہہ دو، کیونکہ اس میں آپؐ کے احکام دربارۂ صدقہ درج ہیں عثمانؓ نے کہا ''مجھے اس سے مستغنی رکھو'' (کیونکہ میرے پاس یہ احکام موجود ہیں)۔

حضرت علیؓ کا نوشتہ حدیث

حضرت علیؓ کا ایک نوشتہ تو وہ تھا جسے انھوں نے اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کے توسط سے خلیفہ سوم کی خدمت میں ارسال کیا، اور دوسرا نوشتہ وہ تھا جس میں دیتِ جراحات کے احکامِ رسول درج تھے، وہ خود فرماتے ہیں۔

مَنْ زَعَمَ اَنَّ عِنْدَ نَا شیئًا نقرَء ہ الا کتاب الله و هذا الصحیفة قال و صحیفة معلقة فی قراب سیفه فقد کذب فیها اسنان الابل و اشیاء من الجراحاتِ وفیها قال رسول الله ﷺ ...... ۵؎ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ہمارے (یعنی اہل بیت کے) پاس، کوئی (خاص) طور پر کوئی چیز ہے سوائے کتاب اللہ کے اور اس صحیفے کے، راوی کا بیان ہے کہ ان کی تلوار کے میان میں ایک صحیفہ لٹکا ہوا تھا، تو اس نے جھوٹ کہا، اس صحیفہ میں اونٹوں کی عمریں (زکوٰۃ کے متعلقات) اور کچھ زخموں کا بیان (ان کے قصاص اور دیتوں کا بیان) اور اس میں یہ بھی کہ فرمایا ''رسول اللہ ﷺ نے، کہ......

۱؎ سنن ابی داوٗد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی زکوٰۃ السائمه ۲؎ جامع بیان العلم، جلد ۲، صفحہ ۱۲۳ ۳؎ جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۲

۴؎ جامع صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس، باب ما ذکر من درع النبی وعصاہ وسیفه

۵؎ مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینة و دعا النبی بالبرکة

حضرت علیؓ، تعلیمِ سنت کا خود اہتمام فرمایا کرتے تھے، اور حاملینِ حدیث کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ

تزاوروا و تذاکروا الحدیث فانکم ان لم تفعلوا یدرس علمکم [1] ایک دوسرے سے میل ملاقات کرتے رہا کرو، اور احادیث کا باہم مذاکرہ کرتے رہا کرو، ورنہ تمہارا علم مٹ جائے گا۔

بلکہ وہ تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے کہ

اذا کتبتم الاحادیث فاکتبوا باسنادہ [2] جب تم حدیث لکھا کرو تو ان کو سند کے ساتھ لکھا کرو۔

دیگر صحابہؓ اور کتابتِ حدیث

خلفائے راشدین کے علاوہ دیگر صحابہ کرام بھی احادیث رسولؐ کو ضبط تحریر میں لایا کرتے تھے، بعض صحابہ کی کتب احادیث، عہد نبوی اور خلافت راشدہ ہی میں شہرت اور قبولیتِ عامہ پا چکی تھیں۔

عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کی شہرۂ آفاق کتاب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حدیث کی ایک کتاب لکھی تھی، جو ''صحیفۂ صادقہ'' کے نام سے مشہور ہوئی، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں۔

ما من اصحاب النبی ﷺ احد اکثر حدیثا عنہ منی الاما کان من عبداللہ ابن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب [3] صحابہؓ میں سے کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ احادیث رسول اللہ کو بیان کرنے والا نہیں، ماسوا، عبداللہ بن عمرو کے، کہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں لکھا نہیں کرتا تھا۔

اور یہی وہ عبداللہ ہیں جن سے، خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تم لکھتے رہا کرو، اس زبان سے سوائے حق کے، اور کوئی بات نہیں نکلتی''۔

اور یہی وہ صحیفہ صادقہ ہے، جو ان کی ذریت میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، اور ان کے پڑپوتے عمرو بن شعیب سے محدثین نے، اس کو اخذ کیا، اور ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

ابو ہریرہؓ کی کتب احادیث

آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں تو، حضرت ابو ہریرہؓ، احادیث نہیں لکھا کرتے تھے، لیکن بعد میں، خود انھوں نے بھی کئی کتب لکھیں، ایک تابعی کہتے ہیں کہ

فاخذ بیدی الی بیتہ فا رانا کتبا من حدیث النبی ﷺ وقال ھذا ھو مکتوب عندی [4] ابو ہریرہ، میرا ہاتھ پکڑ کر، مجھے اپنے گھر میں لے گئے، اور مجھے کتب احادیث دکھائیں، کہ یہ میرے پاس کتابی شکل میں بھی موجود ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک کتاب، اپنے شاگرد، ہمام کے لیے بھی مرتب کی تھی، جو صحیفۂ ہمام کے نام سے مشہور ہے (اور اب چھپ چکی ہے)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، لکھتے ہیں۔

---

[1] خالص اسلام، صفحہ ۸۹، بحوالہ تفہیم اسلام، صفحہ ۵۱
[2] کنز العمال، جلد ۴، صفحہ ۵۷
[3] صحیح بخاری، باب العلم، باب کتابۃ العلم
[4] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۴

مسند ابو ہریرہؓ کے نسخے، عہد صحابہ ہی میں لکھے گئے، چنانچہ ابو ہریرہؓ کی مسند کا نسخہ، عمر بن عبدالعزیز کے والد، عبدالعزیز بن مروان کے پاس بھی تھا، انھوں نے کثیر بن مرّہ کو لکھا کہ ''تمہارے پاس، رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں کی جو حدیثیں ہوں، انھیں لکھ کر بھیج دو۔

الا حدیث ابی ھریرہ فانه عندنا [1] ماسوائے ابو ہریرہؓ کی حدیثوں کے، کہ وہ ہمارے ہاں موجود ہیں

ابو ہریرہؓ کی کتب احادیث کی ایک اور شہادت

احادیثِ رسول پر مشتمل، ابو ہریرہ کی کتب احادیث کے ذخیرہ کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری (جو اولین اسلامی سفیر اور عہد نبوی کے ایک ممتاز سفارتی افسر تھے) کا ایک فرزند، (حسن)، ابو ہریرہ کے شاگرد تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ

تحدثت عند ابی ھریرة بحدیث فانکرہ فقلت انی قد سمعته منک فقال ان کنت سمعته منی فھو مکتوب عندی ، فاخذ بیدی الی بیته فارانا کتبا کثیرة من حدیث رسول اللہ ﷺ فوجد ذالک الحدیث فقال قدا خبر تک انی ان کنت حدّ ثتک به فھو مکتوب عندی [2] میں نے ابو ہریرہ سے ایک حدیث بیان کی، انھیں اس حدیث میں اجنبیت محسوس ہوئی، میں نے کہا'' میں نے آپؓ ہی سے یہ حدیث سنی ہے'' تو فرمایا'' اگر مجھ سے سنی ہے تو ضرور میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی''، پھر مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور بہت سی کتب احادیث دکھائیں، اور میری بیان کردہ حدیث بھی انھوں نے اپنے ذخیرہ میں پالی، تب فرمایا'' میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اگر میں نے یہ حدیث روایت کی تھی، تو ضرور میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہوگی''۔

یہ روایت، اس بات کا واضح ثبوت ہے، کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی تمام احادیث کو کتابی شکل میں محفوظ کر لیا تھا۔

عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ کی کتاب حدیث

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ، کے پاس بھی حدیث کا ایک مجموعہ موجود تھا، ڈاکٹر حمیداللہ صاحب لکھتے ہیں کہ

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ بھی حدیثیں لکھا کرتے تھے، اور ایسا نظر آتا ہے کہ وہ خط وکتابت کے ذریعہ بھی، درس دیا کرتے تھے، جیسا کہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں نظر آتا ہے۔ [3]

سمرہؓ بن جندب کی کتاب حدیث

صحابیٔ رسولؐ، حضرت سمرة بن جندب کے پاس بھی ایک صحیفۂ احادیث موجود تھا، جو بعد میں حضرت حسن بصری کو منتقل ہوا، اور:

انما یحدث عن صحیفة سمرة [4] اور وہ، حضرت سمرہ کی کتاب سے احادیث سنایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر حمیداللہ صاحب، لکھتے ہیں۔

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بھی حدیثیں جمع کیں، جو ان کے بیٹے، سلیمان بن سمرہ کو وراثت میں ملیں، ابن حجر

---

[1] صحیفہ ہمام بن منبہ، پیش لفظ، صفحہ ۴۶ [2] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۴ [3] صحیفہ ہمام بن منبہ، پیش لفظ، صفحہ ۳۸

[4] جامع ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی احتلاب المواشی بغیر اذن الارباب

نے لکھا ہے کہ سلیمان نے اپنے باپ کے حوالہ سے ایک بڑا رسالہ (نسخة كبيرة) روایت کیا ہے، نیز ابن سیرین کہتے ہیں کہ سمرہ نے اپنے بیٹوں کے لیے، جو رسالہ لکھا تھا، اس میں بہت علم (علم کثیر) پایا جاتا ہے۔ [1]

حضرت سعدؓ بن عبادہ کی کتاب حدیث

حضرت سعدؓ بن عبادہ نے بھی، ایک کتاب، مشتمل بر احادیثِ رسول، تالیف کی تھی، حضرت سعد کے فرزند کہتے ہیں:

وَجَدْنَا فِي كِتَابِ سَعْدٍ ان النبیَّ ﷺ قضى باليمين مَعَ الشاهد [2] ہم نے سعد کی کتاب میں (فیصلہ) پایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک گواہ اور قسم پر بھی فیصلہ فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عباس کی کتب احادیث

حضرت عبداللہ بن عباس نے کئی کتابیں لکھی تھیں، اور یہ کتب ان کی زندگی ہی میں اکنافِ عالمِ اسلام میں پھیل چکی تھیں، حضرت عکرمہؒ، جو ان کے نامور شاگرد تھے، فرماتے ہیں کہ

ان نفرا قدموا على ابن عباس من اهل الطائف بكتاب من كتبه فجعل يقرء عَلَيْهِم [3] طائف کے چند افراد، حضرت ابن عباس کے پاس، ان کی کتابوں میں سے ایک کتاب لائے، اور ابن عباس یہ کتاب، پڑھ کر، انھیں سنانے لگے۔

عبداللہ بن عباس کی کتب احادیث کے متعلق، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ

یہ تواتر سے ثابت ہے کہ ان کی وفات ہوئی، تو اتنی تالیفیں چھوڑیں کہ ایک اونٹ پر لادی جاتی تھیں۔ [4]

حضرت انسؓ بن مالک کی کتاب حدیث

خادمِ رسول اور صحابیٔ رسول، حضرت انس بن مالکؓ بھی اپنے ہاں مکتوب شکل میں، ایک دفترِ حدیث رکھتے تھے، حضرت سعید بن ہلال فرماتے ہیں کہ

كنا اذا اكثرنا على انس بن مالك رضى الله عنه فاخرج الينا محالاً عنده فقال هذه سمعتها من النبی ﷺ فكتبتها وعرضتها عليه [5] ہم جب حضرت انسؓ سے زیادہ پوچھ گچھ کرتے، تو وہ اپنے پاس سے ایک دفتر نکالتے، اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں، جو حضور اکرم ﷺ سے میں نے سنی ہیں اور پھر انھیں لکھ کر آپؐ پر پیش کیا ہے۔

حضرت انس کی تعلیمِ حدیث کے دوران، لکھنے والے احادیث کو لکھ بھی لیا کرتے تھے،

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا صحیفۂ حدیث

حضرت جابر بن عبداللہ کے پاس بھی مکتوب شدہ، ایک صحیفۂ احادیث موجود تھا، حضرت سلیمان تیمی کہتے ہیں۔

ذهبوا بصحيفة جابر بن عبدالله الى الحسن البصری فاخذ ها [6] وہ حضرت جابر کی کتاب کو امام حسن بصری کے پاس لے گئے، تو انھوں نے اس کو لے لیا (اور یاد کر لیا)

---

[1] صحیفہ ہمام بن منبہ، پیش لفظ، صفحہ ۳۹ [2] جامع ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی اليمين مع الشاهد

[3] جامع ترمذی، کتاب العلل [4] صحیفہ ہمام بن منبہ، پیش لفظ، صفحہ ۴۰ [5] خالص اسلام، صفحہ ۲۷، بحوالہ تفہیم اسلام، صفحہ ۵۵

[6] جامع ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی ارض المشترک یرید بعضهم بیع نصیبه

حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کی کتاب حدیث

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاں بھی ان کی اپنی خود نوشت کتاب موجود تھی، ان کے بیٹے، عبدالرحمٰن، ایک کتاب نکال کر لائے، اور قسم کھا کر کہا یہ خود، ابن مسعودؓ کی اپنی لکھی ہوئی کتاب ہے، اصل عربی الفاظ یہ ہیں۔

حلف لی انّہٗ خط ابیہ بیدہ [1] انھوں نے حلف اٹھایا کہ یہ ان کے باپ کے اپنے ہاتھوں کا مخطوطہ ہے۔

حضرت زیدؓ بن ثابت کی کتاب حدیث

توجیہ النظر میں ہے کہ

حضرت زید بن ثابت نے ایک کتاب، فرائض کے متعلق لکھی تھی۔ [2]

حضرت رافعؓ بن خدیج کی کتاب حدیث

حضرت رافع بن خدیج کی کتاب حدیث کا ثبوت، وہ واقعہ ہے جسے نافع بیان کرتے ہیں کہ مروان نے خطبہ دیا، اور اس میں مکہ مکرمہ کے حرم ہونے کا تو ذکر کیا لیکن مدینہ کے حرم ہونے کو نظر انداز کر دیا، تو حضرت رافع بن خدیج نے انھیں پکار کر کہا ''کیا بات ہے کہ آپ نے مکہ کی حرمت کا تو ذکر کیا، مگر مدینہ کی حرمت کا ذکر نہیں کیا''، فرمایا:

وَقد حرم رسول اللہ ﷺ مابین لابتیھا و ذالک عند نافی ادیم خولانی، ان شئت اقرء تکہٗ [3]

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے، دونوں سیاہ سنگستانوں کے درمیان واقع علاقہ (مدینہ) کو حرام قرار دیا ہے اور یہ حکم میرے پاس لکھا ہوا ہے اگر چاہو تو میں پڑھ کر سنا دوں۔

حقیقت یہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ عارضی اور وقتی ممانعتِ کتابتِ حدیث کے بعد، حضور اکرم ﷺ نے احادیث کو لکھنے کی عام اور کھلی اجازت دے دی تھی، اور خود صحابہؓ کرام بھی عہد نبوی ہی میں نہیں بلکہ مجلس نبوی میں بھی احادیث رسول کو لکھا کرتے تھے، اور صحابہؓ، کتابی شکل میں، احادیث کا ذخیرہ اپنے ہاں محفوظ رکھا کرتے تھے، کتب وصحائف کے علاوہ، قلوب وصدور بھی اس علم کا مخزن تھے، بلکہ ابتدائی دور میں، کتابتِ حدیث پر، حفظِ حدیث کو شرف وعظمت کے اعتبار سے فوقیت حاصل تھی، تاہم ایک وقت آیا، کہ کتابت حدیث کی رفتار میں، اُس تحریک کی بدولت تیزی آ گئی، جس کے تحت حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے، اپنے عمال حکومت اور جید علماء کو جمع احادیث کی تاکید فرمائی۔ عبداللہ بن دینار کہتے ہیں کہ

کتب عمر بن عبدالعزیز الی ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم ان اکتب الی بما ثبت عندک من الحدیث عن رسول اللہ ﷺ وبحدیث عمر، فانی خفت دروس العلم و ذھابہ [4] حضرت عمر بن عبدالعزیز نے، حضرت عمرو بن حزم کے پوتے، ابوبکر بن محمد کو یہ لکھا کہ حدیث رسول اور فرموداتِ عمر میں سے جو کچھ ثابت شدہ مواد، تیرے

[1] جامع بیان العلوم، جلد ۱، صفحہ ۷۲
[2] برق اسلام، صفحہ ۹۱، بحوالہ تفہیم اسلام، صفحہ ۵۷
[3] جامع صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینۃ ....
[4] سنن الدارمی، مقدمہ، باب من رخص فی کتابۃ العلم

پاس موجود ہے، اسے تحریری شکل میں مجھے بھیج دو، کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ علم مٹ جائے اور رخصت ہو جائے گا۔

اہل مدینہ کو بھی، انھوں نے یہی تحریری حکم ارسال کیا، کیونکہ مدینہ اسلام کی اولین تجربہ گاہ تھی، جس میں عہد نبوی اور خلافت راشدہ کا تعامل، ابھی موجود تھا، چنانچہ یہی عبداللہ بن دینار فرماتے ہیں کہ:

كتب عمر بن عبدالعزيز الى اهل المدينة ان انظروا حديث رسول الله ﷺ فاكتبوه فانى خفت دروس العلم وذهاب اهله [1] حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اہل مدینہ کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو دیکھو، اور انھیں قلمبند کرو، کیونکہ میں یہ خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ علم مٹ جائے گا اور علم کے حامل، رخصت ہو جائیں گے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اس تحریک سے کتابتِ حدیث کے عمل میں تیزی پیدا ہوگئی، لیکن اس کا یہ معنٰی ہرگز نہیں کہ حفظ حدیث کا عمل سست پڑ گیا، جس نسبت سے کتابت حدیث میں اضافہ ہوا، اسی نسبت سے حفظِ حدیث کا عمل بھی فزوں تر ہو گیا، بلکہ تحریری مواد کو، حفظ کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا، جیسا کہ رجاء بن حیوہ کے اس بیان سے ظاہر ہے۔

عن رجاء بن حيوة انه حدثه قال : كتب هشام بن عبد الملك الى عامله ان يسئلنى عن حديث، قال رجاء : فكنت قد نسيته لولا انه كان عندى مكتوباً [2] رجاء بن حیوۃ حدیث روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہشام بن عبدالملک نے اپنے ایک عامل کو لکھا کہ وہ مجھ سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کرے، رجاء نے کہا کہ میں تو وہ حدیث بھول ہی چکا تھا، اگر وہ میرے ہاں لکھی ہوئی نہ ہوتی۔

یہ واقعہ اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ کتابت حدیث کے عمل کو، حفظ حدیث کا ذریعہ بنایا گیا تھا، حفظ حدیث بطور مقصد کے اور کتابتِ حدیث، بطور ذریعہ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کے ہاں، زبانی روایت کے ساتھ ساتھ، کتابت کا عمل بھی برقرار رہا، اور صحابہ مجلس نبوی میں احادیث رسول کو سینوں اور صحیفوں کے ذریعے محفوظ کر کے اگلی نسل کو پہنچاتے رہے، اس حقیقت پر یہ واقعہ بھی شاہد عدل ہے کہ

عن شرجيل ابى سعد قال : دعا الحسن بنيه و بنى اخيه فقال : يا بنى و بنى اخى، انكم صغار قوم يوشك ان تكونوا كبار آخرين، فتعلموا العلم، فمن لم يستطع منكم ان يرويه او قال يحفظهُ فليكتبه وليضعه فى بيته [3] شرجیل ابوسعد نے کہا کہ حضرت حسنؓ نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں سے بلا کر یہ کہا "اے میرے فرزندو! اور بھتیجو! تم آج کم عمر لوگ ہو، ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کے تم اکابر بن جاؤ، پس تم علم سیکھو، جو اس علم (حدیث) کی روایت نہ کر سکے یا اسے حفظ نہ رکھ سکے اسے چاہئے کہ لکھ کر اپنے گھر میں محفوظ کر لے۔

علم حدیث، نسلاً بعد نسل

الغرض، علم حدیث، نسلاً بعد نسل، صحابہ سے تابعین اور تبع تابعین تک بذریعہ حفظ بھی اور بذریعہ کتابت بھی، منتقل ہوتا

---

[1] سنن الدارمی، مقدمہ، باب من رخص فی کتابۃ العلم [2] + [3] الدارمی، مقدمہ، باب من رخص فی کتابۃ العلم

رہا، یہاں تک کہ یہ ہمیشہ کے لیے کتبِ احادیث میں مدون ہو گیا، چونکہ منکرینِ حدیث، کتابتِ حدیث کا بشدت انکار کرتے ہیں، اس لیے، ہم نے کتابتِ حدیث کے پہلو کو حفظ حدیث کی نسبت زیادہ اجاگر کیا اور یہ بتایا ہے کہ محفلِ نبوی میں بھی صحابہ کرام، احادیث لکھا کرتے تھے، پھر یہ کتابت شدہ علم، ان کی اگلی نسل کو منتقل ہوتا چلا گیا ہے، خواہ یہ اگلی نسل، اُن کی اولاد اور احفاد واسباط پر مشتمل ہو یا ان کے تلامذہ و متعلمین پر، مندرجہ ذیل واقعات، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں۔

(۱) --- حضرت ابو ہریرہؓ، ایک کثیر الروایہ صحابی ہیں، ایک شاگرد، جن کا اسم گرامی، بشیر بن نہیک تھا، ابو ہریرہؓ سے ماخوذ احادیث کو لکھ لیا کرتے تھے، وہ خود فرماتے ہیں، کہ جب میں نے ان سے رخصت ہونا چاہا تو:

أتيته بكتابي فقلت هذا سمعته منك قال نعم [۱] میں ان کے پاس اپنی کتاب لے کر آیا اور کہا "یہ ہے جو میں نے تم سے سنا ہے" تو فرمایا "ہاں"۔

(۲) --- حضرت عبداللہ بن عباسؓ، خود علم حدیث کو ضبط تحریر میں لانے کی تاکید کیا کرتے تھے۔

قیدوا العلم بالكتاب [۲] اس علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب، تحریر فرماتے ہیں۔

جب حضرت عبداللہ بن عباس کا انتقال ہوا، تو ان کے بیٹے، علی بن عبداللہ، اپنے باپ کی کتابوں کے وارث بنے اور اس طرح اس سرچشمۂ علم کی فیض رسانی کا سلسلہ، ان کے بعد بھی جاری رہا۔ [۳]

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ

سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ابن عباس، جو املاء کراتے تھے، اسے وہ لکھتے جاتے تھے۔ [۴]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اپنے ایک شاگرد کو (عکرمہ کو) کبھی تعزیراً روک بھی رکھتے تھے۔

قيد ابن عباس عكرمة على تعليم القرآن والسنن و الفرائض [۵] حضرت ابن عباسؓ نے عکرمہ کو، قرآن، حدیث، اور فرائض کا علم سیکھنے کے لیے روک رکھا تھا۔

(۳) --- حضرت انسؓ (جو خود صاحبِ کتابِ حدیث تھے) کی مجلس میں بھی کتابت حدیث ہوا کرتی تھی، حضرت انسؓ کے پوتے، ثمامہ بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ

رأيت ابان يكتب عند انس [۶] میں نے ابان کو حضرت انس کے پاس، لکھتے ہوئے دیکھا۔

علاوہ ازیں، حضرت انس اپنے بچوں کو بھی، احادیث وسنن رسول کو قلم بند کرنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

يا بنی قيدوا هذا العلم [۷] اے میرے بچو! اس علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔

---

[۱] صحیفہ ہمام بن منبہ، پیش لفظ، صفحہ ۴۶ + جامع بیان العلم (ملخصا)، جلد ۱، صفحہ ۷۲

[۲] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۲   [۳] + [۴] صحیفہ ہمام بن منبہ، پیش لفظ، صفحہ ۴۱

[۵] جامع صحیح بخاری، کتاب الحضویات، باب التوثق ممن تخشی معرفة

[۶] + [۷] سنن الدارمی، باب من رخص فی کتابة العلم

(۴) --- یہ بات پہلے گزر چکی ہے، کہ حضرت جابر بن عبداللہ کے پاس، ایک کتاب حدیث موجود تھی، علم حدیث کو اگلی نسل تک پہنچانے کے لیے، ان کی مساعی جمیلہ کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ

> یہ بھی مشہور ہے کہ مسجد نبوی (مدینہ) میں، ان کا ایک حلقۂ درس تھا جس میں لوگ، ان سے علم حاصل کرتے تھے، چنانچہ مشہور تابعی مورخ وہب بن منبہ (ہمام بن منبہ کے بھائی) کو بھی، انھوں نے حدیثیں املا کرائی تھیں، امام بخاری کی روایت ہے کہ مشہور تابعی قتادہ کہا کرتے تھے، کہ مجھے سورہ بقرہ کے مقابلہ میں، صحیفۂ جابر زیادہ حفظ ہے، ان کے ایک اور شاگرد سلیمان بن قیس الیشکری کہتے ہیں، کہ انھوں نے بھی حضرت جابر کی روایت کردہ حدیثیں لکھی ہیں، حضرت جابر سے اور لوگوں نے بھی درس لیا اور ان کے صحیفہ کی روایت کی ہے۔ ۱

(۵) --- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذخیرۂ احادیث کو ان کے بھانجے عروہ بن زبیر نے اخذ کیا تھا، جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرماتے ہیں، نیز ان کا یہ علم، اُن کی ایک بھتیجی اور بھتیجے کے حصہ میں بھی آیا تھا۔

> اُن کے بھانجے عروہ بن زبیر نے، حضرت عائشہ کی احادیث کو جمع کیا تھا۔
>
> عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کی حضرت عائشہ نے پرورش کی، اور ان کو نورِ علم سے آراستہ کیا، عمرہ کی تمام احادیث کو، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے تحریر کر لیا گیا، اور وہ محفوظ ہو گئیں۔ ۲

(۶) --- حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اپنی احادیث کو املاء کروایا کرتے تھے۔

عن سلیمان بن موسٰی : انّه رأى نافعا مولى ابن عمر يملى عليه و يكتب بين يديه ۳ سلیمان بن موسیٰ سے روایت ہے کہ انھوں نے نافع جو ابن عمر کے آزاد کردہ غلام تھے، کو دیکھا کہ ابن عمر املا کروا رہے تھے اور وہ ان کے ہاں لکھ رہے تھے۔

(۷) --- مال و زر کی میراث کی طرح، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم حدیث بھی، ان کی اولاد کے حصہ میں آیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرماتے ہیں۔

> حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو حدیثیں جمع کی تھیں، وہ ان کے بیٹے کے پاس پائی گئیں۔ ۴

(۸) --- عبداللہ بن حنیس راوی ہیں کہ

رَأيتهم عند البراء يكتبون على ايديهم بالقصب ۵ میں نے ان (لوگوں) کو حضرت براء بن عازب کے پاس دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں پر نرکل (سرکنڈا) سے لکھ رہے تھے

(۹) --- یہ روایت بھی اس امر کی دلیل ہے کہ تابعین، سماعت کے بعد لکھا کرتے تھے۔

حدثنا و كيع عن ابى كبران قال سمعت الضحاك يقول اذا سمعت شيئا فاكتبه و لو فى حائط ۶ وکیع نے ابی کبران سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے ضحاک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''جب میں کوئی حدیث سنتا ہوں تو اسے لکھ لیتا ہوں

---

۱ + ۲ صحیفہ ہمام بن منبہ، پیش لفظ، صفحہ ۳۰، ۳۱ ۳ صحیفہ ہمام بن منبہ، پیش لفظ (ملخصا) صفحہ ۳۱ تا صفحہ ۳۲

۴ صحیفہ ہمام بن منبہ، صفحہ ۴۲ ۵ جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۳ ۶ جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۲

خواہ دیوار ہی پر لکھنا پڑے''۔

(۱۰) --- اور کبھی وہ لوگ بھی، جن کا حافظہ اچھا نہیں ہوتا تھا، احادیث کو لکھ کر محفوظ کر لیا کرتے تھے، مثلاً

حدثنا یحیی بن سعید عن عبدالرحمٰن بن حرملة قال کنت سَیَّ الحفظ فرخص لی سعید بن المسیب فی الکتاب [۱] یحیی ابن سعید نے عبدالرحمٰن بن حرملہ سے روایت کیا کہ انھوں نے فرمایا، کہ میں اچھا حافظہ نہیں رکھتا تھا، تو سعید بن مسیّب نے مجھے کتابت کی اجازت دی۔

آخر یہ کتابت حدیث کیوں؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر، یہ کتابت حدیث کیوں؟ اگر حدیث کی کوئی دینی حیثیت تھی ہی نہیں تو پھر حضرت نبی اکرم ﷺ سے لے کر صحابہ و تابعین بلکہ تبع تابعین تک کے دور میں احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کی یہ سرگرمیاں کیوں پائی جاتی ہیں؟ یاد رہے کہ کتابتِ حدیث کے ساتھ ساتھ حفظ کا عمل بھی وسیع پیمانے پر جاری تھا۔ خود نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔

قال رسول الله ﷺ قیدوا العلم بالکتاب [۲] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ علم کو قلمبند کر کے محفوظ کر لو۔

حضرت عمرؓ بھی اس کی تاکید کرتے ہیں۔

عن عبدالملک بن سفیان عن عمه انه سمع عمر ابن الخطاب یقول قیدوا العلم بالکتاب [۳] عبدالملک بن سفیان، اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمر بن خطاب کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔

حضرت عبداللہ بن عباس بھی کتابت حدیث کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

عن یحیی بن ابی کثیر قال قال ابن عباس قیدوا العلم بالکتاب [۴] یحیی بن ابی کثیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ علم کو ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر لو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی احادیث کو قلمبند کرنے کی تاکید یوں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

عن عبدالله ابن عمر یرفعه قال قیدوا العلم قلت وما تقییده قال الکتاب [۵] عبداللہ بن عمر مرفوعاً روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''علم کو مقید کر لو'' میں نے عرض کیا ''علم کو مقید کرنا، کیا ہے؟'' (حضور ﷺ نے) فرمایا ''ضبط تحریر میں لانا''۔

اسی طرح حضرت انسؓ بن مالک بھی، اپنے بچوں کو یہی تاکید کیا کرتے تھے۔

عن ثمامة قال کان انس یقول لبنیه یا بنی قیدوا العلم بالکتاب [۶] ثمامہ سے روایت ہے کہ حضرت انس، اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے کہ ''اے میرے بیٹو! علم کو قید کتابت میں لے آیا کرو''۔

صحابہ کرامؓ کے بعد، یہی حال، تابعین اور تبع تابعین کا بھی تھا، وہ بھی احادیث رسول اور سنن نبویہ کو نہ صرف یہ کہ

---

[۱] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۳ [۲] + [۳] + [۴] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۲

[۵] + [۶] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۳

قلمبند کیا کرتے تھے بلکہ اس کی تاکید بھی کیا کرتے تھے، مثلاً ابوالزناد کے بارے میں، ان کے بیٹے کی یہ روایت ہے کہ:

عن عبدالرحمٰن بن ابی الزناد عن ابیه قال کنا نکتب الحلال و الحرام و کان ابن شهاب یکتب کل ماسمع فلما احتیج الیه علمت انه اعلم الناس [1] عبدالرحمٰن بن ابی زناد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ ہم حرام اور حلال (کی احادیث) کو لکھا کرتے تھے، جبکہ ابن شہاب زہری وہ سب کچھ تحریر کیا کرتے تھے جو وہ سنتے تھے، پھر ضرورت پڑنے پر مجھے علم ہوا کہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ عالم تھے۔

اسی طرح ایک تابعی کی یہ روایت ہے۔

حدثنا سوادة بن حیان قال سمعت معویة بن قره یقول من لم یکتب العلم فلا تعدوه عالما [2] ہم سے سوادہ بن حیان نے بیان کیا کہ انھوں نے معویہ بن قرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص علم کو ضبطِ تحریر میں نہیں لاتا، اسے عالم نہ شمار کرو۔

امام مالکؒ بھی کتابت حدیث کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

حدثنا محمد بن علی قال سمعت خالد بن خداش البغدادی قال ودعت مالک بن انس فقلت یا ابا عبدالله اوصنی فقال علیک بتقوی الله فی السر و العلانیة والنصح لکل مسلم و کتابة العلم من عنداهله [3] ہم سے محمد بن علی نے بیان کیا کہ میں نے خالد بن خداش بغدادی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب میں نے امام مالک کو الوداع کہا تو عرض کیا، "اے ابوعبدالله! مجھے نصیحت کیجئے" فرمایا "چھپے اور کھلے ہر حال میں الله سے ڈرتے رہنا، اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنا، اور اہل لوگوں سے علمی استفادہ کر کے ضبطِ تحریر میں لانا، تم پر لازم ہے۔

یحییٰ بن سعید بھی کتابتِ حدیث کے بارے میں، اپنا موقف یوں بیان کرتے ہیں۔

حدثنا ابن القاسم عن مالک قال سمعت یحیی بن سعید یقول لأن اکون کتبت کل ماکنت اسمع احب الی من ان یکون لی مثل مالی [4] ہم سے ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا کہ میں نے یحییٰ بن سعید کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہر وہ چیز جس کی میں سماعت کروں، اسے لکھتا جاؤں، مجھے اس سے زیادہ عزیز و محبوب ہے کہ اس (علمی ذخیرہ) کے برابر میرے پاس مال وزر ہوتا۔

شعبہ کا کتابتِ حدیث کے بارے میں مسلک، اس روایت سے ظاہر ہے۔

حدثنا وهب بن جریر قال حدثنا شعبة بحدیث ثم قال هٰذا وجدته مکتوبا عندی فی الصحیفة، قال و سمعت شبابة یقول سمعت شعبة یقول اذا رأیتمونی اثج الحدیث فاعلموا انی تحفظتهٗ من کتاب [5] ہم سے وہب بن جریر نے بیان کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ نے ہم سے ایک حدیث بیان کی پھر کہا کہ یہ میرے پاس صحیفہ میں درج ہے، نیز کہا کہ میں نے شبابہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "میں نے شعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب تم دیکھو کہ میں حدیث کو فر فر پیش کرتا ہوں تو جان لو کہ میں نے اسے کتاب سے خوب یاد کیا ہوا ہوتا ہے"۔

یہ روایت، مزید اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ شعبہ کے پاس، احادیث کا کتابی ذخیرہ بھی موجود تھا، نیز یہ بھی کہ وہ ان احادیث کو زیادہ روانی کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے، جن کو انھوں نے کتاب سے یاد کر رکھا تھا۔

---

[1] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۳ [2] + [3] + [4] + [5] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۴

علاوہ ازیں، امام حسن بصری بھی، احادیث رسول کا کتابی ذخیرہ رکھتے تھے۔

حدثنا جریر عن الاعمش قال قال الحسن ان لنا کتباً نتعا ھدھا [1] جریر نے اعمش سے روایت کرتے ہوئے ہم سے بیان کیا کہ حسن بصری کا یہ قول ہے کہ ہماری (حدیث کی) کتب ہیں جن کی ہم برابر نگہداشت کیا کرتے ہیں۔

الریاشی، امام خلیل بن احمد کے متعلق فرماتے ہیں۔

اخبرنا الریاشی قال قال الخلیل بن احمد اجعل ما تکتب بیت مال وما فی صدرک للنفقة [2] ریاشی نے ہمیں اطلاع دی کہ خلیل بن احمد کا مقولہ ہے" جو کچھ لکھتے ہو اسے اپنا بیت المال بناؤ، اور جو کچھ سینے میں جمع ہے، اسے صرف میں لاؤ"۔

ہشام بن عروہ، اپنے والد کے ذخیرۂ احادیث کا ذکر، ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

عن ھشام بن عروة عن بیه انه احترقت کتبه یوم الحرة و کان یقول وددت لو ان عندی کتبی باھلی ومالی [3] ہشام بن عروہ، اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی کتابیں یوم حرہ میں جل گئی تھیں، بعد میں وہ فرمایا کرتے تھے،" کاش، اہل وعیال اور مال ودولت کی جگہ، میری کتابیں میرے پاس رہ گئی ہوتیں"۔

ابوزرعہ، احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کا نظریہ در کتابتِ حدیث، یوں بیان کرتے ہیں۔

حدثنا ابو زرعة قال احمد بن حنبل ویحیی بن معین یقولان کل من لم یکتب العلم لا یؤمن علیه الغلط [4] ابوزرعہ نے ہم سے بیان کیا اور کہا کہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ جس شخص نے علم کو قلمبند نہیں کیا وہ غلطیوں سے بے خوف نہیں ہوسکتا۔

خلیل ابن احمد کے بارے میں، امام مبرد فرماتے ہیں۔

ذکر المبرد قال قال الخلیل بن احمد ما سمعت شیئا الا کتبته ولا کتبته الا حفظته ولا حفظته الا نفعنی [5] علامہ مبرد نے کہا کہ خلیل بن احمد کا یہ فرمان ہے کہ" جو کچھ میں نے سنا، اسے لکھ لیا، اور جو کچھ لکھا اسے یاد کرلیا (حفظ کرلیا) اور جو کچھ میں نے حفظ کیا، اس نے مجھے نفع دیا۔

ابن شبرمہ بھی، احادیث کا کتابی ذخیرہ رکھتے تھے، اور روایت کیا کرتے تھے۔

قال سفیان قال بعض الامراء لا بن شبرمة ما ھذه الاحادیث التی تحدثنا عن رسول اللہ ﷺ قال کتاب عندنا [6] سفیان ثوری کہتے ہیں کہ بعض عمالِ اقتدار نے ابن شبرمہ سے کہا کہ" یہ احادیث کیا ہیں جو تم رسول اللہ ﷺ سے ہمیں بیان کرتے ہو"، تو انھوں نے جواب دیا" یہ ایک کتاب میں سے ہیں جو ہمارے پاس ہے۔

یہ چند اقتباسات اور حوالے، نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر پیش کردیئے گئے ہیں، ورنہ ایسے حوالوں کی کمی نہیں،

[1] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۴ [2] + [3] + [4] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۵ [5] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۷
[6] جامع بیان العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۶

جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حفظ حدیث کے ساتھ ساتھ، کتابتِ حدیث کا سلسلہ بھی، عہد نبوی سے آغاز پذیر ہوا، اور تابعین و تبع تابعین کے دور میں سے گزرتا ہوا، اُس عہد میں داخل ہو گیا، جس میں حدیث کا یہ سارا کتابت شدہ ذخیرہ، مستقل اور دائمی طور پر صحاح ستہ اور دیگر کتب میں مدون ہو گیا، لیکن منکرینِ حدیث، ان تمام حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے، بار بار یہ

کیا صرف لکھی ہوئی چیز ہی قابل اعتماد ہوتی ہے؟

کہتے ہیں، کہ ''احادیث لکھی نہیں گئی تھیں، وہ صدیوں تک زبانی بیان ہوتی رہیں، پھر کہیں ان کو مدون کیا گیا جبکہ قرآن، اول روز سے ہی لکھا گیا''، ان کے استدلال کا بڑا انحصار صرف اس خیال پر ہے کہ قرآن، اس لیے قابل اعتماد و استناد ہے کہ وہ لکھوا لیا گیا تھا، اور احادیث، اس لیے اعتماد و استناد کے قابل نہیں کہ وہ عہد رسالت اور خلافتِ راشدہ میں لکھوائی نہیں گئی تھیں، اگرچہ اوپر کی بحث سے یہ بالکل واضح ہے کہ احادیث کو حفظ و کتابت کے ذریعہ، بالکل اسی طرح محفوظ کیا گیا تھا، جس طرح قرآن کو محفوظ کیا گیا تھا، کتابت حدیث کے متعلق، فرموداتِ رسول اور فرامینِ صحابہ اور اقوال و اعمالِ تابعین، قبل ازیں پیش کیے جا چکے ہیں، تاہم قرآن کو چونکہ احادیث پر شرف تقدم حاصل ہے، اس لیے، اس کے ساتھ اعتنائے رسول کا معاملہ بھی قدرے زائد ہے، لیکن، منکرینِ حدیث کا بہر حال، یہ گمان، قطعی غلط اور بے اصل ہے کہ کسی چیز کو ''لکھ لینا'' اور ''محفوظ کر لینا'' گویا ہم معنٰی ہیں، ایک چیز لکھے بغیر بھی محض حفظ کے ذریعہ سے محفوظ رہ سکتی ہے، اور اس کے مقابلہ میں لکھی ہوئی چیز، اگر نسل در نسل حفظ نہ کی گئی ہو، تو وہ غیر محفوظ ہی نہیں بلکہ ضائع بھی ہو سکتی ہے، تورات، مکتوب شکل میں اتاری گئی تھی، مگر وہ محفوظ نہ رہ پائی، اور انسانی ہاتھوں سے مسخ و تحریف کا نشانہ بن کے رہی، قرآن بھی، اگرچہ نازل ہوتے ہی لکھ لیا جاتا تھا مگر وہ آج تک تحریف سے محفوظ چلا آ رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ لکھ لیا گیا تھا، بلکہ یہ ہے کہ اسے زبانی یاد کر کے سینوں میں محفوظ کر لیا گیا تھا، لیکن منکرینِ حدیث، بتکرارِ بسیار بار بار لکھنے کے مسئلہ ہی کو اہمیت دیتے ہیں اور اپنا سارا زور اس بات پر صرف کرتے ہیں کہ حجت و استناد کے قابل صرف قرآن ہے کیونکہ وہ لکھ لیا گیا تھا اور احادیث کی یہ پوزیشن نہیں، کیونکہ وہ لکھی نہیں گئی تھیں، مولانا مودودیؒ نے اس کی تردید میں فرمایا تھا کہ

> منکرینِ حدیث کا سارا زور، جس بات پر صرف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح، سنت کا بھی ایک مجموعہ کیوں نہ لکھوا دیا گیا، میں پوچھتا ہوں کہ اگر حضور ﷺ نے قرآن مجید کو محض لکھوا کر چھوڑ دیا ہوتا اور ہزاروں آدمیوں نے اسے یاد کر کے بعد کی نسلوں کو زبانی نہ پہنچایا ہوتا تو کیا محض وہ لکھی ہوئی دستاویز، بعد کے لوگوں کے لیے، اس بات کا قطعی ثبوت ہو سکتی تھی کہ یہ وہی قرآن ہے جو حضور ﷺ نے لکھوایا تھا؟ وہ تو خود محتاجِ ثبوت ہوتی، کیونکہ جب تک کچھ لوگ اس بات کی شہادت دینے والے نہ ہوتے کہ یہ کتاب، ہمارے سامنے نبی ﷺ نے لکھوائی تھی، اس وقت تک اس لکھی ہوئی کتاب کا معتبر ہونا مشتبہ رہتا، اس سے معلوم ہوا کہ تحریر پر کسی چیز کے معتبر ہونے کا دار و مدار نہیں ہے، بلکہ وہ اسی وقت معتبر ہوتی ہے جبکہ زندہ انسان اس کے شاہد ہوں۔ اب اگر فرض کیجیے کہ کسی معاملے کے متعلق تحریر موجود نہیں ہے مگر زندہ انسان اس کے شاہد موجود ہیں تو کسی قانون دان

سے پوچھ لیجئے کیا ان زندہ انسانوں کی شہادت ساقط الاعتبار ہوگی جب تک کہ تائید میں ایک دستاویز نہ پیش کی جائے؟ شاید آپ کو قانون کا علم رکھنے والا ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو اس سوال کا جواب اثبات میں دے، آج نبی ﷺ کا لکھوایا ہوا قرآن مجید دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے، مگر اس سے قرآن کے مستند و معتبر ہونے پر ذرہ برابر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ متواتر اور مسلسل زبانی روایت سے اس کا معتبر ہونا ثابت ہے، خود یہ بات کہ حضور ﷺ نے قرآن لکھوایا تھا روایت ہی کی بنا پر تسلیم کی جا رہی ہے ورنہ اصل دستاویز، اس دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کی جاسکتی، اور وہ کہیں مل بھی جائے تو یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضور ﷺ نے لکھوائے تھے، لہٰذا تحریر پر جتنا زور یہ حضرات دیتے ہیں وہ بالکل غلط ہے، نبی ﷺ نے اپنی سنتوں پر قائم کیا ہوا ایک پورا معاشرہ چھوڑا تھا، جس کی زندگی کے ہر پہلو پر آپ کی تعلیم و ہدایت کا ٹھپہ لگا ہوا تھا، اس معاشرے میں آپ کی باتیں سنے ہوئے، آپؐ کے کام دیکھے ہوئے، آپؐ کے زیر ہدایت تربیت پائے ہوئے ہزاروں لوگ موجود تھے، اس معاشرے نے بعد کی نسلوں تک وہ سارے نقوش منتقل کیے اور ان سے وہ نسلاً بعد نسلٍ ہم کو پہنچے، دنیا کی کسی مسلّم اصولِ شہادت کی رو سے بھی یہ شہادت رد نہیں کی جاسکتی۔ پھر یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ نقوش کاغذ پر ثبت نہیں کیے گئے، انھیں ثبت کرنے کا سلسلہ حضور ﷺ کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا، پہلی صدی ہجری میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا، اور دوسری صدی کے محدثین، زندہ شہادتوں اور تحریری شہادتوں، دونوں کی مدد سے، اس پورے نقشے کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ [1]

کتابتِ حدیث پر کتابتِ قرآن کی وجوہِ افضلیت

میں نے منکرین حدیث کے لٹریچر میں بکثرت یہ پایا ہے کہ بار بار لکھنے کے مسئلہ کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں، یوں لگتا ہے کہ ان کے نزدیک کسی چیز کو زبانی یاد کرلینا، گویا اسے محفوظ رکھنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے، لیکن ''لکھ لینا'' گویا ''محفوظ کر لینے'' ہی کے مترادف ہے، مخالفتِ حدیث میں ان لوگوں کے استدلال کا مرکزی اور محوری نکتہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن، چونکہ لکھ لیا گیا تھا، لہٰذا وہ قابل اعتبار و لائق اعتماد ہے، اور احادیث چونکہ لکھی نہیں گئی تھیں اس لیے وہ غیر معتبر اور نا قابل اعتماد ہیں، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ لکھی تو دونوں چیزیں گئی تھیں، لیکن قرآن چونکہ لفظاً اور معناً، وحی الٰہی تھا، اس لیے اس کی کتابت کو زیادہ لائق اعتبار سمجھا گیا، مولانا مودودیؒ، اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ

> اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن کو جس وجہ سے لکھوایا گیا تھا، وہ یہ تھی کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں من جانب اللہ تھے، اس کے الفاظ کی ترتیب ہی نہیں، بلکہ اس کی آیتوں کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب بھی خدا کی طرف سے تھی، اس کے الفاظ کو دوسرے الفاظ کے ساتھ بدلنا بھی جائز نہ تھا، اور وہ اس لیے نازل ہوا تھا کہ لوگ انھی الفاظ میں، اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کریں، اس کے مقابلہ میں سنت کی نوعیت بالکل مختلف تھی، وہ محض لفظی نہ تھی بلکہ عملی بھی تھی، اور جو لفظی تھی اس کے الفاظ، قرآن کے الفاظ کی طرح بذریعہ وحی نازل نہیں ہوئے تھے، بلکہ حضور ﷺ نے اس کو اپنی زبان میں ادا کیا تھا، مثلاً یہ کہ حضور ﷺ کے اخلاق ایسے تھے، حضور ﷺ کی زندگی ایسی تھی، اور فلاں موقع پر حضور ﷺ نے یوں عمل کیا، حضور ﷺ کے اقوال اور تقریریں نقل کرنے کے بارے میں بھی یہ پابندی نہ تھی کہ سننے والے اُنہیں لفظ بلفظ نقل کریں، بلکہ اہل زبان سامعین کے لیے یہ جائز تھا اور وہ اس پر قادر بھی تھے کہ آپؐ سے ایک بات سن کر معنی و مفہوم کو بدلے بغیر اسے

---

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۴۴ تا صفحہ ۱۴۵

اپنے الفاظ میں بیان کریں، حضور ﷺ کے الفاظ کی تلاوت مقصود نہ تھی بلکہ اس تعلیم کی پیروی مطلوب تھی جو آپؐ نے دی ہو۔ احادیث میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی طرح یہ ترتیب محفوظ کرنا بھی ضروری نہ تھا کہ فلاں حدیث پہلے ہو اور فلاں اس کے بعد، اس بنا پر حدیث کے معاملے میں یہ بالکل کافی تھا کہ لوگ انھیں یاد رکھیں اور دیانت کے ساتھ، انھیں لوگوں تک پہنچائیں، ان کے معاملے میں کتابت کی وہ اہمیت نہ تھی جو قرآن کے معاملے میں تھی۔ [1]

کیا حجت وسند ہونے کے لیے کسی چیز کا لکھا ہوا ہونا ضروری ہے؟

رہا منکرین حدیث کا یہ گمان کہ صرف لکھی ہوئی چیز ہی قابلِ اعتماد ولائقِ استناد ہوتی ہے، اور اسی بناء پر وہ قرآن کو لکھے جانے کی وجہ سے سند وحجت مانتے ہیں، اور حدیث کو (اپنے اس زعم باطل کے سبب کہ وہ لکھی نہیں گئی تھیں) حجت وسند قرار دینے سے منکر ہیں، تو اِس کی تردید بھی، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بڑے جاندار انداز میں، اُس وقت کی تھی، جبکہ منکرینِ حدیث کے ان ہی خیالات کا اظہار، اپنے ایک عدالتی فیصلے میں، جسٹس محمد شفیع صاحب نے کیا تھا، مولانا موصوف نے اقتباسِ مندرجہ بالا کے تسلسل میں فرمایا تھا۔

دوسری بات جسے خوب سمجھ لینا چاہئے، یہ ہے کہ کسی چیز کے سند اور حجت ہونے کے لیے، اس کا لکھا ہوا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے، اعتماد کی اصل بنیاد، اس شخص یا ان اشخاص کا بھروسے کے قابل ہونا ہے، جس کے یا جن کے ذریعہ سے کوئی بات دوسروں تک پہنچے، خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔ خود قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لکھوا کر نہیں بھیجا بلکہ نبی کی زبان سے اس کو بندوں تک پہنچایا، اللہ نے پورا انحصار اس بات پر کیا کہ جو لوگ نبی کو سچا مانیں گے وہ نبی کے اعتماد پر قرآن کو بھی ہمارا کلام مان لیں گے، نبی ﷺ نے بھی قرآن کی جتنی تبلیغ واشاعت کی، زبانی ہی کی، آپؐ کے جو صحابہؓ مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے وہ قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی نہ لے جاتے تھے۔ لکھی ہوئی آیات اور سورتیں تو اس تھیلے میں پڑی رہتی تھیں، جس کے اندر آپؐ، انھیں کاتبانِ وحی سے لکھوا کر ڈال دیتے تھے، باقی ساری تبلیغ واشاعت زبان سے ہوتی تھی، اور ایمان لانے والے، اس ایک صحابی کے اعتماد پر یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ وہ سنا رہا ہے وہ خدا کا کلام ہے یا رسول اللہ ﷺ کا جو حکم وہ پہنچا رہا ہے وہ حضور ﷺ ہی کا حکم ہے۔

تیسرا اہم نکتہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ لکھی ہوئی چیز، بجائے خود، کبھی قابل اعتماد نہیں ہوتی جبتک کہ زندہ اور قابل اعتماد انسانوں کی شہادت، اس کی توثیق نہ کرے۔ محض لکھی ہوئی کوئی چیز اگر ہمیں ملے اور ہم اصل لکھنے والے کا خط نہ پہچانتے ہوں یا لکھنے والا خود نہ بتائے کہ یہ اسی کی تحریر ہے، یا ایسے شواہد موجود نہ ہوں جو اس امر کی تصدیق کریں کہ یہ تحریر اسی شخص کی ہے جس کی طرف منسوب کی گئی ہے تو ہمارے لیے محض وہ تحریر، یقینی کیا معنیٰ ظنی حجت بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک ایسی اصولی حقیقت ہے جسے موجودہ زمانے کا قانون شہادت بھی تسلیم کرتا ہے اور فاضل جج خود اپنی عدالت میں اس پر عمل فرماتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر، جو یقین ہم رکھتے ہیں کیا اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ لکھا گیا تھا؟ کاتبین وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے، جو حضور ﷺ نے املا کرائے تھے آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ اگر وہ موجود ہوتے بھی تو آج کون یہ تصدیق کرتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضور ﷺ نے لکھوائے تھے، خود یہ بات بھی کہ حضور ﷺ اس قرآن کو نزول وحی کے ساتھ ہی لکھوالیا کرتے تھے،

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۳۶ تا ۳۳۷

زبانی روایت ہی سے معلوم ہوئی ہے، ورنہ اس کے جاننے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا، پس قرآن کے محفوظ ہونے پر، ہمارے یقین کی اصل وجہ اس کا لکھا ہوا ہونا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ زندہ انسان، زندہ انسانوں سے مسلسل اس کو سنتے اور آگے زندہ انسانوں تک اسے پہنچاتے چلے آ رہے ہیں، لہٰذا، یہ غلط خیال ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ کسی چیز کے محفوظ ہونے کی واحد سبیل، بس اس کا لکھا ہوا ہونا ہے۔

ان امور پر، اگر فاضل جج اور ان کی طرح سوچنے والے حضرات غور فرمائیں تو انھیں یہ تسلیم کرنے میں ان شاء اللہ کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اگر معتبر ذرائع سے کوئی چیز پہنچے تو وہ سند بننے کی پوری قابلیت رکھتی ہے، خواہ وہ لکھی نہ گئی ہو۔ [1]

کیا احادیث اڑھائی صدی تک گوشۂ خمول میں پڑی رہیں؟

منکرین حدیث، یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ --- ''احادیث نہ یاد کی گئیں، نہ محفوظ کی گئیں، بلکہ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں، جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے، ان کا ذکر کر کے مر گئے، یہاں تک کہ ان کی وفات کے کئی سو برسوں بعد، ان کو جمع اور مرتب کیا گیا'' --- منکرین حدیث کے تتبع میں، جسٹس محمد شفیع صاحب نے بھی، انھی خیالات کا اظہار، اپنے مذکورہ عدالتی فیصلے میں کیا تھا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، اس کی تردید وابطال میں فرمایا تھا کہ:

> یہ نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے بلکہ درحقیقت یہ نبی ﷺ کی شخصیت کا اور آپؐ کے ساتھ ابتدائی دور کے مسلمانوں کی عقیدت کا بہت ہی حقیر اندازہ ہے، واقعات سے قطع نظر، ایک شخص محض اپنی عقل ہی پر زور ڈال کر صحیح صورتِ حال کا تصور کرے تو وہ کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جس عظیم الشان شخصیت نے عرب کے لوگوں کو اخلاق وتہذیب اور عقائد واعمال کی انتہائی پستیوں سے نکال کر بلند ترین مقام تک پہنچا دیا تھا، اس کی باتوں اور اس کے کاموں کو وہی لوگ اس قدر نا قابل التفات سمجھتے تھے کہ انھوں نے اس کی کوئی بات یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، نہ دوسروں کے سامنے اتفاقاً ذکر آ جانے سے بڑھ کر، کبھی اس کا چرچا کیا، نہ بعد کی آنے والی نسلوں نے اس کو کوئی اہمیت دی کہ اس کو دیکھنے والوں سے اس کے حالات پوچھتے، ایک معمولی لیڈر تک سے جس کسی کو شرف صحبت نصیب ہوتا جاتا ہے تو وہ اس سے اپنی ملاقاتوں کی ایک ایک بات یاد رکھتا ہے اور دوسروں کے سامنے اس کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے مرنے کے بعد، نئی آنے والی نسلوں کے لوگ جا جا کر، اس کے ملنے والوں سے اس کے حالات دریافت کرتے ہیں، آخر جسٹس محمد شفیع صاحب نے رسول اللہ ﷺ کو کیا سمجھ لیا ہے کہ حضور ﷺ کو آپکے ہم عصر اور آپؐ کے متصل زمانے کے لوگ، اتنے التفات کا مستحق بھی نہ سمجھتے تھے؟
>
> اب ذرا اصل صورتِ واقعہ ملاحظہ فرمائیے، رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے لیے ایک ایسے پیشوا تھے، جن سے وہ ہر وقت، عقائد اور عبادات اور اخلاق اور تہذیب وشائستگی کا سبق حاصل کرتے تھے، آپؐ کی زندگی کے ایک ایک رخ اور ایک ایک پہلو کو دیکھ کر وہ پاکیزہ انسانوں کی طرح رہنا سیکھتے تھے، ان کو معلوم تھا کہ آپ کی بعثت سے پہلے وہ کیا تھے اور آپؐ نے انھیں کیا بنا دیا۔ ان کے لیے ہر پیش آنے والے مسئلے میں مفتی بھی آپؐ ہی تھے، اور قاضی بھی آپؐ۔ آپؐ ہی کی قیادت میں وہ لڑتے بھی تھے اور صلح بھی کرتے تھے، ان کو تجربہ تھا کہ اس قیادت کی پیروی میں وہ کہاں سے چلے تھے اور بالآخر کہاں پہنچ کر رہے۔ اس بنا پر وہ آپ کی ایک ایک بات کو یاد رکھتے تھے، جو قریب رہتے تھے وہ بالالتزام آپ کی صحبتوں میں بیٹھتے تھے، جنھیں کسی وقت آپ کی

---

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۳۷ تا ۳۳۸

مجلس سے غیر حاضر رہنا ہوتا تو وہ دوسروں سے پوچھ کر معلوم کرتے تھے کہ آج آپؐ نے کیا کیا اور کیا کہا؟ دور دور سے آنے والے لوگ، اپنے ان اوقات کو جو آپؐ کے ساتھ بسر ہو جاتے تھے اپنا حاصل زندگی سمجھتے تھے، اور عمر بھر ان کی یاد دل سے نہ نکلتی تھی، جنھیں حاضر ہونے کا موقع نصیب نہ ہوتا تھا وہ ہر اس شخص کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے، جو آپؐ سے مل کر آتا تھا اور کرید کرید کر ایک ایک بات اس سے پوچھتے تھے، جنھوں نے آپ کو دور سے کبھی دیکھا تھا یا کسی بڑے مجمع میں آپ کی صرف تقریر سن لی تھی وہ جیتے جی اس موقع کو نہ بھولتے تھے اور فخریہ اپنے اس شرف کو بیان کرتے تھے، کہ ہماری آنکھوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے اور ہمارے کان، آپ کی تقریریں سن چکے ہیں، پھر حضور ﷺ کے بعد، جو نسلیں پیدا ہوئیں، ان کے لیے تو دنیا میں سب سے اہم اگر کوئی چیز تھی، تو وہ اس رسولِ عظیم کی سیرت تھی جس کی قیادت کے معجزے نے عرب کے شتر بانوں کو اٹھا کر، سندھ سے اسپین تک کا فرمانروا بنا دیا تھا، وہ ایک ایک ایسے شخص کے پاس پہنچتے تھے جس نے آپکی صحبت پائی تھی، یا آپ کو کبھی دیکھا تھا، یا آپ کی کوئی تقریر سنی تھی، اور جوں جوں صحابہ دنیا سے اٹھتے چلے گئے، یہ اشتیاق بڑھتا گیا، حتیٰ کہ تابعین کے گروہ نے وہ سارا علم نچوڑ لیا جو سیرتِ پاک کے متعلق صحابہ سے ان کو مل سکتا تھا۔

صحابہؓ کی روایتِ حدیث عقل گواہی دیتی ہے کہ ایسا ضرور ہوا ہوگا اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا ہے، آج حدیث کا جو علم دنیا میں موجود ہے وہ تقریباً دس ہزار صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے، تابعین نے ان کی صرف احادیث ہی نہیں لی ہیں بلکہ ان سب صحابیوں کے حالات بھی بیان کر دیئے ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس نے حضور ﷺ کی کتنی صحبت پائی ہے یا کب اور کہاں آپ کو دیکھا ہے اور کن مواقع پر آپ کی خدمت میں حاضری دی ہے، فاضل جج تو یہ فرماتے ہیں کہ احادیث تو ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ذہن میں دفن پڑی رہیں اور دو ڈھائی صدی بعد، امام بخاری اور ان کے ہم عصروں نے انھیں کھود نکالا، لیکن تاریخ ہمارے سامنے جو نقشہ پیش کرتی ہے، وہ اس کے بالکل برعکس ہے، صحابہؓ میں سے جن حضرات نے سب سے زیادہ روایات بیان کی ہیں، ان کی اور ان کی مرویات کی فہرست ملاحظہ ہو۔

ابو ہریرہؓ متوفی ۵۷ھ تعدادِ احادیث ۵۳۷۴ ان کے شاگردوں کی تعداد تقریباً ۸۰۰ تھی، اور بکثرت شاگردوں نے احادیث کو قلمبند کیا تھا۔

ابو سعید خدریؓ	متوفی ۴۶ھ	تعدادِ احادیث ۱۱۷۰
جابر بن عبداللہؓ	متوفی ۷۴ھ	تعدادِ احادیث ۱۵۴۰
انس بن مالکؓ	متوفی ۹۳ھ	تعدادِ احادیث ۱۲۸۶
عائشہ صدیقہؓ	متوفیہ ۵۹ھ	تعدادِ احادیث ۲۲۱۰
عبداللہ بن عباسؓ	متوفی ۶۸ھ	تعدادِ احادیث ۱۶۶۰
عبداللہ بن عمرؓ	متوفی ۷۰ھ	تعدادِ احادیث ۱۶۳۰
عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ	متوفی ۶۳ھ	تعدادِ احادیث ۷۰۰
عبداللہ بن مسعودؓ	متوفی ۳۲ھ	تعدادِ احادیث ۸۴۸

کیا یہ اسی بات کا ثبوت ہے کہ صحابہ کرام، نبی ﷺ کے حالات کو، اپنے سینوں میں دفن کر کے یونہی اپنے ساتھ دنیا سے لے گئے؟[1]

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۳۹ تا ۳۴۱

دورِ صحابہ سے امام بخاری کے دور تک علم حدیث کی مسلسل تاریخ

منکرین حدیث تو رسول اکرم ﷺ کو محض ایک ڈاکیے کا مقام دیتے ہیں جس کا کام، محض مکتوب الیہ تک ڈاک پہنچا دینا ہی ہوتا ہے، خطوط پہنچا دینے کے بعد، جس طرح ڈاکیہ، اپنی سرکاری حیثیت سے الگ ہو کر، محض ایک عام بشر ہو کر رہ جاتا ہے بالکل اسی طرح پیغام خداوندی پہنچا دینے کے بعد، نبی مرسل بھی محض ایک فرد بشر ہو کر رہ جاتا ہے، اسی تصور کے تحت ان کا یہ نظریہ ہے کہ نبیؐ، ابلاغ رسالت کے بعد، اتنے التفات کا بھی مستحق نہیں جتنا کوئی معمولی لیڈر ہوا کرتا ہے، لہٰذا، ان کے گمان کے مطابق، نہ تو پیغمبرِ خدا، اپنے کام، کلام، پیام، اور مقام کے لحاظ سے اپنی زندگی ہی میں قابلِ التفات تھا، اور نہ ہی مرنے کے بعد، لائقِ توجہ تھا، ---لیکن منکرینِ حدیث کے اس تصور کے علی الرغم، نبی اکرم ﷺ اپنی حیاتِ طیبہ میں بھی، اور عالمِ جاوداں کو سدھارنے کے بعد بھی، مرکزِ توجہ اور محورِ التفات رہے، صحابہ کرامؓ نے آپ کی باتیں سنیں، دل و دماغ میں محفوظ رکھیں، اپنے سیرت و کردار میں انھیں سمویا اور آئندہ نسلوں کو منتقل کیں، چنانچہ دورِ صحابہؓ کے بعد تابعین کے بارے میں مولانا مودودیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ

> اس کے بعد، ان تابعین کو دیکھئے، جنھوں نے صحابہ کرامؓ سے سیرت پاک کا علم حاصل کیا اور بعد کی نسلوں تک اس کو منتقل کیا، ان کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف طبقات ابن سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔
>
> مدینہ میں ۴۸۶، مکہ میں ۱۳۱، کوفہ میں ۴۱۳ اور بصرہ میں ۱۶۴
>
> ان میں سے جن اکابر تابعین نے حدیث کے علم کو حاصل کرنے، محفوظ کرنے اور آگے پہنچانے کا سب سے بڑھ کر کام کیا ہے، وہ یہ ہیں۔

سعید بن المسیب	پیدائش ۱۴ھ	وفات ۹۳ھ
حسن بصری	پیدائش ۲۱ھ	وفات ۱۱۰ھ
ابن سیرین	پیدائش ۳۳ھ	وفات ۱۱۰ھ
عروہ بن زبیر	پیدائش ۲۲ھ	وفات ۹۴ھ (انھوں نے سیرت رسول پر پہلی کتاب لکھی)
علی بن حسین (زین العابدین)	پیدائش ۳۸ھ	وفات ۹۴ھ
مجاہد	پیدائش ۲۱ھ	وفات ۱۰۴ھ
قاسم بن محمد بن ابی بکر	پیدائش ۳۷ھ	وفات ۱۰۶ھ
شُرَیح		وفات ۷۸ھ (حضرت عمرؓ کے زمانے میں قاضی مقرر ہوئے)
مسروق		وفات ۶۳ھ (ابوبکرؓ کے زمانہ میں مدینہ آئے)
اسود بن یزید		وفات ۷۵ھ
مکحول		وفات ۱۱۲ھ

رجاء بن حَیْوہ		وفات ۱۱۳ھ
ہمام بن مُنَبّہ	پیدائش ۴۰ھ	وفات ۱۳۱ھ (صحیفہ ہمام بن منبہ کے مرتب یہی تھے یہ صحیفہ آج بھی موجود ہے)
سالم بن عبداللہ		وفات ۱۰۶ھ
نافع مولی عبداللہ بن عمر		وفات ۱۱۷ھ
سعید بن جبیر	پیدائش ۴۵ھ	وفات ۹۵ھ
سلیمان الاعمش	پیدائش ۶۱ھ	وفات ۱۴۸ھ
ایوب السختیانی	پیدائش ۶۶ھ	وفات ۱۳۱ھ
محمد بن المنکدر	پیدائش ۵۴ھ	وفات ۱۳۰ھ
ابن شہاب زہری	پیدائش ۵۸ھ	وفات ۱۲۴ھ (حدیث کا بہت بڑا تحریری ذخیرہ چھوڑا)
سلیمان بن یسار	پیدائش ۳۴ھ	وفات ۱۰۷ھ
عکرمہ مولی ابن عباس	پیدائش ۲۲ھ	وفات ۱۰۵ھ
عطاء بن ابی رباح	پیدائش ۲۷ھ	وفات ۱۱۵ھ
قتادہ بن دعامہ	پیدائش ۶۱ھ	وفات ۱۱۷ھ
عامر الشعبی	پیدائش ۱۷ھ	وفات ۱۰۴ھ
عَلْقَمہ		وفات ۶۲ھ (دورِ رسالت میں جوان تھے مگر محرومِ زیارتِ نبی رہے)
ابراہیم النخعی	پیدائش ۴۶ھ	وفات ۹۶ھ
یزید بن ابی حبیب	پیدائش ۵۳ھ	وفات ۱۲۸ھ

ان حضرات کی تواریخ پیدائش ووفات پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان لوگوں نے صحابہؓ کے عہد کا بہت بڑا حصہ دیکھا ہے، ان میں سے بیشتر وہ تھے، جنھوں نے صحابہؓ کے گھروں میں اور صحابیاتؓ کی گودوں میں پرورش پائی ہے، اور بعض وہ تھے جن کی عمر کسی نہ کسی صحابی کی خدمت میں بسر ہوئی ہے، ان کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے بکثرت صحابہ سے مل کر نبی ﷺ کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپ ؐ کے ارشادات اور فیصلوں کے متعلق وسیع واقفیت بہم پہنچائی ہے، اسی وجہ سے روایتِ حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ، انھی لوگوں سے بعد کی نسلوں تک پہنچا ہے۔ تاوقتیکہ کوئی شخص، یہ فرض نہ کرے کہ پہلی صدی ہجری کے تمام مسلمان منافق تھے، اس بات کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا کہ ان لوگوں نے گھر بیٹھے حدیثیں گھڑلی ہوں گی اور پھر بھی پوری امت نے انھیں سرآنکھوں پر بٹھایا ہوگا اور ان کو اپنے اکابر علماء میں شمار کیا ہوگا۔

اس کے بعد، اصاغر تابعین اور تبع تابعین کا وہ گروہ ہمارے سامنے آتا ہے جو ہزار ہا کی تعداد میں، تمام دنیائے اسلام میں پھیلا ہوا تھا، ان لوگوں نے بہت بڑے پیمانے پر تابعین سے احادیث لیں اور دور دور کے سفر کرکے، ایک ایک علاقے کے صحابہ اور ان کے شاگردوں کا علم جمع کیا۔ ان کی چند نمایاں شخصیتیں یہ ہیں:

جعفر بن محمد بن علی (جعفر الصادق)	پیدائش ۸۰ھ	وفات ۱۴۸ھ	
ابوحنیفۃ النعمان	پیدائش ۸۰ھ	وفات ۱۵۰ھ	
شعبۃ ابن الحجاج	پیدائش ۸۳ھ	وفات ۱۶۰ھ	
لیث بن سعد	پیدائش ۹۳ھ	وفات ۱۶۵ھ	
ربیعۃ الرائے		وفات ۱۳۶ھ	یہ امام مالک کے استاد تھے
سعید بن ابی عروبہ		وفات ۱۵۶ھ	
مِسعر بن کِدَام		وفات ۱۵۲ھ	
عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر		وفات ۱۲۶ھ	
سفیان الثوری	پیدائش ۹۷ھ	وفات ۱۶۱ھ	
حماد بن زید	پیدائش ۹۸ھ	وفات ۱۷۹ھ	[1]

یہ تھے وہ عشاقِ رسول، جنھوں نے اپنی زندگیاں، رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کو جاننے اور سمیٹنے کے لیے وقف کر ڈالی تھیں، اور وہ بھی اس کڑے اہتمام کے ساتھ کہ پیغمبر خدا کی طرف کوئی کچی پکی بات، منسوب نہ ہونے پائے، اس کے لیے جانچ پرکھ اور تنقید و تنقیح کے ایسے قواعد ملحوظ رکھ کر کوششیں کی گئی کہ اسماء الرجال کا ایک پورا اور مستقل فن معرض وجود میں آ گیا، اور کبھی اس فن کی تعریف کرتے ہوئے "مفکرِ قرآن" نے یہ بھی کہا تھا

> اس میں ذرا کلام نہیں کہ ان احادیث کا تفحص و تجسس، تحقیق و تدقیق اور نقد و تبصرہ میں حضرات ائمہ حدیث نے، جس دقتِ نظر اور کاوش و دقیقہ سنجی سے کام لیا ہے، اس کی مثال، دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر اسپرنگر تو عربوں کا اسماء الرجال، دیکھ کر ہی ششدر رہ گیا تھا۔ اگر وہ کہیں تاریخ و تدوینِ حدیث پر غور کرتا، تو پتہ نہیں کس قدر غرقِ حیرت ہو جاتا۔ [2]

اور دنیا اس فن کو دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کیونکہ اس کام میں جسقدر محنت مشقت اور جانفشانی صرف کی گئی، اس سے زائد انسانی بساط میں ممکن نہ تھی پھر اس کے بعد وہ دور آیا، جس میں علم حدیث کی تدوین ہی علمائے حدیث کی تگ و تاز کا مرکز تھا، اس سلسلہ میں مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں

دوسری صدی کے جامعین حدیث یہی دور تھا جس میں حدیث کے مجموعے لکھنے اور مرتب کرنے کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوا، اس زمانے میں، جن لوگوں نے احادیث کے مجموعے مرتب کیے، وہ حسب ذیل ہیں۔

ربیع بن صبیح	وفات ۱۶۰ھ، انھوں نے ایک ایک فقہی عنوان پر الگ الگ رسائل مرتب کیے۔
سعید بن ابی عروبہ	وفات ۱۵۶ھ، انھوں نے ایک ایک فقہی عنوان پر الگ الگ رسائل مرتب کیے۔
موسیٰ بن عقبہ	وفات ۱۴۱ھ، انھوں نے نبی ﷺ کے غزوات کی تاریخ مرتب کی۔

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۴۱ تا ۳۴۵ [2] معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۸۸

امام مالک پیدائش ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ، انھوں نے احکامِ شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

ابن جُریج پیدائش ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ، انھوں نے احکامِ شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

امام اوزاعی پیدائش ۸۸ھ وفات ۱۵۶ھ، انھوں نے احکامِ شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

سفیان ثوری پیدائش ۹۷ھ وفات ۱۶۱ھ، انھوں نے احکامِ شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

حماد بن سلمہ بن دینار پیدائش ۹۷ھ وفات ۱۷۶ھ، انھوں نے احکامِ شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

امام ابو یوسف پیدائش ۱۱۳ھ وفات ۱۸۲ھ، انھوں نے احکامِ شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

امام محمد پیدائش ۱۳۱ھ وفات ۱۸۹ھ، انھوں نے احکامِ شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔

محمد بن اسحاق وفات ۱۵۱ھ، انھوں نے نبی ﷺ کی سیرت پاک مرتب کی۔

ابن سعد پیدائش ۱۶۸ھ وفات ۲۳۰ھ، انھوں نے نبی ﷺ اور صحابہ و تابعین کے حالات جمع کیے۔

عبداللہ بن موسیٰ العَبَسی وفات ۲۱۳ھ، انھوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

مسدَّد بن مُسَرھد البصری وفات ۲۱۸ھ، انھوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

اسد بن موسیٰ وفات ۲۱۲ھ، انھوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

نعیم بن حماد الخزاعی وفات ۲۲۸ھ، انھوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

احمد بن حنبل پیدائش ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ، انھوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

اسحاق بن راہویہ پیدائش ۱۶۱ھ وفات ۲۳۸ھ، انھوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

عثمان بن ابی شیبہ پیدائش ۱۵۶ھ وفات ۲۳۹ھ، انھوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

ابوبکر بن ابی شیبہ پیدائش ۱۵۹ھ وفات ۲۳۵ھ، انھوں نے فقہی ابواب اور صحابہ کی جداگانہ مرویات دونوں کے لحاظ سے احادیث جمع کیں۔

ان میں سے امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمد، محمد بن اسحاق، ابن سعد، امام احمد بن حنبل، اور ابوبکر بن ابی شیبہ کی کتابیں آج تک موجود ہیں اور شائع ہو چکی ہیں۔ نیز موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک حصہ بھی شائع ہو چکا ہے، اور جن حضرات کی کتابیں آج نہیں ملتیں وہ بھی درحقیقت ضائع نہیں ہوئی ہیں، بلکہ ان کا پورا پورا مواد، بخاری و مسلم اور ان کے ہم عصروں نے اور ان کے بعد آنے والوں نے اپنی کتابوں میں شامل کر لیا، اس لیے لوگ ان سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔

امام بخاری کے دور تک علم حدیث کی اس مسلسل تاریخ کو دیکھنے کے بعد، کوئی شخص، فاضل جج کے ان ارشادات کو آخر کیا وزن دے سکتا ہے کہ --- ''احادیث نہ یاد کی گئیں، نہ محفوظ کی گئیں بلکہ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کر کے مر گئے، یہاں تک کہ ان کی وفات کے چند سو برس بعد، ان کو جمع اور مرتب کیا گیا'' --- اور یہ کہ --- ''بعد میں پہلی مرتبہ رسول اللہ کے تقریباً ایک سو برس بعد، احادیث کو جمع کیا گیا مگر ان کا ریکارڈ، اب محفوظ نہیں ہے'' --- اس موقع پر ہم یہ عرض کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ ہائی کورٹ جیسی بلند پایہ عدالت کے ججوں کو علمی مسائل پر اظہارِ خیال کرنے میں، اس سے زیادہ محتاط اور باخبر ہونا چاہیے۔ [۱]

[۱] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۴۵ تا ۳۴۶

الغرض، یہ طویل بحث اس حقیقت کو مبرہن کر دیتی ہے کہ حفاظتِ حدیث میں اگرچہ کتابتِ حدیث کا ذریعہ بھی اختیار کیا گیا تھا، لیکن مجرد کتابت، بغیر اس کے کہ حفظ و روایت کا عمل، اس کے ساتھ مقرون ہو، ہرگز ہرگز صحت وحفاظت کی ضمانت نہیں ہوسکتی، کسی چیز کا مجرد لکھا جانا، یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس کی حفاظت کاملہ کا اہتمام کر دیا گیا ہے، دورِ حاضر کے منکرین حدیث نے تو گویا یہ باور کر رکھا ہے کہ کسی چیز کا مکتوب ہو جانا، گویا معصوم ہو جانا ہے، نہ تو لکھنے والوں سے غلط نویسی اور بھول چوک ہی ممکن ہے اور نہ ہی پڑھنے والے کبھی غلط پڑھ سکتے ہیں یا غلط سمجھ سکتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں یاد کی ہوئی چیز کے متعلق، ان لوگوں کا خیال ہے کہ اپنی اصلی حالت میں اس کا یاد رہ جانا گویا ناممکنات میں سے ہے، پھر ان دونوں مفروضوں پر تیسرے مفروضہ کی بنیاد کھڑی کی گئی ہے کہ ابتدائی عہد میں حدیثوں کے چونکہ زبانی یاد کرنے کا رواج تھا اور ان کے قلم بند کرنے کا خیال، صدیوں بعد پیدا ہوا، اس لیے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ حدیثوں کا موجودہ ذخیرہ، جو کتبِ احادیث میں ہے، قطعاً کسی حیثیت سے بھی قابل اعتماد اور لائقِ اعتبار نہیں ہے، اسی کا نام بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر مقدمہ، بجائے خود فاسد اور محض ایک خود تراشیدہ مفروضہ ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا کہ ابتدائی دور میں احادیث کے قلم بند نہ ہونے کا افسانہ، صرف افسانہ ہی ہے۔......

کیا محض کتابت، حفاظتِ کاملہ کا ذریعہ ہے؟

لیکن منکرین حدیث کا، کتابتِ حدیث کی حقیقت سے یکسر آنکھیں بند کر کے، یہ واویلا کرنا کہ احادیث کو ابتداءً لکھا نہیں گیا تھا، اور صرف زبانی روایت پر موقوف رکھا گیا تھا، نہ صرف یہ کہ امر واقعہ کے خلاف ہے، بلکہ اس پر مزید سینہ زوری یہ اختیار کی جاتی ہے کہ کتابت کو انتہائی اور غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے، اور حفظ یا یادداشت کی حد سے گزری ہوئی تحقیر و توہین کر ڈالی جاتی ہے، حالانکہ حفظ و یادداشت کے بغیر، محض کتابت شدہ مواد کو، بالخصوص جبکہ وہ نقاط اور حرکات و اعراب سے عاری ہو، صحیح طور پر پڑھنا بھی ممکن نہیں رہتا، خواہ تحریر شدہ یہ مواد، کتنے ہی حزم و احتیاط اور التزامِ صحت کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہو، لیکن پھر بھی پڑھنے والا، بہر حال اغلاط سے مبرا نہیں ہوسکتا، احادیث کا معاملہ تو خیر دوسرا ہے، لیکن قرآن، جو ہر دور میں، ہر مسلم گھرانے میں موجود رہا ہے، اسے پڑھنے میں بھی بعض لوگ صرف اس لیے غلطی کر جاتے ہیں کہ وہ کسی حافظِ قرآن سے سنے بغیر، محض مکتوب قرآن کو پڑھتے ہیں اور اس کے اصل تلفظ سے ناواقف ہونے کے باعث، غلط پڑھ جاتے ہیں، مثلاً امام سیوطی نے اپنی کتاب تدریب الراوی میں، امام دارقطنی کی کتاب التصحیف سے نقل کیا ہے کہ:

> سورہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ، جس کا نام سورۂ فیل ہے، اِن ہی صاحب نے پڑھتے ہوئے، الم تر کے شروع میں جو الم ہے، اس کو سورہ بقرہ کے ابتدائی حروف کی طرح الف لام میم تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ پڑھ دیا تھا۔[1]

اب یہاں غور فرمایئے کہ اگر قرآن کے معاملہ میں، خدانخواستہ صرف ''کتابت'' ہی پر بھروسہ کر لیا جاتا اور کتابت کے ساتھ ساتھ، زبانی یاد کرنے کا دستور شروع ہی سے مروج نہ رہتا، تو کیا قرآن کو صحتِ تلفظ کے ساتھ پڑھا جا سکتا تھا؟ بالخصوص

[1] تدوین حدیث (از مناظر حسن گیلانی)، صفحہ ۱۹۵

اسلام کے ابتدائی ایام میں، جبکہ عربی حروف، خصوصاً جن کی شکلیں باہم ملتی جلتی ہیں (مثلاً ج ح خ د ذ س ش ص ض وغیرہ) اور ان میں نقاط کے ذریعہ فرق و امتیاز کا طریقہ بھی جاری نہ ہوا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ جب تک نقاط کا طریقہ ایجاد نہ ہوا تھا، اس وقت تک مکتوبہ چیزوں کا پڑھنا اور بھی دشوار تھا، یہ تو صرف اور صرف حفظ اور یادداشت کے طریقے سے محفوظیتِ قرآن کی کرامت ہے کہ بحمد اللہ، اس کے کسی لفظ اور کسی تلفظ کے متعلق کسی قسم کا شبہ پیدا نہ ہوا، ورنہ جیسا کہ اس زمانہ میں سمجھ لیا گیا ہے، اگر بالکلیہ بھروسہ صرف کتابت کے طریقہ پر کر لیا جاتا تو حدیث تو حدیث، بلکہ قرآن تک کے لیے وہ بہت بڑا فتنہ بن سکتا تھا، بغیر حفظ و روایت کے، محض کتابت کی بناء پر، پڑھنے میں جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں، اُن کے بارے میں سید مناظر احسن گیلانی صاحب لکھتے ہیں:

> تدوین حدیث کی تاریخوں میں لوگ اس قسم کے لطائف کا ذکر جو کرتے ہیں کہ فلاں صاحب نے سفیان ثوری کو شقیان ثوری پڑھا، یا خالد الحذاء کو جلد الجداء اور الحسن کے لفظ کو الجسر پڑھ دیا تھا، حتی کہ الحاکم نے لکھا ہے کہ ایک صاحب میرے ساتھ پڑھا کرتے تھے، انھوں نے حدیث کی سند کے راوی رقیہ بن مصقلا کو رقبہ بن مثقلہ پڑھ دیا تو ہم لوگوں میں آئندہ وہ رقبہ ہی کے نام سے پکارے جانے لگے اور یہی نام ان کا مشہور ہو گیا (دیکھو معرفۃ علوم الحدیث للحاکم، صفحہ ۱۵۲)، لیکن یہ غلطیاں تو حدیث میں اور حدیث میں بھی سند کے راویوں کے نام میں لوگوں سے لگی تھیں۔ حکیم الامت مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے وعظ میں ایک دفعہ بیان کیا کہ جدید تعلیمیافتہ حضرات میں سے کسی صاحب نے بغیر استاد کے، خود قرآن کی تلاوت کرنی چاہی، قرآن کھولا، پہلی سورت جس پر نظر پڑی، اس کی ابتداء الٓو سے ہوئی تھی، عربی خط میں یہ کچھ اس طرح لکھا ہوا تھا کہ تعلیم یافتہ صاحب نے اس کو "آلو" پڑھا۔ غالباً اس پر مسرور ہوئے ہوں گے کہ ہماری دینی کتاب، نباتاتی حقائق سے لبریز ہے، کھولنے کے ساتھ ہی کھانے کی ایک چیز سامنے آ گئی، آگے خیال کر لیا ہوگا کہ اسی آلو کے بونے، کاشت کرنے اور پکانے کے طریقوں پر بحث کی گئی ہوگی، افسوس ہوا ہوگا کہ ملاؤں نے اس بہترین کتاب کو صرف خشک دین اور جنت و دوزخ کے تذکروں کی یادداشت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ [1]

قصہ مختصر یہ کہ، ہماری یہ بحث اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ حفظ و یادداشت کے بغیر، کسی چیز کا لکھا ہوا ہونا، نہ تو اس کی صحتِ قراءۃ اور صحتِ تلفظ کی ضمانت دیتا ہے، اور نہ ہی مجرد کتابت اور نوشتہ محض ہونا، اسے قابل اعتماد اور لائقِ استناد بنا دیتا ہے، لکھی ہوئی دستاویز بھی صرف اسی وقت معتبر قرار پا سکتی ہے جبکہ اس کے حق میں زندہ انسانوں کی شہادت موجود ہو۔ لیکن اگر کوئی چیز، مکتوب صورت میں موجود نہ ہو، لیکن اسے اپنے سینوں میں محفوظ رکھنے والے زندہ انسان موجود ہوں، تو یہ صورتِ حال، (باوجود عدمِ کتابت کے) حفاظت کا مسلمہ ذریعہ قرار پاتی ہے، قرآن کریم، اگرچہ، نازل ہوتے ہی لکھ لیا جاتا تھا، لیکن اس کا محفوظ ہونا، کتابت کا نہیں بلکہ حفظ و یادداشت کا مرہونِ منت ہے۔ اگر قرآن، سینوں میں محفوظ نہ کیا گیا ہوتا، اور محض کتابت پر اکتفاء کرتے ہوئے، اسے، صحیفوں ہی میں محفوظ کر لیا گیا ہوتا، تو نیرنگیٔ زمانہ اور گردشِ لیل و نہار کے ساتھ، قرآن کا کتابت شدہ نسخہ باقی و برقرار رہ بھی گیا ہوتا، تو وہ خود اس بات کا محتاجِ ثبوت ہوتا کہ آیا واقعی یہ وہی قرآن ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے لکھایا

[1] تدوینِ حدیث، (مناظر حسن گیلانی)، صفحہ ۱۹۷ تا ۱۹۸

لکھوایا تھا۔ ٹھیک یہی صورتِ حال، آج، قرآن کے بارے میں ہمارے سامنے ہے، یقیناً حضور ﷺ نے قرآن کو لکھوایا تھا، مگر آپ ﷺ کا لکھوایا ہوا کوئی نسخہ آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے، اگر وہ نسخہ کہیں سے دستیاب ہو بھی جائے، تو اس امر کا ثبوت فراہم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نسخہ، خود حضور ﷺ ہی کا تیار کردہ نسخہ ہے، لیکن قرآن، بہر حال، پھر بھی محفوظ ہے، اور حضور ﷺ کے اپنے تیار کردہ نسخۂ قرآن کی عدم فراہمی، حفاظت قرآن پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ڈالتی، اس لیے کہ حفاظت خداوندی کا وعدہ، حضور ﷺ کے لکھوائے ہوئے نسخۂ مخصوصہ سے متعلق نہ تھا بلکہ مطلق قرآنِ مُرَتّل اور کتابِ متلو سے وابستہ تھا، اس سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ قرآن کی حفاظت کا اصل ذریعہ، حفظ یا یادداشت ہی تھا، نہ کہ کتابت کا عمل، نیز اس سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ منکرینِ حدیث، کتابت کے مسئلہ پر زور دیتے ہوئے، اسے جو مبالغہ آمیز اہمیت دیتے ہیں، وہ بالکل غلط چیز ہے، اور بارگاہِ علم و تحقیق میں اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔

جس طرح قرآن کریم --- باوجودیکہ وہ لکھا گیا تھا --- مگر اُسے حفظ و یادداشت ہی کے ذریعہ محفوظ کیا گیا ہے، بالکل اسی طرح حدیث و سنت بھی --- باوجودیکہ مکتوب شکل میں بھی تھی اور باوجودیکہ وہ جیتے جاگتے معاشرے کی عملی زندگی کی رگ رگ میں سرایت بھی کیے ہوئے تھی --- لیکن وہ بھی، قرآن کی طرح حفظ و یادداشت کے عمل ہی کے ذریعہ محفوظ کی گئی ہے۔

باب ۵

عقائد اسلام اور تفسیر مطالب الفرقان

باب ۵

عقائدِ اسلام اور تفسیرِ مطالب الفرقان

عقائدِ اسلام اور تفسیرِ پرویز

اسلام، اپنی معاشرت وثقافت کی بنیاد، جن عقائد پر رکھتا ہے وہ عالمِ غائب سے تعلق رکھنے والے حقائق ہیں، ان عقائد سے، وہ، افرادِ معاشرہ کی تطہیرِ فکر وعمل کا کام بھی لیتا ہے اور معاشرتی واجتماعی زندگی کے استحکام کا بھی --- یہ عقائد، اس تصورِ حیات اور تصورِ کائنات کا بدیہی اور منطقی نتیجہ ہیں جو اسلام نے پیش کیے ہیں، یہ کائنات، اسلامی نقطۂ نظر سے ایک آزمائش گاہ ہے جس میں ہر فردِ بشر کو اچھے اور بُرے حالات میں رکھ کر آزمایا جا رہا ہے، اور اس کی زندگی، وہ مہلتِ آزمائش یا عرصۂ امتحان ہے، جو اسے دنیا کی اس امتحان گاہ میں آزمانے کے لیے دی گئی ہے، انسانی زندگی کا عرصۂ امتحان ہونا اور کائنات کا دارالامتحان ہونا، بدیہی اور منطقی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا تقاضا کرتا ہے کہ ممتحن (یعنی اللہ تعالیٰ) کے وجود کو، ماننے بغیر چارۂ کار نہیں، اس امتحان گاہ میں، تعلیماتِ انبیاء اور کتبِ سماویہ، وہ نصاب ہے جس کی بنیاد پر، ہر شخص کا امتحان لیا جا رہا ہے، فرشتے، وہ امتحانی کارکن ہیں، جو اس وسیع دارالامتحان کو، جو پوری کائنات پر حاوی ہے، بحکمِ خداوندی چلا رہے ہیں، اور آخرت کا دن اس امتحان کے نتیجہ کا دن ہوگا جس میں نصاب کے مطابق زندگی گزارنے والے کامیاب اور کامران اور باقی سب لوگ ناکام ونامراد قرار پائیں گے، اس طرح قرآن کے بیان کردہ، تصورِ حیات اور تصورِ کائنات کی کوکھ سے، یہ پانچوں ایمانیات، معقول ترین حقائق کی صورت میں جنم لیتے ہیں۔

(۱) اللہ پر ایمان (۲) انبیاء ورسل پر ایمان (۳) وحی اور کتابوں پر ایمان

(۴) فرشتوں پر ایمان (۵) آخرت پر ایمان

چونکہ یہ جملہ ایمانیات، عالمِ شہادت کی بجائے، عالمِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے انھیں تسلیم کرنا، ایمان بالغیب کہلاتا ہے۔

ایمان بالغیب اور الحادِ پرویز

ہمارے دَور کے ''مفکرِ قرآن'' جناب پرویز صاحب، لفظاً تو ایمان بالغیب کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن معناً، اس طرح ماننے کے لیے تیار نہیں جس طرح قرآن ماننے کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ فی الواقع، وہ كَلِمَةُ حَقٍ اُرِیْدَ بِهَا الْبَاطِل کا مصداق بن کر، ایمان بالغیب کے مفہوم میں دو پہلوؤں سے الحاد کا رویہ اپناتے ہیں۔

۱- تحریفِ مفہوم

ایمان بالغیب میں، پرویز صاحب کا اولین الحاد یہ ہے کہ وہ اس کے مفہوم کو خالصتاً عالمِ غیب کے حقائق سے زبانی اقرار کے ساتھ وابستہ کرتے ہوئے، عالمِ شہادت سے بھی اس طرح وابستہ کر ڈالتے ہیں کہ ایمان بالغیب کا مفہوم، اسی دنیا کے مستقبل کے نتائج ہی قرار پاتے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر، علامہ محمد عبدہ مصری کا درج ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں، جو ایمان بالغیب کاؤ ہی صحیح مفہوم لیے ہوئے ہے جو اسلاف سے لے کر اخلافِ امت تک میں متفق علیہ مفہوم ہے، علامہ مصری لکھتے ہیں۔

> الغیب سے مراد، وہ تمام امور وحقائق ہیں جن تک علم انسانی کی دسترس نہ ہوسکی ہو، مثلاً ذاتِ باری تعالیٰ، ملائکہ اور دارِ آخرت وغیرہ [۱]

اب، پرویز صاحب، ''لیکن'' کی شرط کے تحت، اس صحیح مفہوم پر اپنا اضافہ کرتے ہوئے، یوں حاشیہ آرائی کرتے ہیں کہ

> بیشک، یہ باتیں عالم نامشہود سے تعلق رکھتی ہیں اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے، لیکن ہمارے نزدیک، اس مقام پر ایمان بالغیب سے مراد، یہ ہے کہ جس نظام کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے، اس کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھا جائے، اس یقین کے بغیر، انسان اس نظام کو عملاً متشکل نہیں کرسکتا۔ [۲]

ایمان بالغیب کا اصل مفہوم وہی ہے جو علامہ محمد عبدہ کے حوالہ سے اوپر بیان ہو چکا ہے، دعوت کے ان دیکھے نتائج پر اعتماد ووثوق، دراصل سچے رسول پر اس اعتماد کا ایک حصہ ہے جو اس کی زندگی بھر کی راستبازی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ پیغمبر پر یہ اعتماد اور بھروسہ اور اس کے پیش کردہ حقائقِ عالمِ غیب پر ایمان، دونوں جمع ہو جائیں تو نور علیٰ نور ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں مستقبل کے نتائجِ دعوت پر اعتماد ہو، وہاں ایمان بالغیب بھی موجود ہو، نتائجِ دعوت کے بہتر مستقبل پر اعتماد، ایک الگ چیز ہے اور ایمان بالغیب، ایک جداگانہ چیز ہے۔ اول الذکر پر اعتماد تو کبھی کافر مشرک اور دہریئے کو بھی ہو جاتا ہے، لیکن ایمان بالغیب کی دولت سے وہ اس کے باوجود محروم ہی رہتا ہے۔ اس کی بہترین مثال، عتبہ بن ربیعہ کا وہ واقعہ ہے جس میں وہ، مشرکین مکہ کی طرف سے، حضور اکرم ﷺ سے ملاقات کرتا ہے، اور مفاہمت کے پیشِ نظر، آپؐ کے سامنے چار تجاویز رکھتا ہے، اور حضورؐ ان تجاویز کے جواب میں، سورہ حٰم السجدہ کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرماتے ہیں، عتبہ، اس کلام اور دعوت سے متاثر ہوتا ہے اور واپس پلٹ کر سردارانِ قریش کو اپنی رپورٹ یوں پیش کرتا ہے۔

> بخدا، میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا، خدا کی قسم! نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے، نہ کہانت ہے۔ اے سردارانِ قریش! میری بات مانو، اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لاکر رہے گا، فرض کرو اگر عرب، اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے، لیکن اگر وہ غالب آ گیا تو اُس کی بادشاہی، تمہاری بادشاہی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی۔ [۳]

---

۱ بحوالہ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۰ ۲ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۰

۳ تفسیر تفہیم القرآن، جلد ۴، صفحہ ۴۳۵

اب یہاں دیکھئے کہ عتبہ، آپ کی دعوت سے نہ صرف یہ کہ متاثر ہے بلکہ اس اعتماد کا بھی اظہار کر رہا ہے کہ یہ کلام رنگ لا کر رہے گا، لیکن یہ اعتماد، ایمان بالغیب قطعاً نہیں ہے، ایمان بالغیب تو فی الواقع، عالمِ غیب ہی کے امور وحقائق کو مان لینے کا نام ہے، وہ جیسا کافر پہلے تھا، اس اعتماد کے اظہار کے بعد بھی ویسا ہی کافر رہا۔

الغرض ''مفکرِ قرآن'' کا، دعوتِ پیغمبر کے ان دیکھے نتائج کو ایمان بالغیب قرار دینا، ایک ملحدانہ طرزِ عمل ہے۔

۲- الحاد فی الایمان کا دوسرا پہلو

ایمان بالغیب (جو ایمانیاتِ خمسہ کو تسلیم کر لینے کا عقیدہ ہے) میں ''مفکرِ قرآن'' صاحب، الحاد کا ایک اور پہلو، اپنے ایک نکتہ کی وضاحت کے دوران، یوں ظاہر کرتے ہیں۔

> یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے، قرآن کریم نے ایمان کے پانچ اجزاء بیان کیے ہیں (۱) اللہ پر ایمان، (۲) رسولوں پر ایمان (۳) ملائکہ پر ایمان (۴) کتابوں پر ایمان (۵) آخرت پر ایمان۔
>
> لیکن ہمارے ہاں، ان میں (اپنی طرف سے) ایک اور جزو کا اضافہ کر لیا گیا ہے، یعنی تقدیر پر ایمان، (یعنی معاذ اللہ، خدا کی فہرست میں جو کمی رہ گئی تھی، اسے ہم نے پورا کر دیا) [۱]

تقدیر پر ایمان، کوئی مستقل اور جداگانہ عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ ایمان باللہ ہی کا ایک حصہ ہے، جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، الگ سے بیان کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح، ختمِ نبوت کا عقیدہ، حضرت محمد ﷺ کی رسالت و نبوت پر ایمان ہی کا ایک جزو ہے، لیکن دورِ حاضر میں، اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، اسے بھی جداگانہ حیثیت سے بیان کیا جاتا ہے، ختمِ نبوت کے عقیدہ کی یہ جداگانہ حیثیت، اور پھر اس کی یہ اہمیت، آج کے خصوصی حالات کا تقاضا قرار پا گئی ہے، لیکن عقیدہ تقدیر کو، یہ اہمیت، خود نبی اکرم ﷺ نے عطا فرمائی ہے۔

> عن علي قال: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ "لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِاَرْبَعٍ : باللهِ وحده لا شريک لهٗ وَاَنِّي رَسُولُ اللهِ وَ بالبعث بعد الموت والقدر [۲] حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کوئی شخص صاحب ایمان نہیں جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے، اللہ کے واحد اور لاشریک ہونے پر، میری رسالت پر، بعث بعد الموت پر اور تقدیر پر۔

لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کو احادیثِ رسول سے جو چڑ، ضد اور تعصب ہے، اس کی بناء پر، وہ، یہ لکھتے نہیں تھکتے'' کہ

> یہ جو ہمارے ہاں، ایمان کی تفصیل یوں بتائی جاتی ہے کہ اٰمَنْتُ بِاللهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ مِنَ اللهِ تَعَالٰى، تو اس میں ''وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ'' کا اضافہ، خارج از قرآن اور مسئلہ تقدیر کو جزوِ ایمان قرار

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۴۲۵ [۲] سنن ابن ماجہ، مقدمہ، باب فی القدر، حدیث ۸۱

[۳] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۱۵۶

دینے کی عجمی سازش ۳

اللہ ہی جانتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' نے، اپنی محولہ بالا عربی عبارت میں وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ کے الفاظ کیوں حذف کر دیئے۔

بہر حال، عقیدہ تقدیر کو، اسلامی عقائد میں، ایمان باللہ کے ایک اہم جزو کی حیثیت سے جداگانہ طور پر بیان کرنا، نہ تو اسلامی عقائد میں اضافہ ہی ہے، اور نہ ہی یہ عجمی سازش کا نتیجہ ہے۔ اسے رسول اللہ ﷺ ہی نے یہ اہمیت عطا فرمائی ہے، کہ اسے ایمان باللہ کے ایک اہم اور لازمی جزو کے طور پر، جداگانہ انداز میں بیان کیا ہے، لیکن پرویز صاحب کو احادیثِ رسول سے، جو عداوت و نفرت، بیر اور دشمنی، تعصب اور ضد لاحق ہے، اس کا نشانہ خود ذاتِ رسول ؐ بھی بنے بغیر نہیں رہتی، کیونکہ ''مفکرِ قرآن'' رسولِ خدا کے عمل کو بھی عجمی سازش قرار دینے سے نہیں چوکتے۔

''مفکرِ قرآن'' کا ''رسولِ قرآن'' سے معارضہ و مقاومہ

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ، عقیدۂ تقدیر کو، ایمان باللہ ہی کی ایک شاخ کے طور پر، اس کا الگ ذکر فرمائیں، تو وہ ''عجمی سازش'' قرار پا جاتی ہے، لیکن اگر خود ''مفکرِ قرآن'' اپنی طرف سے ایک نیا عقیدہ گھڑ کے، اسلامی عقائد میں داخل کر دیں تو یہ، نہ صرف یہ کہ ''عجمی سازش'' نہیں ہے، بلکہ ''تفسیرِ قرآن'' اور ''خدمتِ اسلام'' ہے، واضح رہے کہ ''مفکرِ قرآن'' نے ''انسانی ذات پر ایمان'' کا ایک نیا عقیدہ تراش کر، اسے اسقدر اہمیت دی کہ اس پر ایمان لائے بغیر، خدا پر ایمان لانا بھی بے فائدہ اور بے معنیٰ ہے، وہ فرماتے ہیں۔

> اگر کوئی شخص، اس خدا کو مانتا ہے جس نے کارگہ کائنات کو پیدا کیا اور جس کے قوانین کے مطابق، یہ عظیم الشان سلسلہ، اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے، لیکن وہ انسانی ذات پر یقین نہیں رکھتا، تو قرآن کی رو سے اس کا خدا کو ماننا کچھ معنیٰ نہیں رکھتا۔
>
> انسان کا اپنی ذات پر ایمان، خدا پر ایمان کی بنیادی شرط (Pre-Requisite Condition) ہے۔ ۱

کیا ستم ظریفی ہے کہ اگر پرویز صاحب، کسی من گھڑت عقیدے کو ایسی اہمیت دیں کہ گویا اس کے مانے بغیر، ایمان باللہ کا عقیدہ ہی بے معنیٰ ہو کر رہ جائے، تو وہ ''مفکرِ قرآن'' کہلائیں، لیکن اگر، خود رسولِ خدا ہی ایک عقیدے کو، دوسرے عقیدے میں سے برآمد شدہ فرع اور جزو کی حیثیت سے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، جداگانہ انداز میں بیان کریں تو وہ عقیدہ ''مفکرِ قرآن'' کی نگاہ میں ''قرآنی ایمانیات میں اضافہ''، ''مجوس کا وضع کردہ عقیدہ'' اور ''عجمی سازش'' کا نتیجہ قرار پاتا ہے، اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اس پر، ''خدا کی نامکمل فہرست کو مکمل کر دینے'' کی طنز کر گزریں۔

''مفکرِ قرآن'' کا قرآنی ایمانیاتِ خمسہ پر مشتمل اقتباس (تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۴۲۵ کے حوالہ سے) پہلے پیش کیا جا چکا ہے، ایمانیاتِ خمسہ کی اس فہرست میں، ''انسانی ذات پر ایمان'' کا عقیدہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، لیکن

۱ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۰

پھر بھی، اس عقیدے پر ایمان لانا، "قرآنی ایمانیات میں اضافہ" نہیں ہے، اور یہ عقیدہ "مجوس کا وضع کردہ عقیدہ بھی نہیں ہے" کیونکہ اسے فی الواقع مجوس نے وضع نہیں، بلکہ "مفکرِ قرآن" نے ہی وضع کیا ہے، اور نہ ہی اسے ماننا اور عقائد اسلام میں داخل کرنا، کوئی "عجمی سازش" ہے، کیونکہ "مفکرِ قرآن" صاحب تو ماشاء اللہ "خالص عرب" ہیں جن پر عجمیت کی کوئی پرچھائیں تک نہیں پڑی، پھر بھلا وہ کسی "عجمی سازش" میں کیسے شریک ہو سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک "انسانی ذات پر ایمان" کا تعلق ہے، عہدِ رسالت اور دورِ خلافتِ راشدہ کیا معنیٰ، کسی بھی دور میں اس کا وجود تک نہیں ملتا، لیکن اس کے مقابلہ میں عقیدۂ تقدیر، قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور صحابہؓ کرام، اس پر ایمان رکھتے تھے، خود طلوعِ اسلام کو بھی، ایک موقع پر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک مرتبہ، حضرت معاویہؓ کو یہ فرماتے ہوئے، اس عقیدہ کا اعتراف کیا کہ

خدا نے جو کچھ مقدر کر دیا ہے، اس کے سوا ہمیں کچھ نہیں پیش آ سکتا۔ [1]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے جو کچھ فرمایا، وہ ہو بہو قرآن کریم کی اس آیت کا ترجمہ ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (التوبہ ۹:۵۱) آپ کہہ دیجئے کہ ہمیں وہی کچھ پہنچے گا جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے۔

یہ عقیدہ کہ والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ (ہر اچھی اور بری تقدیر، اللہ ہی کی طرف سے ہے)، خود قرآن کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ مثلاً ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ ۔شر اور خیر کے حالات کے ذریعہ، اللہ کی طرف سے لوگوں کی آزمائش، آخر عقیدہ تقدیر کے سوا اور کیا چیز ہے؟ پھر راحت ورنج، دکھ اور سکھ، شادی وغم، فتح وشکست، اور خوف وامن وغیرہ میں سے ہر پہلو کا منجانب اللہ ہونا (جسے قرآن کل من عنداللہ کہتا ہے) والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ ہی کا تو، پرتو ہے۔ لیکن ہمارے "مفکرِ قرآن" صاحب اس عقیدہ کو مجوس کا وضع کردہ عقیدہ قرار دیتے ہوئے بھی، اس پر مجبور ہیں کہ اسی عقیدہ پر اساس پذیر ایک جملہ کو (قرآنی آیت ہونے کا تاثر دیتے ہوئے) اپنی نقطہ طرازی کا ذریعہ بنائیں۔ اور یہ سمجھائیں کہ قرآن میں "اللہ" سے مراد "اللہ کا قانون" ہے۔

رنج اور راحت، سب خدا کی طرف سے ملتے ہیں۔ یعنی مصیبت اور راحت، سب، قانونِ خداوندی کے مطابق ملتے ہیں۔ [2]

کیا ہی عجیب بات ہے کہ اگر "مفکرِ قرآن" صاحب یہ فرمائیں کہ "رنج اور راحت سب خدا کی طرف سے ملتے ہیں" تو وہ قرآنی تعلیم قرار پائے، جو ان کے لیے نکتہ آرائی کا ذریعہ بن جائے، لیکن اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی لسانِ مبارک سے "اچھی بری تقدیر منجانب اللہ ہے"، کا جملہ صادر ہو جائے تو وہ "عجمی سازش" اور "مجوس کا وضع کردہ عقیدہ" قرار پائے۔

---

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۷ [2] سلیم کے نام، جلد اول، صفحہ ۱۰۸

(ا) پہلا عقیدہ: ایمان باللہ

اسلامی عقائد میں، اصلی اور نبیادی عقیدہ، ایمان باللہ ہے، کتابوں اور رسولوں پر ایمان ہو، یا فرشتوں اور آخرت پر۔ یہ سب عقائد، دراصل، ایمان باللہ ہی کی جڑ سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں، جنھیں ان کی اہمیت کے پیشِ نظر، جداگانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، ارکان اسلام اور عبادات کی ادائیگی میں بھی مرکزی عقیدہ، ایمان باللہ ہی کا عقیدہ ہے، جس کے بغیر، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج میں کوئی معنویت نہیں رہ جاتی۔ ایمان باللہ کے بغیر، نماز محض ایک فضول سی اٹھک بیٹھک ہو کر رہ جاتی ہے، روزہ سے اگر ایمان باللہ کا جوہر سلب کر لیا جائے تو وہ ایک بیجا فاقہ کشی بن کر رہ جاتی ہے، زکوٰۃ میں سے ایمان باللہ کی روح نکال لی جائے تو پھر دوسروں پر اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی خرچ کرنا، ایک خواہ مخواہ کی چٹی اور تاوان کے سوا کچھ نہیں ہے، حج میں سے اگر اس عقیدے کو الگ کر دیا جائے تو محض ایک پرانے سے کمرے کی زیارت کے لیے، اتنا لمبا سفر کرنا، محض ایک فضول قسم کا سیر سپاٹا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ دراصل، ایمان باللہ ہی کا عقیدہ ہے جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج میں ایک معنویت پیدا کرتا ہے اور ان اعمال کو عبادت بلکہ ارکان اسلام ہونے کی وقیع و رفیع منزلت عطا کرتا ہے، پھر پوری عملی زندگی میں بھی ایمان باللہ ہی کو مرکزی اور محوری حیثیت حاصل ہے، جدوجہدِ حیات میں، بعض امور کا ممنوع اور ناجائز ہونا، بعض کا فرض اور حق ہونا، بعض کا حلال اور بعض کا حرام ہونا، یہ سب کچھ ایمان باللہ ہی پر موقوف ہے، جس کے بغیر، نہ فرائض کی کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی حقوق کی، نہ حلال میں کوئی وقعت ہے اور نہ حرام میں کوئی وزن، نہ جائز ہی میں کوئی معنویت رہ جاتی ہے اور نہ ناجائز ہی میں کوئی مقصدیت۔ اس طرح ایمان باللہ ایک ایسا بنیادی عقیدہ ہے جس پر اسلام کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے، اور ایک ایسا محور ہے جس کے گرد پورا اسلامی نظامِ حیات گردش کرتا ہے۔

ایمان باللہ کی اس مرکزی اور محوری حیثیت کے گوناں گوں پہلو ہیں، جن پر تفصیل سے وسیع و عریض بحث کی جا سکتی ہے، لیکن ہم ان پہلوؤں سے چشم پوشی کرتے ہوئے، ''مفکرِ قرآن'' کے بہت سے انحرافات میں سے، صرف تین انحرافی امور تک اپنی بحث کو محدود رکھیں گے۔

(الف) تخلیقِ انسان کے بعد، انسانی آبادی میں خدا کا تصور کیسے پیدا ہوا؟

(ب) اللہ تعالیٰ کی متشابہ صفات کا مسئلہ

(ج) لفظ ''اللہ'' کے انوکھے معانی اور نرالے مفاہیم

(الف) بنی نوعِ انسان میں خدا کا تصوّر کیسے پیدا ہوا؟

بنی نوعِ انسان میں، خدا کا تصور، عقیدۂ الوہیت اور ایمان باللہ کا نظریہ کیسے پیدا ہوا؟ اس کا واضح اور اطمینان بخش جواب، از روئے قرآن، یہ ہے کہ ایسا، وحیِ خداوندی کی بناء پر ہوا، لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کی عقل و دانش اور ''قرآنی بصیرت'' اس کا کوئی اور ہی جواب فراہم کرتی ہے، ملاحظہ فرمائیے یہ جواب۔

قوموں کے عروج و زوال میں، اس بات کو بڑا دخل ہے کہ خارجی کائنات اور Outer Space کے بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے؟ انسان کے شعور نے جب پہلے پہل آنکھ کھولی، تو فضاء اور ماحول، اس کے خلاف تھا۔ سر پر آگ برسانے والا شعلہ، آندھیاں، جھکڑ، بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، بپھرے ہوئے دریا، اور ان کے درمیان نہتا اور تنہا انسان۔ نہتا یوں کہ فکر و دانش میں پختگی پیدا نہ ہوئی تھی، وہ فطرت کی طاقتوں کے سامنے جھکنے لگا، انسان کا یہ ابتدائی مذہب (خود ساختہ) خوف کا پیدا کردہ تھا، اس وقت انسان، حوادث کے اسباب و علل سے بھی واقف نہ تھا، فطرت کے مظاہر، ہر جگہ، خدا کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ ۱؎

ایک اور مقام پر، وہ اس سے بھی زیادہ تفصیل سے لکھتے ہیں کہ خدا کا تصوّر انسانوں میں کیسے پیدا ہوا؟

جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا، سر پر آتش باری کرنے والا ایک عظیم اور مہیب گولہ، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، ادھر ادھر ساحل نا آشنا سمندر، اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں، یہاں وہاں کف بر دہان اور سیلاب در آغوش دریاؤں کی خوف سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدہے، کبھی بادل کی لرزہ خیز گرج، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدہام، اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سر و سامان تنہا ابن آدم، آپ سوچیے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق، اس کا ردعمل، اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا، کہ جو بلا سامنے آئے، یہ گڑگڑانا شروع کر دے، جہاں کوئی خطرہ آنکھ دکھائے، یہ اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے، اس طرح فطرت کی مختلف قوتیں، اس کا ''اِلٰہ'' اور یہ ان کا پرستار بن گیا، چاند، سورج، ستارے، گرج، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر، حتّٰی کہ وبائی امراض، سب دیوی دیوتا تصور کر لیے گئے، اور ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز، منت و سماجت اور مدح و ستائش سے انھیں خوش رکھنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا (اس ماحول میں) انسان کا اولین ردعمل، خارجی کائنات کے متعلق۔ رفتہ رفتہ اسی ردعمل نے مذہب کی شکل اختیار کر لی، اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ یا تصور، مذہب کی شکل اختیار کر لے تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں، اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی، چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب، کائنات کے متعلق، انسان کے اس اولین ردعمل کے مظاہر ہیں۔ ۲؎

''مفکرِ قرآن'' کا قطعی خلافِ قرآن فلسفہ

''مفکرِ قرآن'' کا یہ اقتباس، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتداء، توحید سے نہیں بلکہ شرک سے کی تھی، یہ نظریہ دراصل، دین بیزار، اسلام دشمن، توحید مخالف، دہریت پسند قوموں کا فلسفہ ہے، جسے انھوں نے ''خدا سے بیزار عقل'' کی کسوٹی پر پرکھ پر پیش کیا ہے اور ہمارے ''مفکرِ قرآن'' نے، اپنی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کی بناء پر، اسے من و عن قبول کر لیا ہے، حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے سفرِ حیات کی ابتداء، اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں، عقیدۂ توحید کی روشنی میں کی تھی، نہ کہ کفر و شرک کی ظلمت میں۔ انسان کو پیدا کرنے کے بعد، اس کی رہنمائی کرنا، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کے بکثرت مقامات پر، خدائے بزرگ و برتر کی اس ذمہ داری کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً

وَاِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (الیل - ۱۲) اور ہم پر ہی یہ لازم ہے کہ ہم رہنمائی کریں۔

۱؎ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۳ ۲؎ اسلام کیا ہے؟، صفحہ ۱۹۴

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (النحل-۹) اور راہِ راست دکھانا اللہ ہی کے ذمہ ہے جبکہ ٹیڑھے راستے بھی موجود ہیں۔

اس بناء پر، اللہ تعالیٰ نے، سب سے پہلا انسان، جو پیدا کیا تو اسے علمِ وحی سے نوازا، مرتبۂ نبوت عطا فرمایا، تا کہ وہ، علم کی روشنی میں، نہ کہ جہالت کی تاریکی میں، اپنے سفرِ حیات کا آغاز کرے۔

تنقید بر ''دلائلِ پرویز''

رہے ''مفکرِ قرآن'' کے وہ دلائل، جو انھوں نے ''خارجی کائنات کے متعلق، انسان کے اولین ردِّعمل'' کے ضمن میں پیش کیے ہیں تو وہ دراصل ''دلائل'' نہیں ہیں بلکہ دانشورانِ مغرب کی چھوڑی ہوئی وہ ہڈیاں ہیں، جنھیں منکرینِ حدیث، اپنے منہ سے اگل رہے ہیں، اور حیرت بالائے حیرت، یہ امر ہے کہ تہذیبِ مغرب کے سحر میں گرفتار، یہ غلام فطرت لوگ، اپنی اسلامی حس اور قوتِ تنقید کو سرے سے ہی کھو چکے ہیں، یہاں تک کہ مغرب سے جو کچھ بھی آتا ہے، اسے من وعن قبول کر لیا جاتا ہے، اس کی بہترین مثال، اسی زیرِ بحث معاملہ میں دیکھی جا سکتی ہے کہ انسانی دنیا میں خدا اور مذہب کے تصور کی پیدائش میں، کس طرح فلاسفۂ مغرب کی اندھی تقلید کی گئی ہے، اور ''خدا'' کو محض خوف کی ''پیداوار'' قرار دیا گیا ہے، نیز یہ کہ کاروانِ انسانیت کے سفر کا آغاز، علمِ وحی کی روشنی میں نہیں بلکہ جہل و بے خبری کی تاریکی میں ہوا تھا، اور نہیں معلوم کہ سفرِ ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کر ڈالنے کے بعد، اور مدت دراز کی ٹھوکریں کھانے کے بعد، اس کاروان کو توحید و اسلام کی روشنی دکھائی دی، یہ سب، دراصل، اسلامی فلسفۂ تاریخ سے قطعی جہالت و بے علمی کا نتیجہ ہے، اور ساتھ ہی فلسفۂ مغرب سے شدید فکری مرعوبیت اور ذہنی مغلوبیت کا بھی۔ بیدار مغز مسلم مفکرین نے، جنھیں کبھی تہذیبِ مغرب کی چمک دمک، متاثر نہ کر سکی، اپنی جاندار تنقید سے، مغربی فلسفہ کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے، ملاحظہ فرمائیے، درج ذیل، اقتباس۔ مولانا امین احسن اصلاحی (مرحوم) فرماتے ہیں:-

> یہ بات کہ مذہب کا آغاز، ان دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا ہے، اور یہی جذبہ، انسان کے جذبات میں اولین اور قدیم ترین ہے، بالکل بے سروپا ہے، انسانوں میں، جو خوف پایا جاتا ہے، اس کی اصل حقیقت، زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے، خوف کا تجزیہ کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے اس چیز کا، کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اس سے محروم ہو جانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو آپ کو حاصل بھی ہے اور عزیز بھی ہے۔ مثلاً انسان کو اپنی زندگی عزیز ہے، زندگی کا سروسامان عزیز ہے، اپنے بیوی بچے عزیز ہیں، اس لیے وہ ان چیزوں کی طرف سے اندیشہ میں ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں چھن نہ جائیں، دوسرے لفظوں میں، اس کے معنٰی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے، کسی نعمت کا شعور بھی لازمی ہوا، اور پھر اس کی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔
>
> اس نظریہ کی تائید، اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں، انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں، وہ دنیا کے عام واقعات میں سے نہیں، زلزلے روز نہیں آیا کرتے، آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں، وبائیں روز نہیں پھوٹتیں، اور طوفانوں کا شور بھی کوئی روز مرہ کا واقعہ نہیں، اس کے برعکس، تارے روز چمکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، چاند روز

چمکتا ہے اور اپنی روپہلی چاندنی کی چادر، روز دشت وجبل میں بچھاتا ہے، آسمان کی نیلگونی، ہر لحہ باصرہ نوازی کرتی ہے، ابرِکرم کی تردستیاں اور درختوں کی ثمر باریاں ہر موسم میں موجود رہتی ہیں، پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہرِ فطرت کی گاہ گاہ کی گھرکیاں اور دھمکیاں، تو انسان کو اس درجہ مرعوب کردیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعمِ غیب کی یہ ساری فیاضیاں بالکل بے اثر ہو کر رہ جائیں، اور انسان میں شکر وسپاس کا کوئی ولولہ پیدا نہ کریں۔ اس لیے انسان کے مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ انفس کی فطری راہ، یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے مشاہدہ سے، اس پر ایک منعمِ حقیقی کی شکر گزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا، اور پھر اس جذبہ کی تحریک سے، وہ اُس کی بندگی کی طرف مائل ہوا، گویا دین کا آغاز، توحید سے ہوا، اس میں کجی پیدا کرکے، شرک کی راہ، انسان نے بعد میں اختیار کی۔ [1]

ہمارے ''مفکرِ قرآن'' چونکہ ذہناً اور قلباً، فلسفۂ مغرب سے مرعوب ومسحور تھے، اس لیے وہ مقہور ومجبور تھے کہ اس سوال کے جواب میں کہ بنی نوعِ انسان میں، خدا کا تصور کیسے پیدا ہوا؟ وُہی فلسفہ اپنائیں، جس کی روشنی میں، اہلِ مغرب کے ہاں، انسان کا سفرِ حیات (توحید کی روشنی سے نہیں، بلکہ) شرک وکفر کی تاریکیوں میں شروع ہوا تھا، اور اسی فلسفۂ باطلہ کی لاج رکھتے ہوئے، انھوں نے، ہستی اول البشر اور ذاتِ ابوالبشر (حضرت آدم علیہ السلام) کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کردیا، یہ طرزِ عمل خود اس حقیقت کو بے نقاب کردیتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کس طرح، قرآن کا نام لے کر، فکرِ فرنگ اور فلسفۂ مغرب کی پیروی کیا کرتے تھے۔

عمر بھر کے مطالعۂ قرآن کے بعد بھی، قرآن سے بے خبری

''مفکرِ قرآن'' اپنی ستائش آپ کرتے ہوئے، اکثر اپنی عمر بھر کی قرآنی تحقیق ومطالعہ کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تے، مثلاً

میں، اے برادرانِ گرامی قدر! قرآن کریم کا طالب علم ہوں، میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ، اس کتاب عظیم کی روشنی میں، اپنی بصیرت کے مطابق، اسلام کے بنیادی تصورات کا مفہوم متعین کرنے میں صرف کیا ہے اور میری اس کوشش کا ماحصل، میری تصانیف کے اوراق میں محفوظ ہے، بالخصوص لغات القرآن میں۔ [2]

مہ وسال کے شمار سے، میں ۹، جولائی ۱۹۷۸ء کو اپنی عمرِ رواں کے پچھتر (۷۵) سال پورے کر رہا ہوں، یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں تھا جس کا خصوصیت کے ساتھ، طلوعِ اسلام کے صفحات میں ذکر کیا جاتا، قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں پچاس سال پورے کر رہا ہوں، عام اصطلاح میں، اسے گولڈن جوبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے، میرے نزدیک یہ پچاس سالہ'' جوبلی'' دنیا کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور اس کی یاد سب سے زیادہ وجۂ نشاطِ روح ہے اور نشاط وانبساط کے یہی وہ احساسات ہیں جن میں اپنے بے شمار دیدہ اور نادیدہ احباء ورفقاء اور متفقین کو شریک کرنے کے لیے میں نے اس کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے، میں جب ساحلِ عمر کے ریگِ رواں پر ان پچاس سالہ نقوش کو مرتسم دیکھتا ہوں تو حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے مجھ پر ایک عجیب والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے، مسرت اس احساس سے کہ میں نے زندگی میں، جو مشن اپنے سامنے رکھا تھا، اس میں مجھے اس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس سے میرا سرِ نیاز، اس بارگاہ کے عتبۂ

[1] فلسفے کے بنیادی مسائل (قرآن حکیم کی روشنی میں)، صفحہ ۳۵ [2] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۷

عالیہ پر بیساختہ جھک جاتا ہے، جس کی عطا کردہ رہنمائی کے بغیر، اس کامیابی کا عشرِعشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اور حیرت اس پر کہ تمام دنیاوی علائق کے باوجود، (جن میں کم وبیش تیس سال ملازمت کے بھی شامل ہیں) میں نے، انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں تن تنہا یہ طویل مسافت کیسے طے کر لی؟ ۱

یہ کچھ میں نے کیسے کر لیا؟ سچ پوچھئے تو منطقی توجیہات سے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب میں خود بھی نہیں دے سکتا، میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بے صوت، ان دیکھی صدا مجھے بلاتی گئی اور میں، ایں و آں سے بیگانہ، والہانہ طور پر، اس کی طرف بڑھتا گیا، اس میں تھکنا تو ایک طرف، میں کبھی ستانے کے لیے بھی نہیں رکا۔ بجز ان لمحات کے، جن میں، میں (علالت وغیرہ کی وجہ سے) بالکل معذور ہی نہ ہو گیا ہوں، میں نے اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے وقف رکھا۔ ۲

بلاشک وشبہ، ''مفکرِ قرآن'' نے قرآنی مطالعہ وتحقیق میں پچاس سال صرف کر ڈالے، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ وہ لغت ہائے حجازی کے قارون تو بن گئے، لیکن قرآن کی روح، ان پر بے نقاب نہ ہو سکی، صرف اس لیے کہ ان کی آنکھوں پر ایک مخصوص رنگ کی عینک چڑھی ہوئی تھی، اور دورانِ مطالعہ انھیں ہر چیز، اسی عینک ہی کے رنگ میں دکھائی دیتی رہی اور قرآن کریم کی وہ واضح آیات، جو فکرِ مغرب کی تردید کرتے ہوئے، یہ اعلان کرتی ہیں کہ کاروانِ انسانیت نے اپنا سفر، کفر وشرک اور جہالت وبے علمی کی تاریکیوں میں نہیں بلکہ عقیدہ توحید اور علمِ وحی کی روشنی میں، شروع کیا تھا، ان کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہیں، صرف دو آیات فی الحال ملاحظہ فرمائیے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس-۱۹) اور لوگ تو ایک ہی امت تھے پھر انھوں نے اختلاف کیا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (البقرہ-۲۱۳) (ابتداء میں) سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے، (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو مبشر اور مُنذر تھے۔

یہ دونوں آیات، اُس فکرِ پرویز کی تردید کرتی ہیں جو انھوں نے ''مفکرِ قرآن'' کی حیثیت سے، مغرب سے اپنی ذہنی مرعوبیت کے باعث اپنا رکھا تھا، پہلی آیت کے تحت، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں۔

ضمناً، اس سے جدید فلسفیوں کے اس نظریہ کی بھی تردید ہو گئی کہ انسان نے دین کا آغاز، شرک سے کیا، پھر درجہ بدرجہ ارتقاء کرتے ہوئے، توحید تک پہنچا، قرآن اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ خدا نے شروع ہی سے انسان کو توحید کی تعلیم دی، لیکن گمراہوں نے اس میں اختلاف پیدا کر کے فتنے کھڑے کر دیئے، ہم نے فلسفۂ جدید کے اس باطل نظریہ کی تردید، اپنی کتاب ''حقیقتِ توحید'' میں تفصیل سے کی ہے۔ ۳

اور دوسری آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں۔

آیت نے ایک بڑی گرہ کھول دی، فرنگی ''محققین'' حسبِ معمول، مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے، اور ان میں سے اکثر یہی کہے گئے کہ انسان کا ابتدائی مذہب شرک یا تعدد آلہہ تھا، شروع شروع میں، وہ ایک ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا، اور عقیدۂ توحید تک نسلِ انسانی، بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد، اور عقلی اور دماغی ارتقاء کے بڑے بڑے طویل سفر کے بعد پہنچی ہے، قرآن مجید نے اس

۱ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۶ ۲ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۷ ۳ تدبرِ قرآن، جلد ۴، صفحہ ۳۵

خرافی نظریہ کو ٹھکرا کر صاف اعلان کر دیا کہ نسل انسانی، آغاز فطرت میں، دینی حیثیت سے ایک اور واحد تھی، اس میں ''مذہب'' و ''ادیان'' کے یہ تفرقے کچھ بھی نہ تھے، اُمَّةً وَّاحِدَ ۃ میں، جس وحدت کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ اس سے دینی واعتقادی وحدت ہی مراد ہے، کانوا علی شریعة من الحق (ابن جریر-عن ابن عباس) انهم کانوا علی دین واحد وهو الایمان والحق هذا قول اکثر المُحققین (کبیر)۔صدیوں کی الٹ پھیر، اور قیل وقال کے بعد، اب آخری فیصلہ بڑے بڑے ماہرینِ اثریات، انسانیات واجتماعیات کا (سر چارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن، پروفیسر شمڈٹ کا) یہی ہے کہ انسان کا اولین دین، دینِ توحید تھا۔ [1]

''مفکّرِ قرآن'' کی اندھی تقلیدِ مغرب

لیجئے، اب تو مغربی مفکرین بھی، اپنی تحقیقات کے بعد، اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ انسان کا اولین دین، دینِ توحید تھا، لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب ''ماڈرن'' ہوکر بھی، ابھی تک اس مسئلہ میں ''قدامت پرستی'' پر ڈٹے ہوئے ہیں، دراصل ''مفکرِ قرآن'' صاحب، یہاں کے اس جدید طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ذہنوں پر، مغرب کی اندھی پیروی کے باعث، ایسا جمود و تعطل طاری ہو گیا ہے کہ اگر وہاں سے کوئی غلط بات بھی صادر ہو جائے تو اسے ''وحی'' قرار دیکر ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا ہے، اور مسائلِ حیات کے حل کے لیے پوری مقلدانہ سعادتمندی کے ساتھ، اُن ہی نسخوں کو آزما ڈالا جاتا ہے، جو دراصل یہاں کے لیے بنائے ہی نہیں گئے تھے، اہلِ مغرب، دورِ حاضر کی غالب تہذیب کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے، اپنے مجوزہ نسخوں کو مجتہدانہ بصیرت سے برتتے ہیں، اور حسبِ ضرورت، ان میں ترمیم بھی کر لیتے ہیں، لیکن یہاں کے مقلد، تو، ایسے کورچشم واقع ہوئے ہیں کہ اپنے وطن، ماحول، حالات الغرض، ہر چیز سے آنکھیں بند کرتے ہوئے، مریض کی آخری ہچکی تک وہی نسخہ استعمال کرتے رہیں گے الّا یہ کہ خود وہیں سے ترمیم کی کوئی اطلاع آ جائے، لیکن بعض ضدی قسم کے عطائیوں کا تو یہ حال ہے کہ جس غلط بات کو ایک مرتبہ تقلیدِ یورپ میں اختیار کر لیا ہو، اسے پھر دانتوں سے پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں، بعد ازیں، اب اگر وہاں کے مفکرین کی تحقیقات میں بھی وہ غلط قرار دی گئی تو بھی یہاں کے مقلدین، اس کی تردید و تکذیب پر آمادہ نہیں ہوتے۔فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ

اب یہاں دیکھئے، مغرب کے مفکرین مثلاً سر چارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن، پروفیسر شمڈٹ وغیرہ، اپنی جدید تحقیقات کے باعث، اپنے سابقہ نظریئے کو ترک کر کے، اس تحقیق و انکشاف پر متفق ہو رہے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کا آغاز، کفر وشرک کی ظلمتوں اور جہالت و بے خبری کی تاریکیوں میں نہیں کیا تھا، بلکہ عقیدۂ توحید اور علمِ وحی کی روشنی میں کیا تھا، لیکن ہمارے ہاں تجدد پسند دانشور، ابھی تک مغرب کی اس پرانی تحقیق پر جمے ہوئے ہیں، جو صریح طور پر خلافِ قرآن ہے۔

معاشی میدان میں ''اشتراکیت'' کو تحقیق جدید پا کر، ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، لیکن یہ خلافِ فطرت نظام، اپنی پون صدی

---

[1] تفسیر قرآن (تفسیر ماجدی)، صفحہ ۸۳، حاشیہ ۲۷۷، (سورۃ البقرہ)

بھی پوری نہ کر پایا کہ اس کی فلک بوس عمارت، دھڑام سے پیوند خاک ہوگئی، ہمارے ''مفکر قرآن'' بھی اشتراکی نظام سے خوب متاثر بلکہ مرعوب ہوئے، انھوں نے اشتراکیت کا پورا معاشی نظام لے کر، اس پر ''نظام ربوبیت'' کا لیبل چپکا دیا، اور پھر مطمئن ہوگئے، کہ ''رام داس'' عبداللہ بن گیا ہے، اب اشتراکیت اور اس کا فلسفہ، خود ماسکو میں اپنے حامی نہیں پا رہا ہے، لیکن ہمارے ہاں کے سعادتمند مقلدینِ اشتراکیت، اسے اب بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اور اس فریبِ نفس میں مبتلا ہیں کہ لیبل بدل ڈالنے سے گویا اس کی حقیقت و ماہیت بھی بدل جائے گی۔

اس سے آگے بڑھ کر، تقلیدِ اعمیٰ کی اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔

پھر لطف کی بات یہ کہ مغرب کی پیروی میں، یہ لوگ، جس گمراہی کو بھی اختیار کریں گے، قرآن ہی سے ''برآمد'' کر کے اختیار کریں گے، گویا قرآن سے انھیں ایسی محبت ہے کہ اس کا ''ساتھ'' نہیں چھوڑ سکتے، مغربی آقاؤں کی پیروی میں، یہ لوگ، جس گڑھے میں بھی لڑھکیں گے، قرآن کو بھی اپنے ساتھ ہی لڑھکائیں گے۔ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا

ہوئے کس درجہ فقیہان حرم ، بے توفیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں

الغرض، قرآنی تصریحات، اور دورِ حاضر کے علمائے مغرب کی جدید تحقیقات، دونوں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ حیاتِ انسانی نے اپنے سفر کا آغاز، جہالت سے نہیں بلکہ علم کے ساتھ کیا تھا، دینِ شرک یا مسلکِ کفر سے نہیں بلکہ دینِ توحید سے کیا تھا، ظن و تخمین سے نہیں، بلکہ علمِ وحی سے کیا تھا۔

(ب) اللہ تعالیٰ کی متشابہ صفات کا مسئلہ

قرآنِ کریم میں ایسی بہت سی آیات ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کرتے ہوئے، ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو قرآن ہی میں انسانوں کی صفات پر بھی اطلاق پذیر ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا سمیع و بصیر ہونا، اس کا علم و قدرت رکھنا یا اس طرح کی دوسری صفات۔ بعض لوگوں نے اس سے تشبیہ کا عقیدہ پیدا کرتے ہوئے، خدا کو بندوں کے مشابہ قرار دیدیا اور فکری گمراہی میں پڑ گئے، حالانکہ خدا اور بندے کے لیے ایسی صفات، بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں، کسی مخلوق کو سمیع و بصیر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں، اب یہاں دو چیزیں الگ الگ اپنا وجود رکھتی ہیں، ایک تو وہ آلہ، جو سننے اور دیکھنے کا مبدأ اور ذریعہ ہے یعنی کان اور آنکھ۔ دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض و غایت، یعنی وہ علم جو آنکھ سے دیکھنے اور کان سے سننے سے حاصل ہوتا ہے، پس جب مخلوق کو سمیع و بصیر کہا جائے گا تو اس کے حق میں مبدأ اور غایت یا ذریعہ اور نتیجہ، دونوں چیزیں معتبر ہوں گی، جن کی کیفیات، ہم کو معلوم ہیں، لیکن یہی الفاظ، جب اللہ عز و جل کے لیے استعمال کیے جائیں گے تو یقیناً اس سے وہ مبادی اور کیفیاتِ جسمانیہ نہیں مراد لیے جاسکتے جو مخلوق کے خواص میں داخل ہیں اور جن سے جناب باری

تعالیٰ قطعاً منزہ ہیں۔ البتہ یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ سمع و بصر کا مبدأ، اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس میں بدرجہ اتم موجود ہے اور اسی کا نتیجہ یعنی وہ علم، جو رؤیت اور سماعت سے حاصل ہوتا ہے، اسے بدرجۂ کمال حاصل ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ مبدأ کیسا ہے؟ اور دیکھنے اور سننے کی کیا کیفیت ہے؟ تو ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب میں بجز اس کے، اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کا دیکھنا اور سننا، مخلوق کی طرح نہیں، اس لیے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ - ۱۱) ''کوئی چیز بھی کائنات میں، اس کے مشابہ نہیں ہے''۔ غرضیکہ، اسی طرح اس کی تمام صفات کو سمجھنا چاہیے، کہ صفت، باعتبار اپنے اصل مبدأ و غایت کے، تو، ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی جا سکتی اور نہ کسی آسمانی شریعت نے، کبھی انسان کو اس امر پر مجبور کیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ان حقائق میں غور و خوض کر کے، جو اس کی عقل و ادراک کی دسترس سے باہر ہیں، بیکار اپنے عقل و دماغ کو پریشان کرے۔

رہیں، وہ آیات، جو اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات کا اظہار کرتی ہیں جن کا پرتو مخلوق میں بھی پایا جاتا ہے، تو وہ درجِ ذیل ہیں، سب سے پہلے وہ آیات ملاحظہ فرمائیے جن میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک جگہ مستوی ہونے کا ذکر کیا ہے۔

۱- اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰہٰ-۵) اور رحمان عرش پر براجمان ہوا۔

۲- ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِى السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ (الملک-۱۶) کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تمہیں زمین میں دھنسا دے۔

۳- اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِى السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا (الملک-۱۷) کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے؟

پہلی آیت میں، جس عرش پر، اللہ تعالیٰ کے مستوی ہونے کا ذکر ہے، دوسرے مقام پر، اسی عرش کا فرشتوں سے اٹھایا جانا بھی مذکور ہے۔

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (الحاقۃ-۱۷) اور آٹھ فرشتے، اس روز، تیرے رب کا عرش، اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس کے بعد، ان آیات کو ملاحظہ فرمائیے، جن میں اللہ تعالیٰ کے اعضاء و جوارح کا ذکر ہے۔

۱ - يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح-۱۰) اللہ کا ہاتھ، ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

۲- بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ (المائدہ-۶۴) نہیں! بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔

۳- اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا (یٰسین-۷۱) ہم نے اپنے دستِ عمل سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ایک ہاتھ کا، دوسری میں دو ہاتھوں کا، اور تیسری میں متعدد ہاتھوں کا ذکر ہے۔

۴- كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص-۸۸) اس کے چہرہ (یعنی ذات) کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔

۵- فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطّور-۴۸) بیشک تم (اے پیغمبر) ہماری نگاہوں میں ہو۔

ان دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کے چہرے اور آنکھوں کا ذکر ہے۔ اب ان آیات کو ملاحظہ فرمائیے جن میں وہ صفات مذکور ہیں جو مخلوق کے لیے بھی مذکور ہیں۔

۶- وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ (الفرقان-۵۸) اور تو (اُس) زندہ پر بھروسہ رکھ۔

۷- اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (لقمان-۲۸) بیشک اللہ تعالیٰ، سننے اور دیکھنے والا ہے۔

۸- اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ (النحل-۷۰) بیشک اللہ تعالیٰ، صاحبِ علم اور قدرت والا ہے۔

بلاشبہ، ان آیات میں، حیات و سماعت، بصر، علم، قدرت وغیرہ صفات کا اثبات پایا جاتا ہے، اور حیات سے مراد، قطعاً وہ چیز نہیں جو ہمارے اجسام و ابدان میں عارض پائی جاتی ہے، اور نہ ہی سمع و بصر سے مراد وہ اعراض ہیں جو ہمارے اعضاء و جوارح سے وابستہ ہیں، لہٰذا، اللہ تعالیٰ کی حیات، علم اور دیگر صفات، اس طرح کے اعراض نہیں ہیں جس طرح کے مخلوق کے حق میں پائے جاتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حق میں، یہ صفات، ایسی ہیں جیسی کہ اس کی ہستی کے شایانِ شان ہیں، نہ کہ ایسی صفات، جو مخلوق کے شایانِ شان ہیں۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیات تو قرآن و سنت سے معلوم اور ثابت ہے، لیکن اس کی کنہ اور کیفیت مجہول ہے، قرآن سے خالق ارض و سما کی صفت علم بھی معلوم ہے مگر بغیر اس کے کہ اس کی تفصیلی کیفیت ہمیں معلوم ہو، اسی طرح، خدائے قدوس کا سمیع و بصیر ہونا، تو از روئے قرآن، معلوم و ثابت ہے لیکن یہ سب کچھ اس طرح کے اعراض نہیں ہیں جیسا کہ مخلوق کے حق میں موجود ہیں بلکہ یہ اپنی کنہ و حقیقت اور کیفیت و حالت میں ایسی ہیں جیسی کہ اس کی شانِ الوہیت کے لائق ہیں۔

استواء علی العرش اور پرویز صاحب

اللہ تعالیٰ کے مستوی علی العرش ہونے کی آیات، پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ پرویز صاحب، قرآنی الفاظ کے مفہوم سے تجاوز کرتے ہیں، اور ترجمۂ آیات میں، بین القوسین، اضافی اور الحاقی الفاظ کے ذریعہ سے، اصل مفہوم سے اعراض کرتے ہیں، چنانچہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا ترجمہ، بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

اور وہ اپنے تخت (جہانداری) پر متمکن ہوا۔ [۱]

اور وہ اپنے تختِ (جہانبانی) پر متمکن ہو گیا۔ [۲]

اور وہ اپنے تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا۔ [۳]

ان الفاظ کا حقیقی معنیٰ یہی ہے کہ "وہ تخت پر متمکن ہو گیا"۔ ترجمہ میں "جہانداری"، "جہاں بانی" اور "حکومت" کے الفاظ، خود ساختہ ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر قرار پکڑنے کے مفہوم سے انحراف کیا جا سکے، حالانکہ لغت کی رو سے بھی "اِسْتَوَاءٌ عَلٰى شَيْءٍ" کا معنیٰ "کسی چیز پر جم کر بیٹھنا، متمکن ہونا، یا براجمان ہونا" ہی مذکور ہے، خود پرویز صاحب کو بھی اس

---

[۱] + [۲] من و یزدان، صفحہ ۲۸۲ [۳] من و یزدان، صفحہ ۲۸۳

کا اعتراف ہے۔

اِسْتَوىٰ کا معنیٰ ہیں محکم اور پائیدار طریقہ پر جم کر بیٹھنا۔ حضرت نوحؑ کے قصہ میں ہے فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (۲۸/۲۳) ''سو جس وقت تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جائیں (اسْتَوَيْتَ) تو کہو کہ سب حمد و ستائش اللہ کے لیے ہے۔

اور جب وہ کشتی، اس طوفان بلا خیز سے بچ کر، جودی پہاڑ پر جا ٹکی، تو اس کے متعلق کہا وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ (۱۱/۴۴) سواری کی پیٹھ پر جس طرح جم کر بیٹھا جاتا ہے، اس کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے لِتَسْتَوُا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ (۱۳/۴۳) ''تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر بیٹھ جاؤ'' [1]

ٹھیک اسی طرح ''اسْتَوىٰ عَلَى الْعَرْشِ'' کا معنیٰ بھی یہی ہے کہ ''اللہ نے عرش پر قرار پکڑا'' یا ''عرش پر متمکن ہوا'' لیکن پرویز صاحب، اس مفہوم سے اعراض و انحراف کرتے ہیں، کیوں؟ صرف اس لیے کہ اگر، آیت کا سیدھا سادا ترجمہ (بغیر کسی الحاقی اور اضافی لفظ کے) کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ کا کسی خاص مقام پر ہونا، لازم آتا ہے، جو انھیں ناقابل قبول ہے۔

انحراف کی وجہ

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> قرآن نے ان امور کو تشبیہاً بیان کیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی مادی تخت کا متعین کرنا، اسے کسی خاص مقام پر نصب کرنا، اور اس کے سچ مچ اٹھانے کے لیے ملائکہ کا مقرر کرنا، ذاتِ خداوندی کے متعلق غلط اندازہ لگانا ہے، اس کی ذات، جہت و سمت اور مکان کے تعینات سے بلند و بالا تر ہے۔ ....
>
> لہٰذا، ذاتِ خداوندی کے لیے جہت و مکان کا تعین، اس کے متعلق غلط نگہی پر مبنی ہے، اس کی تو شان یہ ہے کہ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے)۔ [2]

یقیناً قرآن نے، اللہ تعالیٰ کے لیے ''عرش'' کا ذکر کیا ہے، لیکن نہ تو خود قرآن نے، اور نہ ہی رسولِ خدا نے، اور نہ ہی کسی عالم دین نے ''مادی عرش'' کا ذکر کیا ہے، جس کی ''مفکر قرآن'' صاحب تردید فرما رہے ہیں، اور جہاں تک، اللہ تعالیٰ کے لیے، جہت و سمت کے تقرر کا سوال ہے، وہ کوئی بھی نہیں کرتا، قرآنی الفاظ مَنْ فِي السَّمَآءِ سے یقیناً، اللہ تعالیٰ کا آسمان پر ہونا معلوم اور ثابت ہوتا ہے، لیکن آسمان، بیضوی شکل کی زمین کے ہر طرف موجود ہے، اگر آسمان کی کوئی جہت اور سمت متعین ہو سکتی ہے، تو پھر اللہ کی بھی ہو سکتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا آسمان میں ہونا، ایک ایسی حقیقت ہے جسے قرآن، بتکرار و اعادہ بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عرش کا پوری کائنات پر وسیع ہونا بھی، قرآن سے واضح ہے، اور یہ بات، انسان کے وجدان و فطرت میں داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ، آسمان میں ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنے رب سے التجاء و فریاد کرتے ہوئے، بندے کے ہاتھ اور نگاہیں، بیساختہ آسمان کی طرف اٹھ جاتے ہیں، خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں، تحویل کعبہ کے ضمن میں، قرآن بیان کرتا ہے کہ

---

[1] من و یزداں، صفحہ ۲۸۱ [2] من و یزداں، صفحہ ۲۸۵

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ-۱۴۴) ہم آپؐ کے چہرے کا آسمان کی طرف بار بار پلٹنا، خوب دیکھ رہے ہیں۔

غلط فہمی کی بنیادی وجہ اور اس کا ازالہ

''مفکرِ قرآن'' اور ان کے دوسرے ہم فکر لوگ، استوائے باری تعالیٰ کے بارے میں، جس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ، اللہ تعالیٰ کی ذات کو، انسانی جسم و بدن پر اور اس کے اعضاء کو بشری جوارح پر قیاس کرتے ہیں اور پھر جس طرح بشری وجود، اپنے مقام و محل میں گھرا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح وہ خدا کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی کسی خاص جہت وسمت اور مکان و محل میں محدود ہے، اور عرش پر، جو بہر حال ایک محدود جگہ تصور کیا جاتا ہے، اسے براجمان سمجھا جاتا ہے، حالانکہ آسمان میں اس کے ہونے اور پھر عرش پر اس کے متمکن ہونے کی حقیقت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ، یہ حقیقت بھی اپنے مقام پر قائم و برقرار ہے کہ اس کے استواء کی کیفیت قطعی طور پر غیر معلوم ہے۔

استواء سے متعلق دو بنیادی باتیں

اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں، ''استواء علی العرش'' جو کہا جاتا ہے اس کے متعلق، دو باتیں بالکل الگ الگ ہیں، جن میں خلط مبحث، الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔

۱ --- استواء کا مبدأ اور ظاہری شکل، یعنی تخت پر قرار پکڑنا اور متمکن ہونا۔

۲ --- ''استواء علی العرش'' کی حقیقت اور غرض و غایت یعنی پورے اقتدار و تسلط اور نفوذ و تصرف کی قدرت کا حامل ہونا۔

پرویز صاحب اور ان کے ہم فکر ساتھی، ''استواء علی العرش'' جیسی آیات میں، مبدأ اور ظاہری شکل کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں، اور دوسری بات کو جو غرض و غایت کی حیثیت رکھتی ہے، نمایاں اور اجاگر کر کے پیش کر دیتے ہیں حالانکہ قرآنِ مجید، پہلی بات کو (یعنی عرش پر قرار و تمکن کو) الگ پیش کرتا ہے اور دوسری کو (یعنی اللہ تعالیٰ کے اقتدار و تصرف کی قدرت کو) الگ پیش کرتا ہے، صرف ایک آیت ملاحظہ فرمائیے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِىْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرَاتٍۢ بِأَمْرِهٖ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف-۵۴) درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت پر متمکن ہوا، وہ رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن، رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے، اس نے سورج، چاند اور تارے پیدا کیے، جو اس کے تابع فرمان ہیں۔ اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے، بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔

اس آیت میں (اور اس طرح کی دیگر آیات میں) ''استواء علی العرش'' کو الگ طور پر، محض مبدأ اور ظاہری صورت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور اس کے بعد کے حصۂ آیت کو، غایت و مقصد کے پہلو سے، الگ پیش کیا گیا ہے، تاکہ کائنات

میں، اللہ تعالیٰ کے اختیار واقتدار، اور نفوذ وتصرف کا اثبات کیا جائے، اب دونوں جداگانہ امور کو شئے واحد قرار دیکر یہ کہنا کہ

۱ - اِسْتَوىٰ عَلَى الْعَرْشِ کے معنی ہوں گے نظم ونسق، عالم پر تسلط واقتدار رکھنا۔ [۱]

۲ - اِسْتَوىٰ عَلَى الْعَرْشِ اس تدبیر امور کے لیے آیا ہے جس سے یہ نظام عالم قائم ہوتا ہے اور اس کے حکم کے ماتحت مظاہر فطرت، اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں منہمک ہیں۔ [۲]

ایک ایسا خلط مبحث ہے جس میں اگر ایک حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے، تو دوسری کا انکار بھی پایا جاتا ہے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرہ-۸۵) تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کیساتھ کفر کرتے ہو، پھر تم میں جو کوئی ایسا کرے تو اس کی سزا، دنیا کی رسوائی کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے اور آخرت میں ایسے لوگ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے۔

(ج) لفظ ''اللہ'' کے انوکھے مفاہیم اور نرالے معانی

قرآن کریم، اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے جو خالق، قادر، مالک، رازق، پروردگار، ہادی، شارع، محی، ممیت، محاسب، اور مجازی وغیرہ ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے اس لفظ کو، ایسے معانی میں استعمال کیا ہے، جو عرف عام میں اور کتب لغت میں بھی یکسر معدوم ہیں، اور بہر حال، خالق کی بجائے مخلوق ہی پر اطلاق پذیر ہوتے ہیں چند معانی ومفاہیم ملاحظہ فرمایئے:

(الف) اللہ بمعنی نظام

قرآن کریم کی آیت وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۲/۲۶۷) کا ترجمہ، ہر عالم نے اس طرح کیا ہے کہ اللہ کا لفظ، ایک زندۂ جاوید ہستی کا تصور پیش کرتا ہے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، ان الفاظ کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں۔

> یاد رکھو! خدا کا نظام ایسا نہیں کہ وہ بھیک مانگتا پھرے، اور تم اس کی جھولی میں بچے کھچے ٹکڑے ڈال دو، وہ اس قسم کی خیرات سے بے نیاز اور ہر قسم کی ستائش کا سزاوار ہے۔ [۳]

اللہ بمعنی ''نظام'' کی دوسری مثال اس آیت میں پیش کی گئی ہے۔

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرہ-۱۳۷) ان کے مقابلہ میں اللہ تمھاری حمایت کے لیے کافی ہے وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

لیکن ''مفکر قرآن'' اس کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں۔

> ہمارے اس نظام میں، جس کی تم اطاعت کرتے ہو، اتنی قوت موجود ہے کہ وہ تمہیں ان کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رکھ سکے، اس لیے کہ یہ اُس خدا کا نظام ہے جو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ [۴]

---

[۱] من ویزدان، صفحہ ۲۸۲
[۲] من ویزدان، صفحہ ۲۸۳
[۳] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۰۶
[۴] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۹ تا ۵۰

اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے، ''مفکرِ قرآن'' نے ثنویت اور دوہرے معیار کو پیشِ نظر رکھا ہے، آیت کے پہلے ٹکڑے میں واقع لفظ ''اللہ'' کا ترجمہ و مفہوم ''نظام'' کیا ہے لیکن دوسرے حصۂ آیت میں، اللہ ہی کے لیے استعمال ہونے والی ضمیر هُوَ کو ہستیٔ خداوندی ہی کے معنوں میں لیا ہے، گویا ایک ہی ذاتِ باری تعالیٰ، ایک ہی آیت میں، الوہیت سے مُنفک بھی ہے اور غیر منفک بھی۔

اب تیسری آیت ملاحظہ فرمائیے۔

اَنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ-۱۱۵) اللہ بڑی وسعت والا ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

ان الفاظ کا مفہوم، ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

خدا کا نظام بڑی وسعتوں کا مالک اور سرتاپا علم و بصیرت پر مبنی ہے۔ ۱

قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر یہ الفاظ موجود ہیں۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران-۱۳۴) اور اللہ ایسے نیک لوگوں کو بہت پسند کرتا ہے۔

لیکن ''مفکرِ قرآن'' یہاں بھی ''اللہ'' کا مفہوم ''نظامِ خداوندی'' کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اور یہ روش، نظام خداوندی کے نزدیک، بڑی پسندیدہ ہے۔ ۲

یہاں ''محسنین'' کا مفہوم ''شخصیتوں'' کو نہیں بلکہ ان کی ''روش'' کو قرار دیا گیا ہے، رہا ''اللہ'' تو وہ تو پہلے ہی کسی ہستی اور ذات کا نام نہیں، بلکہ ''نظام'' کا نام ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت کا بھی ایسا ہی نرالا مفہوم پیش کیا گیا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ آل عمران-۱۳۲) اور تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔

اب پرویزی مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیے۔

خدا کے اس نظام کی اطاعت کرو جسے اس کے رسول نے متشکل کیا ہے۔ ۳

یہاں، فعل امر وَاَطِيْعُوا کے دو مفعول ہیں اللہ اور رسول جن کا مفاد یہ ہے کہ ''تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو'' لیکن ''مفکرِ قرآن'' نے لفظ ''اللہ'' کو ''نظام'' کا مفہوم دیدیا اور ''رسول'' کی اطاعت سے جان چھڑانے کے لیے، اسے اس نظام کا صورت گر بنا کر بطور فاعل پیش کر دیا حالانکہ آیت میں، وہ بطور مفعول ہی واقع ہوا ہے، اور ''وَاَطِيْعُوا'' کے فعل کے اسی طرح تابع ہے، جس طرح، لفظ ''اللہ'' اُس کے تابع ہے۔

(ب) اللہ بمعنی قانون

اللہ بمعنی نظام کے بعد، اب ان مثالوں کو ملاحظہ فرمائیے، جن میں، اللہ بمعنی قانون مذکور ہے۔

(۱) --- ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

---

۱ مفہوم القرآن، صفحہ ۴۱ ۲ مفہوم القرآن، صفحہ ۱۵۴ ۳ مفہوم القرآن، صفحہ ۱۵۳

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الانفال - ٦١) یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

اب اس کا یہ مفہوم دیکھئے جسے ''مفکر قرآن'' نے پیش کیا ہے۔

یہ اس خدا کا قانون ہے جو سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ [1]

اِنَّهٗ میں ہ کی ضمیرِ متصل اور اس کے بعد هُوَ کی ضمیرِ منفصل، دونوں ہی، اُس اللہ کی طرف لوٹتی ہیں، جو اِنَّهٗ سے متصل قبل، وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کی عبارت میں واقع ہے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' ان دونوں میں سے ایک ضمیر کو خواہ مخواہ، ''قانون'' کی طرف لوٹاتے ہیں۔

(۲) --- اس سے اگلی آیت کے الفاظ یہ ہیں۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (الانفال- ٦٢) اگر وہ تجھ سے دھوکہ کرنے کی نیت رکھتے ہوں تو تیرے لیے، اللہ کافی ہے۔

اسی آیت کا مفہوم، ان الفاظ میں، پیش کیا گیا ہے۔

اور اگر دشمن (اپنے آپ کو مائل بہ صلح ظاہر کر کے) تمہیں دھوکہ دینے کا ارادہ رکھتا ہو، تو (اے رسول!) تم گھبراؤ نہیں، تمھارے لیے خدا کا قانون کافی ہے۔ [2]

(۳) --- تھوڑا سا آگے چل کر، اسی سورت میں، یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

حَسْبُكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ (الانفال - ٦٢) اے نبی! تمھارے لیے اور تمھارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ ہی کافی ہے۔

اس آیت کا مفہوم، جسے ''مفکر قرآن'' نے پیش کیا ہے، ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

اے رسول! خدا کا یہ قانون، تیرے لیے بھی کافی ہے، اور اُن مؤمنین کی جماعت کے لیے بھی، (جو اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لیے) تیرا اتباع کرتی ہے۔ [3]

(۴) --- قرآن کے اس مختصر سے جملہ کو ملاحظہ فرمائیے۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (الانفال-٦٧) اور اللہ کے پیش نظر آخرت ہے۔

اس کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے۔

اور قانون خداوندی کی نگاہ مستقبل پر ہے۔ [4]

(۵) --- قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر یہ جملہ واقع ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (الانفال - ٤٧) جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ ان سب (اعمال) کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

لیکن ''مفکر قرآن'' کے ہاں ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے۔

لیکن خدا کا قانون، انھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا، وہ ان کے تمام اعمال کو محیط تھا۔ [5]

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۱۰ [2] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۱۰ [3] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۱۱

[4] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۱۲ [5] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۰۶

(ج) اللہ بمعنی قانونِ مکافاۃ

''مفکرِ قرآن'' نے، اللہ کا تیسرا معنی'' قانونِ مکافات'' کیا ہے، درج ذیل آیات میں، وہ یہی معنٰی کرتے ہیں۔

(۱) --- سورۃ المائدہ میں ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ اللہَ عَلِیْمٌ مبِذَاتِ الصُّدُوْرِ (المائدہ - ۷) بیشک اللہ، دلوں کے راز تک جانتا ہے۔

''مفکرِ قرآن'' ان الفاظ کا مفہوم، یوں پیش کرتے ہیں۔

خدا کا قانونِ مکافات، دل میں گذرنے والے خیالات تک کا بھی علم رکھتا ہے۔ ۱

(۲) --- ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے،

اِنَّ اللہَ خَبِیْرٌ م بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ - ۸) بے شک جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

لیکن'' مفکرِ قرآن'' کے نزدیک، ان آیات کا مفہوم یہ ہے۔

یادرکھو! اللہ کا قانونِ مکافات تمھارے اعمال سے باخبر ہے۔ ۲

(۳) --- قرآن میں ایک مقام پر، اللہ رب العزت کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ

وَکَانَ اللہُ عَزِیْزاً حَکِیْماً (النساء - ۱۶۵) اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔

لیکن'' مفکرِ قرآن'' انھی الفاظ کا مفہوم، یوں بیان کرتے ہیں۔

خدا کا قانونِ مکافات، جہاں اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے کہ اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا، وہ وہاں اسقدر پُر حکمت بھی ہے کہ یونہی اندھا دھند تباہیاں نہیں لے آتا۔ ۳

گویا خدا کا قانون، تباہی تو لاتا ہی ہے مگر'' یونہی اندھا دھند نہیں لاتا''۔

(۴) --- ارشادِ قرآن ہے کہ

وَکَانَ اللہُ شَاکِراً عَلِیْماً (النساء - ۱۴۷) اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔

مگر'' مفکرِ قرآن'' کی بصیرت، مفہومِ آیت کو ان الفاظ کا جامہ پہناتی ہے۔

خدا کا قانونِ مکافات، ہر ایک کے عمل سے واقف ہے اور اس کی کوششوں کے بھرپور نتائج دیتا ہے۔ ۴

(۵) --- صفاتِ خداوندی میں سے قرآن، ایک صفت کو بایں الفاظ پیش کرتا ہے۔

فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (النساء - ۱۳۵) (جان رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو اس کی خبر ہے۔

لیکن'' مفکرِ قرآن'' صاحب، اس آیت کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں۔

یادرکھو! اللہ کا قانونِ مکافات، تمھارے تمام اعمال (جذبات و رجحانات تک) سے اچھی طرح واقف ہے۔ ۵

---

۱ مفہوم القرآن، صفحہ ۲۴۲
۲ مفہوم القرآن، صفحہ ۲۴۲
۳ مفہوم القرآن، صفحہ ۲۳۲
۴ مفہوم القرآن، صفحہ ۲۲۶
۵ مفہوم القرآن، صفحہ ۲۲۲

(د) رب العالمین بمعنیٰ ”نظام ربوبیت“

صفاتِ باری تعالیٰ میں سے، قرآن نے ایک صفت رب العالمین ہونا بھی بیان کی ہے، اور قرآن کے متعدد مقامات پر اسے بیان کیا گیا ہے، مثلاً ایک مقام پر یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام-۷۱) اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمام جہانوں کے پروردگار کے مطیع فرمان رہیں۔

لیکن ہمارے ”مفکر قرآن“ اس آیت کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں۔

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اسی راستہ کو اختیار کریں اور خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ [۱]

(۲) --- سورہ یونس میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس-۱۰) ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہوگا کہ ”ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے“

اس آیت کا مفہوم ”مفکر قرآن“ کے نزدیک یہ ہے۔

اور ان کی اس دعوت کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس نظام ربوبیت کے عالمگیر نتائج کو دیکھ کر، ہر شخص پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظام، کس قدر مستحق حمد و ستائش ہے۔ [۲]

(۳) --- حضور اکرم ﷺ نے دوران دعوت و تبلیغ، یہ اعلان فرمایا تھا کہ

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء-۱۴۵، ۱۶۴) میرا اجر تو رب العالمین ہی کے ذمہ ہے (میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا)۔

لیکن ”مفکر قرآن“ آیت ۱۴۵ کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں۔

دیکھو! میں اس بات کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ، خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے ذمہ ہے۔ [۳]

اور آیت ۱۶۴ کا مفہوم، ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاملۂ معاوضہ، خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے ذمہ ہے۔ [۴]

سوال یہ ہے کہ جو لوگ ”خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت“ اور ”خدا کی ربوبیتِ عالمینی“ کے قیام سے پہلے ہی، دعوت حق دیتے ہوئے، دارِ فانی کو چھوڑ کر عالم باقی کو سدھار گئے، وہ بیچارے اپنے معاوضہ کو کس کے ذمہ ڈالیں گے؟

(۴) --- ایک اور مقام پر رب العالمین کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے۔

وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الزمر-۷۵) اور لوگوں کے درمیان، حق کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائے گا اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ، رب العالمین کے لیے۔

اسی آیت کا مفہوم ”مفکر قرآن“ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۳۰۳
[۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۴۶۰
[۳] مفہوم القرآن، صفحہ ۸۴۹
[۴] مفہوم القرآن، صفحہ ۸۵۱ تا صفحہ ۸۵۲

اس وقت، تمام انسانی امور کے فیصلے، حق کے ساتھ ہوں گے، اور خدا کی ربوبیتِ عالمینی، اس حُسن وخوبی سے آشکارا ہوگی کہ ہر ایک کی زبان، اس کی حمد وستائش میں، زمزمہ بار اور نغمہ سنج ہوگی۔ [1]

(۵) --- آخر میں سورۃ الصّافّات کی آخری آیت پیش کی جاتی ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (الصّافّات-۱۸۲) اور ساری تعریف، اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔

اسی آیت کا مفہوم، ''مفکرِ قرآن'' نے بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

اور ساری دنیا کس طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ خدا کا وہ نظام، جو تمام اقوامِ عالم کی نشوونما کا ضامن ہے، کس طرح، سرتاپا، سزاوارِ حمد وستائش ہے۔ [2]

ان نرالے معانی اور انوکھے مفاہیم پر سوچنے کی چند باتیں

ذرا غور فرمائیے کہ لفظ ''اللہ'' کس قدر عام فہم اور مشہور ومعروف ہے، اسے سمجھنے کے لیے کوئی ابہام یا پیچیدگی حائل نہیں ہوتی۔ نہ یہ کوئی ایسا کثیر المعانی لفظ ہے کہ اس میں اشتراکِ معانی اور تشابہِ مفاہیم کے باعث، کوئی اشتباہ لازم آجائے، نہ یہ کوئی استعاراتی اور تلمیحی کلمہ ہے، جس کا قطعی مفہوم پالینا مشکل ہو، ہر خاص وعام، خواندہ وناخواندہ اور کافر ومومن، یہ جانتا ہے کہ اللہ، اس ہستی کا ذاتی نام ہے جس نے یہ وسیع کائنات، اور اس میں واقع، ہر چیز کو، خلعتِ وجود بخشا ہے، لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' نے، اپنی تفکیر اور دانشوری کی بھینٹ چڑھا کر اسے، ایک چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے ایک نظام دیا ہے، مگر خدا کا یہ نظام، خود خدا نہیں ہے۔

یقیناً، خدا کی اطاعت کا واحد ذریعہ، اُس کے قانون، حکم اور رسول کی اطاعت ہے، لیکن نہ تو ''خدا کا قانون'' اِلٰہ ہے اور نہ ہی ''اس کا حکم'' خدا ہے، اور نہ ہی ''اس کا رسول''، خود اللہ ہے، حالانکہ رسول کی اطاعت، خود اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ مگر اس کے باوجود بھی، رسول اور اللہ میں وہی مغائرت پائی جاتی ہے، جو مخلوق اور خالق میں واقع ہے۔

لاریب، خداوند قدوس، بڑی وسعتوں کا مالک اور سراپا علم وبصیرت ہے، لیکن خدا کی ان صفات کو، خدا کے نظام کے ساتھ نتھی کر ڈالنا، اور پھر اس نظام ہی کو ''بڑی وسعتوں کا مالک اور سراپا علم وبصیرت'' قرار دینا، قطعی مہمل بات ہے۔

بلاشبہ، اللہ تعالیٰ نے قرآن کی صورت میں ایک دستور اور قانونِ حیات دیا ہے جس کے ایک لفظ کا انکار بھی کفر ہے۔ لیکن اس کے باوجود، خدا کے قانون اور دستور کو، خود خدا قرار نہیں دیا جاسکتا (خواہ وہ بقول پرویز، قانونِ ربوبیت ہی کیوں نہ ہو)، اللہ اور اس کے قانون کو شیئے واحد قرار دینا، کھلی کھلی تلبیس وتدلیس ہے۔

یقیناً، ہم سجدہ، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت ہی میں کرتے ہیں، اور صرف اُسے ہی سجدہ کرتے ہیں (نہ کہ اس کے حکم اور قانون کو)، لاریب، حکمِ خداوندی پر چلنا ہی اس کی عبادت وبندگی اور اطاعت وفرمانبرداری ہے، مگر معبود، اللہ رب العزت کی

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۰۸۷ [2] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۰۵۱

ذات ہی ہے، نہ کہ اس کا حکم یا قانون۔

بیشک، اللہ تعالیٰ، دلوں میں چھپی ہوئی نیتوں، خیالات، محرکات و مقاصد اور اغراض و غایات تک سے واقف ہے، لیکن خدا کی اس صفت (عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ) کو، خدا کی بجائے، اس کے "قانونِ مکافات" سے وابستہ کر دیا جائے تو یہ نہ صرف یہ کہ خلافِ حقیقت ہو گا بلکہ خود حقیقتِ نفس الامری کو بھی، اس تحریف کے ذریعہ، فصاحت و بلاغت کے بلند ترین معیار سے گرا کر، رکاکت کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دینے کے مترادف ہو گا۔ ذاتِ خداوندی، صاحب ارادہ و شعور، اور صاحب علم و خبر ہے، اس کا نظام یا قانون یا حکم، ذی شعور و ارادہ اور صاحب علم و خبر نہیں ہے، بلکہ قانون کی خوبی ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اندھا ہو، تاکہ وہ امیر و غریب، شاہ و گدا، آقا و غلام، اور شریف و وضیع میں فرق و امتیاز نہ کر سکے، اور سب کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ کر سکے۔

اور آخر میں رب العالمین کا معنیٰ "نظامِ ربوبیت" بیان کرنا، گویا جدت طرازی کی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر لینا ہے، علاوہ ازیں، اس معنی میں "جدت طرازی" اور "نرالا پن" دونوں ہی جمع ہو گئے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ (فرض کیجئے) کسی مقام پر "نظامِ ربوبیت" قائم ہو جاتا ہے، تو کیا اس نظام کے خاتمہ کا معنیٰ، خود "رب العالمین" کا خاتمہ ہو گا؟ کیا جب تک "نظامِ ربوبیت" کا وجود قائم نہ ہو، اس وقت تک "رب العالمین" کا وجود بھی معدومِ محض ہو گا؟ اور جونہی، جس مقام پر، "نظامِ ربوبیت" وجود پذیر ہو جائے، تو کیا اس کا معنیٰ، خود "رب العالمین" کا معرض وجود میں آ جانا ہو گا؟ اور پھر کیا "نظامِ ربوبیت" کے فناء کے گھاٹ اترتے ہی، معاذ اللہ، "رب العالمین" کا وجود بھی مٹ جائے گا؟ ان امور پر سرسری غور و فکر ہی "مفکرِ قرآن" کی الحاد فی الآیات کی عادتِ مالوفہ کو واضح کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص، اللہ کا مفہوم بدل کر، کچھ سے کچھ کر ڈالے، وہ قرآنی آیت کے ترجمہ و تفسیر، اور تشریح و توضیح میں کیا شگوفے نہیں چھوڑ سکتا اور کیا گل نہیں کھلا سکتا؟ اس قسم کی تفسیر، تو تفسیر بالرائے سے بھی گئی گزری ہے، جس "مفسر" کے ہاں، اللہ سے مراد خالقِ کائنات کی زندۂ جاوید ہستی نہ ہو، بلکہ اس کا قانون یا نظام ہو، اور رب العالمین سے مراد، جملہ مخلوقات اور ان کے جملہ افراد کی نشو و نما کا سامان فراہم کرنے والی، ذاتِ پروردگار نہ ہو، بلکہ محض عالمگیر نظامِ ربوبیت ہو، اور اللہ و رسول سے مراد، دو ہستیاں نہ ہوں، جس میں سے ایک خالق ارض و سماء اور دوسرا، اس کا ارسال کردہ نمایندہ مجاز ہو، بلکہ جب "اللہ اور رسول" کا لفظ اکٹھا بولا جائے، تو اللہ کی الوہیت ختم اور رسول کی رسالت معدوم، اور پھر اس عدم محض سے، ایک اور ہستی کا برآمد ہونا قرار پائے، جسے "مرکزِ ملت" کہا جاتا ہے، جنوں سے مراد، انسانوں کے علاوہ، کوئی ایسی مخلوق نہ ہو، جو تخلیقِ بشر سے قبل، آگ سے پیدا کی گئی ہو، بلکہ انسانوں ہی کا ایک وحشی اور جنگلی طبقہ مراد ہو، ملائکہ سے مراد، اپنا جداگانہ تشخص رکھنے والی کوئی مخلوق نہ ہو، بلکہ "افرادِ انسانی کے نفسیاتی محرکات ہی ہوں جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہوں"، اور شیطان سے مراد، جنوں میں سے کوئی سرکش و نافرمان فرد نہیں بلکہ انسان کے وہ "جذباتِ مفاد پرستی ہوں، جو اسے حق و صداقت کی راہ سے روکتے ہوں"، الغرض، ایسی تفسیر، جس میں قرآنی حقائق کو یکسر بدل دیا گیا ہو اور کتاب اللہ کو، فکرِ مغرب اور اشتراکیت کے سانچے میں ڈھال کر

پا ثر ند بنا دیا گیا ہو، اسے تفسیر بالرائے کا نام دیدیا جائے، تو ہمیں اندیشہ ہے کہ دنیا میں جو تفاسیر فی الواقع تفسیر بالرائے کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں سے کوئی تفسیر، اسے اپنی توہین سمجھ کر، ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ نہ دائر کردے۔

(۲) دوسرا عقیدہ: ایمان بالرسالت

ایمان باللہ کے بعد، اسلامی عقائد میں دوسرا بڑا عقیدہ، ایمان بالرسالت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شخص کو منصب رسالت ونبوت پر فائز کر کے، بنی نوعِ انسان کو، اس کے ذریعہ سے راہِ ہدایت دکھائی جائے، نہ ماننے والوں کو، ان کے انجامِ بد سے ڈرایا جائے اور تبلیغ رسالت کے ذریعہ سے، ان پر حجت تمام کردی جائے، نیز ماننے والوں کو، ذاتِ رسولؐ کی صورت میں، اسوۂ حسنہ پیش کر دیا جائے تاکہ وہ اس کی اقتداء وائتساء کرسکیں، الغرض، نبی و رسول کی مبلغانہ حیثیت، صرف کفار کے مقابلہ میں ہے، رہے اہل ایمان، تو ان کے لیے ہستیٔ رسولؐ، صرف مبلغ ہی نہیں، بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں بہترین نمونۂ پیروی ہے جس کی اطاعت وپیروی، ہر مسلمان پر لازم ہے، لیکن منکرینِ حدیث، اول تو، نبی کی اطاعت کا معنیٰ ''اطاعتِ قرآن'' کر ڈالتے ہیں، اور ثانیاً، اگر انھیں اطاعتِ رسول کو مجبوراً ماننا بھی پڑے، تو ان کے نزدیک، یہ اطاعت، مامور من اللہ رسول کی اطاعت نہیں بلکہ اس انسان کی اطاعت ہوتی ہے، جس کی حیثیتِ رسالت صرف پیغامِ قرآن پہنچا دینے کی حد تک محدود ہے، اور پھر وہ، اس کے بعد، دیگر اہل ایمان کی مانند محض ایک ایسا فرد مومن ہے، جس نے جو کچھ بھی کہا اور کیا ہے، وہ ، تاریخ کے ایک خاص دور میں پائے جانے والے انسان کی حیثیت سے کیا ہے (نہ کہ مامور من اللہ رسول یا نبی کی حیثیت سے)۔ پیغمبر خداؐ کے بارے میں منکرینِ حدیث کا یہ تصور ہی خلافِ قرآن ہے، اور ان کے فکر وعمل کی ساری کجی، اسی غلط تصور کی پیدا کردہ ہے، گزشتہ صفحات میں بھی، (اور آئندہ ابواب میں بھی) چونکہ اس تصور کی تردید وابطال میں بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس لیے یہاں مزید بحث کی ضرورت نہیں، البتہ، یہاں، پرویز صاحب کے اس نظریہ کا جائزہ لینا مناسب ہے جس کے تحت وہ، قرآن میں مذکور ''اللہ ورسول'' کے الفاظ سے ''مرکزِ ملت'' مراد لیتے ہیں۔

ایک ضمنی بحث - اللہ اور رسول، مرکزِ ملت

۱ - زید نے کھانا کھایا۔

۲ - زید نے سیب کھایا۔

دونوں جملوں کو بغور پڑھیے، پہلے جملے میں فعل ''خوردن'' کا مفعول ''کھانا'' ہے، اور دوسرے میں ''سیب''۔ اب کیا یہ درست ہوگا کہ ہم ''کھانا'' کا معنیٰ ''سیب'' کر ڈالیں؟ --- اور اگر نہیں، تو اُس شخص کا معاملہ کس قدر پُرفریب ہے جو ''کھانا'' کا معنیٰ ''سیب'' کر ڈالنے پر، محض اس لیے مصر ہے کہ ''کھانا'' کی جگہ، اگر ''سیب'' رکھ دیا جائے تو جملے میں کوئی ابتری واقع

نہیں ہوتی اور اس صورت میں بھی جملہ بامعنی ہی رہتا ہے، آپ جس قدر چاہیں، شور مچاتے رہیں کہ لغت کی کتابیں ''کھانا'' بمعنی سیب سے قطعاً خالی ہیں، مگر وہ صاحب یہی فرمائے جارہے ہیں کہ --- ''کتبِ لغت، اس سے خالی ہوں تو ہوں، مگر ''کھانا'' کی جگہ ''سیب'' رکھ دینے سے جملے کی ترتیب وساخت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لہٰذا ''کھانا'' کا لغوی مفہوم ''سیب'' نہ سہی، مگر مرادی مفہوم تو بہرحال ''سیب'' ہی ہے''۔

بالکل یہی حال، جناب پرویز صاحب نے قرآن پاک کی ان آیات کا کیا ہے، جن میں ''اللہ ورسول'' کی اطاعت کا ذکر ہے،

وہ ''اللہ ورسول'' سے مراد، ان دو ذوات کو نہیں لیتے، جن میں سے ایک ہستی فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے اور دوسری اس کی طرف سے مامور، وہ محترم شخصیت ہے کہ جس کی زندگی، اہل ایمان کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' ہے، بلکہ وہ ''اللہ اور رسول'' سے مراد ''مرکزِ نظامِ اسلامی'' یا ''مرکزِ ملت'' لیتے ہیں، چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

۱ ----- اللہ اور رسول سے مراد، مرکز نظام اسلامی ہے۔ [۱]

۲ ----- اللہ اور رسول سے مراد، اسلامی مملکت یا قرآنی نظام حکومت ہوتا ہے۔ [۲]

۳ ----- اللہ اور رسول سے مراد، وہ مرکز نظام اسلامی (Central Authority) ہے، جہاں قرآنی احکام نافذ ہوں، یہ حقیقت کہ اللہ ورسول سے مراد، مرکزِ ملت ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور شرح وبسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ [۳]

اپنے اس مزعومہ کی حمایت میں وہ بڑی بے تکلفی سے، ان آیات کو پیش کرتے چلے گئے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت مذکور ہے، پھر ''اللہ اور رسول'' کی جگہ ''مرکز ملت'' یا ''مرکز نظام اسلامی'' کے الفاظ، اُسی طرح نصب کر دیتے ہیں جس طرح ''کھانا'' کی جگہ ''سیب'' کو ثبت کر دیا جاتا ہے، اور پھر نتیجہ وہ نکالا جاتا ہے جو اقتباساتِ بالا میں ظاہر کیا گیا ہے۔

مزعومۂ پرویز میں اسقام وعلل

بعض لوگوں کی دماغی ساخت، کچھ اس قسم کی واقع ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملے میں نرالی اُپچ اختیار کرتے ہیں، اور اسے بزعم خویش ''بڑا علمی نکتہ'' قرار دیتے ہیں لیکن نہیں سمجھتے کہ ان کے یہ ''علمی نکات'' میزانِ علم میں کوئی وزن نہیں رکھتے، بلکہ الٹا عامۃ الناس کی گمراہی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ''خدا اور رسول'' کا معنیٰ ''مرکز ملت'' کرنا، ایسی ہی نکتہ آفرینی ہے، جس نے صرف عوام الناس ہی کو نہیں بلکہ بعض عربی زبان سے ناآشنا، پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ہم آغوشِ ضلالت کر دیا ہے، ''اللہ ورسول'' کی اس نئی نرالی اور انوکھی تفسیر میں، جو اسقام وعلل مضمر ہیں، ہم ذیل میں انھیں درج کیے دیتے ہیں تاکہ ہر شخص، اس تفسیر وتشریح کا وزن خود محسوس کر لے۔

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۳۴۰ [۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۶، صفحہ ۷۰ [۳] معراج انسانیت، صفحہ ۳۱۸

(۱) نظامِ اسلام کے قیام سے قبل ''خدا اور سول'' کی اطاعت؟

اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد، اگر نظامِ اسلامی کے مرکز کی اطاعت لی جائے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نظامِ اسلامی ہنوز قائم ہی نہ ہوا تھا، تو اُس وقت ''اللہ و رسول'' کی اطاعت کا کیا مفہوم تھا؟ مثلاً نبی اکرم ﷺ کی برپا کی ہوئی تحریک کے نتیجہ میں، اسلامی نظام کا قیام تو مدنی دور میں ہوا، خود پرویز صاحب رقمطراز ہیں۔

فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کی حقیقی حکومت کی بنیاد پڑتی ہے۔ [1]

ہجرت کے بعد، اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی، وہ آہستہ آہستہ مستحکم بھی ہوتی گئی .... حضور ﷺ کی مدنی زندگی کے ابتدائی آٹھ سال میں صورت یہ تھی کہ اسلامی مملکت قائم تھی۔ [2]

اب سوال یہ ہے کہ اگر ''نظامِ اسلامی'' یا ''اسلامی حکومت'' کا قیام، فتح مکہ کے بعد ہوتا ہے یا ہجرت کے فوراً بعد ہی ہو جاتا ہے تو آخر مکی دور میں نازل ہونے والی ان آیات کا کیا مفہوم ہوگا جن میں ''اللہ و رسول'' کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے؟ کیونکہ اطاعتِ ''خدا اور سول'' تو مکی دور میں بھی اہل ایمان پر لازم تھی، اور مدنی دور میں بھی! --- مدنی دور میں، اگر ''اللہ و رسول'' سے مراد ''نظامِ اسلامی'' لیا جائے تو پھر مکی دور میں اس نظام کا موجود نہ ہونا کیا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ اس وقت ''اللہ و رسول'' کا وجود ہی نہ تھا، اور لوگوں کو خواہ مخواہ ''اللہ و رسول'' کی نافرمانی پر جہنم کی وعید سنائی گئی؟ جیسا کہ مکی سورۃ الجن میں یہ کہا گیا ہے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (الجن-۲۳) اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

(۲) ایک ''اللہ و رسول'' یا متعدد اِلٰہ و رسل؟

عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں، وسیع و عریض دنیا پر پھیلی ہوئی اسلامی مملکت، بہر حال، ایک مرکز کے ماتحت تھی، جبکہ آج، پورا عالم اسلام، انتشار کا شکار ہے، اور مسلم سلطنتیں، بیسیوں مراکز میں بٹ چکی ہیں، اب کیا ہر مسلم مملکت کے لیے، ہم، جُدا جُدا ''اللہ و رسول'' تسلیم کر لیں، یا سب کے لیے ایک ہی ''اللہ و رسول'' کو تسلیم کریں؟ --- کیا یہ سب ''اللہ و رسول'' اپنی اپنی جگہ، (اپنے باہمی اختلافات بلکہ نزاعات کے باوجود) خود معیارِ حق ہوں گے، یا ان میں سے بالاتر بھی، کوئی ''اللہ و رسول'' ہوگا جس کے سامنے بصورتِ نزاع، باقی سب ''اللہ و رسول'' سر جھکا دیں گے؟ --- کیا پوری ملتِ اسلامیہ کو، آپ ایک ہی ''اللہ و رسول'' کے تابع رکھیں گے، یا جملہ ممالک کے لیے متعدد اور متفرق ''خداؤں اور رسولوں'' کا وجود مانیں گے؟ --- اگر آپ پوری روئے زمین کے مسلمانوں کو، ایک ہی ''اللہ و رسول'' کی تابعداری میں رکھنا چاہیں گے تو اس مقصد کے لیے، آپ تلوار سونت کر، میدانِ حرب و قتال میں آئیں گے تا کہ ایک ''اللہ و رسول'' کے سوا، باقی سب ''اللہ و رسول'' فنا کے گھاٹ اتر جائیں، یا آپ الیکشن

---

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۶۸ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۱۲۹

کے ذریعہ کسی ایک ''اللہ و رسول'' کو منتخب کر لیں گے؟ --- کیا ہی اچھا ہوتا اگر جناب پرویز صاحب، اپنی زندگی ہی میں ان الجھنوں کو صاف کر جاتے، یا اب ادارہ طلوعِ اسلام ہی اس فریضہ کو انجام دے ڈالے؟

(۳) خدا اور سول کے نام پر بدترین آمریت

نظامِ اسلامی کے مرکز کو ''اللہ و رسول'' قرار دینے سے، ''خدا اور سول'' ہی کے نام پر ایسی بدترین آمریت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تصور، فرعون، نمرود، ہٹلر اور مسولینی تک کو نہ سُوجھا تھا --- ''مفکرِ قرآن'' صاحب، تھیا کریسی (Theocracy) پر لب کشائی فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> جب تک اسلامی نظام قائم رہا، اس کے سربراہ خلفائے راشدین کے لقب سے سرفراز رہے۔ یہ سوئے اتفاق ہے (اور امت کی حرماں نصیبی) کہ یہ سلسلہ معدودے چند تک قائم رہا۔ بعد میں یہ نظام، ملوکیت میں بدل گیا تو اس آیت (۵۹/۴) کے مفہوم میں دشواری پیش آ گئی، نظامِ ملوکیت میں، امت میں ثنویت پیدا ہو گئی، دنیاوی امور، حکومت کی تحویل میں آ گئے اور امور شریعت، علماء کی تحویل میں۔ اس ثنویت کی رُو سے، اس آیت کے معنی یہ کیے گئے کہ تم اطاعت کرو، اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اربابِ حکومت کی (اولوالامر منکم)۔ اگر تم میں اور حکومت میں کسی امر میں اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے حضرات علماء کی طرف رجوع کرو تاکہ وہ بتائیں کہ اس باب میں اللہ اور اس کے رسول کا کیا حکم ہے، علماء کا فیصلہ تمھارے (عوام) اور حکومت، دونوں کے لیے قولِ فیصل ہوگا .... [1]

یہ اقتباس ابھی جاری ہے، لیکن ''مفکرِ قرآن'' نے آخری جملہ میں، اس ''سقم'' یا ''عیب'' کو بیان فرمایا ہے کہ اس سے باہمی نزاعات میں حضرات علماء کی طرف رجوع کرنا لازم آتا ہے، اور یہ چیز، اُن کے لیے ہمیشہ ہی سوہانِ روح بنی رہی ہے۔

حضرات علماء کی طرف، اس لیے رجوع کرنا کہ وہ نزاعی امور میں حکمِ خدا سے آگاہ کریں، اگر واقعی ایک ''عیب'' ہے تو یہ ''عیب'' پرویز صاحب کے تصورِ ''مرکزِ ملت'' میں بھی موجود ہے، آخری نزاعی امور میں حکمِ خدا کو جاننے کے لیے، کسی نہ کسی طرف رجوع تو ناگزیر ہوگا۔ حضراتِ علمائے کرام کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا، تو ان ''مسٹروں'' کی طرف راجع ہونا پڑے گا، جو ''مرکزِ ملت'' کی طرف سے پروانۂ تقرری پا کر، قرآن کے اجارہ دار بن بیٹھیں گے، تاکہ ''نئی نسل کے لیے، نئی تعبیرِ قرآن'' کا نعرہ لگا کر، قرآن کی مرمت فرماتے رہیں، اور چونکہ یہ لوگ، صاحبِ اقتدار اور اربابِ اختیار ہوں گے، اس لیے ان کا قول، قولِ فیصل نہ بھی ہوا، تب بھی اسے نافذ کر ڈالا جائے گا خواہ، امتِ مسلمہ کا اجتماعی ضمیر، ایسے بے تکے فیصلوں کو کبھی قبول نہ کر پائے۔

مندرجہ بالا اقتباس کے تسلسل میں ''مفکرِ قرآن'' فرماتے ہیں۔

> بادنیٰ تدبر، اس سے یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ اس سے آخری اقتدار، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آ گیا...... [2]

اقتباس، اب بھی جاری ہے، لیکن یہ جملہ پڑھتے ہوئے، ہماری زبان پر بیساختہ یہ شعر آ گیا۔

---

[1] + [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۳۴۲

غیر کی آنکھوں کا تنکا تجھ کو آتا ہے نظر
دیکھ اپنی آنکھ کا غافل! ذرا شہتیر بھی!

''مفکرِ قرآن'' صاحب کے تصورِ ''مرکزِ ملت'' کی رو سے بھی، ''آخری اقتدار، مذہبی پیشوائیت ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے''۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب مذہبی پیشوا ''باریش متقی علماء'' کی بجائے ''مغرب کے بے ریش غلام اور مسٹر'' ہوں گے، جو ''قرآنی عالم'' بنکر اگر مقننہ میں پہنچیں گے تو اشتراکیت کے پورے معاشی نظام کو ''ربوبیت کا نظام'' کہہ کر پیش کریں گے، اور مغربی تہذیب اور یورپی معاشرت کے جملہ لوازمات کو، ''قرآنی معاشرت'' کے لیبل کے تحت پیش کریں گے۔

اپنے اقتباس کو جاری رکھتے ہوئے، ''مفکرِ قرآن'' صاحب، فرماتے ہیں۔

> بادنیٰ تدبر، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس سے آخری اقتدار، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آ گیا، اور چونکہ وہ اپنے فیصلے کو اپنا فیصلہ قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ اسے ''خدا و رسول'' کا فیصلہ کہہ کر صادر کرتے تھے، اس لیے کسی کی مجال نہیں کہ اس سے سرتابی کر سکے، عوام کا بے پناہ ہجوم (خدا و رسول کے نام پر مرمٹنے کے لیے) ان کے ساتھ ہوتا تھا، اس سے ایسی تھیا کریسی (Theocracy) وجود میں آ گئی، جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ [1]

علمائے کرام کی طرف منسوب کردہ اس ''تھیا کریسی'' سے کہیں بڑھ کر بدتر مثال وہ ہے، جسے خود ''مفکرِ قرآن'' نے پیش کیا ہے، اور جس کا ذکر، اگلے پیراگراف میں، آ رہا ہے، لیکن اس سے پہلے یہ حقیقت واضح کرنا ضروری ہے کہ تھیا کریسی کی یہ صورتِ حال، دراصل عیسائیت کی پیداوار ہے، یہ محض پرویز صاحب کے قلم کا کرشمہ ہے کہ علماء کا نام لے کر، انھوں نے اسے اسلام کے کھاتے میں ڈال دیا ہے، ورنہ ہر دور میں، اہلِ تقویٰ و تدیّن علمائے کرام، ملوکیت کے منظورِ نظر ہونا تو درکنار، الٹا ان کے مغضوب اور معتوب ہوتے ہوئے، خدمتِ اسلام کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ معدودے چند، دنیا پرست علماء ملوکیت کا ساتھ دیکر، اپنے مفادات اسی طرح حاصل کرتے رہے ہیں، جس طرح خود پرویز صاحب، پاکستان کے اربابِ بست و کشاد سے ہمیشہ خوشگوار تعلقات رکھتے ہوئے، اپنے کام کرواتے رہے ہیں، آخر یہ بات کون نہیں جانتا کہ پاکستان کے علماء، اپنی حق گوئی کی بناء پر، حکمرانوں کے زیرِ عتاب رہے ہیں لیکن خود پرویز صاحب، حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے کے باعث، ان کے منظورِ نظر رہے ہیں۔

''مرکزِ ملت'' کی بدترین تھیا کریسی

تفسیر مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۳۴۲ سے ماخوذ اُس اقتباس کی روشنی میں بھی (جسے اوپر تین اقساط میں پیش کیا گیا ہے) تھیا کریسی کی جو تصویر، خود ''مفکرِ قرآن'' نے اپنے موئے قلم سے پیش کی ہے، اسے اگر من و عن قبول کر بھی لیا جائے، تب بھی بات یوں بنتی ہے کہ --- ''علمائے کرام، اپنے فیصلے کو، اپنا فیصلہ قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ اسے خدا اور رسول کا فیصلہ

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۳۴۲

کہہ کر پیش کرتے تھے" --- لیکن خود، پرویز صاحب، جس تھیاکریسی کو جنم دے رہے ہیں، اس میں خود "مرکزِ ملت" ہی "اللہ اور رسول" بن جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص، مرکزِ ملت کی کسی غلطی پر ٹوکتے ہوئے یہ کہے کہ "آپ کا یہ اقدام غلط ہے، خدا اور رسول کا حکم تو یہ ہے جبکہ آپ اس کے برعکس یہ کر رہے ہیں" --- تو مرکزِ ملت پلٹ کر جواب دے گا کہ --- "آپ کس خدا و رسول کی بات کر رہے ہیں؟ "خدا اور رسول" کا تو معنیٰ ہوتا ہے نظامِ حکومت - تمھارے ذہن میں غالباً حضرت محمد ﷺ کا تصور جما ہوا ہے، حالانکہ وہ "مرکزِ ملت" ہونے کی بنا پر، اپنے زمانے میں "خدا اور رسول" تھے، ہم اپنے زمانے کے "مرکزِ ملت" ہونے کی بناء پر "خدا اور رسول" ہیں۔ ہم گزشتہ زمانوں کے "خدا اور رسول" کے فیصلوں کے پابند نہیں ہیں" --- اس طرح، پرویز صاحب کا نظامِ اسلامی کا یہ تصور، جسے وہ بڑا معرکہ آراء تصور سمجھتے ہوئے پیش کرتے ہیں، "خدا اور رسول" کے نام کو، اپنے لیے مخصوص کرتے ہوئے اور "خدا اور رسول" کے منصب پر براجمان ہوتے ہوئے، وہ کچھ کرے گا، جس کی مثال، دنیا کی کسی تھیا کریسی میں نہیں ملتی۔

یقیناً وہ شخص، بڑا ظالم ہے، جو خدا اور رسول کا نام لے کر، اپنا حکم چلاتا ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر ظالم وہ شخص ہے جو "مرکزِ ملت" کی خود ساختہ اصطلاح کی آڑ میں خود خدا اور رسول بن بیٹھتا ہے اور پھر اپنا حکم چلاتا ہے۔

ایک مغالطہ اور اس کی حقیقت

بعض مقامات پر، علمائے اسلاف کی عبارتوں سے، "مفکرِ قرآن" نے مغالطہ آفرینی کرتے ہوئے، یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ آخر ایک صحیح اسلامی حکومت کو، اگر "خدا اور رسول" کی حکومت نہ قرار دیا جائے تو اسے کیا کہا جائے؟ پس جس طرح، صحیح اسلامی حکومت، "خدا اور رسول" کی حکومت قرار پاتی ہے، اسی طرح، اگر ایسی حکومت کے سربراہ یا اربابِ اقتدار کو (یا پرویز صاحب کی اصطلاح میں "مرکزِ ملت" کو) "خدا اور رسول" کہہ دیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔

یہ بظاہر بڑا سادہ مگر بباطن بڑا گہرا مغالطہ ہے، --- یہ درست ہے کہ ایک صحیح "اسلامی حکومت" واقعی "خدا اور رسول" کی حکومت ہوتی ہے، ایسی حکومت کی مخالفت، فی الواقع "اللہ اور رسول" ہی کی مخالفت قرار پاتی ہے، لیکن اس حکومت کے اربابِ اقتدار کو، جن کے لیے، پرویز صاحب نے "مرکزِ ملت" کی اصطلاح وضع کی ہے، خود "خدا اور رسول" قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ پرویز صاحب، بزعمِ خویش، زندگی بھر، قرآنی تحقیق میں مشغول رہنے کے بعد بھی، اس عظیم فرق و تفاوت کو نہ سمجھ پائے جو اسلامی حکومت کو، خدا اور رسول کی حکومت قرار دینے میں، اور اس حکومت کے اربابِ اقتدار کو بذاتِ خود، "خدا اور رسول" قرار دینے میں پایا جاتا ہے، ہم اس فرق کو ایک مثال سے واضح کیے دیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی وقت، اسلامی حکومت، کوئی غلط قدم اٹھا لیتی ہے، ہمارے نزدیک، "خدا اور رسول" سے مراد "مرکزِ ملت" نہیں ہے بلکہ ہستی باری تعالیٰ اور ذاتِ رسول ﷺ مراد ہیں، لہذا، ہم حکومت کے کارپردازوں سے کہیں گے کہ --- "آپ اپنے اقدام پر نظرِ ثانی کریں،

آپ کا یہ اقدام، خدا اور سول کے حکم کے خلاف ہے'' --- لیکن پرویز صاحب کے تصور کی روشنی میں، حکومت خود'' خدا اور سول'' ہوگی، لہٰذا، اس کے سامنے، کسی'' خدا اور سول'' کو بطورِ معیار اور کسوٹی کے پیش کیا ہی نہیں جا سکتا۔

مرکزِ ملت ایک بدترین آمریت

اس کے بعد، یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ'' اللہ و رسول'' سے مراد، اگر'' مرکز ملت'' لیا جائے، تو --- اولاً، تو یہ'' مرکز ملت'' ایک ایسی بدترین اور ظالمانہ آمریت میں تبدیل ہو جائے گا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا،'' مرکز ملت'' کی اِس آمریت کو، اُس آمریت سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوگی جسے ہمارے'' مفکر قرآن'' صاحب، عمر بھر، مذہبی پیشوائیت کے نام سے مطعون کرتے رہے ہیں، کیونکہ'' اللہ اور رسول'' کی اِس ماڈرن تفسیر کے مطابق، جو لوگ، حکومت سے اختلاف کریں گے (خواہ یہ اختلاف کتنے ہی مضبوط دلائل پر قائم ہو) اور'' مرکز ملت'' کی سمع و طاعت سے گریزاں ہوں گے، وہ لوگ'' کھلی گمراہی'' کا شکار قرار پائیں گے، --- ثانیاً،'' اللہ و رسول'' کے معنی'' مرکز ملت'' کسی طرح بھی آیاتِ قرآنی میں کھپتے ہی نہیں، مثلاً چند آیات ملاحظہ فرمائیے۔

۱ --- وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب-۳۶) اور جس نے'' اللہ اور اس کے رسول'' کی نافرمانی کی تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گیا۔

چنانچہ'' مرکز ملت'' کا یہ فتویٰ (جو قرآن، قرآن، کی رٹ لگاتے ہوئے رسید کیا جائے گا) صرف دنیا ہی میں نہیں، بلکہ آخرت میں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا، یہاں تک کہ حکومت یا مرکز ملت کے یہ مخالفین، جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

۲ --- وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَإِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا (الجن-۲۳) اور جو کوئی'' اللہ اور اس کے رسول'' کی نافرمانی کرے تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہوگی جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

چنانچہ وہ لوگ، جنھوں نے'' مرکز ملت'' کی حکومت کو ماننے سے (یا مرکز ملت کے وجود کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا، (خواہ یہ انکار،'' مرکز ملت'' کی کسی صریح غلطی پر، یا ٹھوس اور معقول دلائل کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو) ہرگز اس قابل نہیں ہوں گے کہ کبھی بھی نارِ جہنم سے باہر نکالے جائیں، کیونکہ انھوں نے'' اللہ اور رسول'' کا انکار کر ڈالا ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ یہ سورۃ الجن کی آیت ہے، جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، اُس وقت بقولِ پرویز، اسلامی نظام ابھی قائم ہی نہ ہوا تھا کہ'' مرکز ملت'' کی فرمانبرداری اور نافرمانی کا سوال پیدا ہوتا۔ اب یا تو اس بات کا اعتراف کر لیا جائے کہ'' اللہ اور رسول'' کا وہ مفہوم نہیں ہے جو'' مرکز ملت'' کی خود ساختہ اصطلاح میں پیدا کیا گیا ہے، یا پھر یہ مان لیا جائے کہ'' اللہ اور رسول'' (بمعنی'' مرکز ملت'') کی نافرمانی پر یہ وعید، فعل عبث ہے جو اس وقت دی گئی جبکہ'' اللہ اور سول'' کا ابھی وجود ہی قائم نہ ہوا تھا (معاذ اللہ)، اور ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔

۳ --- إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (التوبہ-۸۰) اگر آپ ستر مرتبہ بھی، ان کے حق میں، اللہ سے مغفرت طلب کریں، تب بھی اللہ تعالیٰ، انھیں ہرگز نہیں بخشے گا، کیونکہ ان لوگوں نے ''اللہ اور اس کے رسول'' کا انکار کر ڈالا ہے۔

چنانچہ اگر یہ لوگ ''مرکزِ ملت'' (حکومت) کی نافرمانی اور مخالفت میں مر گئے تو ''مرکزِ ملت'' نہ تو ان کا جنازہ پڑھے گا اور نہ ہی ان کی قبر پر کھڑا ہوگا اور نہ ہی کسی اور کو ایسا کرنے دے گا، کیونکہ ''قرآنی حکم'' یہی ہے۔

۴ --- وَلَا تُصَلِّ عَلٰى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ أَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ إِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (التوبہ-۸۴) آپ ان میں سے کسی کے مرنے پر، نمازِ جنازہ نہ پڑھیں، اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں، کیونکہ انھوں نے ''اللہ اور رسول'' (یعنی مرکزِ ملت) کا انکار کیا ہے، اور حالتِ نافرمانی میں مر گئے ہیں۔

ان چند آیات ہی سے اندازہ لگا لیجئے کہ اگر ''اللہ اور رسول'' سے مراد ''مرکزِ ملت'' لیا جائے، تو پرویزی تصور کے مطابق، اسلامی حکومت کس قدر بدترین آمریت میں تبدیل ہو جاتی ہے؟ لیکن ہمارے مہربان، اس آمریت کی تو تردید کر رہے ہیں، جس میں کوئی شخص، بقول ان کے، اپنے فیصلے کو ''خدا اور رسول'' کا فیصلہ کہہ کر نافذ کرتا ہے، لیکن اس ظالمانہ اور مستبدانہ آمریت کو قرآن سے کشید کر ڈالتے ہیں جس میں ''مرکزِ ملت'' کے نام سے کوئی شخص، خود ''اللہ اور رسول'' بن بیٹھتا ہے۔

(۴) ''مرکزِ ملت'' پر ایمان اور اس کی اطاعت

''اللہ اور رسول'' سے ''مرکزِ ملت'' مراد لینے کی لغویت، اس سے بھی واضح ہے کہ اس معنیٰ میں حکومت کی اطاعت کی طرف دعوت تو دی جا سکتی ہے، مگر ''مرکزِ ملت'' پر ایمان لانے کی دعوت، ایک بعید از کار سی بات ہے، جبکہ قرآنِ کریم فرماتا ہے۔

۱ --- يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النساء-۱۳۵) اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

۲ --- وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ ...... (المائدہ-۸۱) اگر وہ اللہ اور نبیؐ پر ایمان رکھتے تو ....

۳ --- وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ أَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ (المائدہ-۱۱۱) جب میں نے حواریوں کو وحی کی کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں۔

۴ --- فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ (الاعراف-۱۵۸) پس تم اللہ اور اس کے اُمّی مرسل نبی پر ایمان لاؤ۔

۵ --- إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (الحجرات-۱۵) بیشک اہل ایمان تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں، اور پھر کسی قسم کے شک و ریب میں نہ پڑیں۔

ان آیات میں ''اللہ و رسول'' کا معنیٰ ''مرکزِ ملت'' کسی طرح بھی نہیں لیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ خود جناب پرویز صاحب --- جو قرآن کریم کے ہر اس مقام پر، جہاں، انھیں ''اللہ و رسول'' کے الفاظ نظر آئے ہوں ''نظامِ خداوندی''، ''نظام

جماعت''، ''مرکز ملت'' یا اس قسم کے دوسرے الفاظ بڑی بے تکلفی سے رکھتے رہے ہیں --- ان آیات میں، انتہائی کوشش کے باوجود بھی، یہ معانی داخل نہ کر پائے، چنانچہ اِن ہی آیات کا مفہوم، خود پرویز صاحب نے بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

۱ ----- اے جماعت مومنین! تم ہمیشہ اس نظام کے بنیادی اصولوں کی صداقت پر یقین رکھو، اور وہ بنیادی اصول ہیں، اللہ پر ایمان، رسول پر ایمان ۱

۲ ----- جن کفار سے یہ اس وقت دوستانہ تعلقات قائم کرتے ہیں، اگر وہ اللہ پر، اور اِس نبی پر، اور جو کچھ اس پر نازل کیا گیا ہے، اس پر ایمان لے آئے تو ۲

۳ ----- اور جب میں نے حواریوں کو (انجیل میں بذریعہ وحی) حکم دیا تھا (جس طرح اب جماعتِ مومنین کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے) کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں۔ ۳

۴ ----- ...... اس خدا پر ایمان لاؤ، اور اس کے رسول پر، جو (قرآن ملنے سے پہلے (۴۸/۲۹) اُمّی تھا۔ ۴

۵ ----- مومن، انھیں کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (علے وجہ البصیرت) ایمان لائیں، اس طرح کا ایمان، کہ اس کے بعد، ان کے دل میں، ذرا سا بھی اضطراب اور شک باقی نہ رہے (۴۹/۱۵) ۵

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں ''اللہ اور رسول'' کا جو مفہوم، جناب پرویز صاحب نے بیان کیا ہے، بالکل وہی مفہوم، ان آیات کا بھی ہے، جن میں انھوں نے ''مرکز ملت'' کی خود ساختہ اصطلاح سے انوکھا اور اجنبی مفہوم پیدا کیا ہے۔

اللہ و رسول کے ذکر کے بعد ضمائرِ توحید سے استدلال

قرآنِ کریم میں چند آیات ایسی بھی ہیں، جن میں اللہ اور رسول کے ذکر کے بعد، تثنیہ کے صیغوں یا ضمیروں کی بجائے، واحد کے ضمائر اور صیغے استعمال ہوئے ہیں، مثلاً درجِ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے۔

۱ --- يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (الانفال-۲۰) اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اس سے روگردانی نہ کرو، اس حال میں کہ تم (اس سے) سُن رہے ہو۔

۲ --- يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال-۲۴) اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو، جبکہ وہ تمھیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے۔

۳ --- قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (النور-۵۴) کہہ دیجئے، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، لیکن اگر تم گریزاں ہو تو رسول پر وہ ذمہ داری ہے جو اس پر ڈالی گئی اور تم پر وہ ذمہ داری ہے، جو تم پر ڈالی گئی ہے، اور اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے۔

---

۱ مفہوم القرآن، صفحہ ۲۲۳ ۲ مفہوم القرآن، صفحہ ۲۶۷ ۳ مفہوم القرآن، صفحہ ۲۸۰

۴ مفہوم القرآن، صفحہ ۳۷۹ ۵ مفہوم القرآن، صفحہ ۱۲۰۹

ان آیات میں سے پہلی آیت میں، لَا تَوَلَّوا عَنْهُ میں ضمیر مجرور (یعنی عَنْهُ میں هٗ کی ضمیر)، اور دوسری آیت میں اِذَا دَعَاكُمْ میں دَعَا کا فاعل، اور تیسری آیت میں وَاِنْ تُطِيْعُوهُ میں واقع ضمیر مفعول (ہ) یہ سب کے سب واحد کے صیغے ہیں، جو اللہ اور رسول کے بعد، لائے گئے ہیں، اسی طرح مندرجہ ذیل آیت کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَقُّ أَنْ يُّرْضُوْهُ إِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (التوبہ-۶۲) یہ لوگ، تمہیں راضی کرنے کے لیے قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسول اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ لوگ اسے راضی کریں۔

اس آیت سے (اور اس قسم کی دوسری آیت سے)، ''مرکز ملت'' کے حق میں یوں استدلال کیا جاتا ہے۔

> اس آیت میں اللہ اور رسول، جس کے لیے عربی قاعدے کے مطابق ضمیر تثنیہ آنی چاہئے تھی، واحد (یُرْضُوهُ میں ہٗ کی ضمیر) لائی گئی ہے، حالانکہ اللہ اور رسول ایک نہیں، اللہ خالق ہے اور رسول مخلوق ہے، پیغام دینے والا اور پیغام پہنچانے والا ایک نہیں ہو سکتا، لیکن اس آیت میں ان دونوں کے لیے ضمیر واحد لا کر، انھیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر کیا گیا ہے کہ اس آیت میں ''اللہ اور رسول'' کے الفاظ، اصطلاح کے طور پر کسی ایسی چیز کے لیے لائے گئے ہیں جو ایک ہیں دو نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس ایک چیز سے مراد، اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ وہی نظام ہے جو رسول اللہ کی معرفت اس دنیا میں قائم کیا گیا۔ [1]

یہ ہے دلائل کی وہ کل کائنات، جو طلوع اسلام نے اپنے اس نرالے موقف کی تائید میں پیش کی ہے، اس اقتباس کی روشنی میں چند باتیں بڑی قابل غور ہیں۔

اَوَّلاً: یہ کہ، اس اقتباس کی ابتداء میں، جس عربی قاعدے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ہر جگہ اور ہر صورت کے لیے نہیں ہے، بعض اوقات، دو چیزوں یا دو ہستیوں کے ذکر کے بعد، تثنیہ کی بجائے مفرد کا صیغہ بھی آ جاتا ہے، لیکن اس کی وجہ وہ نہیں جو پرویز صاحب نے بیان کی ہے۔ اس کی مثالیں آگے آ رہی ہیں۔

ثانیاً: معلوم نہیں کہ ''خالق + مخلوق (یعنی اللہ اور رسول) = مخلوق (یعنی مرکز ملت)'' -----------
اور ''پیغام دینے والا + پیغام پہنچانے والا (یعنی خدا اور رسول) = مرکز ملت'' جیسی مساوات کہاں سے اور کیونکر برآمد کر لی گئی ہیں، اور پھر ساتھ ہی اُسی سانس میں پلٹ کر، یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ --- ''خالق اور مخلوق، ایک نہیں ہو سکتے'' ---

دو اشیاء کے لیے ضمیرِ مفرد، لانے کی دو صورتیں

جب دو اشیاء یا دو ہستیوں کے ذکر کے بعد، ضمیر مفرد لائی جائے تو ایسا ہونا، مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت ہی میں ممکن ہوتا ہے۔

(۱) ----- کسی دلیل یا قرینہ کی بناء پر، یہ ضمیر کسی ایک ہی مرجع کی طرف لوٹتی ہے، اور وہ مرجع، انھی مذکورین میں سے کوئی

[1] طلوع اسلام، اگست ۱۹۸۸ء، صفحہ ۴۶

ایک ہوتا ہے، (نہ کہ اِن سے باہر، کہ خارج سے اس کا وجود درآمد کرلیا جائے)، یہ مرجع ضمیر کے قریب بھی واقع ہوسکتا ہے اور بعید بھی۔

(۲) ------ صیغۂ واحد کی یہ ضمیر، دونوں مذکور چیزوں کی طرف فرداً فرداً لوٹتی ہے، قطع نظر اس سے کہ ان میں سے کوئی مرجع، تذکر و تانیث کے اعتبار سے ضمیر سے مطابقت رکھتا ہے یا کہ نہیں۔

پہلی صورت کی مثالیں

پہلی صورت کی --- جبکہ ضمیر مفرد، کسی قرینہ یا دلیل کی بناء پر، کسی ایک مرجع کی طرف لوٹتی ہے --- قرآن مجید میں بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں، چند ایک آیات، بطور نمونہ، مشتے از خروارے، پیشِ خدمت ہیں۔

پہلی آیت

سورۃ التوبہ کی آیت ۶۲، جس کے الفاظ یہ ہیں وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَقُّ أَنْ يُّرْضُوْهُ بھی اسی سلسلے کی ایک مثال ہے، يُرْضُوْهُ میں واحد کی ضمیرِ مفعول کا مرجع --- اس قرینہ کی بناء پر کہ اِرْضَاءِ رسول اور اِرْضَاءِ خدا میں، کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے، چنانچہ دونوں میں ایسا باہم تلازم پایا جاتا ہے کہ اللہ کو راضی کرنے کے لیے، اور رسولؐ کو راضی کرنے کے لیے جدا گانہ کوششوں اور طریقوں کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے --- اللہ اور رسول میں کوئی ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یقیناً رسول ہی ہے، ملاحظہ ہو تفسیر جلالین:

تَوْحِيْدُ الضَّمِيْرِ لِتَلَازُمِ الرِّضَآءَيْنِ [۱] یعنی ضمیر واحد کا لایا جانا، دونوں رضاؤں کے باہمی تلازم کے باعث ہے۔

پھر حاشیہ میں یہ عبارت بھی موجود ہے۔

لما كان الظاهر العطف بالوا ويقتصنى التثنيّة وقد افرده وجهه بان رضاء الرسول ﷺ لاينفک عن رضاء الله تعالىٰ فتلاز مها جعلا كشيءٍ واحدٍ فعاد عليها الضمير المفرد [۲] (واللہ اور رسولہ میں) واؤ کے ظاہری عطف کا تقاضا یہ ہے کہ صیغۂ تثنیہ لایا جائے، حالانکہ یہاں صیغہ مفرد ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رضا، اللہ تعالیٰ کی رضاء سے منفک اور جداگانہ نہیں ہے، ان دونوں رضاؤں کے تلازم نے انھیں گویا ایک ہی شے بنا دیا ہے، اس لیے ضمیر، مفرد لائی گئی ہے۔

صاحبِ کشاف، علامہ زمخشری لکھتے ہیں۔

اِنَّمَا وَحَّدَ الضَّمِيْرَ لِاَنَّهٗ لَا تَفَاوُتَ بَيْنَ رِضَاءِ اللهِ وَرِضَاءِ رسولِه ﷺ وكان فی حكم مرضیّ واحدٍ [۳] ضمیر کو بصیغۂ واحد لایا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اس کے رسول ﷺ کی رضاء میں کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے، دونوں گویا ایک ہی کو راضی کرنے کے حکم میں ہیں۔

---

[۱] تفسیر الجلالین، صفحہ ۱۶۲ [۲] حاشیہ بر تفسیر الجلالین - کمالین، صفحہ ۱۶۲ [۳] تفسیر الکشاف، جلد ۲، صفحہ ۲۸۵

طلوعِ اسلام کی بنیادی غلطی

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اس آیت میں اور اسی طرح کی آگے آنے والی دیگر آیات میں مستعمل ضمیرِ واحد سے استدلال کرنے میں، پرویز صاحب اور ''طلوعِ اسلام'' کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ضمیرِ واحد کا مرجع، آیت ہی میں مذکور دو ہستیوں یا دو چیزوں میں سے کسی کو بھی نہیں بناتے، بلکہ خارج سے اس کا مرجع درآمد کرتے ہیں، اُن کے نزدیک، یہ ضمیرِ واحد، نہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے رسول ﷺ کی طرف، بلکہ ''مرکزِ ملت'' کی طرف راجع ہوتی ہے، جس کا آیت میں سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔

دوسری آیت

اس سلسلہ میں دوسری آیت، سورۃ الانفال کی بیسویں آیت ہے يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ یہاں لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ میں ضمیرِ مجرور بصیغۂ واحد لائی گئی ہے حالانکہ اس سے قبل، ''اللہ اور اس کے رسول'' دونوں ہستیوں کا ذکر ہے، آیت میں موجود قرینے کی بناء پر، اور دیگر مقامات پر موجود، قرآنی دلائل کی بناء پر، یہ مفرد ضمیر، جس واحد مرجع کی طرف لوٹتی ہے، وہ ذاتِ رسول ﷺ ہے۔

اولاً ---- اس لیے کہ آیت کے آخر میں وَأَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ کے الفاظ موجود ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ سامعین نے خدا کی آواز براہ راست نہیں سنی، بلکہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعہ دعوتِ دین کی اس آواز کو سُنا، جیسا کہ قرآن خود کہتا ہے:

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَا دِيًا يُّنَادِي لِلْاِيْمَانِ (آل عمران-۱۹۳) اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک مُنادی کو سنا جو ایمان کی صدا دیتا ہے۔

اس بناء پر، آیت کے اس داخلی قرینے کی رو سے لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ میں مذکور ضمیرِ مجرور، رسول اللہ ﷺ ہی کی طرف لوٹتی ہے۔

ثانیاً ---- اس لیے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ذریعہ ہی ممکن ہے (اور اس کے برعکس ممکن نہیں، اِلّا یہ کہ کوئی شخص خود نبی ہو حالانکہ اب بابِ نبوت بند ہو چکا ہے)، جیسا کہ قرآن مجید خود فرماتا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء-۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

لہٰذا یہاں، اس بناء پر لَا تَوَلَّوْا عنه میں واقع ضمیرِ مجرور کا مرجع رسول ہی ہے، اس آیت کے تحت، صاحبِ کشاف کے یہ الفاظ، قابلِ غور ہیں۔

اَلضَّمِيْرُ فِي (عَنْهُ) لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لان المعنى اطيعوا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَقَوْلِهٖ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَقُّ أَنْ يُّرْضُوْهُ[1]

عَنْهُ میں موجود ضمیر (ہٗ) رسول ﷺ کے لیے ہے، کیونکہ معنی یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، جیسا کہ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَقُّ أَنْ يُّرْضُوْهُ (التوبہ-۶۲) میں بھی یہی مراد ہے۔

[1] تفسیر الکشاف، جلد ۲، صفحہ ۲۰۹

تیسری آیت

اس سلسلہ کی تیسری آیت، سورۃ الانفال ہی کی چوبیسویں آیت ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ ''اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں بلائے''۔

اس آیت میں بھی ''اللہ اور رسول'' کے ذکر کے بعد دَعَاكُمْ میں مضمر ضمیر فاعلی، بصیغہ مفرد، وارد ہوئی ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے استجابت اور اللہ تعالیٰ کے لیے استجابت میں کوئی مغائرت نہیں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں، بالکل اسی طرح ''استجابت للہ'' فی الواقعہ استجابت للرسول ؐ کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے دَعَاكُمْ میں ضمیر فاعلی (جو مضمر فی الفعل ہے) اور خود فعل دَعَا کو مفرد لایا گیا ہے، جس کا فاعل، رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، کیونکہ لوگوں کو، اللہ تعالیٰ کی طرف، دعوت دینے کی ذمہ داری، رسول اللہ ﷺ ہی پر عائد کی گئی ہے، قرآن مجید میں ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (النحل - ۱۲۵) اے نبی! (لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے بلائیے۔

اسی بناء پر، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو دَاعِياً اِلَى اللهِ (۳۳/۴۶) کے خطاب سے نوازا ہے، اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ، خود بھی داعی ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ

وَاللّٰهُ يَدْعُوْا إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ (البقرہ - ۲۲۱) اللہ، اپنے اذن سے، جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ دعوت بھی، لسانِ رسول ؐ ہی پر جاری ہو کر لوگوں تک پہنچتی ہے، اس لیے دَعَاكُمْ میں واحد کی ضمیر فاعلی صرف ''رسول'' ہی کی طرف لوٹتی ہے، نہ کہ کسی ''مرکز ملت'' کی طرف --- جیسا کہ پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کا گمان ہے --- کیونکہ ''رسول'' نے یہ دعوت مکی دور میں، اس وقت بھی دی تھی، جبکہ ادارہ طلوعِ اسلام کے نزدیک بھی، ''مرکز ملت'' یا ''نظام اسلامی'' کا وجود ہی نہ تھا۔

چوتھی آیت

اس سلسلہ کی چوتھی آیت، سورۃ النور کی آیت ۵۴ ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (النور - ۵۴) (اے نبی ؐ) کہہ دیجئے، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو رسول ؐ پر وہ ذمہ داری ہے جو اُس پر ڈالی اور تم پر وہ، جو تم پر عائد کی گئی، اور اگر تم اُسکی اطاعت کرو گے تو راہ یاب ہو گے، اور رسول پر تو کھول کر پہنچا دینے ہی کی ذمہ داری ہے۔

اس آیت میں اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول ؐ کے ذکر کے بعد، عَلَيْهِ میں ضمیرِ مجرور، اور تُطِيْعُوْهُ میں ضمیرِ مفعول، بصیغۂ واحد مذکور ہیں، اِن دونوں کا مرجع بھی ذاتِ رسول ہی ہے، یہ دونوں اطاعتیں، بظاہر دو ہیں، لیکن اصلاً اور حقیقتاً

ایک ہی اطاعت کے حکم میں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کے رسولؐ کی اطاعت سے کوئی الگ شئے نہیں ہے، ان میں پائے جانے والے تلازم کے باعث، یہ دونوں اطاعتیں، دراصل ایک ہی اطاعت کے تحت آ گئی ہیں اور وہ ہے رسولؐ کی اطاعت، جس کے بغیر خدا کی اطاعت ممکن ہی نہیں ہے، چنانچہ خود پرویز صاحب یہ فرماتے ہیں کہ

چونکہ اس تعمیل اور نمونہ کے بغیر، خدا کی اطاعت ممکن نہ تھی، اس لیے جہاں قرآن میں اَطِيْعُوا اللهَ آیا ہے اس کے ساتھ ہی اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ بھی آیا ہے، کہیں ایک جگہ بھی اکیلا اَطِيْعُوا اللهَ نہیں آیا، اور چونکہ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ میں، اطاعتِ خداوندی خود بخود آ جاتی ہے، اس لیے خالی اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ، قرآن میں بعض جگہ آیا ہے، مثلاً

وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (نور-۵۶) رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

اور جہاں جہاں اَطِيْعُوا اللهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ آیا ہے، وہاں درحقیقت اَطِيْعُوا اللهَ سے مراد، اطاعتِ رسول ہی ہے۔[1]

اس لیے زیرِ بحث آیت میں عَلَيْهِ اور تُطِيْعُوْهُ میں واقع مفرد ضمیروں کا مرجع، ذاتِ رسولؐ ہی ہے، خارج سے مرجع درآمد کرنے کے شوق میں، اللہ تعالیٰ کو اس کی اُلوہیّت سے اور رسولؐ کو اُس کی رسالت کے منصب سے گویا معزول کر کے، ان دو ہستیوں کی بجائے، کسی نئی اور واحد شخصیت کو ''مرکزِ ملت'' کے نام سے، ان کا قائم مقام قرار دینا، عرفِ عام، شریعتِ اسلامیہ، لغاتِ عربیہ، محاوراتِ زبان، اور قواعدِ زبان، الغرض، ہر لحاظ سے غلط ہے۔

موقفِ پرویز، تب اور اب

یہاں یہ طرفہ تماشہ بھی دیدنی ہے، کہ ہمارے دور کے ''مفکرِ قرآن'' صاحب اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں، لیکن قرآن کا نام لیتے ہوئے ضمیروں کے مراجع بدلنے میں کس قدر رنڈر اور بیباک واقع ہوئے ہیں، اوپر، جن آیات کو، دوسری، تیسری اور چوتھی آیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، بالکل انھی آیات کو جناب پرویز صاحب نے ایک مقام پر، آیت نمبر ۱ (انفال-۲۰)، آیت نمبر ۲ (الانفال-۲۴)، اور آیت نمبر ۳ (نور-۵۴) کے طور پر پیش کیا ہے، پھر وہ، ان آیات میں واقع ضمیروں کے مراجع کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

آیت نمبر ۱ میں عَنْهُ کی ضمیر واحد غائب، نمبر ۲ میں دَعَاكُمْ اور نمبر ۳ میں تُطِيْعُوْهُ کے اضمار واحد سے، جن کا مرجع رسول ہے، عیاں ہے کہ رسول کی اتباع کا حکم ہے، اُس کی آواز پر حاضر ہونے کی تاکید ہے، اور اس سے روگردانی سے منع کیا گیا ہے، پس اطاعتِ رسول میں، عین اطاعتِ خدا ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ [2]

لیکن آج، پرویز صاحب، اپنی ان سابقہ عبارتوں کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا کر، ان ہی آیت میں واقع ضمیروں کا مرجع ''مرکزِ ملت'' کو قرار دیتے ہیں، جس کا ان آیات میں سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔

پانچویں آیت

اس سلسلہ کی اگلی آیت بھی سورۃ النور ہی سے تعلق رکھتی ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] معارف (اعظم گڑھ انڈیا)، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۸۲ تا صفحہ ۲۸۳
[2] معارف (اعظم گڑھ انڈیا)، اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۸۳ تا صفحہ ۲۸۴

وَإِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ٥ وَإِنْ يَّكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوٓا إِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (النور-۴۸،۴۹) اور جب ان (منافقین) کو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان میں فیصلہ کردے تو ایک گروہ ان میں سے اعتراض کرتا ہے، اور اگر ان کا حق (کسی پر واجب آتا) ہو تو وہ اس کے ہاں سر تسلیم خم کیے چلے آتے ہیں۔

اس آیت میں بھی، ''اللہ اور رسول'' کے ذکر کے بعد، لِيَحْكُمَ میں فاعل کی ضمیر کو مفرد لایا گیا ہے اور یہ صرف ذاتِ رسول ﷺ ہی کی طرف راجع ہوتی ہے، یاد رکھیے کہ باہمی نزاعات میں فیصلے کے لیے، بلائی جانے والی تمام آیات میں بطور اصول، یہ بات قرآن مجید نے طے کردی ہے کہ اگر ''مدعوالیہ'' کے طور پر، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ، کوئی اور ہستی یا چیز بھی مقرون ہو (مثلاً اللہ تعالیٰ یا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ) تو اس کے بعد، واحد کی ضمیر کا مرجع، صرف ذاتِ رسول ہی ہوگی، اس کے ثبوت میں ملاحظہ ہو، سورۃ النساء کی یہ آیت۔

> وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُوْلِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء-۶۱)
> اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ (وحی) اور رسول کی طرف آؤ تو آپ منافقین کو دیکھیں گے کہ وہ آپ سے کنی کتراتے ہیں۔

اس آیت میں، دو چیزوں کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے، ایک مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ، اور دوسری، ذاتِ رسول، (ﷺ)۔ ان دونوں کے ذکر کے بعد، صیغۂ غائب کی ضمیر مفرد بھی لائی جاسکتی تھی (جیسا کہ سابقہ آیات میں ایسا ہوا بھی ہے)، لیکن یہاں، اگرچہ رَءَيْتَ میں ضمیر فاعلی اور عَنْكَ میں ضمیرِ مجرور، واحد ہی ہیں، تاہم اس ضمیر کو صیغۂ مخاطب میں پیش کرکے یہ واضح کردیا گیا ہے، کہ فیصلہ کرنے والی ذات --- نیز مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اور ذاتِ رسول، دونوں میں سے اصل عامل --- ہستیٔ رسول ہی ہے، جس کی طرف بلایا جاتا ہے اور جس کی طرف آنے سے منافقین گریزاں ہیں، اِلَّا یہ کہ وہ محسوس کرلیں کہ فیصلہ، اُن کے حق میں ہوگا، پھر وہ بڑے مطیع فرمان بن کر عدالتِ نبوی میں حاضر ہوتے ہیں، پس جس طرح، آیت (النساء - ۶۱) میں رَءَيْتَ اور عَنْكَ سے ذاتِ رسول مراد ہے، بالکل اسی طرح سورۃ النور کی آیت ۴۸-۴۹ میں بھی لِيَحْكُمَ کے فاعل کی حیثیت سے، اور اِلَيْهِ میں ضمیر مجرور کے مرجع کی حیثیت سے ذاتِ رسول ہی مراد ہے، نہ کہ کچھ اور۔

چھٹی آیت

سورۃ النور ہی کی ایک اور آیت بھی، اس سلسلہ میں داخل ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

> إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (النور-۵۱) اہل ایمان کو جب اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان میں فیصلہ کردے تو ان کا قول یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔

اس آیت میں بعینہ، اسی دلیل کی بناء پر، جو اس سے پہلی آیت کے ضمن میں بیان ہوچکی ہے، لِيَحْكُمَ میں ضمیر فاعلی

کا مرجع، ذاتِ رسولِ مقبول ﷺ ہی ہے، نہ کہ کچھ اور۔

ساتویں آیت

سورۃ التوبہ کی آیت ۷۴ کے تحت مدیر طلوعِ اسلام لکھتے ہیں۔

اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ---

یہاں بھی، اللہ اور اس کے رسول کے لیے واحد کی ضمیر (ہ) لائی گئی ہے یعنی خالق اور مخلوق کا ذکر کر کے، ان کے لیے واحد کی ضمیر لائی گئی ہے، تو اس سے اسلامی نظام کے علاوہ، اور کیا مراد ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ نظام، اللہ تعالیٰ کے پیغام کے ذریعے، اس کے پیغمبر نے، اس دنیا میں قائم کیا تھا۔ [1]

یہاں صیغۂ واحد غیب کی دو ضمیریں موجود ہیں، ایک ضمیر (ہٗ) جو رَسُوْلُهٗ میں بطور مضاف الیہ واقع ہوئی ہے، یہ قطعی طور پر، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف راجع ہے، جبکہ طلوعِ اسلام کے نزدیک، یہ ''اسلامی نظام'' یا اس کے ''مرکزِ ملت'' کی طرف راجع ہے، جو صریحاً غلط ہے، دوسری ضمیرِ مجرور (ہٖ) لفظ فَضْلِهٖ میں واقع ہے، اور یہ بھی، بلاشک وشبہ، اللہ تعالیٰ ہی طرف راجع ہے، اس طرح اس آیت کا معنٰی یہ بنتا ہے کہ --- ''اللہ نے اپنے فضل سے، اور رسولؐ نے (بھی اس کے فضل سے) لوگوں کو غنی کر دیا ہے'' --- جبکہ پرویز صاحب اور مدیر طلوعِ اسلام کے موقف کی بناء پر، آیت کا ترجمہ یوں ہوگا --- ''مرکزِ ملت (کیونکہ ان کے نزدیک، ''اللہ اور رسول'' سے مراد، مرکزِ ملت، ہی ہے) نے لوگوں کو اپنے فضل سے (نہ کہ اللہ کے فضل سے) غنی کر دیا ہے'' --- یہ ترجمہ صریحاً غلط ہے، اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ''فضل'' مرکزِ ملت کے دستِ اختیار میں ہے جبکہ قرآن کریم کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ فضل صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے، اپنے فضل سے نوازتا ہے۔

وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (الحدید-۲۹) بیشک فضل، اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے، اسے عطا فرماتا ہے۔

اہلِ کتاب کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کے فضل کے اجارہ دار ہیں، قرآن نے یہ کہہ کر ان کی تردید کی، کہ

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الحدید - ۲۹) وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر بھی قادر نہیں ہیں۔

علاوہ ازیں، حضور اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے بھی یہ اعلان کروایا گیا۔

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران-۷۳) کہہ دیجئے، بیشک فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عطا فرماتا ہے۔

لوگوں کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے فضل کو، اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کریں (نہ کہ کسی مرکزِ ملت سے)۔

وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء - ۳۲) اور تم اللہ ہی سے، اس کے فضل کا سوال کرو۔

ان وجوہ کی بناء پر، آیتِ زیرِ بحث (التوبہ-۷۴) میں فَضْلِهٖ میں واقع ضمیرِ مجرور، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف راجع ہوتی

---

[1] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۸۸ء، صفحہ ۴۷

ہے (نہ کہ کسی مرکز ملت کی طرف، جیسا کہ طلوعِ اسلام کا گمان ہے)

مزید یہ کہ آیت زیر بحث میں، آخری ضمیر مجرور کے تنہا، اللہ کی طرف راجع ہونے کی قطعی دلیل یہ ہے کہ اس مفہوم و مضمون کی ایک دوسری آیت میں، اس ضمیر کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹایا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (التوبہ-۲۸) اگر تمہیں ناداری کا خوف ہو تو اللہ تمہیں اپنے فضل سے غنی کردے گا۔

اس آیت میں یہ ضمیر، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف راجع ہے، مدیر طلوعِ اسلام کے اگست ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں چھپنے والے مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں غالباً اس وجہ سے یہ غلط فہمی لاحق ہوگئی کہ آیت (التوبہ - ۷۴) کی ترکیب میں ''أَغْنٰهُمُ اللّٰهُ'' اور ''مِنْ فَضْلِهٖ'' میں کچھ فاصلہ حائل ہوگیا ہے حالانکہ یہ غلط فہمی، سورۃ التوبہ ہی کی ایک دوسری آیت سے دور ہو جاتی ہے، جس میں وَرَسُولُهٗ کے معطوف کو مؤخر کر کے یہ فاصلہ ختم کر دیا گیا ہے۔

سَيُؤْتِينَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُولُهٗ (التوبہ-۵۹)

ان وجوہ کی بناء پر یہ بات قطعی طور پر طے ہو جاتی ہے کہ أَغْنَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ میں، آخر میں واقع، واحد غیب کی یہ ضمیرِ مضاف الیہ، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف راجع ہوتی ہے، نہ کہ کسی اور طرف، بالخصوص جبکہ ''کسی اور'' کا ذکر تک آیت میں موجود نہ ہو۔

ضمیرِ واحد کے استعمال کی دوسری صورت کی مثالیں

توحیدِ ضمیر کی دوسری صورت میں یہ ضمیر مفرد، دونوں مذکور چیزوں کی طرف فرداً فرداً لوٹتی ہے، قطع نظر اس کے کہ ان میں کوئی مرجع، تذکیر و تانیث کے اعتبار سے، ضمیر مفرد سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔

پہلی مثال

کلامِ عرب اور کلام اللہ میں اس کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں، رہا کلامِ عرب، تو اس کی نظیر، یہ شعر ہے۔

ان شرخ الشباب والشعر الاسود ‏ مَا لَمْ یعاصَ کان جنوناً [۱]

اس شعر میں ''لَمْ یُعَاض'' واحد کا صیغہ ہے، تثنیہ کے اعتبار سے لَمْ یعاضیا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ اس سے قبل، دو چیزوں، اٹھتی ہوئی جوانی (شرخ الشباب) اور سیاہ بال (الشعر الاسود) کا ذکر ہے، لَمْ یُعَاض میں مضمر ضمیر واحد، فرداً فرداً، دونوں مذکورہ چیزوں کی طرف لوٹتی ہے۔

دوسری مثال

دوسری مثال میں، کلامِ عرب کا درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیے۔

---

۱ بحوالہ البیان فی غریب اعراب القرآن، لابن الانباری، جلد ۱، صفحہ ۳۹۸

۲ بحوالہ اِملاء ما من بہ الرحمن لابی البقاء العکبری، جلد ۲، صفحہ ۱۷

نحن بما عندنا و انت بما عندک راض و الرَّأیُ مختلف ؎۲

اس شعر میں نَحْنُ (ہم) اور اَنْتَ (تُو) دونوں اسمائے ضمیر کی خبر کے طور پر، صیغہ واحد کا اسم فاعل رَاضٍ لایا گیا ہے، جو نَحْنُ (ہم) اور اَنْتَ (تُو) دونوں سے فرداً فرداً وابستہ ہوتا ہے۔

تیسری مثال

تیسری مثال، قرآن کریم سے پیش کی جا رہی ہے --- قرآنِ کریم میں اگرچہ، اس کی بہت سی مثالیں ہیں، لیکن ہم صرف دو مثالوں پر اکتفاء کریں گے، پہلی مثال، سورۃ الجمعہ کی یہ آیت ہے۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوَ ۨ انفَضُّوٓا إِلَيْهَا (الجمعہ-۱۱) اور جب انھوں نے تجارت اور کھیل تماشا دیکھا تو اُس کی طرف لپک گئے۔

اس آیت میں تِجَارَتَ اور لھو (کھیل)، دو چیزوں کا ذکر ہے، لیکن ان دونوں کے بعد (اِلَیْھَا میں ''ھا'' کی ضمیر) مفرد لائی گئی ہے، جو فرداً فرداً، دونوں مذکور چیزوں کی طرف لوٹتی ہے، اس ضمیر کی تانیث میں مرجعِ بعید کا لحاظ رکھا گیا ہے، جو تِجَارَةً ہے۔

چوتھی مثال

اس سلسلہ کی چوتھی مثال، سورۂ توبہ کی درجِ ذیل آیت ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (التوبہ-۳۴) اور جو لوگ سونے اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں، اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ....

اس آیت میں بھی دو چیزوں کا ذکر ہے الذَّھَب (سونا) اور الفِضَّةَ (چاندی)، اس کے بعد یُنفِقُونَهَا میں ضمیر مفعول (ھا) کو مفرد لایا گیا ہے، یہ ضمیر بھی فرداً فرداً دونوں چیزوں (سونا اور چاندی) کی طرف راجع ہوتی ہے، اس آیت میں ضمیر کی تانیث میں مرجعِ قریب (الفِضَّةَ) کا لحاظ رکھا گیا ہے، جبکہ سورۃ الجمعہ والی آیت میں مرجعِ بعید کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

ان دونوں آیات سے یہ بھی واضح ہے کہ ضمیر کے دونوں مراجع میں سے کوئی ایک مرجع (خواہ وہ قریب کا ہو یا بعید کا) تذکیر و تانیث کے اعتبار سے، اگر ضمیر کے ساتھ مطابقت نہیں بھی رکھتا، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اب دیکھئے، سورۃ الجمعہ کی آیت میں ''لھو'' مذکّر ہے، جبکہ اِلَیْھَا میں ضمیر مجرور مؤنث واقع ہوئی ہے، اور یہاں اَلذَّھَبَ، اگرچہ مذکر ہے، لیکن یُنفِقُونَهَا میں واقع ضمیر مفعول، مؤنث ہے۔

الغرض، غلام احمد پرویز ہوں، یا طلوعِ اسلام کا کوئی مدیر ہو، اُن کا یہ نظریہ قطعی غلط ہے کہ دو اشیاء (یا دو ہستیوں) کے ذکر کے بعد، اگر ضمیر واحد لائی جائے، تو اس کا مرجع خارج سے درآمد کر لیا جائے، ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مدیر موصوف، ان دونوں آیات (التوبہ-۳۴ اور الجمعہ-۱۱) میں، اپنی ''نکتہ رسی'' کی بنیاد پر، کون سا خارجی مرجع درآمد کرتے ہیں۔

ایک آیت کی معنوی تحریف اور پھر افتراء پردازی

سورۃ النساء کی آیت - ۵۹ کی لمبی چوڑی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے، اور رکیک اور دور خیز تاویلات سے کام لے کر، ''مفکر قرآن'' نے ''اللہ ورسول'' سے مرکز ملت ہی کو مراد لیا ہے، اس پر مدیر طلوعِ اسلام فرماتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کے یہ معانی صرف پرویز صاحب نے ہی بیان نہیں کیے بلکہ قدیم وجدید تمام مفسرین نے بیان کیے ہیں .... [۱]

قبل اس کے کہ اس اقتباس کو مکمل کیا جائے، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ پیش کردہ اسی جزوی حصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ قطعی غلط اور جھوٹ ہے، کیونکہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کے، یہ معنی، قدیم وجدید مفسرین میں سے کسی ایک نے بھی بیان نہیں کیے، خود طلوعِ اسلام نے (اسی شمارہ - اگست ۱۹۸۸ء میں)، مولانا ثناء اللہ امرتسری، امام رازی، علامہ سیوطی، مفسر بغوی اور رئیس المحدثین امام بخاری رحمة الله عليهم اجمعين کے نام سے جو عبارتیں درج کی گئی ہیں، ان میں کوئی ایک عبارت بھی، سورۃ النساء، آیت ۵۹ سے متعلق نہیں ہے، پھر ان عبارتوں کو بھی، اصل سیاق وسباق سے کاٹ کر، (ایک غلط موقع ومحل میں) توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان تمام عبارتوں میں کتر بیونت کے جو کرشمے دکھائے گئے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا پردہ چاک کیا جائے، پھر اگر یہ جملہ عبارات نہیں، تو ان میں سے اکثر عبارات، عربی زبان میں ہیں جن تک عام لوگوں کی رسائی نہیں ہے، اس لیے اسی قسم کی جو کرشمہ سازی، مولانا مودودیؒ کی اردو عبارت میں کی گئی ہے، آگے چل کر صرف اسی کو بے نقاب کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے، کیونکہ سید مودودیؒ کی عبارت تک رسائی، تحقیق کرنے والوں کے لیے مشکل نہیں ہے، ہمیں یقین ہے کہ عباراتِ مخالفین میں، اس قسم کی جسارت کرتے وقت، نہ تو کبھی پرویز صاحب ہی کو خوفِ خدا اور آخرت میں جواب دہی کا احساس ہوا، اور نہ کسی مدیر طلوعِ اسلام کو۔

لیجئے، اب اقتباس کو مکمل کرتے ہوئے، سابقہ عبارت کے ساتھ، مندرجہ ذیل عبارت کو بھی مسلسل انداز میں ملاحظہ فرمایئے:

حیرت کی بات یہ ہے کہ .... تمام مفسرین نے بیان کیے ہیں، اس سلسلہ میں پرویز صاحب نے اسی آیت کی تفسیر کے حاشیہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا بھی ایسا ہی مسلک، ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

''زمین سے مراد، یہاں وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن وامان قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو، اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب، اس صالح نظام کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو''، (تفہیم القرآن، جلد ۱، صفحہ ۴۶۵) [۲]

فکرِ طلوعِ اسلام سے وابستہ افراد میں، یہ عادت اور وصف، مشترک ہے کہ وہ اپنی مطلب برآری کے لیے، اپنے مخالفین کی عبارتوں کو، نہ صرف یہ کہ سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں، بلکہ انھیں ادھورے انداز میں بھی مقتبس کرتے

---

[۱] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۸۸ء، صفحہ ۴۸ [۲] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۸۸ء، صفحہ ۴۸

ہیں، خود پرویز صاحب نے اپنی تفسیر کے اس مقام پر، جس کا حوالہ، اقتباسِ بالا میں دیا ہے، اس اقتباسِ مودودیؒ کو پورا درج کرنے کی بجائے ادھورا ہی درج کیا ہے، بالکل یہی حرکت، طلوعِ اسلام سے وابستہ ایک نمایاں فرد، جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے، اُس وقت کی تھی جبکہ وہ مولانا مودودیؒ سے، سنت کی آئینی حیثیت کے موضوع پر قلمی مناظرہ کر رہے تھے، اُس وقت، مولانا مودودیؒ نے، اس کا جو جواب دیا تھا، اس سے اس مغالطہ کی قلعی کھل جاتی ہے، جو یہ حضرات، مودودیؒ صاحب کے ادھورے اقتباس کی آڑ میں دیا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالودود، مولانا مودودیؒ اور پرویز

یہاں ہم ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا یہی مغالطہ انگیز اعتراض، اور پھر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا جواب، ان کے اپنے قلم سے پیش کیے دیتے ہیں، تاکہ اصل حقیقت، طشت از بام ہو جائے --- ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے، اپنے آخری خط میں، مولانا مودودیؒ کو لکھا تھا۔

> یہ جو میں نے کہا ہے کہ ''خدا اور رسول'' سے مراد، اسلامی نظام ہے، تو یہ میری اختراع نہیں، اس کے مجرم، آپ بھی ہیں، آپ نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں، سورۂ مائدہ کی آیت --- إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ .... کی تشریح کرتے ہوئے لکھا تھا --- اللہ اور رسول سے لڑنے کا مطلب، اس صالح نظام کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو، ایسا نظام، جب کسی سرزمین میں قائم ہو جاتا ہے، تو اس کو خراب کرنے کی کوشش کرنا دراصل خدا اور رسول کے خلاف جنگ ہے ---
>
> ذرا غور فرمایئے، اگر میں ''خدا اور رسول'' سے مراد، اسلامی حکومت لوں، تو ہدف طعن و تشنیع بن جاؤں اور آپ اس سے وہی مراد لیں تو مفسر قرآن کہلائیں۔ [1]

اُس وقت، مولانا مودودیؒ صاحب نے، ڈاکٹر صاحب کے جواب میں لکھا تھا

> یہاں پھر ڈاکٹر صاحب نے میرے سامنے میری ہی عبارت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنیکی کوشش کی ہے، اصل عبارت یہ ہے --- ''ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے، تو اس کو خراب کرنے کی کوشش کرنا، قطع نظر اس کے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو، یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لیے ہو، دراصل، خدا اور رسول کے خلاف جنگ ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں، ہر اس شخص کو جو برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے، بادشاہ کے خلاف لڑائی (Waging war against the king) کا مجرم قرار دیا گیا، چاہے اس کی کارروائی، ملک کے کسی دور دراز گوشے میں، ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اور بادشاہ اس کی دسترس سے کتنا ہی دور ہو'' --- [2]

تفہیم القرآن سے خود اپنا یہ اقتباس پیش کرنے کے بعد، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا تھا۔

---

[1] بحوالہ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، (منصبِ رسالت)، صفحہ ۱۷۱ [2] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۷۱ تا صفحہ ۱۷۲

اب ایک معمولی سمجھ بوجھ والا آدمی بھی خود دیکھ سکتا ہے کہ بادشاہ کی نمائندگی کرنے والے سپاہی کے خلاف جنگ کو، بادشاہ کے خلاف جنگ قرار دینے، اور سپاہی کو خود بادشاہ قرار دینے میں کتنا بڑا فرق ہے، ایسا عظیم فرق، ان دو باتوں میں ہے کہ ایک شخص، اللہ اور رسول کے نظامِ مطلوب کو چلانے والی حکومت کے خلاف کارروائی کو، اللہ اور رسول کے خلاف کارروائی قرار دے، اور دوسرا شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہ حکومت، خود ''اللہ اور رسول ہے''، اس فرق کی نزاکت، پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک آپ ان دونوں کے نتائج پر تھوڑا سا غور نہ کر لیں، فرض کیجئے کہ اسلامی حکومت، کسی وقت ایک غلط حکم دے بیٹھتی ہے جو قرآن وسنت کے خلاف پڑتا ہے، اس صورت میں، میری تعبیر کے مطابق تو عام مسلمانوں کو اٹھ کر یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ --- ''آپ اپنا حکم واپس لیجئے، کیونکہ آپ نے اللہ اور رسول کے فرمان کی خلاف ورزی کی ہے، اللہ نے قرآن میں یہ فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے یہ ثابت ہے، اور آپ اس سے ہٹ کر یہ حکم دے رہے ہیں، لہٰذا آپ اس معاملہ میں اللہ اور رسول کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے'' --- مگر منکرینِ حدیث کی تعبیر کے مطابق، اسلامی حکومت، خود ہی اللہ اور رسول ہے، لہٰذا، مسلمان، اس کے کسی حکم کے خلاف یہ استدلال لانے کا حق نہیں رکھتے، جس وقت وہ یہ استدلال کریں گے، اس وقت حکومت یہ کہہ کر اُن کا منہ بند کر دے گی، کہ --- اللہ ورسول، ہم خود ہیں، جو کچھ ہم کہیں اور کریں، وہی قرآن بھی ہے اور سنت بھی'' --- [1]

یہ ہے وہ بنیادی فرق، جو اسلامی نظام کے امیر وامام اور طلوعِ اسلام کے ''مرکزِ ملت'' میں پایا جاتا ہے، اور جسے مولانا مودودیؒ کے پورے اقتباس اور پھر ان کی اپنی وضاحت نے خوب نمایاں کر دیا ہے، اور پھر داد دیجئے، پرویز صاحب کو، اور ان کے ادارے سے وابستہ دیگر حضرات کو، جو ستمبر ۱۹۶۱ء میں مودودی صاحب کی طرف سے کی گئی، اس وضاحت کے بعد بھی، اب تک، اُن کے ادھورے اقتباس کو توڑ مروڑ کر، اپنے باطل موقف کے حق میں استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں، اور تو اور خود پرویز صاحب نے بھی (جو طلوعِ اسلام کے صفحات میں ''مفکرِ قرآن'' قرار دیئے جاتے ہیں)، اپنی تفسیر (مطالب الفرقان، جلد چہارم، صفحہ ۳۳۸) میں، اس آیت (النساء-۵۹) کی تفسیر کرتے ہوئے، حاشیہ میں ادھورا اقتباس ہی نقل کیا ہے، حالانکہ یہ تفسیر، پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی، یعنی مودودیؒ صاحب کی وضاحت کے بیس سال دو ماہ بعد۔ لیکن یہ مغالطہ انگیزی اور فریب دہی کا سلسلہ، ہنوز جاری ہے، شاید ایسے ہی کسی موقع پر، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''اذا لم تستحی فاصنع مَا شئت''

ایک درخواست .... ذرا غور تو فرمائیے

طلوعِ اسلام سے وابستہ حضرات تو، اس سے بالاتر ہیں کہ انھیں، اس معاملے میں غور وفکر کی دعوت دی جائے، لیکن عام اہلِ اسلام سے یہ درخواست ہے کہ وہ خود غور فرمائیں کہ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر مجرد ''اللہ'' کا لفظ بولا جائے، تو اس سے واقعی، خالقِ کائنات کی ذات مراد لی جائے، اور اگر صرف ''رسول'' کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد، فی الحقیقت، وہ مامور من اللہ شخصیت لی جائے جو اہلِ ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ ہے، لیکن جب اللہ اور رسول کے الفاظ (معطوف اور معطوف علیہ کی صورت میں) اکٹھے بولے جائیں، تو اب ''اللہ'' اپنی الوہیت سے، اور ''رسول'' اپنے منصبِ رسالت سے معزول ہو گیا، پھر جب اس

[1] ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۷۱ تا صفحہ ۱۷۲

طرح، اللہ کی الوہیت اور نبی کی حیثیتِ نبوت (معاذ اللہ) ختم ہوگئی، تو اس عدم سے "مرکز ملت" وجود میں آیا۔ گویا یہ الوہیت اور نبوت ورسالت کے مسائل نہ ہوئے بلکہ سائنس کی لیبارٹری کے مسائل ہوئے، کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کو، جب ایک خاص ترکیب سے جمع کیا جاتا ہے تو جہاں آکسیجن کی تحریقی خاصیت ختم ہو جاتی ہے، وہاں ہائیڈروجن سے اس کی احتراق پذیری کی صفت، منفک ہو جاتی ہے، اور "پانی" نام کی ایک نئی چیز، اُسی طرح معرض وجود میں آ جاتی ہے، جس طرح، ادارہ طلوعِ اسلام کی قرآنی لیبارٹری میں "اللہ اور رسول" کے مجموعے سے "مرکز ملت" وجود کوش ہو جاتا ہے، جس میں، نہ تو اللہ کی الوہیت کا، اور نہ ہی، رسول و نبی کی رسالت و نبوت ہی کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔

(۳) تیسرا عقیدہ: ایمان بالکتب

بنی نوع انسان کے لیے، اللہ تعالیٰ نے، جو سرکاری فرمان، خود اپنے الفاظ و کلام میں، اپنے انبیاء ورسل کے توسط سے بھیجا ہے، اسے کتاب کہا جاتا ہے، جسے باشندگانِ زمین کے لیے دستور و آئین کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، لیکن یہ آسمانی کتب اگرچہ خالقِ کائنات ہی کی نازل کردہ کتب ہیں، مگر ہیں یہ حروف والفاظ پر مشتمل۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان، کتابی حروف والفاظ سے کہیں زیادہ، انسانی سیرت و کردار سے متاثر ہوتے ہیں، اس لیے، اللہ تعالیٰ نے محض کتابیں نازل کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان کتب کی تعلیمات کو، انبیاء ورسل کے جیتے جاگتے پیکر میں سمو کر بھی پیش کیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تنہا کتاب اللہ، ہدایتِ انسانی کے لیے کافی نہیں تھی، اس لیے رسول اللہ کا ساتھ بھیجا جانا ناگزیر تھا، بالخصوص، جبکہ کتب سماویہ کے الفاظ کا مفہوم جاننے میں اختلاف کا پایا جانا، ناگزیر اور فطری امر بھی ہو، تو ایسی صورت میں، پیغمبرؐ کا اپنا بتایا ہوا مفہوم ہی، ناطق اور معیاری مفہوم ہوگا، نبی کے بیان فرمودہ مفہوم کو نظر انداز کر کے، کسی کا اپنا مفہوم پیش کرنا، خود کو، نبیؐ کے منصب پر براجمان کرنے کے مترادف ہے، الفاظِ کتاب اللہ خواہ کتنے ہی محفوظ ہوں اور وہ تحریف و ترمیم سے خواہ کتنے ہی بالاتر ہوں، عملی زندگی میں مطلوب، الفاظ نہیں، بلکہ مفہومِ الفاظ ہوتا ہے، جسے سیرت و کردار میں ڈھالا جاتا ہے، اگر ہر شخص، اپنی اپنی مرضی اور اپنے اپنے فہم کے مطابق، الفاظِ کتاب کا مفہوم متعین کرنے پر اتر آئے، تو کتاب کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور کتاب اللہ کے اسقدر مفاہیم پیدا ہو جائیں گے کہ ع شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

اسی لیے، اللہ تعالیٰ نے، کتاب اللہ کے ساتھ، رسولؐ کو بھیجنا لازم قرار دیا، اور تنہا کتاب کو، رسولؐ کے بغیر، ہدایتِ انسانی کے لیے ناکافی گردانا، لیکن ہمارے "مفکر قرآن" اور ان کے ہم فکر رفقاء، اس کے برعکس، تنہا کتاب کو بغیر رسول کے، کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گائیڈ کی مطلق ضرورت نہیں ہے، ان کے ہاتھ میں "رہنمائی کا کتابچہ" جو نظر آ رہا ہے، اسے لے لیا جائے، تو یہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کافی ذریعہ ہے۔ رہنما کی رہنمائی کے بغیر، محض، اس چراغ کو حاصل کر لینا ہی مفید مطلب ہے، جو رہنما کے ہاتھوں میں دکھائی دے رہا ہے، یقیناً چراغ، روشنی فراہم کر دے گا مگر رہنما کے بغیر، دوراہوں، تراہوں اور چوراہوں میں سے منزلِ مقصود کو جانے والے راستے کی نشاندہی کرنا، چراغ کے بس کی بات نہیں ہوگی، یہ کام تو بہرحال، رہنما

یا گائیڈ ہی کو انجام دینا ہوگا، پس کتاب اللہ کی موجودگی بھی، نبی کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں کر سکتی، لیکن منکرینِ حدیث، قرآن کی دہائی دے کر، کتاب اللہ اور رسول اللہ کے باہمی تعلق کو کاٹ پھینکتے ہیں، اور پھر تنہا کتاب اللہ کے وہ وہ معانی بیان کرتے ہیں کہ خدا و جبریل و مصطفیٰ بھی حیران و ششدر ہو کر رہ جائیں۔ اس ساری کارروائی کے نتیجہ میں، فکر و نظر میں، ہم آہنگی تو اختیار کی جاتی ہے، لینن اور کارل مارکس جیسے سکہ بند ملاحدہ اور یہود کے ساتھ، لیکن نام، قرآن ہی کا لیا جاتا ہے، تاکہ ان کفارِ یہود کے مقابلہ میں، خود ارشادِ نبوی کو "خلافِ قرآن" کہہ کر رد کیا جا سکے، سچی بات ہے کہ ؎

دل نہ چاہے، تو رسالت کا بھی ارشاد غلط
من کو بھا جائے تو بھانڈوں کی خرافات بجا

حقیقت یہ ہے کہ "مفکرِ قرآن" نے کتاب بلا پیغمبر، اور قرآن بغیر محمدؐ، کا جو نرالہ مسلک اور انوکھا مذہب ایجاد اور اختیار کیا ہے، اس کا اصل مقصد بھی، اور عملی نتیجہ بھی، اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ، محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمودات سے تو دستکش ہو جائیں، لیکن "مفکرِ قرآن" کے بیان کردہ معانی و مفاہیم کو شرفِ قبولیت سے نوازتے رہیں، اور اس طرح، وہ، قرآن کی تبیین و توضیح میں، اس مقام پر بیٹھے نظر آئیں، جس مقام پر، خود خدائے قدوس نے، اپنے پیغمبر کو جلوہ فرما کیا تھا۔

یہ ہے، ایمان بالکتب اور بالخصوص ایمان بالقرآن کی اصل حیثیت، جو منکرینِ حدیث کے ہاں پائی جاتی ہے۔ یعنی نام تو قرآن کا، مگر خیالات، تہذیبِ غالب کے ـ الفاظ تو قرآن ہی کے، مگر معانی و مفاہیم، خارج از قرآن و اسلام سرچشمہ سے ـ دعویٰ، تصریفِ آیات کے ذریعہ تفسیرِ قرآن کا، مگر عمل اور اس کا نتیجہ، تحریفِ آیات کے ذریعہ تغییرِ قرآن کا۔

الغرض، قرآنی الفاظ سے، روحِ قرآن کے خلاف، معانی کشید کرنے کی مثالیں، اس مقالہ میں، قدم قدم پر موجود ہیں، اس لیے ان کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، البتہ "مفکرِ قرآن" کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے جس کے تحت، یہ کہا جاتا ہے کہ کتاب بلا پیغمبر اور قرآن بغیر محمدؐ، انسانی ہدایت کے لیے کافی ہے۔

کیا تنہا قرآن، ہدایت کے لیے کافی ہے؟

خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ تمھارے لیے ضابطۂ حیات کے طور پر قرآن کافی ہے أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱) کیا ان لوگوں کے لیے وہ کتاب کافی نہیں جسے ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے؟" [۱]

ایک اور مقام پر "مفکرِ قرآن" فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعتراضات کے جواب میں کہا تھا کہ: أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱) "کیا وہ کتاب، جسے تو ان کے سامنے پیش کرتا ہے، ان کے لیے کافی نہیں" تو یہ اس کے ساتھ، کچھ اور بھی چاہتے ہیں؟ قرآن مجید سے الگ اور خارج، دوسری وحی کے عقیدہ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی کتاب انسانی راہنمائی کے لیے کافی نہیں۔ [۲]

---

[۱] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۳ [۲] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۸ء، صفحہ ۲۳

ان دونوں اقتباساتِ پرویز میں، اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسانی ہدایت کے لیے، تنہا قرآن ہی کافی ہے، اور ''قرآنی ثبوت'' کے لیے آیت (۵۱/۲۹) کو پیش کیا گیا ہے، حالانکہ اس آیت کو اگر اس کے سیاق وسباق میں رکھ کر پڑھا جائے، تو سرے سے وہ بات نکلتی ہی نہیں ہے جو ''مفکرِ قرآن'' نے نکال ڈالی ہے، لیجئے آیت کو اپنے سیاق وسباق میں ملاحظہ فرمائیے۔

وَقَالُوا لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ايٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَإِنَّمَآ أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّآ أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (العنکبوت - ۵۰ تا ۵۱) یہ لوگ کہتے ہیں کہ '' کیوں نہ اتاری گئیں، اس شخص پر نشانیاں، اس کے رب کی طرف سے؟'' کہو '' نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں، اور میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں، کھول کھول کر''۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری، جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔

آیت زیرِ بحث، اپنے سیاق وسباق میں، اس بات کو اجاگر کر رہی ہے کہ قرآن کا کافی ہونا، اُس کے معجزہ اور نشانی ہونے کے لحاظ سے ہے، کیونکہ یہ بات، کفارِ عرب کے اس سوال کے جواب میں کہی گئی ہے کہ '' اس شخص پر، کیوں نہ اس کے رب کی طرف سے، نشانیاں اتاری گئیں؟'' لیکن '' مفکرِ قرآن'' اپنے مخصوص پرویزی حیلوں کے تحت، آیت کو اس کے سیاق وسباق سے، اکھاڑ کر، اسے یہ معنٰی پہناتے ہیں کہ '' قرآن، تنہا ہی، دین وہدایت کے لیے کافی ہے''۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ فی الواقع قرآن سے ہدایت لینے کے متمنی تھے یا اُلٹا قرآن کو ہدایت دینے کے۔ وہ قرآن کے مطابق، اپنے خیالات ومعتقدات کو بدلا کرتے تھے، یا اپنے افکار ونظریات کے مطابق، کتاب اللہ کو تبدیل کیا کرتے تھے؟

لیجئے! اب اسی آیت کا صحیح مفہوم بھی پرویز صاحب کے قلم ہی سے ملاحظہ فرمائیے، جسے کبھی انھوں نے '' مفکرِ قرآن'' کا منصب پانے سے قبل، معلوم نہیں کہ کیسے بیان کر دیا تھا۔

یہی بات، دوسری آیت میں، مزید تصریح کے ساتھ ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ايٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَإِنَّمَآ أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّآ أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ (۲۹/۵۱-۵۰) اور کافروں نے کہا کہ کیوں نہ اس کے اوپر کوئی نشانی اتاری گئی۔ کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں میں تو کھلا ہوا آگاہ کرنیوالا ہوں، کیا ان کے لیے کافی نہیں کہ ہم نے تیرے اوپر کتاب اتار دی ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے یعنی جس نشانی یا معجزہ کے وہ طلبگار ہیں، اگر ان کے پاس بصیرت ہو، تو اس کے لیے قرآن کافی ہے۔ [1]

یہ اقتباس، مولانا اسلم جیراجپوری کا ہے، اب خود پرویز صاحب کے قلم سے بھی یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

جب مخالفین، نبی اکرمؐ سے معجزات طلب کرتے تو ان کی توجہ بھی اس معجزہ (قرآن) کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی، سورہ عنکبوت میں ہے وَقَالُوا لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ايٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول پر، اس کے رب کی طرف سے

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۵۰ء، صفحہ ۲۲

(محسوس) نشانات (معجزات) کیوں نہیں اتارے گئے۔ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ - ان سے کہو کہ معجزات، خدا کے ہاں ہیں، یہ ساری کائنات، اس کی خلاقی کا معجزہ ہے، یہاں کا ذرہ ذرہ معجزہ ہے، سارے انسان مل کر بھی چاہیں تو گھاس کی ایک پتی پیدا نہیں کر سکتے، باقی رہا میں، تو وَإِنَّمَآ أَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ میرا منصب یہ ہے کہ میں تمہیں، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں، یہ چیز میں اس کتاب کے ذریعہ کرتا ہوں، جو میری طرف وحی کی گئی ہے، یہ کتاب سب سے بڑا معجزہ ہے أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ کیا یہ ان کے لیے کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۹/۵۱) اس کتاب میں، ان لوگوں کے لیے، جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، خدا کی رحمت اور (انسانی مقصدِ زندگی کی) یاد دہانی ہے، خدا کی یہ کتاب ایک زندۂ جاوید معجزہ ہے۔ [1]

یہی صحیح مفہوم، ایک جگہ، ''مفکر قرآن'' کو اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہی بنی! چنانچہ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ

یہ تھا وہ جواب، جو ان لوگوں کو معجزہ طلبی پر دیا گیا اور کہا گیا کہ وَقَالُوْا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَإِنَّمَآ أَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۹/۵۰) ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسولؐ کو خدا کی طرف سے معجزات کیوں نہیں دیئے جاتے، ان سے کہو کہ معجزات کا دینا، خدا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن اس سے سلسلۂ رشد و ہدایت کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ میرا منصب معجزات دکھانا نہیں، تمہیں اس سے آگاہ کرنا ہے کہ جس روش پر تم چل رہے ہو، اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں''۔ اور اس کے بعد أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۹/۵۱) ''کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ خدا نے، اے رسول! تمھاری وساطت سے ان کی طرف اس قسم کا ضابطۂ زندگی بھیجا ہے کہ جو لوگ بھی اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں گے انھیں دنیا میں سامانِ زیست فراوانی سے ملے گا اور وہ عزّ و شرف سے بھی بہرہ یاب ہوں گے، کیا یہ کتاب، ان کے لیے کافی معجزہ نہیں جو یہ حسّی معجزات کے مطالبے کرتے رہتے ہیں۔ [2]

''مفکر قرآن'' کے ان دونوں متضاد نوعیت کے اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ وہ ایک ہی آیت سے کس طرح متضاد مفاہیم اخذ کیا کرتے تھے اور حسبِ ضرورت، جہاں جو مفہوم، مفیدِ مطلب ہوا، وہاں اسے پیش کر دیا، گویا، پرویز صاحب کا زرخیز دماغ، خیالات کے اعتبار سے، ایک ایسی زنبیلِ عمرو عیار ہے کہ دنیا جہان کی ہر متضاد شے اس میں موجود ہے، اور مداری کی اس پٹاری میں سے، جب اور جیسا کچھ چاہا، نکال کر دکھا دیا، اور اپنے اندھے مقلدین کو یہ ڈھنڈورا پیٹنے پر لگا دیا کہ

پرویز صاحب کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نہ کبھی پرانی ہوتی ہیں اور نہ ان میں کہیں تضاد ہی واقع ہوتا ہے۔ [3]

اب یہ بات، اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ اندھے مقلدین، پرویز صاحب کی تحریروں کو پڑھے بغیر ہی، ان کی یہ ''خصوصیّت'' بیان کرتے ہیں، یا ''علم و بصیرت'' کی بنیاد پر حقائق کو قبول کرنے کے یہ دعویدار بھی ''اندھے اعتماد'' کا اظہار فرما رہے ہیں؟

(۴) چوتھا عقیدہ: ایمان بالملائکہ (فرشتوں پر ایمان)

اسلامی عقائد میں، ایک عقیدہ، ایمان بالملائکہ کا بھی ہے، ملائکہ کا ترجمہ بالعموم ''فرشتوں'' کے لفظ سے کیا جاتا ہے، یہ

[1] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۴-۲۵ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۳۱۳ [3] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۸۳ء، صفحہ ۲۶

وہ ہستیاں ہیں، جنھیں جاہل لوگوں نے، خدا کی خدائی میں شریک قرار دیے رکھا، اور انھیں، اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دیکر، ذاتِ باری تعالیٰ کو آلودۂ نسب کر رکھا تھا، یہ مخلوق، غیر مرئی ہونے میں، جنوں سے مماثل ہے۔

ایمان بالملائکہ کا مقصد اور فرشتوں کی ذمہ داریاں

فرشتوں پر ایمان کے عقیدہ کو، صرف اس لیے، عقائد میں شامل کیا گیا ہے کہ نظام کائنات میں، ان کی واقعی حیثیت کو بیان کر کے، ایک طرف، تو، عقیدۂ توحید کو خالص اور بے آمیز کر دیا جائے، اور دوسری طرف، شرک کے دروازہ کو قطعی بند کر دیا جائے، چنانچہ قرآن کریم نے فرشتوں کا جو تذکرہ بھی کیا ہے، اس میں اسی پہلو کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، بڑی تفصیل سے ان کی مفوضہ ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے، جن میں سے چند ایک درجِ ذیل ہیں۔

(۱) عندالموت، قبضِ ارواح

قرآن کریم نے بکثرت مقامات پر، یہ بیان کیا ہے کہ موت کے وقت، انسانی ارواح کو قبض کرنا، ملائکہ کی ذمہ داری ہے۔

۱- قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدہ -۱۱) آپ کہہ دیجئے کہ تمہیں موت کا وہ فرشتہ وفات دیتا ہے، جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

یاد رکھئے کہ تمام انسانوں کی ارواح قبض کرنے والا فرشتہ، صرف ایک ہی نہیں ہے، جسے ملک الموت کہا جاتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ اور بہت سے فرشتے بطور معاون و مددگار شریکِ عمل ہوتے ہیں، چونکہ ملک الموت، ان سب کا سردار ہوتا ہے اس لیے سورہ سجدہ میں، یہ کام اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے، ورنہ قرآن میں ایسے فرشتوں کا ذکر بصیغۂ جمع بھی آیا ہے۔

۲- اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِىْٓ اَنْفُسِهِمْ (النساء-۹۷) جو لوگ، اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں، جب فرشتوں نے قبض کیں۔

حتٰی کہ اگر کسی فردِ واحد کی روح قبض کرنا مقصود ہو، تب بھی، ایک نہیں، بلکہ بہت سے فرشتے اس پر حاضر ہوتے ہیں۔

۳- حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ (الانعام-۶۱) یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کی بھی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے، اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اس میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔

اس لیے ہمارے ہاں، یہ جو تصور پایا جاتا ہے کہ صرف ایک ہی فرشتہ روئے زمین پر مرنے والے تمام انسانوں کی جان قبض کرتا ہے، درست نہیں ہے۔

(۲) پیغام رسانی

فرشتوں کی ذمہ داریوں میں، ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ خدائی پیغام کو اس کے رسولوں تک پہنچا دیں، یہ پیغام رسانی، وحی کی متفرق النوع صورتوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ایک صورت، فرشتہ بھیج کر، نبی تک پیغام رسانی کرنے کی ہے، جو فرشتے یہ فریضہ انجام دیتے ہیں ان کا قائد، جبریل ہے، بذریعہ جبریل (یا بذریعہ فرشتہ) وحی کرنے کا ذکر درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے۔

أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَآءُ (الشوریٰ-۵۱) یا پھر وہ کوئی پیغام بر بھیجتا ہے جو حکمِ خدا، جو کچھ چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔

خود پرویز صاحب بھی، ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

رسولوں کی طرف بھیجنے کا فریضہ، منتخب ملائکہ کے ذمہ عائد کیا جاتا تھا۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۲۲/۷۵) اللہ نے ملائکہ میں سے بعض کو پیغام رسانی کے لیے منتخب کر لیا ہے، اسی طرح بعض انسانوں کو بھی بلاشبہ، اللہ ہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ [۱]

(۳) موت تک انسانوں کی حفاظت کرنا

فرشتوں کو یہ حکم بھی ہے کہ وہ لوگوں کی موت کے وقت تک ان کی حفاظت کریں۔ قرآن میں مذکور ہے کہ لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ (الرعد-۱۱) ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

اور ایک مقام پر یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً (الانعام-۶۱) وہ اپنے بندوں پر حاوی ہے اور ان پر محافظ بھیجتا ہے۔

(۴) ملائکہ کی جنگ میں امداد

قرآن کریم کا مطالعہ، اس امر کو واشگاف کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس جنگ میں فرشتوں کے ذریعہ بھی مدد کی تھی، جس میں، حضور اکرم ﷺ بنفس نفیس شریک تھے، ایسی آیات میں سے ایک یہ آیت بھی ہے جو آلِ عمران میں واقع ہے۔

إِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ أَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ أَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ○ بَلٰى إِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَأْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (سورہ آل عمران - ۱۲۴، ۱۲۵) (اے نبی!) یاد کرو، جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے "کیا تمھارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے؟ بیشک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تم پر چڑھ آئیں گے اسی آن، تمھارا رب پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔

(۵) بدکردار قوموں پر عذاب کا کوڑا برسانا

قرآن کریم کی رو سے، خدا سے حکم پا کر، کسی بدکردار قوم کو کیفر کردار تک پہنچانا بھی، فرشتوں کے فرائض میں داخل ہے۔ چنانچہ قوم لوط پر، عذاب کا کوڑا برسانے کا کام، فرشتوں ہی نے انجام دیا تھا، پرویز صاحب لکھتے ہیں

سورۃ الحجر میں ہے فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوطِ ۣالْمُرْسَلُوْنَ (۱۵/۶۱) .... پھر جب ایسا ہوا کہ یہ بھیجے ہوئے (فرشتے) خاندانِ لوط کے پاس پہنچے تو............... [۲]

---

[۱] ابلیس وآدم، صفحہ ۱۴۸

[۲] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۹۴

ایک اور مقام پر، پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ

ز اگر ایک طرف ملائکہ، ایمان و استقامت کی بناء پر، اللہ کی رحمتوں کی نور افشانی کرتے ہیں تو دوسری طرف کفر و سرکشی کے لیے، عذاب خداوندی کے حامل بھی، یہی ہوتے ہیں۔ [۱]

(۶) تسجیلِ اعمالِ انسانی

بنی نوعِ انسان کے جملہ اعمال کا پورا پورا ریکارڈ رکھنا بھی، ملائکہ کے فرائض میں شامل ہے، قرآن کی متعدد آیات میں اس کا ذکر موجود ہے۔

۱---أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (الزخرف-۸۰) کیا انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کے راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔

۲---وَإِذَآ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيٓ اٰيَاتِنَا قُلِ اللّٰهُ أَسْرَعُ مَكْرًا إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ (یونس-۲۱) لوگوں کو بعد از مصیبت، جب ہم ان کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو فوراً وہ ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے کہو اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے، ہمارے فرشتے تمھاری سب مکاریاں لکھ رہے ہیں۔

۳---إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ (۱۷) مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (قٓ - ۱۷تا۱۸) دو کاتب، اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔

ایسی ہی آیات سے استدلال کرتے ہوئے، پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ

ان مقامات میں، کتابتِ اعمالِ انسانی کو، ملائکہ کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ [۲]

(۷) ملائکہ اور تدبیرِ امور

اللہ بزرگ و برتر کے زیرِ فرمان رہ کر، پوری کائنات کے امور کی تدبیر کرنا بھی، فرشتوں کی ذمہ داری میں داخل ہے، خود پرویز صاحب، فرماتے ہیں۔

قرآن نے بتایا ہے کہ قوانین مشیّت کے تابع، ان امور الٰہیہ کو جاری و ساری کرنے کے فرائض، جن کے ذمہ ہیں، انھیں ملائکہ کہا جاتا ہے اس لیے ملائکہ کو مدبرات امور کہا گیا ہے فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْراً (۷۹/۵) دوسری جگہ، انھیں فَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْرًا بھی کہا گیا ہے (۵۱/۴) [۳]

الغرض، فرشتوں کی ان ذمہ داریوں کے اس تفصیلی ذکر سے مقصود، صرف یہ بتانا ہے کہ فرشتے، اللہ تعالیٰ کے غلاموں

[۱] ابلیس و آدم، صفحہ ۱۵۷ [۲] ابلیس و آدم، صفحہ ۱۶۱ [۳] ابلیس و آدم، صفحہ ۱۴۵

اور بندوں کی حیثیت سے نظامِ کائنات کو، بحکم خداوندی چلا رہے ہیں، وہ نہ تو کائنات کی تخلیق اور اس کے اقتدار و اختیار میں، خدا کے ساتھ شریک ہیں اور نہ ہی خدا سے ان کا کوئی نسبی تعلق ہے، فرشتے، اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوق ہیں جو معصیتِ رب سے قطعی بالاتر ہیں، اس مخلوق کو حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا تھا، اور یہی مخلوق، از روئے قرآن، حاملینِ عرشِ خداوندی ہے۔

ملائکہ اور موقف پرویز

لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اگرچہ ملائکہ کو تسلیم کرتے ہیں، مگر اس طرح نہیں جس طرح قرآن کہتا ہے، بلکہ اُس طرح کہ جس طرح وہ چاہتے ہیں کہ ان کو مانا جائے۔ آیئے یہ دیکھیں کہ پرویز صاحب فرشتوں کو کیسے اور کیا مانتے ہیں۔

(ا) ملائکہ۔ کائناتی قوتیں

''مفکرِ قرآن'' کے نزدیک فرشتے، محض ''فطرت کی قوتیں'' ہیں، وہ کوئی ایسی مخلوق نہیں جو باقاعدہ تشخص رکھتی ہو، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ملائکہ سے مفہوم، وہ قوتیں (Forces) ہیں، جو کائنات کی عظیم القدر مشینری کو، مشیئتِ ایزدی کے مطابق، چلانے میں مصروف العمل ہیں۔ [1]

فرشتوں کو ''ہستیاں'' قرار دینے کی بجائے، ''قوتیں'' قرار دینا، ایک ایسا نظریہ ہے، جو قرآنی الفاظ سے قدم قدم پر ٹکراتا ہے، قرآن، فرشتوں کا جس انداز میں ذکر کرتا ہے، اس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ فرشتے، محض مجرد قوتیں نہیں ہیں، جو تشخص سے عاری ہوں، بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں، جو ذی شعور و ذی ارادہ ہیں، اور جن سے اللہ تعالیٰ اس وسیع کائنات پر پھیلی ہوئی، سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لے رہا ہے، یہ وہ خدائی اہل کار ہیں جو احکام الٰہی کو نافذ کرتے ہیں، لیکن قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ستیاناس ہو، انسان کی انتہا پسندی کا، کہ اگر وہ افراط کی طرف جائے تو ان ہستیوں کو خدا کی خدائی میں شریک و سہیم قرار دے دیتا ہے، اور خدا سے ان کا نسبی تعلق قائم کر ڈالتا ہے، لیکن جب یہ تفریط کی طرف لڑھکتا ہے، تو وہ ان کی ہستی ہی کا منکر ہو کر، انھیں محض فطرت کی ایسی اندھی بہری قوتیں قرار دے بیٹھتا ہے جو شعور و ارادہ سے یکسر محروم ہیں۔

پھر اگر، ملائکہ سے مراد، کائنات کی قوتیں ہی ہوں، تو ان کا منکر کون ہے؟ حتیٰ کہ دہریئے اور منکرینِ خدا بھی، ان کائناتی قوتوں اور فطری قوتوں کے منکر نہیں ہیں، پھر آخر ان پر ایمان لانے کا معنٰی کیا؟ کیا ہر کائناتی قوت اور فطرت کی ہر قوت، لائق اعتقاد ہوا کرتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر ان کائناتی قوتوں کو ایمانیات میں کیوں شامل کیا گیا جنھیں ملائکہ کہتے ہیں۔

سجدہ آدم کی انوکھی توجیہ اور اس کا جائزہ

قرآن کریم میں، قصۂ آدم کے ضمن میں، خدا اور فرشتوں کے درمیان، واقع ہونے والے مکالمہ کا ایک ایک جز،

[1] ابلیس و آدم، صفحہ ۱۴۴

ملائکہ کے باتشخص ہستیوں کے وجود پر، دلالت کرتا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب، سجدۂ آدم کے متعلق فرماتے ہیں۔

> ملائکہ نے آدم کو سجدہ کر دیا، مطلب یہ کہ فطرت کی قوتیں، انسان کے تابع فرمان بنادی گئی ہیں، یہ تمام قوتیں، خدا کی اسکیم (Scheme) کے مطابق (جسے مشیئت کہا جاتا ہے) مختلف امور کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل ہیں۔ [1]

کیا واقعی ملائکہ کے سجدہ کر ڈالنے کی صورت میں، فطرت کی قوتیں، انسان کے تابع فرمان ہو چکی ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو طوفان باد و باراں سے سینکڑوں انسانوں کا مر جانا کیوں؟ مکانات کی چھتوں کا اڑ جانا اور عمارتوں کا منہدم ہونا کس لیے؟ آفاتِ ارضی و سماوی سے فصلوں کی تباہی کیوں؟ زلزلہ سے فلک بوس عمارتوں کا دھڑام سے نیچے گر جانا اور انسانی آبادیوں کا وسیع پیمانے پر لقمۂ اجل بن جانا کس لیے؟ سیلاب سے ہری بھری فصلوں کا اجڑ جانا، اور باغات کا ویرانوں میں بدل جانا کیوں؟ آتش فشاں کے پھٹنے سے، اس بہتی ہوئی آگ کا کھلے عام رقصِ موت کیوں؟ کیا ایسے مواقع پر، فطرت کی قوتوں پر انسان کا کوئی بس چلتا ہے؟ پھر آخر انسان، ملائکہ کا مسجود کیونکر ہوا؟

(۲) ملائکہ داخلی قوتیں

''مفکر قرآن'' بہر حال، شہنشاہِ تضادات تھے، وہ کون سا عنوان ہے جس پر قلم اٹھایا اور الفاظ کی شیشہ بندی کرتے ہوئے، تضادات کو اختیار نہیں کیا، ملائکہ کے بارے میں، ان کا ایک تصور یہ ہے کہ وہ انسانی وجود سے خارج ''کائناتی قوتیں'' ہیں، اور دوسرا تصور یہ ہے کہ وہ ''انسان کی داخلی قوتیں'' ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ

> یہ ملائکہ، ہماری اپنی ہی داخلی قوتیں ہیں یعنی ہمارے اعمال کے وہ اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں، جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں، قرآن اسے قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ [2]

نامعلوم، ہماری ''اپنی ہی ان داخلی قوتوں'' سے کیا مراد ہے؟ قوتِ لامسہ؟ قوتِ باصرہ، قوتِ سامعہ، قوتِ ذائقہ اور قوتِ شامہ؟ یا قوتِ حافظہ؟ یا قوتِ فکر؟ وغیرہ۔ اگر فی الواقع یہی مراد ہیں تو پھر ان پر ایمان بالغیب کا قرآنی مطالبہ عبث اور لایعنی مطالبہ ہے، اس لیے کہ آخر ان قوتوں کا منکر ہے کون، جسے ان کے ماننے کی دعوت دیجائے؟ یہ تو ایسا ''ایمان بالغیب'' ہے جسے بغیر، کسی قرآنی دعوت کے، ہر کافر و مشرک، ملحد و زندیق، اور دہریہ و منافق، اپنائے ہوئے ہے۔

کون سی قیامت؟

پھر ''مفکر قرآن'' نے یہ بھی کیا خوب کہا کہ --- ''جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں، قرآن، اسے قیامت سے تعبیر کرتا ہے'' ---

اس جملے میں، قیامت کی یہ تعریف کہ ''یہ وہ وقت ہے جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں''، بجائے خود غور و فکر کی متقاضی ہے۔

---

[1] ابلیس و آدم، صفحہ ۱۴۵ [2] ابلیس و آدم، صفحہ ۱۶۲

سوال یہ ہے کہ اعمال سے مراد، کون سے اعمال ہیں جن کے نتائج، محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں؟ طبعی اعمال، جو حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں؟ مثلاً سانس لینا، حالتِ پیاس میں پانی پینا، بھوک کی حالت میں کھانا کھانا وغیرہ) یا انسانی یا اخلاقی سطح کے اعمال؟ (مثلاً فکرِ صحیح کو اپنا کر، زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالنا، اور منافی ایمان یا خلافِ فکرِ صحیح اعمال مثلاً گناہ وغیرہ سے اجتناب کرنا)۔

اگر پہلی قسم کے اعمال مراد لیے جائیں، تو حالت پیاس میں پانی پینے کا نتیجہ، پیاس بجھنے کی ''محسوس شکل میں'' اور حالتِ بھوک میں، کھانا کھانے کا نتیجہ، ازالۂ جوع کی ''محسوس شکل میں'' سامنے آجاتا ہے، کیا یہی وقت، وقتِ قیامت ہے؟

رہے، دوسری قسم کے اعمال، جو ہماری انسانی اور حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، تو فرض کیجئے کہ کچھ لوگ لواطت شعاری اور کثرت زنا کاری میں غرق ہیں، ان اعمال کا ''محسوس شکل میں'' نتیجہ، امراض خبیثہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، یا پھر جسمانی کمزوری اور بدنی نقاہت کی صورت میں؟ کیا واقعی جب ان اعمالِ بد کا نتیجہ، یوں ''محسوس شکل میں، برآمد ہوتا ہے'' تو وہ وقت، وقتِ قیامت ہے؟

دوسری طرف ایک انتہائی نیک پارسا اور پرہیز گار بندۂ خدا ہے، وہ فکرِ صحیح بھی پیش کرتا ہے، اور لوگوں کی زندگیوں کو اس کے سانچے میں ڈھالتا بھی ہے، بدکردار لوگ اور فکرِ فاسد کے علمبردار افراد، اس کی انتہائی مخالفت کرتے ہیں، لیکن بہر حال، طویل کشمکش کے نتیجہ میں وہ نیک طینت اور خیر خواہِ انسانیت، بندۂ خدا غالب آجاتا ہے، اور اس کے اس دعوت الی الخیر کا نتیجہ ''محسوس شکل میں'' سامنے آجاتا ہے کہ ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے، اب کیا جونہی، اس بندۂ خدا (ﷺ) کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ، اسلامی ریاست کے قیام کی ''محسوس شکل میں'' سامنے آیا، تو ''قیامت واقع ہوگئی''؟

پھر بعض اعمال کے نتائج، تو اسی دنیا میں ''محسوس شکل میں'' سامنے آجاتے ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے، اور بعض اعمال کے نتائج، مرنے کے بعد، اگلی دنیا میں ''محسوس شکل میں'' برآمد ہوتے ہیں، اگر ''انسانی اعمال کے نتائج کا مخصوص شکل میں، سامنے آنا ہی قیامت ہے'' تو اس ''قیامت'' کے وقوع پذیر ہونے کا امکان، دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی۔ ''مفکرِ قرآن'' کے ہاں، آخر ان دونوں میں سے کون سی ''قیامت'' مراد ہے؟ جس پر ایمان بالغیب رکھنا چاہیے؟

(۳) ملائکہ - انسانی جسم کے طبعی تغیرات

ملائکہ سے مراد، ''مفکرِ قرآن'' کے نزدیک، ''کائناتی قوتیں'' اور ''انسان کی داخلی قوتیں'' بیان ہو چکی ہیں۔ اب ملائکہ کا ایک اور مفہوم ''مفکرِ قرآن'' بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

> جو طبعی تغیرات، انسان کے جسم میں رونما ہوتے ہیں اور جن کا آخری نتیجہ انسان کی طبعی موت ہوتی ہے، انھیں بھی ملائکہ کی قوتوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ [1]

[1] ابلیس و آدم، صفحہ ۱۵۹

یقیناً انسان، نطفہ سے ترقی پا کر، اور طبعی تغیرات میں سے گزرتا ہوا، بطن مادر ہی میں، حالت جنین کو پہنچتا ہے، پھر پیدائش کے بعد، شیر خوارگی سے بچپن تک، بچپن سے لڑکپن تک، لڑکپن سے شباب تک، شباب سے کہولت تک اور کہولت سے بڑھاپے تک پہنچتا ہے، پھر اس کے بعد بڑھاپے ہی میں موت کی طرف بڑھتا ہے، پوری انسانی زندگی میں، اس دوران، متعدد طبعی تغیرات، اس کے جسم میں نمودار ہوتے ہیں، اگر یہ جملہ تغیرات، ملائکہ ہی کی قوتیں ہیں تو پھر ان کا منکر کون ہے؟ نفس تغیرات کو تو سب ہی تسلیم کرتے ہیں، کوئی بھی ان کا منکر نہیں ہے، کافر و مشرک، ملحد و زندیق، منافق و مخلص، ہندو و مسلم، سکھ عیسائی، دہریہ و یہود، مجوس و بے دین الغرض، سب ہی ''ملائکہ کی قوتوں'' اور ''انسانی جسم کے ان طبیعی تغیرات'' پر ایمان رکھتے ہیں۔ جب ہر ایک کا یہ اعتقاد، بغیر قرآنی دعوت کے، پہلے ہی سے موجود ہے اور سبھی لوگ پہلے ہی اسے مان رہے ہیں، تو پھر قرآن کی طرف سے یہ دعوت مہملہ کیسی؟ اور اس پر تلقینِ ایمان کیسی؟ آخر جاگتے ہوئے کو جگانے کی یہ زحمت کیسی؟ اور پھر پانی میں مدھانی چلانے کا فائدہ کیا؟

پھر ان طبیعی تغیراتِ جسمانیہ کا، انسان کی فکری فلاح، عملی اصلاح اور اخلاقی تعمیر سے کیا تعلق ہے کہ ملائکہ پر ایمان لانا قرآن نے لازم ٹھہرا دیا ہے؟ اگر کوئی ایمان بالملائکہ سے بے نیازی برتے، تو اس کی فکری تخریب، عملی فساد اور اخلاقی بگاڑ میں کیا کمی بیشی ہوگی؟ بلکہ ہوگی بھی یا نہیں؟ اگر ان باتوں پر غور کیا جاتا تو اِس موقف کی لغویت واضح ہو جاتی۔

(۴) ملائکہ۔نفسیاتی محرکات

''مفکر قرآن'' صاحب، سورۃ توبہ کی آیت ۲۵ اور ۲۶ کو مع متن و ترجمہ پیش کرنے کے بعد، لکھتے ہیں کہ

> ان مقامات پر غور کیجئے ملائکہ کی مدد کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس سے جماعت مومنین کے دلوں کو تسکین ملی تھی اور ان کے عزائم پختہ ہو گئے تھے، دوسری طرف دشمنوں کے دل خوفزدہ ہو گئے تھے، اور ان کے حوصلے چھوٹ گئے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں ملائکہ سے مراد، وہ، نفسیاتی محرکات ہیں، جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہیں۔ [1]

''مفکر قرآن'' کی طرف سے ملائکہ کی یہ توجیہ، ان کی انتہائی کوتاہ نظری پر دال ہے، جو یہ بات بھی واضح کر دیتی ہے کہ وہ ملائکہ کی باتشخص ہستیوں کی نفی کرنے کے لیے، کس قدر دور خیز اور رکیک تاویلاتِ آیات پر اتر آیا کرتے تھے۔

انسان کے ''نفسیاتی محرکات'' فی الواقع، ایک داخلی چیز ہے، لیکن یہاں یہ داخلی چیز واقع ہوئی ہے، اس خارجی چیز کے سبب، جسے ملائکہ کہا گیا ہے، کسی خارجی چیز سے واقع ہونے والی، داخلی چیز سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ خارجی چیز ہی فی الواقعہ داخلی چیز ہے، یا تو خود فریبی ہے یا فریب دہی۔ پھر یہاں، اس داخلی چیز (نفسیاتی محرکات) کا ذکر، اہل ایمان کے حق میں أَنزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور کفار کے حق میں، یہی چیز قَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ کے الفاظ میں مذکور ہے، لہٰذا، ''مفکر قرآن'' کی یہ نکتہ رسی، قرآنی الفاظ کے ساتھ قطعاً میل نہیں کھاتی، نیز اگر ملائکہ سے مراد ''نفسیاتی محرکات'' ہی ہوں، تو پھر ایمان بالملائکہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیونکہ ایسے ''نفسیاتی محرکات'' کا تو کوئی بھی منکر نہیں ہے۔

---

[1] ابلیس و آدم، صفحہ ۱۵۵

(۵) پانچواں عقیدہ: ایمان بالآخرت

ایمان بالآخرت، اسلامی عقائد میں اس قدر اہم ہے کہ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ، اس کے بالواسطہ یا بلاواسطہ ذکر سے خالی ہو، انسانی زندگی کے راہِ راست پر رہنے، اور اس کے معاشرہ کے فساد و بگاڑ سے محفوظ رہنے کا بڑا انحصار، اسی عقیدہ کے استحکام پر ہے، آج دنیا کے فکر و عمل میں جو فساد اور اخلاق و کردار میں، جو بگاڑ پیدا ہو چکا ہے، اس کی بڑی وجہ آخرت کی باز پرس سے غفلت اور بے نیازی ہے، آخرت کی جوابدہی کا عقیدہ، قلبِ انسانی میں، ایک ایسا کوتوال متعین کر دیتا ہے جو تنہائیوں میں بھی، جہاں کوئی آنکھ، اسے دیکھنے والی اور کوئی کان اسے سننے والا اور کوئی شخص، اس کا گواہ بننے والا نہیں ہوتا، اسے گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے، فکر و عمل کی تطہیر اور اخلاق و کردار کی اصلاح کے لیے، عقیدۂ آخرت، نہایت مؤثر اور صحتمند اساس ہے۔

آخرت کا پرویزی تصور

لیکن، پرویز صاحب کے نزدیک، آخرت سے مراد، مستقبل (Future) ہے، اور پھر مستقبل کا لفظ بولتے ہوئے بھی، اُن کا زیادہ تر رجحان، دنیا ہی کے مستقبل کی طرف ہوتا ہے، اگرچہ وہ کہیں کہیں، آخرت اور قیامت کے مستقبل کا بھی ذکر کر دیا کرتے ہیں، ان کے ہاں، جنت و دوزخ کا وجود بھی، مرنے سے قبل، اسی دنیا میں پایا جاتا ہے، اگرچہ، مرنے کے بعد، عالم آخرت کے جنت و دوزخ کا بھی وہ کھلا کھلا انکار نہیں کرتے، چنانچہ، وہ لفظ ''آخرت'' کو لغوی تحقیق کے خراد پر، چڑھا کر، اِس کی چھیل چھال کے بعد، اِسے جو نئے معانی پہناتے ہیں، اُسے بایں الفاظ بیان فرماتے ہیں۔

آخرت کے معنٰی مستقبل (Future) کے ہیں، ان معانی کے لحاظ سے دیکھئے تو

(i) ہر فرد کا آنے والا کل اس کا مستقبل ہے۔

(ii) ہر قوم کا اگلا دور، اس کا مستقبل ہے، خواہ وہ عروج ہو یا زوال۔

(iii) عالمگیر انسانیت کی ہر موجودہ نسل کے بعد، آنے والی نسل، اس کا مستقبل ہے۔

(iv) مرنے کے بعد کی زندگی، ان سب کا مستقبل ہے۔[1]

آخرت کے معنٰی ''مستقبل'' کر ڈالنے کے بعد، پہلی تین شقیں، ظاہر ہے، کہ اسی دنیائے فانی سے تعلق رکھتی ہیں، ان کا انکار مومن و مسلم تو رہا ایک طرف، کسی کافر و مشرک نے بھی نہیں کیا، پھر آخر ایسی چیز، جسے پہلے ہی ہر کوئی تسلیم کر رہا ہے، اسے ایمان بالآخرۃ کے طور پر منوانا، ایک مہمل سی بات ہے۔

رہی چوتھی، شق، تو دراصل، مفہومِ آخرت میں، یہی واحد شق داخل ہے، اسے اول الذکر تین شقوں کے ساتھ، نتھی کر کے پیش کرنا، ایسی تلبیسِ حق و باطل ہے جو الحاد فی الاٰیات کے زمرہ میں داخل ہے، پھر آخرت کا معنٰی ''مستقبل'' کر کے، اور اس

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۱، صفحہ ۱۴۵

سے بھی زیادہ تر "دنیوی مستقبل" مراد لینا، قاری کے ذہن میں، اسی تصور کو راسخ کر ڈالتا ہے، رہا آخرت کا مستقبل، تو وہ یا تو پس منظر میں چلا جاتا ہے یا اس کی حیثیت، محض وزن برائے بیت کی رہ جاتی ہے، اور پھر، اس پر مستزاد یہ کہ، وہ، آخرت کے مفہوم میں، دنیوی مستقبل کو، اخروی مستقبل پر شرفِ تقدم بخشتے ہیں اور اپنی مثالوں سے آخرت کی وضاحت بھی کرتے ہیں تو اس سے مراد دنیاوی مستقبل ہی ہوتا ہے۔

> قرآن کریم نے جماعت مؤمنین کے متعلق کہا کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں یعنی وہ مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر گرنہیں پڑتے بلکہ ہمیشہ اپنے سامنے مستقبل کا مفاد رکھتے ہیں، جو کسان، بیج کے لیے رکھی ہوئی گیہوں کو پسوا کر، نرم نرم روٹیاں کھالیتا ہے اس کی آج کی بھوک تو مٹ جاتی ہے، لیکن مستقبل (آخرت) میں اس کے لیے مستقل بھوک ہوتی ہے، لیکن جو کسان، اس بیج کو زمین میں ڈال کر، چھ سات ماہ تک برابر محنت کرتا ہے اور نہایت ثبات اور تحمل سے فصل پکنے کا انتظار کرتا ہے، اس کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے، اور جب سلسلہ ایک چکر باندھ لیتا ہے تو اس کا حال بھی خوشگوار ہو جاتا ہے اور مستقبل بھی۔ یہ اس لیے کہ اسے مستقبل (آخرت) پر یقین تھا، اس لیے وہ مفاد عاجلہ پر لپک نہیں پڑا۔ [1]

اس اقتباس میں اگرچہ موت کے بعد، عالمِ آخرت کی واضح نفی نہیں کی گئی، لیکن اس کے باوجود، آخرت کا لفظ دنیاوی مستقبل اور اسی دنیا میں آیندہ کی خوشگواریوں کو، آخرت کے مترادف کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس سے آخرت کا قرآنی تصور، اس قدر دھندلا جاتا ہے کہ دنیا ہی کا مستقبل، آخرت کا غالب مفہوم قرار پا جاتا ہے۔

الساعة کا تحریف شدہ مفہوم

قرآن کریم، آخرت کے لیے، اَلسَّاعة کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے، اس کا لغوی مفہوم تو "وقت کا کچھ حصہ" ہے، خواہ وہ دن کا وقت ہو یا رات کا، لیکن قرآن اسے اپنے اصطلاحی مفہوم میں، "قیامت" اور "آخرت" کے لیے استعمال کرتا ہے، قرآن کریم کی درج ذیل دو آیات میں، اس کا لغوی مفہوم ہی مراد ہے۔

> وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (الاعراف-۳۴) ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو گھڑی بھر کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

> وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ (یونس-۴۵) جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (حیات دنیا یوں محسوس ہوگی کہ) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کو ٹھہرے تھے۔

اس طرح، جملہ آیات میں، الساعة کا مفہوم "ایک گھڑی، ایک ثانیہ، یا دن رات کے وقت کا کچھ حصہ" ہی مراد ہے، ان دو آیات کے علاوہ چھ اور آیات بھی ہیں جن میں اس لفظ کا یہی مفہوم پایا جاتا ہے، مثلاً (۱) سورۃ التوبہ، آیت ۱۱۷ (۲) سورہ یونس، آیت ۴۹ (۳) سورۃ النحل، آیت ۶۱ (۴) سورۃ روم، آیت ۵۵ میں، دوسرا لفظ الساعہ (۵) سورۃ السبا، آیت ۳۰ (۶) سورۃ الاحقاف، آیت ۳۵۔

---

[1] لغات القرآن، صفحہ ۲۱۱

لیکن ان کے علاوہ، اور جتنی بھی آیات ہیں ان میں الساعۃ سے مراد ''قیامت'' یا ''آخرت'' ہی ہے، آپ کوئی سا مترجم قرآن اٹھا لیجئے، یہی معنیٰ پائیں گے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے الساعۃ میں ''وقت کی گھڑی'' کے حقیقی مفہوم سے تجاوز کر کے، ''انقلاب کی گھڑی'' کے معنوں کو اختراع کیا اور پھر گھڑی کا لفظ اڑا کر محض ''انقلاب'' کا مفہوم گھڑ ڈالا، اور پھر چونکہ ''انقلاب'' اچھا بھی ہوسکتا ہے اور برا بھی، اس لیے کہیں تو الساعۃ سے مراد ''تباہ کن انقلاب'' اور کہیں، خود ساختہ ''نظام ربوبیت'' کا ''خوش کن انقلاب'' لیا۔ رہا قیامت کا مفہوم، تو وہ آیات سے یکسر غائب ہو گیا ہے۔

الساعۃ کا مفہوم محرف، آیات قرآن میں

مندرجہ ذیل آیات وہ ہیں، جن میں ''الساعۃ'' کا لفظ قیامت کے معنی میں آیا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے ان میں، اپنا تحریف شدہ مفہوم مراد لیا ہے، ذیل میں متنِ آیات کے فوراً نیچے، جو ترجمہ دیا گیا ہے، اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ آیت میں الساعۃ کا معنی قیامت ہی ہے۔ اس کے بعد، دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر جو عبارت درج کی گئی ہے، وہ مفکر قرآن کی، ایسی عبارت ہے جو اسی آیت (زیر بحث) کا تحریف شدہ مفہوم لیے ہوئے ہے، ملاحظہ فرمائیے، ایسی آیات کو

۱ --- حَتّٰی إِذَا جَآئَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يَا حَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا (الانعام-۳۱)...... یہاں تک کہ جب اچانک وہ قیامت آ جائے گی تو یہ لوگ کہیں گے ''افسوس! ہم سے اس معاملہ میں کیسی تقصیر ہوئی''۔

> جو لوگ، خدا کے قانون مکافات سے انکار کرتے ہیں، وہ خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، جب وہ ''تباہ کن انقلاب'' یک لخت ان کے سامنے آئے گا تو وہ بصد حسرت و یاس کہیں گے کہ ہم سے بڑی تقصیر ہوئی''۔ [۱]

۲ --- قُلْ أَرَأَيْتُكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ (الانعام-۴۰) کہہ دو! ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے، یا تم پر قیامت آ جائے تو.....................

> ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ خدا کے علاوہ اور قوتیں بھی اختیار و اقتدار رکھتے ہیں تو جس وقت کوئی طبیعی آفت (آندھی سیلاب وباء وغیرہ) آتی ہے یا کوئی تباہ کن انقلاب برپا ہونے لگتا ہے، تو تم .... [۲]

۳ --- يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ إِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيْكُمْ إِلَّا بَغْتَةً يَسْئَلُوْنَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ (الاعراف-۱۸۷) یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ قیامت (کی گھڑی) کب آئے گی؟ کہو ''اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے، اسے اپنے وقت پر ہی ظاہر کرے گا، آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہوگا وہ تم پر اچانک آ جائے گا'' یہ لوگ تم سے اس کے متعلق یوں پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہو، کہو ''اس کا علم اللہ کے ہاں ہے''۔

> یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ انقلاب کی وہ گھڑی (جس کی بابت تم اس قدر دھمکیاں دے رہے ہو) کب واقع ہوگی؟ ان سے

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۲۹۱ [۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۲۹۴

کہو کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے، اس کے سوا کوئی نہیں جو اسے اس کے وقت پر نمودار کرے (لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ انقلاب ایسا عظیم ہوگا کہ) وہ زمین و آسمان، سب پر بھاری ہوگا، اور تم پر اچانک آ جائے گا، یہ تجھ سے اس کے متعلق اس طرح پوچھ رہے ہیں گویا، تو اسی کاوش میں لگا رہتا ہے (اس کے سوا تیرے لیے کوئی اور کام ہی نہیں) ان سے کہہ دو کہ (میں اس کے متعلق قطعاً کوئی کاوش نہیں کرتا) اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ ۱

حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری آیت، قیامت ہی کے متعلق ہے، لیکن "مفکر قرآن" نے السَّاعة کا ترجمہ "انقلاب" ذہن میں رکھ کر، پوری آیت کو اپنے خود ساختہ مفہوم کا نشانہ بنا دیا ہے۔

۴ --- أَفَأَمِنُوٓا اَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (یوسف-۱۰۷) کیا وہ اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب کی آفت چھا جائے یا ان پر اچانک قیامت آ جائے اور انھیں خبر تک نہ ہو۔

کیا یہ لوگ، اس بات سے بالکل مطمئن ہو چکے ہیں کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے آنیوالی تباہیوں میں سے ان پر کوئی ایسی تباہی نہیں آئے گی جو ان پر ہر طرف سے چھا جائے، یا وہ آنیوالا انقلاب اس طرح اچانک آ جائے کہ انھیں اس کے آنیکا احساس تک بھی نہ ہو۔ ۲

۵ --- وَإِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (الحجر-۸۵) بیشک قیامت ضرور آنیوالی ہے، پس تم اچھی طرح درگزر کرو۔

وہ فیصلہ کن انقلاب، جس سے انھیں متنبہ کیا جاتا ہے، آ کر رہے گا، لہٰذا تم ان سے الجھو نہیں (تبلیغ کا حق جس قدر ضروری تھا، وہ ہو چکا) ۳

۶ --- وَمَآ أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ (النحل-۷۷) اور قیامت کا آنا ایسے ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا یا وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔

(آنے والا انقلاب، ضمیرِ کائنات میں پہلو بدل رہا ہے، وہ بتدریج آگے بڑھ رہا ہے، جب وہ نمودار ہوگا تو یوں سمجھو) جیسے آنکھ کا جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلدتر۔ ۴

۷ --- وَكَذٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا (الکھف-۲۱) اور اسی طرح ہم نے (لوگوں کو) ان پر خبردار کیا تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں۔

ہم نے ایسی صورت پیدا کر دی کہ لوگ ان کے حال سے مطلع ہو گئے (اور انھیں معلوم ہو گیا کہ ان کے گم گشتہ لیڈر زندہ ہیں)، اور خدا نے جو وعدہ کیا تھا (وہ ان کے ہاتھوں) پورا ہوگا، اور وہ انقلاب، جس کے لیے، انھوں نے آواز بلند کی تھی، بلاشبہ آ کر رہے گا۔ ۵

---

۱ مفہوم القرآن، صفحہ ۳۸۷ ۲ مفہوم القرآن، صفحہ ۵۴۶ ۳ مفہوم القرآن، صفحہ ۵۹۰
۴ مفہوم القرآن، صفحہ ۶۱۲ ۵ مفہوم القرآن، صفحہ ۶۶۲

۸، ۹ --- وَمَآ أَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً (الکہف-۳۶،فصلت-۵۰) اور میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت برپا ہوگی۔

(تمھاری یہ سب باتیں واہمہ ہیں) میں نہیں سمجھتا کہ وہ انقلاب کی گھڑی (قیامت)، جس سے تو مجھے ڈراتا رہتا ہے کبھی آئے۔[۱]

صد شکر کہ الساعۃ کے مفہوم میں کہیں ''قیامت'' کا لفظ بھی آ گیا، اگرچہ اصل معنیٰ ''انقلاب کی گھڑی'' ہی قرار دیا گیا ہے، اور قیامت کو محض (حقیقی نہیں بلکہ) مرادی مفہوم کے طور پر (بین القوسین) پیش کیا گیا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کا انقلاب آئے گا۔[۲]

۱۰---حَتّٰی إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ (مریم-۷۵) یہاں تک کہ وہ دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، خواہ عذاب، خواہ قیامت۔

ان سے کہہ دو (یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت تمھارے پاس قوت اور دولت زیادہ ہے، لیکن خدا کا قانون یہ ہے کہ) جو لوگ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں (انھیں فوراً نہیں پکڑ لیا جاتا)، انھیں مہلت دی جاتی ہے، حتّٰی کہ وہ اس تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں جس کی بابت ان سے کہا جاتا تھا کہ --- پہلے ہلکی سی سزا، (تاکہ وہ اپنی روش سے باز آ جائیں، اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو) پھر انقلاب کا ہلاکت انگیز عذاب۔[۳]

۱۱ --- إِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ-۱۵) بیشک قیامت آنے والی ہے میں چاہتا ہوں کہ اسے (اپنے آپ سے بھی) پوشیدہ رکھوں تاکہ ہر شخص کو اس کی کی ہوئی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔

اس آیت کا مفہوم، ''مفکر قرآن'' نے، اشتراکیت کی فکری غلامی میں مبتلا ہو کر، درج ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے، تاکہ قرآن کو دورِ قدیم کی ''رجعت پسندانہ'' کتاب ہونے کے ''الزام'' سے بچا لیا جائے، اور دورِ حاضر کی ''ماڈرن کتاب ہدایت'' کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

(اس حقیقت کو یاد رکھ کہ تیرے ہاتھوں ایک) انقلابِ عظیم رونما ہونے والا ہے، ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب، جو اس وقت تک ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اب نکھر کر سامنے آ جائے، یہ انقلاب آئے گا تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ مل سکے (اور سلب و نہب کا موجودہ فرعونی، قارونی اور ہامانی معاشرہ، جس میں حالت یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا حاصل کوئی اور لے جاتا ہے، الٹ کر رکھ دیا جائے، یہ انقلاب، نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے سے آئے گا۔[۴]

۱۲ --- اَلَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ (الانبیاء-۴۹) (اہل تقویٰ وہ ہیں جو) اپنے رب سے، بغیر اسے دیکھے، ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے بھی خوفزدہ رہتے ہیں۔

یعنی ان لوگوں کے لیے، جو قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کے ان دیکھے نتائج سے ڈرتے تھے، اور اس طرح آنے والے انقلاب کے تصور سے لرزتے تھے۔[۵]

۱۳ --- يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ○ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۶۶۲ [۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۲۳ [۳] مفہوم القرآن، صفحہ ۶۹۸ تا ۶۹۹

[۴] مفہوم القرآن، صفحہ ۷۰۵ [۵] مفہوم القرآن، صفحہ ۷۳۷

أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارٰى وَمَا هُمْ بِسُكَارٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ (الحج -۱، ۲) لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی، اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے، حالاں کہ وہ نشے میں نہ ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔

اے نوعِ انسانی! اپنے نشو ونما دینے والے کے قوانین کی نگہداشت کرو (اور اپنے معاشرہ کو صحیح خطوط پر، متشکل کرلو، اگر تم از خود ایسا نہ کرو گے تو) یہ صرف ایک ایسے شدید انقلاب کی رو سے واقع ہوگا جو ہر شے کو اس کی جگہ سے ہلا دے گا۔

جس دن یہ انقلاب رونما ہوگا، اس کی ہولنا کیوں کا یہ عالم ہوگا کہ (کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہے گا حتیٰ کہ) دودھ پلانے والی مائیں، اپنے دودھ پیتے بچوں تک کو بُھول جائیں گی اور اس کا انھیں قطعاً افسوس نہیں ہوگا، حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، لوگ یوں دکھائی دیں گے جیسے نشے میں مدہوش ہوں، حالانکہ درحقیقت، کوئی نشے میں نہ ہوگا، یہ کچھ خدا کے عذاب کی شدت کا نتیجہ ہوگا۔ [1]

۱۴ --- وَأَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (الحج -۷) اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور یہ کہ، اللہ، ان کو، جو قبروں میں ہیں، اٹھا کھڑا کرے گا۔

.... لہٰذا، وہ انقلاب، جس کی رو سے، اس جماعت کو، جسے تم اپنی ظاہر بین نگاہوں سے کمزور اور مردہ دیکھتے ہو، حیاتِ نو عطا ہوگی، ضرور آ کر رہے گا، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اسی طرح، اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ خدا مُردوں کو بھی زندگی عطا کرے گا۔ [2]

۱۵ --- وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ (الحج -۵۵) اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اس بارے میں ہمیشہ شک میں رہیں گے، یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آ جائے یا منحوس دن کا عذاب آ جائے۔

(لیکن جو لوگ علم وبصیرت اور غور وتدبر سے کام نہیں لیں گے) وہ اس کی طرف سے برابر شک میں رہیں گے تا آنکہ، موعودہ انقلاب کی گھڑی اچانک ان کے سر پر آ جائے، یا ان پر وہ عذاب آ جائے، جو ان کے شجرِ امید کو یکسر خشک کر کے رکھ دے اور اس کے بعد، وہ کبھی بار آور نہ ہو سکے۔ [3]

۱۶، ۱۷ --- بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا (الفرقان - ۱۱) بلکہ انھوں نے قیامت کو جھٹلا دیا، اور ہم نے، اس شخص کے لیے جس نے قیامت کو جھٹلا دیا، دوزخ تیار کر رکھا ہے۔

اور یہ لوگ اس آنے والے انقلاب کے متعلق کہتے ہیں کہ یونہی دھمکیاں ہیں (انھیں معلوم نہیں کہ) جو لوگ اس انقلاب کو جھٹلاتے ہیں، ہم نے ان کے لیے ایسا شعلہ بار عذاب تیار کر رکھا ہے (جو ان کی متاعِ حیات کو راکھ کا ڈھیر بنا دے گا)۔ [4]

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۷۵۰
[2] مفہوم القرآن، صفحہ ۷۵۲
[3] مفہوم القرآن، صفحہ ۷۶۶
[4] مفہوم القرآن، صفحہ ۸۱۷

۱۸ --- وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ (الروم-۱۲) جس روز قیامت برپا ہوگی مجرم ناامید ہو کر رہ جائیں گے۔

چنانچہ جو کچھ اقوام سابقہ کے ساتھ ہوا، وہی کچھ ان (مخالفین عرب) کے ساتھ ہوگا (اس وقت تو یہ لوگ، قوانین خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں ان کا مذاق بھی اڑاتے ہیں، لیکن جس وقت) آنے والا انقلاب، ان کے سامنے آ کھڑا ہوگا تو ان بڑے بڑے سرکش مجرموں پر، ہر طرح کی مایوسیاں چھا جائیں گی۔ [۱]

۱۹ --- وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ (الروم-۱۴) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز (لوگ) متفرق (تتر بتر) ہو جائیں گے۔

اس انقلاب کے وقت، سب اپنی اپنی فکر میں غلطاں و پیچاں ہوں گے، ہر ایک کو نفسا نفسی پڑی ہوگی۔ [۲]

۲۰ --- وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (الروم-۵۵) اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم قسمیں کھائیں گے کہ

.... جب ان کے سامنے وہ انقلاب نمودار ہو جاتا ہے جس نے ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے، تو اس وقت یہ لوگ، جن کے اپنے جرائم کی وجہ سے، ان پر یہ تباہی آتی ہے قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمیں زیادہ وقت ہی نہیں ملا، جو ہم اپنی اصلاح کر سکتے۔ [۳]

۲۱ --- إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (لقمان-۳۴) بیشک اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، وہی بارش نازل کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو ماؤں کے رحم میں ہے، کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا بیشک، اللہ علم والا خبردار ہے۔

یہ ظہور نتائج کی گھڑی کب آئے گی؟ اس کا علم خدا ہی کو ہو سکتا ہے، اگرچہ اعمال کے نتائج کے مرتب ہونے کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ جس طرح بارش برستی تو ایک وقت پر جا کر ہے لیکن وہ بنی شروع ہو گئی ہوتی ہے، ایک مدت پہلے سے، یا جس طرح ایک بچہ پیدا ہوتا ہے ایک وقتِ خاص پر جا کر، لیکن وہ رحمِ مادر میں بہت پہلے سے مختلف مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے، خدا کو ان تمام مراحل کا علم ہوتا ہے۔

ان تمام امور (یعنی بارش یا جنین کے مختلف مراحل میں سے گزرنے) کا علم تو تم بھی حاصل کر سکتے ہو، لیکن خدا وہ کچھ جانتا ہے جو تم نہیں جان سکتے (مثلاً) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا، اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی، خدا سب کچھ جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے (اس لیے خدا کو اس بات کا علم ہے کہ ظہور نتائج کی گھڑی کب آئے گی، تمہیں اس کا یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ضرور آ کر رہے گی۔ [۴]

۲۲، ۲۳ --- يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (الاحزاب-۶۳) آپؐ سے لوگ قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں فرما دیں کہ اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور تمہیں کیا

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۹۳۲ — [۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۹۳۲

[۳] مفہوم القرآن، صفحہ ۹۴۳ — [۴] مفہوم القرآن، صفحہ ۹۵۴

خبر کہ شاید قیامت قریب ہی ہو۔

اس پر (یہ منافقین اور فتنہ پرداز) پوچھتے ہیں کہ (جس انقلابی دور کے متعلق تم کہتے ہو کہ اس میں شریر النفس، بدقماش لوگوں کو ایسی سزا ملے گی) وہ دور کب آئے گا؟ ان سے کہو کہ اس کے ظہور کے ٹھیک وقت کے متعلق خدا ہی جانتا ہے (میں نہیں بتا سکتا) اے پوچھنے والے! تجھے کیا معلوم کہ وہ انقلابی دور تیرے سر پر ہی کھڑا ہو۔ [1]

۲۴ --- وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ (السبا-۲) اور کہتے ہیں کافر، کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔

اس کے باوجود، یہ لوگ جو ہمارے قانون مکافات سے انکار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ جس انقلاب کی تم دھمکی دیتے ہو، وہ ہم پر نہیں آئے گا، ان سے کہہ دو کہ وہ آئے گا اور بالضرور آئے گا، اس حقیقت پر میرا پروردگار شاہد ہے۔ [2]

۲۵ --- وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ (المؤمن-۴۶) اور جب قیامت کی گھڑی آ جائے گی تو حکم ہوگا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کر دو۔

وہ اس دنیا میں بھی تباہی اور بربادی کے عذاب میں مبتلا رہے، جو ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا، اور قیامت کے دن بھی، ان کے متعلق حکم دیا جائے گا کہ انھیں سخت عذاب میں مبتلا کر دو۔ [3]

بس یہی وہ واحد آیت ہے جس میں اَلسَّاعَةَ کا ترجمہ ''قیامت'' کیا گیا ہے، جو صحیح ہے۔ باقی سب آیات کا ترجمہ قطعی غلط کیا گیا ہے۔

۲۶ --- إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (المؤمن-۵۹) بیشک قیامت ضرور آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

یاد رکھو! یہ انقلاب (جس سے یہ حقیقت نمایاں ہو جائے گی کہ مذکورہ دونوں گروہ برابر نہیں ہو سکتے) واقع ہو کر رہے گا، اس میں کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجائش نہیں، لیکن اکثر لوگ ایسی بدیہی بات کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ [4]

۲۷ --- إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ (فصلت - ۴۸) قیامت کا علم، اسی (اللہ) کے حوالے کیا جاتا ہے۔

یہ انقلاب یعنی ظہورِ نتائج کا وقت کب آئے گا اور اس کے لیے مہلت کا وقفہ کس قدر ہے؟ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ [5]

۲۸ --- وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ (الشوریٰ -۱۷) اور تجھے کیا خبر، شاید قیامت قریب (ہی) ہو۔

تجھے کیا خبر، کہ نتائج سامنے آنے کا وقت، قریب ہی ہو۔ [6]

۲۹ --- يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهَا الْحَقُّ أَلَا إِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلَالٍ بَعِيْدٍ (الشوریٰ-۱۸) اس (قیامت) کی وہ لوگ جلدی مچاتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے اور جو ایمان لائے وہ اس سے ڈرتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے یاد رکھو! بیشک جو لوگ قیامت کے

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۹۸۳ [2] مفہوم القرآن، صفحہ ۹۸۷ [3] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۰۹۹

[4] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۰۱ [5] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۲۲ [6] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۳۰

بارے میں جھگڑتے ہیں وہ دور کی گمراہی میں (پڑے ہوئے) ہیں۔

جو لوگ خدا کے قانون مکافات پر ایمان نہیں رکھتے، شور مچاتے ہیں کہ وہ انقلاب (جس میں نتائج سامنے آجائیں گے) جلدی کیوں نہیں آجاتا، لیکن جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس انقلاب کا آنا، ایک حقیقت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کا بھی احساس رکھتے ہیں کہ اس میں کسقدر صبر آزما مراحل میں سے گزرنا پڑے گا، اس لیے وہ اس سے خائف رہتے ہیں۔

یادرکھو! جو لوگ اس کے واقع ہونے میں ذرا سا بھی شک و تردد رکھتے ہیں وہ صحیح راستے سے بہت دور چلے جاتے ہیں (صحیح راستے کا مدار، ہی قانونِ مکافاتِ عمل کے ایمان پر ہے)۔ [1]

۳۰ --- وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (الزخرف-٦١) بیشک وہ قیامت کی ایک نشانی ہے تو تم ہرگز اس میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔

(جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، عیسیٰ خدا کا پیغمبر تھا اور) اس انقلاب عظیم کی نشانی (کہ اب سلسلۂ نبوت، شاخ اسرائل سے منقطع ہو کر، اسماعیل کی طرف منتقل ہو جائے گا، جس میں خدا کا آخری نبی، اس کا آخری پیغام لے کر آئے گا، چنانچہ وہ انقلاب اب آ گیا ہے، لہٰذا تم بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ) تم اس کی بابت کسی قسم کا شک وشبہ مت کرو، اور میرا اتباع کرو، یہی سیدھی اور توازن بدوش راہ ہے۔ [2]

۳۱ --- هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (الزخرف-٦٦) کیا وہ صرف قیامت کا انتظار کرتے ہیں کہ وہ ان پر اچانک آ جائے، اور شعور (خبر) بھی نہ رکھتے ہوں۔

(یہ ہے ان کے اس اعتراض کی حقیقت کہ ان کے معبودوں کی تو مخالفت کی جاتی ہے اور عیسیٰ کی مخالفت نہیں کی جاتی، لیکن یہ لوگ دلائل و براہین سے ماننے والے نہیں) یہ تو اس آنے والے انقلاب کا انتظار کر رہے ہیں وہ ان پر اس طرح اچانک آ جائے گا کہ انھیں خبر بھی نہیں ہوگی کہ وہ کیسے آ گیا۔ [3]

۳۲ --- وَتَبَارَكَ الَّذِيْ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (الزخرف-۸۵) بڑی بابرکت ہے وہ (ذات) جس کے لیے بادشاہت ہے آسمانوں اور زمینوں کی اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اسی کیطرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس میں کامل اقتدار و اختیار، ایک خدا کا کارفرما ہے، کائنات کی ہر شے، اس کے نظام ربوبیت کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہے، وہ عظیم انقلاب کب واقع ہوگا (جس میں یہ عالمگیر ربوبیتِ انسانی، دنیا میں جاری و ساری ہو جائے گی) اس کا علم، خدا ہی کو ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمھارا ہر قدم اسی طرف اٹھ رہا ہے۔ [4]

۳۳ --- وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ (الجاثیۃ-۲۷) جس دن قیامت قائم (برپا) ہوگی، اس دن باطل پرست خسارہ پائیں گے۔

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۳۰

[2] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۵۲

[3] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۵۳

[4] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۵۵

یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے، جس کا اقتدار تمام کائنات کو محیط ہے جب وہ انقلاب عظیم واقع ہوگا تو یہ لوگ جو باطل کی روش پر چل رہے ہیں، سخت نقصان اٹھائیں گے۔ ۱

۳۴، ۳۵ ---- وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِىْ مَا السَّاعَةُ إِنْ نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (الجاثیۃ - ۳۲) اور جب (تم سے) کہا جاتا ہے کہ بیشک، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم نے کہا ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں یقین ہم کو نہیں ہے۔

اور جب تم سے کہا جاتا تھا کہ یاد رکھو، خدا کا وعدہ حق ہے جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے اسی طرح واقع ہو کر رہے گا، اور یہ انقلاب آ کر رہے گا اس میں قطعاً کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے یہ انقلاب کیا ہے، ہم اسے محض ایک واہمہ سمجھتے ہیں، ہم اس پر یقین کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ ۲

۳۶ ---- فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ أَشْرَاطُهَا فَأَنّٰى لَهُمْ إِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرَاهُمْ (محمد-۱۸) پس وہ تو محض قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ ان پر اچانک آ جائے سو اس کی علامات تو آ چکی ہیں، تو جب وہ ان کے پاس آ گئی تو انھیں نصیحت پانا کہاں (نصیب) ہوگا۔

(سو یہ لوگ جو تمھاری مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ تمہیں تمھارے وطن سے نکال دیا ہے، اور اس کے بعد بھی تمھارا پیچھا نہیں چھوڑتے) تو انھیں اب صرف اس کا انتظار ہے کہ وہ آنے والا انقلاب اچانک ان کے سامنے آ جائے، اس انقلاب کی ابتدائی علامات تو نمودار ہو چکی ہیں (لہٰذا اب اسے آنے والا ہی سمجھو) جب وہ انقلاب آ جائے گا تو اس وقت ان کا سمجھ بوجھ سے کام لینا، انھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکے گا۔ ۳

۳۷ ---- اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (القمر-۱) قیامت قریب آ گئی اور چاند شق ہو گیا۔

وہ انقلاب کی گھڑی (جس کے متعلق ان سے اتنی مدت سے کہا جا رہا تھا) بالکل قریب آ پہنچی ہے اب ان مخالفینِ عرب کی قوت وشوکت ختم ہو جائے گی اور ان کا پرچم (جس پر قمر کا نشان ہے) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ۴

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جس آیت کا یہ لمبا چوڑا مفہوم بیان کیا گیا ہے، اسی کا نہایت جامع اور مختصر ترجمہ، کبھی پرویز صاحب نے، بایں الفاظ بھی کیا تھا۔

قیامت قریب آئی اور چاند پھٹا۔ ۵

لیکن یہ ترجمہ، چونکہ شق القمر کے معجزہ پر دلالت کرتا ہے، اور پرویز صاحب، معجزات کے منکر ہیں، اس لیے ایک مدت تک تو وہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مندرجہ ذیل، عبارت کا سہارا لیتے رہے اور شقِ قمر کا انکار کرتے رہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ''تفہیمات'' سے، ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ''شق قمر'' ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں، بلکہ علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ ۶

۱+۲ مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۷۱ ۳ مفہوم القرآن، صفحہ ۱۱۸۸ ۴ مفہوم القرآن، صفحہ ۱۲۴۸

۵ معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۲۳۱ ۶ طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۴۴

لیکن پھر "مفکرِ قرآن" نے سوچا، کہ جب تک، آیت زیرِ بحث کا یہ ترجمہ --- "قیامت قریب آئی اور چاند پھٹا" --- برقرار رہے گا، یہ "شقِ قمر" کا ثبوتِ معجزہ بنتا رہے گا، اسے خواہ کتنا ہی بلند آہنگی کے ساتھ، شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے، یکے از علاماتِ قیامت قرار دیا جائے، بہر حال، اس میں "خارقِ عادت" عنصر موجود رہے گا، جو معجزہ کا نہایت اہم پہلو ہے، اس لیے، کوئی ایسا داؤ چلنا چاہئے کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ چنانچہ اسی "نظریہ ضرورت" کے تحت، آیت کا جامع اور مختصر ترجمہ، گلدستۂ طاقِ نسیان بنایا گیا اور اس کی جگہ مندرجہ بالا اقتباس بطور (ترجمہ نہیں بلکہ بطور) مفہوم آیت اختراع کیا گیا جس میں شقِ قمر سے مراد "آسمان کے چاند" کا پھٹنا نہیں، بلکہ مشرکین عرب کے جھنڈے پر سے چاند کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا مراد ہے، یوں ماشاءاللہ دردِ سر کا علاج، سر کاٹنے سے ہی ہو گیا۔

۳۸، ۳۹ --- بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ (القمر-۴۶) بلکہ قیامت، ان کی وعدہ گاہ ہے اور قیامت بڑی سخت اور بڑی تلخ ہوگی۔

(ہمارے قانون مکافات کے مطابق) اس فیصلۂ انقلاب کے محسوس طور پر، سامنے آنے کا وقت، مقرر ہو چکا ہے، یہ ان پر اچانک اور حیرت انگیز طریق سے آئے گا اور ان کے لیے بڑا ہی تلخ ہوگا۔ [1]

۴۰ --- يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (النازعات - ۴۲، ۴۳) اور آپ سے پوچھتے ہیں، قیامت کی بابت کہ کب (ہوگا) اس کا قیام؟ تمہیں کیا کام، اس کے ذکر سے؟

(اس انقلاب کے متعلق، یہ کچھ سننے کے بعد،) یہ لوگ، تجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ انقلاب بالآخر آئے گا کب؟ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ میرے حیطۂ علم کی بات نہیں، میں نہیں جانتا کہ وہ کب واقع ہوگا؟ [2]

خلاصہ بحث بر لفظ الساعۃ

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں السَّاعة کا لفظ، یا تو وقت کی حقیر و قلیل مقدار کے لیے آیا ہے، جس کا مفہوم "گھڑی بھر" یا "ایک ثانیہ" کے الفاظ سے ادا کیا جا سکتا ہے، یا پھر "قیامت" کے لیے، قرآن کریم کے آٹھ مقامات پر یہ لفظ، پہلے معنٰی میں آیا ہے، (یعنی (۱) سورۃ الاعراف، آیت ۳۴ (۲) سورۃ التوبہ، آیت ۱۱۷ (۳) سورۃ یونس، آیت ۴۵ (۴) سورۃ یونس، آیت ۴۹ (۵) سورۃ النحل، آیت ۶۱ (۶) سورۃ الروم کی آیت ۵۵ میں دوسرا لفظ السَّاعة (۷) سورۃ سبا، آیت ۳۰ (۸) سورۃ الاحقاف، آیت ۳۵)، اور بقیہ چالیس مقامات میں، جن کی آیات، پیش کی جا چکی ہیں، ان میں سے ہر مقام پر السَّاعة کا لفظ قیامت ہی کے معنٰی میں آیا ہے، آپ کوئی سا بھی مترجم قرآن اٹھا لیجئے، یہی ترجمہ پائیں گے، لیکن "مفکرِ قرآن"، صاحب نے، السَّاعة کے مفہوم میں اپنے مزعومہ اور خود ساختہ مفہوم کو داخل کرنے کے لیے جو کاوش کی ہے، وہ کئی مراحل پر مشتمل ہے۔

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۲۵۴　　[2] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۴۱۲

اولاً ----- السّاعة کا حقیقی مفہوم ''ایک ثانیہ'' یا ''ایک گھڑی'' نظر انداز کیا گیا، اور تجاوز کرتے ہوئے اپنی طرف سے ''انقلاب کی گھڑی'' کو اس لفظ کا مفہوم قرار دیا گیا۔

ثانیاً ----- چونکہ یہ ساری کارروائی، اشتراکیت کو ''نظام ربوبیت'' کے نام سے مشرف بالاسلام، کرنے کے لیے کی گئی، اس لیے ''انقلاب کی گھڑی'' سے مراد یا تو نظام سرمایہ داری کا ''تباہ کن انقلاب'' یا ''نظامِ ربوبیت'' کا ''خوش کن انقلاب'' حسبِ موقع لیا گیا۔

ثالثاً ----- اور پھر آخری مرحلہ پر، السّاعة کو مطلق ''انقلاب'' کا ہم معنٰی قرار دیا گیا۔

دنیا و جہان کی کسی بھی کتاب لغت میں السّاعة بمعنٰی ''انقلاب'' موجود نہیں ہے، یہ معنٰی ''مفکر قرآن'' کے صرف اور صرف ''صوابدیدی اختیارات'' کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں، اُن کی یہ ایک مستقل روش تھی کہ اگر کسی آیت میں، وہ کوئی خاص مفہوم پیدا کرنا چاہتے تھے، تو اس کے لیے بڑے اہتمام سے اپنی طرف سے ایک ''شانِ نزول'' گھڑا کرتے تھے اور اس کی روشنی میں، آیت میں وہ طبعزاد مفہوم گھسیڑ دیا کرتے تھے، اور اگر کسی قرآنی لفظ میں، اپنے مزعومہ معانی اور خود ساختہ مفاہیم داخل کرنے کے متمنی ہوا کرتے تھے، تو اس لفظ کی تشریح سے قبل، ایک خاص ''پس منظر'' اختراع کیا کرتے تھے، اور پھر اُسے، اپنے مدعائے مطلوب کے لیے، بطور زینہ استعمال کیا کرتے تھے، جیسا کہ السّاعة کی ''لغوی وضاحت'' کے لیے کیا گیا ہے، اس لفظ کی ''لغوی تشریح و توضیح'' کے لیے تسویلِ نفس کی یہ کارروائی لغات القرآن کے صفحہ ۹۱۸ سے ۹۲۰ تک ممدود و متعدی ہے، مگر حرام ہے کہ کہیں اس معنٰی کی تائید میں، کسی مستند کتاب لغت تو کیا، کسی گری پڑی کتاب ہی کا حوالہ دیا گیا ہو، یا کلام عرب ہی سے کوئی تائیدی نظیر پیش کی گئی ہو، لیکن دعوٰی --- اور وہ بھی بڑی بلند آہنگی کے ساتھ --- یہی کیا جاتا ہے کہ لغات القرآن میں ہر قرآنی مفرد کی سندِ معنٰی مذکور ہے، اور یہ بھی کہ قرآنی الفاظ کا وہی مفہوم دیا گیا ہے، جو دورِ نزولِ قرآن میں پایا جاتا تھا، لیکن ''السّاعة بمعنی انقلاب'' کی نہ تو کوئی سند پیش کی گئی ہے، اور نہ ہی کلام عرب میں سے کوئی تائیدی نظیر، جو اس امر کا ثبوت ہو کہ دورِ نزولِ قرآن میں اس لفظ کا یہی معنٰی بولا اور سمجھا جاتا تھا، باقی رہا یہ بلند بانگ اعلان کہ

> آپ نے چار جلدوں میں، ایک ایسا لغت تیار کر دیا، جس کی تیاری میں، اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت، حوالے کے لیے استعمال کیے۔ [1]

تو یہ اعلان، عامۃ الناس پر، علم و تحقیق کا رعب ڈالنے کے لیے کافی ہے۔

چالیس آیات میں الساعۃ بمعنی قیامت

اب غور فرمائیے کہ ان چالیس مقامات پر، جن میں السّاعة کا لفظ، ''قیامت'' کے معنوں میں آیا ہے، ماسواء ایک مقام کے، باقی ہر جگہ اسے خود ساختہ مفہوم ''انقلاب'' کے معنٰی میں لینا، کیا قاری کے ذہن میں یہ غلط تاثر نہیں جما دیتا کہ اس لفظ کا

[1] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۵

اصل مفہوم ہے ہی ''انقلاب''؟ اور یہ کہ تمام مترجمینِ قرآن اور مفسرینِ عظام نے گویا (السَّاعة بمعنی قیامت) کے ''غلط مفہوم'' پر ایکا کر رکھا تھا؟

رہا ایک مقام پر (سورۃ المومن، آیت ۴۶ میں) ''السَّاعة'' کو ''مفکرِ قرآن'' کا ''قیامت'' کے مفہوم میں لینا، تو یہ صرف اُس مصلحت کے تحت ہی معلوم ہوتا ہے، جس کے تحت، بعض اوقات، ناقص اور کھوٹا مال رکھنے والے بد دیانت تاجر کو بھی، مجبوراً حکمت عملی کے پیشِ نظر، عمدہ اور کھرے مال کی بھی کوئی آئیٹم رکھنی پڑتی ہے۔

عقیدہ آخرت کے چار اہم اجزاء

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر، عقیدہ آخرت کے، چار بڑے اجزاء بیان کیے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) موجودہ نظام کائنات کا درھم برھم ہونا:- موجودہ عالم کی بساط لپیٹ دیجائے گی اور زمین و آسمان، بدل کر کسی اور ہی صورت میں ڈھال دیئے جائیں گے، آفتاب و ماہتاب بے نور ہو جائیں گے، ستارے جھڑ جائیں گے، زمین اپنے پیٹ میں چھپے سارے خزانے باہر نکال پھینکے گی، سمندر آتش پذیر ہوں گے، اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے، زمین کے نشیب و فراز مٹا کر اسے چٹیل میدان بنا دیا جائے گا، الغرض موجودہ کائنات ختم ہو کر ایک اور ہی نظام کائنات کے قیام کے لیے جگہ خالی کر دے گی۔

(۲) اعمال کا ریکارڈ:- انسانی زندگی کے جملہ اعمال، خواہ ان کا تعلق، دل کی نیتوں اور ارادوں سے ہو، یا زبان کی گفتگو اور کلام سے ہو، یا اعضاء و جوارح کے افعال و اعمال سے ہو، سب کا مکمل اور بے لاگ ریکارڈ مرتب کیا جا رہا ہے اور اسی کی بناء پر، آخرت میں، ہر شخص کو جزاء و سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

(۳) عالم برزخ:- انسانی زندگی کے خاتمہ کے بعد، قیامت تک کا زمانہ، عالم برزخ کہلاتا ہے، ثواب و عذاب قبر کا معاملہ، اسی عالم برزخ سے تعلق رکھتا ہے۔

(۴) بعث بعد الموت:- مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا، عقیدہ آخرت کا ایک ایسا اہم جز ہے، جو مشرکینِ عرب کے انکارِ آخرت کا بڑا سبب تھا۔

ان چار اجزائے آخرت میں سے، پرویز صاحب نے، دو اجزاء کی تشریح و توضیح میں الحاد کا رویہ اختیار کیا ہے، اس لیے، ہم اپنی بحث کو ان دو اجزاء تک محدود رکھیں گے (یعنی پہلے اور تیسرے جزو تک)۔

(الف) نظام کائنات کا درہم برہم ہونا اور موقف پرویز

عقیدہ آخرت کے اجزاء میں سے پہلا جزو، یہ ہے کہ موجودہ نظام کائنات، درہم برہم ہو جائے گا، اس کی کوئی چیز بھی موجودہ حالت میں باقی و برقرار نہیں رہے گی، قرآن کریم نے مختلف اور متعدد مقامات پر، اس صورتحال کی نقشہ کشی کی ہے،

لیکن "مفکرِ قرآن" نے، قیامت سے متعلقہ ایسی آیات کو، کچھ اور ہی معانی پہنا دیئے ہیں، حالانکہ انھی آیات کا صحیح مفہوم بھی کبھی ان کے قلم سے صفحاتِ قرطاس پر محفوظ ہو چکا ہے، آیت مع متن و ترجمہ، متصل اوپر نیچے پیش کیے جا رہے ہیں، جبکہ اسی آیت کا "ماڈرن مفہوم" اس کے بعد، دونوں طرف، حاشیہ چھوڑ کر پیش کیا جا رہا ہے، ملاحظہ فرمائیے، چند آیات۔

۱---إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ۝ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (الواقعہ-۴،۵) جب زمین کو سخت زلزلہ پیش آئے گا، اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ [۱]

یعنی اس وقت، نیچے کے طبقے کے لوگ (عوام جنھیں مستبد قوتوں نے اپنے پاؤں تلے روند رکھا ہے) حرکت میں آ کر اٹھ کھڑے ہوں گے، اور اوپر کے طبقہ کے بڑے بڑے لوگ، یوں منتشر اور پریشان ہو جائیں گے، جیسے تیز آندھی میں گرد و غبار اڑ رہا ہو۔ [۲]

اس مفہوم پر، حاشیہ آرائی کرتے ہوئے، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ

ہم نے ان آیات (اور ان جیسی دیگر آیات میں)، ارض اور جبال وغیرہ الفاظ کو مجازی معنوں میں لیا ہے، اگر انھیں حقیقی معنوں میں لیا جائے، تو کوئی طبیعی تبدیلی مراد لی جائے گی جو کرۂ ارض پر واقع ہوگی۔ [۳]

یہ حاشیہ آرائی، عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی واضح مثال ہے، "مفکرِ قرآن" صاحب، اپنے نفس سے تسویلِ معنٰی اور اختلاقِ مفہوم کرتے ہیں اور پھر مجازی معنٰی کی آڑ میں، اس کھوٹے سکے کو، بازارِ علم میں لے آتے ہیں، حالانکہ نہ ہی ان الفاظ کے یہ مجازی معانی ہیں، اور نہ ہی کبھی اہلِ زبان نے ان الفاظ کے یہ مجازی معنٰی مراد لیے ہیں۔

۲---وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (المعارج - ۹) اُس روز پہاڑ دھنکی ہوئی اُون کی طرح ہو جائیں گے۔ [۴]

اب اس آیت کا مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیے، جو اس آیت سے متصل پہلی آیت يَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ کے ساتھ مل کر، اپنا مفہوم واضح کرتا ہے۔

اس وقت، ان بڑے بڑے فلک نشین سرداروں کی قوتیں پگھل کر پانی ہو جائیں گی، تمام سرفرازیاں اور سربلندیاں پست ہو جائیں گی، ان کی محکم گرفتیں ڈھیلی پڑ جائیں گی (۵۵/۴۷)، اور یہ جو اس وقت پہاڑ کی طرح نظر آتے ہیں (دھنی ہوئی) اون کی طرح فضاء میں اڑتے دکھائی دیں گے (۵/۱۰۱) اور شاخِ شکستہ کی طرح خمیدہ ہو جائیں گے۔ [۵]

۳---إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ (۸۱/۱،۲) جب آفتاب بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر یں گے۔ [۶]

کسی آنے والے دور میں، جب انسانوں کے خود ساختہ نظامِ تمدن و معاشرے کی جگہ قرآنی نظام لے لے گا تو اس وقت کی انقلابی کیفیات کے متعلق یوں سمجھو کہ ملوکیت کا نظام لپیٹ کر رکھ دیا جائے۔

اور ان کے اہالی موالی (چھوٹی چھوٹی ریاستیں) سب جھڑ کے نیچے گر جائیں گے، ان کا شیرازہ بکھر جائے گا، ان کی قوت مانند

---

[۱] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۷۳۰
[۲] + [۳] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۲۶۵
[۴] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۷۳۰
[۵] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۳۵۸
[۶] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۷۳۰

پڑ جائے گی۔ [1]

قیامت کے اس منظر کو، کہ ---" جب آفتاب بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے" --- کو "مفکر قرآن" نے، اپنے ذہنی تغیر کے ساتھ، اور ہی معانی دیدیئے ہیں، اور پھر انہیں جائز قرار دینے کے لیے، یہ سخن سازی اختیار کی کہ

> نزول قرآن کے وقت، ملوکیت کی سب سے بڑی نمائندہ اور عربوں سے قریب تر مملکت، ایران تھی، جس کے جھنڈے کا نشان "شمس" تھا، (جس طرح زمانہ قبل از اسلام، عربوں کے جھنڈے کا نشان "قمر" تھا اس آیت میں، نام تو "شمس" کا لیا گیا ہے، لیکن اس سے مراد، ملوکیت کا نظام ہے، جسے مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا، اس نظام کو نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقاءؓ نے مٹایا، لیکن وہ پھر قائم ہو گیا ان میں سے کسی ایسے آنے والے دور کا ذکر ہے جب ملوکیت کا نظام پھر مٹے گا، اس دور کی جو دوسری نشانیاں بتائی گئی ہیں، اس سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جیسے یہ ہمارے ہی زمانے کا ذکر ہے، ہوسکتا ہے کہ عصر حاضر کی بے پناہ تبدیلیاں، قرآنی نظام کے قیام کا پیش خیمہ ہوں۔ [2]

یہ اقتباس، اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے، "بات بنا ڈالنے" میں "مفکر قرآن" بڑے فنکار واقع ہوئے ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ اس امر کا ماخذ کیا ہے کہ مملکت ایران کے جھنڈے کا نشان "شمس" تھا، اور اس سے بھی بڑھ کر عجیب اور بے سروپا، بات یہ کہ --- "عربوں کے جھنڈے کا نشان "قمر" تھا"۔ حالانکہ عرب کسی سلطنت کا نام نہ تھا، جس کا کوئی جھنڈا ہو کجا یہ کہ اس پر کوئی نشان "قمر" ثبت ہو، عرب کو باقاعدہ ریاست اور سلطنت تو اسلام نے بنایا تھا، قبل از اسلام، یہاں نہ کوئی آئین و دستور تھا، نہ قانون اور کوئی ضابطہ تھا جس نے عربوں کو ایک نظام میں منضبط کر رکھا ہو، اور نہ عرب آبادی کا کوئی ایسا مشترک علم تھا، جس پر نشانِ "قمر" ثبت ہو، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فتح مکہ تک بھی (قبائلِ کفارِ عرب ہی کے نہیں بلکہ) مسلم قبیلوں کے بھی جداگانہ قبائلی پھریرے تھے، ایک ہی مشترک پرچم تو اس لشکرِ نبوی کا بھی نہیں تھا جس نے مکہ فتح کیا تھا، اس وقت بھی، ہر قبیلے کا جدا جدا پرچم تھا، شاہ معین الدین ندوی، تاریخ اسلام میں، فرماتے ہیں۔

> اس کے بعد، لشکر اسلام کا تلاطم، مکہ کی طرف بڑھا، ہر قبیلہ کا دستہ الگ الگ تھا، آنحضرت ﷺ نے ابوسفیان کو افواج الٰہی کا نظارہ کرنے کے لیے، ایک بلند مقام پر بھیج دیا، تمام قبائل کے پرچم یکے بعد دیگرے گذرتے تھے، ابوسفیان، افواجِ اسلامی کی ہیبت سے سہما جاتا تھا، سب سے آخر میں کوکبہ نبوی نمودار ہوا، اور ٹھیک آٹھ برس کے بعد، آنحضرت ﷺ مسلمانوں کے ساتھ، اس سرزمین میں فاتحانہ داخل ہوئے جس سے انتہائی بے کسی کی حالت میں محروم کیے گئے تھے۔ [3]

لہٰذا، ان زیر بحث، آیات کے نزول کے وقت بھی، حالت یہ تھی کہ مختلف اور منتشر قبائل کے اپنے اپنے جھنڈے تھے،

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۴۱۸ [2] حاشیہ بر مفہوم القرآن، صفحہ ۱۴۱۸

[3] تاریخ اسلام (شاہ معین الدین ندوی)، جلد ا، صفحہ ۵۹ تا صفحہ ۶۰

ممکن ہے کہ ان میں سے کسی قبیلے کے پرچم پر ''قمر'' کا بھی نشان ہو، لیکن اسے کل عرب کی مملکت اور جملہ عربوں کے جھنڈے کا نشان، قرار دینا، ''مفکرِ قرآن'' کی مفکرانہ سخن سازی کے سوا، کچھ بھی نہیں ہے۔

۴ --- قیامت کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج باہم مجتمع ہو جائیں گے۔

وَخَسَفَ الْقَمَرُ o وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (القیامہ - ۸،۹) اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج ایک جگہ جمع ہو کر ٹکرا جائیں گے۔ [۱]

اب اس آیت کا ''ماڈرن سیاسی جغرافیے'' پر مشتمل مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیے۔

چاند تاریک ہو جائے گا (جاہلیتِ عرب کا اقتدار ختم ہو جائے گا)۔ چاند اور سورج اکٹھے ہو جائیں گے (عرب اور ایران کی قوتیں مل کر ایک ہو جائیں گی)۔ [۲]

۵ --- آسمان کا پھٹ جانا بھی، مناظرِ قیامت میں مذکور ہے۔

فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ (الرحمان - ۳۷ نیز ۱۶/۶۹، ۹/۷۷، ۱/۸۲) اور جب آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ [۳]

اب سورۃ الرحمٰن کی آیت ۳۷ کا مفہومِ پرویز بھی ملاحظہ فرمائیے۔

اس تباہی کی آتش فشانیوں کا یہ عالم ہوگا کہ فضاء کی بلندیوں سے پھٹنے والی چیزیں، یوں گریں گی جیسے سرخ پگھلا ہوا تانبا، یا تیل کی تلچھٹ، جو چمٹ کر چھوٹ نہ سکے اور یوں ہر شے کو جلا اور پگھلا کر تباہ کر دے۔ [۴]

اس گول مول عبارت میں مناظرِ قیامت، مراد لینے کی گنجائش بھی ممکن ہے۔ جبکہ اس آیت کے کچھ اور مفاہیم بھی بیان کیے گئے ہیں۔

(i) --- وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (۱۶/۶۹)

اس وقت، ہر سربلند، متکبر کی قوت پاش پاش ہو جائے گی، اور ہر مستبد کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ [۵]

(ii) --- اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ (مفہوم، آیت ۹/۷۷، درج ذیل ہے)

بڑی بڑی بلندیوں کے حامل سرداروں کی رفعت و شوکت کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔ [۶]

(iii) --- اِذَالسَّمَآءُ انْفَطَرَتْ

(جس انقلاب کا ذکر پیچھے چلا آ رہا ہے، اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ) فضاء میں پھیلی ہوئی توانائیاں پھٹ جائیں گی۔ [۷]

اب آخر میں سورہ تکویر کی ابتدائی چند آیات کا وہ ''مفہوم'' بھی ملاحظہ فرمائیے، جسے پیش کر کے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، نے، ایک طرف توجدّت طرازی (Modernism) کا دم بھرا ہے، اور دوسری طرف، نئی نسل کے لیے نئی تعبیرِ قرآن بھی پیش فرما کر، قرآنی تعلیمات کو ''دورِ حاضر کی علمی سطح سے ہم آہنگ'' بھی کر دیا ہے، اور یوں قرآن مجید پر پڑی ہوئی چودہ

---

[۱] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۷۳۰ [۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۳۸۸ [۳] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۷۳۱
[۴] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۲۶۱ [۵] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۳۵۳ [۶] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۳۹۹
[۷] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۴۲۲

صدیوں کی قدامت کی گردوغبار کو صاف کرڈالا ہے، پہلے ملاحظہ فرمایئے، آیت کے الفاظ اور ان کا وہ ترجمہ جو علمائے امت ہمیشہ سے بیان کرتے آئے ہیں۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (١) وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ (٢) وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (٣) وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (٤) وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (٥) وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (٦) وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (٧) وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ (٨) بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ (٩) وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (١٠) وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (١١) وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ (١٢) وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ (١٣) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ (١٤) (التکویر-۱ تا ۱۴) جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا اور جب جہنم دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب لائی جائے گی اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اب ان آیات کا وہ مفہوم پیشِ خدمت ہے، جسے ہمارے ''مفکر قرآن'' نے پیش فرمایا ہے، لیکن ''اصل مفہوم'' سے پہلے وہ ایک تمہید بایں الفاظ باندھتے ہیں، اور وہ بھی اس طرح، کہ ایک سورہ کی چند آیات کو اپنے ''مفکرانہ مفہوم'' میں ڈھالتے ہیں تاکہ اپنے ''اصل مفہوم'' تک پہنچنے کے لیے، اسے بطور زینہ استعمال کیا جا سکے۔

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ (۸۳/۴) کیا ان لوگوں کو اس کا خیال نہیں آتا کہ یہ نظام ہمیشہ نہیں رہ سکتا، وہ وقت آئے گا جب انھیں انسانیت کے راستے سے ہٹا دیا جائے گا لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ٥ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۸۳/۵،۶) یہ اُس انقلاب عظیم کے وقت ہوگا جب انسانیت، خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے قیام کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی، اُس دور کی بہت سی نشانیاں قرآن میں مذکور ہیں، مثلاً کہا گیا کہ: وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۸۱/۵) جب اونٹ جیسا مفید جانور، تیز رفتار ذرائع سفر کی ایجاد سے بے کار ہو کر رہ جائے گا، وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (۸۱/۶) جب پسماندہ اور وحشی اقوام میں بھی، اجتماعی زندگی کا احساس بیدار ہو جائے گا۔ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۸۱/۷) جب، سمندر، جہازوں اور کشتیوں سے معمور ہو جائیں گے، وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (۸۱/۹) جب آبادیاں، یہاں سے وہاں تک ملتی ہوئی چلی جائیں گی، وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۸۱/۱۰) جب کتابیں، مجلات، اخبارات بہت زیادہ پھیل جائیں گی، وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (۸۱/۱۲) جب آسمانی کروں پر پڑے پردے اٹھتے جائیں گے، وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ٥ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ (۸۱/۳،۴) جب ذرائع رسل ورسائل کے عام ہو جانے سے زمین پھیل جائے گی اور اپنے معدنی ذخائر کو نکال باہر پھینکے گی اور اس طرح اندر سے خالی ہو جائے گی۔ یہ تو خارجی کائنات میں رونما ہونے والے انقلابات کی نشاندہی ہے --- خود انسانی دنیا کے اندر بھی ایک

انقلاب آئے گا اور وہ یہ کہ --- وَإِذَا الْمَوْءُ وُدَةُ سُئِلَتْ ٥ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۹/۸۱) جب عورت کہ جسے مردوں کے استبداد نے زندہ درگور کر رکھا ہے، انسانیت کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور وہاں یہ سوال پوچھا جائے گا کہ اسے بالآخر کس جرم کی پاداش میں مدفون رکھا گیا تھا، یعنی اس زمانے میں صرف زمین کے مدفون خزانے ہی ابھر کر باہر نہیں آئیں گے بلکہ انسانوں کے ہاتھوں کی دفن کردہ مظلوم عورت بھی دوبارہ زندہ ہو کر سطح انسانیت پر آ جائے گی، یہ ہے وہ دور، جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ انسانیت، خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ [1]

علمائے امت، چودہ صدیوں سے، ان آیات کو وقوعِ قیامت کے مناظر سے وابستہ کرتے آئے ہیں، لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب، ہمیشہ نرالی اُپج اختیار کیا کرتے تھے، تاکہ ملاّ کی موافقت سے پہلو تہی کر کے، تنہا پروازی (Solo Flight) کو سرمایہ افتخار بنایا جائے، روزِ قیامت، مردوں کے اُٹھانے کی بات تو قابل فہم ہے، لیکن اسلام سے قبل، دورِ جہالت میں، زندہ درگور کی گئی شخصیت کا ''عالمگیر نظامِ ربوبیت'' کے قیام پر، زندہ ہو کر، جسٹس غلام احمد پرویز کی ''قرآنی عدالت'' میں پیش ہو کر، بای ذنب قتلت کے سوال کا مخاطب ہونا، ایک ایسا معاملہ ہے جسے آج کا انتہائی تعلیمیافتہ شخص بھی نہیں سمجھ سکتا، کجا یہ کہ دورِ نزولِ قرآن کا ایک عام اور سادہ مزاج بدّو اسے سمجھ لیتا۔

پھر اس ''مفکرانہ تفسیر'' کا یہ پہلو بھی قابل غور اور لائق صد حیرت ہے کہ --- ''اونٹ جیسے مفید جانور کا، ذرائع سفر کی ایجاد سے بیکار ہو جانا، پسماندہ اور وحشی اقوام میں، اجتماعی زندگی کا شعور بیدار ہونا، سمندروں کا جہازوں اور کشتیوں سے معمور ہونا، آبادیوں کا یہاں سے وہاں تک ملتے چلے جانا، کتابوں، مجلّوں اور اخباروں کا بہت زیادہ پھیل جانا، وغیرہ --- جملہ امور کو تو اُسی وقت وقوع پذیر ہونا چاہئے تھا جب ''عالمگیر نظام ربوبیت'' قائم ہو جاتا، لیکن یہ واقعات، ایسے عجلت پسند ہیں کہ اس ''عالمگیر انقلاب'' سے پہلے ہی واقع ہو گئے۔ پنجابی محاورہ ہے ''چورنالوں پنڈ کاہلی'' (یعنی چور کی گٹھڑی، خود چور سے بھی زیادہ تیز اور جلد باز ہے، جو یہ چاہتی ہے کہ سارق سے بھی پہلے، چور کے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائے)۔

ہمارے یہ ''مفکر قرآن'' صاحب زندہ ہوتے تو کیا عجب کہ وہ اس چوری پر، مزید سینہ زوری کرتے ہوئے، یہ دعویٰ بھی کر ڈالتے کہ --- ''اب ساری دنیا میں واقعی ''نظام ربوبیت'' قائم ہو چکا ہے، دیکھتے نہیں کہ اونٹ جیسا مفید جانور، ذرائع سفر کی ایجاد سے بیکار ہو چکا ہے، پسماندہ اور وحشی اقوام میں اجتماعی زندگی کا احساس جنم لے چکا ہے، سمندر، جہازوں اور کشتیوں سے معمور ہو چکے ہیں۔ آبادیاں یہاں سے وہاں تک ملتی چلی گئی ہیں، کتب و رسائل اور اخبارات و مجلّات بہت زیادہ پھیل چکے ہیں --- اب اور کیا چاہتے ہو؟ پیغمبری مل جائے؟''

اس سے یہ واضح ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، قرآنی آیات کو، اُن کے سیاق و سباق سے کاٹ کر، کس طرح نشانۂ تحریف بنایا کرتے تھے، مزید بریں، اس سے یہ بھی عیاں ہے کہ ''مفکر قرآن''، آخرت اور قیامت کے کس حد تک قائل ہیں،

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۵۸

قرآن کریم میں اَلسَّاعَة کا لفظ جہاں جہاں بھی آیا ہے، وہاں انھوں نے قیامت کا صحیح اور متفق علیہ مفہوم مراد لینے کی بجائے، خودساختہ مفاہیم ہی مراد لیے ہیں (باستثنائے مقام واحد)، اور جہاں آیات میں ہولناک مناظرِ قیامت کا تذکرہ ہے، وہاں بھی، انھوں نے اپنے مزعومہ ''انقلاب'' ہی کے مناظر مراد لیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ایک خداترس آدمی، جسے آخرت میں، اپنی جوابدہی کا احساس ہو، قرآنی آیات کا ترجمہ ومفہوم پیش کرنے میں، ازحد محتاط ہوگا، مگر ''مفکرِ قرآن'' کی جسارت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے بے باک رویئے کی بناء پر کسی حد پر رُکتے ہی نہیں، اور صداقت وحقیقت کی ہر حد کو پھلانگتے چلے جاتے ہیں، اور مجازی معانی کی آڑ میں، ذاتی تخیلات اور خودساختہ تصورات کو، قرآنی الفاظ کے ظروف میں ڈالتے چلے جاتے ہیں، آخر کوئی کہاں تک، اُن کی ایسی حرکات کا نوٹس لے؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شیطان ہی کی خودکاشتہ فصل ہے، جسے شیطان ہی کاٹے گا، اپنی رغبت کے ساتھ نہیں، تو پھر بھی مجبوراً اسے ہی کاٹنا ہوگی، کہ یہی اللہ کا طریق کار اور ضابطہ ہے۔

اب جبکہ اَلسَّاعَة کا مفہوم ''قیامت'' نہ رہا، بلکہ ان کے ''نظامِ ربوبیت'' کی کوئی ''انقلابی گھڑی'' قرار پا گیا تو جنت ودوزخ کا تعلق، کب، زندگی بعد الموت سے وابستہ رہ سکتا ہے؟ زبانی جمع خرچ کے اعتبار سے، اعترافِ جنّت، اپنی جگہ، لیکن اَلسَّاعَة کی طرح، اُسے بھی، اِسی دنیاوی زندگی سے وابستہ کرنا، خواہ کتنا ہی خلافِ حقیقت ہو، مگر ''ملاں کی مخالفت میں ''جدّت طرازی کا ایک علمی نکتہ تو ضرور ہی قرار پائے گا، چنانچہ وہ جنت کو بھی، عالمِ آخرت سے کھینچ کر، اسی دنیا میں لے آتے ہیں۔

> قرآن میں، جو جنتی معاشرے کی اکثر تفاصیل بیان کی گئی ہیں، وہ اسی جنتِ ارضی سے متعلق ہیں، جنت اخروی کی صحیح کیفیت کا ادراک، ہم اپنے موجودہ شعور کی سطح پر نہیں کرسکتے۔ [1]

''مفکرِ قرآن'' کے اس اقتباس میں، اگرچہ ''اکثر تفاصیل'' کو دنیاوی جنت سے وابستہ کیا گیا ہے، لیکن ''اقل تفاصیل'' کو مبہم انداز میں، وُہ، اخروی جنت کے ساتھ، منتھی کرنے پر بھی مجبور ہوئے ہیں، اگرچہ ان کا صحیح ادراک، آج ممکن نہیں ہے، اور شاید، جنتِ اخروی کے ناممکن الادراک ہونے کے باعث ہی، ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اُسے، دورِ حاضر کے انسان کی سرحدِ شعور میں لانے کے لیے، عالمِ آخرت سے کھینچ کر، عالمِ دنیا میں لانے پر، مجبور ہوئے ہیں، کیونکہ عالمِ آخرت کے ''جملہ امور'' ازقبیلِ متشابہات ہیں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

> آیاتِ قرآنی، بیشتر محکم ہیں یعنی ان کے معانی قطعی اور متعین ہیں، تھوڑی سی متشابہات ہیں، جن کے حقائق، انسان کی دسترس سے بالاتر ہیں، مثلاً اللہ کی ذات، صفات، جنت، دوزخ اور میزانِ عمل وغیرہ، جن کو تمثیل اور تشبیہ کے طور پر، قرآن نے بیان کیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔ [2]

لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ آخرت (یا جنت ودوزخ) سے متعلقہ آیات، جب تک عالم مابعد الموت سے وابستہ رہیں، تو وہ ازقبیلِ متشابہات قرار پائیں، لیکن جب انھی ''متشابہات'' کو وہ اخروی جنت سے منقطع کرکے، اس دنیاوی اور ارضی جنت سے وابستہ کرڈالیں، تو پھر یہ محکمات میں بدل جائیں؟ اور اُخروی جنت سے متعلقہ سارے وعدوں کا مصداق ''دنیاوی فتوحات'' قرار پائیں؟

---

[1] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۹ء، صفحہ ۶۲
[2] معارف القرآن، جلد ۱، مقدمہ، صفحہ ۳۷

ارضی یا اخروی جنت؟

سورۃ الزمر میں یہ مذکور ہے کہ آخرت میں، جنتی لوگ، اپنے ایمان و عملِ صالح کی بناء پر، جب جنت میں داخل ہوں گے، تو وہ بارگاہِ رب العزت میں، بایں الفاظ ہدیۂ تشکر پیش کریں گے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ (الزمر-۷۴)

شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنے وعدہ کو سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا کہ جہاں چاہیں جنت میں ٹھکانہ بنائیں، عمل کرنیوالوں کے لیے بہترین اجر ہے۔

لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' ان کلماتِ تشکر کو، آخرت میں، جنت کی نعمتوں سے وابستہ کرنے کی بجائے، اِسی دنیا کی، اُن ارضی فتوحات سے وابستہ کرتے ہیں جو اِستخلاف فی الارض کے وعدہ کی صورت میں، سورۃ النور کی آیت ۵۵ میں مذکور ہے (اسلام کیا ہے؟ صفحہ ۱۲۸ تا صفحہ ۱۲۹)۔

اس کے بعد ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اس آزمائشی جنت میں سے (جو حضرت آدمؑ کے لیے عارضی طور پر بنائی گئی تھی، اور جس میں، ان کی خوراک و ضروریات کا بندوبست، اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر کیا تھا) اپنے ''نظامِ ربوبیت'' کا تصور، کشید کرتے ہوئے، لکھتے ہیں کہ

اس اَلْجَنَّة نے سب سے پہلے، ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کیا جس کی ان کے ہاں اسقدر کمی تھی، جنت کی یہی وہ پہلی خصوصیت ہے جس کا ذکر آدمؑ سے، ان الفاظ میں کیا گیا کہ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰیo وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی اس میں تجھے نہ بھوک کی فکر ہے، نہ لباس کی، نہ پیاس کا ڈر ہے اور نہ دھوپ کا۔ [۱]

اس کے بعد، قرآن کریم میں اہل جنت کی خوشیوں بھری زندگی کے لیے، جن نعمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے، ان کی تفصیل ''مفکرِ قرآن'' صاحب، بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی، پورا ہونے کے بعد، آسائش و آرائش کے تمام سامان:
سونے کے کنگن، جواہرات سے مرصع ریشمی لباس (۲۲/۲۳) - (کھانے کی میز پر) سونے کی پلیٹیں، اور پیالے، لیے ہوئے گردش کرنے والے (۴۳/۷۰) - اس کے بعد تقلّبا کھانے کی چیزوں کے ڈھیر (۴۳/۷۱) بیٹھنے کے لیے صوفے، چاندی کے برتن، اور شیشے کے پیالوں کو لیے گھومنے والے (خدام) - باریک ریشمی ملبوسات، دبیز ریشم (کے پردے) (۷۶/۱۷-۲۱) - پسندیدہ پرندوں کا گوشت (۵۶/۲۱) - تہ بہ تہ کیلے، گھنے سائے، آبشاریں (۵۶/۲۱-۲۸)۔ [۲]

پھر اخروی جنت کی ان نعمتوں کو، اپنے نام نہاد ''نظامِ ربوبیت'' کے قیام کے نتیجہ میں، قائم ہونے والی، ''دنیاوی جنت'' سے، اور ''دنیاوی فتوحات'' سے نتھی کرتے ہوئے، فرماتے ہیں کہ

آپ ان تفاصیل پر غور کیجئے، اور زیادہ نہیں تو صرف مدائن کی فتح پر، جو مالِ غنیمت، ان کے ہاتھ لگا تھا، کتب تاریخ میں ان کی فہرست پر نظر ڈالیے، صاف دکھائی دے گا کہ اَلْجَنَّة کی جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا تھا، وہ کس طرح اس سامان میں موجود

[۱] + [۲] اسلام کیا ہے؟، صفحہ ۱۲۹

تھیں، اور ایک ایران ہی پر کیا موقوف ہے، شام کے سرسبز و شاداب باغات، مصر کی سونا اگلنے والی زمین، عراقِ عجم (جو اس زمانے میں ایران ہی کا حصہ تھا) کی پُر بہار فضائیں، یہ سب کچھ اسی اَلْجنَّة کی مشہور تفسیر تھی، جو ان کے سامنے آ گئی۔ ۱

اب یہ مت سوچئے

لیکن اب یہ مت سوچئے کہ اہلِ ایمان کی طرف سے اپنے جان و مال کو، اللہ کے ہاتھ میں بیچ دینے کی تجارت میں، جس اَلْجنَّة کا وعدہ، سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱، میں کیا گیا ہے، اس کا مصداق، اگر یہی دنیاوی جنت ہے، تو بیچارے وہ صحابہ تو یقیناً ''محرومِ جنت'' قرار پا گئے، جو فتح ایران و عراق، تسخیر شام و مصر سے پہلے نخلِ اسلام کی آبیاری اپنے خون سے کرتے کرتے ، دارِ آخرت کو سدھار گئے۔

اور پھر، یہ سوچنے کی بھی زحمت نہ اٹھائیے کہ اہلِ ایمان کو اس دنیا میں، اقتدار و اختیار کی جو نعمت ملتی ہے، وہ بجائے خود، آخرت میں قابلِ محاسبہ ہے ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (التکاثر-۸) ''پھر اس روز، تم سے ہر نعمت کے متعلق پوچھا جائے گا؟''، جبکہ آخرت میں ملنے والی نعمتوں پر باز پرس اور محاسبہ ہرگز نہ ہوگا، يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ (المؤمن-۴۰) ''بغیر محاسبہ کے انھیں رزق دیا جائے گا'' کیونکہ دارالجزاء میں ملنے والی یہ نعمتیں، ان اعمال ہی پر تو دی جائیں گی، جو (دنیا کے دارالعمل میں رہ کر) انھوں نے انجام دیئے تھے، اس لیے ان نعمتوں پر باز پرس اور محاسبہ کیسا؟ لیکن ''مفکرِ قرآن'' ان جملہ امور کو نظر انداز کرتے ہوئے، بعد از مرگ، ملنے والی جنت کے اوصاف و احوال کو اپنی خود ساختہ دنیاوی جنت سے وابستہ کر ڈالتے ہیں ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یہی حال، دوزخ کا بھی ہے، اسے بھی ''مفکرِ قرآن'' عالمِ مابعد الموت میں سے کھینچ کر، اس دنیاوی زندگی میں برآمد کر لیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے یہ دونوں مقام، آخرت ہی میں واقع ہیں، ''مفکرِ قرآن'' کی تقلیبِ امور کی کارروائی سے، حقائق بدل نہیں سکتے۔

پھر ''مفکرِ قرآن'' کا ''منزلِ قرآن'' سے کھلا کھلا اختلاف، صرف اسی نقطۂ نظر ہی سے نہیں ہے کہ قرآن مجید میں مذکور، جنت و جہنم آیا اسی دنیا میں واقع ہیں یا عالم بعد الموت میں؟ بلکہ یہ اختلاف اس اعتبار سے بھی ہے، کہ جنت و جہنم، آیا مقامات کا نام ہے یا کیفیات کا؟ ''مفکرِ قرآن'' برملا یہ کہتے ہیں کہ

> جنت یا جہنم، کسی خاص مقام کا نام نہیں، کیفیاتِ زندگی کی تعبیر ہے۔ ۲

لیکن خالقِ کائنات اور منزلِ قرآن، بالفاظِ صریحہ جنت کو ایک خاص مقام قرار دیتے ہوئے، فرماتے ہیں کہ

> حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (الفرقان - ۷۶) وہ (جنتی بالا خانے) عارضی یا مستقل قیام کے طور پر خوب جگہ ہے۔

اور جہنم کو بھی، ایک مقام قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

---

۱ اسلام کیا ہے؟، صفحہ ۱۳۰

۲ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۵۱ء، صفحہ ۲۵

إِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (الفرقان - ۶۶) وہ (جہنم) عارضی ٹھہراؤ یا مستقل قیام کے طور پر نہایت بُری جگہ ہے۔

"منزلِ قرآن" کے مقابلہ میں، "مفکرِ قرآن" کی یہ سینہ زوری اور یہ تحکمانہ روش، واقعی قابلِ داد ہے۔ قُتِلَ الْإِنسَانُ مَآ أَكْفَرَهٗ

(ب) عالم برزخ

قیامت کے اجزائے اربعہ میں سے دوسرا جزو، عالم برزخ کا وجود ہے، جس میں "مفکرِ قرآن" نے الحاد کا رویہ اختیار کرنے کی بجائے، قطعی انکار کا رویہ اپنایا ہے۔

موت سے لے کر، یوم البعث تک کا عرصہ، عالم برزخ کہلاتا ہے، اس عالم میں مرنے والوں کی ارواح، تو یقیناً، اجسام سے الگ ہو کر، اپنے وجود برقرار رکھتی ہیں، لیکن ان کے ابدان واجسام، یا تو قبور میں مدفون ہو کر، زمین یا حشرات الارض کی خوراک بن جاتے ہیں، یا سمندر کا پیٹ اور آبی یا برّی درندوں کے بطون، ان کی قبریں قرار پاتی ہیں یا وہ آگ میں جل کر، راکھ ہو کر، ان کا ذرہ ذرہ عالمِ برزخ میں پہنچ جاتا ہے، قبر، عالمِ برزخ (جو بجائے خود، عالمِ آخرت ہی کا ایک حصہ ہے) ہی کا ایک ایسا مقام ہے جہاں مُردہ، اپنے ساتھ ہونے والے، اچھے یا بُرے سلوک سے، اپنی خوش انجامی یا بدانجامی کی پیشگی واقفیت پا لیتا ہے، اسی سلوک کو قبر کا عذاب وثواب کہتے ہیں، یکے از منکرین حدیث، جناب اسلم جیراجپوری ایک مقالہ میں لکھتے ہیں کہ

> ۱ --- برزخ کی مدت، مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے کہ اس میں، وہ، اپنے رب کی حضوری سے، آڑ میں رکھے جائیں گے اور جب حشر ہو گا اللہ کے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے .... یہ عالم برزخ، جس میں شہداء کے سوا، باقی مردے رکھے جاتے ہیں، قرآن کے نزدیک مطلق عالم ممات ہے، جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں۔ [۱]
>
> ۲ --- موت اور حشر میں، مردوں کے لیے، فصل زمانی نہیں ہے، یعنی ان کو برزخ کے زمانہ کا مطلق احساس نہ ہو گا۔ [۲]
>
> ۳ --- اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق کوئی احساس نہیں ہے، اس لیے یہ سمجھنا چاہئے کہ مرنے والے کے لیے، موت ہی کا دن، اس کا حشر کا دن ہے۔ [۳]

دعویٰ ہائے مدعی

مقالہ نگار نے، اپنے ان اقتباسات میں مندرجہ ذیل دعاوی کیے ہیں۔

اولاً ----- "یہ کہ عالم برزخ موت سے حشر تک ہے"۔

ثانیاً ----- یہ کہ "مردے، اس دوران میں، اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں"۔

ثالثاً ----- یہ کہ "عالم برزخ، عالم ممات ہے، جس میں حیات کا شائبہ تک نہیں"۔

رابعاً ----- یہ کہ "عالم برزخ میں شعور واحساسِ زمانہ نہیں ہے"۔

خامساً ----- یہ کہ "عالم برزخ، غیر زمانی عالم ہے"۔

---

۱ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۵۷ ۲ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۰ تا ۶۱ ۳ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۲

دعوائے اول

جہاں تک، اس دعوے کا تعلق ہے کہ ''عالم برزخ، موت سے حشر تک ہے''۔ یہ دعویٰ بالکل صحیح اور مطابق قرآن ہے، قرآن بیان کرتا ہے۔

وَمِنۡ وَّرَآئِهِم بَرۡزَخٌ إِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ (المومنون-۱۰۰) ان سب مرنے والوں کے پیچھے برزخ ہے دوسری زندگی کے دن تک۔

چونکہ یہ، ہمارے اور منکرینِ حدیث کے درمیان، ایک متفق علیہ دعویٰ ہے، لہٰذا اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

دعوائے ثانی اور جائزہ

دعوائے ثانی کے مطابق، ''مُردے عالم برزخ میں، اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں --- ''یقیناً برزخ کا مفہوم، حد فاصل، آڑ، فصل یا روک ہی ہے، مگر یہ کہ وہ برزخ ''رب کی حضوری سے آڑ ہے'' --- یہ بات قرآن سے، نہ کتب لغت سے اور نہ کسی اور دلیل ہی سے ثابت ہے۔

مزید برآں، برزخ کو حد فاصل تسلیم کرنا، تو از روئے لغت اور قرآن، معقول بات ہے، لیکن اسے ''رب کی حضوری سے آڑ'' خیال کر لینا، کیونکر ممکن ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ جنت و دوزخ سے آڑ ہو، دنیا کی زندگی اور اس کے خرخشوں سے آڑ ہو، یہاں کے لوگوں کے ساتھ میل جول سے آڑ ہو، اس قسم کی متعدد آڑیں ہوسکتی ہیں، آخر کسی ایک کی تخصیص بلا مخصص اور بلا دلیل کیسے قبول کر لی جائے؟

ہمارے نزدیک، آڑ کا وہ مفہوم اقرب الی الصحت ہے، جسے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنے ترجمہ قرآن کے حواشی میں پیش کیا ہے۔

> ''برزخ'' فارسی لفظ ''پردہ'' کا معرّب ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اب، ان کے اور دنیا کے درمیان، ایک روک ہے جو انھیں واپس نہیں جانے دے گی، اور قیامت تک، یہ دنیا اور آخرت کے درمیان کی اس حدِ فاصل، میں ٹھہرے رہیں گے۔[1]

اور آیت کا سیاق وسباق بھی اس معنیٰ کی تائید کرتا ہے، کیونکہ اس سے متصل پہلی آیت میں، دنیا کی طرف، ان کے پلٹائے جانے کی خواہش، بایں الفاظ مذکور ہے۔

> حَتّٰى إِذَا جَآءَ أَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ ٥ لَعَلِّيۡ اَعۡمَلُ صٰلِحًا فِيۡمَا تَرَكۡتُ (المومنون-۹۹، ۱۰۰) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہے گا ''اے میرے رب مجھے دنیا میں واپس بھیج دے جسے میں چھوڑ آیا ہوں تاکہ اب میں نیک عمل کروں۔

اپنے رب ہی کے حضور میں

حقیقت یہ ہے کہ تمام مرنے والے افراد، بلا استثناء، اپنے رب ہی کی حضوری میں جاتے ہیں، لہٰذا، یہ دعویٰ قطعی غلط

[1] ترجمہ قرآن (مودودیؒ)، صفحہ ۸۸۹

ہے، کہ ''وہ اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں، قرآن کریم، عندالموت ہی یہ اعلان کر دیتا ہے کہ

اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ (القیامۃ-۳۰) وہ دن ہوگا تیرے رب کی طرف روانگی کا۔

ایک اور مقام پر، قرآن میں، بعد از موت، مردوں کو اُن کے رب کی طرف واپس لائے جانے کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

حَتّٰی إِذَا جَآءَ أَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ٥ ثُمَّ رُدُّوْٓا إِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ (الانعام-۶۱، ۶۲) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آ جاتی ہے تو ہمارے فرستادہ (فرشتے) اسے موت دینے میں کوتاہی نہیں کرتے اور پھر یہ (مردے) اپنے ربِ حقیقی کیطرف لوٹائے جاتے ہیں۔

موت کے نتیجہ میں دنیا چھوڑ دینے کے بعد، نیک عملی کے ارادہ پر، دوبارہ چھوڑی ہوئی دنیا کیطرف جانے کی التجاء (جو سورۃ المومنون کی آیت ۹۹، ۱۰۰ میں اوپر دی جا چکی ہے) بھی ظاہر کرتی ہے، کہ مرنے کے بعد، مردے اپنے رب ہی کی حضوری میں پیش کیے جاتے ہیں، اس لیے تو رَبِّ ارْجِعُوْنِ کے الفاظ سے وہ یہ التجاء کرتے ہیں۔

الغرض، الفاظ، خواہ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ہوں، یا ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ ہوں، یا رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحاً فِیْمَا تَرَکْتُ کے ہوں، یہ بہرحال، مردوں کے اپنے رب ہی کی حضوری میں پیش کیے جانے کو واضح کرتے ہیں، نہ کہ اُس سے آڑ میں رکھے جانے کو۔

پھر شہدائے فی سبیل اللہ کا بعد از موت، اپنے رب کے حضور پہنچنا اور اس سے رزق پانا، تو ایک ایسی حقیقت ہے، جسے منکرین حدیث اور ان کے سرخیل، اسلم جیراجپوری بھی تسلیم کرتے ہیں، عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ کے الفاظ، حضوریٔ رب پر دال ہیں۔

المختصر، یہ کہ تمام مردے، بعد از موت، اپنے رب ہی کی حضوری میں پیش کیے جاتے ہیں، اور ہرگز آڑ میں نہیں رکھے جاتے، البتہ ان کے مدارج الگ الگ ہوں گے، ایک مجرم و سرکش کی حیثیت سے پیش ہوگا اور دوسرا وفادار و فرمانبردار کی حیثیت سے۔ پھر ان میں، یہ سب متفاوت الدرجات ہوں گے، نیکوکاروں میں بھی اور مجرموں اور باغیوں میں بھی فرق مراتب ہوگا، اور ان کے اپنے اپنے درجۂ جرم و اطاعت پر معاملہ کیا جائے گا۔

وَلِکُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَلِیُوَفِّیَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (الاحقاف-۱۹) ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ وہ، ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے، ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔

دعوائے ثالث اور اس کا جائزہ

منکرین حدیث کا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ ''عالم برزخ، عالم ممات ہے، جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں ہے''۔ اس موقف کی حمایت میں، یہ دلیل پیش کی گئی ہے۔

انسان کے لیے، دو ہی زندگیاں ہیں اور دو ہی موتیں۔ پہلی زندگی یہ دنیاوی زندگی ہے، اور دوسری زندگی، حشر کے دن ملے گی، برزخ میں زندگی نہیں۔ [1]

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۲

تیسری زندگی کے قرآنی واقعات

اگر واقعی، انسان کے لیے دو ہی زندگیاں اور دو ہی موتیں ہیں، تو پھر قرآن کے ان واقعات کی کیا توجیہ ہوگی، جن میں اسی دنیا میں، بعث بعد الموت کا ذکر کیا گیا ہے، جو قرآن، دو زندگیوں اور دو موتوں کا ذکر کرتا ہے (اور قطعی طور پر، تیسری زندگی اور تیسری موت کی نفی نہیں کرتا ہے) وہ اگر ایک اور زندگی اور ایک اور موت کا ذکر کر دے، تو اس میں استبعاد کیسا؟ درج ذیل قرآنی واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) ----- بنی اسرائیل، دیدارِ خداوندی پر اصرار کرتے ہیں، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو اسوقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں جب تک وہ اللہ تعالیٰ کو کھلی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں (قَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً (البقرہ-۵۵) حضرت موسیٰؑ، ستر افراد پر مشتمل ایک جماعت کو، کوہِ طور پر لے جاتے ہیں، وہاں وہ صاعقہ کی لپیٹ میں آ کر، زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، پھر انھیں دوبارہ زندگی بخشی جاتی ہے، قرآن اس واقعہ کے متعلق، یہ کہتا ہے، کہ

ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (البقرہ-۵۶) پھر ہم نے تمہیں، موت کے بعد، زندگی دی، تاکہ تم شکر گزار بنو۔

(۲) ----- بنی اسرائیل، اپنے میں سے ایک آدمی کو قتل کر کے، الزامِ قتل، ایک دوسرے پر دھرنا شروع کر دیتے ہیں، اللہ کی بتائی ہوئی ایک تدبیر کے مطابق، مقتول زندہ ہو کر، قاتل کا نام واشگاف کر دیتا ہے، اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں، بعث بعد الموت کے سلسلہ میں دکھاتا ہے۔ کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتٰی وَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ (البقرہ-۷۳)

(۳) ----- اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ ہی میں، ایک ایسی قوم کا واقعہ بیان کیا ہے، جس کے افراد ہزاروں کی تعداد میں، موت سے ڈر کر، اپنے گھروں سے نکل پڑے، تو اللہ تعالیٰ نے، اسی موت کو، ان پر مسلط کر دیا، جس کے خوف سے انھوں نے اپنے گھر بار چھوڑے تھے، پھر انھیں دوبارہ زندہ کیا، قرآن نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ (البقرہ-۲۴۳) کیا تم نے ان لوگوں پر بھی غور کیا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں، اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ ''تم مر جاؤ'' پھر اس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔

(۴) ----- خداوند قدوس کے ایک برگزیدہ پیغمبر (حضرت عزیر علیہ السلام) ایک ایسی بستی پر سے گزرتے ہیں، جو کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھی، حیرت و استعجاب سے یا کسی اور جذبہ و مقصد کے تحت پکار اٹھتے ہیں کہ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا ''اللہ اس کو موت کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟'' اللہ نے، خود اسی پیغمبر کو، اُسے (بعث بعد الموت کی) نشانی بنانے کے لیے، سو سال تک، حالتِ میّت میں رکھا، پھر اسے دوبارہ زندہ اٹھا کھڑا کیا فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِاْئَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ (البقرہ- ۲۵۹)

(۵) ----- حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بعض مردوں کو زندہ کیا جسے خود اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن میں بیان فرمایا ہے اور خود حضرت عیسیٰؑ نے بھی اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ (آل عمران-۴۸) کہہ کر اس امرِ واقعہ کی تصدیق و تصویب فرمائی ہے۔

یہ جملہ واقعات، خود قرآن میں مذکور ہیں، ان واقعات کی رو سے، ان افراد کے لیے، تین موتیں اور تین زندگیاں، قرآن ہی سے ثابت ہوتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے جہاں بھی، دو زندگیوں اور دو موتوں کا ذکر کیا ہے، وہاں حصر نہیں کیا کہ تیسری زندگی کی قطعی نفی کی جائے، پھر مزید یہ کہ برزخ میں، شہید کی زندگی کے تو منکرینِ حدیث بھی قائل ہیں اور اللہ کے ہاں، اُن کے رزق پانے کو بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس زندگی کا اعتراف کرتے ہوئے، کبھی ان کے سان گمان میں بھی نہیں گزرا کہ آخر یہ زندگی بھی، تو، ''دو زندگیوں اور دو موتوں والے اصول'' کے منافی ہے۔

دعوائے رابع اور اس کا جائزہ

منکرین حدیث کا عالم برزخ کے بارے میں چوتھا دعویٰ یہ ہے کہ --- ''اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق کوئی احساس نہیں ہے، اس لیے یہ سمجھنا چاہیئے، کہ مرنے والے کے لیے، موت ہی کا دن، اس کے حشر کا دن ہے'' --- اور اسی دعویٰ کی بازگشت، اس اقتباس میں بھی ہے۔

> دوسری زندگی، جو انسان کو ملے گی، وہ حشر کے دن ملے گی، نہ کہ قبر میں، لہٰذا، اس دنیاوی زندگی کے منقطع ہو جانے کے بعد، اہل برزخ میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور زمانہ چونکہ اعتباری شے ہے اور اہل برزخ میں شعور اور احساس نہیں ہے اس لیے زمانہ کا بھی ان کو احساس نہیں ہے چنانچہ قیامت کے دن، جب وہ اٹھائے جائیں گے تو اپنے خیال میں اپنے آپ کو اسی ساعت اور اسی لمحہ میں سمجھیں گے، جس میں ان کی جان نکلی تھی۔ [1]

کیا اہل برزخ شعور و ادراک رکھتے ہیں؟

منکرینِ حدیث کے نزدیک، اہل برزخ، شعور و ادراک، اور خبر و سماعت (جو لوازم حیات ہیں) سے قطعی محروم ہیں، اور اس کی دلیل ان آیات سے کشید کی جاتی ہے جن میں مشرکین کا فوت شدہ اولیاء و اکابر کو پکارنا مذکور ہے، اور قرآن، اہل قبور کی سماعت و خبر اور شعور و ادراک کی نفی کرتا ہے، چنانچہ ایسی آیات پیش کر کے، ان سے استدلال اور پھر استنتاج یوں کیا جاتا ہے۔

> ان آیات سے جہاں اس امر کا بین ثبوت ملتا ہے کہ مشرکین کے معبودان غیر اللہ، ان کے مردہ اولیاء اور بزرگانِ دین ہی ہیں جن کو وہ مقبولانِ بارگاہ اور صاحبانِ قدرت سمجھ کر پوجتے تھے، وہاں یہ بھی تصریحاً ثابت ہوتا ہے کہ تمام مردے، جو برزخ میں ہیں، ان میں نہ علم ہے، نہ احساس، نہ شعور، نہ سماعت، اور بالکل غافل اور بے خبر ہیں اور قیامت کے دن، اپنے پوجنے اور پکارنے والوں کو صاف جواب دے دیں گے کہ نہ ہم کو تمھاری پرستش کی خبر تھی، نہ تمھاری پکار کی۔ [2]

امر واقعہ یہ ہے کہ مردے، عالم برزخ کی چاردیواری میں رہ کر، عذاب و اذیت اور راحت و مسرت کا احساس رکھتے ہیں، علم و خبر اور شعور و ادراک بھی رکھتے ہیں، لیکن اس موجودہ دنیا کے مشرکوں کی نداء و پکار کے بارے میں، جو ان کے عالم برزخ کی چاردیواری سے باہر کے امور ہیں، قطعی بے خبر اور غافل ہیں۔ ایک گھر کے اندر رہنے والا آدمی، اگر باہر کے پڑوسیوں کی

---

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۰
[2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۵۹

آواز نہیں سن سکتا اور ان کے امور کا علم و احساس نہیں رکھتا تو اس سے یہ کب اور کس طرح لازم آتا ہے کہ اس کی اپنی گھر کی چاردیواری میں، خود اسے پیش آنے والے امور سے بھی وہ غافل و بے خبر ہے؟

عالم برزخ میں، مردے نہ صرف یہ کہ برزخی امور و معاملات کا شعور و ادراک رکھتے ہیں، بلکہ اگر وہ نیک روحیں ہیں تو اپنے پسماندگان سے اس قدر دلچسپی بھی رکھتے ہیں کہ اپنے نیک انجام سے، ان کے باخبر ہونے کے متمنّی رہتے ہیں، تاکہ وہ بھی، ان کی طرح، راہِ راست اختیار کر کے، آخرت کے انجام بد سے محفوظ ہو کر، اخروی فوز و فلاح کو پالیں۔ اس کا ثبوت، بالتفصیل، آئندہ صفحات میں، اثباتِ عذابِ قبر میں آرہا ہے۔

الغرض، قرآن کریم، جن امور و معاملات سے، اہل برزخ (کے مُردوں) کو، غافل، بے خبر، بے شعور، اور بے علم قرار دیتا ہے، وہ دراصل، اِس عالم مادی سے متعلق ہیں، اور جن واقعات و حوادث کے شعور و علم، اور احساس و ادراک کا اثبات کرتا ہے، وہ بجائے خود عالم برزخ ہی سے تعلق رکھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عالم برزخ کے مردے، مشرکوں کی پکار و عبادت اور نداء و التجاء سے قطعی بے علم اور بے خبر رہتے ہیں، لیکن خود انھیں، بہرحال، ان حوادث و واقعات اور امور و معاملات کا علم، احساس، خبر، شعور اور ادراک ضرور ہوتا ہے، جو عالمِ برزخ میں، ان ہی کے ساتھ پیش آتے ہیں، اگرچہ اس کا ثبوت، تفصیل کے ساتھ، آئندہ صفحات میں آرہا ہے، تاہم فوری حوالہ کے تحت، ایک دلیل پیش خدمت ہے۔

اہل برزخ کے لیے شعور و ادراک کا قرآنی ثبوت

سورہ یٰسین میں، ایک مردِ مومن کا واقعہ مذکور ہے، جو اپنی کافر قوم کو، توحید خداوندی اور اتباعِ مرسلین کی ترغیب و تلقین کرتا ہے، قوم کے اشرار، اسے سزائے موت دیتے ہیں، وہ موت کے دروازے میں سے گزر کر، حیاتِ برزخ کی کامیابی پر اس قدر شاداں و فرحاں ہوتا ہے کہ اپنے پسماندگان کے بارے میں، اس کی تمنا الفاظ کا جامہ پہن کر، اس کے لبوں پر آجاتی ہے، اور وُہ بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ٥ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ (یٰسین-۲۶، ۲۷) کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا، کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت، میری مغفرت فرمادی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا۔

مردِ مومن کے مرنے کے بعد، --- ''کاش، میری قوم یہ جان لے'' --- کے الفاظ میں، مذکور یہ تمنا، صرف اُسی وقت، موزوں اور مناسب قرار پاسکتی ہے، جبکہ اس کی قوم کو دنیا (کے دارالعمل) میں رہ کر، اس سے فائدہ اٹھانے کی مہلت میسر ہو، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ یہ تمنا، عالم برزخ میں، اس کے پسماندگان کے حق میں کیجا رہی ہو، ورنہ قیامِ قیامت کے بعد، اس قسم کی تمنا کے وقت، مردِ مومن کے پسماندگان ہوں گے ہی نہیں، کجا یہ کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں، کیونکہ اس وقت تو تمام انسان، دنیا چھوڑ کر، عالم حشر میں موجود ہوں گے، اس آیت کے تحت، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا ہے۔

یہ آیت بھی من جملہ، ان آیات کے ہے، جن سے حیاتِ برزخ کا صریح ثبوت ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے

بعد سے قیامت تک کا زمانہ، خالص عدم اور کامل نیستی کا زمانہ نہیں ہے جیسا کہ بعض کم علم لوگ گمان کرتے ہیں، بلکہ اس زمانہ میں، جسم کے بغیر روح زندہ رہتی ہے، کلام کرتی اور سنتی ہے، جذبات و احساسات رکھتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے، اور اہل دنیا کے ساتھ بھی، اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں، اگر یہ نہ ہوتا تو مرنے کے بعد، اس مردِ مومن کو، جنت کی بشارت کیسے دی جاتی، اور وہ اپنی قوم کے لیے یہ تمنا کیسے کرتا کہ کاش وہ اس کے نیک انجام سے باخبر ہو جائے۔ [1]

دعوائے خامس اور اس کا جائزہ

منکرینِ حدیث کا عالم برزخ کے بارے میں، پانچواں دعویٰ یہ ہے کہ --- ''وہ غیر زمانی، عالم ہے، اور خالص عدم اور کامل نیستی کا عالم ہے جس میں اہل برزخ کو، زمانہ کا مطلق کوئی احساس نہیں ہوتا، برزخی دنیا میں واقع مُردے، علم و احساس، خبر و سماعت، اور جملہ لوازمِ حیات سے قطعی محروم ہوتے ہیں''۔

کیا عالم برزخ غیر زمانی ہے؟

عالمِ برزخ، منکرینِ حدیث کی نگاہ میں، خالص عدم، کامل نیستی کا دَور اور غیر زمانی عالم ہے، لیکن یہ محض ایک مغالطہ ہے، اور یہ مغالطہ بھی اس بناء پر ہے کہ اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہوتا، اس لیے یہ غیر زمانی ہے۔

اولاً ----- تو یہ بات ہی غلط ہے کہ اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہوتا، انھیں احساس تو یقیناً ہے، اور اسی احساس کی بناء پر، وہ اپنی مدتِ قیام کو کبھی ''گھڑی بھر'' بتاتے ہیں، اور کبھی ''دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک کی مدت'' بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے، کہ صحیح یا غلط مدت بیان کرنا، احساس و علم ہی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اگر انھیں زمانہ کا ''مطلق احساس'' نہ ہو، تو (صحیح یا غلط) وہ کسی بھی مدت کو بیان کرنے سے قاصر رہتے۔ پس ان کا مدت بیان کرنا، خواہ یہ مدت غلط ہی ہو، علم و احساس ہی کی بدولت ہے۔

ثانیاً ----- یہ کہ اگر یہ بات، برسبیلِ تنزل، مان بھی لیجائے کہ اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہوتا، تب بھی منکرین حدیث کا موقف ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ کسی چیز کا احساس یا علم نہ ہونا، اس چیز کے معدوم ہونے کے لیے کسی بھی طرح حجت نہیں ہو سکتا۔ وجودِ شے اور اس کے احساس و شعور میں، کوئی ایسا لازمہ نہیں ہے جس کی بناء پر، نفیاً یا اثباتاً کوئی فیصلہ کیا جا سکے، منکرینِ حدیث کا (اور بالخصوص، ان کے سرخیل، جناب اسلم جیراجپوری کا) یہ اصولِ استدلال ہی بے بنیاد ہے کہ چونکہ اہل برزخ کو، مدت کا مطلق احساس نہیں ہے، اس لیے اس کی کوئی مدت ہی نہیں ہے۔

تردید، بانداز دِگر

اب اگر مدت برزخ کا صحیح طور پر نہ بتایا جانا، مدتِ برزخ کے عدم کی دلیل ہے تو پھر لازم ہے کہ حیاتِ دنیا کو بھی معدوم قرار دیا جائے، کیونکہ قیامت کے روز، لوگ، لبث فی الارض کی مدت کو بھی، اسی طرح غلط بتائیں گے، جس طرح عالم

[1] تفہیم القرآن، جلد ۴، صفحہ ۲۵۵

برزخ کی مدت کو غلط ظاہر کریں گے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ (یونس-۴۵) جس دن اللہ ان کو اٹھائے گا، گویا وہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی، جس میں وہ باہم متعارف ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سے نہ تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ لوگ دنیا میں بھی، شعور وادراک، علم وخبر اور احساس وسماعت سے عاری ہیں اور نہ ہی یہ کہ موجودہ ارضی دنیا، غیر زمانی ہے جیسا کہ عالم برزخ کے متعلق استدلال اور استنتاج کیا جاتا ہے، کیونکہ جس طرح، اہل برزخ، برزخی مدت سے بے خبری کا اظہار کریں گے بعینہٖ وہ دنیا کے امور سے بھی، ایسی ہی بے علمی ظاہر کریں گے، اب نہ تو اس سے دنیاوی آلام وراحت کی نفی ہوسکتی ہے اور نہ ہی عالم برزخ کی۔

احساس زمانہ میں غلطی

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں، اس کا تجربہ کرتے رہتے ہیں کہ جو شخص چند گھنٹوں کے لیے سوتا ہے، اسے وقت کا مطلق احساس نہیں رہتا اور وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ میں کس قدر مدت سویا ہوں جب تک کہ اسے کسی دوسرے ذریعہ سے صحیح طور پر معلوم نہ ہو، بعض لوگ دو دو دن، بعض ہفتوں، بعض مہینوں اور بعض برسوں تک سوئے رہتے ہیں، اور انھیں بدن میں نقاہت کے علاوہ، وقت کا کوئی صحیح پتہ یا احساس نہیں ہوتا۔ خود قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ اصحاب کہف (بحساب شمسی کیلنڈر) تین سو سال (اور بحساب قمری کینڈر) نو سال اضافہ کے ساتھ (تین سو نو سال) تک سوئے رہے ہیں، لیکن جب صدیوں پر محیط، اس لمبی نیند سے بیدار ہوکر، اس سوال کا سامنا کرتے ہیں کہ كَمْ لَبِثْتُم ''کتنی دیر اس حال میں رہے؟'' تو ان سب کا جواب یہ تھا کہ لَبِثْنَا يَوماً أَوْبَعْضَ يَوم ''ہم شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے''، یہاں صحیح مدت بتانے میں، ان کا علم واحساس غلطی کر جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ''علم واحساس موجود'' ہو تو وہ غلطی کرتا ہے، اگر سرے سے علم واحساس موجود ہی نہ ہو، تو وہ کیا غلطی کرے گا؟ بہر حال، اس سے یہ واضح ہے کہ نفس واقعہ، ایک الگ چیز ہے اور اس کے متعلق احساس وشعور، چیزے دیگر ہے، دونوں میں خلط مبحث کرنا، صحیح غور وتدبر کرنے والوں کا کام نہیں ہے۔

نیند اگرچہ، خاص معنیٰ کے اعتبار سے موت نہیں، مگر درحقیقت اس کی قریبی رشتہ دار ہے، اس میں انسان کے حواس کسی قدر معطل ہوجاتے ہیں، خود بحالات خواب، جو کچھ دیکھتا ہے، وہ بھی ایک نقش غیر واضح کی طرح ہوتا ہے، تو خود اندازہ لگا لیجئے کہ موت کے بعد تعطل حواس کس درجہ کا ہوگا؟

پھر علم واحساس کا درجہ تو زندہ اور بیدار انسانوں میں بھی مختلف اور متفاوت ہوتا ہے، دنیا میں، آئے دن، سینکڑوں واقعات رونما ہوتے ہیں، ان واقعات کے احساس وشعور میں، اور ان کی جزئیات کے احاطہ واستقصاء میں کسی طرح بھی، یہ سب یکساں نہیں ہو سکتے، بعض افراد سے واقعات یا ان کی جزئیات کے بیان میں غلطی کا صدور ممکن ہے، اور ان اغلاط کی بناء پر اگر نفس واقعات کا انکار نہیں کیا جاسکتا، تو عالم برزخ کی مدت بیان کرنے میں، غلطی کر جانے کو مدتِ برزخ کے وجود زمانی کا انکار کیسے کیا جاسکتا ہے؟

غلطی بوجہ نسیان کی ایک اہم وجہ

پھر اگر صدورِ نسیان کے اسباب کا کھوج لگایا جائے تو ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے، بعض اوقات، بڑے بڑے ذکی الحس، حاضر دماغ، سلیم الطبع افراد بھی، اپنے بہت سے ذاتی واقعات کو بھول جاتے ہیں، دانستہ غلطی اور ارادی جھوٹ سے نہیں، محض سہو و نسیان سے، ایک سچے واقعہ کا وہ انکار کر دیتے ہیں، مگر اس سے ''واقعہ'' کی صحت باطل نہیں ہو جاتی۔ ایسے امور، ہر شخص کو بکثرت پیش آتے رہتے ہیں، مثال کے طور پر، آنحضرت ﷺ کا نماز میں بھول کر، چار کی جگہ پانچ رکعت پڑھا دینا، اور کبھی چار رکعتی نماز میں صرف دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دینا مذکور ہے، اس کی بابت بعض صحابہ کا قوی احساس، بعض کا نیم احساس، بعض کا سکوت اور بعض کا صاف انکار، پھر لوگوں کی تصدیق پر، سجدۂ سہو کرنا، اس امر کی ایک اعلیٰ شہادت ہے، اس سے احساس کی کمی، اور شواغل و موانع کے باعث، بعض چیزوں سے غافل و بے خبر ہونا، خوب واضح ہے، پس اس غفلت و بے خبری سے، عدمِ شئے پر حجت قائم کرنا قطعی ناروا بات ہے، خواہ وہ شئے، حیاتِ دنیا سے متعلق ہو، یا حیاتِ برزخ سے۔

عالم برزخ کے زمانی ہونے کا ثبوت

ہماری اب تک کی یہ بحث، اگرچہ اس خیال کی تردید کے لیے کافی ہے، کہ عالم برزخ، غیر زمانی ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر، قرآن کریم کی وہ آیات بھی پیش کی جا رہی ہیں، جن سے عالم برزخ کا زمانی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

(۱) --- يَا وَيْلَنَا مَنۢ بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا (یٰسین-۳۶) ہائے، ہماری شامت، کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے اٹھا دیا۔

اس آیت کے تحت اسلم جیراجپوری صاحب لکھتے ہیں کہ

> یعنی حشر کے وقت، وہ اپنے آپ کو، اپنی خوابگاہ ہی میں سمجھتے ہوں گے، جہاں مرض الموت میں مرے تھے۔ [1]

سوال یہ ہے کہ ایسا سمجھنے سے، نفس واقعہ کا ایسا ہونا، کیونکر لازم آئے گا، بالخصوص، جبکہ وہ یہ کہتے ہوئے دیکھ ہی رہا ہوگا کہ وہ اس بستر، یا چار پائی یا پلنگ سے ہرگز نہیں اٹھا ہے جس پر اسے موت آئی تھی، ممکن ہے اسے خوابگاہ سے، مرنے کے بعد، کسی میدان یا قبرستان میں لایا گیا ہو، بہت ممکن ہے کہ کسی مرگھٹ میں جلایا گیا ہو، یا کسی درندے نے اسے ہڑپ کر لیا ہو، یا اسے کسی ہسپتال کے مردہ خانے میں رکھا گیا ہو، کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ قیامت جیسے وحشتناک عالم میں، اور ہولناک حادثے میں، اپنے احساسات فراموش کر جائے یا ان کی طرف، کسی خاص وجہ سے، خاص توجہ نہ دے سکے، دنیا میں بے سروسامانی اور پریشانی کے وقت، انسان، ہوش و حواس گم کر بیٹھتا ہے اور خلافِ مقصد، کچھ اور ہی اس کے منہ سے نکل جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قیامت کا زمین و آسمان پر بھاری اور زبردست حادثہ، اس قدر سنگین، شدید اور اوسان خطا کر دینے والا ہو کہ عذاب برزخ بھی، اس کے سامنے ہلکا ہو، اور وہ قیامت کی اس طآمّۃ الکبریٰ کی گھڑی میں، برزخ کی تکلیف کو بھول گیا ہو، کیونکہ بڑی مصیبت کے سامنے،

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۰

انسان چھوٹی مصیبت کو بھول ہی جاتا ہے۔

روز قیامت کے حساب کتاب سے قبل، مردے کا عالم برزخ میں، عذاب وتکلیف پانا، ایک ڈراؤنے خواب کا سا معاملہ ہے جس طرح خواب، حالت نیند میں آتا ہے، اسی طرح، برزخ کی یہ سزا بھی کچھ ایسی حالت میں ملتی ہے، یہی وجہ ہے کہ برزخ (قبر) کو آیت میں مرقد کا نام دیا گیا ہے جس میں ڈراؤنے خواب کی شکل میں دکھ پا رہا تھا۔

بہرحال، آیت کی روشنی میں، مرقد میں پڑے رہنا اور عذاب وثواب سے دوچار ہوتے رہنا، اور پھر حادثۂ قیامت پر اٹھ کھڑے ہونا، اور ''کس نے ہمیں اپنی خوابگاہ سے اٹھا کھڑا کر دیا'' کا سوال کرڈالنا، اور پھر اپنی مدت برزخ کا غلط اندازہ لگا کر ،اسے بیان کرنا، یہ سب کچھ، اپنے اندر زمانی ثبوت رکھتا ہے۔

عالم برزخ کے زمانی ہونے کی ایک اور واضح دلیل

عالم برزخ کے زمانی ہونے کی، سب سے بڑی اور واضح دلیل درج ذیل آیت میں پائی جاتی ہے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ إِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (الرُّوم-۵۵)اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم قسم کھائیں گے، کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے، اسی طرح وہ بہکائے جاتے تھے، اور جن کو علم وایمان دیا گیا، وہ کہیں گے کہ تم، اللہ کے نوشتہ میں حشر تک رہے، سو یہ یوم حشر ہی ہے، مگر تم اس کو جانتے نہ تھے۔

اس آیت کے تحت، اسلم جیراجپوری صاحب فرماتے ہیں۔

> مجرم تو حشر کے دن، قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے، مگر اہل علم وایمان، ان سے کہیں گے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں قیامت تک رہے، لیکن تم کو خبر نہ تھی، یہ تصریح ہے اُن کے عدمِ احساسِ زمانی کی۔ [1]

حقیقت یہ ہے کہ یہاں مقالہ نگار، آیت کے اصل مفہوم سے اباء واعراض کرتے ہوئے، اور سینہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، یہ فرماتے ہیں کہ --- ''یہ تصریح ہے ان کے عدمِ احساسِ زمانی کی'' --- حالانکہ یہ صرف ''غلط احساس زمانی'' کی تصریح ہے، نہ کہ ''عدم احساس زمانی'' کی۔ اور پھر اہل ایمان اور صاحبانِ علم، اس غلط احساس کی تردید کرتے ہوئے، امر واقعہ کو بایں الفاظ پیش کرتے ہیں کہ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ''تم نوشتہ خداوندی میں (عالم برزخ میں) حشر کے دن تک رہے ہو''۔ اس سے بڑھ کر، عالمِ برزخ کے زمانی ہونے کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟

(ج) عذابِ قبر

عذاب برزخ، جسے بالعموم عذاب قبر کہا جاتا ہے، ایک ایسی حقیقت ہے، جو قرآن سے ثابت ہونے کے باوجود، منکرینِ حدیث کے لیے ناقابل قبول ہے، ہم کسی تفصیل میں جائے بغیر، ان آیات کی توضیح وتشریح ہی پر اکتفاء کر رہے ہیں جن

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۱

میں عذاب وثواب برزخ سے بحث کی گئی ہے، لیکن قبل اس کے کہ عذاب برزخ پر دالّہ آیات پیش کی جائیں، عالم برزخ کے بارے میں، یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ وہ عرصہ ہے، جو موت سے لے کر، حشر تک کی مدت پر پھیلا ہوا ہے، یہ مدت، محض، عرصۂ ممات نہیں، بلکہ برزخی زندگی پر مشتمل دور ہے، یہ زندگی، دنیاوی زندگی سے یکسر مختلف ہے، حیات برزخ میں، اہلِ برزخ، عالم برزخ ہی کی چاردیواری میں، علم واحساس، شعور وادراک اور سماعت وخبر رکھتے ہیں، البتہ اہل دنیا سے، ان کا اس قسم کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ مقتولین فی سبیل اللہ کے حق میں، تو قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ، حیات برزخ اور برزخی زندگی کے لوازمات کو پیش کیا ہے جس میں وہ موت سے لے کر، حشر تک، شاداں وفرحاں رہیں گے، اسی کیفیت کو ثوابِ برزخ کہا جاتا ہے، اس کے برعکس، بُرے لوگ بُرے حالات ہی میں یہ وقت گزاریں گے، اسے عذاب برزخ کا نام دیا جاتا ہے، اس سے بہر حال یہ واضح ہے کہ عالم برزخ، موت وحشر کے درمیان، فصل زمانی ہے، قطعِ نظر اس کے کہ اہل برزخ کو برزخی مدت کا صحیح احساس ہو، یا نہ ہو۔

ثواب وعذابِ برزخ پر دالّہ آیات

قرآن کریم میں، متعدد آیات ایسی ہیں، جو عذابِ برزخ پر بھی، اور ثواب برزخ پر بھی دلالت کرتی ہیں، چند آیات ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) --- إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ اَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا (النساء-۹۷) بیشک وہ لوگ، جن کی فرشتے جان نکالتے ہیں، اس حال میں کہ برخود ظلم کر رہے ہیں، ان سے کہتے ہیں کہ "تم کس حال میں تھے؟" وہ کہتے ہیں کہ "ہم زمین میں بے بس تھے"، فرشتے کہتے ہیں کہ "کیا اللہ کی راہیں کشادہ نہ تھیں کہ تم ہجرت کر لیتے"۔

(۲) --- وَلَوْ تَرٰى إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ (الانفال-۵۰،۵۱) کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جبکہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے، وہ ان کے چہروں اور کولھوں پر مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے "لو اب جلنے کی سزا بھگتو یہ تمھارے ہاتھوں کی آگے بھیجی ہوئی کمائی ہے۔

(۳) --- فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ (محمد-۲۷) پھر اس وقت کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انھیں لے جائیں گے۔

(۴) --- وَلَوْ تَرٰى إِذِ الظّٰلِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا أَنفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ اٰيٰتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ (الانعام-۹۳) اگر آپ اس وقت دیکھیں جبکہ یہ ظالم لوگ، موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے "ہاں اپنی جانیں نکالو، آج تمہیں ذلت کی سزا دی جائیگی اس وجہ سے کہ تم اللہ کے ذمہ جھوٹی باتیں بکتے تھے اور تم اللہ کی آیات سے تکبر کرتے تھے"۔

یہ چاروں آیات، قرآن کریم کی ان آیات میں سے ہیں، جو عذاب برزخ (عذاب قبر) کی تصریح کرتی ہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت ہی سے کفار و منافقین پر، عذاب شروع ہو جاتا ہے، اور یہ عذاب، اس سزا سے مختلف چیز ہے، جو قیامت میں، ان کے مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد، ان کو دیجائے گی، نیز عند الموت، فساق و فجار اور ظالمین و اشرار کے ساتھ، فرشتوں کی زجر و توبیخ پر مشتمل گفتگو بھی، ان آیات میں مذکور ہے، جو عامۃ الناس کے لیے بالکل اسی طرح، نا قابل سماعت ہے، جس طرح فرشتوں کے ہاتھوں، مجرمین کی پٹائی، غیر مرئی اور غیر مشاہد ہے، کیونکہ یہ معاملہ، مرنے والے کفار و اشرار کے اجسام و ابدان کے ساتھ نہیں بلکہ اُن کی مقبوضہ ارواح کے ساتھ پیش آتا ہے، اس لیے، مارنے والی ہستیاں (فرشتے) اور ضربِ ملائکہ کا نشانہ بننے والی ارواح اور فرشتوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کی یہ ساری کارروائی، عالم برزخ کی وہ مستور و مخفی کارروائی ہے، جو اہل دنیا کے لیے نا قابل سماعت اور غیر مرئی ہی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ، عذاب برزخ کی دلیل، مندرجہ ذیل آیت بھی فراہم کرتی ہے۔

(۵) --- حَتّٰٓى إِذَا جَآءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صٰلِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّآ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (المومنون-۹۹،۱۰۰) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آ جائے گی تو کہنا شروع کر دے گا کہ "اے میرے رب! مجھے اسی دنیا میں بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ آیا ہوں امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا" ہرگز نہیں، یہ تو محض ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے، دوسری زندگی کے دن تک ان سب مردوں کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے۔

یہ آیت اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی، برزخ کا وہ دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے جس کے حالات کو دیکھتے ہی، مجرم کو احساس ہو جاتا ہے کہ عالم مابعد الموت کے متعلق، انبیاء، جو کچھ فرمایا کرتے تھے، وہ سب درست ہے، اس لیے، وہ عالم برزخ کی سرحد میں، داخل ہوتے ہی، یہ درخواست کرے گا کہ اسے ایک دفعہ دنیا میں واپس بھیج دیا جائے، تا کہ کفر و شرک اور فسق و فجور کی جگہ، ایمان و توحید اور صلاح و فلاح کی زندگی گزار کر لوٹے، یہ صورتحال، عالم برزخ میں، حقیقت کے بے نقاب ہونے کو ظاہر کرتی ہے، جس کا احساس اور مشاہدہ، مجرم روح کو واپس لوٹنے کی التجاء کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے، جو عالم برزخ کو محض عالمِ ممات اور دنیائے عدمِ محض قرار دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ مجرموں کی طرف سے، دنیا میں لوٹائے جانے کی یہ درخواست، صرف موت کی سرحد پار، کرتے وقت ہی، نہیں کی جائے گی بلکہ عالم برزخ سے لے کر، واصل بجہنم ہونے تک کے ہر کٹھن مرحلہ میں، حتّٰی کہ دوزخ میں سزا پانے کے دوران بھی، وہ بار بار ایسی التجائیں کرتے رہیں گے کہ انھیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے، اب کے وہ گمراہی کی بجائے، ہدایت پر چل کر آئیں گے۔

عذاب برزخ کی ان آیات کے بعد، اب کچھ وہ آیات ملاحظہ فرمائیے، جن میں ثواب برزخ کا ذکر ہے۔

(۶) ---وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ ۝ فَرِحِيۡنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَيَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (آلِ عمران-۱۶۹، ۱۷۰) جولوگ، اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ہیں، انھیں مردہ مت خیال کر، وہ زندہ ہیں جو اپنے رب کے ہاں رزق دیئے جاتے ہیں، وہ خوش ہیں اس چیز سے، جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمائی، اور جو لوگ ابھی ان سے نہیں ملے ہیں، ان کے متعلق بھی وہ خوش ہیں کہ (وہ بھی اسی راہ پر ہیں) اور انھیں کسی قسم کا خوف و غم نہیں ہے۔

اس آیت میں، اللہ تعالیٰ نے مقتولین فی سبیل اللہ (شہداء) کے لیے چار اعزازات بیان کیے ہیں۔

اوّلاً ----- یہ کہ وہ زندہ ہیں، اس لیے، انھیں مردہ کہنا تو کجا، بلکہ ایسا گمان کرنے سے بھی منع فرما دیا۔ وہ ایک امتیازی نوعیت کی برزخی زندگی رکھتے ہیں، جو عام مُردوں کی برزخی حیات سے بالاتر ہے۔

ثانیاً ----- یہ کہ انھیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں سے رزق ملتا ہے، جو دنیا سے منتقل ہوتے ہی، ان کے لیے جاری ہو جاتا ہے، اس زندگی میں شہداء کو، خدا کی حضوری میں، جو قرب حاصل ہے، عِنۡدَ رَبِّهِمۡ کے الفاظ اس کا مظہر ہیں۔

ثالثاً ----- یہ کہ، فَرِحِيۡنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لوگ، اللہ کی نوازشات پر خوش و خرم، شاداں و فرحاں مسرت کے جھولے جھولتے ہیں، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ عالمِ برزخ میں انھیں، مسرت و فرحت کی کیفیات کا بخوبی احساس ہوگا۔

رابعاً ----- یہ کہ، وہ اپنے ان متعلقین کے بارے میں بھی خوش ہیں، جو ان کے نقوشِ قدم پر چل کر، ان سے ملنے والے ہیں۔

آخری فضیلت کے الفاظِ قرآن، اس امر کو مبرہن کر ڈالتے ہیں کہ شہداء فی سبیل اللہ کے یہ انعامات اور نعمتیں، برزخی زندگی ہی سے تعلق رکھتی ہیں، (بعث بعد الموت کے بعد ملنے والی جنت سے ان کا تعلق نہیں ہے) جبکہ ابھی کچھ لوگ، دنیاوی زندگی میں، ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، موت کے دروازہ سے گزر کے حیاتِ جاوداں پانے والے ہیں، ورنہ اگر اجتماعی حشر کے بعد، (یا برزخی زندگی کے بعد) ملنے والی جنت کی نعمتوں کا معاملہ ہوتا، تو لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ کا جملہ بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا، کیونکہ حشر کے بعد تو تمام لوگ ہی دنیا چھوڑ چکے ہوں گے اور کوئی شخص بھی لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ کا مصداق نہ رہیگا۔ اس طرح یہ آیت ثواب برزخ، برزخی زندگی اور زندگی کے جملہ لوازم مثلاً علم و احساس، شعور و ادراک اور پسماندگان کے متعلق احساسات کا نہایت واضح ثبوت ہے۔

(۷) --- قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَـنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِىۡ يَعۡلَمُوۡنَ (یٰسین - ۲۶، ۲۷) کہا گیا ''داخلِ جنت ہو جا'' اس نے کہا'' کاش میری قوم جان لے کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا ہے اور مجھے صاحب اعزاز بنا دیا ہے''۔

یہ دراصل، سورہ یٰسین میں مذکور، اس مردِ مومن کا واقعہ ہے، جو شہر کے دور دراز گوشے سے آ کر اپنی قوم کو یہ تلقین کر رہا

تھا کہ تم خدا کے ان پیغمبروں کا اتباع کرو، جو تمہیں بغیر کسی طمع ولالچ کے راہ راست دکھا رہے ہیں، لیکن اس کی یہ نصیحت، قوم پر بے اثر ثابت ہوئی اور قوم نے اسے جان سے مار ڈالا، یہ اس کی سعادت بختی تھی کہ شہادت کے نصیب ہوتے ہی، اسے جنت کی بشارت دے دی گئی، جونہی کہ وہ موت کے دروازے سے گزر کر، دوسرے عالم (عالم برزخ) میں پہنچا، فرشتے، اس کے استقبال کو موجود تھے، انھوں نے اسے خوشخبری دی کہ فردوس بریں، اس کی منتظر ہے، عالم برزخ میں، اس کے ساتھ، یہ سلوک بھی، دراصل جنتی برتاؤ کا ایک حصہ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قبر، جنت کے باغوں میں سے، یا تو، ایک باغ ہے، یا پھر جہنم کے گڑھوں میں سے گڑھا۔ اس لیے عالم برزخ میں، اس کی یہ پذیرائی، ایسی ہے گویا وہ جنت ہی میں داخل ہو گیا۔

"يٰلَيْتَ قَوْمِیْ يَعْلَمُوْنَ ...." (کاش، میری قوم یہ جان لے کہ..........) کے الفاظ یہ ثابت کرتے ہیں کہ ابھی حشر (اجتماعی قیامت) کا واقعہ پیش نہیں آیا، اور اس کی قوم، ابھی حیاتِ دنیا کا سفر طے کر رہی ہے، موت کے دروازے سے ابھی ان کا گزر نہیں ہوا، اس لیے عالم برزخ میں، اس کی یہ تمنا ہے کہ کاش، اس کی قوم، اس کے نیک انجام سے باخبر ہو جائے، اور اس کی زندگی سے، اگر نہیں، تو اس کی موت ہی سے سبق لے کر، راہِ راست اختیار کر لے، اس طرح یہ صورتحال، ثواب برزخ کی واضح دلیل ہے۔

علاوہ ازیں، مندرجہ ذیل، دونوں آیات بھی، عذاب قبر اور ثواب برزخ کی واضح دلیل ہیں۔

(۸، ۹)......قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْیَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰی إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ ۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا لِّلَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَّلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَّلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (النحل - ۲۷ تا ۳۲) علم والے (اس وقت) بول اٹھیں گے، کہ آج (پوری) رسوائی اور سختی، ان کافروں پر ہے، جن کی جانیں فرشتوں نے اس حال میں قبض کی تھیں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے، تب وہ ڈگیں ڈال دیں گے کہ "ہم کوئی برائی نہیں کرتے تھے"، فرشتے کہیں گے، "کر کیسے نہیں رہے تھے، اللہ تمھاری کرتوتوں سے خوب واقف ہے، اب جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ، اسی میں تمہیں اب رہنا ہے، کیا برا ٹھکانہ ہے متکبرین کا" --- اور اہل تقویٰ سے پوچھا گیا کہ تمھارے رب نے کیا اتارا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ بہترین چیز اتاری، نیکوکاروں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر (اور بھی) بہتر ہے اور اہل تقویٰ کا کیا ہی اچھا ٹھکانہ ہے ہمیشہ رہنے کے باغ، جن میں داخل ہوں گے، ان کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی، انھیں خواہش کے مطابق مل جائے گا اللہ اسی طرح اہل تقوی کو بدلہ دیتا ہے، ان کی روحیں، فرشتے، پاکیزگی کی حالت میں قبض کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ تم پر سلام ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ، بسبب اپنے ان اعمال کے، جو تم کیا کرتے تھے۔

یہ آیات، جن میں کفار و متکبرین اور مومنین و متقین کی ارواح کو قبض کرنے کے بعد، ملائکہ کی گفتگو، اِن اخیار و اشرار

سے مذکور ہے، قرآن کریم کی ان متعدد آیات میں سے ہیں، جو عذابِ قبر اور ثوابِ برزخ کا صریح ثبوت ہیں، حدیث میں قبر کا لفظ مجازاً برزخ کے لیے آیا ہے، اس سے مراد، وہ عالم ہے، جس میں موت کی آخری ہچکی سے لے کر، بعث بعد الموت کے پہلے جھٹکے تک، انسانی ارواح رہتی ہیں۔ منکرینِ حدیث کو اس پر اصرار ہے کہ یہ عالم، بالکل عدمِ محض کا عالم ہے، جس میں کوئی احساس اور شعور نہ ہوگا، اور ہر قسم کے عذاب یا ثواب سے یہ عالم عاری ہوگا، لیکن یہاں ان آیات کو دیکھئے کہ کفار کی روحیں، جب قبض کی جاتی ہیں تو موت کی سرحد کے پار کا حال، بالکل اپنی توقعات کے خلاف پا کر، سراسیمہ ہو جاتی ہیں اور فوراً سلام ٹھونک کر، ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم کوئی برا کام نہیں کر رہے تھے، جواب میں ملائکہ ان کو ڈانٹ پلاتے ہیں اور جہنم واصل ہونے کی پیشگی خبر دیتے ہیں۔ کیا برزخ کی زندگی میں، احساس، شعور، عذاب اور ثواب کا اس سے بھی زیادہ کھلا ہوا ثبوت کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ اس مقام پر مولانا مودودیؒ کا حاشیہ، خوب قابلِ مطالعہ ہے۔

> حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث، دونوں سے موت اور قیامت کے درمیان کی حالت کا ایک ہی نقشہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ موت، محض جسم و روح کی علیحدگی کا نام ہے، نہ کہ بالکل معدوم ہو جانے کا۔ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد، روح، معدوم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس پوری شخصیت کے ساتھ، زندہ رہتی ہے، جو دنیا کی زندگی کے تجربات اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی، اس حالت میں روح کا شعور، احساس، مشاہدات اور تجربات کی کیفیت، خواب سے ملتی جلتی ہوتی ہے، ایک مجرم روح سے فرشتوں کی باز پرس، اور پھر اس کا عذاب اور اذیت میں مبتلا ہونا، اور دوزخ کے سامنے پیش کیا جانا، سب کچھ اس کیفیت سے مشابہ ہوتا ہے جو ایک قتل کے مجرم پر، پھانسی کی تاریخ سے ایک دن پہلے، ایک ڈراؤنے خواب کی شکل میں، گزرتی ہوگی، اس طرح ایک پاکیزہ روح کا استقبال، اور پھر اس کا جنت کی بشارت سُننا، اور اس کا جنت کی ہواؤں اور خوشبوؤں سے متمتع ہونا، یہ سب بھی، اس ملازم کے خواب سے ملتا جلتا ہوگا، جو اپنی حسنِ کارکردگی کے بعد، سرکاری بلاوے پر، ہیڈ کوارٹر میں حاضر ہوا ہو، اور وعدۂ ملاقات کی تاریخ سے، ایک دن پہلے، آیندہ انعامات کی امیدوں سے لبریز، ایک سہانا خواب دیکھ رہا ہو، یہ خواب یکلخت، نفخِ صورِ دوم سے ٹوٹ جائے گا اور یکا یک میدانِ حشر میں، اپنے آپ کو، جسم و روح کے ساتھ، زندہ پا کر، مجرمین حیرت سے کہیں گے کہ قَالُوْا يَا وَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (ارے، یہ کون ہمیں، ہماری خواب گاہ سے اٹھا لایا؟) مگر اہلِ ایمان، پورے اطمینان سے کہیں گے، هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یہ وہی چیز ہے جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کا بیان سچا تھا)۔ مجرمین کا فوری احساس، اس وقت یہ ہوگا کہ وہ اپنی خواب گاہ میں، شاید گھنٹہ بھر سوئے ہوں، اور اب اچانک اس حادثہ سے آنکھ کھلتے ہی کہیں بھاگے جا رہے ہیں، مگر اہلِ ایمان، پورے ثبات کے ساتھ کہیں گے کہ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اللہ کے دفتر میں، تو تم روزِ حشر تک ٹھہرے رہے ہو، اور یہی روزِ حشر ہے مگر تم اس چیز کو جانتے نہ تھے) [1]

منکرینِ حدیث اور تشریحِ آیات

سورۃ النّحل کی ان آیات سے (جو عذابِ قبر اور ثوابِ برزخ پر قطعی واضح دلیل ہیں) جناب اسلم جیراجپوری صاحب،

[1] تفہیم القرآن، جلد ۲، صفحہ ۵۳۶ تا صفحہ ۵۳۷

تردیدی دلائل یوں پیش کرتے ہیں۔

اب میں ان چند آیات کو بھی لکھ دیتا ہوں جن سے لوگوں نے غلط فہمی سے برزخ کا عذاب سمجھا ہے:

الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(۱۶/۳۲) جن کو فرشتے اس حالت میں وفات دیتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں (تو ان سے) کہتے ہیں کہ تمھارے اوپر سلامتی ہو، تم جنت میں داخل ہو، ان کاموں کے عوض جو تم کرتے تھے۔

یہ آیت خاص دارآخرت کے متعلق ہے برزخ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، قرآن کا سلسلۂ بیان یہ ہے:

وَلَدَارُ الاٰخِرَۃِ خَیْرٌ وَّلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ o جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَھَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ لَھُمْ فِیْھَا مَا یَشَآؤُوْنَ کَذٰلِکَ یَجْزِی اللّٰہُ الْمُتَّقِیْنَ o الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(۱۶/۳۲) [1]

جائزہ تشریح آیات

حقیقت یہ ہے کہ مولانا اسلم جیراجپوری نے فرشتوں کی قبض ارواح کے وقت کی گفتگو اور صورتحال کو ''دارآخرت'' سے وابستہ کرڈالنے میں بڑے سطحی پن کا مظاہرہ کیا ہے، اگر یہ آیت واقعی ''خاص دارآخرت کے متعلق ہے'' تو پھر تو لازم آتا ہے کہ ملائکہ نے قبض روح کا کام، دنیا میں نہیں بلکہ دارآخرت میں انجام دیا ہے، کیا مولانا اسلم جیراجپوری صاحب اور دیگر منکرین حدیث، یہ ماننے کے لیے تیار ہیں؟

اب دیکھیے کہ مقالہ نگار نے مضمونِ آیت کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے کس طرح فنکاری کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

عذاب قبر اور ثواب برزخ کا بیان، اسی سورہ (النحل) کی آیت ۲۸ سے شروع ہوکر، آیت ۳۲ تک ختم ہوتا ہے، آیت ۲۸ میں، ملائکہ کے کفار کی روحیں قبض کرنے اور ان سے ہمکلام ہونے کا ذکر ہے، اور کافروں کی موت کے وقت ہی، فرشتے انھیں عذاب سنا دیتے ہیں، یہ بیان آیت ۲۹ تک چلتا ہے، آیت ۳۰ تا آیت ۳۲ میں اہل تقویٰ کا خوشگوار انجام مذکور ہے، جس میں دنیا میں بھی اچھا ٹھکانہ دینے اور آخرت میں بھی، دنیا کے ٹھکانے سے بڑھ کر افضل ٹھکانہ دینے کی بشارت مذکور ہے، اب آخرت کے ٹھکانے کے مبشر بہ ہونے کے بعد، ان کی وفات کے وقت، فرشتوں کا ان سے مسرور کن تکلم اور فرحت بخش گفتگو مذکور ہے، جس میں ثواب قبر کا ذکر ہے۔

اب فاضل مقالہ نگار نے یہاں کیا یہ ہے کہ آیت ۳۰ جس میں عندالموت پرہیزگاروں کو جنت دینے کے وعدہ کا بیان ہے، وہ انھوں نے وَلَدَارُالْاٰخِرَۃِ سے شروع کی، اور اس آیت کا پہلا حصہ چھوڑ دیا، پھر آیت ۳۰ کے باقی ماندہ حصہ کو، پوری آیت ۳۱ کے ساتھ ملا کر، آیت ۳۲ سے جوڑ کر، یہ ''ثابت'' کر دکھایا، کہ یہاں برزخ کی تو بات ہی نہیں ہو رہی، وہ تو دارآخرت کی بات ہے حالانکہ آیات میں بیان ہوا ہے کہ فرشتے مرنے والے کو عندالموت ہی اس کے اچھے یا بُرے انجام پر آگاہ کر دیتے ہیں،

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۳ تا صفحہ ۶۴

جس کا سلسلہ، دم توڑتے ہی، ان کے ساتھ آغاز پذیر ہو جاتا ہے، اسی سلسلۂ سلوک کو عذابِ قبر یا ثواب برزخ کہا جاتا ہے۔

اب عذابِ قبر کے سلسلہ میں، ایک ایسی آیت پیش کی جاتی ہے، جس سے زیادہ قطعی الثبوت آیت، شاید ہی قرآن میں موجود ہو۔

(۱۰) --- فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَیِّئَاتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَّيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (المؤمن- ۴۵، ۴۶) پھر اللہ نے ان سب چالوں سے، جو انھوں نے کیں، اس (مردِ مومن) کو بچالیا، اور فرعون کے پیروکار، خود بدترین عذاب کے پھیر میں آ گئے، دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے وہ صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں اور جب قیامت کی گھڑی آ جائے گی، تو حکم ہوگا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔

اس آیت کے تحت، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے نہایت جامع اور قیمتی حاشیہ قلمبند فرمایا ہے۔

> یہ آیت، اس عذاب برزخ کا صریح ثبوت ہے، جس کا ذکر بکثرت احادیث میں، عذاب قبر کے عنوان سے آیا ہے، اللہ تعالیٰ یہاں صاف الفاظ میں، عذاب کے دو مرحلوں کا ذکر فرما رہا ہے، ایک کمتر درجے کا عذاب، قیامت کے آنے سے پہلے فرعون اور آلِ فرعون کو اب دیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھیں صبح وشام، دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جسے دیکھ کر وہ ہر وقت ہول کھاتے رہتے ہیں کہ یہ ہے وہ دوزخ، جس میں آخر کار ہمیں جانا ہے، اس کے بعد، جب قیامت آ جائے گی تو انھیں وہ اصلی اور بڑی سزا دی جائے گی، جو ان کے لیے مقدر ہے یعنی وہ اسی دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے جس کا نظارہ، انھیں غرقاب ہو جانے کے وقت سے آج تک کرایا جا رہا ہے اور قیامت کی گھڑی تک کرایا جاتا رہے گا، اور یہ معاملہ صرف فرعون اور آلِ فرعون کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، تمام مجرموں کو موت کی ساعت سے لے کر قیامت تک وہ انجام نظر آتا رہتا ہے جو ان کا انتظار کر رہا ہے، اور تمام نیک لوگوں کو، اس نیک انجام کی حسین تصویر دکھائی جاتی رہتی ہے جو اللہ نے ان کے لیے مہیا کر رکھا ہے، بخاری، مسلم اور مسند احمد میں، حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا --- ''ان احدکم اِذا مات عرض علیه مقعده بالغداةِ والعشی، ان کان من اهل الجنّة ، فمن اَهْلِ الجنّة وَان کان من اهل النار فمن اهل النار فیقال هٰذا مقعدک حتّٰی یَبْعَثَکَ الله اِلیه یوم القیامة'' --- ''تم میں سے جو شخص بھی مرتا ہے، اسے صبح وشام اس کی آخری قیام گاہ دکھائی جاتی رہتی ہے، خواہ وہ جنتی ہو یا دوزخی، پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے، جہاں تو اس وقت جائے گا جب اللہ تجھے قیامت کے روز، دوبارہ اٹھا کر، اپنے حضور بلائے گا''۔ [1]

اعتراض اور اس کا جائزہ

آیت کے اس مفہوم، اور اس کی تشریح پر، جس سے صراحتاً، عذاب برزخ ثابت ہوتا ہے، منکرین حدیث کے سرخیل، مولانا اسلم جیراجپوری صاحب یہ اعتراض پیش کرتے ہیں۔

> یہ مفہوم، ان تمام قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے جو پہلے بدلائل بیان کر دی گئیں ہیں، کیونکہ اگر برزخ میں، آلِ فرعون، روزانہ صبح وشام کو آگ پر پیش کیے جاتے ہیں تو ان میں زندگی اور عذاب کی اثر پذیری کی صلاحیت یعنی شعور واحساس بھی ہونا

[1] تفہیم القرآن، جلد ۴، صفحہ ۴۱۳

چاہیے، جس کا قرآن صریحاً انکاری ہے۔ [1]

اس اعتراض کے دو پہلو ہیں۔

اولاً ----- یہ کہ ''یہ مفہوم ان تمام قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے جو پہلے بدلائل بیان کر دی گئی ہیں''۔

ثانیاً ----- یہ کہ عالم برزخ میں عذاب تسلیم کرنے کی صورت میں، شعور و احساس کا ماننا لازم آتا ہے، ''جس کا قرآن صریحاً انکاری ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ اس اعتراض کے یہ دونوں پہلو، انتہائی کوتاہ فہمی پر مبنی ہیں، یہ لوگ، جس قدر، قرآن اور وہ بھی تنہا قرآن کا نعرہ لگانے میں بلند بانگ ہیں، اسی قدر قرآن فہمی سے کورے ہیں۔

جہاں تک اعتراض کے پہلے پہلو کا تعلق ہے، تو صرف یہ عرض کرنا ہی کافی ہے کہ آیت کے اس صحیح مفہوم کو (جسے جملہ علماء امت کی ہمنوائی میں، سید مودودیؒ کے اقتباس سے واضح کیا جا چکا ہے) جن دلائل کے ساتھ پیش کی گئی قرآنی تعلیمات کے خلاف قرار دیا گیا ہے، ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل برزخ کے لیے، علم و احساس اور شعور و ادراک کی وہ کھڑکی بند کر دی گئی ہے، جس سے وہ، اہل دنیا کی نداء و صداء کو سن سکیں، یا جس میں سے جھانک کر، وہ، اہل دنیا کے امور و معاملات کو جان سکیں، رہا عالم برزخ ہی کے شؤن و احوال کا شعور و ادراک اور علم و خبر، تو اس کی نفی، اُن ''قرآنی تعلیمات'' کے ہرگز خلاف نہیں ہیں، جن کو 'بدلائل پیش کرنے کا دعویٰ'' کیا گیا ہے، ایک شخص، اگر اپنے پڑوسی کے جداگانہ گھر کے امور و معاملات سے ناواقف ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ وہ، خود اپنے ہی گھر کے احوال و امور کا بھی علم و احساس نہیں رکھتا، مان لیا، کہ ایک گہری نیند سویا ہوا آدمی، کسی جاگتے ہوئے فرد کی آواز نہیں سُن پا رہا، اور نہ یہ نیند کا ماتا ہی اسے دیکھ رہا ہے، لیکن اس سے یہ دلیل کیسے اخذ کی جا سکتی ہے کہ خواب کی حالت میں بھی، وہ کسی خواب ہی میں واقع ہونے والے، کسی کردار کی آواز کو نہ سُن ہی رہا ہو، اور نہ اسے دیکھ ہی رہا ہے، جس قدر عالم خواب اور عالم بیداری میں یہ فرق ہے، اس سے اگر زیادہ نہیں، تو کم از کم اتنا ہی فرق، عالم برزخ اور دنیاوی جہاں میں بھی واقع ہے، عالم دنیا اور عالم برزخ کے باہمی معاملات کے شعور و احساس کی نفی سے، تنہا عالم برزخ ہی کے احوال کے احساس و شعور کی نفی کرنا، خود فریبی بھی ہے اور فریب دہی بھی۔

رہا اعتراض کا دوسرا پہلو، تو وہ بھی اگر نادانستہ سوئے فہم پر مبنی نہیں، تو دانستہ مغالطہ آفرینی پر اساس پذیر ہے، قرآن جس حقیقت کا صریحاً انکاری ہے، وہ تو صرف یہ ہے کہ --- ''عالم برزخ میں مُردوں کی ارواح، اہل دنیا کی دعاء و نداء سے غافل ہیں، اور یہ ارواح، اب عالم دنیا کے امور و معاملات سے منقطع ہو چکی ہیں، لہٰذا، انھیں ایسا کوئی علم و احساس اور شعور و ادراک نہیں ہے جس سے وہ اہل دنیا کے بالعموم اور اپنے پجاریوں کے بالخصوص، مصائب و مشکلات کو جان سکیں، اور ان کی نداء و پکار سُن سکیں تا کہ ان کی مدد کر پائیں، کیونکہ اہل برزخ کے لیے، امورِ دنیا کے علم و احساس کی کھڑکی بند کر دی گئی ہے'' ----

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۴

اب قرآن کا تصریحاً انکاری ہونے کو، اس حقیقت پر چسپاں کرنا کہ --- ''اہل برزخ کے ساتھ، عالم برزخ میں، جو سلوک کیا جاتا ہے، وہ اس کا بھی علم و احساس اور شعور و ادراک نہیں رکھتے'' --- قرآن کریم کے الفاظ سے کُھلا کُھلا تجاوز ہے، اور قرآن کے منہ میں، اپنی من گھڑت بات ڈالنے کے مترادف ہے۔

عذابِ قبر اور تقاضائے انصاف

منکرینِ حدیث، عذابِ قبر کو، اللہ تعالیٰ کے تقاضائے عدل و انصاف کے منافی قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے یہ تقریر استدلال پیش کرتے ہیں۔

یہاں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اللہ کے یہاں انصاف ہے، یہ کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ جس نے حضرت نوحؑ کا انکار کیا، وہ پانچ ہزار برس پہلے سے عذاب سہے اور برزخ میں جلے، اور جس نے محمد ﷺ کا انکار کیا، وہ پانچ ہزار یا دس ہزار برس بعد۔ [1]

یہ اعتراض، صرف اور صرف، اسی صورت میں وزنی اور مؤثر قرار پاسکتا ہے جبکہ کسی مستند ذریعہ سے یہ معلوم کرلیا گیا ہو کہ:

(۱) عالم برزخ میں بھی وقت کے پیمانے وہی ہیں جو اس دنیا میں پائے جاتے ہیں، کیونکہ پانچ ہزار سال پہلے یا دس ہزار برس بعد کے وقت سے، عذاب برزخ جھیلنے کا سوال، اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ بالیقین یہ معلوم کرلیا گیا ہو کہ دونوں جہانوں میں (یعنی جہانِ دنیا میں بھی، اور عالم برزخ میں بھی) وقت کے پیمانے ایک سے ہیں۔

(۲) قیامت کے عذابِ جہنم اور عالم برزخ کے عذابِ قبر کی مجموعی مدت اور شدت، اس مقدارِ عذاب کے مطابق نہیں ہے، جس کا کوئی مجرم اور گنہگار شخص، فی الواقع مستحق ہے۔

یہ دونوں باتیں، عالم غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور قرآن وسنت ان کے بارے میں ساکت و صامت ہیں۔ ان دونوں امور کے بارے میں، مستند معلومات کے بغیر، محض ظنّ و تخمین کی بنیاد پر، ان حقائق کو رد نہیں کیا جاسکتا جن کا ثبوت، قرآن و سنت سے حتماً اور یقیناً مل رہا ہے۔

اب کیا واقعی منکرین حدیث نے، عالم غیب میں جھانک کر، اللہ تعالیٰ کی خفیہ دستاویز کا مطالعہ کرکے، یقین کے ساتھ یہ معلوم کرلیا ہے کہ فلاں مجرم فی الواقع، اتنی سزا کا مستحق ہے، جو عذاب جہنم ہی سے پوری ہوجائے گی، لہٰذا عذاب برزخ، اس سزا پر ایسا اضافہ ہے جو خدا کے عدل و انصاف کے منافی ہے؟ یا یہ کہ عالم دنیا، عالم برزخ اور عالم آخرت، تینوں میں، وقت کے پیمانے یکساں ہیں، جس پر عذاب برزخ کی سزا، عدل خداوندی کے منافی قرار پاتی ہے؟

پیمانۂ ہائے وقت کے بارہ میں، یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ عالم برزخ میں مجرم کے عذاب کی کیفیت، فی الواقع، ڈراؤنے خواب کی سی ہے جس میں موت سے لے کر، قیامت تک کا عرصہ، موجودہ مادی دنیا کے پیمانہ سے یکسر مختلف ہوگا۔ ہماری اس دنیا میں تو، وقت کا تعین، طلوعِ آفتاب اور غروبِ شمس پر مبنی ہے، جس سے شب و روز اور پھر ماہ و سال پیدا ہوتے ہیں، عالم

[1] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۳

برزخ میں، نہ اِس دنیا کا سورج ہوگا، اور نہ ہی طلوع و غروبِ آفتاب کا یہ منظر، اور نہ ہی گردشِ لیل و نہار سے جنم لینے والے یہ ماہ و سال۔ وہاں وقت کا احساس ہمارے ان پیمانوں سے قطعی مختلف ہوگا --- بلکہ اگر ہم اس دنیا میں بھی، آفتاب سے اوپر پہنچ کر، نیچے کی طرف دیکھیں تو ہمیں رات کا وجود ہی نظر نہ آئے، بلکہ ہر طرف، دن کی روشنی ہی محیط کائنات دکھائی دے گی۔ اور طلوعِ آفتاب اور غروبِ شمس پر موقوف سلسلۂ روز و شب اور پھر اس سے آگے، ماہ و سال کا نظام الاوقات، سارے کا سارا ابتر ہو کر رہ جائے گا۔ اب اگر اسی کائنات کے دو حصوں میں (جن میں سے ایک حصہ، آفتاب کے اوپر اور دوسرا حصہ تحت الشّمس واقع ہے) نظام الاوقات میں یہ فرق و اختلاف بدیہی امر ہے، تو پھر عالم برزخ میں وقت کے پیمانوں کو، تحت الشّمس دنیا کے وقت کے پیمانوں پر قیاس کرنا، قطعی غلط ہے، پھر ڈراؤنا خواب، خواہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، اس میں وقت کا صحیح صحیح احساس، اگر اس دنیا میں ممکن نہیں، تو عالم برزخ میں کیسے ممکن ہوگا؟ اس لیے عالم برزخ کے عرصہ کو، اس دنیا کے پیمانہ ہائے وقت کے مطابق قیاس کرنا، اور پھر عذابِ قبر کی مدت کو، مختلف ادوار میں مرنے والوں کے لیے، کم و بیش جان کر، اسے عدل خداوندی کے منافی قرار دینا، یہ سب کچھ، قرآن و سنت کے واضح حقائق کے مقابلہ میں، اپنے اوہام و ظنون کو بالاتر اہمیت دینے کے مترادف ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ، قرآن ہی کے مطیع فرمان ہیں یا قرآن کو الٹا اپنا مطیعِ فرمان بنانا چاہتے ہیں، پھر جب ان کی آئے دن، بدلتی ہوئی، نت نئی تاویلات، ہمارے سامنے آتی ہیں تو یہ بات، شک و شبہ سے بالاتر ہو جاتی ہے کہ یہ طائفہ خدا پرست نہیں بلکہ ہوا پرست ہے اور اپنی متضاد اور رکیک تاویلات سے، قرآن کے یہ نام لیوا، خدا کی کتاب کو بازیچۂ اطفال بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کا ''قرآنی ادب'' ایک وسیع خارزارِ تضادات بن کر رہ گیا ہے۔

عقیدۂ عذابِ قبر اور صحابہ کرامؓ

قبل اس کے کہ طلوعِ اسلام (اور پرویز صاحب) کے وسیع خارزارِ تضادات کی کچھ جھلک پیش کی جائے، یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ عقیدہ عذابِ قبر، قرآن و سنت کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے، اور صحابہ کرامؓ، خود اس عقیدے کے قائل تھے، چنانچہ وہ اپنی دعاؤں میں عذابِ قبر سے اللہ کی پناہ طلب کیا کرتے تھے، احادیث میں ایسی بہت سی دعائیں، مختلف صحابہ سے ماثور ہیں، لیکن چونکہ ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، عذابِ قبر ہی کو ''خلافِ قرآن'' قرار دیتے ہیں اس لیے کتب احادیث سے انھیں نقل کرنا بیکار ہے۔ البتہ طلوعِ اسلام ہی سے، ابوذر غفاریؓ کے متعلق ایسا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے، جس کا مضمون، پرویز صاحب کی ''قرآنی بصیرت'' کی کسوٹی پر پورا اتر کر، طلوعِ اسلام میں جگہ پا چکا ہے۔

> مجھے میرے خلیلؐ نے وصیت فرمائی کہ حق بات کہوں خواہ وہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو، اور اللہ کے بارے میں ملامت گر کی ملامت کی پروانہ کروں، اور میں وہی دعا کرتا ہوں جو آپ کیا کرتے تھے، خدایا! میں بزدلی، بخل، بڑھاپے اور دنیا اور عذابِ قبر کے فتنہ سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔ [1]

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶۹

عذاب قبر سے متعلق یہ دعاء، حضرت ابوذر غفاری نے آنحضرت ﷺ ہی سے لی تھی، گویا حضور اکرمؐ خود بھی یہ دعا پڑھا کرتے تھے، لیکن پرویز صاحب اور طلوع اسلام کی تحقیق یہ ہے کہ

عذاب قبر کا عقیدہ بھی ان عقائد میں سے ہے، جن کی قرآن سے کوئی سند نہیں ملتی، اور جو بعد میں، اسلام میں داخل کیے گئے ہیں۔[1]

اس تحقیق کا یہ بدیہی نتیجہ ہے کہ عذاب قبر کو ماننے والے اور اس سے پناہ طلب کرنے والے، خواہ خود حضور اکرم ﷺ ہوں، یا ابوذر غفاریؓ جیسے جید صحابی ہوں یا ان کے علاوہ دیگر جلیل القدر رفقائے رسول ہوں، یہ سب ''خلافِ قرآن'' عقائد کو سینوں سے لگائے ہوئے تھے اور عقائد بھی وہ، ''جو بعد میں اسلام میں داخل کیے گئے''۔

طلوعِ اسلام کی متضاد روش

موضوعِ زیرِ بحث کے لحاظ سے، طلوعِ اسلام کے وسیع خارزار تضادات میں سے، صرف دو مثالیں، نذر قارئین ہیں جس سے اس گروہ کے تناقضات و تضادات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پہلی مثال - عالم برزخ، زمانی یا غیر زمانی؟

یکے از منکرینِ حدیث، بلکہ فتنہ انکار حدیث کے، علمبردار، جناب اسلم جیراجپوری صاحب، قرآنی الفاظ وَمِنْ وَّرَآئِهِم بَرْزَخٌ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ کے تحت لکھتے ہیں کہ

برزخ کی مدت، مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے کہ اس میں وہ اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جائیں گے جب حشر ہوگا، اللہ کے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔[2]

اب اس اقتباس میں ''برزخ کی مدت'' اور ''جب حشر ہوگا'' کے الفاظ، واضح طور پر، عالم برزخ کے زمانی ہونے پر دلالت کرتے ہیں، اور آگے چل کر، اسی مقالہ میں، یہ فرماتے ہیں کہ

موت اور حشر میں، مردوں کے لیے فصل زمانی نہیں ہے، یعنی ان کو اس برزخ کے زمانہ کا مطلق احساس نہ ہوگا۔[3]

یہاں عالم برزخ کے زمانی ہونے کا صریح انکار ہے، اور وہ بھی اِس انتہائی کمزور دلیل پر، کہ ''مُردوں کو عالم برزخ میں زمانہ کا مطلق احساس نہ ہوگا''، حالانکہ کسی چیز کا احساس نہ ہونا، اس چیز کے عدم کی دلیل نہیں ہوا کرتی، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اشیاء کا وجود و عدم محض ہمارے احساس پر موقوف ہے، جونہی ہمیں کسی چیز کا احساس ہوا، وہ چیز، اسی وقت، وجود میں آ گئی، اور جونہی ہمارا احساس ختم ہوا، تو خاتمۂ احساس کے ساتھ ہی، وہ چیز معدوم ہوگئی، اور یہ بہر حال بدیہی البطلان امر ہے۔

پھر، یہاں یہ کہنا کہ --- ''ان کو اس برزخ کے زمانہ کا مطلق احساس نہ ہوگا'' --- بھی خلافِ حقیقت ہے، انھیں احساس تو ہوگا، مگر اُس احساس کی بدولت، وہ مدت برزخ بتانے میں غلطی کریں گے، اب یہ ظاہر ہے، کہ غلط یا صحیح مدت بتانا، بجائے خود، علم و احساس پر مبنی ہے، اور شعور و ادراک پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۵۷ [2] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۵۷ [3] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۰ تا صفحہ ۶۱

دوسری مثال - صرف شہداء کی برزخی زندگی یا تمام مُردوں کی زندگی؟

تناقضات و تضاداتِ طلوعِ اسلام کی دوسری مثال، برزخی زندگی سے تعلق رکھتی ہے، قرآن، صراحت کے ساتھ، شہداء کی زندگی کو بیان کرتا ہے، چنانچہ اسلم جیراجپوری صاحب، فرماتے ہیں۔

شہداء یعنی مقتولین فی سبیل اللہ، جن کی زندگی کی قرآن نے تصریح فرمادی ہے وہ برزخ یعنی آڑ میں نہیں بلکہ عِنْدَ رَبِّهِم اپنے رب کی حضوری میں ہیں، جہاں ان کو نئی زندگی مل گئی ہے اور وہ روزی پاتے ہیں۔ ۱

اس پر حکیم ابوالنظر صاحب امروہوی، تعجب وحیرت کا اظہار کرتے ہوئے، یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا شہیدوں کے علاوہ، بزرگانِ دین سے لے کر، پیغمبروں تک، کسی کو، بعد از مرگ، زندگی نصیب نہیں ہوتی؟ کیا شہیدانِ ملت کے دلوں میں یقین کی آگ روشن کرنے والے پیغمبر بھی، صرف اس لیے مردہ قرار دیئے جائیں گے کہ قرآن نے ان کی زندگی پر کوئی روشنی نہیں ڈالی اور مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کے دائرہ میں وہ بھی شامل ہیں۔ ۲

حکیم صاحب کے اس سوال کا مختصر جواب، برسرِ موقع، حاشیہ میں یہ دیا گیا ہے۔

علامہ اسلم یہی کہتے ہیں کہ قرآن نے صرف شہداء کی زندگی کا ذکر کیا ہے، اگر ان کے علاوہ کسی اور کی زندگی کا بھی قرآن نے ذکر کیا تو اسے پیش کرنا چاہئے۔ ۳

لیکن آگے چل کر، قدرے وضاحت سے یہ لکھا ہے کہ

محترم حکیم صاحب کا ارشاد ہے کہ جب مقتولین فی سبیل اللہ کی زندگی کے متعلق، قرآن شاہد ہے، تو انبیاء کرام (جو شہداء سے افضل ہوتے ہیں) لامحالہ زندہ ہوں گے، اور جب انبیاء زندہ ہوں گے تو صلحاء و صادقین بھی زندہ ہوں گے، ہم اتنا عرض کریں گے کہ منطقی طور پر یہ دلیل وقیع ہو تو ہو، لیکن سوال تو یہ ہے کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے؟ قرآن نے یہ تخصیص، صرف مقتولین فی سبیل اللہ کے لیے کی ہے، اور کسی کے لیے نہیں۔ اگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے، کہ انبیاء و صلحاء و صادقین بھی سب اس میں شامل ہیں تو سمجھ میں آتا کہ قرآن کو اس تخصیص کی کیا ضرورت تھی؟ ہماری بحث کا مدار قرآن ہے، اس لیے، اس باب میں، ثبوت بھی قرآن ہی سے پیش کرنا چاہئے، جی تو ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ جو خصوصیت مقتولینِ فی سبیل اللہ کے لیے ہے وہ کم از کم حضراتِ انبیاء کرام کو ضرور محیط ہو، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے لیے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ۴

اپنے اس مقالہ میں حکیم صاحب، یہ استفسار بھی فرماتے ہیں کہ

یہ کہنا کہ عِنْدَ رَبِّهِمْ کہنے سے برزخ کی نفی ہوگئی، ایک عجیب سی بات ہے، خدا کے پاس جانے سے آخر کیا مطلب؟ شہید ہونے والے کہاں چلے جاتے ہیں؟ کیا شہیدوں اور اپنی موت مرنے والوں کے لیے، قرآن نے، نئے نئے عالم اور نئے نئے منازل کا دعویٰ کیا ہے؟ ۵

---

۱ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۵۷
۲ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۰ء، صفحہ ۴۹
۳ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۰ء، صفحہ ۵۰
۴ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۰ء، صفحہ ۵۳
۵ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۵۰ء، صفحہ ۴۹

حکیم صاحب کے اس استفسار پر یوں حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔

جب قرآن نے مقتولین فی سبیل اللہ کے لیے، یہ تخصیص کر دی ہے تو ہم اسے عام حالات میں مرنے والوں پر کس طرح منطبق کر سکتے ہیں۔ [1]

حکیم صاحب کے ان استفسارات کے جواب میں، طلوع اسلام کے اقتباسات کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے کہ اسے قرآن کریم سے کس قدر ''شدید عشق'' ہے کہ وہ انبیاء کرام کے لیے بھی وہ فضیلت ماننے کے لیے تیار نہیں، جسے قرآن نے شہداء کی خصوصیت قرار دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی صورت بھی قرآن کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، حتّٰی کہ وہ گمراہی کی جس کھڈ میں بھی گریں گے، قرآن کو اپنے ساتھ ہی لے کر گریں گے، آخر جب انھوں نے قرآن کو اپنے ایمان سے مشرّف کر ہی ڈالا ہے، تو اس کے بدلہ میں، قرآن پر، ان کا جو کم از کم حق عائد ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ ضلالت کی ہر وادی میں، قرآن ان کا ساتھ دے، اب ان کے ایمان بالقرآن کے بعد، صورتِ حال یہ نہ ہو کہ طلوع اسلام قرآن کا ساتھ دے، بلکہ یہ کہ الٹا قرآن، طلوع اسلام کا ساتھ دیکر، اپنے اوپر ایمان کا بدلہ چکائے، اور ''مفکر قرآن'' یا ''طلوع اسلام'' کی نت نئی تاویلات کے سامنے، قرآن بیچارہ، سرنیوڑائے کھڑا رہے۔

ایک طرف تو یہ دعویٰ کہ بعد از مرگ، حیات کی خصوصیت، صرف شہداء ہی کے لیے ہے، حتّٰی کہ انبیائے کرام کے لیے بھی نہیں، اور دوسری طرف، یہ قلا بازی، کہ قرآن ہی کے نام پر، بعد از مرگ، صرف حیات ہی نہیں، بلکہ مقتولینِ فی سبیل اللہ کی جملہ خصوصیات کا دروازہ، ہر ایک کے لیے چوپٹ کھول دیا۔

مقتولین فی سبیل اللہ کے جو خصوصی مراتب ہیں وہ انھی تک محدود نہیں، جو میدان جنگ میں جاں دیدیں وہ ان سب کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں جان دینے کے لیے تیار ہوں، مثلاً رسولؐ اللہ اور حضورؐ کے صحابہؓ، ان تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے جو فی سبیل اللہ لڑی گئیں، ان میں سے بعض صحابہ، میدان جنگ میں مقتول ہو گئے، خود حضورؐ اور صحابہؓ اس طرح مقتول نہ ہوئے، بلکہ زندہ رہے، اگر ان خصوصی مراتب کو مقتولین تک محدود سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دیگر مجاہدین (جو میدان جنگ میں مقتول نہیں ہوئے، اور خود، رسولؐ اللہ) ان مراتب سے محروم رہ گئے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ [2]

اور ذرا آگے چل کر، حیات بعد از مرگ کے بارے میں خاص طور پر لکھتے ہیں۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ موت کے بعد، زندگی صرف مقتولین فی سبیل اللہ کے لیے ہے، اوروں کے لیے نہیں، موت کے بعد، زندگی ہر ایک کے لیے ہے۔ [3]

اور حکیم صاحب کے استفسار کے جواب میں، طلوع اسلام نے، خود ہی یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ --- ''اگر انبیاء و صلحاء و صادقین بھی سب کے سب، مقتولین فی سبیل اللہ کی اس خصوصیت (حیات) میں شامل ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا، کہ قرآن کو

---

[1] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۰ء، صفحہ ۴۹ [2] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۲

[3] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۳

اس تخصیص کی کیا ضرورت تھی؟'' --- اب اس سوال کا جواب اور اس تخصیص کی ضرورت، یوں بیان کی گئی کہ

مقتولین فی سبیل اللہ کے زندہ ہونے کا خصوصیت سے ذکر، اس لیے کیا گیا ہے کہ منافقین کا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ لوگ جنگ میں نہ جاتے تو موت سے بچ جاتے .... اس کے جواب میں، ان سے کہا گیا کہ اول تو تم یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمیشہ زندہ رہو گے؟ .... اور دوسرے یہ کہ، جو لوگ حق و صداقت کی راہ میں جان دیتے ہیں، انھیں مردہ مت سمجھو۔ ۱

تضادات اور پھر یہ تعلّیات بھی

طلوعِ اسلام کے اس بدلتے ہوئے متضاد موقف کو بھی دیکھیے اور پھر یہ بلند بانگ تعلّی بھی ملاحظہ فرمائیے۔

مفاد پرستوں کے خود ساختہ اسلام کے کئی مختلف ایڈیشن شائع ہوئے، لیکن مصلحت اندیشیوں کی دیمک نے، انھیں، اس طرح چاٹا کہ ان کا ایک حرف بھی زمانہ کے صفحہ پر دکھائی نہیں دیتا، لیکن تغیرات کی ان آندھیوں اور انقلابات کے ان جھکڑوں میں، ایک طلوعِ اسلام ہے کہ جس میں آپ کو نہ کہیں تضاد ملے گا اور نہ تخالف نظر آئے گا۔ ۲

اور ''مفکرِ قرآن'' خود اپنے منہ، میاں مٹھو بن کر، یوں اپنی خود ستائی فرمایا کرتے تھے۔

قرآن کو سند و حجت ماننے والا، تو ساری عمر میں، دو متضاد باتیں، قرآن کی سند سے نہیں کہہ سکتا۔ ۳

جبکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب، (اور طلوعِ اسلام) کا موقف، دو ٹکے کی جنتری کی طرح ہمیشہ ہی بدلتا رہا ہے، جس کے باعث، تضادات اور تناقضات کا ایک وسیع خارزار پیدا ہو چکا ہے، لیکن یہ حضرات، ایسے اندھے واقع ہوئے ہیں کہ انھیں، اپنے واضح تضادات تو دکھائی نہیں دیتے، لیکن اپنے مخالفوں کے ''فرضی تضادات'' کا یہ کہہ کر ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں کہ

ان کا اسلام، ان کی مصلحتوں کے ہاتھ میں کھلونا ہے، آج ایک بات عین مطابقِ اسلام قرار دی جا رہی ہے، اور کل وہی خلافِ اسلام قرار دی جاتی ہے۔ ۴

---

۱ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۹ ۲ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۳۱

۳ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵۸ ۴ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۳۱

باب ٦

ارکان اسلام
اور
تفسیر مطالب الفرقان

باب ٦

ارکانِ اسلام اور تفسیر مطالب الفرقان

انسان، اس وقت عجیب کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے جبکہ وہ فکری دنیا میں، اپنے ماحول سے کٹ چکا ہو، مگر جسمانی اعتبار سے، اسی ماحول میں رہنے پر مجبور ہو، وہ اپنے معاشرے کی ایک ایک چیز سے اختلاف رکھتا ہو، مگر برملا اس کا اظہار نہ کر سکتا ہو، اس کے دماغی افکار اور قلبی نظریات کچھ اور ہوں، مگر اس کے عینی مشاہدات، کسی اور ہی فکری بنیاد پر قائم ہوں، وہ دل میں جو کچھ سوچتا ہو، اسے اپنے ماحول کی عدم موافقت کے باعث، زبان پر لانے سے قاصر ہو، اس طرح اس کی زبان، اس کے دل کی رفیق نہ رہی ہو، اور وہ مصلحت کا لبادہ اوڑھ کر، کچھ مدت تک، وہی کچھ کہنے پر مجبور ہو، جو معاشرے کے لیے قابل قبول ہو، ایسا شخص، اگر اظہار اختلاف کرتا بھی ہے، تو احتیاط کے ساتھ سنبھل سنبھل کر، بڑے ہلکے پھلکے انداز میں، تا کہ لوگ اس سے متوحش نہ ہوں، اور بدک کر، اس سے الگ نہ ہو جائیں، پھر جب اس قسم کی احتیاط پر مبنی اختلاف کو گوارا کر لیا جاتا ہے، تو پھر وہ قدرے اور کھل جاتا ہے، اور اس اختلاف کے شگاف کو، ہوا بھر مزید وسعت دیتا ہے، تب وہ اس اختلاف سے مانوس ہونے والوں کا، ایک حلقہ بنا لیتا ہے، اس طرح اسے کچھ ہم خیال افراد میسّر آ جاتے ہیں، اب وہ قدرے اور تیزی سے کوشش کرتا ہے کہ اختلاف کا یہ شگاف کچھ اور کھل جائے، اور اس کے حلقہ میں، مزید وسعت پیدا ہو جائے، اس طرح، رفتہ رفتہ، درجہ بدرجہ، جس قدر، اس کے ہمنوا اور ہم خیال، بڑھتے چلے جاتے ہیں، اسی قدر، اس کے اظہار اختلاف میں، شدت اور تیزی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ کل تک (نیک نیتی کے ساتھ، یا مصلحت کا لبادہ اوڑھ کر) جن امور کی حمایت اور ہمنوائی ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر، حفاظت وصیانت کی جدوجہد میں جُتا ہوا تھا، آج وہ، ان ہی کی تردید اور بیخ کنی میں سرگرمِ جہاد نظر آتا ہے۔

ٹھیک یہی وہ ٹیکنیک ہے جو "مفکر قرآن" نے، اپنا ایک حلقہ بنانے میں، اختیار کی ہے، اور وہ انھی مراحل ومنازل سے گزرے ہیں، جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، ایک وقت وہ تھا کہ وہ انھی افکار ونظریات کا اظہار کیا کرتے تھے، جن پر امتِ مسلمہ، صدیوں سے قائم تھی، پھر آہستہ آہستہ وہ ان افکار واعمال سے سرکتے چلے گئے، اور ان کے ساتھ، وہ لوگ بھی، اپنی پٹڑی سے اُترتے چلے گئے، جو ان کے ہم خیال بن چکے تھے، یہاں تک کہ جس نسبت سے "مفکر قرآن" اپنے، انفرادو شذوذ میں بڑھتے اور پختہ ہوتے چلے گئے، اسی نسبت سے، ان کے پیروکار بھی، ایک فرقہ کے سانچہ میں ڈھلتے گئے، اور "دعوت الی القرآن" اور "رجوع الی القرآن" کے نتیجہ میں، دوسرے فرقوں کا ختم ہونا، تو درکنار، الٹا کچھ اور فرقے، معرضِ وجود میں آنا شروع ہو گئے، جن کی مسانید میں سے، سب سے اونچی مسندِ پیشوائیت، پرویز صاحب کے حصہ میں آئی۔

(ا) نماز - صلوٰۃ - اقامت صلوٰۃ

جملہ افکار سے قطع نظر کرتے ہوئے، ہم یہاں صرف، نماز کے بارے میں، ان کے فکری تحوّلات کی تاریخ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال رہے ہیں، تاکہ یہ واضح ہوسکے کہ کس طرح اور کس رفتار سے، انھوں نے، روشنی سے تاریکیوں کا سفر طے کیا ہے۔

(۱) اعترافِ وجود نماز، اپنے معروف معنی میں

ایک دور تھا، جبکہ پرویز صاحب، وجود نماز کو، اسی مفہومِ معروف کے ساتھ، تسلیم کرتے تھے، جوامت مسلمہ میں، قرنِ اول سے لے کر، اب تک پایا گیا ہے، چنانچہ ایک مقام پر، وہ ''نماز پنجوقتہ'' کے متواتر عمل ہونے کا ذکر، بایں الفاظ کرتے ہیں۔

> احکام قرآنی (مثل نماز روزہ وغیرہ) کی عملی تشکیل، نبیٔ اکرمؐ نے متعین فرمائی، جس کی پابندی، امت کے لیے، لازمی ہے، یہ عملِ محسوس، متواتر ہم تک پہنچا ہے۔ [۱]

نماز کے عمل متواتر ہونے کا اعادہ، ان الفاظ میں بھی کیا گیا۔

> قرآن کریم نے جن ایسی باتوں کا حکم دیا، جو عملی شکل میں سامنے آئے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں، حضورؐ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ ان احکام کی تعمیل کیسے ہوگی؟ مثلاً قرآن نے حکم دیا کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (نماز قائم کرو) نماز کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اسے نبی اکرمؐ نے خود نماز پڑھ کر بتا دیا، رسولؐ اللہ کے اس عمل کی اتباع، صحابہ کرامؓ نے کی، ان کے بعد، بعد میں آنے والے نے، انھیں دیکھ کر، ویسا ہی کیا، اور یہ سلسلہ متواتر، اس وقت تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا عمل متواتر چونکہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے، اس لیے، اس کے آگے منتقل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ [۲]

نماز کے اسی معروف وجود کا، اصلاحِ فرد اور اصلاح معاشرہ میں کیا کردار ہے؟ اسے پرویز صاحب، بایں الفاظ واضح کرتے ہیں۔

> اسلام، افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے، جو نظام انسانیت کو عدل پر چلا سکے، اس مقصد کے حصول کے لیے، اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم، اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے، نماز کے لیے پانچ وقت کا اجتماع، تقویٰ، ضبطِ نفس، غیر اللہ کی محکومی سے انکار، اللہ کی حاکمیت کا اقرار، مرکزیت، اجتماعیت، اطاعت امام کا عملی مظاہرہ، جمعہ کے اجتماع میں، یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے، عید کی تقریب پر، اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں، اور بالآخر حج کے میدان میں، اس کی وسعتیں ساری دنیا کو، اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ [۳]

یہی نماز، اور نماز کی یہی وہ شکل تھی، جس پر حضور اکرمؐ نے اپنی آخری علالت کے دوران صحابہؓ کو اس پر قائم دیکھ کر تبسم فرمایا تھا:

> علالت کے تیرہویں روز، یکم ربیع الاول ۱۱ھ، مئی ۶۳۲ء، صبح کے وقت، طبیعت میں کچھ سکون تھا، لیکن نقاہت زیادہ تھی، اس لیے آپؐ نے حجرۂ مبارک سے لیٹے لیٹے، پردہ اٹھا کر، مسجد کی طرف دیکھا، تو لوگ، نماز میں مشغول تھے، اللہ کے بندوں کو اپنے

---

[۱] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۰ [۲] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۴۰ء، صفحہ ۴۲ [۳] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۹

> اللہ کے سامنے، سجدہ ریز دیکھ کر، فرطِ مسرت سے چہرہ بشاش ہو گیا، جھکی ہوئی نگاہوں سے، درگاہِ رب العزت میں، تشکر و امتنان کے سجدے ادا کیے۔ [1]

ان جملہ اقتباسات میں، نماز کا وہی معروف مفہوم، مذکور ہے، جس پر امت، عہد نبوی سے لے کر، اب تک اور آج سے لے کر قیامت تک قائم ہے اور رہے گی، لیکن پھر ایک ایسا دور آیا، جس میں، نماز، صلوٰۃ، یا اقامت صلوٰۃ کا مفہوم، مرورِ ایام کے ساتھ بدلتا ہی چلا گیا، اس ضمن میں انحراف والحاد کے کئی خارزاروں سے، انھیں، گزرنا پڑا۔

(۲) صلوٰۃ بمعنی صراط مستقیم پر چلنا

لفظ صلوٰۃ کا ایک مفہوم --- اور بہت ہی انوکھا اور نرالہ مفہوم --- ''مفکر قرآن'' نے بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

> الصَّلٰوۃ، صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے، وہ صراط، جس کے متعلق فرمایا کہ اِنَّ رَبِّی عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم ''تیرے نشوونما دینے والے کا قانون ربوبیت، خود متوازن راہ پر چل رہا ہے''۔ اسی کے پیچھے پیچھے، تم بھی چلتے جاؤ، مُصَلِّی، اس گھوڑے کو کہتے ہیں، جو گھوڑ دوڑ میں، پہلے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو، جو اِدھر اُدھر کی راہوں میں نکل جائے، وہ مصلّی نہیں۔ [2]

اِنَّ بیشک رَبِّی میرا رب عَلٰی پر صِرَاطٌ راستہ مُّسْتَقِیْم سیدھا۔ اور پوری آیت کا ترجمہ یہ ہوا، کہ بیشک میرا پروردگار (رب) سیدھے راستہ پر ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے الفاظ کے مُسرفانہ استعمال سے رَبِّی کا ترجمہ کیا ہے ''تیرے نشوونما دینے والے کا قانونِ ربوبیت'' پھر اس ''قانون ربوبیت کا متوازن راہ پر چلتے جانا'' بھی کیا ''مفکرانہ صنعتِ تخیل'' ہے۔

(۳) صلوٰۃ بمعنی اطعام مسکین

قرآن کریم میں مذکور ہے کہ اہل جہنم سے پوچھا جائے گا، کہ مَا سَلَكَكُمْ فِی سَقَرَ تمھارا کون سا جرم تھا جو تمھیں جہنم میں کھینچ لایا؟ وہ جواب دیں گے کہ'' نہ ہم نماز پڑھا کرتے تھے، اور نہ مساکین کو کھانا کھلایا کرتے تھے، اہل باطل کے ساتھ مل کر، ہم باتیں بنایا کرتے تھے اور روز جزاء کو جھٹلایا کرتے تھے، لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب نے، دوزخیوں کے، چار فقروں پر مشتمل جواب میں سے آخری دو جُملوں کو تو نظر انداز کر دیا، اور اولین جملے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ کو اصل متنِ جواب قرار دیکر، دوسرے فقرے کو اس کا مراد و مفہوم بنا ڈالا، جس کے الفاظ یہ ہیں وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ اس طرح، دونوں فقروں میں مذکور، دو الگ الگ جرائم کو، ایک ہی جرم قرار دے ڈالا۔

> سورۃ المدثر میں ہے کہ اہل جنت، اہل جہنم سے پوچھیں گے، کہ مَا سَلَكَكُمْ فِی سَقَرَ (۷۴/۴۲) تمھارا وہ کون سا جرم تھا، جو تمھیں جہنم میں کھینچ لایا؟ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ (۷۴/۴۳،۴۴) وہ جواب دیں گے کہ ہم ''مصلین'' میں سے نہیں تھے یعنی (اور) ہم مساکین کے کھانے کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔ [3]

---

[1] معراج انسانیت، صفحہ ۳۹۸ + معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۱۷۷ [2] سلیم کے نام، جلد ا، صفحہ ۱۵۱ [3] سلیم کے نام، جلد ا، صفحہ ۱۶۷

لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ کا معنیٰ ''یعنی'' کے لفظ سے لَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ کرنا، ایک طرف تو کھلی تحریفِ قرآن ہے، اور دوسری طرف، خود، اللہ تعالیٰ کے متعلق، یہ گھناؤنی بدگمانی ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر بھی قدرت نہیں رکھتا، اور اس طرح مُغلق اور پیچیدہ انداز میں بات کرتا ہے، کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، اس کی ''تفسیر'' نہ فرمائیں تو کسی کے پلّے کچھ نہ پڑے، اور تیسری طرف، صرف ''مسکین کو کھانا کھلا دینا'' ہی ''اقامت صلوٰۃ'' ہے۔ اس معنیٰ کو قبول کرتے ہی، صلوٰۃ کے دیگر مفاہیم سے بھی جان چھوٹ گئی اور اس دوڑ (Race) سے بھی نجات مل گئی، جس میں گھوڑا اول نمبر پر آنے کی بجائے، بیچارہ، دوسرے نمبر پر ہی رہتا ہے۔

(۴) صلوٰۃ بمعنی تشکیلِ معاشرہ برقوانینِ الٰہیہ

''مفکر قرآن'' کے بیان کردہ مفاہیم صلوٰۃ، جس قدر، رسولؐ خدا کے عملاً پیش کردہ مفہومِ صلوٰۃ سے بُعد اور مغائرت اختیار کرتے چلے گئے، اُسی قدر اس طبقہ میں، یہ مفہومِ پرویز، شرف قبولیت پاتا چلا گیا، جس کے افراد، نماز چھوڑ کر، بھی مسلمان رہنا چاہتے تھے، اور اطاعت رسول سے منہ موڑ کر بھی، فرمانبردارانِ ایزدی بنے رہنا چاہتے تھے، تو طلوعِ اسلام کے حلقۂ قارئین میں بھی قدرے وسعت پیدا ہوئی، اور پھر ''مفکر قرآن'' بھی اپنے قلبی نظریات کے اظہار میں کُھلتے چلے گئے، جس حزم واحتیاط کا دامن تھام کر، وہ اظہار خیال کیا کرتے تھے، اسے چھوڑتے ہوئے اپنے متجددانہ افکار کے اظہار میں اور بے باک ہوتے چلے گئے، اور شاہراہِ تحریف پر چلتے ہوئے، جب وہ صلوٰۃ بمعنی ''صراط مستقیم پر چلنا'' اور اقامت صلوٰۃ بمفہوم اطعام المساکین کی منزل سے بھی گزر گئے، تو پھر ایک اور منزل، ان کے سامنے آئی، جس میں ایک اور جدید مفہوم پیش کیا گیا۔

اقامت صلوٰۃ بمعنی تشکیل معاشرتِ مخصوصہ

اس مفہوم کے مطابق، اقامت صلوٰۃ کا مطلب، ایک ایسا مخصوص معاشرہ قائم کرنا قرار پایا، جو قوانینِ الٰہیہ پر استوار ہو۔

> قیامِ صلوٰۃ، قرآن کی ایک نہایت جامع اور بلیغ اصطلاح ہے، جس سے درحقیقت اس معاشرے کا قیام ہے جس میں قانونِ خداوندی عملاً نافذ ہو، اور اس طرح ہر فرد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں میں پوری پوری نشو ونما ہوتی چلی جائے۔ [۱]

یہاں دراصل، جس مفہوم کو، اقامت صلوٰۃ کا مفہوم، قرار دیا گیا ہے، فی الواقع، وہ اقامت دین کا مفہوم ہے، لیکن چونکہ اقامتِ دین کی اصطلاح کو سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے، اپنے لٹریچر میں، ''مفکر قرآن'' سے بھی، بہت پہلے، بڑی شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے، اور مودودیؒ صاحب سے، ''مفکر قرآن'' کو خدا واسطے کا بیر ہے، اس لیے، وہ اقامتِ دین کی اصطلاح اختیار کرنے کی بجائے، اقامت صلوٰۃ کی اصطلاح کو اپنانے پر مجبور ہوئے، لیکن ''اقامت صلوٰۃ'' کے لفظ سے صرف نماز ہی کے متعلقات، مثلاً اوقاتِ نماز، رکعاتِ نماز، آدابِ نماز، شرائطِ نماز، وغیرہ ہی ذہن میں آتے ہیں، اسی لیے ''مفکر قرآن'' کو یہ

---

[۱] قرآنی فیصلے، جلد۱، صفحہ ۱۴

اصطلاح اپنا لینے کے بعد، پھر اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کرنی پڑی، تاکہ اقامت صلوٰۃ میں اقامت دین کا کشادہ مفہوم پیدا ہو سکے، اور اس طرح، وہ، مولانا مودودیؒ کے مقابلہ میں، اپنی ''مفکرانہ انفرادیت'' کو برقرار بھی رکھ سکیں۔

اس نظام کا نقطۂ ماسکہ، بزعم پرویز صاحب، ''نظام ربوبیت'' کا قیام ہے، جیسا کہ درج ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

> آپ نے دیکھ لیا، کہ قیام صلوٰۃ سے مفہوم کیا ہے؟ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرنا، جس سے انسان، خود بھی ربوبیت کی ذہنیت پیدا کرے اور دوسروں کو بھی، اس کی تلقین کرے اور ترغیب دے، لہٰذا، اس نظام ربوبیت کے قیام کے لیے، ضروری ہے کہ......[1]

اب جبکہ اقامت صلوٰۃ کا مفہوم اقامت دین کے مفہوم کے مماثل قرار پا گیا اور اس کا مقصد، نظام ربوبیت کا قیام و نفاذ ہو گیا، تو پھر سوال پیدا ہوا کہ --- ''اِس نظامِ صلوٰۃ میں، اُس صلوٰۃ کا کیا مقام ہوگا، جسے مؤقت فریضہ کہا گیا ہے؟'' --

اقامتِ صلوٰۃ میں عملِ صلوٰۃ کا مقام

یہ سوال، بہر حال، مولانا مودودیؒ کی اصطلاح اقامتِ دین میں، تو، پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں یہ بات واضح ہے، کہ اقامت صلوٰۃ، اقامت دین کا ایک جزو ہے، اور جس طرح، ہر جزو کُل میں شامل ہوتا ہے، بالکل اسی طرح، اقامت صلوٰۃ کا نظام بھی، اقامت دین میں شامل ہے --- لیکن ''مفکر قرآن'' جو اقامت صلوٰۃ کے جزو کو اقامت دین ہی کی کُل کے مترادف قرار دیتے ہیں، اُن کو واقعتاً اس سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ جواباً فرماتے ہیں:

> یہ نظام، جماعت مؤمنین کی پوری کی پوری زندگی پر چھایا ہوتا ہے اور دن رات میں، ایک لمحہ بھی، ایسا نہیں آتا جس میں، وہ، اس کے احاطے سے باہر ہوں .... آئینِ خداوندی نے، اس کا بھی انتظام کر رکھا ہے کہ اس نظام کی یاد دہانی کرائی جائے، تاکہ اس کے اصول و مبانی اُجاگر ہوتے جائیں، اور اس کی اہمیت، نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، اس یاد دہانی کا نام فریضۂ مؤقت ہے، یعنی خاص اوقات کا اجتماعِ صلوٰۃ۔ [2]

اب ذرا اس بات پر غور فرمائیے کہ قرآن میں، نہ تو کہیں، ''نظام'' کا لفظ آیا ہے، اور نہ ہی ''ربوبیت'' کا، اور نہ ہی ''نظام ربوبیت'' کی مرکب اصطلاح ہی، قرآن میں اپنا وجود رکھتی ہے، اور نہ ہی قرآن میں کوئی ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم یا ترجمہ، اُسی طرح، ''نظامِ ربوبیت'' قرار پائے، جس طرح ''صلوٰۃ'' کا معنٰی یا ترجمہ ''نماز'' قرار پا چکا ہے۔

اب کیا یہ بات، قابل تعجب اور باعث حیرت نہیں کہ جس نظام ربوبیت کو قرآن اور اسلام کا مقصود اصلی قرار دیا گیا ہے، اس کا قرآن میں کہیں نام و نشان تک نہیں، مگر جس چیز کو فریضۂ مؤقت قرار دیا گیا ہے، اور جس کا مقصد، صرف نظام ربوبیت کی یاد دہانی قرار دیا گیا ہے، اسے بیسیوں کیا، سینکڑوں مرتبہ پیش کیا گیا ہے؟

پھر یہاں، ''مفکر قرآن'' کا، اللہ تعالیٰ سے، ایک اور اختلاف بھی ہو رہا ہے، اُن کے نزدیک، تو خاص اوقات کے یہ ''اجتماعِ صلوٰۃ'' نظام ربوبیت کی یاد دہانی کے لیے ہیں، جبکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِی ''نماز قائم

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۱۵۲ [2] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۴ تا صفحہ ۱۵

کرو، میری یاد کے لیے"۔ اب ایک عام قاری قرآن بیچارہ، تذبذب کے دوراہے پر حیران کھڑا سوچ رہا ہے کہ کس کی بات مانی جائے؟ مُنَزِّلِ قرآن کی؟ یا "مفکرِ قرآن" کی؟

(۵) صلی یصلی - "ساتھ ساتھ حرکت کرنا"

قرآن کریم میں صَلّٰی یُصَلِّی کا معنیٰ (جبکہ اس کے بعد حرف جارّ عَلٰی آئے) وہ چیز بھی ہے، جسے ہمارے ہاں "درود پڑھنا" یا "درود بھیجنا" کہا جاتا ہے، لیکن طلوعِ اسلام کے نزدیک، اس کا معنیٰ "ساتھ ساتھ حرکت کرنا" ہے، چنانچہ ایک مقام پر آیتِ درود کا ترجمہ، یوں کیا گیا ہے۔

> إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (احزاب-۵۶) اللہ کا قانون اور کائنات کی تمام قوتیں، اس نبی کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی ہیں، اے مسلمانو! تم بھی اس نبی کے ساتھ ساتھ چلو، اور پوری پوری تسلیم و رضا کا ثبوت دو"۔ [۱]

قرآن کریم میں، ایک مقام پر، حضور اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے، یہ حکم دیا گیا ہے کہ

> وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ-۱۰۳) ان کے حق میں دعائے رحمت کر، کیونکہ تری دعا، ان کے لیے باعث سکون ہوگی۔

اس آیت کا ترجمہ، مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

> اور آپؐ، جماعت مومنین کے ساتھ ساتھ چلتے رہئے کہ آپ کا ساتھ ساتھ چلنا ان کے لیے موجب سکون اور اطمینان بخش ہے۔ [۲]

لیکن کبھی ماضی میں، ان ہی الفاظ کا یہ ترجمہ بھی، "مفکرِ قرآن" ہی کے قلم سے برآمد ہوا تھا۔

> ان کے لیے دعائے خیر کرو۔ بلاشبہ تمھاری دعا ان کے دلوں کے لیے راحت و سکون ہے۔ [۳]

اقامت صلوۃ - "غرباء کے لیے دولت کو کھلا رکھنا" اور "باہمی تعاون"

اقامت صلوٰۃ اور صلوٰۃ کے جو جدید ترین مفاہیم، ہمارے دور کے "مفکرِ قرآن" نے پیش فرمائے ہیں، ان میں سے ایک معنیٰ "غرباء کے لیے دولت کا کھلا رکھنا" اور دوسرا معنیٰ "باہمی تعاون" بھی ہے۔

> اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم، ایمان کے بعد، اپنی دولت کو ضرورت مندوں اور محتاجوں کے لیے کھلا رکھنا۔ [۴]

> صلوٰۃ کے لغوی معنیٰ "باہمی تعاون" کے ہیں اور زکوٰۃ کا مفہوم ہے "سامان نشوونما" مہیا کرنا۔ [۵]

صلوٰۃ اور اقامت صلوٰۃ کے، ان متفرق اور مختلف مفاہیم سے گزرتے ہوئے، آخر میں (میرے علم کی حد تک) وہ جس مفہوم پر آ کر ٹِکے ہیں، وہ معاشرہ کا قوانین خداوندی پر متشکل ہونا ہے، جس میں نظامِ ربوبیت قائم ہو، اور جس کا نظامِ حکومت

---

[۱] + [۲] طلوعِ اسلام، ۲ اپریل ۱۹۵۵ء، صفحہ ۸

[۳] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۳۲۷

[۴] طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۸۴ء، صفحہ ۵۸

[۵] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۴ء، صفحہ ۳۹

''قرآنی'' ہو، اور جس کے اندر، نماز کے وقتی اجتماعات بھی شامل ہوں، یہی ان کے نزدیک ''اقامتِ صلوٰۃ'' یا ''نظامِ صلوٰۃ'' ہے جس کا مفہوم، وہ، بایں الفاظ بیان کرتے ہیں۔

> جب افراد کے دل میں، اس قسم کا یقین (ایمان) پختہ ہو جائے، تو اس کی تمام حرکات و سکنات سے، اس کا مظاہرہ ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس سے معاشرہ میں ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ تصور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اس فضا میں، تمام افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں، اس قسم کے معاشرہ کے قیام کا نام قرآن کی اصطلاح میں ''قیام صلوٰۃ'' ہے یعنی ایسا معاشرہ، جس میں قوانینِ خداوندی کا اتباع ہوتا چلا جائے، نماز کے وقتی اجتماعات، اس نظام کے ضروری اجزاء ہیں، اس لیے انھیں بھی قرآن نے اقامتِ صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ [1]

سوال گندم جواب چنا

جب پنجگانہ نماز کے مؤقت فرائض بھی، اقامت صلوٰۃ کا جزو قرار پا گئے، تو کسی نے یہ سوال، اٹھا دیا، کہ ---

''اگر تم وحی خفی (یعنی غیر متلو) کے منکر ہو تو بتاؤ کہ پانچ وقت کی نمازوں کا ذکر، قرآن کریم میں کہاں ہے؟ کیا یہ اوقات، رسول اللہ ﷺ نے وحی خفی کی بناء پر مقرر نہیں فرمائے تھے؟'' ---

یہ سوال تھا، جو ''مفکر قرآن'' سے پوچھا گیا تھا، مگر انھوں نے قرآن میں سے اوقاتِ نماز کی تفصیل بیان کرنے کی بجائے، یہ فرمایا کہ

> یہ تو ہم کبھی پھر عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق، قرآن کریم میں کیا کچھ ہے، سر دست آپ اسناد دیکھئے کہ اس وحیِ خفی کی کیفیت کیا ہے جس کی رو سے پانچ وقتوں کی نماز فرض ہوئی تھی۔ [2]

اس کے بعد، انھوں نے جامع بخاری کی وہ حدیث درج کی ہے، جس میں پانچ نمازوں کی فرضیت مذکور ہے، اور پھر نتیجہ یہ نکالا کہ

> یہ (حدیث) کسی یہودی نے گھڑی ہے تاکہ اس سے حضرت موسیٰؑ کی فضیلت ثابت ہو جائے۔ [3]

سوال کے اس جواب پر، ''سوال گندم، جواب چنا'' کی ضرب المثل صادق آتی ہے، پوچھا یہ گیا تھا، کہ ''کیا قرآن میں پنجوقتہ نمازوں کے اوقات مذکور ہیں؟ اس کا جواب تو آیندہ کے لیے ٹال دیا، اور ساری گفتگو میں، پورا زور بیان، اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کر دیا کہ بخاری کی یہ روایت موضوع ہے جسے کسی یہودی نے گھڑا ہے۔

تین سوال؟

یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں، جن کا جواب، منکرینِ حدیث پر لازم ہے۔

اولاً ----- یہ کہ کسی یہودی کو یہ روایت گھڑنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ صرف اس لیے کہ مسلمان، حدیث

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۲۴ [2] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۲ [3] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۳

رسول کو حجت اور سند مانتے تھے، اگر مسلمانوں کا حدیث وسنت کے متعلق یہ اعتقاد نہ ہوتا، تو یہودی کو یہ روایت گھڑنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، آخر جعلساز لوگ، ان ہی سکوں کو تو گھڑا کرتے ہیں، جن کا بازار میں چلن ہو، جو سکے بازار میں چلتے ہی نہ ہوں، ان کے مثل سکے کون گھڑتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کا یہ استدلال، بجائے خود، حجیت حدیث کے حق میں ہے، البتہ یہ ایک الگ بحث ہے کہ واقعتاً، یہ حدیث موضوع ہے یا نہیں۔

ثانیاً ----- یہ کہ، ''مفکرِ قرآن'' نے پنجوقتہ نماز کے اوقات، نہ تو سائل کے جواب میں، اس وقت پیش کیے، جبکہ پوچھے گئے تھے، اور نہ ہی کبھی بعد میں، قرآن سے، اوقات الصلوات پیش گئے، حتیٰ کہ وہ سطح زمین سے بطن ارض میں منتقل ہو گئے، حالانکہ یہ کہہ کر، انھوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ --- ''یہ تو ہم پھر کبھی عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق، قرآن میں کیا کچھ ہے'' --- اس سے پتہ چلتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کو اپنے وعدہ وفائی کا کس قدر احساس و پاس تھا، جبکہ ان کے اندھے مقلدین یہ کہتے نہیں تھکتے کہ وہ:

معاملات کے کھرے، بات کے سچے، وعدے کے پکے ہیں۔ [1]

ثالثاً ----- یہ کہ، اگر قرآن بھی اوقاتِ نماز کے بارے میں خاموش ہے، اور یہ حدیث بھی موضوع ہے، تو یہ پنجوقتہ نماز، کہاں سے آن ٹپکی اور خود ''مفکرِ قرآن'' کے بھی گلے پڑ گئی، کیونکہ وہ خود بھی، اپنے متعلق، یہ یقین دلایا کرتے تھے، کہ

میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہوں، جس طرح جمہور مسلمان (فقہ حنفی کے مطابق) نماز پڑھتے ہیں۔ [2]

اقامتِ صلوۃ کو نظامِ صلوۃ میں بدلنے کی علت

تواتر وتسلسل سے، رسول اللہ ﷺ کا عملِ صلوٰۃ، ہم تک پہنچنے کو اگر تسلیم کر لیا جائے، تو پھر اس کے حوالہ سے بہت سے دیگر سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً نماز کی شرائط، اس کے ارکان واجزاء، اس کی رکعات، اس کے اوقات، اس کی ادائیگی، انفرادی شکل میں ہو، یا اجتماعی شکل میں؟ گھر میں؟ یا کسی مخصوص مقام پر؟ اس طرح کے سوالات کو کوئی شخص، سنتِ رسول سے گریزاں ہو کر، محض قرآن کی بنیاد پر طے نہیں کر سکتا، خواہ وہ کتنا ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر، قرآن کریم کے تبیاناً لِّکُلِّ شَیْءٍ، اور تَفْصِیلاً لِّکُلِّ شَیْءٍ ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتا رہے، نبی کے ہاتھ سے قرآن چھین کر، یہ لوگ، خود رسول اللہ کی راہنمائی سے یہ کہہ کر بیزار ہو جاتے ہیں کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ -لیکن تنہا اور نری کتابِ اللہ، نماز کے متعلق، ان ڈھیروں سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے، اس لیے، ان کو اس مشکل کا یہی حل نظر آیا، کہ نماز کا وہ مفہوم (جو تواتر وتسلسل سے، ایک مخصوص عمل کی صورت میں، ہم تک پہنچا ہے) ہی بدل ڈالا جائے تاکہ یہ وہ عمل ہی نہ رہے جسے مخصوص شرائط کے ساتھ، مخصوص اوقات میں، ایک خاص شکل میں انجام دیا جاتا ہے، اور اسے ایک اور ہی ''نظام'' میں بدل ڈالا جائے، پھر اسے اس اصرار و تکرار کے ساتھ، اسقدر بار بار دہرایا جائے کہ خود رسول اللہ ﷺ کی تشکیل فرمودہ نماز، شعور سے اتر کر لاشعور میں گم ہو جائے، اور اس کی جگہ شعور میں

[1] طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۹ [2] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۶

صرف ''نظام صلوٰۃ'' ہی کا وجود رہ جائے، لیکن اس کے باوجود بھی، اگر صلوۃ الرسول سطحِ شعور پر ہی رہے تو پھر اسے اس ''نظام'' کے تابع محض اس کا ایک جزو بنا دیا جائے، یہ سب کچھ کرنے کے بعد اور باوجود بھی، اس کی جزئیات کے متعلق، کسی گوشے سے کوئی سوال اٹھا دیا جائے، تو اسے شیعہ دوستوں کے امام غیب کی طرح، کسی ''آنے والے'' مرکز ملت پر ٹال دیا جائے، تاکہ نہ رسولؐ اللہ کی قائم فرمودہ نماز رہے اور نہ ہی اس کی جزئیات کو قرآن سے نکالنے کی زحمت اٹھانی پڑے، نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ یہ ہے سر درد کا علاج، جو سر ہی کو کاٹ ڈالنے کی صورت میں کیا گیا ہے۔

صلوۃ اور اقامت صلوۃ کے جدید مفہوم کا پراپیگنڈہ

چنانچہ ''قیامِ صلوٰۃ'' اور ''نظامِ صلوٰۃ'' کے جدید مفہوم کا خوب پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اور بے نماز افراد کو یہ مفہوم خوب اپیل کرتا ہے، کیونکہ نماز پڑھے بغیر بھی، اگر قرآن کی سند، ہاتھ سے نہ چھوٹے، تو اس میں کیا نقصان اور خسارہ ہے۔

> خدا کے نظام ربوبیت کے قیام کے لیے، ایمان کے بعد، دوسری کڑی یہ ہوتی ہے کہ اس معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کی جائے، جس سے اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، یہی تصور آنکھوں کے سامنے رہے، اس کا نام، قرآن کی اصطلاح میں اقامت صَلوٰۃ ہے۔[1]
>
> قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ''اقامتِ صلوٰۃ'' ہے جس کے عام معانی نماز پڑھنا یا نماز قائم کرنا لیے جاتے ہیں، لفظ صلوٰۃ کا مادہ (ص - ل - و) ہے جس کے بنیادی معنٰی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں اس لیے صلوٰۃ میں، قوانینِ خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا، بنا بریں، اقامت صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا، ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام، جس میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے، یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ [2]

اقامت صلوۃ کے جدید ترین مفہوم کا قرآن سے ٹکراؤ

اقامت دین کے مفہوم کو ''اقامتِ صلوٰۃ'' کا نام دیتے ہوئے، اسے ایک وسیع نظام (نظامِ ربوبیت) قرار دینا، قرآن کریم کی ان آیات سے صریحاً ٹکراتا ہے جن میں اقامت صلوٰۃ کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے، مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں۔

> یہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر، منکرینِ حدیث کی اس جسارت پر غور کیجئے کہ وہ ''نماز پڑھنے'' کا مذاق اڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ نماز، جو آج مسلمان پڑھ رہے ہیں، یہ سرے سے وہ چیز ہی نہیں ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے، ان کا ارشاد ہے کہ قرآن تو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے، اور اس سے مراد ''نماز پڑھنا'' نہیں بلکہ ''نظامِ ربوبیت'' قائم کرنا ہے۔ اب ذرا ان سے پوچھئے کہ وہ کونسا نرالہ نظامِ ربوبیت ہے جسے یا تو طلوعِ آفتاب سے پہلے قائم کیا جا سکتا ہے یا پھر زوالِ آفتاب کے بعد کچھ رات گزرنے تک؟ اور وہ کونسا نظامِ ربوبیت ہے جو خاص جمعہ کے دن قائم کیا جانا مطلوب ہے؟ (إِذَا نُودِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْٓا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ)۔ اور نظامِ ربوبیت کی

---

[1] نظام ربوبیت، صفحہ ۱۴۷ تا صفحہ ۱۴۸

[2] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۷

آخر وہ کونسی خاص قسم ہے کہ اسے قائم کرنے لیے آدمی کھڑا ہو تو پہلے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھولے اور سر پر مسح کر لے ورنہ وہ اسے قائم نہیں کر سکتا؟ (اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ......)۔ اور نظام ربوبیت کے اندر آخر یہ کیا خصوصیت ہے کہ اگر آدمی حالتِ جنابت میں ہو تو جب تک غسل نہ کر لے، اسے قائم نہیں کر سکتا؟ (لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ .... وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا)۔ اور یہ کیا معاملہ ہے کہ اگر آدمی عورت کو چھو بیٹھا ہو اور پانی نہ ملے تو اس عجیب و غریب نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کے لیے، اسے پاک مٹی پر ہاتھ مار کر، اپنے چہرے اور منہ پر ملنا ہوگا؟ (اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ)۔ پھر یہ کیا لطیفہ ہے کہ اگر جنگ کی حالت ہو تو فوج کے آدھے سپاہی ہتھیار لیے ہوئے، امام کے پیچھے "نظام ربوبیت" قائم کرتے رہیں اور آدھے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہیں۔ اس کے بعد، جب پہلا گروہ امام کے پیچھے "نظامِ ربوبیت" قائم کرتے ہوئے، ایک سجدہ کر لے تو وہ اُٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے چلا جائے، اور دوسرا گروہ، اس کی جگہ آ کر، امام کے پیچھے، اس "نظام ربوبیت" کو قائم کرنا شروع کر دے؟ (وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ)۔ قرآن کریم کی یہ ساری آیات صاف بتا رہی ہیں کہ اقامت صلوٰۃ سے مراد وہی نماز قائم کرنا ہے جو مسلمان، دنیا بھر میں پڑھ رہے ہیں، لیکن منکرینِ حدیث ہیں، کہ خود کو بدلنے کی بجائے، قرآن کو بدلنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص، اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بالکل ہی بیباک نہ ہو جائے وہ اس کے کلام کے ساتھ یہ مذاق نہیں کر سکتا جو یہ حضرات کر رہے ہیں، یا پھر قرآن کے ساتھ، یہ کھیل، وہ شخص کھیل سکتا ہے جو اپنے دل میں، اسے اللہ کا کلام نہ سمجھتا ہو، اور محض دھوکہ دینے کے لیے، قرآن قرآن پکار کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہو۔ [1]

"مفکر قرآن" نے اقامتِ صلوٰۃ کی توضیح و تشریح میں رکیک تاویلات کے ذریعہ، دور کی کوڑی لاتے ہوئے، جو صفحات پر صفحات سیاہ کیے ہیں، ان سب پر، تردید و ابطال کے نقطۂ نظر سے سید مودودیؒ کا یہ مختصر اور جامع حاشیہ بھاری ہے، اور استدلالِ پرویز کے غبارہ سے ساری ہوا نکال کر رکھ دیتا ہے، اور "مفکر قرآن" کے تجدد کا پائے چوبیں سخت بے تمکین ہو کر رہ جاتا ہے۔

نماز وزکوٰۃ کی جزئیات میں تبدیلی کا مسئلہ

اب "اقامتِ صلوٰۃ" کے کچھ اور گوشے بھی ملاحظہ فرمائیے، ان میں سے پہلا گوشہ نماز اور زکوٰۃ کی جزئیات میں تبدیلی کا مسئلہ ہے، کسی صاحب کا "مفکر قرآن" سے یہ سوال تھا کہ قرآن کریم میں اصولی طور پر، صرف اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم دیا گیا ہے، صلوٰۃ کی جزئیات کا ذکر نہیں ہے، کیا کسی سربراہ مملکتِ اسلامیہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نماز کی ان جزئیات کو،

[1] تفہیم القرآن، جلد ۳، الروم، ح ۴۴، صفحہ ۷۴۱

جنھیں رسولِ خدا نے متعین فرمایا تھا، بدل ڈالے؟ جیسا کہ جزئیاتِ زکوٰۃ کی تغییر کے بارے میں آپ کی مثبت رائے ہے، اس کے جواب میں فرمایا۔

> سب سے اول تو یہ دیکھئے کہ اس میں بحث قوانین سے ہے، عبادات سے نہیں، کسی قانون کی جزئیات میں، زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ماتحت، ردّ و بدل کی ضرورت بالکل واضح ہے، لیکن عبادات میں، یہ ضرورت، بالکل شاذ ہے، مثلاً نماز اور زکوٰۃ کو لیجئے، زکوٰۃ یعنی حکومت کی ٹیکس کی شرح میں تغیر و تبدل کی ضرورت، ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نظر نہیں آتی، اس کے برعکس، نماز کو لیجئے، تو زمانے کے تقاضے (ذاتی رجحانات نہیں بلکہ زمانے کے تقاضے) اس کی جزئیات پر کہاں اثر انداز ہوں گے، اور وہ کون سی ضرورت ہوگی جو اِس کی مقتضی ہو کہ رکوع میں سُبْحَان رَبِّی الْعَظِیْم کی جگہ سُبْحَانَ اللہ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ کہا جائے، یا سجدہ دو کی بجائے ایک ہو۔ [1]

"مفکرِ قرآن" کا یہ اقتباس، ان کی کوتاہ نظری، قلتِ فکر اور تنگیٔ نگاہ کی کھلی دلیل ہے، پھر اس میں حقائق کو بھی مسخ کیا گیا ہے، اور مغالطہ آفرینی سے بھی کام لیا گیا ہے۔

قانون اور عبادت

سب سے پہلے تو یہ بات، کہ "قوانین" اور "عبادات" میں یہاں فرق کیا گیا ہے، حالانکہ کسی اور جگہ نہیں، بلکہ اسی مضمون میں آگے چل کر، وہ، اس فرق کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قوانین کا تعلق، ہماری دنیاوی زندگی سے ہے اور عبادات کا تعلق آخرت سے یا قوانین، مادی دنیا سے متعلق ہیں اور عبادات روحانی سے۔ اسلام میں دنیا و آخرت اور مادہ و روح میں کوئی امتیازی خطوط نہیں، اس کے قوانین اور اس کے تمام اعمال، اس کی عبادات ہیں، ہر قانونِ قرآنی کی اطاعت عبادت ہے، اور ہر عبادت زندگی کے لیے خود ایک قانون کا درجہ لیے ہوئے ہے۔ [2]

ہم اس سے یہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، لیکن "مفکرِ قرآن" نے یہ فرماتے ہوئے بھی، کہ "قانون اور عبادت، اسلام میں ایک ہی چیز ہوا کرتے ہیں، خود ہی ان دونوں میں، یہ فرق کر دیا ہے کہ، ایک کو (یعنی قانون کو) بتقاضائے زمانہ، قابلِ تغیر و تبدل سمجھتے ہیں اور دوسرے کو اس سے بالاتر۔

زکوٰۃ – عبادت یا ٹیکس؟

دوسرے یہ کہ وہ زکوٰۃ کو ایک حکومتی ٹیکس سمجھتے ہیں، حالانکہ زکوٰۃ بھی، اسی طرح، اسلام کی ایک عبادت اور رکن ہے، جس طرح توحید و رسالت کی شہادت، نماز، روزہ اور حج۔ زکوٰۃ، اس وقت بھی، مسلمانوں پر (مکی دور میں) عائد رہی ہے، جبکہ اسلامی حکومت کا ابھی وجود ہی قائم نہیں ہوا تھا (خواہ، اس کی جزئیات، اس وقت، وہ نہ تھیں، جو بعد میں، مدنی دور میں طے کی گئی تھیں)، پھر آخر اسے حکومت کا ٹیکس کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، جبکہ اس کا حکم اور اس کے نتیجہ میں، اس کا وجود، قیامِ حکومت سے

---
[1] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۹ تا ۱۰
[2] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۱

پہلے بھی قائم تھا۔

زمانے کے تقاضے اور نماز

تیسرے یہ کہ، --- ''زمانے کے تقاضے، نماز کی جزئیات پر کہاں اثر انداز ہوں گے، وہ کونسی ضرورت ہوگی جو اس کی مقتضی ہو کہ رکوع میں سُبْحَان رَبِّیَ الْعَظِیْم کی جگہ سُبْحَانَ اللہ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ کہا جائے، یا سجدہ دو کی بجائے ایک ہو'' --- حالانکہ نمازوں کا اپنی پوری تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ ادا کیا جانا، ایک ایسا وقت طلب (Time Taking) معاملہ ہے، جس کا احساس، کسی اور کو ہو یا نہ ہو، لیکن قارئین طلوعِ اسلام کو ضرور ہے، جبکہ وہ خود کہتے ہیں کہ

> نماز کے ارکان اور اس کی ادائیگی کی تفصیل بھی بڑا وقت طلب معاملہ ہے۔ [1]

پھر پانچوں نمازیں، نماز جمعہ اور رمضان کی تراویح کے ساتھ مل کر، ایک ایسا بوجھ بن جاتی ہیں، جو یکے از قارئین طلوعِ اسلام، جناب لاہوتی صاحب کو بھی گراں گزرتا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ

> پھر یہی نہیں کہ پانچ وقت، اپنی تعداد کے لحاظ سے بوجھل ہیں، بلکہ مزید بوجھ یہ ہے کہ ان میں سے ایک ایک نماز، اتنی لمبی ہے جو پانچ نمازوں سے بھی زیادہ وقت لیتی ہے، ظہر کو دیکھئے، عشاء کو دیکھئے اور رمضان کی تراویح پر نظر ڈالیے۔ [2]

اور اگر آج کے مادی دور میں (جس میں ہر شخص، اپنی زندگی کا ہر لمحہ، دنیا کمانے میں صرف کر رہا ہے) نمازوں کی گرانباری اور وقت طلبی کے یہ احساسات، ''ذاتی رجحانات'' سے ترقی پا کر ''زمانے کے تقاضے'' بن جائیں تو پھر بات صرف ''دو سجدوں کی بجائے، ایک سجدہ کرنے'' تک ہی محدود نہیں رہے گی، بلکہ پوری نماز ہی کو ''ضیاعِ وقت'' کا ذریعہ گردانا جائے گا جسے بالآخر ختم کر دینا ہی ''سودمند'' ہوگا، بالخصوص، جبکہ اقامت صلوٰۃ کے عمل کو (جو تعلق باللہ کے تقریر و استحکام کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے)، آج کے دورِ مادہ پرستی میں، ''مفکرِ قرآن'' کی طرف سے، معاشی نظام ہی کا بیج قرار دیا جا رہا ہو۔ روسی اشتراکیوں نے، اسی منطق سے، وہاں کے مسلمانوں کو، نماز کے ''معاشی نقصانات'' سمجھائے تھے، کہ جب بارہ کروڑ کی آبادی میں سے، ہر شخص، ہر نماز پر، اگر آدھ گھنٹہ بھی صرف کرے تو ایک دن میں، اس قوم کے تیس کروڑ گھنٹے ''ضائع'' ہوں گے، پھر حساب لگایئے کہ سال بھر میں کتنے کھربوں گھنٹے ''ضائع'' ہوں گے، اس کے بعد، استدلال کا منطقی نتیجہ اور ٹیپ کا بند، یہ قرار پایا کہ جو قوم، سال بھر میں کھربوں گھنٹوں کے حساب سے اپنا وقت ''ضائع'' کرتی ہو، وہ دنیا میں کیا خاک ترقی کرے گی؟

پھر نماز کے ''معاشی نقصانات'' کا ایک اور پہلو بھی ہے، کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر ہر شخص، نماز سے قبل، وضو کرنے پر، دو کلو پانی ہی صرف کرے، تب بھی، نمازِ پنجگانہ پر، بارہ کروڑ آبادی، صرف ایک دن میں، ایک ارب، بیس کروڑ کلو پانی ''ضائع'' کرے گی، سال بھر میں یہ نقصان کس قدر بڑھ جاتا ہے؟ اس کے لیے، اسی عدد کو ۳۶۵ سے ضرب دے لیجئے، پھر استدلال کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ ''جو قوم، اپنے آبی ذخائر کی آپ دشمن ہو، اور روزانہ اربوں کلو پانی ''ضائع'' کرتی ہو، تو وہ قوم دنیا

[1] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۸
[2] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶۰

میں کیا ترقی کر سکتی ہے؟ اور پھر عجب نہیں کہ وضو کرنا، ملک کے آبی وسائل کو "ضائع کرنے" کے لحاظ سے، "ملک دشمنی" کا رویہ قرار پائے، اور ہر نمازی آدمی پر غداری کا مقدمہ چل جائے۔

یہ ہے وہ ذہنیت، جو اقامت صلوٰۃ کو ایک معاشی نظام میں ڈھال دینے کی صورت میں، بنتی اور مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے، جبکہ ہمارے "مفکر قرآن" صاحب، بڑی سادگی کے ساتھ، یہ وعظ فرما رہے ہیں کہ --- "وہ کون سی ضرورت ہوگی جو اس کی مقتضی ہو کہ .... سجدہ دو کی بجائے ایک ہو" --- واقعی یہ ذہنیت، جسے "مفکر قرآن" پیدا کرنا چاہتے ہیں، اگر پیدا ہو جائے، تو اس کا تقاضا یہ نہیں ہوگا کہ "............ سجدہ، دو کی بجائے ایک ہو جائے" بلکہ یہ ہوگا کہ پوری نماز ہی سے ہاتھ دھو لیے جائیں، تاکہ نہ تو وقت ہی ضائع ہو، اور نہ ہی آبی ذخائر۔

"مرکز ملت" کا اختیار تبدیل جزئیات

بہرحال، یہ کہنے کے بعد، کہ زمانے کے تقاضوں کے تحت، جزئیاتِ نماز میں تبدیلی کرنے کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ایک عبادت ہے، قانون نہیں جو وقت کے تقاضوں سے تبدیل ہو سکتا ہے، "مفکر قرآن" اگلے ہی صفحہ پر یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

> اگر جانشینِ رسول اللہ (یعنی قرآنی حکومت)، نماز کی کسی جزئی شکل میں، جس کا تعین، قرآن نے نہیں کیا، اپنے زمانے کے کسی تقاضے کے ماتحت، کچھ ردّ و بدل ناگزیر سمجھے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہوگی، ہماری دشواری یہ ہے کہ جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ردّ و بدل کا تصور کرتے وقت، ہماری موجودہ حکومتوں کے ارباب حل وعقد، ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں اور اس تصور سے ہماری روح کانپ اٹھتی ہے کہ ان لوگوں کو یہ حق کیسے دیا جائے کہ یہ ان احکام میں تغیر وتبدل کر دیں، جو رسول اللہ نے متعین فرمائے تھے، ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حق صرف رسول اللہؐ کے جانشینوں کو پہنچتا ہے، کسی اور کو نہیں۔ [1]

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کبھی ماضی میں "قرآنی حکومت" قائم بھی ہوئی تھی یا نہیں؟ اگر قائم ہوئی تو کب؟ ظاہر ہے کہ "مفکر قرآن" کے نزدیک، عہد نبوی اور خلافت راشدہ کی حکومت، "قرآنی حکومت" ہی تھی، جس کی ابتداء کے متعلق، وہ، خود فرماتے ہیں کہ

> ہجرت کے بعد، اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی، وہ آہستہ آہستہ مستحکم بھی ہوتی گئی اور پھیلتی بھی گئی ....
>
> حضور اکرمؐ کی مدنی زندگی کے ابتدائی آٹھ سال میں صورت یہ تھی کہ اسلامی حکومت قائم تھی (جس کا دار الخلافہ مدینہ تھا)۔ [2]
>
> فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کی حقیقی حکومت کی بنیاد پڑتی ہے۔ [3]
>
> دین کا یہ سلسلہ، خلفائے راشدین تک قائم رہا، اس کے بعد منقطع ہو گیا۔ [4]

اس صورتِ حال میں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

اولاً ---- یہ کہ عہد نبوی کے مقابلہ میں، خلافت راشدہ کی سرحدیں وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھیں، اور نئے

---

[1] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۱
[2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ٦، صفحہ ۱۲۹
[3] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵٦۸
[4] سلیم کے نام (چوبیسواں خط)، جلد ۲، صفحہ ۱۱۱

ممالک کی فتح کے ساتھ نئے مسائل بھی حل طلب موجود تھے، زمانے کے تقاضے بھی بدل چکے تھے، سلطنتِ اسلامیہ بھی، ابتدائی عرب ریاست سے کئی گنا بڑھ چکی تھی، کئی نئے محکمے بھی پیدا ہو چکے تھے، کیا اس دور کے ''قرآنی حکومت'' کے کسی ''مرکزِ ملت'' نے بھی، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قصاص یا دیت، جنگ یا صلح وغیرہ کے معاملہ میں کوئی تبدیلی کی تھی؟ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جن کی نیکی، تقویٰ، تدیّن اور رسوخ فی الایمان کی بناء پر، دنیا ہی میں، انھیں رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ کی امتیازی فضیلت و سند مل چکی تھی، اگر یہ پاکباز سربراہانِ سلطنت بھی، نبی اکرم ﷺ کے طے کردہ امور کو بدلنے کے مجاز، خود کو نہیں سمجھتے تھے، تو کسی اور کے بارے میں ایسا سمجھنے کی کیا دلیل ہے؟ نماز و زکوٰۃ کی جزئیات تو رہیں ایک طرف، صحابہؓ تو ایسی عام تدابیر کو بدلنے کے بھی، اپنے آپ کو مجاز نہ جانتے تھے، جنکا دین پر کوئی اثر بھی نہیں پڑتا تھا مثلاً جیشِ اسامہؓ کا واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

> حضرت اسامہ، زید بن حارثہ کے بیٹے تھے، جو آنحضرتؐ کے غلام، مشہور تھے، علاوہ ازیں نو عمر آدمی تھے، اُن کا سن، اسوقت سترہ سال کا تھا، انصار کی طرف سے حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ اگر آپ لشکر بھیجتے ہی ہیں تو کسی شریف النسل اور سن رسیدہ شخص کو اس کا امیر مقرر فرمائیے، یہ سنکر حضرت ابو بکرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اور حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسامہ کو سردار مقرر کر دیا ہے، میں ان کو برطرف کر دوں؟ [1]

جن لوگوں کا یہ عالم تھا کہ زمانہ بھر کی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر، اطاعت رسول ہی کو سب سے بڑی مصلحت سمجھتے تھے، اور رسولؐ اللہ کے مقرر کردہ سترہ سال کے کم تجربے والے سپہ سالار کو بدلنا اور اس کی جگہ سن رسیدہ اور زیادہ تجربہ کار سپہ سالارِ فوج مقرر کرنیکو منافیٔ اطاعتِ رسول جانتے تھے، کیا وہ خود کو عبادات کی جزئیات تک بدلنے کے مجاز سمجھتے ہوں گے؟ ع

این خیال است و محال است و جنوں

آخر اس کی قرآنی دلیل کیا ہے؟

ثانیاً ---- یہ کہ نماز کی ترکیب، اس کا طریقۂ ترکیب، اس کے اوقات کا واضح اور غیر مبہم تعیّن، اس کی تعدادِ رکعات، اس کے جملہ اجزاء و ارکان (مثل تکبیر تحریمہ، قیام، قراءۃ قرآن، رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ وغیرہ) پر مشتمل ہر رکعت اور پھر ہر نماز کی الگ الگ تعداد رکعات، یہ سب چیزیں قرآن کے مجمل حکم وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ کی اصولی تعلیم ہی کے نتیجہ میں، حضور اکرمؐ نے، جو متعین فرمائی تھیں، تو کیا یہ صحابۂ کرامؓ کے باہمی مشورہ سے مقرر فرمائی تھیں؟ یا خود آپؐ نے معاذ اللہ، اپنے نفس سے گھڑ ڈالی تھیں؟ یا ان کا طے کرنا، ایک مامور من اللہ پیغمبر کا فریضہ تھا؟

کیا قرآن، حدیث و سنت یا تاریخ میں سے، کوئی دلیل، اس امر پر پیش کی جا سکتی ہے کہ نماز کی یہ جزئیات، حضورؐ نے صحابہؓ کے مشورہ سے طے کی تھیں؟ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، کیا پھر حضورؐ کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ آپؐ نے (معاذ اللہ) اپنے نفس سے گھڑ کر، یہ جزئیاتِ نماز پیش کی تھیں؟ استغفر اللہ من ذالک یہ بات تو منصب نبوت ہی کے خلاف

[1] تاریخ الامت، جلد ۲، صفحہ ۳۴

ہے، اسے کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ لامحالہ، تیسری شق ہی باقی رہ گئی ہے، جس کے مطابق، آپؐ کا جزئیاتِ نماز کو مرتب کرنا، مامور من اللہ پیغمبر کی حیثیت سے، فریضۂ منصبی تھا۔ اب حیرت کی بات یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب مامور من اللہ شخصیت کے ہاتھوں طے شدہ جزئیات کو تبدیل کرنے کا اختیار، ان ''مراکز ملت'' کو دے رہے ہیں، جو قطعاً مامور من اللہ نہیں ہیں جبکہ ایسا اختیار، خلفائے راشدین جیسے پاکباز ہستیوں کو بھی حاصل نہیں تھا، جن کی پاکبازی اور تقویٰ و تدیّن کی نظیر، چشم فلک نے آج تک نہیں دیکھی۔ آخر غیر مامور من اللہ شخصیت کو، مامور من اللہ رسول کی متعین فرمودہ جزئیات کو بدل دینے کا اختیار دینے کی قرآنی دلیل کیا ہے؟

ایک اور نئی نماز - الصلوٰۃ الجامعہ

''مفکر قرآن'' نے اپنی تحقیق کے زور پر، نماز پنجوقتہ کے علاوہ، ایک اور نماز --- اور وہ بھی نماز باجماعت --- جبلِ تاریخ میں سے کھود ڈالی ہے۔

زیر نظر، اسلامی مملکت کا مرکزی مقام مدینہ تھا اور حضرت عمرؓ فاروق، اس کے سربراہ (امیر المؤمنین)۔ ان کی ایک مجلسِ مشاورت تھی جو اعیانِ مدینہ (انصار و مہاجرین) کے منتخب افراد پر مشتمل تھی، اس میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، زیدؓ بن ثابت، معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہم) جیسے اولوالعزم صحابہؓ شامل تھے جب اس کی میٹنگ بلانی ہوتی تو ایک مناد اعلان کرتا --- الصلوۃ الجامعہ --- صلوٰۃ کے لیے جمع ہو جاؤ --- (یہاں سے صلوٰۃ کا مفہوم و منطوق واضح ہو جاتا ہے) جب ارکان مجلس جمع ہو جاتے، تو پہلے امیر المؤمنین کے زیرِ امامت، دو رکعت، نماز پڑھی جاتی، جس سے اس امر کا اعتراف و اظہار و اعلان مقصود تھا کہ ہم قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے، (یعنی احکام خداوندی کی اطاعت کرنے) کی غرض سے جمع ہوئے ہیں، اس کے بعد، حضرت عمرؓ خطبہ دیتے (یعنی ارکان مجلس سے خطاب کرتے) جس میں بحث طلب معاملہ پیش کیا جاتا۔ ؎۱

بزعم ''مفکر قرآن''، صرف دور فاروقی ہی میں نہیں، بلکہ پوری خلافت راشدہ میں یہ ''نمازِ مشاورت'' پڑھی جاتی تھی۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ میں، جب کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو خلیفہ کی طرف سے منادی کرائی جاتی کہ ''الصلوۃ الجامعہ'' لوگ، مسجد نبوی میں جمع ہوتے، پہلے دو رکعت نماز ادا ہوتی، پھر خلیفہ، معاملہ پیشِ نظر کی وضاحت کرتا اور مجلس کے باہمی مشورہ سے، اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا۔ ؎۲

اور ''مفکر قرآن'' صاحب، کچھ اور کھلتے ہیں، اور مزید آگے بڑھ کر، فرماتے ہیں کہ خلافت راشدہ ہی میں نہیں، بلکہ خود عہد نبوی میں بھی، لوگوں کو ''الصلوٰۃ الجامعۃ'' کہہ کر اکٹھا کیا جاتا تھا۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ عہدِ نبی اکرمؐ اور صحابہؓ میں، جب کبھی کوئی ایسا اہم واقعہ پیش آیا جس کے لیے فوری اجتماع کی ضرورت ہوتی تو اس کے لیے جو اعلان کیا جاتا تھا، اس میں کہا جاتا تھا کہ ''الصلوٰۃ الجامعہ''۔ چنانچہ یہ اعلان سنکر، لوگ جمع

؎۱ شاہکارِ رسالت، صفحہ ۲۲۸ ؎۲ قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ١٦

ہو جاتے اور مسئلہ پیش نظر پر غور و خوض کر لیا جاتا، اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس دور میں الصلوٰۃ کا مفہوم کیا تھا۔ [1]

لیکن حرام ہے جو کہیں بھی ''مفکر قرآن'' نے کتب تاریخ یا ذخیرۂ حدیث میں سے کسی کا حوالہ دیا ہو کہ بات فلاں کتاب میں مذکور ہے، اسی واقعہ کو طلوع اسلام، ماہ اکتوبر ۱۹۸۴ء صفحہ ۵۹ پر بھی درج کیا گیا ہے، لیکن کسی ایک جگہ بھی حوالۂ ماخذ نہیں دیا گیا، تاکہ تحقیق کے دوران، اس واقعہ، اور اس ''نمازِ مشاورت'' کے بے اصل، بے بنیاد اور بے سروپا ہونے کا راز نہ کھل سکے، رہے عقیدتمندانِ پرویز، تو ان کا پہلے ہی یہ عقیدہ ہے کہ ع مستند ہے آپ کا فرمایا ہوا۔

جی ہاں! یہ وہی تاریخ ہے

پھر تاریخ کا نام لے کر، یہ بے سروپا بات، اس شخص کے قلم سے برآمد ہو رہی ہے، جو یہ کہتے نہیں تھکتا کہ

میں جب اپنے تاریخی سرمایہ پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو اس میں، اسلامی نظام، اسلامی سیاست، یا اسلامی ریاست کے متعلق، قرآنی نقطۂ نگاہ سے کچھ لکھا ہوا نہیں ملتا۔ وہ ہمارے (مسلمانوں کے) دورِ ملوکیت کی تاریخ ہے، اور ملوکیت میں، قرآنی نقطۂ نگاہ سے یا تو کچھ لکھا ہی نہیں جا سکتا، اور اگر کسی صاحب ہمت نے اس کی جرأت کی ہوگی تو تھیا کریسی نے اس کا ایک ایک ورق ضائع کر دیا ہوگا، تھیا کریسی کی انتہائی کوشش یہ رہی ہے (اور ہے) کہ قرآن بے نقاب ہو کر، امت کے سامنے نہ آنے پائے۔ [2]

اور تاریخ ہی کے متعلق، یہ کہتے ہوئے بھی، ان کی زبان ہمیشہ تر رہی کہ

قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں، سب سے بڑی رکاوٹ، ہماری غلط تاریخ ہے۔ [3]

چلو، اچھا ہوا، یہ تاریخ بھی تو کسی کام آئی، اگر یہ نہ ہوتی تو ایسے بے سروپا، بے اصل، اور بے بنیاد واقعات، کو، ''مفکر قرآن'' کس کے نام پر پیش کرتے، اس زحمت کشی پر یقیناً وہ اندھا قابل ستائش ہے، جس نے اندھیرے کمرے میں، اس کالی بلی کو تلاش کرنے کی کوشش کی، جو اس کمرے میں تھی ہی نہیں۔

کیا نماز اور اقتدار لازم و ملزوم ہیں؟

''مفکر قرآن'' کا ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ اقتدار کے بغیر، نماز، ایک بے روح عمل اور بے جان لاشہ ہے، اور یہ نظام صلوٰۃ، اقتدار کے بغیر، قائم ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر کوئی قوم، اپنے معاشرتی اور معاشی نظام کو، قوانینِ الٰہیہ پر استوار کیے بغیر، نماز پڑھتی ہے، تو اس کی نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔

اگر کسی قوم میں معاشرتی و معاشی نظام غیر خداوندی خطوط پر متشکل ہوں تو ان کے مصلین (نمازیوں) کی صلوٰۃ (نماز) نہیں کہلا سکتی، ایسی صلوٰۃ کا نتیجہ، تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ [4]

---

[1] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۹
[2] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۴
[3] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۸
[4] سلیم کے نام، جلد ۱، صفحہ ۱۶۵

دین کی رو سے صلوٰۃ وزکوٰۃ کا نظام اور حکومت ایک ہی شے ہے، جن کا مدار، قرآنی ہدایت کی روشنی میں باہمی مشورے پر ہے۔[1]

قرآن کریم نے اقامت صلوٰۃ کو ایک اجتماعی فریضہ قرار دیا ہے، اتنا ہی نہیں، بلکہ اس نے یہ بھی بتایا کہ الصلوۃ کا قیام، اسی صورت میں ممکن ہے، جب جماعتِ مؤمنین کو تمکّن فی الارض حاصل ہوان کی اپنی آزاد مملکت ہو۔[2]

صلوۃ پہلے یا اقتدار وحکومت؟

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص، ایک نیا نظامِ فکر وعمل گھڑ کر، پیش کرتا ہے، تو اسے قدم قدم پر، اس کشمکش سے سابقہ پیش آتا ہے جس میں واقعی حقائق کا اس کے خودساختہ ''حقائق'' سے ٹکراؤ ہوتا ہے، اور پھر اُسے، اپنے ''اختلاقات ومفتریات'' کی لاج رکھنے کے لیے، تضادات گوئی پر مجبور ہونا پڑتا ہے، کچھ ایسی ہی کیفیت ہے، جس میں ''اقامت صلوٰۃ'' کا ماڈرن مفہوم گھڑتے ہوئے، ''مفکر قرآن'' دکھائی دیتے ہیں وہ، یہاں تو یہ فرماتے ہیں کہ --- ''الصلوٰۃ کا قیام، اسی صورت میں ممکن ہے، جب جماعتِ مؤمنین کو تمکن فی الارض حاصل ہو، اور ان کی اپنی آزاد مملکت ہو'' --- گویا ''تمکن فی الارض'' اور ''آزاد مملکت'' کا ہونا، وجود صلوٰۃ پر مقدم ہے، لیکن ایک دوسرے مقام پر، اس ترتیب کو الٹ دیتے ہیں، اور وجودِ صلوٰۃ کو ''تمکن فی الارض'' اور ''آزاد مملکت'' پر اس طرح اور اس حد تک مقدّم قرار دیتے ہیں کہ امر ثانی، امر اول کا نتیجہ اور ثمرہ قرار پاتا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

قرآن نے اقامتِ صلوٰۃ کا فطری نتیجہ، استخلاف فی الارض بتایا ہے، ہماری ان نمازوں سے ہمیں کب استخلاف ملا؟[3]

''مفکر قرآن'' کی ان متضاد تحریروں نے، قارئین کو، تذبذب کے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں وہ جانب منزل، کوئی قدم اٹھانے کی بجائے، بس یہی سوچتے رہیں کہ مرغی پہلے یا انڈہ؟

وجودِ صلوٰۃ، قبل از اقتدار وحکومت

اس صریح تضاد سے قطع نظر، یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ''اگر کسی قوم میں معاشرتی ومعاشی نظام غیر خداوندی خطوط پر متشکل ہو تو مصلین (نمازیوں) کی صلوٰۃ (نماز) صلوٰۃ نہیں کہلا سکتی اور ایسی صلوٰۃ کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوا کرتا ہے'' --- اور اگر --- ''دین کی رو سے نظام صلوٰۃ وزکوٰۃ اور حکومت، ایسے ہی لازم وملزوم ہیں کہ گویا دونوں شئے واحد ہیں'' --- نیز اگر --- ''صلوٰۃ کا قیام، تمکن فی الارض اور آزاد مملکت کے بغیر ممکن ہی نہیں'' تو اللہ تعالیٰ نے مکّی سورتوں میں، جبکہ ''آزاد مملکت'' کے قائم ہو جانے کے آثار، دور دور تک بھی دکھائی نہیں دیتے تھے، اقامت صلوٰۃ کا حکم ہی کیوں دیا؟ نیز جبکہ اللہ تعالیٰ، جس کا علم ماضی حال اور مستقبل کے ذرّہ ذرّہ پر محیط ہے، یہ جانتا ہے کہ --- ''معاشرہ کو اسلامی قوانین پر قائم کیے بغیر، صلوٰۃ کا نتیجہ، تباہی اور بربادی ہے'' --- تو اس کا حکم، اور وہ بھی کئی سورتوں میں، بتکرار داعادہ، دیا ہی کیوں؟ کیا اللہ واقعی حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کو یہ حکم دیکر، انھیں تباہی اور بربادی میں ڈالنا چاہتا تھا؟

[1] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۹ء، صفحہ ۶۸ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ا، صفحہ ۹۹ تا صفحہ ۱۰۰ [3] سلیم کے نام، جلد ا، صفحہ ۱۵۲

مکی دور میں اللہ تعالیٰ کا حکمِ صلوٰۃ

اب رہا یہ امر کہ واقعی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مکی دور میں، (جبکہ اقتدار وحکومت، ابھی مسلمانوں کو ملا ہی نہیں تھا)، اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دے رکھا تھا، تو اس پر مندرجہ ذیل متعدد آیات شاہد ہیں۔

۱ --- وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (ھود-۱۱۴) دن کے دونوں کناروں پر، اور رات کچھ گزرنے پر نماز قائم کرو۔

۲ --- أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ (بنی اسرائیل-۴۸) زوالِ آفتاب سے لے کر، تاریکئ شب تک کے اوقات میں نماز قائم کرو۔

۳ --- اُتْلُ مَآ أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ (العنکبوت-۴۵) کتاب وحی میں سے پڑھ اور نماز قائم کر۔

اور ایسا بھی نہیں کہ چلو! اللہ میاں، تو بیچارہ "تباہی میں ڈالنے والا، یہ حکم" دے ہی چکا تھا، تو اس کے نبیؐ اور صحابہؓ ہی، اس پر عمل نہ کرتے، اور تباہی وبربادی سے بچ جاتے، لیکن قرآن کریم بیان کرتا ہے کہ ان "تباہ کن احکام" پر عمل بھی کیا گیا۔

۴ --- أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى ○ عَبْدًا إِذَا صَلّٰى (العلق-۹، ۱۰) کیا تو نے اسے دیکھا جو اللہ کے بندے کو روکتا ہے جبکہ اس نے نماز پڑھی۔

یہ تو نبیؐ کا امتثال امر تھا، رہے صحابہؓ، تو ان کے متعلق بھی، قرآن، یہی شہادت دیتا ہے۔

۵ --- إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ (فاطر-۲۹) بیشک وہ جو کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم کی۔

پھر "مفکر قرآن" کی یہ عادت تھی، کہ تاریخ اور سیرتِ رسول کو، از سرِ نو "مطابق قرآن" بنانے کے لیے، وہ ان واقعات کو گول کر جایا کرتے تھے، جو "خلافِ قرآن" ہوا کرتے تھے، لیکن حیرت بالائے حیرت، اور باعث صد تعجب بات تو یہ ہے کہ وہ بھی اپنی "مطابقِ قرآن" تصنیف کردہ، سیرت رسول میں، رسولِ خدا کو، اس تباہ کن حکم پر، مکی دور میں، عمل پیرا، ظاہر کرتے ہیں، حالانکہ مکی دور میں، انھیں، نہ تو "تمکن فی الارض" ہی حاصل تھا اور نہ "آزاد مملکت" قائم تھی، اور نہ انھیں "استخلاف فی الارض" ہی کی نعمت ہی ملی تھی۔

> مخالفین، آپؐ کے قبیلہ کی پوزیشن کے پیشِ نظر، آپؐ پر دست درازی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے وہ کمینہ حرکات پر، اتر آئے، وہ آپؐ کے راستوں میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت، ہنسی اڑاتے، حضور سجدے میں جاتے، تو نجاست کا ڈھیر اوپر ڈال دیتے، باہر تشریف لیجاتے، تو شریر لڑکوں کا غول پیچھے لگا دیتے، آپ کسی مجمع میں دعوت اسلام دیتے تو ابولہب برابر چلاتا جاتا کہ یہ (معاذ اللہ) جھوٹ کہتا ہے۔ [1]

---

[1] معراج انسانیت، صفحہ ۱۳۴ + معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۲۴۴

اب یہ بات بالکل واضح ہے، کہ --- اگر اقامت صلوٰۃ کا عمل، آزاد مملکت کے بغیر، تباہی اور بربادی کی طرف لیجانے والا عمل ہے" --- تو خدا کا ایسا حکم دینا، اور نبیؐ وصحابہؓ کا اس پر عمل پیرا ہونا، غلط قرار پاتا ہے، ورنہ اس کے برعکس، موقفِ پرویز کو ہی باطل کہنا پڑتا ہے، ایک طرف، خدا اور رسول اور صحابہ ہیں، اور دوسری طرف، ان کے مدمقابل، ہمارے دور کے "مفکر قرآن" ہیں، کس کی بات غلط قرار دیجائے؟ خود سوچ لیجئے کہ ؏ تجھی پہ چھوڑ دیا فیصلہ موت وحیات

اقامتِ صلوۃ، اقتدار کے بغیر بھی کیوں؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے اور خدا خوفی کے زیر سایہ زندگی گزارنے کے لیے، اللہ کی یاد اور تعلق باللہ، اہم کردار ادا کرتے ہیں، اللہ کی یاد کی عملی اور مؤکد شکل، نماز ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃ لِذِکْرِی اِسے قائم کرنا، ہر حال میں لازم ہے، خواہ اقتدار اور آزاد مملکت حاصل ہو، یا نہ ہو، انابت الی اللہ، ذکر اللہ، اور تقویٰ وہ قلبی اعمال ہیں، جن کی ظاہری شکل نماز ہے، اور جب تک نماز موجود ہے، انسان راجع اِلی اللہ اور زیر سایۂ خوفِ خدا رہتا ہے، اسی حقیقت کو، اللہ تعالیٰ نے، اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔

مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (الروم-۳۱) (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور ڈرو اس سے، اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس، آیت کے تحت، سید مودودیؒ نے ایسا مؤثر اور خوبصورت حاشیہ لکھا ہے جو قلبِ سلیم اور دلِ منیب پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

> اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع (مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ) اور اس کے غضب کا خوف (وَاتَّقُوْہُ) ، دونوں قلب کے افعال ہیں اور اس قلبی کیفیت کو، اپنے ظہور اور استحکام کے لیے، لازماً کسی ایسے جسمانی فعل کی ضرورت ہے، جس سے خارج میں بھی، ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص واقعی، اللہ وحدہ لاشریک کی طرف آیا ہے، اور آدمی کے اپنے نفس میں بھی، اس رجوع وتقویٰ کی کیفیت کو، ایک عملی ممارست کے ذریعہ سے، پے در پے نشوونما نصیب ہوتا چلا جائے، اسی لیے، اللہ تعالیٰ، اس ذہنی تبدیلی کا حکم دینے کے بعد، فوراً ہی، اس جسمانی عمل یعنی اقامت صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے، آدمی کے ذہن میں جب تک کوئی خیال، محض خیال کی حد تک رہتا ہے، اس میں استحکام اور پائیداری نہیں ہوتی، اس خیال کے ماند پڑ جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے اور بدل جانے کا بھی امکان ہوتا ہے، لیکن جب وہ اس کے مطابق کام کرنے لگتا ہے تو وہ خیال، اس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے، اور جوں جوں وہ اس پر عمل کرتا جاتا ہے اس کا استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس عقیدہ وفکر کا بدل جانا یا ماند پڑ جانا، مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے، اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو رجوع الی اللہ اور خوفِ خدا کو مستحکم کو کرنے کے لیے، ہر روز، پانچ وقت پابندی کے ساتھ، نماز ادا کرنے سے بڑھ کر، کوئی عمل کارگر نہیں ہے کیونکہ دوسرا جو عمل بھی ہو، اس کی نوبت دیر دیر سے آتی ہے یا متفرق صورتوں میں، مختلف مواقع پر آتی ہے لیکن نماز ایک ایسا عمل ہے جو ہر چند گھنٹوں کے بعد، ایک ہی متعیّن صورت میں، آدمی کو دائماً کرنا ہوتا ہے، اور اس میں ایمان واسلام کا وہ پورا سبق، جو قرآن نے اسے پڑھایا ہے، آدمی کو بار بار دہرانا ہوتا ہے تا کہ وہ

اسے بھولنے نہ پائے، مزید براں کفار اور اہل ایمان، دونوں پر یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ انسانی آبادی میں سے کس کس نے بغاوت کی روش چھوڑ کر، اطاعتِ رب کی روش اختیار کر لی ہے، اہل ایمان پر اس کا ظہور اس لیے درکار ہے کہ ان کی ایک جماعت اور سوسائٹی بن سکے، اور وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں، اور ایمان و اسلام میں سے جب بھی ان کے گروہ کے کسی شخص کا تعلق ڈھیلا پڑنا شروع ہو جائے، اسی وقت کوئی کھلی علامت فوراً ہی تمام اہل ایمان کو اس کی حالت سے باخبر کر دے، کفار پر اس کا ظہور اس لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر کوئی سوئی ہوئی فطرت، اپنے ہم جنس انسانوں کو خداوند حقیقی کی طرف بار بار پلٹتے دیکھ کر جاگ اٹھے، اور جب تک وہ نہ جاگے ان پر خدا کے فرمانبرداروں کی عملی سرگرمی دیکھ کر، دہشت طاری ہوتی رہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے بھی، اقامتِ صلوٰۃ ہی سب سے زیادہ موزوں ذریعہ ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہئے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا یہ حکم، مکہ معظمہ کے اس دور میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں کی ایک مٹھی بھر جماعت، کفارِ قریش کے ظلم وستم کی چکی میں پس رہی تھی، اور اس کے بعد بھی نو برس تک پستی رہی، اس وقت دور دور بھی کہیں اسلامی حکومت کا نام ونشان تک نہ تھا، اگر نماز، اسلامی حکومت کے بغیر بے معنٰی ہوتی، جیسا کہ بعض نادان سمجھتے ہیں، یا اقامتِ صلوٰۃ سے مراد ''نماز قائم کرنا'' سرے سے ہوتا ہی نہیں، بلکہ ''نظامِ ربوبیت'' چلانا ہوتا جیسا کہ منکرینِ سنت کا دعوٰی ہے تو اس حالت میں، قرآن مجید کا یہ حکم دینا آخر کیا معنٰی رکھتا ہے؟ اور یہ حکم آنے کے بعد، نو سال تک نبی ﷺ اور مسلمان، اس حکم کی تعمیل، آخر کس طرح کرتے رہے؟ [۱]

(۲) زکوٰۃ

زکوٰۃ سے کیا مراد ہے؟ یہ وہ مخصوص مقدارِ مال ہے، جو اسلامی مملکت، مسلم اغنیاء سے وصول کرتی ہے اور اسے امت مسلمہ کے اہل حاجت کی طرف لوٹا دیتی ہے تاکہ ان کی ضروریات بھی پوری ہوں، اور وہ بھی معاشی خوشحالی کی طرف گامزن ہو سکیں، چودہ صدیوں پر مشتمل اسلامی ادب، زکوٰۃ کا یہی مفہوم، تواتر اور تسلسل کے ساتھ پیش کرتا رہا ہے، چونکہ زکوٰۃ کا یہ مفہوم، بجائے خود، فاضلہ دولت کی شخصی ملکیت کا بیّن ثبوت ہے، اس لیے ''مفکرِ قرآن'' کو، اصطلاحِ ''زکوٰۃ'' سے یہ مفہوم خارج کرنے کے لیے، اور اس کی جگہ، نیا مفہوم داخل کرنے کے لیے خاصی کوہ کنی کرنی پڑی ہے، نئے دور میں ''زکوٰۃ'' کا ماڈرن مفہوم، اب کمیونزم اور مارکسزم سے ہم آہنگ ہو کر رہ گیا ہے، چنانچہ ''مفکرِ قرآن'' فرماتے ہیں۔

قرآن کے پیش کردہ معاشی نظام کی رو سے مملکت کی ساری آمدنی ''زکوٰۃ'' ہے کیونکہ اسے نوعِ انسانی کی نشو ونما کے لیے صرف کیا جاتا ہے، (ایتائے زکوٰۃ کے معنی نشو ونما دینا ہوتا ہے)، جسے آج کل زکوٰۃ کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کا ذکر تک نہیں ہے۔[۲]

اس اقتباس میں، ہمارے ''مفکرِ قرآن'' نے جسے قرآن کریم کا پیش کردہ معاشی نظام کہا ہے، وہ دراصل قرآن کریم کا معاشی نظام ہے ہی نہیں، بلکہ وہ، قرآن کی طرف منسوب کردہ، اُن کا اپنا طبعزاد نظام ہے، جو کمیونزم اور مارکسزم ہی سے ماخوذ ہے، وہ مزید فرماتے ہیں۔

[۱] تفہیم القرآن، جلد ۳، (سورۃ الروم، حاشیہ ۵۰) صفحہ ۷۵۴
[۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۸ (برحاشیہ)

مملکت میں تمام کا سب افراد، ان کاموں کو، جو ان کے سپرد کیے جائیں گے اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق پوری تندہی سے انجام دیں گے، اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر فاضلہ، اس نظام کی سنٹرل اتھاریٹی (مرکز ملت) کی تحویل میں دے دیں گے تاکہ وہ اس سے، ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کا انتظام بھی کرے جو اپنی ضروریات خود پوری کرنے کے قابل نہ ہوں، اس کے علاوہ، وہ مملکت، افرادِ معاشرہ کی مناسب تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرے جس سے وہ اس قابل ہو جائیں، کہ اپنی ذات کی نشوونما کر سکیں، اس اعتبار سے آپ، آج کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ، اسلامی حکومت کی جملہ آمدنی (Revenue) کو کہا جائے گا اور اسے اس لیے زکوٰۃ کہا جائے گا کہ اس آمدنی کا مقصد، افرادِ معاشرہ کی نشوونما ہوگا۔ [1]

ماڈرن مفہوم زکوٰۃ اور لغوی انحرافات

اس ماڈرن مفہوم کی رو سے، اب زکوٰۃ، وہ مخصوص مقدارِ مال نہ رہی، جو ایک مسلمان فرمانِ خداوندی کے مطابق، اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر، اپنے عفو المال میں سے نکال کر، نظمِ اجتماعی کے حوالے کرتا ہے بلکہ اب وہ سارے کا سارا عفو المال ''زکوٰۃ'' قرار پا گیا جو افراد کی شخصی ملکیت میں رہنے کی بجائے، مملکت کی تحویل میں رہے گا، قرآنی ''زکوٰۃ'' میں یہ مفہوم گھسیڑنے کے لیے، عربی لغات کو کھنگالا گیا، اور بہت سے صُغروں کُبروں کو ملا کر، زکوٰۃ کا یہ مفہوم ایجاد کر ڈالا گیا۔

زَكَا الْمَالُ وَالزَّرْعُ يَزْكُوا وَاَزْكٰى - جانوروں کا اور کھیتی کا پھلنا پھولنا، بڑھنا، نشوونما پانا۔ اَزْكَى اللّٰهُ الْمَالَ وَزَكَّاهُ - خدا نے مال کو نشوونما دی اور بڑھایا۔ زَكَا الرَّجُلُ يَزْكُو - آدمی، آسودہ اور خوش حال ہو گیا، اس کی صلاحیتوں میں نشوونما آ گئی، اس کی زندگی سرسبز و شاداب ہو گئی۔

لہٰذا زکوٰۃ کے بنیادی معنٰی نشوونما پانا، بڑھنا، پھلنا، پھولنا ہیں۔ راغب نے یہ معنٰی لکھ کر اس کی مثال میں قرآن مجید کی یہ آیت، درج کی ہے فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا (۱۹/۱۸) ''دیکھو کہ کونسا کھانا حلال اور خوش انجام ہے'' یعنی جس میں نشوونما دینے کی زیادہ صلاحیت ہے، جو زیادہ (Nutritious) ہے۔ [2]

''مفکرِ قرآن'' کی اس لغوی تحقیق میں کم از کم تین پہلوؤں سے انحراف بالکل واضح ہے۔

اولاً ---- لفظ ''زکوٰۃ'' کے بنیادی معنوں میں، جس طرح، ''افزائش و نشوونما'' کا مفہوم پایا جاتا ہے، بالکل اُسی طرح ''طہارت و صلاح'' کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے، لیکن چونکہ ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کو، یہ دوسرا مفہوم قابلِ قبول نہیں تھا، اس لیے انھوں نے، اُسے پایۂ ثقاہت سے گرا دینے کے لیے، اس مفہوم کی ایسی کمزور اور لایعنی بلکہ شاید من گھڑت توجیہ پیش کی کہ ایک اوسط درجے کا قاری بھی، اسے تسلیم نہ کر پائے، اور یہی ان کا مطمحِ نظر تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں، کہ

زکوٰۃ کے معنٰی ہیں نشوونما پانا، بڑھنا، پھلنا پھولنا، بالیدگی۔ اس کے معنی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں غالباً اس لیے کہ درختوں کی نشوونما کے لیے ان کی شاخ تراشی کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہ اس کے بنیادی معنٰی نہیں ہیں۔ [3]

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۲۰۷ تا صفحہ ۲۰۸ [2] + [3] لغات القرآن، صفحہ ۸۰۸

معلوم نہیں کہ "مفکر قرآن" کو کس طرح کلیجہ تھام کر، یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ --- "زکوٰۃ کے معنٰی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں" --- لیکن اس کے ساتھ ہی، یہ بے بنیاد دعویٰ بھی کر ڈالا کہ --- "یہ اس کے بنیادی معنٰی نہیں ہیں" --- اور پھر اس کی توجیہ میں، ایسی بیکار سخن سازی کی ہے کہ "درختوں کی نشوونما" کے پیشِ نظر، ان کی "شاخ تراشی" کے عمل میں، اور "پاکیزگی" میں کوئی معنوی ربط سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔

ثانیاً ----- علاوہ ازیں، زکوٰۃ کے مفہوم کے تعین میں، ایک اور چیز کو بھی، ہمارے "مفکر قرآن" نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اور وہ یہ کہ مال، کھیتی وغیرہ (جن کی مثالیں دے کر، انھوں نے، زکوٰۃ بمعنٰی "بالیدگی ونشوونما" کو اجاگر کیا ہے) بے جان اشیاء ہیں، کجا یہ کہ یکے از جاندار مخلوق ہونے کے باعث، اپنا اخلاقی واعتقادی وجود رکھتی ہوں، جب کہ انسان، اول و آخر، ایک اخلاقی واعتقادی تشخص کا حامل ہے، اس لیے جب زکوٰۃ کے مادہ سے کوئی مشتقہ فعل، مال یا کھیتی کے لیے آئے، تو وہاں اس کے معنٰی یقیناً "نشوونما، بالیدگی اور پھلنا پھولنا" ہی ہوں گے، کیونکہ ان چیزوں میں اخلاقی طور پر "خیر وصلاح" اور اعتقادی لحاظ سے، "طہارت و پاکیزگی" کا مفہوم ہو ہی نہیں سکتا لیکن جب انسان کے متعلق کہا جائے، زَكَا الرَّجُلُ تو اس کا معنٰی "صلاح وطہارت" ہی کی نسبت سے کیا جائے گا (نہ کہ طبعی نشونما اور "جسمانی بالیدگی" کی نسبت سے) کیونکہ ایک اخلاقی و اعتقادی وجود میں، جو "افزائش اور بالیدگی ونمو" پایا جائے گا، اس کا تعلق بھی، اس کی "طہارت و پاکیزگی" اور "صلاح وخیر" ہی سے ہوگا (نہ کہ "طبعی افزائش" اور "جسمانی بالیدگی" سے جو صرف، غیر اخلاقی اور غیر اعتقادی وجود ہی میں متحقق ہوتی ہے) یہی وجہ ہے کہ کتب لغات میں بے جان اشیاء یا غیر انسانی مخلوق کے لیے، زَكَا يَزْكُو کے مفہوم میں، غالب معنٰی افزائش ونمو کا ہوتا ہے، نہ کہ طہارت وصلاح کا، جبکہ انسان کے لیے استعمال ہونے کی صورت میں، اس فعل کے مفہوم میں "طہارت وصلاح" کا مفہوم ہی غالب ہوگا (نہ کہ "طبعی افزائش" یا "جسمانی بالیدگی" کا مفہوم)۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے "مفکر قرآن" نے، اپنی لغوی تحقیق میں، یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

ثالثاً ----- "مفکر قرآن" نے اپنی لغوی تحقیق کے دوران، یہ فرمایا ہے کہ --- "............ لہٰذا زکوٰۃ کے بنیادی معنٰی نشوونما پانا، بڑھنا، پھلنا، پھولنا ہیں، راغب نے یہ معنٰی لکھ کر، اس کی مثال میں قرآن مجید کی یہ آیت درج کی ہے: فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا (۱۹/۱۸)" --- یہ قطعی غلط ہے۔ امام راغب نے قولُهُ : اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا سے پہلے قومہ (،) نہیں، بلکہ خاتمۂ جملہ کی علامت، جسے انگریزی میں (Ful-stop) کہتے ہیں (یعنی نقطہ . کی علامت) لگا کر، نئے سرے سے اس جملے کا آغاز کیا ہے، جو اپنے مابعد والے جملہ سے متعلق ہے نہ کہ ماقبل والے فقرہ سے، امام راغب کی پوری عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

زكا : اَصل الزكوٰة النموُّا لحاصل عن بركة الله تعالىٰ، ويعتبر ذالك بالامور الدنيويّة والاخروية، يقال زكا الزَّرْعُ يَزْكُو اذا حَصَل منه نموٌّ وبركة، وقولهُ: (اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا) اشارة الى مايكون حلالاً لا يُستوخَمُ

عقباه ومنه الزكاة لما يخرجُ الانسان من حق الله تعالىٰ إِلىَ الفقراء وتسميتهٔ بذالک لما يكون فيها من رجَاء البركة او لتزكية النفس [1]

ز - ک - حرف علت، زکاۃ کی اصل، وہ افزائش ہے جو اللہ کی برکت سے حاصل ہو، اور اس کا اعتبار دنیاوی اور اخروی دونوں قسم کے امور میں کیا جاتا ہے، جب کھیتی میں نمو اور برکت حاصل ہو تو کہا جاتا ہے کہ زَکَا الزَّرْعُ یَزْکُو ۔اور اللہ کا یہ فرمان اَیُّھَا اَزْکٰی طَعَاماً ''کونسا کھانا پاکیزہ ہے'' ایک اشارہ ہے، اس چیز کی طرف، جو حلال ہو، اور جس کے کھانے سے انجام، مضر اور ناموافق نہ ہو جائے، اور اسی سے وہ ''زکاۃ'' ہے، جو انسان، (اپنے مال میں سے) بطورِ حق باری تعالیٰ، نکال کر فقراء (وغیرہ) کو دیتا ہے، اور اس کا یہ نام ''زکوٰۃ'' اس لیے ہے کہ اس میں، امید برکت اور تزکیہ نفس پایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں، لفظ زکوٰۃ کی وضاحت میں، امام راغب کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ --- ''اسی سے زکوٰۃ ہے، جو انسان اپنے مال سے بطورِ حق اللہ نکالتا ہے، اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس سے یا تو مال میں برکت ہوتی ہے یا نفسِ انسانی میں طہارت و پاکیزگی پیدا ہوتی ہے'' --- یہ عبارت، چونکہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے لیے مفیدِ مطلب نہ تھی، اس لیے اسے نظر انداز کر دیا، کیونکہ انھیں زندگی بھر مفیدِ مطلب (نہ کہ مفیدِ حق وصدق) اشیاء ہی کی تلاش وجستجو رہی، جہاں، انھیں رائی کے برابر بھی، ایسی کوئی چیز مل گئی، اسے پہاڑ بنا کر پیش کر دیا، تاہم جہاں، انھیں ایسی کوئی چیز نہ ملتی تھی، تو وہ گھبرایا نہیں کرتے تھے، بلکہ رائی کے بغیر ہی پہاڑ بنا ڈالا کرتے تھے، لیکن جہاں کوئی چیز، پہاڑ کے برابر، خلافِ مطلب نظر آئی، وہاں ''حیاء'' سے اپنی آنکھیں بند کر لیں (جیسا کہ یہاں کیا گیا ہے)۔ یہ تھا، ''مفکرِ قرآن'' کی ''قرآنی تحقیق کا انداز'' جس پر، وہ عمر بھر قائم رہے۔

ایک بے بنیاد دعوے

رہا ان کا یہ فرمان کہ --- ''طہارت و پاکیزگی کا معنیٰ زکوٰۃ کے بنیادی مفہوم میں شامل نہیں ہے'' --- تو یہ ایک قطعی غلط بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''نشوونما و بالیدگی'' اور ''صلاح وطہارت'' دونوں ہی اس لفظ کے بنیادی مفہوم میں شامل ہیں۔ دیگر لغات کو تو چھوڑیئے ایک طرف، جن کتب لغات کی مدد سے ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے ''لغات القرآن'' کو مرتب کیا ہے، ان میں معجم مقاييس اللغة بھی شامل ہے جس میں، یہ عبارت موجود ہے۔

(زكى) اَلزَّاء والكَاف وَالْحَرْفُ الْمُعْتَلُّ اَصلٌ يَدُلُّ عَلىٰ نَمَاءٍ وَّ زِيَادَةٍ وَيُقَالُ الطَّهَارَةُ زَكَاةُ الْمَالِ ۔ قَالَ بَعْضُهُم سميت بذالک لانها مما يرجىٰ به زكَاءُ الْمَالِ وَهُوَ زِيَادَتُهٗ وَنَمَا ئُهٗ وَقَالَ بَعْضُهُمْ سميت زكوٰةً لِاَنَّهَا طَهَارَةٌ قالوا وحجة ذالک قوله جلَّ ثناء ہٗ ۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا والاصل فى ذالک راجع الى هٰذَيْنِ الْمَعْنَيَيْنِ وَهُمَا النَمَآءُ والطهارةُ [2]

زکوٰۃ - زاء، کاف اور حرفِ علت، اس کا مادہ ہے جو نماء اور افزائش پر دلالت کرتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا کہ طہارت بھی زکوٰۃِ مال ہے، بعض علماء لغت کے نزدیک، زکوٰۃ کو زکوٰۃ کا نام، اس لیے دیا گیا کہ اس فعل سے ''افزائشِ مال اور نمائے زر'' کی امید کی

---

[1] المفردات للراغب، صفحہ ۲۱۳ [2] معجم مقاييس اللغة لابن فارس، جلد ۳، صفحہ ۱۷

جاتی ہے، جبکہ دیگر علماء کے نزدیک، طہارت و پاکیزگی کے پیش نظر، اسے زکاۃ کا نام دیا گیا ہے، ان کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے کہ خُذمِنْ اَمْوَالهم صَدَقَةً تطهّرهم و تزكيهم بها (التوبہ-١٠٣) ''ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کر دیں اور نیکی کی راہ میں ان کی نشوونما کرتے رہیں''۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادے میں ''بالیدگی اور افزائش'' اور ''طہارت و صلاح'' کے دونوں ہی مفہوم پائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد، ابنِ منظور کی لسان العرب کی یہ عبارت بھی ملاحظہ فرمایئے، یاد رہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب نے لغات القرآن کی تالیف و ترتیب میں، لسان العرب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ علامہ ابن منظور بھی زکوۃ کے معانی میں ''نشوونما'' کے علاوہ ''طہارت و صلاح'' کا معنی بیان کرتے ہیں۔

اَلزَّكَاةُ : اَلْاِصْلَاحُ .... زَكَّاهُ اللهُ وَزَكَّا نَفْسَهُ تَزْكِيَةً : مَدَحَ .... وَزَكّٰى الرَّجُلُ نَفْسَهُ اِذَا وَصَفَهَا وَاَثْنٰى عَلَيْهَا ۱

الزکوۃ، صلاح ہے .... زَكَّاهُ اللهُ وَزَكَّا نَفْسَهُ تَزْكِيَةً کا معنیٰ ہے کہ اللہ نے اس کی اصلاح کی اور اس نے اپنے نفس کو سنوارا یا اس کی تعریف کی .... وَزَكّٰى الرَّجُلُ نَفْسَهُ کا معنیٰ ہے کہ --- ''آدمی نے اپنے آپ کی تعریف کی، یا اپنی اصلاح کی''۔

وَقَالَ تعالىٰ : خَيْراً مِنْهُ زَكٰوةً اي خَيْراً مِنْهُ عَمَلاً صَالِحاً وقال الفرّاء زكٰوةً صَلَاحًا وَ كذالك قوله عَزَّوَجَلَّ : حَنَانًا مِنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً قَالَ صَلَاحًا قال ابوزيد النحويُّ فِي قولِهِ عَزَّوَجَلَّ : وَلَوْلَا فضل الله عليكم ورحمته مَازَكَامِنكم من اَحدٍ ابداً وَّ قُرِئَ مَازَكّٰى منكم فَمَنْ قَرَءَ مَازَكٰى فمعناه مَاصَلُحَ مِنكم وَمَنْ قَرَءَ مَازَكّٰى فَمَعْنَاهُ مَااَصْلَحَ وَلٰكن الله يزكّى من يشاء اى يُصلِحُ ۲

ارشادِ خداوندی خیرا منه زکوۃ کا معنی ہے کہ ''عمل صالح کے اعتبار سے بہتر'' اور فرّاء نے کہا ہے کہ ''زکوۃ، صلاح ہے'' اسی طرح، فرمانِ ایزدی ہے حَنَانًا مِنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً یعنی ''ہماری طرف سے نرم دل اور صاحب صلاح''۔ ابوزید نحوی نے اس فرمان باری تعالیٰ کے متعلق کہا ہے کہ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ میں بعض لوگوں نے مَا زَكَا پڑھا، تو معنیٰ یہ ہوا کہ ''تم میں سے وہ صاحبِ صلاح نہ ہوا'' اور جس نے مَازَكّٰى پڑھا تو معنیٰ یہ ہوا کہ --- ''بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے، اس کا تزکیہ کرتا ہے''، یعنی ''اصلاح کرتا ہے''۔

چونکہ عام لوگوں کو، الفاظ کی لغوی تحقیق سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، اس لیے، ہم انھی دو کتب کے حوالوں پر اکتفاء کرتے ہیں ورنہ کوئی کتاب لغت ایسی نہیں ہے جس میں ''زکوۃ'' کے مفہوم میں ''نشوونما'' کے علاوہ ''طہارت و صلاح'' کے معنی کو بنیادی معانی میں شامل نہ کیا گیا ہو۔

لفظ زکوۃ اور جدید و قدیم مفاہیم پرویز

اس کے بعد، اب یہ ملاحظہ فرمایئے کہ پرویز صاحب پر جوں جوں اشتراکیت کا رنگ گہرا اور تیز ہوتا چلا گیا، وہ الفاظ

۱ + ۲ لسان العرب، جلد ۱۴، صفحہ ۳۵۸

کے قالب میں سے کس طرح، سابقہ مفہوم کو خارج کر کے، ان میں بالکل نئے نرالے اور خودساختہ معانی و مفاہیم داخل کرتے چلے گئے، مثال کے طور پر، اسی لفظ زکوٰۃ اور اس کے قرآنی مشتقات کے سابقہ اور جدید مفاہیم پر ایک نظر ڈال لیجئے، سب کچھ واضح ہو جائے گا۔

۱ --- فَلْيَنظُرْ أَيُّهَآ أَزْكَىٰ طَعَامًا (سورۃ الکہف-آیت ۱۹)

قدیم ترجمہ: ''جا کر دیکھے کس کے ہاں اچھا کھانا ملتا ہے'' (معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۹۶ سال اشاعت، جولائی ۱۹۳۵ء)

جدید ترجمہ: ''(ایسا کھانا) جو زیادہ (Nutritious) ہے'' (لغات القرآن، صفحہ ۸۰۸ سال اشاعت، اکتوبر ۱۹۶۰ء)

''مفکرِ قرآن'' کے ماڈرنزم کی انتہا ہے کہ اَزْکٰی طعاما کا ترجمہ و مفہوم ''(ایسا کھانا) جو زیادہ (Nutritious) ہے''، کیا ہے جو اس تصور پر مبنی ہے کہ دورِ نزولِ قرآن سے بھی بہت پہلے، اصحابِ کہف کے زمانہ میں، گویا، جگہ جگہ غذائی تجزیہ (Food Analysis) کی معملات (Laboratories) موجود تھیں، اور کھانا لانے والے پر لازم تھا کہ وہ ایسا کھانا لائے، جو غذائیت سے بھرپور ہو، اور جس میں لحمیات (Proteins)، حیاتین (Vitamins)، نشاستہ (Starch or Carbohydrates)، نمکیات (Minerals)، اور روغنیات (Oils & Fats) وغیرہ کی نہایت متوازن مقدار موجود ہو۔

....

۲ --- أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ (الکہف-آیت ۷۴)

قدیم ترجمہ: ''آپ نے ایک بیگناہ کی جان لے لی حالانکہ اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی'' (معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۳۸۱، جولائی ۱۹۳۵ء)

جدید ترجمہ: ''آپ نے کیا کیا؟ ایک پلے پلو سے لڑکے کو یونہی قتل کر دیا'' (مفہوم القرآن، جلد ۲، صفحہ ۶۷۵، سال اشاعت ندارد)

شاید بوقتِ قتل، صاحبِ موسیٰ کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور انھیں نظر نہ آیا، کہ وہ ایک ''پلے پلو سے'' لڑکے کو قتل کر رہے ہیں، ورنہ وہ شاید، اس ''ہٹے کٹے لڑکے کی بجائے، کسی ایسے لڑکے کو اپنی مشق آزمائی کے لیے چنتے، جو ''پلا پلوسا'' نہ ہوتا۔

....

۳ --- لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (سورہ مریم-آیت ۱۹)''

قدیم ترجمہ: ....کہ تجھے ایک پاک فرزند دے دوں'' ---معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹، سال اشاعتِ کتاب، جولائی ۱۹۳۵ء

جدید ترجمہ: ''وہ تجھے عمدہ نشوونما یافتہ بچہ عطا کرے گا'' مفہوم القرآن، جلد ۲، صفحہ ۶۸۹،
سال اشاعت ندارد (جبکہ جلد اول، ۱۹۶۱ء میں چھپی)

....

۴ --- وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَوٰةِ فَاعِلُونَ (سورۃ المؤمنون-آیت ۴)

قدیم ترجمہ: ''جو زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں'' (معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۴۵۵، ۲ نومبر ۱۹۴۹ء- ۱۲ محرم ۱۳۶۹ھ)
جدید ترجمہ: ''وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے جس سے تمام نوعِ انسانی کو نشو ونما کا سامان بہم پہنچتا ہے''۔
مفہوم القرآن، صفحہ ۷۷۳، سالِ اشاعت ندارد

....

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لفظ زکوٰۃ سے ''طہارت و پاکیزگی، صلاح و خیر، اور توصیف و اِثناء کے اُن حقیقی مفاہیم سے، محض اپنے جدید مفاہیم کی خاطر، کس طرح گریز کیا گیا ہے، جو سابقہ تراجم میں مسلّم چلے آ رہے تھے، نیز یہ بھی کہ ماڈرن مفاہیم میں تجدد پسندی کی اس روش کے باعث، کسقدر تکلف کیا گیا ہے، اور جو معانی برآمد کیے گئے ہیں، وہ اصل سے کس قدر بُعد رکھتے ہیں۔

زکوٰۃ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

علاوہ ازیں، یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے، کہ ''زکوٰۃ'' یا ''الزکوٰۃ'' قرآن پاک کی مخصوص اصطلاح ہے، اس کے یکے از اصطلاحاتِ قرآن ہونا، خود ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کو بھی مسلّم تھا، انھوں نے ایک مقام پر یہ لکھا کہ:

> قرآن کریم نے .... الزّکوٰۃ کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ [1]

اب یہ بات، اہل علم تو درکنار، معمولی سمجھ بوجھ والا آدمی بھی جانتا ہے، کہ الفاظ کے اصطلاحی اور لغوی مفہوم میں بڑا فرق و تفاوت ہوا کرتا ہے، جب کوئی لفظ، ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر، مستعمل ہوتا ہے، تو اس میں لغوی مفہوم سے انتہائی بُعد، بلکہ مغائرت تک پیدا ہو جاتی ہے، اس بناء پر، اس اصطلاح کا مفہوم، اس نظام، نظریئے، فن یا شخصیت کے حوالے سے متعیّن کیا جائے گا، جس کے ہاتھوں وہ اصطلاح اختیار کی گئی ہے، یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا خود، پرویز صاحب کو بھی اقرار و اعتراف تھا، چنانچہ انھوں نے خود ایک مقام پر یہ لکھا ہے کہ:

> جب کوئی لفظ، اصطلاح کی شکل میں مستعمل ہونے لگ جائے، تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے، اس کے بعد آپ جب بھی اس لفظ کا استعمال کریں گے وہ اپنے ان تمام مضمرات و لزومات کو، اپنے ساتھ لائے گا جن سے وہ نظریہ یا نظام عبارت ہے جس کے لیے وہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ [2]

اب اس کے بعد، ''مفکرِ قرآن'' کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیے، کہ وہ ''الزکوٰۃ'' کو قرآنی اصطلاح بھی مانتے ہیں، پھر یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ --- ''جب کوئی لفظ اصطلاح کی شکل میں، مستعمل ہونے لگ جائے، تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے'' --- پھر وہ، اس قرآنی اصطلاح --- زکوٰۃ --- کے مفہوم کے تعیّن کے لیے، کتب لغات کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۲۰۲
[2] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۴۴

ورق گردانی کے نتیجہ میں، کہیں کی اینٹ، اور کہیں کا روڑا لے کر، وہ نئے معانی کا کنبہ جوڑتے ہیں، ہمارے نزدیک، یہ ساری کارروائی، جس میں قرآنی اصطلاحات کا مفہوم از ورئے کتبِ لغات، متعیّن کرنے کی کوشش، پرویز صاحب عمر بھر کرتے رہے ہیں، یہ سب کچھ اگر فریب دہی نہیں تو فریب خوردگی ضرور ہے۔

بہرحال، زکوٰۃ، ایک قرآنی اصطلاح ہے، شارع نے نظامِ اسلام سے اسے وابستہ کرتے ہوئے، جو معنیٰ و مفہوم، اس میں ودیعت کیا ہے، اور معاشیاتِ اسلام سے وابستگی کی بناء پر، جو لزومات و مضمرات، اس میں سموئے ہوئے ہیں، ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، کتبِ لغات کی بنیاد پر کھینچ تان کرکے، مارکسزم کی فکری و ذہنی غلامی کے زیرِ اثر، نئے معانی داخل کرنا، سخت بیجا حرکت ہے، پرویز صاحب کی عمر بھر کی ''قرآنی خدمات'' کا ماحصل یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کی ایک ایک اصطلاح کو لے کر، اشتراکی تہذیب کی فکری اسیری میں مبتلا ہو کر، کتبِ لغات کے نام پر، ان میں نئے معانی داخل کیے ہیں۔

لیکن پھر بھی زکوٰۃ لغوی اور اصطلاحی مفہوم کا مجمع البحرین

اگرچہ زکوٰۃ کے لغوی مفہوم میں ''بالیدگی ونشوونما'' اور ''طہارت وصلاح'' دونوں داخل ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر، خود شارع نے زکوٰۃ کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ مال و دولت میں سے، یہ وہ مخصوص مقدار ہے جو ملتِ اسلامیہ کے صاحبِ ثروت افراد سے وصول کرکے، امت کے مفلس اور حاجتمند افراد کو لوٹائی جاتی ہے، شارع نے مختلف النوع اموال کے لیے جداگانہ نصاب مقرر فرمائے ہیں، زکوٰۃ کے عملی پروگرام میں، حصہ لیتے ہوئے، خود افرادِ امت کے ہاں، اس کا لغوی مفہوم بھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ زکوٰۃ، اس لیے دیتے ہیں کہ ان کے مال میں بالیدگی ونشوونما، اور ان کے نفوس میں طہارت وصلاح پیدا ہو، اُن کے قلب و ذہن، بخل، زرپرستی اور حُبّ مال اور فریفتگیٔ دنیا جیسی صفاتِ رذیلہ سے پاکیزگی وطہارت پالیں، اور ایثار و قربانی، ہمدردی و غمگساری، فیاضی و سخاوت، رحم دلی اور انسان پروری کی صفاتِ حسنہ کی ان میں افزائش ونشوونما ہو، دوسری طرف، نظامِ زکوٰۃ کی بناء پر، اہلِ حاجت اور نادار طبقوں کو، جو امداد بصورتِ مال یا بصورتِ جنس (Help in cash or kind) اہلِ ثروت کی طرف سے ملتی ہے، اسے پاکر، ان افراد کے قلوب ونفوس، مالدار طبقے کے خلاف، حسد، کڑھن، جلن اور احساسِ کہتری جیسی صفاتِ رذیلہ سے پاک ہو جاتے ہیں، اور ان کے قلوب و اذہان میں بھی، اہلِ ثروت کے ساتھ، خیرخواہی، خیرسگالی، اور باہمی احترام و اکرام کے جذبات کو افزائش اور بالیدگی میسّر آتی ہے، اس طرح مجموعی طور پر پورے معاشرے میں، مالی اعتبار سے قوی اور کمزور طبقوں میں، باہمی تعاون و اشتراکِ عمل کی فضا پھلتی پھولتی اور افزائش پذیر ہوتی ہے، اور یوں معاشرہ، طبقاتی کشمکش کے مفسدات سے دن بدن، نظامِ زکوٰۃ کی بدولت پاک ہوتا رہتا ہے، پس جب یہاں حال یہ ہے کہ زکوٰۃ کے اصطلاحی مفہوم پر، عمل پیرا ہونے میں لغوی مفہوم بھی، اس سے منفک نہیں ہوتا تو آخر اس بات کی کیا ضرورت پڑی ہے کہ زکوٰۃ کے لفظ سے، اس اصطلاحی مفہوم کو نکال باہر کیا جائے جو شارع نے خود اس میں داخل کیا ہے، اور اشتراکیت کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہوتے ہوئے،

حکومت کی جملہ آمدنی (Revenue) کا مفہوم، خواہ مخواہ، اس میں گھسیڑا جائے، لیکن ہمارے ہاں کے غلام فطرت ''مفکر قرآن'' صاحب کی ''قرآنی فکر'' کی معراج ہی یہ ہے کہ وہ قرآنی اصطلاحات کو، اصل معانی سے (جو شارع نے انھیں دے رکھے ہیں) مجرّد کر کے، لغت کی کتب کی بنیاد پر، مختلف صغرے اور کُبرے ملا کر، ان میں نئے خود ساختہ معانی داخل کیے جائیں، پرویز صاحب نے زکوٰۃ کی قرآنی اصطلاح کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے، اور خود شارع کے مقرر کردہ مفہوم کو ''مروجہ مفہوم'' کہہ کر مذاق اڑاتے رہے ہیں۔

زکوٰۃ کا مفہوم اصلی اور ''مفکر قرآن''

حالانکہ کل تک وہ خود، اسی شرعی اور مصطلحہ مفہوم کو مانتے رہے ہیں، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے واضح ہے۔

نبی اکرمؐ نے (اور حضورؐ کے اتباع میں خلفائے راشدین نے) جن یہود و نصاریٰ وغیرہ سے صلح کی تو ان کے معاہدات میں جزیہ کے مقاصد کی بھی تصریح فرما دی، ان معاہدات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زرِ جزیہ کے معاوضہ میں، ان لوگوں کو یہ حقوق حاصل تھے۔

(۱) کوئی شخص، ان پر حملہ آور ہوگا تو ان کی مدافعت کی جائے گی، اس میں ان کی جان و مال، کاروانِ تجارت اور دیگر مملوکہ اشیاء سب شامل ہیں۔

(۲) ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا، ان کے معابد کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

(۳) جو حقوق انھیں اس سے پہلے حاصل تھے وہ زائل نہیں کیے جائیں گے۔

(۴) ان سے عُشر وصول نہیں کیا جائے گا۔

اب دیکھیے، اس ٹیکس کی مقدار کیا تھی؟ اس کی عام شرح تین روپے، اور چھ روپے سالانہ تھی اور زیادہ سے زیادہ بیس روپے، اور اس سے بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے مرد، نیز تمام عورتیں، مفلوج، معطل العضو، نابینا، مفلس اور وہ تمام لوگ جو فوجی خدمت از خود قبول کر لیں، مستثنیٰ تھے، اس کے برعکس اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیے کہ مسلمانوں کو جبری فوجی ملازمت کے علاوہ، زکوٰۃ بھی دینی پڑتی تھی، یعنی اگر کسی مسلمان کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوتا اسے (اس وقت کی شرح کے مطابق) کم از کم اڑھائی ہزار روپیہ زکوٰۃ کا دینا پڑا، ساتھ ہی فوجی ملازمت بھی۔ اگر وہ غیر مسلم ہے تو اسے صرف بیس روپے ادا کرنے پڑے اور اس کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری دوسروں کے سر ہو گئی۔ [۱]

اس اقتباس میں، ایک لاکھ پر اڑھائی ہزار زکوٰۃ، عہدِ نبوی اور خلافت راشدہ کی وہی ''مروجہ زکوٰۃ'' ہے، جس کا ''مفکر قرآن'' استخفاف اڑاتے اڑاتے، سطح زمین سے، بطن ارض میں منتقل ہو گئے۔

مصارف زکوٰۃ

کل تک، پرویز صاحب، زکوٰۃ کے اسی اصطلاحی مفہوم کو مانتے رہے ہیں، جو چودہ صدیوں میں، ملتِ اسلامیہ میں،

[۱] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۶۸

ایک متفق علیہ مفہوم کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے مگر آج، اشتراکیت کا اسیرِ زلف ہونے کی بناء پر، انھوں نے اس مفہوم کی مخالفت کی، چنانچہ زکوٰۃ کے مصارف پر مشتمل آیات کے متعلق لکھا کہ:

> آج کل، ہمارے ہاں، ان مدّات کو زکوٰۃ کی مدّات سمجھا جاتا ہے جو صحیح نہیں، قرآن کریم کے پیش کردہ معاشی نظام کی رو سے مملکت کی ساری آمدنی، زکوٰۃ ہے، اسے نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے صرف کیا جاتا ہے (ایتائے زکوٰۃ کے معنیٰ نشوونما دینا ہیں) جسے آج کل زکوٰۃ کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ [1]

ایک اور مقام پر اسی آیت (یعنی سورہ التوبہ کی آیت ۶۰، جس میں مصارف زکوٰۃ مذکور ہیں) کے متعلق لکھتے ہیں۔

> یہ صدقات کے مصارف ہیں، جنھیں ہمارے ہاں، غلطی سے زکوٰۃ کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے۔ [2]

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں صدقات کا لفظ دو معانی میں استعمال ہوا ہے، اوّلاً، عام خیرات کے لیے، اور ثانیاً، زکوٰۃ کے لیے، لیکن آج ''مفکر قرآن'' نے لفظ ''صدقات'' کے مفہوم کو بھی بالکل بدل کر رکھ دیا ہے، آج ''صدقات'' سے کیا مراد ہے؟ پرویز صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:

مفہوم صدقات

> بعض اوقات، ہنگامی حالات، ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لیے بجٹ میں گنجائش نہیں ہوتی، مثلاً
>
> سیلاب، زلزلہ، جنگ وغیرہ، ان کے لیے ملت سے خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے، انھیں قرآن کریم نے صدقات سے تعبیر کیا ہے، سورۂ توبہ کی آیت (۶۰) میں جن مصارف کا ذکر ہے، وہ صدقات کے مصارف ہیں، زکوٰۃ کے نہیں''۔ [3]
>
> ہنگامی حالات کے لیے عطیات کو صدقات کہا جاتا ہے۔

آیت ۶۰ / ۹ اور اسلم جیراجپوری صاحب

صدقات سے مراد ''ہنگامی حالات کے عطیات'' ہیں یا زکوٰۃ؟ نیز سورۂ توبہ کی آیت (۶۰) میں جو فہرست مذکور ہے وہ مستحقینِ زکوٰۃ کی فہرست ہے یا ہنگامی عطیات کے حقداروں کی؟ اس کے حتمی فیصلہ کے لیے، ہم، بوجوہ، تاریخ الامت کا حوالہ پیش کر رہے ہیں۔

اولاً ----- اس لیے کہ اس کتاب کے مصنف، جناب اسلم جیراجپوری صاحب کو ''مفکر قرآن'' نے جا بجا اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔

ثانیاً ----- اس لیے، کہ اس کتاب کو ادارہ طلوعِ اسلام ہی نے شائع کیا ہے۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۸
[2] نظام ربوبیت، صفحہ ۲۸۴
[3] نظام ربوبیت، صفحہ ۴۱۸

ثالثاً ----- اس لیے کہ، اس کتاب کے متعلق یہ دعویٰ مذکور ہے کہ مصنف نے کتاب میں ''جو تحقیقی بات تھی، ثبت کردی'' (صفحہ ۱۲)۔

لہٰذا، اس کتاب کا اقتباس، وابستگانِ طلوعِ اسلام کے لیے، اتمام حجت کا درجہ رکھتا ہے، اب ملاحظہ فرمائیے، کہ آیت (۶۰/۹) میں مذکور مصارف کو، اسلم جیراجپوری صاحب، مصارفِ زکوٰۃ قرار دیتے ہیں؟ یا مصارفِ صدقات؟

> زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے، ایک مصرف، خاص اس کے لیے مقرر فرمایا، یعنی زکوٰۃ کی آمدنی میں سے مال کا ایک حصہ اس غرض کے لیے مخصوص کرایا جائے کہ اس سے غلام آزاد کرائے جائیں۔ [1]
>
> زکوٰۃ، مدینہ میں فرض ہوئی، اس کے مصارف، سورہ توبہ میں بیان کردیئے گئے۔ [2]

اب یہ ظاہر ہے کہ سورۃ التوبہ کی جس آیت میں مصارف زکوٰۃ کا حوالہ، اسلم جیراجپوری صاحب نے دیا ہے، وہ وہی آیت ہے، جس کے متعلق، پرویز صاحب نے، کچھ مدت، پیش از مرگ، یہ واویلا مچانا شروع کردیا تھا کہ --- ''یہ صدقات کے مصارف ہیں، جنھیں ہمارے ہاں، غلطی سے زکوٰۃ کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے'' --- حالانکہ اس واویلا سے قبل، وہ ایک مدت تک، آیت (۶۰/۹) کے اندر مذکور مصارفِ زکوٰۃ کو، زکوٰۃ ہی کے مصارف قرار دیتے رہے ہیں، صدقات کا لفظ، زکوٰۃ کے معنوں میں، آیت (۵۸/۹) میں بھی آیا ہے، چنانچہ پرویز صاحب، یہاں بھی، صدقات سے مراد زکوٰۃ ہی لیتے ہیں۔

> وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ‌ۚ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَاِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ (۵۸/۹)
>
> اور ان میں کچھ ایسے ہیں کہ مال زکوٰۃ بانٹنے میں تجھ پر عیب لگاتے ہیں (کہ تو لوگوں کی رعایت کرتا ہے) پھر حالت اُن کی یہ ہے کہ اگر انھیں، اس میں سے دیا جائے، تو خوش ہوجائیں، نہ دیا جائے تو اچانک بگڑ بیٹھیں! [3]

آیت (۶۰/۹) اور موقف پرویز کا جائزہ

اب آیئے، آیت (۶۰/۹) کی طرف، جس کے متعلق، پرویز صاحب، یہ کہتے ہیں کہ اس میں مذکور مصارف، مصارفِ صدقات ہیں، نہ کہ مصارف زکوٰۃ۔

> اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّـفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ‌ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ (سورۃ التوبۃ-۶۰) یہ اموال صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو زکوٰۃ کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کو چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں، اور مسافر نوازی کے لیے ہیں، یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ صاحب علم و حکمت ہے۔

یہاں، یہ امر، غور طلب ہے کہ اگر اس آیت میں صدقات سے مراد ''ہنگامی حالات کے عطیات'' ہوتے، تو ہنگامی

---

[1] تاریخ الامت، جلد ۱، صفحہ ۲۰۵ [2] تاریخ الامت، جلد ۱، صفحہ ۲۰۶

[3] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۸۵

حالات کے باعث، افرادِ معاشرہ کا فقر و مسکنت میں مبتلا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر لوگوں کی گردنوں کا بند غلامی میں پھنس جانا اور ان پر حالت سفر کا طاری ہونا (جس میں یہ عطیات انھیں دیئے جائیں گے) بالکل نا قابلِ فہم ہے، کیا لوگ ہنگامی حالات ہی میں سفر کیا کرتے ہیں کہ ان کو چندوں کی ضرورت پڑتی ہے؟ کیا عہد نبوی میں ہنگامی حالات ہی میں غلامی کا رواج تھا؟ کیا یہ ہنگامی حالات ہی کا تقاضا تھا کہ اہل کفر و شرک کو محض تالیف کے لیے، دیا جائے؟ کیا عام حالات میں غلامی رواج پذیر نہ تھی کہ ان کی گردنوں کو بندِ غلامی سے چھڑانے کے لیے ہنگامی چندوں کی ضرورت ہوتی؟ کیا عام حالات میں، مؤلفة القلوب کا وجود، معدوم ہوتا ہے؟ اور یہ لوگ صرف ہنگامی حالات ہی میں وجود پذیر ہو کر منصۂ شہود پر آتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ صدقات کا یہ مفہوم (کہ وہ ہنگامی چندوں اور عطیات کا نام ہے) قطعی خود ساختہ مفہوم ہے جسے طلوعِ اسلام کی لغت ساز ٹکسال میں ڈھالا گیا ہے، آیت (۹/۶۰) میں ''صدقات'' کا لفظ، مال زکوٰۃ ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ انھی صدقات کو، اسی آیت میں فَرِيضَةً مِّنَ اللهِ کہا گیا ہے، اور یہ خدائی فریضہ بہر حال، زکوٰۃ ہی ہے۔ زکوٰۃ سے مراد ''ضرورت سے زائد پوری دولت مکسوبہ نہیں ہے، جس میں سے بقدر ضرورت رکھ کر، باقی سب مال، بقولِ پرویز، ریاست کی تحویل میں چلا جاتا ہے، بلکہ یہ وہ مقدارِ مال ہے، جس کی ادائیگی کے بعد بھی، فرد کا سب کے پاس، مال و دولت بچ رہتی ہے، جس میں سے وہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی فراخدلی سے خرچ کرتا رہتا ہے، درج ذیل، آیات، اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔

زکوٰۃ کے بعد بھی حکم انفاق

زکوٰۃ، تو بہر حال، رکن اسلام ہے، جس کی ادائیگی کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں، لیکن زکوٰۃ کے علاوہ، انفاق فی سبیل اللہ کا جو حکم مذکور فی القرآن ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ زکوٰۃ، حکومت کی کل آمدنی (Revenue) کو نہیں کہتے جیسا کہ پرویز صاحب کا خیال ہے، اگر ایسا ہوتا، تو پھر، ان کے پاس ہوتا ہی کیا، جو وہ انفاق فی سبیل اللہ کے حکم پر عمل کرتے؟ درج ذیل آیات ،اس تصور پرویز کی تردید کرتی ہیں۔

(۱) --- وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل-۲۰) نماز قائم کرتے رہو، اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور اللہ تعالیٰ کو قرض حسن بھی پیش کرتے رہو۔

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔

اولاً ----- یہ کہ زکوٰۃ سے مراد پوری دولت نہیں ہے، جو بقولِ پرویز صاحب، افرادِ کاسبین کے ہاتھوں سے نکل کر، مملکت کی تحویل میں چلی جاتی ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو انسان کے پاس سرے سے کوئی فاضل مال باقی ہی نہ بچتا، کجا یہ کہ وہ قرض حسن بھی پیش کر ڈالتا، زکوٰۃ کے علاوہ، یہاں قرضِ حسن کا مطالبہ، اس امر کو مستلزم ہے کہ قرآن کے نزدیک، فرد کا سب، اپنے اموالِ مکسوبہ میں سے صرف اتنے ہی کا حق دار نہیں ہے جو اس کی ضروریات کی کفایت کر سکے بلکہ وہ اپنے پورے ماحصل کا

مالک ہے، اور مالک ہی کی حیثیت سے پھر وہ انفاق فی سبیل اللہ کرتا ہے۔

ثانیاً ----- یہ کہ، زکوٰۃ، ایک ایسی مخصوص مقدارِ مال کا نام ہے جو عفو المال میں سے نکالی جاتی ہے اور اس مقدار کے نکل جانے کے بعد بھی، اس کی ملکیت میں، اس قدر عفو المال بچ رہتا ہے کہ قرآن کریم، اس میں سے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

خود پرویز صاحب نے ایک مقام پر، اس آیت کے ترجمے میں، اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

اور نماز کے نظام کو قائم رکھو، زکوٰۃ دو، نیز (زکوٰۃ کے علاوہ بھی)، اللہ (کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے اگر ضرورت پڑے تو مرکز) کو قرض حسنہ بھی دیا کرو۔ [1]

(۲) --- لَّيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَـٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ (البقرۃ-۱۷۷) نیکی یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے، یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی، اللہ کو، یوم آخر اور ملائکہ کو، اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال، رشتہ دار افراد، اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، سوال کرنے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔

سورۃ المائدہ میں واقع، یہ آیت بھی، اسی حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے۔

(۳) --- لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنتُم بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (المآئدۃ-۱۲) اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمھاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

ان آیات میں، زکوٰۃ کے علاوہ بھی، اہل حاجت پر مال خرچ کرنے یا اللہ تعالیٰ کو قرضِ حَسن دینے کا ذکر ہے، اگر فی الواقع زکوٰۃ سے مراد، وہ سارے کا سارا عفو المال ہوتا، جو افرادِ معاشرہ کی ذاتی ملکیت سے نکل کر، ریاست کی تحویل میں چلا جاتا، تو اس کے بعد، اہل حاجت پر، صَرف کرنے یا اللہ کو قرضِ حسن دینے کا حکم عبث قرار پاتا، حکم زکوٰۃ کے بعد بھی، انفاق کے یہ مطالبے، اس امر کو شک وشبہ سے بالاتر کر دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کا وہ مفہوم قطعی غلط ہے جو پرویز صاحب نے بیان کیا ہے۔

الغرض، آیت (۹/۶۰) میں صدقات سے مراد ''زکوٰۃ'' ہی ہے جس کا ذکر، آیت (۹/۵۸) میں بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ پرویز صاحب کے حوالے [2] (معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۸۵) سے گزر چکا ہے۔

---

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۳۳۳

اصطلاحی زکوٰۃ پر اعتراضاتِ پرویز کا جائزہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے زکوٰۃ کے اصطلاحی مفہوم پر (جو دورِ نزولِ قرآن سے لے کر، آج تک متفق علیہ اور مجمع علیہ مفہوم کے طور پر، متواتر و مسلسل معروف رہا ہے)، جو اعتراضات کیے ہیں، ان کا بھی جائزہ لے لیا جائے، ان اعتراضات کا خلاصہ (جن کی تفصیل، تفسیر مطالب الفرقان، جلد دوم، صفحہ ۲۰۸ پر دی گئی ہے) حسب ذیل ہے۔

(۱) قرآن جمع مال ہی کے خلاف ہے کجا یہ کہ اس پر ایک سال گزر جائے اور پھر اس پر مصطلحہ زکوٰۃ واجب ہو۔

(۲) قرآن میں وصولی و جمعِ زکوٰۃ کا کوئی حکم ہی نہیں ہے، اس میں صرف ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہے، لہٰذا یہ مروجہ وصولی و جمع کے خلاف ہے۔

(۳) قُلِ الْعَفْوَ انتہائی مرحلہ ہے جس پر پہنچ کر جمعِ مال اور پھر اس پر زکوٰۃ ممکن ہی نہیں ہے۔

جائزہ اعتراضِ اول

ہاں! یہ درست ہے کہ قرآن جمعِ مال کے خلاف ہے، لیکن کس صورت میں؟ اِس صورت میں جبکہ مال و دولت سے وابستہ شرعی حقوق ادا نہ کیے جائیں۔ اگر شرعی حقوق کی ادائیگی، بلاتعطل اور بلا تامّل، جاری رہے اور مال و دولت بھی شریعت کی حدود میں رہ کر کمایا جائے، اور اسے نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے، بخل سے کام بھی نہ لیا جائے، تو اس کے باوجود، جو مال، اس کے پاس جمع ہوگا وہ اللہ کا فضل ہوگا اور ہرگز ہرگز اکتنازِ زر کی وعید کے تابع نہیں ہوگا۔ اکتنازِ زر کی وعید صرف اس صورت میں ہے جبکہ جمعِ مال کے ساتھ لَايُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ الله کا طرزِ عمل بھی موجود ہو، ''مفکرِ قرآن'' نے، اشتراکیت کے زیرِ اثر مرتب کردہ، اپنے ''نظامِ ربوبیت'' کو سامنے رکھتے ہوئے، مطلق جمعِ مال کو اس وعید کا مصداق قرار دیکر، جمع مال کی مذمت کی ہے حالانکہ یہ بات ہی سرے سے غلط ہے، جمع مال کی مذمّت میں، پرویز صاحب نے قرآنی الفاظ --- وَجَمَعَ فَأَوْعٰى (۱۸/۷۰) اور الَّذِي جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهٗ (۲/۱۰۴) سے بھی استدلال کیا ہے، حالانکہ یہ آیات ان لوگوں کی مذمت میں ہیں جو کافر ہیں اور اپنے اموال میں، خدا کے کسی حق کو سرے سے مانتے ہی نہیں ہیں کجا یہ کہ وہ عملاً اس کو ادا کریں، لہٰذا یہ منکرینِ خدا و آخرت، مال کی محبت میں ایسے مبتلا ہیں کہ انھیں اپنے رزق میں رازق کے حقوق کی مطلق پروا نہیں ہے، ایسے لوگ واقعی مذمّت کے مستحق ہیں خواہ وہ کھلے کافر ہوں یا منافق یا نام نہاد مسلمان ہوں، ایک سچے اور کھرے مسلمان کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ اپنی مکسوبہ دولت میں سے خدا کے راستے میں، دل کھول کر خرچ کرے، پھر بھی اگر کچھ رقم، اس کے پاس رہ جائے، تو اسلام، اس دولت کو، اللہ کا فضل قرار دیتا ہے۔ قرآن، مطلق جمع مال کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ صرف، اس صورت میں، اس کے خلاف ہے جبکہ خدا اور آخرت کے تقاضوں سے گریز کرتے ہوئے مال جمع کیا جائے، ایک مقام پر اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے، یہ کہا گیا ہے کہ:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (یونس-۵۸) اے نبی! یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی، اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہئے یہ ان سب سے بہتر ہے جو لوگ جمع کر رہے ہیں۔

یہاں نہ تو مَا يَجْمَعُوْن کو برا بھلا کہا گیا ہے اور نہ ہی جمع کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے بلکہ نعمتِ قرآن پر، انھیں خوشی منانے کی دعوت دی گئی ہے، اس ہدایت کے ساتھ کہ قرآنی تعلیمات کے مقابلے میں، اپنے دنیاوی مال کو بہتر نہ جانا جائے، کہ حقیر دولت کی خاطر کتاب اللہ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیا جائے، لیکن اگر کوئی شخص، کتاب اللہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، مال و دولت کو حاصل کرتا ہے، تو یہ کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں ہے کہ جس کے پاس بھی نہ پھٹکا جائے، بلکہ یہ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَن يَّشَآءُ کی رو سے فضلِ ربانی ہے، اور یہ شجرِ ممنوعہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ:

(۱) ----- قرآن پاک، اپنی ضروریات پوری کر لینے کے بعد، بچ جانے والے مال میں سے ادائے زکوٰۃ، اور قرضِ حسن کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے، جو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگوں کے پاس عفو المال ہو۔

(۲) ----- مال و دولت کو اللہ تعالیٰ نے ہستیٔ انسان کا سہارا قرار دیا ہے، وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا ''اور اپنے وہ مال، جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو'' اب ظاہر ہے کہ جو چیز ہستی انسان کا سہارا ہو، از روئے قرآن، خیر ہو، اس کو کمانے کی جدوجہد کو، اللہ نے اِبْتِغَآءِ فَضْلِ اللّٰهِ سے تعبیر کیا ہو، تو اس کی بندۂ مومن کے پاس موجودگی، جبکہ شرعی حقوق کی ادائیگی میں بھی کوئی کوتاہی نہ ہو، قطعاً مکروہ و مبغوض نہیں ہے، اور نہ ہی اس مال کی وہ حیثیت ہوگی، جو منکرِ خدا اور مال پرست شخص کے مال کی ہوا کرتی ہے۔

(۳) ----- قرآن مجید، مال و دولت کو بھی خیر کے نام سے موسوم کرتا ہے مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ (۲/۲۷۳) اور وَإِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْد (۸/۱۰۰)۔ ان تعلیمات کو بھی، وہ، خیر ہی کہتا ہے جو منزل من اللہ ہوں، وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا (۱۶/۳۰) جب قرآن، دونوں کو (مال و دولت کو بھی، اور وحی کی تعلیمات کو بھی) خیر ہی کہتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کے حصول کو مذموم و ممنوع قرار دے، البتہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیاوی خیر کو دینی خیر کے تابع رکھ کر، حاصل کیا جائے، اور جب ایسا کیا جائے، تو جو خیر بھی، از قبیل دنیا حاصل ہوگی وہ نہ تو عند اللہ معیوب و مبغوض ہوگی اور نہ ہی اس کے حاصل کرنے والوں کو، ان وعیدوں کا مستحق گردانا جائے گا، جن کو ''مفکرِ قرآن'' صاحب، عمر بھر، جا و بیجا، اور بے سوچے سمجھے، ہر مسلمان پر چسپاں کر دینے کے عادی رہے ہیں۔

جائزہ اعتراضِ ثانی

پرویز صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں جمع زکوٰۃ کا سرے سے کوئی حکم ہی نہیں ہے لہٰذا جس زکوٰۃ کے جمع اور وصول کرنے پر زور دیا جاتا ہے، وہ قرآن سے ثابت نہیں ہے۔

''مفکرِ قرآن'' صاحب، اشتراکیت پر ایمان لاکر، اسے مشرّف بالاسلام کرنے کے لیے، قرآن کریم کے ایک ایک لفظ سے اور ایک ایک اصطلاح سے زور آزمائی کیا کرتے تھے، اور زندگی بھر، ان قرآنی مصطلحات کے ظروف میں، نئے معانی و مفاہیم کی شراب بھرا کرتے تھے، پھر ان خودساختہ مفاہیم و مطالب کو'' قرآنی معیار'' اور ''سندِ وحی'' قرار دیکر، وہ ہر اس چیز کے انکار پر تل جایا کرتے تھے، جو ان کے تصوّرات کے خلاف ہوں۔ قرآنی اصطلاح، زکوٰۃ اور صدقات کے ساتھ بھی، انھوں نے یہی کھیل کھیلا اور ان کے اصل معروف و متداول معانی سے انکار کر کے، انھیں اپنی طرف سے نئے معانی دیئے، اور پھر بڑے دھڑلے سے یہ دعویٰ کرڈالا کہ

> ہمارے صدقات کے انھی مصارف کو، زکوٰۃ کے مصارف کہا جاتا ہے، اور کوئی نہیں پوچھتا کہ قرآن نے یہ مصارف، صدقات کے بتائے ہیں، انھیں زکوٰۃ کے مصارف کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔ [1]

حالانکہ انھی صدقات کا ذکر، سورۂ توبہ کی آیت (۵۸) میں بھی ہے، جس کا ترجمہ خود پرویز صاحب نے بھی زکوٰۃ ہی کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ (۵۸/۹) ''ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ مالِ زکوٰۃ بانٹنے میں، تجھ پر عیب لگاتے ہیں''۔ [2]

اس آیت میں، خود پرویز صاحب نے، ''صدقات'' سے مراد'' مال زکوٰۃ'' لیا ہے اور انھی صدقات کے مستحقین کا ذکر، آیت (۶۰/۹) میں ہے، خود پرویز صاحب، رقمطراز ہیں۔

> سابقہ آیات میں منافقین کے انھی صدقات کی تقسیم کے سلسلہ میں، حضور کے خلاف الزام تراشی کی تھی، زیرِ نظر آیات میں، انھی صدقات کے مصارف کا ذکر ہے۔ [3]

یہی وہ ''صدقات'' (اموالِ زکوٰۃ) ہیں، جن کی وصولی و جمع کا حکم، حضور اکرم ﷺ کو، ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (التوبہ-۱۰۳) لوگوں کے مالوں میں سے (اے نبی)، تم صدقات (اموالِ زکوٰۃ) وصول کیا کرو۔

اس وصولی و جمع کے بعد ہی، وہ مرحلہ آتا ہے جس میں اسلامی حکومت کا فریضہ'' ایتاءِ زکوٰۃ'' (۴۱/۲۲) بتایا گیا ہے، نادار لوگوں کو زکوٰۃ دینے سے قبل، بہرحال، صاحبِ ثروت اور خوشحال افراد سے، اس کی وصولی و جمع کا مرحلہ مقدّم اور ناگزیر ہے، جب زکوٰۃ جمع ہو جاتی ہے تو پھر بیت المال سے مستحقین کو عطا کی جاتی ہے، اس پر یہ کہنا کہ'' قرآن میں، سرے سے وصولی و جمعِ زکوٰۃ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں پایا جاتا''، ایک بے جابات ہے، اپنے ہی خیالات میں مگن رہنے والوں کو کوئی چیز بھی، اپنے مطلب کے خلاف، قرآن میں سے نہیں ملا کرتی، اس آیت (۱۰۳/۹) کے تحت، پرویز صاحب، فرماتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۹ [2] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۸۵ [3] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۹

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہنوز قرآنی نظام، اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا، اس نظام میں، ہر شخص، اپنی آمدنی میں سے، اپنی ضروریات کے بقدر لے کر، باقی سب مملکت کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے کہ وہ اس سے حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرے (۲۱۹/۲)۔ ل

تعجب خیز رویہ پرویز

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اگر پرویز صاحب، اپنے خودساختہ ''نظام ربوبیت'' کے حوالہ سے کلام فرمائیں، تو ''زکوٰۃ' ان کے من گھڑت مفہوم کے لحاظ سے، حکومت کی ایسی پوری آمدنی (Revenue) قرار پاتی ہے، جس کی وصولی وجمع، افراد معاشرہ ہی سے کی جاتی ہے، لیکن جب ''زکوٰۃ'' کا وہ مفہوم مراد لیا جائے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر، آج تک تواتر و تسلسل سے ہم تک پہنچا ہے، تو پھر ''مفکرِ قرآن'' صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ''قرآن میں تو وصولی وجمع زکوٰۃ کا سرے سے حکم ہی نہیں ہے''۔

جائزۂ اعتراضِ ثالث

پرویز صاحب کا یہ جملہ، بڑے تکرار کے ساتھ، اکثر و بیشتر مقامات پر، آپ کو ملے گا کہ --- ''یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ قرآنی نظام، ہنوز اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا'' --- لیکن کسی ایک مقام پر بھی، انھوں نے بھولے سے یہ نہیں فرمایا کہ ''قرآنی نظام'' کا مکمل نفاذ کس سال میں ہوا تھا، کیونکہ وہ جس سال کو بھی، ''قرآنی نظام'' کا سال قرار دیں گے، اس کے بعد تک، بلکہ خلافت راشدہ تک کے دور میں ذاتی ملکیت کا اصول برقرار رہا ہے، کہیں بھی، وہ دور نہیں آیا جس میں زائد از ضرورت مال، لوگوں نے ریاست کے حوالہ کر دیا ہو، اور ریاست نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا ہو، اب یہاں دیکھئے کہ خُذْمِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً کا حکم، غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ، مطابق نومبر ۶۳۵ء، بحوالہ معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۵۸۰ اور معراج انسانیت، صفحہ ۲۹۲) کے بعد نازل ہوا، اور پرویز صاحب، آخر عمر تک، یہی رٹ لگاتے رہے، کہ --- ہنوز قرآنی نظام، اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا'' --- حالانکہ بقول پرویز صاحب، ''قرآنی نظام'' کے تحت، ہر شخص، اپنی آمدنی میں سے بقدر ضرورت لے کر، باقی سب کچھ، جس حکم کے تحت، مملکت کی تحویل میں دینے پر مامور تھا، وہ سورۃ البقرہ (۲۱۹/۲) میں موجود ہے، یہ حکم ۲ھ میں نازل ہوا تھا، اب جبکہ ۲ ہجری میں نازل ہونے والے حکم کے بعد بھی، ۹ھ تک، اس پر عملدرآمد نہیں ہوا تو معلوم نہیں کہ، پھر وہ ''قرآنی نظام'' کب نافذ ہوا تھا، جس کا یہ لوگ ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے۔ جب خلفاء راشدین تک کے دور میں، مال و دولت اور زمین کی شخصی ملکیت کا وجود ثابت و برقرار رہا ہے (جیسا کہ پرویز صاحب کی کتب کے حوالہ سے اس مقالہ کے دوسرے مقام پر تفصیلاً مذکور ہے)، تو پھر نہ معلوم، وہ انتہائی مرحلہ، کس سن و سال میں آیا ہے جب لوگوں کے پاس، زائد

ل تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۳۴

ازضرورت کوئی مال و دولت باقی نہ رہا؟ کاش! ''مفکرِ قرآن'' صاحب یہ وضاحت بھی کرڈالتے، کہ ان کے ''قرآنی نظام'' کے نفاذ کے تین مراحل، کس سن وسال میں طے پائے تھے، تاکہ ہم خود بھی، قرآن کی روشنی میں، ان کا جائزہ لے سکتے، حقیقت یہ ہے کہ قُلِ الْعَفْوَا کا وہ انتہائی مرحلہ (جسے مارکسزم سے ماخوذ، نام نہاد نظام ربوبیت کی آخری منزل کے طور پر، پرویز صاحب نے پیش کیا تھا) عہدِ نبوی یا خلافتِ راشدہ میں آیا ہی نہیں، یہ صرف ''مفکرِ قرآن'' کی اپنی فکری اُپج ہے، جو اُن کے اپنے ذہن کے سوا، عالمِ واقعہ میں کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتی۔

بحوالۂ زکوٰۃ، خارزارِ تضادات

زکوٰۃ کی بحث کے آخر میں، ایک نظر، اس خارزارِ تضادات پر بھی ڈال لیجئے، جو زکوٰۃ کے ضمن میں، ''مفکرِ قرآن'' کے لٹریچر میں پایا جاتا ہے، یہی خارزارِ تضادات، اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ تشریحِ اسلام اور تفسیرِ قرآن میں، انھوں نے کبھی بھی فطرت اور صداقت کا راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ تصنّع اور تکلف کا راستہ اختیار کیا ہے، اور یہی ان کے تضادات کا اصل سبب ہے، اور جہاں تضادات پائے جائیں، اور وہ بھی بکثرت وبسیار، وہاں ممکن ہی نہیں کہ حقیقت بھی موجود ہو، وہاں تصنّع اور تکلف کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، خود، پرویز صاحب، ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

> حقیقت اور تصنّع میں ایک فرق ضرور ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، حقیقت کے بیان میں کبھی تعارض وتناقض نہیں ہوتا، کسی واقعہ کی جزئیات، آپ جس قدر زیادہ سے زیادہ بیان کرتے چلے جائیں گے کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی جائیں گی، لیکن جو بات، واقعہ کے خلاف گھڑی جائے گی، اس کی جزئیات بیان کرتے وقت، کہیں نہ کہیں سچی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے، اس لیے کہ انسان کا حافظہ اتنا قوی نہیں، کہ وہ قدم قدم پر زندگی بھر اپنے تصنّع کا خیال رکھ سکے، لہٰذا اس کی جزئیات میں آپ کو تعارض وتناقض کے بہت ہی بھونڈے نمونے نظر آئیں گے۔ [1]

اب مندرجہ ذیل تضادات کو ملاحظہ فرمایئے، جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ''مفکرِ قرآن'' نے کہاں تک تصنّع سے کام لیا ہے؟ اور یہ بھی کہ جو کچھ انھوں نے بیان کیا ہے، اس میں واقعی کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی گئی ہیں؟ اور یہ بھی کہ کیا وہ واقعی اس قدر قوی الحافظہ تھے کہ قدم قدم پر انھوں نے اپنے تصنّعات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہو؟ کیا ان کی تحریروں میں بھی تناقض کے بہت ہی بھونڈے نمونے نہیں دکھائی دیتے ہیں؟

(۱) صدقات وزکوٰۃ - مترادف المعنیٰ یا متغائر المفہوم؟

ایک زمانہ تھا، کہ پرویز صاحب، زکوٰۃ کو تو فَرِيْضَةٌ مِنَ اللهِ مانتے تھے، اور صدقات کی رضاکارانہ (نفلی عبادت) اور لازمی (فریضہ کی) حیثیت کے بھی قائل تھے اور اس دوسری حیثیت کے اعتبار سے، صدقات وزکوٰۃ، ہم معنیٰ قرار پاتے ہیں، اور خود، پرویز صاحب بھی، زکوٰۃ اور صدقات کے مترادف المعنیٰ ہونے کے کبھی قائل تھے۔

[1] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۹

زکوٰۃ سے مفہوم وہی ہے جو ہم نے طلوعِ اسلام میں بیان کیا تھا، اس کے لیے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے وصول کر خُذْمِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (۱۰۳/۹) حتیٰ کہ ان کارکنوں کا بھی ذکر ہے، جو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے متعین کیے جائیں وَالعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا (۶۰/۹)۔ [۱]

اس اقتباس سے واضح ہے، کہ صدقات اور زکوٰۃ ہم معنیٰ ہیں، اور صدقات وصول کرنے کے حکم کا مطلب، وصولیٔ زکوٰۃ ہی ہے، نیز یہ بھی کہ آیت (۶۰/۹) میں مذکور مصارف بھی، زکوٰۃ ہی کے مصارف ہیں، جن میں وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا بھی ایک مصرف ہے، اگرچہ اس میں ''زکوٰۃ'' کی بجائے، ''صدقات'' ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

لیکن بعد میں، جب پرویز صاحب کا ذہن پلٹا، اور وہ ''مفکرِ قرآن'' بن گئے تو زکوٰۃ و صدقات میں مغائرت پیدا ہوگئی، اب زکوٰۃ، ایک چیز قرار پائی اور صدقات الگ اور جداگانہ شئے۔ اب لفظی تفاوت کے ساتھ ساتھ ان میں معنوی تغایر بھی پیدا ہو گیا، اب، قرآن ہی کی آڑ لے کر، ''مفکرِ قرآن'' نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ

قرآن نے نہایت وضاحت کے ساتھ، ان دو الفاظ کو الگ الگ استعمال کیا ہے، اگر صدقات سے مراد زکوٰۃ ہی ہوتی تو وہ صدقات کی جگہ زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کرتا، لیکن قرآن میں غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک، زکوٰۃ کا مفہوم صدقات سے الگ ہے، اسلامی معاشرے کے ابتدائی مدارج میں (جب ہنوز اپنی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی) صدقات کا مفہوم خیرات ہی تھا، لیکن جب بعد میں، اپنا نظامِ حکومت قائم ہو گیا تو صدقات سے مراد وہ عطیات وغیرہ ہو گئے جو اسلامی حکومت، بعض ہنگامی ضروریات کے لیے طلب کرتی ہے۔ [۲]

(۲) مفہومِ زکوٰۃ میں تضاد و تناقض

تعارض و تناقض کی دوسری مثال، زکوٰۃ کے مفہوم میں پائی جاتی ہے، ایک زمانہ تھا، جب زکوٰۃ کے متعلق، یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ، کل مقدارِ مال کا ایک ایسا حصہ ہے جو بطورِ فریضہ صاحبِ مال پر عائد ہے، ہر نوع کے مال میں، شرحِ زکوٰۃ، متعین فرمودۂ شارع ہے۔

جمع شدہ مال پر، جس پر سال گزر جائے، چالیسواں حصہ، اللہ تعالیٰ کی راہ میں، جو قوم کی حمایت اور خلقِ خدا کی بہتری کی راہ ہے، نکال کر خرچ کیا جائے، تاکہ مال صرف اغنیاء ہی میں نہ پھرتا رہے بلکہ غرباء اور ضرورتمندوں میں آ کر ایک طرح سے اشتراک اور اشتمال بھی ہو جائے، كَيْلَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ [۳]

خود پرویز صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ، حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا، اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی ان کے ذمہ تھی .... ایک کروڑ پتی مسلمان سے کم از کم اڑھائی لاکھ بطورِ زکوٰۃ وصول کیا جائے گا۔ [۴]

---

[۱] طلوعِ اسلام، جنوری ۱۹۴۹ء، صفحہ ۸۲
[۲] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳۶
[۳] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۰
[۴] طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۹ء، صفحہ ۴۸

لیکن اشتراکیت کے بچھڑے کی محبت، جب اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گئی، تو اب زکوٰۃ کا مفہوم بھی یکسر بدل گیا، ماڈرن مفہومِ زکوٰۃ، اب یہ قرار پایا کہ افرادِ معاشرہ کے ہاتھوں سے، زائد از ضرورت ساری دولت، جب حکومت کی تحویل میں آئے گی تو یہ زکوٰۃ کہلائے گی۔

> مملکت میں، تمام کا سب افراد، ان کاموں کو، جو ان کے سپرد کیے جائیں گے اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق، پوری تندہی سے انجام دیں گے، اس کے ماحصل میں سے، بقدرِ ضرورت کے لے کر، فاضلہ اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی (مرکزِ ملت) کی تحویل میں دے دیں گے .... آپ آج کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ، اسلامی مملکت کی جملہ آمدنی (Revnue) کو کہا جائے گا۔ [1]

قرآن وہی، الفاظِ قرآن وہی، جو چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے زیرِ مطالعہ و تلاوت ہیں، لیکن ''مفکرِ قرآن'' کا مفہوم بدلتا رہا، اُن کے خیالات میں تغیر آتا رہا، اور ''مفکرِ قرآن'' کے فضائے دماغی میں اٹھنے والی ہر لہر، قرآنی مفہوم میں تغیر و تبدل ہی نہیں بلکہ تحریف و ترمیم کا باعث بنتی رہی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگرچہ قرآن تو وہی ہے، مگر سمتِ کعبہ بدل چکی ہے۔

(۳) مفہومِ صدقات - کبھی کچھ، کبھی کچھ

زکوٰۃ و صدقات کے ضمن میں، تضاد کی تیسری مثال، صدقات کے تغیر پذیر مفہوم میں واقع ہے، کبھی اس کا مفہوم ''خیرات و امداد'' بھی تھا۔

> تمہارے دعوائے ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم محتاجوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کیا کچھ دیتے ہو، (اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقہ کہتے ہیں) [2]

لیکن جب یہی لفظ ''صدقات'' پرویز صاحب کی تجدد پسندی کا نشانہ بنا تو اس کا جدید مفہوم، یہ قرار پایا۔

> سال میں بعض ہنگامی حالات، ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ جن کے لیے بجٹ میں گنجائش (Provision) نہیں ہوتی، مثلاً سیلاب، زلزلہ، وبا، جنگ وغیرہ، ان کے لیے ملک میں خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے، انھیں قرآن کریم نے صدقات سے تعبیر کیا ہے۔ [3]

سوال یہ ہے کہ کیا سیلاب، زلزلہ، وبا، جنگ واقعی ایسے حوادث ہیں، جو ہر سال باقاعدگی سے آیا کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے، تو پھر تو ان کی گنجائش (Provision) بجٹ ہی میں ہونی چاہئے، لیکن اگر یہ ہنگامی اور اتفاقی نوعیت کے واقعات ہیں، جو کبھی کبھار، سالوں کے بعد رونما ہوتے ہیں، تو پھر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآن، ہنگامی اور اتفاقی امور سے نپٹنے کے لیے، عملہ مقرر کرنے کا، اور ان کی تنخواہ تک کا ذکر، یہ کہہ کر کر ڈالتا ہے کہ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ ...... وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا...... (۹/۶۰) لیکن روزمرہ کے معاملات کو چلانے کے لیے، کسی عملہ یا ان کی تنخواہ کا ذکر تک نہیں کرتا؟ کیا قرآن کی یہی عادت ہے کہ وہ پگڈنڈیوں پر پیش آنے والے مسائل سے تو تعرض کرے، لیکن شاہراہوں کے مسائل سے اغماض برتے؟

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۲۰۷ [2] شاہکارِ رسالت، صفحہ ۳۳۵ [3] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۲

پھر حرام ہے، جو کبھی، ''مفکر قرآن'' نے، اس بات پر غور کیا ہو، کہ جب ضرورت سے زائد ساری آمدنی، ''زکوٰۃ'' بنکر حکومت کی تحویل میں چلی گئی تو ہنگامی حالات کے یہ عطیّات، آئیں گے کہاں سے؟ لوگوں کے پاس ''نظام ربوبیت'' نے جو کچھ باقی رہنے دیا ہے، وہ تو ہے ہی ان کی ضروریات کے بقدر، اب وہ عطیّات دیں گے کہاں سے؟

(۴) صدقات (کے موقع و محل) میں تضاد کا ایک پہلو

صدقات کی ادائیگی کا موقع و محل کیا ہے؟ نظامِ ربوبیت کے نفاذ کے بعد، یا اس سے قبل؟ ''مفکر قرآن'' نے اس کے دو متضاد جواب دیئے ہیں۔

(الف) ----- ادائیگی صدقات کا موقع و محل، ''نظام ربوبیت'' کے قیام سے قبل کا ''عبوری دور'' ہے۔

قرآن کریم میں صدقہ و خیرات کے ذریعہ، غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنے کے، یا ترکہ اور وراثت وغیرہ کے سلسلے میں، جو احکام آئے ہیں، ان کا تعلق، انھی عبوری ادوار سے ہے، مکمل دین میں تو صورت یہ ہوگی کہ نہ کسی کے پاس، ضرورت سے زائد فاضلہ دولت ہوگی، اور نہ کوئی فرد، اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم، لہٰذا، دوسروں کی مدد کا محتاج ہوگا اسی دور کے متعلق کہا گیا ہے کہ يَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ۱

(ب) ----- ادائیگی صدقات کا موقع و محل، مکمل دین (نظام ربوبیت) کے نفاذ و قیام کے بعد بھی ہے۔

اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ ''ایتاء زکوٰۃ'' ہے، یعنی تمام افراد معاشرہ کو سامان نشوونما بہم پہنچانا۔ اس مقصد کے پیش نظر، اس کی تمام آمدنی زکوٰۃ یعنی ذریعۂ نشوونما کہلا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھیے، ہم دیکھتے ہیں کہ سال میں، بعض ہنگامی حالات ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لیے بجٹ میں گنجائش (Provision) نہیں ہوتی، مثلاً سیلاب، زلزلہ، وباء، جنگ وغیرہ، ان کے لیے ملک سے خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے، انھیں قرآن کریم نے صدقات سے تعبیر کیا ہے۔ ۲

حقیقت یہ ہے کہ کہیں صدقہ کا مفہوم، کچھ بیان کیا گیا ہے، اور کہیں کچھ، ہر مفہوم کے ساتھ، اس کا موقع و محل بھی بدل جاتا ہے، مفہومِ صدقات، اگر ''خیرات و مالی مدد'' ہو تو پھر اس کا حکم، ''نظام ربوبیت'' کے نفاذ سے قبل کے ''عبوری دور'' سے وابستہ ہو جاتا ہے، اور اگر اس کا مفہوم ''ہنگامی حالات کے عطیات'' ہوں، تو پھر یہ مکمل دین کے نفاذ کے بعد کے دور سے وابستہ ہو جاتا ہے، اس صریح تضاد کے رفع و ازالہ کے لیے، یہ توجیہ کی گئی کہ صدقات کے مفہوم کا اختلاف موقع و محل کے اختلاف کو مستلزم ہے حالانکہ قرآن وہی اور قرآن کے الفاظ وہی لیکن ان کا مفہوم، بدلتے ہوئے ذہن کے تابع رہ کر تغیر پذیر رہتا ہے۔

(۵) آیت (۹/۶۰) مصارف زکوٰۃ یا مصارف صدقات؟

سورۃ التوبہ کی آیت (۶۰) میں مذکور مصارف، مصارفِ زکوٰۃ ہیں؟ یا مصارفِ صدقات؟ پرویز صاحب کے لٹریچر

---

۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۲، صفحہ ۳۶۳
۲ طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۶۶ء، صفحہ ۶۲

میں، اس سوال کے بھی دو متضاد جوابات پائے جاتے ہیں۔

(الف) ----- آیت (۹/۶۰) میں مذکور مصارف، زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ ......الآیه (صدقات، فقراء، مساکین، زکوٰۃ وصولی وغیرہ کا کام کرنے والوں اور مؤلفۃ القلوب کے لیے ہیں) مؤلفة القلوب کو قرآن نے زکوٰۃ کے مصارف میں سے شمار کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ نبی ﷺ، بعض لوگوں کو محض تالیفِ قلب کی خاطر، زکوٰۃ میں سے کچھ مہیا کرتے تھے۔ [۱]

لیکن جب ''مفکرِ قرآن'' کی سمتِ قبلہ بدلی تو اس آیت کا مفہوم بھی بدل گیا، اور آیت میں مذکور، مصارف بھی متغیر ہو کر، صدقات کے مصارف قرار پا گئے۔

ہمارے ہاں، صدقات کے انھی مصارف کو، زکوٰۃ کے مصارف کہا جاتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ قرآن نے یہ مصارف صدقات کے بتائے ہیں، انھیں زکوٰۃ کے مصارف کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ [۲]

''مفکرِ قرآن'' کا ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے کہ جب بھی وہ قرآن کا کوئی بدلتا ہوا، جدید مفہوم پیش کریں، تو لوگ اسے معیار جان کر، ان علماء اور عامۃ الناس سے ضرور پوچھیں، جو ان کے جدید ترین مفہوم سے اختلاف کر رہے ہیں، لیکن اُس ''مفکرِ قرآن'' سے کچھ بھی باز پرس نہ کریں جس کا مفہومِ قرآن، دو ٹکے کی جنتری کی طرح، ہر سال بدل جاتا ہے۔

(۶) اڑھائی فیصد زکوٰۃ - قرآنی بھی اور غیر قرآنی بھی

قرآن نے اٰتُوا الزَّكٰوة کا حکم دیا، اور رسولِ قرآن نے، سال بھر کی مالی بچت پر اڑھائی فیصد شرح سے، زکوٰۃ عائد فرما دی، لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، زکوٰۃ کے اس مفہوم کو غیر قرآنی مفہوم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ہمارے ہاں ''اِیتاءِ الزکوٰۃ'' کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے (یعنی لوگ زکوٰۃ دیں گے) اور زکوٰۃ سے مراد، یہ لیا جاتا ہے کہ جمع شدہ مال و دولت سے، سال کے بعد، اڑھائی فیصد روپیہ نکال کر، غریبوں کو دے دینا --- ''اِیتاءِ الزکوٰۃ'' کا یہ مفہوم، قرآنی نہیں۔ [۳]

لیکن اس کے باوجود، ''مفکرِ قرآن'' یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اڑھائی فیصد کی شرح سے قائم، یہ ''غیر قرآنی زکوٰۃ'' خلافتِ راشدہ میں رائج تھی۔

قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دیکر، اس کی شرح وقیود کو غیر متعین چھوڑ دیا ہے تاکہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت، اپنی اپنی ضروریات کے مطابق، اسے خود متعین کرتی رہے، قرونِ اولیٰ میں خلافت راشدہ نے، اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق اڑھائی فیصد مناسب سمجھا، اس وقت یہی شرح، شرعی تھی۔ [۴]

---

[۱] طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۵۹ء، صفحہ ۵۶
[۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۶، صفحہ ۲۰۹
[۳] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۱ء، صفحہ ۳۹ + ستمبر ۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۶
[۴] طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵۳

بطور جملہ معترضہ

یہاں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی یہ شرح، خلفائے راشدین نے متعین نہیں کی تھی، اسے خود رسولؐ اللہ نے، مامور من اللہ کی حیثیت سے، فرض منصبی جان کر مقرر کیا تھا، اور خلفائے راشدین (ہی نہیں بلکہ اب تک کے علماء امت نے) اسے قطعی ناقابل تغیر جان کر، تسلیم کرلیا ہے، اس لیے کہ جو فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہو، اس میں کسی مسلمان کا پھر کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب-۳۶) کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول، کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنیکا اختیار حاصل رہے۔

آمدم برسر مطلب

جملۂ معترضہ کے بعد، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اڑھائی فیصدی زکوٰۃ، اگر غیر قرآنی ہے (کیونکہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے) تو صحابہ کرام بالعموم اور خلفائے راشدین بالخصوص، اس ''غیر قرآنی زکوٰۃ'' سے کیوں چمٹے رہے؟ انھوں نے کیوں اس قدر مال و دولت جمع کیا (کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگئی) جبکہ قرآن، بقولِ پرویز صاحب، جمعِ مال ہی کے خلاف ہے؟ کیا ''غیر قرآنی زکوٰۃ'' سے چمٹی رہنے والی یہ حکومت، کسی صورت بھی ''خلافتِ راشدہ'' کہلائی جانے کی مستحق ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ یا تو ''مفکر قرآن'' کا تصورِ زکوٰۃ غیر قرآنی ہے؟ یا پھر خلفائے راشدین کا، جن کے ہاں اڑھائی فیصد زکوٰۃ رائج تھی؟ اگر اُن کے ہاں یہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ، اپنا وجود رکھتی ہے، (اور یقیناً رکھتی ہے، جیسا کہ خود ''مفکر قرآن'' کو اس کا اعتراف ہے) تو پھر ''مفکر قرآن'' کا تصور زکوٰۃ، سراسر غیر قرآنی ہے، لیکن اگر، پرویز صاحب کا پیش کردہ نظریۂ زکوٰۃ قرآنی ہے، تو خلافت راشدہ کی حکومت قطعاً ''غیر قرآنی'' اور غیر اسلامی قرار پاتی ہے۔

(۷) کیا خلافت راشدہ - دور ملوکیت ہے؟

بہر حال، اقتباس بالا سے یہ ظاہر ہے کہ خلافتِ راشدہ میں، شرحِ زکوٰۃ اڑھائی فیصد رائج تھی، اور زکوٰۃ کا یہ تصور کہ افرادِ ریاست کی زائد از ضرورت دولت، حکومت کی جملہ آمدنی تھی، خلافت راشدہ میں موجود نہ تھا، وہاں تو افراد اپنی کل مکسوبہ دولت کے مالک تھے اور سال بھر کے بعد، اپنی بچت پر، (نہ کہ آمدنی پر) اڑھائی فیصد شرح کے حساب سے، زکوٰۃ دیا کرتے تھے، اور نفلی صدقات، اور دیگر شرعی امور میں، انفاقِ اموال اور رضا کارانہ اخراجات، زکوٰۃ کے علاوہ تھے، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب نے جب اشتراکیت کا چشمہ پایا، تو اڑھائی فیصد زکوٰۃ کے متعلق، انھیں انکشاف ہوا کہ

زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم، اس دور میں وضع ہوا تھا، جب خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوگئی تھی، اور قرآن کے معاشی نظام کی جگہ،

نظام سرمایہ داری، پھر سے درآیا تھا، زکوٰۃ کا یہ مفہوم، دراصل نظام سرمایہ داری پر "اسلامی ٹھپہ" لگانے کے لیے تھا۔ [1]

ظاہر ہے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا یہ مروّجہ مفہوم، اگر دورِ ملوکیت ہی میں وضع ہوا تھا، تو خلافتِ راشدہ کا دور، بجائے خود، دورِ ملوکیت، قرار پا گیا، کیونکہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا نظام، خلافتِ راشدہ میں موجود تھا، اور نظامِ سرمایہ داری پر، یہ "اسلامی ٹھپہ" لگانے والے لوگ، آغوشِ نبوت اور گہوارۂ رسالت میں، تربیت پانے والے وہی صحابہ کرامؓ تھے، جن میں سے بعض کو خلفائے راشدین ہونے کا شرف و اعزاز بھی ملا۔

(۳) روزہ

روزہ کے بارے میں، "مفکرِ قرآن" کے نظریات میں اور علماءِ امت کے افکار میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے، فقہی امور میں، جیسا اختلاف، کم و بیش مختلف مکاتبِ فکر کے علماء میں پایا جاتا ہے ویسا ہی اختلاف، اس بات میں پرویز صاحب سے بھی ممکن ہے، لیکن ایسا اختلاف جو کفر و شرک، یا کم از کم کھلی گمراہی اور الحاد و زندقہ تک جا پہنچتا ہے وہ کم از کم مجھے نظر نہیں آیا، ویسے بھی روزہ جیسے تعبدی امر کے متعلق، پرویز صاحب نے بہت ہی کم لکھا ہے۔

اعتکاف

البتہ روزوں میں اعتکاف کے بارے میں، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں صریحاً لغوی انحراف پایا جاتا ہے، اعتکاف کے متعلق، قرآن کریم فرماتا ہے۔

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ (البقرہ-۱۸۷) پھر تم رات تک اپنا روزہ مکمل کرو اور اپنی بیویوں سے اختلاط نہ کرو، اس حال میں، کہ مسجد میں رکے ہوئے ہو۔

پرویز صاحب، آیت کا مفہوم، یوں بیان کرتے ہیں۔

> اس کے بعد رات تک روزہ پورا کرو، لیکن اگر تم اس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لیے، تربیت و اطاعت کے مراکز (مساجد) میں رکے ہوئے ہو، تا کہ تم الجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سلجھا سکو، تو پھر تم ان راتوں میں بھی، اپنی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری یکسوئی سے معاملات پیشِ نظر پر مرکوز رکھو)۔ [2]

یہاں عَاكِفُونَ کا ترجمہ و مفہوم --- "مسجد میں رک کر الجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سلجھانا" --- کیا گیا ہے، جو عرفاً، لغتاً اور شرعاً کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ عربی زبان میں:-

(۱) عَكْفٌ اور عُكُوفٌ (جو باب ضَرَبَ يَضْرِبُ اور نَصَرَ يَنْصُرُ سے مصدر ہیں) کا معنٰی، کسی چیز پر اس طرح جھکنا، مائل ہونا، یا متوجہ ہونا ہے، کہ اس سے صرفِ نظر نہ کیا جائے، اس صورت میں عَلٰی کا صلہ آتا ہے، جیسا کہ مذکور فی القرآن ہے يَعْكُفُونَ عَلٰى اَصْنَامٍ لَّهُمْ (الاعراف - ۱۳۸) "یہ لوگ اپنے بتوں (کی پرستش) پر جمے بیٹھے تھے" (یعنی

[1] طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۸۰ء، صفحہ ۵۹ [2] مفہوم القرآن، صفحہ ۶۹

بتوں پر اس طرح مائل اور متوجہ تھے کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہ تھا)۔

(۲) دوسرا معنٰی ''اقامت اختیار کرنا'' ہے، اور بعض علماء کے نزدیک، **يَعْكُفُونَ عَلٰى اَصْنَامٍ لَّهُمْ** کے الفاظ میں بھی یہی معنٰی پایا جاتا ہے، چنانچہ ان الفاظ کا ترجمہ، یوں کرتے ہیں ''وہ لوگ اپنے بتوں (کی عبادت) پر مقیم ہوئے بیٹھے تھے''۔ اور اسی طرح **عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِد** کا معنٰی بھی ''**مُقِيْمُونَ فِي الْمَسَاجِدِ**'' یعنی مسجد میں لزوم واقامت اختیار کرنے والے لوگ ہیں جو مسجد سے بلاضرورت باہر نہ نکلیں اور وہیں اپنا وقت، نماز اور قرآن خوانی میں گزاریں، اور جو شخص، مسجد میں، اس طرح لزوم واقامت اختیار کریں انھیں عاکف یا مُعتکف کہا جاتا ہے۔

(۳) تیسرا معنٰی (علف، عکوف اور اعتکاف) کا ''رُک کے رہنا'' ہے، عاکف اور معتکف، چونکہ مسجد میں، اسی عبادت کے پیشِ نظر رُکا رہتا ہے، اس لیے **عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِد** کے مفہوم میں، یہ معنٰی بھی ممکن ہے۔

(۴) چوتھا معنٰی ''کسی چیز کے گرد گھومنا'' ہے، **عَكَفُوا حَولَ الشَّيْءِ اى اِسْتَدَارُوا** یعنی ''وہ لوگ گھومے اور محوِگردش رہے'' اس صورت میں، فعل کے بعد **حَولَ** کا کلمہ آنا ضروری ہے۔

(۵) پانچواں معنٰی ''کسی چیز سے روکنا ہے **عَكَفَهُ عَنْ حَاجَتِهٖ يَعْكِفُهُ اى صَرَفَهُ وحَبَسَهُ** یعنی اس نے اسے (شخصِ دیگر کو) اس کی حاجت سے پھیر دیا اور روک دیا، اس صورت میں **عَنْ** کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ مصدر عکف ہو، تو معنٰی میں متعدی فعل کا مفہوم ہوگا، لیکن اگر عکوف مصدر ہو، تو پھر فعل لازم کا مفہوم ہوگا، مثلاً **عَكَفْتُهُ عَكْفًا فَعَكَفَ يَعْكُفُ عُكُوفًا** یعنی ''میں نے اسے روکے رکھا، تو وہ رُکا رہا''۔ قرآن کریم میں ہے **وَالْهَدْىَ مَعْكُوفًا**، جس میں **معکوف** بمعنی محبوس ہے یعنی ''روکا ہوا''۔

اس سے باب تفعیل کا مصدر تعکیف بھی ''روک دینے'' ہی کے معنٰی میں آتا ہے، جیسے **عَكَّفْتُ الْقَوْمَ عَنْ كَذَا**، یعنی ''میں نے لوگوں کو اس (امر) سے روک دیا، منع کر دیا''۔ لیکن اگر بصیغۂ مجہول **عُكِّفَ النَّظْم** کہا جائے، تو اس کا معنٰی ہوگا **نُضِّدَ فِيْهِ الْجَوْهَرُ** یعنی ''موتی پرودیا گیا''۔ یہ ہے اس لفظ کی اصل حقیقت، لیکن ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اس کی وضاحت کرتے ہوئے، یوں فرماتے ہیں۔

> **عَكَفَ** کسی چیز کو روکنا یا رُکنا **عَكَفَ عَلَيْهِ** ''اس کی طرف مسلسل بڑھا اور اس سے اپنا رخ نہ پھیرا، **عَكَّفَ** ''کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کے لیے لڑی میں پرودیا جس طرح موتیوں کو پرودیا جاتا ہے'' **عكف الجوهر فى النظم** گوہر لڑی میں پُر گیا۔ **شَعْر مَعْكُوف** کنگھی کیے ہوئے بال، گندھے ہوئے بال، (برخلاف پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں کے) اس لیے **عَكَّفَ** کے معنٰی ہیں ''معاملات کو درست کرنا''۔ [۱]

اس چھوٹے سے اقتباس میں، ''مفکرِ قرآن'' نے **عَاكِفُونَ** کے معانی ومفاہیم میں --- ''نوعِ انسانی کی شیرازہ بندی کرنا''، الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانا'' اور ''گیسوئے انسانیت کو سنوارنا'' وغیرہ --- کا مفہوم داخل کرنے کے

[۱] لغات القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۱۸۳

لیے، جن پرویزی حیلوں سے کام لیا ہے وہ واقعی قابل داد ہیں۔

(۱) ----- سب سے پہلے لغوی تحقیق کے دوران، اس قاعدے کو پسِ پشت ڈالا گیا ہے، جس کے تحت اولاً ثلاثی مجرد کے تمام افعال کو ان کے تمام معانی سمیت (نہ کہ صرف ان معانی کے ساتھ، جو مفید مطلب ہوں) بیان کیا جاتا ہے، اور پھر مزید فیہ کے ابواب کو لیا جاتا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے ابتداء، تو ثلاثی مجرد کے افعال ہی سے کی ہے، مگر آگے چل کر، وہ بیچ میں، مزید فیہ کے صرف ایک فعل عَكَّفَ، اور اس کے بھی صرف ایک معنی ''پرو دینا'' کو پیش کرتے ہیں بغیر اس حقیقت کو پیش کیے کہ اس صورت میں یہ فعل، بصیغۂ مجہول ہی استعمال ہوتا ہے، اور پھر دوبارہ ثلاثی مجرد کے افعال کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور پھر سے انھیں زیرِ بحث لے آتے ہیں۔

(۲) پھر عَكَّفَ کے معنیٰ میں (جو تعکیف از باب تفعیل ہے) ''پرو دینا'' کے علاوہ، دیگر مفاہیم مثلاً ''روکنا'' وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں، لیکن باقی مفاہیم سے صرف نظر کرتے ہوئے، اور ''انسانی شیرازہ بندی'' کے مفہوم کو قارئین کے ذہن میں داخل کرنے کے لیے، صرف ''پرو دینا'' کا واحد مفہوم بیان کیا ہے، اور وہ بھی اس لمبی چوڑی عبارت کے ساتھ، کہ --- ''عَكَّفَ کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کے لیے، لڑی میں پرو دینا، جس طرح موتیوں کو پرو دیا جاتا ہے'' --- حالانکہ یہ معنیٰ مراد لینے کے لیے بھی، کسی دلیل واضح یا کم از کم، سیاق وسباق میں کسی قرینہ کا پایا جانا ضروری ہے، مطلق عَكَّفَ کا لفظ بولا جائے، تو کوئی عرب بھی، اس کا یہ معنیٰ نہیں لے گا کہ --- ''اس نے شیرازہ بندی کی'' یا ''گیسوئے انسانیت کو سنوارا'' یا ''الجھے معاملات کو سلجھایا''۔

(۳) ----- پھر ''گیسوئے انسانیت کو سنوارنے'' اور ''شیرازہ بندی'' کا معنی لینے کے لیے، شَعْرٌ مَعْكُوفٌ کا سہارا لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ''کنگھی کیے بال'' اور ''گندھے ہوئے بال'' ہیں۔ پھر اپنے مزعومہ مفہوم کو نمایاں اور اجاگر کرنے کے لیے، بین القوسین، وہ عبارت پیش کی گئی ہے، جو قارئین کے ذہن کو موصوف کے خود ساختہ مفہوم کی طرف لے جائے، حالانکہ اگر بین القوسین کچھ الفاظ لکھنا ضروری بھی تھے، تو موقع ومحل کی رعایت سے یہ الفاظ لکھنا زیادہ موزوں اور مناسب تھے کہ --- (برخلاف، غیر کنگھی شدہ بالوں کے اور غیر گندھے ہوئے بالوں کے)۔

(۴) --- ان سارے پرویزی حیلوں کے بعد، پھر یہ کھلی کھلی خیانت بھی کہ آخر میں یہ قلمبند کر دیا کہ

اس لیے عَكَّفَ کے معنیٰ ہیں، (معاملات کو) درست کرنا۔ [۱]

اس عبارت کے خاتمہ پر Star ☆ کا نشان دیکر، اسے منسوب کیا گیا ہے، تاج العروس کے مصنف، علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی کی طرف، حالانکہ یہ معنیٰ انھوں نے قطعاً نہیں لکھے، یہ ''مفکر قرآن'' کے خود ساختہ معانی ہیں، جنھیں تاج العروس کے مصنف کے سر تھوپ دیا گیا ہے، ان کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

(.......... وَشَعْرٌ مَعْكُوفٌ) اى (لمشوط مضفوراً) قال اللَّيث قَلَّمَا مَا يقولون عكف وان قيل كان صَوَابًا قال (وَعكَّف النظم تعكيفاً) اذا نظم [۲]

---

[۱] لغات القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۱۸۳ [۲] تاج العروس، جلد ۶، صفحہ ۲۰۳، (طبع علی مطابع دار، بیروت، ۱۳۸۶ھ - ۱۹۶۶ء)

(........... وَشَعْرٌ مَعْكُوفٌ) سے مراد ہے "کنگھی کیے ہوئے گندھے ہوئے بال" - لیث نے کہا کہ "لوگ، کم ہی (ثلاثی مجرد سے، اس کا فعل) عَکف استعمال کرتے ہیں، تاہم اگر وہ ایسا کریں تو درست ہے اور فرمایا وَعکّف النظم تعکیفاً (باب تفعیل) جبکہ اسے ترتیباً آراستہ کر دیا گیا ہو۔

اس عبارت میں، ہر شخص، دیکھ سکتا ہے کہ وَشَعْرٌ مَعْكُوفٌ کے بعد، ایسی کوئی عبارت، سرے سے موجود ہی نہیں ہے، جس کا یہ ترجمہ ہو کہ --- "اس لیے عکف کے معنی ہیں (معاملات کو) درست کرنا۔

یاد رکھیے، اگر مطلق عَکَفَ کا لفظ بولا جائے، تو کوئی شخص بھی، حتّٰی کہ کوئی عرب بھی، اس کا یہ مفہوم نہیں سمجھے گا، کہ "اس نے معاملات کو درست کر دیا"۔

آخر یہ کیا اندازِ تحقیق ہے کہ اپنے من پسند معانی کو ثابت کرنے کے لیے، لغت کے معروف اسلوب کو نظر انداز کیا جائے، اور تکلف اور تصنع کے ساتھ، ایسے تشریحی الفاظ، اپنی طرف سے داخل کیے جائیں، جو من گھڑت معانی کی طرف، قارئین کے قلوب و اذہان کو کھینچتے چلے جائیں، اور ان تمام حیلوں کے بعد، مصنف کے ایک صحیح جملے کی آڑ میں، اس کے اپنے بیان کردہ محدود مفہوم کو، اپنی مطلب برآری کے لیے وسیع کر دیا جائے، تاکہ خود ساختہ معانی کے لیے، گنجائش پیدا کی جا سکے، پھر بھی کام نہ بن پائے، تو "اس لیے" کا لفظ کہہ کر، اپنے وضع کردہ معانی کو بیان کرتے ہوئے، اسے کسی مستند لغت کی طرف منسوب کر ڈالا جائے، اور اس طرح کے پرویزی حیلوں سے، جب پوری لغات القرآن تیار ہو جائے، تو یہ دعویٰ کر ڈالا جائے کہ

اس میں ہر معنٰی کے بنیادی معنٰی متعیّن کیے گئے ہیں، اور پھر اس کے جو جو مشتقات، قرآن میں استعمال ہوئے ہے، ان کا مطلب لکھا گیا ہے، اس طرح کہ کوئی بات بے سند بیان نہ کی جائے۔ [1]

اور اس کے ساتھ ہی، یہ ڈھنڈورا بھی پیٹا جائے، کہ

لغات القرآن --- ایسی لغتِ قرآن --- جس کا تا حال، اردو میں کوئی جواب نہیں ہے۔ [2]

امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے نام پر، ایسی تحریف شدہ لغت کا جواب، صرف اردو ہی نہیں بلکہ دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہے۔

(۴) حج

حج، ارکانِ اسلام میں سے ایک ایسا فریضہ ہے، جسے زندگی بھر میں، ایک مرتبہ ادا کرنا لازم ہے، نفس انسانی کو اللہ تعالیٰ کی طرف راغب کرنے میں، اور اس میں للّٰہیّت کو فروغ دینے میں، تقویٰ و تدیّن کے استحکام میں، اپنے گھر بار، کاروبار اور عزیز رشتہ دار سے الگ ہو کر، صرف اور صرف اللہ کی رضاء جوئی کی خاطر، حج کے سفر کو اختیار کرنے میں، نیز اس پر صعوبت اور لمبے سفر کو عبادت جان کر طے کرنے میں، دورانِ سفر، ہم سفر حجاج کرام سے خادمانہ برتاؤ کے ذریعہ نیکیاں کمانے میں، اور احرام کا خاص لباس پہن کر فقیرانہ ہیئت اختیار کرنے میں، ہر بلندی پر چڑھتے اور ہر پستی کی طرف اترتے ہوئے، ہر قافلہ سے ملتے ہوئے، اور

---

[1] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۳۵ [2] طلوع اسلام، فروری ۱۹۸۶ء، صفحہ ۱۱

ہر کارواں سے بچھڑتے ہوئے، زبان سے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کرنے میں، اور خدا کے گھر --- جو خود، اس کا مرکزِ عقیدہ و ایمان بھی ہے --- کے ارد گرد پروانہ وار طواف کرنے میں، اور دیگر اعمال و مناسکِ حج ادا کرنے میں، خود حاجی کے اپنے نفس میں، اس کے دل و دماغ میں، اور سیرت و کردار میں، حج کیا مثبت اثرات پیدا کرتا ہے، یہ سب دراصل وہ فوائد ہیں، جنھیں روحانی، اخلاقی اور اعتقادی فوائد و ثمرات کہنا زیادہ مناسب ہے، لیکن حاجی کے ان انفرادی فوائد سے کہیں بڑھ کر، وہ اثرات وثمرات ہیں، جو وجودِ حاجی سے متعدی اور وسیع ہو کر، دوسروں تک بھی پہنچتے ہیں، جن کو سید سلیمان ندویؒ نے سیرتِ نبوی میں تفصیلاً اور سید مودودیؒ نے ''خطبات'' میں اجمالاً پیش کیا ہے، انھیں حج کے اجتماعی اور عالمگیر ثمرات و فوائد کہا جا سکتا ہے، حج کا موسم آتے ہی، بیت اللہ کی زیارت کا شوق، عالم اسلام میں ایک حرکت پیدا کر دیتا ہے، حجاج کرام میں، تقویٰ و پرہیز گاری کی افزائش، ان کا تودیع و استقبال کرنے والوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، اس فریضہ کی ادائیگی، عالم اسلام کی بیداری کا ایک ذریعہ بنتی ہے، اور مکہ معظمہ میں، چار دانگ عالم سے سمٹ کر آنے والے حجّاج کرام، وحدتِ ملت کا ایسا پر کیف نظارہ پیش کرتے ہیں کہ لسان ولون، خاک و خون اور نسل و وطن کے تعصّبات، یکسر دم توڑ دیتے ہیں، پھر پاکیزہ نیتوں کے ساتھ، پاکیزہ مقام پر، پاکیزہ عزائم و مقاصد کے پیشِ نظر، یہ دنیا کا واحد پاکیزہ اجتماعِ افراد ہے، جو امت مسلمہ کی دینی اخوت اور حقیقی مساوات کا بھی مظہر ہے۔

حج اور ''مفکر قرآن''

لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، حج کی اہمیّت، جو کچھ بھی ہے، وہ صرف اس پہلو سے ہے کہ یہ عالم اسلام کے سربراہوں اور حکمرانوں کی ایک کانفرنس ہے، جس میں وہ اپنی مشترکہ پالیسیاں بنانے اور انھیں اختیار کرنے میں مصروف رہیں گے، میدان عرفات میں، ان کے باہمی تعارف کی رسم ادا ہوگی، اور کسی دوسری جگہ، ان کی اصولی پالیسیوں کی جزئیات اور تفصیلات طے ہوں گی، قربانی کا مقصد، ان حکمرانوں کی ضیافت طبع اور کام و دہن کی لذت کا اہتمام ہے، اور خطبۂ امام، دراصل، ان طے کردہ اصولی پالیسیوں کا مشترکہ اعلان اور متفقہ اعلامیہ ہے، اور بس، چنانچہ وہ حج کی اہمیت اور اس کا مفہوم و مقصد بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔

> حج سے مفہوم یہ کہ تمام دنیا کے انسان، بلاتفریقِ رنگ و نسل، اور بلا امتیازِ وطن و زبان، جو، اس نصب العین پر، ایمان رکھتے ہوں، کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق نہیں، محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے، اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں، یہ نمایندے، اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت، مرکزِ وحدتِ انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں، عرفات کے میدان میں، ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو، پھر یہ تمام امرائے ملت، اپنے میں سے ایک امیر الامراء کا انتخاب کرلیں، اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر، باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کرلیں، جو آئندہ سال کے لیے اصولی طور پر، بطور مشترکہ پالیسی، اختیار کیا جائے، اور جو امن و سلامتیٔ انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادتِ آدمیت کا کفیل ہو۔ ان کا منتخب کردہ امام، اپنے خطبۂ حج میں، اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے، اس کے بعد، یہ تمام نمائندگان، مقام منیٰ میں جمع ہو کر، اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور

کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے کے ملک پر اس کا عملی اثر اور ردّعمل کیا ہوگا، وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں گے، اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی، جس کے لیے قربانی تجویز کی گئی ہے، اس کے بعد، یہ نمایندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آ جائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق، اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں، یہ ہے وہ عملی طریقہ، جو قرآن کریم نے، تمام نوعِ انسانی کو، ایک امت واحدہ بنانے، اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لیے بنایا ہے۔ [1]

حج کے ماڈرن مفہوم پر ایک نظر

حج کا یہ نقشہ، صاف دکھائی دیتا ہے کہ دورِ حاضر کی اقوامِ متحدہ، یا لیگ آف نیشنز کو سامنے رکھ کر، مرتّب کیا گیا ہے، جس میں حج کے مناسک کی ادائیگی، تو پس منظر میں چلی گئی ہے، اور مختلف مسلم ریاستوں کی ''نمایندہ کانفرنس'' کا تخیّل، حج کا مرکزی اور اساسی مقصد قرار پا گیا ہے، پھر اس ''نمایندہ کانفرنس'' کی غایت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ باہمی مشاورت سے کوئی مشترکہ پالیسی طے کی جائے، اور پھر کسی دوسری جگہ جا کر، اس کی جزئیات وتفصیلات پر غور کرتے ہوئے، باہمی مذاکرات کیے جائیں، اور آپس کی دعوتوں اور ضیافتوں کا اہتمام کیا جائے، تاکہ قربانی کے جانور ٹھکانے لگ جائیں اور اس طرح، لگے ہاتھوں ''قربانی'' کے حکم پر عمل بھی ہو جائے۔

(۱) ----- حج کا یہ ماڈرن نقشہ، اس بات کو لازم کرتا ہے کہ حج، افرادِ امتِ مسلمہ پر فرض نہیں ہے بلکہ یہ ان کے سربراہوں، حکمرانوں یا منتخب افراد پر ہی عائد ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے، قرآن کریم میں، اسے امتِ مسلمہ کے نمایندوں پر نہیں، بلکہ خود لوگوں ہی پر فرض قرار دیا ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا وَّمَنْ كَفَرَ .... (ال عمران-۹۷) اور اللہ کے لیے لوگوں پر (اس) گھر کا حج کرنا لازم ہے ہر اس شخص پر جو حج کی استطاعت رکھتا ہے، پھر جس نے کفر کیا ....

عَلَى النَّاسِ کے الفاظ میں، عامۃ الناس کا مفہوم آتا ہے (نہ کہ ان کے نمائندگان کا)۔ تاہم اگر ایسے نمائندگان، حج کے لیے جائیں گے بھی، تو نمائندہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ یکے از افرادِ مسلمین ہی کی حیثیت سے شریکِ حج ہوں گے، اپنے ملک میں، یہ لوگ، خواہ کسی نظامت کے ناظمِ اعلیٰ ہوں یا کسی محکمہ کے افسرِ بالا، وزیرِ سلطنت ہوں یا اراکینِ مقننہ، حکامِ انتظامیہ ہوں یا مُنصِفِیْنِ عدلیہ، سربراہِ مملکت ہوں یا والیانِ صوبہ، ان کی شخصیتوں پر پڑے ہوئے عہدوں کے یہ سب لفافے، یہیں اتر جائیں گے، اور خدا کے گھر میں، احرام کا فقیرانہ لباس پہن کر، یہ ظاہر کے بھی اور باطن کے بھی فقیر بن کر ہی حاضر ہوں گے کہ یہی ان کی اصل اور مستقل حیثیت ہے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ إِلَى اللّٰهِ (فاطر-۱۵) اے لوگو! تم سب اللہ ہی کے محتاج وفقیر ہو۔

(۲) ----- قربانی کے جانوروں کے متعلق قرآن کہتا ہے۔

[1] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۶۸

فَكُلُوا مِنهَا وَأَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيرَ (الحج - ۲۸) قربانی کے ان جانوروں میں سے تم خود بھی کھاؤ اور تنگدست محتاج کو بھی کھلاؤ۔

فَكُلُوا مِنهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج - ۳۶) اِن میں سے تم خود بھی کھاؤ اور قناعت پسند (قلیل الرزق) اور حاجتمند کو بھی کھلاؤ۔

قرآن نے قربانی کے گوشت کا یہ مصرف بیان کیا ہے جس کے مطابق، فقیر و تنگدست، قلیل الرزق مگر قناعت پسند، حاجتمند کو کھلانا بھی لازم ہے، یہ انفاق فی سبیل اللہ ہی کی اور غریب پروری ہی کی ایک صورت ہے، جس کی روح کو سلب کر کے ''مفکر قرآن'' اسے محض حکمرانوں کی ایک ''گوشت خور پارٹی'' کے طور پر پیش کر رہے ہیں، اور اسے مقصدِ قربانی قرار دے رہے ہیں۔

(۳) ----- مناسک حج میں کچھ اعمال، وہ ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں اور کچھ وہ ہیں جو سنتِ نبویہ سے ماخوذ ہیں، قرآن، جن مناسکِ حج کا ذکر، کرتا ہے، ان میں احرام (وَاَنْتُمْ حُرُمٌ)، طوافِ کعبہ (وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ)، سعی بین الصفاوالمروہ (إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا)، وقوف عرفات اور اس سے روانگی (فَإِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ ....)، وقوفِ مشعر حرام (مزدلفہ) (فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ)، قربانی (لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ)، حَلقِ رأس وتقصیرِ رأس (مُحَلِّقِينَ رُؤُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ)، پھر تمام شعائر اللہ کی بے حرمتی سے بچنا (لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللّٰهِ)، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر، ان کا احترام و اکرام اور تعظیم و توقیر کرنا (وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ) وغیرہ شامل ہیں، رہے وہ مناسک حج، جنکا ماخذ، سنتِ نبویہ ہے، تو اسے فی الحال، نظر انداز کیجئے کہ وہ ''مفکر قرآن'' اور ان کے ہمنوا منکرین حدیث کے لیے، سرے سے حجت ہی نہیں ہیں۔

جہاں تک قرآن مجید میں مذکور، مناسکِ حج کا تعلق ہے، ''مفکر قرآن'' کے پیش کردہ نقشۂ حج میں، خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی، ان کا پتہ نہیں چلتا، بس مسلم حکمرانوں کا ایک اجتماع ہے، جنکا مقصد مشترک پالیسیاں بنانا اور گوشت خوری کرنا ہے، رہے وہ اعمال حج جو مذکور فی القرآن ہیں تو ان کی اس اجتماع میں کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہے، گویا یہ سارے مناسک اب یا تو اس ''ترقی یافتہ'' دور میں، اس لیے متروک ہیں کہ یہ قرونِ مظلمہ (تاریک ادوار) کی (معاذ اللہ) وہ باقیاتِ سیئات ہیں، جو دورِ حاضر کی ''علمی سطح'' سے فروتر ہیں، یا پھر ''عبوری دور'' کے یہ وہ احکام ہیں، جنکا زمانہ لد چکا ہے۔

ماڈرن نقشۂ حج کا ایک بدیہی نتیجہ

حج کی حیثیت، جسے قرآن نے پیش کیا ہے، اور جسے مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ نے پیش نظر رکھا ہے، اسے تو ''مفکر قرآن'' نے یکسر بدل دیا، اور جو نقشۂ حج خود پیش کیا ہے، اس کا مقصد، ان الفاظ میں بیان کیا کہ:

حج کا اجتماع، اس مقصد کے لیے ہے کہ اس امت کے نمایندے، وہاں جمع ہو کر، سوچیں کہ اس مقصد عظیم سے عہدہ برا ہونے

کے لیے کیا پروگرام بنانا اور اسے کس طرح بروئے کار لانا چاہئے۔ [۱]

اس سے ظاہر ہے کہ حج کرنا، افرادِ مسلمین کا نہیں، بلکہ نمائندگانِ امت کا ہی فریضہ ہے، حج کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے، اس کا بھی منطقی تقاضا یہی ہے کہ نمائندگانِ امت مسلمہ ہی حج کے لیے جائیں، عامۃ الناس کا وہاں جانا، کچھ بھی مفید مطلب یا قرینِ مقصد نہیں ہے، عام افرادِ مسلمین کا وہاں جانا، ''غیر قرآنی'' فعل ہے، جسے کوئی بھی ''قرآنی حکومت'' برداشت نہیں کر سکتی، کیونکہ اس صورت میں ملکی زرِ مبادلہ ''ضائع'' ہوتا ہے، لہٰذا عامۃ الناس کے لیے حج پر پابندی، اسی طرح ملکی مفاد کے لیے ناگزیر ہوگی جس طرح ترکی میں ایسا کیا جانا، مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھوں ناگزیر گردانا گیا تھا۔

لیکن غیر مسلم بھی حج میں آئیں

''مفکرِ قرآن'' کے نزدیک، عامۃ الناس کا نہ تو حج میں جانا مناسب ہے اور نہ ہی ان پر لازم ہے، یہ کام تو امت مسلمہ کے نمائندگان کا ہے کہ وہ حج کے موقع پر جمع ہوں اور سر جوڑ کر، امت کی فلاح و صلاح کی منصوبہ بندی کریں، اس لیے عام افرادِ مسلمین کو تو مکہ معظمہ میں بغرضِ حج نہیں جانا چاہئے، البتہ غیر مسلم اس اجتماعِ حج میں شریک ہو سکتے ہیں، جیسا کہ حج کا ''مفکر قرآن'' کے ہاتھوں، مرتب کردہ نقشہ واضح کرتا ہے، ان غیر مسلموں پر، اگرچہ فریضۂ حج عائد نہیں ہوتا، لیکن، بقولِ ''مفکر قرآن'' انھیں بھی بطور مبصّر، قرآن کریم، شریکِ حج ہونے کی دعوت دیتا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> ۱ ----- آیت کے شروع میں کہا گیا ہے وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ ''تو لوگوں کو حج کے اجتماع میں شرکت کی دعوت دے''۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ منشائے خداوندی یہ تھا کہ اس اجتماع کا انصرام و اہتمام، تو امتِ مسلمہ کی طرف سے ہو، لیکن اس میں دیگر اقوامِ عالم کے نمائندوں کو بھی مبصّرین کی حیثیت سے دعوتِ شرکت دیجائے، تاکہ وہ اس امر کا مشاہدہ کریں کہ نظامِ خداوندی، عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ [۲]
>
> ۲ ----- یہ دعوت ''الناس'' کو دی جاتی تھی جس میں امت مسلمہ بھی شامل تھی اور غیر مسلم بھی۔ [۳]
>
> ۳ ----- غیر مسلموں کو حج کے اجتماع میں، مبصر کی حیثیت سے شریک ہونیکی دعوت دی جائے گی، تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، کہ یہ نظام، ان کی بہبود کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے، لیکن اس کے لیے، ایک شرط ضروری ہے وہ یہ کہ اس میں کوئی شخص، کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو ان مقاصد کے خلاف جائے، جنھیں خدا نے مقرر کیا ہے، ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے (۳۵/۲۲)، اسی بناء پر مشرکین مکہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ [۴]
>
> ''مفکرِ قرآن'' کے اس موقف پر، چند امور وضاحت طلب ہیں۔

اَوّلاً ----- یہ کہ، کیا جس ہستی پر قرآن، نازل ہوا تھا، اور جو ہستیاں، ان کے بعد خلفائے راشدین کہلائیں، ان کے عہد میں بھی، کبھی کسی غیر مسلم کو بطور مبصّر دعوتِ شرکت دی گئی تھی؟

---

[۱] طلوعِ اسلام، مئی جون ۱۹۶۳ء، صفحہ ۱۵۲ [۲] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۷۹ء، صفحہ ۵ تا ۶

[۳] + [۴] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۸۱ء، صفحہ ۱۸

حرام ہے جو کبھی ''مفکر قرآن'' نے عمر بھر میں، ایک مرتبہ بھی، یہ انکشاف فرمایا ہو کہ عہدِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ میں ''الناس'' کو دعوت دیتے ہوئے، کب اور کس کافر و مشرک کو بطور مبصر، شریک حج ہونے کی دعوت دی گئی تھی؟

ثانیاً ----- یہ کہ، کیا قرآن، صراحت کے ساتھ، مشرکوں کا داخلہ، مسجد حرام میں ممنوع قرار نہیں دیتا؟ قرآن تو کسی بھی مشرک کو (جب تک وہ عقیدۂ شرک پر قائم ہے) مسجد حرام کے قریب تک پھٹکنے کو گوارا نہیں کرتا، کجا یہ کہ وہ انھیں بطور مبصر، شرکت حج کی دعوت دے۔ قرآن اہل ایمان اور ان کے ارباب اقتدار کو یہ حکم دیتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (التوبہ ۹-۲۸)

اے ایمان والو! مشرکین، ناپاک و نجس ہیں۔ اس سال کے بعد، وہ، مسجد حرام کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائیں۔

شرک کی نجاست، لازمۂ شرک ہے، یہ پلیدی اس وقت تک، مشرکوں کے ساتھ چمٹی رہتی ہے، جبتک کہ وہ شرک کو چھوڑ کر، توحید کو قبول نہ کر لیں، لہٰذا وہ اگر پرویز صاحب کی تجویز کے مطابق، عملی شرک سے، تھوڑی دیر کے لیے اجتناب کر بھی لیں، تب بھی، عقیدۂ شرک کی بناء پر (جو ان کے قلب و ذہن پر مستولی، اور ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے) وہ ناپاک و نجس ہی رہیں گے، جس کے باعث، بہرحال، مسجد حرام میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔

الناس سے مراد کون لوگ ہیں؟

رہی ''مفکر قرآن'' کی یہ دلیل کہ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ کے الفاظ میں یہ دعوت ''الناس'' کو دی گئی ہے، جس میں امت مسلمہ بھی شامل ہے اور غیر مسلم بھی۔ تو یہ اگر فریب خوردگی نہیں تو فریب دہی ضرور ہے، قرآن سے جہالت نہیں تو شرارت کا کرشمہ ہے۔

(۱) ----- سیدھی سی بات ہے کہ ''الناس'' کو جو دعوت دی گئی ہے، وہ حج ہی کی دعوت ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' اپنی طرف سے یہ تفریق پیدا کرتے ہیں کہ بعض لوگوں (مسلمانوں) کو یہ دعوت، تو حج ہی کے لیے ہے، لیکن بعض دیگر لوگوں کو (یعنی مشرکوں کو) یہ دعوت بطور مبصر کے ہے، اب اگر اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ میں، یہ دعوت اگر حج کے لیے ہے تو تمام ''الناس'' ہی کے لیے، اور اگر بطور مبصر ہے، تب بھی تمام ''الناس'' ہی کے لیے ہے، ان میں سے بعض ''الناس'' کو بطور حجاج اور بعض کو بطور مبصر بلانا ہرگز، قرآن سے ثابت نہیں ہے، آخر اس ثنویت اور تفریق کی قرآنی دلیل کیا ہے؟

(۲) ----- ''الناس'' اگر غیر مسلم ہوں تو انھیں سب سے پہلے ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے، اگر قبول کر لیں تو پھر وہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا کے مخاطب قرار پا کر، مختلف احکام و ہدایاتِ خداوندی پر، مامور و مکلّف بن جاتے ہیں، لیکن اگر وہ ''ایمان'' ہی کو قبول نہ کریں تو پھر وہ کسی بھی شرعی حکم کے مخاطب قرار نہیں پاتے، یہ ایک بدیہی امر ہے۔

(۳) ----- اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ میں ''الناس'' سے مراد، صرف اور صرف اہل ایمان ہے، جو آیت کے

سیاق وسباق سے بالکل ظاہر ہے، ''مفکر قرآن'' کی یہ ایک عادتِ مستمرہ تھی، کہ وہ کسی آیت میں سے چند الفاظ کو الگ کر کے، انھیں اپنے خودساختہ معانی پہنا دیا کرتے تھے، حالانکہ سیاق وسباق میں، ان الفاظ کے معانی کچھ اور ہوتے ہیں۔

''الناس'' سے مراد کون لوگ ہیں؟ صرف اور صرف اہل ایمان یا مومنین و کافرین کا مخلوط مجمع؟ قرآن کا سیاق وسباق اسے خود واضح کر دیتا ہے، ملاحظہ فرمایئے یہ آیات۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِo وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ....(سورۃ الحج - ۲۶، ۲۷) اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرا یہ گھر ان لوگوں کے لیے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں، قیامِ عبادت والے ہوں، رکوع وسجود میں جھکنے والے ہوں اور تو لوگوں میں حج کا اعلان کر دے۔

کن لوگوں کو حج کی دعوت دی گئی؟ اُن کو، جن کے لیے، اللہ کے گھر کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا، حکم، حضرت ابراہیم کو دیا گیا، اور جن کی نشاندہی اَلطَّآئِفِيْنَ (طواف کرنے والے)، الْقَآئِمِيْنَ (عبادت میں قیام کرنے والے)، الرُّكَّعِ (رکوع وانابت الی اللہ کرنے والے) اور السُّجُوْدِ (اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے والے) کہہ کر دی گئی ہے۔

لیکن اگر برسبیلِ تنزل، یہ مان بھی لیا جائے کہ ''الناس'' میں، غیر مسلم افراد اور امت مسلمہ کے لوگ دونوں ہی شامل ہیں، تب بھی قرآن کا یہ حکم دینا کہ إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا، ''الناس'' میں سے مشرکوں کو خارج کر کے، اسے صرف افرادِ مسلمین ہی کے لیے خاص کر دیتا ہے، اور غیر مسلموں کو (مشرکین وکفار کو) کسی صورت بھی (خواہ وہ ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، مبصر ہی کی صورت میں کیوں نہ ہوں) مسجد حرام کے قریب تک پھٹکنے کا روادار نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج، ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے، جس کا مقصد، بیت اللہ کی زیارت کے لیے وہاں پہنچ کر، مناسکِ حج کو انجام دینا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے، حج کا حلیہ بگاڑ کر، اسے محض، نمائندگانِ ملتِ اسلامیہ کا ایک ''سیاسی اجتماع'' بنا ڈالا ہے، جن کے نزدیک، احرام، طوافِ کعبہ، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑ، وقوفِ عرفات ووقوفِ مزدلفہ، حَلق وتقصیرِ رأس وغیرہ اعمالِ حج کسی شمار وقطار ہی میں نہیں۔ رہی قربانی، تو اس کا مقصد بھی، خدا کی عطا کردہ حیوانی دولت کو، خدا کے نام پر قربان کرتے ہوئے، توحیدِ الوہیت اور توحیدِ عبودیت کا اظہار کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف نمائندگانِ ملت اسلامیہ کے کام ودہن کی لذت کے لیے، ایک ''بین الاقوامی گوشت خور پارٹی'' کا اہتمام کرنا ہے، اس لیے ہمارے ''مفکر قرآن'' نے، حج کی عبادت کو، قرآن اور خدائے قرآن کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بجائے، ایک اور ہی زاویۂ نظر سے دیکھا، اور اس کا نقشہ، اپنے ذہنی سانچہ میں ڈھال دیا، جس میں ان کی خواہش کے مطابق مسجد حرام میں صرف مسلمان ہی قدم رنجہ نہ ہوں، بلکہ غیر مسلم بھی مبصر بن کر، حرم کی اس پاک سرزمین کو، اپنے قدموں سے روندنے کے لیے آئیں، جس کے قریب تک پھٹکنا بھی، قرآن کو گوارا نہیں ہے، جبکہ ''مفکر قرآن'' کے نزدیک یہی ''قرآنی حکم'' ہے۔

مسئلہ قربانی (قرآن کریم روشنی میں)

حج کے دنوں سے وابستہ، ایک عمل، قربانی کا عمل ہے، جسے نہ صرف یہ کہ حرم میں موجود حجاج کرام ہی انجام دیتے ہیں، بلکہ بیرون حرم بھی، چاردانگ عالم میں، پوری امت مسلمہ، اس عمل کے ذریعہ سے، خود کو شریکِ حجاج سمجھتی ہے، اور اس طرح، یہ عمل، ان میں ملی وحدت کا ایک ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

دورِ نزولِ قرآن سے لے کر، اب تک عید الاضحیٰ پر، جانوروں کی قربانی، امت مسلمہ میں ایک مجمع علیہ اور متفق علیہ عبادت کی حیثیت سے، تواتر کے ساتھ قائم رہی ہے، معتزلہ، جو ابتدائی زمانہ میں، حدیثِ رسول اور سنتِ نبوی سے گریزاں رہے ہیں، بھی قربانی کا انکار نہ کر پائے، لیکن ہمارے زمانے میں، غلام احمد پرویز نے عید الاضحیٰ کے موقع پر، کی جانے والی قربانی کی شدید مخالفت کی اور اسے خلافِ قرآن عمل قرار دیا، البتہ حج کے موقع پر، وہ قربانی کے قائل تھے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

> عید الاضحیٰ کی تقریب پر، جس طرح قربانیاں دی جاتی ہیں، ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ مروجہ مذہب میں ان قربانیوں کی سند میں کچھ روایات پیش کی جاتی ہیں، چونکہ میرے پیشِ نظر صرف قرآن مجید کی تشریح و تفسیر ہے، اس لیے ان روایات کے متعلق بحث کرنا، میرے مقصد سے خارج ہے، ویسے بھی روایات کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ [1]

قربانی اور دلیل علمائے امت

علمائے امت، حج کے علاوہ، دیگر مقامات پر عید الاضحیٰ کے موقع پر، کی جانے والی قربانیوں کا ثبوت، درجِ ذیل آیت سے فراہم کرتے ہیں۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام-۱۶۳) (''اے پیغمبر'') آپ فرما دیجئے، کہ میری نماز اور میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ، رب العالمین ہی کے لیے ہے۔

پرویز صاحب، اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

> اس آیت میں لفظ نسک کے معنیٰ ''قربانی'' کیے جاتے ہیں، لغت میں، اس مادہ (ن-س-ک) کے معنیٰ پاک اور صاف کرنا ہیں، نَسَکَ الثَّوبَ اس نے کپڑے کو دھو کر پاک اور صاف کیا۔ اَرْضٌ نَاسِکَةٌ سرسبز و شاداب زمین، جس پر حال ہی میں بارش ہوئی۔ ان بنیادی معانی کی رو سے اس کا مفہوم، کسی معاملے کو درست اور ٹھیک کر لینا ہوتا ہے، نَسَکَ السَّبْخَةَ کے معانی ہیں، اس نے زمینِ شور کو درست کیا، اسے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا، نَسَکَ اِلٰی طَرِيْقَةٍ جَمِيْلَةٍ اس نے اچھا طریقہ اختیار کیا اور پھر اس پر مداومت اختیار کی، راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلامِ عرب میں نَسَکٌ، ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس پر عام طور پر، آمد و رفت جاری ہو، یہیں سے اس کے معنیٰ، روش اور رسم کے ہو گئے، اور امور و مراسم حج کو بھی مناسکِ

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۴۷

حج کہتے ہیں۔ [1]

پرویز صاحب کی لغوی تحقیق کا انداز

پرویز صاحب نے لغات کی ورق گردانی کرتے ہوئے، اس بات کی پوری کوشش فرمائی ہے کہ ''نسک'' بمعنی ''ذبیحہ''، ''قربانی'' اور ''راہِ خدا میں بہائے جانے والے خون'' کے معانی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیں، اور ان معانی کے علاوہ، باقی دیگر معانی کو، بیان کر کے، یہ تاثر دیا جائے، کہ کتب لغات میں ''نسک'' بمعنی ''قربانی'' موجود ہی نہیں ہے، یہ ہے وہ مطلب جُو یانہ ذہنیت، جسے اگر قربانی کے حق میں، پہاڑ کے سے دلائل بھی مل جائیں، تو اس سے نظریں چُرا لی جائیں، لیکن اگر قربانی کے علاوہ، دیگر معانی مل جائیں، تو ان پر عبارت آرائی اور سخن سازی کرتے ہوئے، یہ تاثر دیا جائے، کہ ان کے علاوہ، لغت میں کوئی اور مفہوم پایا ہی نہیں جاتا۔

قرآنی تحقیق کا ہرگز، یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوں تو ان میں اپنے دل پسند مطلب کے خلاف معانی کو نظر انداز کر دیا جائے، اور مفید مطلب معانی کو بیان کر کے، یہ تاثر ابھارا جائے کہ عربی لغات، ہمارے بیان کردہ معانی کے علاوہ، دیگر معانی سے خالی ہیں بلکہ قرآنی تحقیق کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جملہ لغوی معانی کو دیکھتے ہوئے، جو مفہوم و مراد، قرآن کے کسی مقام پر فِٹ بیٹھتا ہے، اسے دلائل کے ساتھ، دیگر مفاہیم پر ترجیح دی جائے، لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب نے، ''نسک'' کی لغوی تحقیق کے دوران، ''نسک'' بمعنی ''قربانی'' و ''ذبیحہ'' کا ذکر تک نہیں کیا، حالانکہ کوئی بھی عربی لغت، اس معنیٰ سے خالی نہیں ہے۔

کتب لغت کی شہادت

ہمارے اس دعویٰ کی تائید میں، چند کتب لغات سے، مندرجہ ذیل اقتباسات پیشِ خدمت ہیں، جن سے نہ صرف یہ کہ اصل حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے بلکہ ''مفکر قرآن'' کی یکطرفہ تحقیق بھی۔

(۱) ----- اَلنُّسُکُ وَالنَّسِیْکَۃُ : اَلذَّبِیْحَۃُ وَقِیْلَ النُّسُکُ الدَّمُ وَالنَّسِیْکَۃُ الذَّبِیْحَۃُ تَقُوْلُ مَنْ فَعَلَ بِکَذَا وَکَذَا فَعَلَیْہِ النُّسُکُ اَیْ دَمٌ یُھْرِیْقُہٗ بِمَکَّۃَ شَرَّفَھَا اللّٰہُ تَعَالٰی وَاِسْمُ تِلْکَ الذَّبِیْحَۃِ النَّسِیْکَۃُ وَالْجَمْعُ نُسُکٌ وَنَسَآئِکٌ [2]

اَلنُّسُکُ اور النَّسِیْکَۃُ ذبیحہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''نُسُکُ'' خون کو کہتے ہیں اور اَلنَّسِیْکَۃُ ذبیحہ کو۔ مثلاً آپ کہتے ہیں ''جس نے یہ کام کیا ہے، اس پر ''نُسُک'' لازم ہے یعنی مکہ میں خون بہانا لازم، جسے اللہ نے شرف سے نوازا ہے، اور ایسے ذبیحہ کا نام نَسِیْکَہ ہے، اس کی جمع نُسُکٌ اور نَسَآئِکٌ ہے۔

اور آگے چل کر یہ عبارت بھی موجود ہے۔

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۴۸

[2] لسان العرب، جلد ۱۰، صفحہ ۴۹۸ تا صفحہ ۴۹۹

وَقَالَ اَبُو اِسْحٰق قُرِءَ "لِکُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا وَ مَنْسِکًا" قَالَ وَالنُّسُکُ فِی هٰذَا الْمَوضِعِ یَدُلُّ عَلٰی مَعنَی النَّحْرِ کَاَنَّهٗ قَالَ جَعَلْنَا لِکُلِّ اُمَّةٍ بِاَنْ تَذْبَحَ الذَّبَائِحَ لِلّٰهِ فَمَنْ قَالَ مَنْسِکٌ فَمَعْنَاهُ مَکَانُ نُسُکٍ مِثْلُ مَجْلِسٍ مَکَانُ جُلُوسٍ وَمَنْ قَالَ مَنْسَکٌ فَمَعْنَاه الْمَصْدَرُ نَحْوَ النَّسْکِ وَالنُّسُوکِ وَغَیْرِهٖ وَالْمَنْسَکُ وَالْمَنْسِکُ الْمَوضَعُ الَّذِیْ تُذْبَحُ فِیْهِ النُّسُکُ وَقُرِئَ بِهِمَا قَوْلُهٗ تَعَالٰی جَعَلْنَا مَنْسِکًا هُمْ نَاسِکُوهُ .... وَالمنسک الْمَذْبَحُ وَقَدْ نَسَکَ یَنْسُکُ نَسْکًا اِذَا ذَبَحَ [1]

ابواسحاق نے کہا کہ آیت کو یوں بھی پڑھا گیا لِکُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا وَ مَنْسِکًا (یعنی لفظ مَنْسک، سین پر زبر (َ) اور زیر (ِ) کے ساتھ) --- اس نے کہا کہ نَسَک یہاں نَحَرَ کے معنٰی میں ہے (یعنی قربانی کرنا کے معنٰی میں) --- گویا یوں کہا کہ "ہم نے ہر امت کے لیے طے کر دیا ہے کہ وہ اللہ کے لیے ذبیحوں کو ذبح کرے" پس، جس نے مَنْسِک (سین کے کسرہ کے ساتھ) کہا تو معنٰی یہ ہوا کہ "قربانی کی جگہ" جیسے مَجْلِس، جلوس (بیٹھنے کی جگہ)، اور جس نے مَنْسَک (سین پر فتح کے ساتھ) کہا تو اس کا معنٰی، مصدر کا معنٰی ہوا، (یعنی قربانی کرنا) جیسے نَسک اور نسوک (مصدر ہیں)، اور مَنْسَک اور مَنْسِک (سین کی زبر اور زیر، دونوں کے ساتھ) اس مقام کو بھی کہتے ہیں، جس میں قربانی ذبح کیجائے، یعنی اللہ کا فرمان یوں بھی پڑھا گیا جَعَلْنَا مَنْسَکًا هُمْ نَاسِکُوهُ ......اور مَنْسِک (سین کی زبر اور زیر، دونوں کے ساتھ) مَذْبَح (ذبح کرنیکی جگہ) کو کہتے ہیں۔

(۲) ----- "قَدْ نَسَکَ یَنْسُکُ نَسْکًا کا معنٰی یہ ہے کہ "اس نے ذبح کیا"۔ [2]

(۳) ----- نُسُکٌ النون و السّین وَالکاف اَصلٌ صَحِیحٌ یَدُلُّ عَلٰی عِبَادَةٍ وَتَقَرُّبٍ اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی۔ وَرَجُلٌ نَاسِکٌ – وَالذَّبِیْحَةُ الَّتِی تُتَقَرَّبُ بِهَا اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی نَسِیْکَةٌ وَالْمَنْسَکُ الْموضَعُ یُذبَحُ فِیْهِ النَّسآءِکُ وَلَا یَکُونُ ذَالِکَ اِلَّا فِی الْقُرْبَانِ ۔ [3]

"نسک" نون، سین اور کاف، اس کے حروفِ اصلیہ ہیں، یہ عبادت اور تقرب الی اللہ پر دلالت کرتے ہیں، (اسی سے ہے) رَجُلٌ نَاسِکٌ (عبادت گزار مرد) اور وہ ذبیحہ، جو تَقَرُّبًا اِلَی اللّٰهِ، ذبح کیا جائے، نسیکہ کہلاتا ہے، اور منسک وہ جگہ ہے جس میں "نَسَاءِک" (قربانیاں) ذبح کی جائیں، اور یہ سب کچھ قربانی ہی میں ہوتا ہے۔

(۴) ----- اَلنُّسُکُ بالضَّمِ وَبِضَمَّتَیْنِ الذَّبِیْحَةُ اَوِالنُسُکُ الدَّمُ وَالنَّسِیْکَةُ الذَّبِیْحُ [4]

النُّسُکُ (ایک ضمہ کے ساتھ، یعنی النُّسْک اور دو ضموں کے ساتھ یعنی النُّسُکُ) ذبیحہ کو کہتے ہیں، اور نسک، خون کو، اور نَسِیْکَة، ذبح کیے جانے والے جانور کو کہا جاتا ہے۔

(۵) ----- نَسَکَ یَنْسُکُ نِسْکًا وَنُسُوکًا وَنَسْکَةً وَمَنْسَکًا .... نَسَکَ لِلّٰهِ : تَطَوَّعَ بِقُرْبَةٍ وَذَبَحَ لِوَجْهِهٖ تَعَالٰی .... النُّسُکُ : ما یُقَدَّمُ لِلّٰهِ تَعَبُّداً وَزُهْداً اَلذَّبِیْحَةُ – سَبائِکُ الفُضَّة – الدَّمُ، یُقَالُ مَنْ فَعَلَ کَذَا وَ کَذَا فَعَلَیْهِ نُسُکٌ ای دَمٌ یُهْرِیْقُهٗ .... النَّسِیْکَةُ الذَّبِیْحَةُ – اَلْمَسْنَکُ [ع]

---

[1] لسان العرب، جلد ۱۰، صفحہ ۴۹۹
[2] لسان العرب، جلد ۱۰، صفحہ ۴۹۸
[3] معجم مقاییس اللغۃ، جلد ۵، صفحہ ۴۲۰
[4] القاموس المحیط، صفحہ ۳۳۲

مَنَاسِکُ : اَلْمَكَانُ الْمَأْلُوفُ وَالْمَنْسِكُ ج مَنَاسِک : شِرْعَةُ النُّسُكِ : موضع تدبح فيه النَّسِيكَةُ [1]

نَسَکَ يَنْسُکُ کے مصادر میں نَسْكًا، نِسْكًا، نُسُكًا، نُسُوکٌ، نَسْكَةٌ وَمَنْسَكًا .... نَسَکَ لِلّٰهِ ''اس نے اللہ کے قرب کی رغبت کی، اور اس کی رضا کے لیے جانور ذبح کیا''، .... النُّسُکُ'' جو کچھ عبادت اور زہد کے طور پر، اللہ کے حضور پیش کیا گیا، قربان کیا جانے والا جانور۔'' چاندی کے ٹکڑے'' اور'' خون'' (بھی اس کا معنٰی ہیں)۔ کہا جاتا ہے کہ جس نے یہ کام کیا اس پر نسک واجب ہے، یعنی خون واجب ہے، جسے وہ (دورانِ ذبح) بہائے گا۔

النَّسِيكَةُ الذَّبِيحَةُ ذبیحہ کو کہتے ہیں، اَلْمَنْسَک، اس کی جمع مَنَاسِک ہے یعنی'' مانوس جگہ'' اور اَلْمَنْسِک کی جمع ''مَنَاسِک'' ہے یعنی (i) رسم قربانی اور (ii) وہ جگہ جہاں قربانیاں ذبح کی جائیں۔

(۶) ----- النَّسِيكَةُ مُخْتَصَّةٌ بِالذَّبِيحَة : قَالَ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ [2]

النَّسِيكَةُ، ذبیحہ کے لیے خاص ہے (اور دلیل، اس کی یہ قرآنی آیت ہے) فرمایا: پھر فدیہ ہے روزوں میں سے یا صدقہ میں سے یا قربانیوں میں سے۔

(۷) ----- نَسَکَ فُلَانٌ ــُ نَسْكًا وَنَسْكَةً وَمَنسَكًا : تَزَهَّدَ وَتَعَبَّدَ وَذَبَحَ ذَبِيحَةً تَقَرَّبَ بِهَا اِلَى اللهِ .... لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا وَالْمَنْسَکُ مَوضِعٌ تُذْبَحُ النَّسِيكَةُ .... النُّسُکُ كُلّ حَقٍّ لِلّٰهِ تَعَالٰى وَ --- الذَّبِيحَةُ .... النَّسِيكَةُ : سَبِيكَةُ الفِضَّةُ الخَالِصةُ وَ --- الذَبِيحَةُ ج نُسُک وَنَسَائِکُ وَفِي التَنْزِيْل العَزِيْزِ : فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ اَوْصَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ [3]

نَسَکَ فُلَانٌ يَنْسُکُ (جملہ مصادر) کے دو معنٰی ہیں: (i) وہ زاہد اور عبادت گزار بنا، (ii) اس نے تقربِ خداوندی کے لیے جانور ذبح کیا .... ''ہم نے ہر امت کے لیے منسک مقرر کیا یعنی ایسی جگہ مقرر کی جہاں قربانیاں ذبح کی جاتی ہیں .... النُّسُک کے دو معنٰی ہیں۔ (i) اللہ کے جملہ حقوق، اور (ii) ذبیحہ .... النَّسِيكَة آلائش سے پاک خالص چاندی کی ٹکڑیاں (ٹکیاں)، اور ذبح کیا جانے والا جانور - اس کی جمع نُسُک اور نَسَائک ہے۔ اس معنٰی میں، قرآن مجید کی یہ آیت ہے، -''فدیہ ہے روزوں میں سے، صدقہ میں سے قربانیوں میں سے''۔

(۸) ----- مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب لکھتے ہیں۔

نُسُک : رسم، قربانی (پ دیکھو مناسک) [4]

پھر وہ لفظ مناسکنا کے تحت فرماتے ہیں۔

--- مَنَاسِکَنَا : اسم ظرف، جمع مضاف، مَنسِکٌ واحد - نَا ضمیر جمع متکلم مضاف اِلَيهِ ''ہمارے حج اور عبادت کے طریقے''، نَسک : عبادت، پرستش نَسَکٌ : مانوس جگہ نیز نُسُکٌ اور نُسُکٌ : قربانی نَسِيکٌ : سونا چاندی نَسِيكَةٌ : قربانی [5]

---

[1] المنجد، صفحہ ۸۰۶ [2] المفردات، امام راغب، صفحہ ۴۹۱ [3] المعجم الوسیط، جلد ۲، صفحہ
[4] لغات القرآن، جلد ۶، صفحہ ۵۰ [5] لغات القرآن، جلد ۵، صفحہ ۴۵۲

(۹) ----- یہی نہیں بلکہ عام عربی اردو لغات میں ''نسک بمعنی قربانی'' کی وضاحت سے خالی نہیں۔

نَسَکَ لِلّٰهِ : نفلی عبادت کرنا، خدا کے نام پر ذبح کرنا۔

النُّسُکُ وَالنُّسُکُ : نذر جو اللہ کے لیے پیش کیجائے، ذبیحہ۔

النَّسِیْکَةُ : ذبیحہ، سونے چاندی وغیرہ کا ٹکڑا۔

المَنسک : قربانی کی رسم، قربانی کی جگہ، قربانی۔ [1]

(۱۰) ----- بیان اللسان میں یوں مذکور ہے۔

نُسک : قربانی کے جانور، قربانی، خون۔

مَنسِک : قربانی کی جگہ، دین کا راستہ، عبادت کا طریقہ اور جگہ، جمع مناسِک [2]

''مفکرِ قرآن'' اور لغوی انحراف

نُسُک بمعنی قربانی کے ان اقتباسات کو دیکھئے اور پھر خوب داد دیجئے ''مفکرِ قرآن'' صاحب کو، جنھوں نے تفسیر مطالب الفرقان (جلد سوم) میں، اس لفظ کی لغوی تحقیق کو پیش کرتے ہوئے، کس قدر شدید التزام برتا ہے کہ ''قربانی'' کے معنوں میں، یہ لفظ ان کی عبارت میں نہ آنے پائے، حالانکہ اس معنٰی و مفہوم سے کوئی لغت کی کتاب بھی خالی نہیں ہے۔

پھر یہاں ''مفکرِ قرآن'' کی لغوی تحقیق کے دوران، ان کا یہ ''جوہر'' بھی کھل کر سامنے آتا ہے کہ اگر ایک لفظ کے کئی معانی ہوں، تو وہ، بنیادی معنٰی اسے قرار دیتے ہیں، جسے وہ اپنے ذہنی مفہوم تک پہنچنے کے لیے، بطور زینہ استعمال کرنا چاہتے ہیں، مثلاً یہاں، یہ ملاحظہ فرمائیے کہ علامہ ابن فارس نے صراحت کے ساتھ، یہ لکھا ہے (اور حوالہ پہلے گزر چکا ہے) کہ ن-س-ک کا مادہ، عبادت اور تقرب الی اللہ پر دلالت کرتا ہے، جس میں معناً وہ ذبیحہ بھی شامل ہے جس کا خون تقربِ خداوندی چاہتے ہوئے بہایا جائے، لیکن ''مفکرِ قرآن'' صاحب اپنی مطلب برآری کے لیے ''ٹھیک اور درست کرنا'' کے دور خیز معانی کو تلاش کرتے ہیں، لیکن خود اہل زبان نے، انسانی معاشرے کے لیے، جن الفاظ کو کسی خاص مفہوم و مدلول کے لیے وضع کیا ہے، اسے نظر انداز کر دیتے ہیں، کیونکہ ایسا کرنا ہی، ان کے لیے، مفیدِ مطلب ہوتا ہے۔

''نسک'' سے مفہوم ''قربانی'' کے اخراج کی مفکرانہ کاوشیں

لفظ ''نُسک'' کے لغوی مفہوم سے ''قربانی'' اور ''ذبیحہ'' کا معنٰی، نکال باہر کرنے کے لیے، ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے جو پاپڑ بیلے ہیں، اسے بھی ایک نظر ملاحظہ فرمالیجئے۔

قرآن کریم میں، احکام حج کے ضمن میں آیا ہے، فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَنَاسِکَکُمْ (۲/۲۰۰) ''جب تم حج کے واجبات سے فارغ ہو چکو .... اس سے ذرا پہلے ہے، فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُکٍ (۲/۱۹۶) ابن قتیبہ نے

---

[1] مصباح اللغات، صفحہ ۸۷۲ [2] بیان اللسان، صفحہ ۷۹۹، ۸۲۷

کہا ہے کہ یہاں نسک سے مراد ذبیحے کے ہوں گے۔ ابن فارس نے بھی، اس کے معنٰی تقرب حاصل کرنے اور ذبیحہ کے لکھے ہیں، لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے معنٰی ذبیحہ کے کیوں مختص کر لیے جائیں اس سے مراد کوئی عمل خیر ہو سکتا ہے، جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔ [1]

اب ساری عمر، قرآنی تحقیق میں صرف کر دینے والے، اس ''مفکر قرآن'' کو کون سمجھائے کہ --- ''جس عمل کو کوئی شخص، خود اپنے اوپر واجب قرار دے لے، لغت میں، اسے نُسُک نہیں، بلکہ نَذَر کہتے ہیں، چنانچہ ''نذر'' کا مفہوم، خود انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ

نذر (نقصان سے بچنے کے لیے) جو کچھ اپنے اوپر واجب قرار دے لیا جائے، نیز کسی شرط پر کوئی وعدہ کرنا بھی، نذر کے معنوں میں داخل ہے، مثلاً کوئی شخص اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے کہ میرا بچہ تن درست ہو گیا تو میں یوں کروں گا، تو یہ نذر کہلاتی ہے، راغب نے لکھا ہے کہ کسی معاملہ کے پیش آنے پر، کسی ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا، جو واجب نہ ہو (نذر کہلاتا ہے)۔ [2]

لیکن زیر بحث آیت (البقرہ - ١٩٦) میں، جس فدیہ کا ذکر ہے، اسے انسان نے اپنے اوپر، خود واجب نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے، اس لیے نسک کے معنٰی ''کوئی سا عمل خیر'' کر ڈالنے کے بعد، بھی، (جو لغتاً، عرفاً، شرعاً ہر لحاظ سے غلط ہے) پرویز صاحب کی بات بنتی نظر نہیں آتی۔

رہا پرویز صاحب کا، یہ فرمان کہ --- ''نسک کے معنٰی کو کیوں ذبیحہ کے لیے مخصوص کر لیا جائے اور کیوں نہ اس سے مراد ''کوئی سا عملِ خیر'' لیا جائے، تو یہ بوجوہ غلط ہے۔

اولاً ----- اس لیے کہ قرآن، یہاں فدیہ کے طور پر، نُسُکٌ کے ساتھ، دو مخصوص اعمال --- صیام اور صدقہ --- کا ذکر کر رہا ہے، مطلق اعمالِ خیر میں سے، صیام اور صدقہ کو خاص کر لینے کے بعد، ''نسک'' کو اگر ''کوئی سے عمل خیر'' کے معنوں میں لیا جائے، تو یہ پہلے دونوں اعمال کی خصوصیت کو باطل کر دینے کے مترادف ہو گا، اب ''صیام'' سے مراد ''مطلق کارِ خیر''، اور ''صدقہ'' سے مراد ''مطلق نیک عمل'' نہیں ہے تو نسک سے بھی ہرگز ''کوئی سا عمل خیر'' مراد نہیں لیا جا سکتا۔

ثانیاً ----- اس لیے کہ ''صیام'' یہاں صَامَ یَصُومُ کا مصدر نہیں ہے بلکہ صَومٌ کی جمع ہے، بالکل اسی طرح جس طرح نُسُکٌ یہاں مصدر نہیں ہے بلکہ نَسِیْکَۃٌ کی جمع ہے، یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب، نے بھی ترجمۂ آیت یوں کیا ہے۔

فَفِدْیَۃٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَۃٍ اَوْ نُسُکٍ (١٩٦/٢)، اس کا فدیہ، روزے یا صدقہ یا ذبیحے ہوں گے۔ [3]

اب جبکہ یہ بات طے ہو گئی ہے نُسُک جمع ہے، تو اس کی واحد نَسِیْکَۃٌ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی، اور نَسِیْکَۃٌ کے متعلق، علمائے لغت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ خاص طور پر ''ذبیحہ''، ''خون'' یا ''قربانی'' ہی کو کہا جاتا ہے، لہٰذا، عبادت کے دیگر طور طریقے، اس کے مفہوم سے خارج ہوں گے۔

اور تو اور، خود پرویز صاحب کو بھی یہ اعتراف کرتے ہی بنی کہ نَسِیْکَۃٌ ذبیحہ یا خون کو کہتے ہیں۔

---

[1] لغات القرآن، صفحہ ١٦١٥ [2] لغات القرآن، صفحہ ١٥٩٨ [3] لغات القرآن، صفحہ ١٦١٥

راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں منسک ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس کی طرف آنے جانے کے لوگ، عادی ہوں، خواہ یہ خیر میں ہو یا شر میں، اس کے بعد امور و مراسمِ حج کو مناسک کہنے لگے اور نُسُک اور نَسِيْكَةٌ ذبیحہ کو یا خون کو۔[1]

اب جبکہ لغوی تحقیق سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ نسک (جو نَسِيْكَةٌ کی جمع ہے) کا معنٰی ''قربانیاں'' ہیں، تو سورۃ الانعام کی اس آیت کا ترجمہ قطعی واضح ہو جاتا ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ - ۱۶۳) آپ (اے نبی) کہہ دیجئے کہ میری نماز، اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔

لیکن پرویز صاحب، قربانی کی شدید مخالفت میں مبتلا ہو کر، لفظ نسک سے اس معنٰی کو خارج کرتے ہوئے مفہومِ آیت یوں لکھتے ہیں۔

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرے فرائض زندگی، اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے مختصراً یہ کہ میری ساری زندگی حتّٰی کہ میری موت بھی، خدا کے تجویز کردہ پروگرام کے لیے وقف ہے۔[2]

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا

پھر اپنے موقف کو مزید سہارا دینے کے لیے، وہ، ان علماء کے تراجم پیش کرتے ہیں، جنھوں نے، اگرچہ نسک بمعنی قربانی کا انکار نہیں کیا، لیکن حدود لغت کے اندر رہ کر، انھوں نے عبادات یا اعمالِ عبادت کو نسک کا مفہوم بیان کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

اس لفظ کا ترجمہ، مذکور صدر مترجمین نے حسب ذیل کیا ہے۔

شاہ عبدالقادر .... عبادتیں
شاہ رفیع الدین .... عبادتیں
جلالین .... عبادات میں حج (حج کی عبادات)
ابوالکلام آزاد صاحب .... میرا حج [3]

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، کہ اگر ایک لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوں تو کسی آیت میں خاص معنٰی مراد لینے کے لیے یا کسی ایک معنٰی کو ترجیح دینے کے لیے دلائل کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا، یقیناً ان چند مترجمین کے نزدیک نسک بمعنی عبادات کا معنٰی قابل ترجیح ہوگا، جبکہ ان کے مقابلہ، بہت بڑی اکثریت، اور ان سے چالیس پچاس گنا بڑی اکثریت کے نزدیک، نسک بمعنی قربانی ہی قابل ترجیح ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' نے عظیم اکثریت کو نظر انداز کر کے صرف چار علماء کے تراجم کو پیش کر کے یہ تاثر دیا ہے، کہ نسک بمعنی قربانی گویا، نہ تو مترجمین کے ہاں قابل قبول ہے اور نہ ہی لغت میں، یہ موجود ہے۔

---

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۱۴ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۴۸ [3] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۸۵

لیکن میں یہاں پچاسوں علماء کی عبارتیں، ''نسک بمعنی قربانی'' پیش کرنے کی بجائے، صرف ''مفکر قرآن'' ہی کی عبارتیں پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں، کیونکہ ع مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری!

(۱) ----- قُلْ إِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

کہہ دیجئے کہ میری نمازیں، میری قربانیاں، میرا مرنا، میرا جینا، سب اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔ [۱]

(۲) اسی آیت کا یہی ترجمہ ایک مقام پر، یوں کیا گیا ہے۔

کہہ دیجئے کہ میری عبادتیں اور میری قربانیاں، میرا مرنا اور میرا جینا صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ [۲]

(۳) یہی ترجمہ مع آیت، ایک اور مقام پر، ان الفاظ میں موجود ہے لیکن قُلْ کا ابتدائی لفظ محذوف ہے۔

میری نماز اور میری قربانیاں، میرا جینا، میرا مرنا، سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ [۳]

(۴) اسی آیت کو پیش کر کے، اس کا ترجمہ بایں الفاظ درج کیا گیا ہے۔

کہہ دے کہ میری نمازیں اور میری قربانیاں، میرا مرنا اور میرا جینا محض اللہ کے لیے ہے، جو تمام انسانوں کا رب ہے۔ [۴]

(۵) حج دراصل تجدید عہد ایمان کا ایک عمل ہے، اس پر طلوع اسلام جو کچھ لکھتا ہے اس میں زیر بحث آیت کا ترجمہ بھی آجاتا ہے۔

حج کے اجتماع میں فی الواقع، ایک خصوصیت ہے، اور وہ خصوصیت ہے ایک بندۂ مومن کے اس عہد و پیمان کی، جو وہ اپنے خدا سے باندھتا ہے اور جس کی تجدید حج کا نقطۂ آغاز ہے، ایک عبد مومن، اپنے خدا سے اقرار کرتا ہے کہ إِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میری نمازیں اور میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ فقط اللہ کے لیے ہے، کسی اور غرض کے نہیں۔ [۵]

(۶) ایک اور مقام پر، اسی آیت کو درج کر کے، اس کا ترجمہ بایں الفاظ دیا گیا ہے۔

(اے پیغمبر اسلام) تم کہہ دو، میری نماز، میری قربانیاں، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ، اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہاں کا ہے۔ [۶]

(۷) ایک اور مقام پر، اسی آیت کا ترجمہ، متن کی بجائے، نیچے حاشیہ میں بایں الفاظ دیا گیا ہے۔

(کہہ دے کہ میری نماز اور میری قربانیاں، حتیٰ کہ میری زندگی اور موت، سب ایک اللہ کے لیے ہے، جو رب العالمین ہے۔ [۷]

(۸) طلوع اسلام ہی کی شائع کردہ کتاب، جسے مولانا اسلم جیراجپوری کی تصنیف کے طور پر، شائع کیا گیا ہے، اس میں ترجمہ آیت، بایں الفاظ دیا گیا ہے۔

کہہ دے کہ میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ [۸]

(۹) طلوع اسلام میں، اسی آیت کا مفہوم و ترجمہ، الفاظِ درج ذیل میں موجود ہے۔

میری صلوٰۃ اور میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ کی رب العالمین کو عام کرنے کے لیے ہو جائے۔ [۹]

---

[۱] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۱۶ [۲] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۸۶ [۳] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۹

[۴] طلوع اسلام، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۷۰ [۵] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۲ [۶] معارف القرآن، جلد ۲، صفحہ ۴۳۰

[۷] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۱۵۴ [۸] تاریخ الامت، جلد ۱، صفحہ ۲۰۲ [۹] طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۶ء، صفحہ ۴۲

لیجئے، پرویز صاحب کی طرف سے صرف چار علماء کے نسک بمعنی عبادت پر مشتمل اقتباسات کے مقابلے میں، خود پرویز صاحب، اور طلوعِ اسلام ہی سے نو اقتباسات ایسے پیش کر دیئے ہیں جن سے نسک بمعنی "قربانیاں" اظہر من الشمس ہو جاتا ہے۔

رہا لفظ مَنۡسَک، تو لغت کی کتابوں کے دس حوالوں سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ اس کا معنٰی قربانی بھی ہے، ہم علماء سلف وخلف کی عبارات کو اپنی تائید میں پیش کرنے کی بجائے، پرویز صاحب ہی کا ایک اقتباس پیش کیے دیتے ہیں۔

یہ وہ اِلٰہ ہے جس کے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جس کے علاوہ کوئی دیوی دیوتا، کوئی تقدیس وعزت کا پیکر انسان ایسا نہیں، جس کے سامنے جھکا جائے، یا جس کے حضور جا کر قربانیاں پیش کی جائیں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَكًا لِيَذۡكُرُوا .... (۳۴/۲۲) اور ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی (یا طریقِ عبادت وقربانی) کا ایک طور طریقہ ٹھہرایا، تا کہ .... [۱]

ٹھیک یہی عبارت، اور آیت کے اسی ترجمہ کے ساتھ، طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۷۷، پر بھی موجود ہے۔

لیکن بعد میں، جب پرویز صاحب کا ذہن، قربانی سے پھر گیا، تو پھر نُسُکی کا ترجمہ "میری قربانی" غلط قرار پا گیا تو انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ

اِنَّ صَلٰوتِیۡ وَنُسُكِیۡ کے معنٰی "میری قربانی" نہیں، اس لیے یہ آیت قربانی کے حکم کے لیے، بطورنصِ قرآنی پیش نہیں کی جا سکتی۔[۲]

اسی طرح، "مفکر قرآن" کی تبدیلیٔ ذہن کے ساتھ ہی، آیتِ مَنۡسَک کا ترجمہ بھی بدل کر، اب یہ ہو گیا۔

ہم نے ہر قوم کے لیے، یہ طریق مقرر کر دیا تھا، کہ وہ جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا کریں۔ [۳]

اسی طرح اب مَنۡسَک کا معنٰی وہ قربانی نہ رہا جو عید الاضحٰی کے موقع پر، کی جاتی ہے، بلکہ ہر روز کا وہ ذبیحہ قرار پا گیا، جو کھانے پکانے کے معمول کے طور پر، ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، کہ اس پر خدا کا نام لے کر، اسے ذبح کیا جائے،

الغرض، سورۃ الانعام کی آیت ۱۶۳ کا وہ ترجمہ، شک وشبہ سے بالاتر ہے، جو نہ صرف علماء امت (سلف وخلف) سے تواتر کے ساتھ منقول رہا ہے بلکہ خود پرویز صاحب بھی، اس کا یہی ترجمہ کرتے رہے، پھر معلوم نہیں کہ وہ اس کی تردید ومخالفت پہ کیوں تُل گئے، حتّٰی کہ اپنی تردید بھی، خود ہی کر ڈالی۔ فیا للعجب!

قربانی کی دوسری دلیل

قربانی کا ثبوت، سورۃ الکوثر کی دوسری آیت سے بھی ملتا ہے، لیکن ہمارے مفکر قرآن صاحب، اس کی تردید میں فرماتے ہیں۔

مروّجہ قربانی کی تائید میں سورۃ الکوثر کی آیت --- فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ --- بھی پیش کی جاتی ہے، اس کا ترجمہ کیا جاتا

[۱] معارف القرآن، جلد ا، صفحہ ۱۶ [۲] قرآنی فیصلے، جلد ا، صفحہ ۸۷ [۳] مفہوم القرآن (۳۴/۲۲)، صفحہ ۷۶۰

ہے، ''نماز پڑھ، اپنے رب کے آگے اور قربانی کر'' --- ''قربانی کر'' ترجمہ کیا جاتا ہے وَانۡحَرۡ کا

لغت کی رو سے نحر سینے کے اوپر کے حصے کو کہا جاتا ہے، صاحب تاج العروس نے مختلف تفاسیر کی سند سے وَانۡحَرۡ کے متعدد معانی لکھے ہیں، مثلاً (۱) نماز میں کھڑے ہو کر سینے کو باہر کی طرف نکالنا (۲) نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا (۳) نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا (۴) نماز میں نحر تک ہاتھ اٹھانا (۵) اپنے سینے کو قبلہ رخ کر کے کھڑے ہونا (۶) خواہشات کا قلع قمع کرنا۔

اونٹ کے ذبح کرنے کا طریق یہ ہے کہ کھڑے کھڑے، اس کے نحر (سینے کے اوپر کے حصے) کے قریب، حلق کی رگ پر نیزہ مارتے ہیں، اس سے نَحَرَ الۡبَعِیۡرَ کے معنٰی آتے ہیں، اس نے اونٹ کو اس طرح ذبح کیا، لیکن لغت میں النحر اور النحریر کے معنٰی ہیں، ماہر، عقلمند، تجربہ کار، ہر بات سمجھ کر اختیار کرنے والا، اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے والا، چنانچہ کہتے ہیں نَحَرۡتُ الشَّیۡءَ عِلۡمًا ''میں علم کی رو سے اس معاملہ پر حاوی ہو گیا''۔ [1]

لغات القرآن میں یہ معانی بیان کرنے کے بعد، آیت کا معنٰی و مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے۔

اس لیے وَانۡحَر (۲/۱۸) کے معنٰی ہوں گے، اس پروگرام کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری طرح حاوی ہو کر، ان پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا ہو۔ [2]

''مفکر قرآن'' صاحب، شاید یہ سمجھتے تھے کہ کسی قرآنی لفظ کے عربی لغات میں پائے جانے والے دس پندرہ معانی میں سے، لاٹری کے ذریعہ، کسی ایک معنٰی کو چنتے ہوئے، اپنے خودساختہ جملوں میں استعمال کر ڈالنے سے، قرآنی آیات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

لغوی انحراف کا جائزہ

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وَانۡحَرۡ کا معنٰی --- ''علمی طور پر کسی معاملے پر حاوی ہونا'' اگر کسی لغت کی کتاب سے ثابت بھی ہو، تو یہ صرف اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے، جبکہ کوئی قرینہ، اس معنٰی کا مؤید ہو، جو مثال پرویز صاحب نے دی ہے، وہ مجھے لغت کی کسی کتاب میں نہیں مل سکی، تاہم اگر اُن کی یہ خودساختہ مثال --- نَحَرۡتُ الشَّیۡءَ عِلۡمًا --- درست بھی قرار دیجائے، تب بھی یہاں علماً کا قرینہ، یہ معنٰی لینے کے حق میں ہے، لیکن سورۃ الکوثر میں سرے سے ایسا کوئی قرینہ موجود ہی نہیں ہے، لہٰذا یہاں یہ معنٰی کسی طرح بھی مراد نہیں لیے جا سکتے۔

(۲) ----- دوسری بات یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے بنیادی معنٰی کے ذریعہ، قرآنی مفردات کی تشریح و توضیح کرنے کے اپنے مزعومہ اصول کو یہاں پسِ پُشت ڈال دیا ہے، صاحب تاج العروس کے حوالہ سے، انھوں نے جو چھ معانی بیان کیے ہیں، ان پر تفصیلی کلام کی گنجائش موجود ہے، تاہم انھیں مناسب اور موزوں معانی قرار دے بھی دیا جائے، تو بھی ان چھ معانی میں نَحۡر بمعنی سینہ کے بالائی حصہ کا مفہومِ اساسی پایا جاتا ہے، لیکن ''مفکر قرآن'' کے بیان کردہ معنٰی --- ''پروگرام کے

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۴۸ [2] لغات القرآن، صفحہ ۱۵۹۲

متعلق، تمام امور پر، علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری طرح حاوی ہو کر، ان پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا ہونے" --- کے مفہوم میں تو یہ بنیادی معنٰی سرے سے پایا ہی نہیں جاتا، حالانکہ وَانْحَرْ کے ترجمہ --- "تو قربانی کر" --- میں، یہ بنیادی مفہوم بدرجہ اتم موجود ہے بالخصوص، اونٹ کی قربانی، تو نحر پر نیزہ مار کر، ذبح کرنیکی صورت ہی میں کی جاتی ہے۔

(۳) ----- تیسری بات یہ کہ النِحو اور النِحْرِیْر سے، اپنے مزعومہ معانی اخذ کرنا، صرف اسی صورت میں ممکن تھا، جبکہ النِحْو اور النِحْرِیْر سے واقعتاً فعل ماضی، فعل مضارع یا فعل امر وغیرہ بنانے کا عمل، اہل عرب اور کتب لغات میں پایا جاتا ہو، جبکہ ایسی کسی مثال کا پیش کیا جانا، قطعاً ممکن نہیں ہے۔ نَحر مصدر سے مطلق نَحَرَ فُلَانٌ بولا جائے، تو اس سے ہر شخص یہی سمجھے گا کہ "فلاں نے اونٹ کی قربانی کی" --- اور فعل امر اِنْحَرْ سے بھی یہی مفہوم ہوگا کہ "تو قربانی کر"، لیکن النِحْو اور النِحْرِیْر کے الفاظ سے اس قسم کے افعال کی نظیر پیش کرنا ممکن نہیں ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے "مفکر قرآن" کی عربی زبان سے واقفیت کس قدر سطحی تھی۔

(۴) ----- چوتھی بات یہ ہے کہ اِنْحَرْ کا فعل امر، نَحر کے مصدر سے ہے، جبکہ النِحْو اور النِحْرِیْر کا معنٰی یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ سرے سے مصدر ہیں ہی نہیں، بلکہ یہ، اپنے اندر اسم فاعل کا معنٰی رکھتے ہیں۔ اب "مفکر قرآن" کا اسے مصدر قرار دینا --- اور پھر اس سے اِنْحَرْ کا فعل مراد لینا --- اور پھر اس سے مزعومہ معانی کشید کرنا --- یہ سب کچھ ایک دیوار کج پر مسلسل ٹیڑھے ردّے جماتے چلے جانے کے مترادف ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود، ہمارے "مفکر قرآن" صاحب، وَانْحَرْ کے ترجمہ "قربانی کر" کو رد کرتے ہوئے، اپنے خود ساختہ "ماڈرن ترجمہ" پیش کرنے کے بعد، فرماتے ہیں۔

> یہ ہے ہماری بصیرت کی رو سے، اس سورہ میں وَانْحَرْ کا مفہوم، اس سے مروجہ قربانی کی سند لینا، بعید از کار سی بات ہے۔[۱]

لیکن ایک وقت تھا، کہ "مفکر قرآن" صاحب، خود بھی یہی "بعید از کار سا" ترجمہ کیا کرتے تھے۔

> فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ (۲/۱۰۸) لہٰذا اپنے رب کے لیے نماز قائم کرو اور قربانی کرو۔[۲]

قرآن وہی، اس کے الفاظ وہی، لیکن "مفکر قرآن" کا ترجمۂ آیات بدلتا رہا، کیوں؟ اس لیے کہ قرآنی ترجمہ، بلکہ خود قرآن بھی، ہمیشہ ان کے افکار و نظریات کے تابع ہی رہا، اور ان کے افکار و نظریات، وہ چیز تھے، جو ہمیشہ تغیر پذیر رہے۔

قربانی اور پرویز صاحب کا شروط ثلاثہ

"مفکر قرآن" نے قربانی کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے، یہ فرمایا ہے کہ

> اگر وَانْحَرْ سے مراد بالضرور "قربانی" لینا ہے تو قرآن کریم کی رو سے ان شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہوگا۔[۳]

اس کے بعد، انھوں نے تین شرطیں بیان کی ہیں، ہم ان میں سے ہر شرط کا جائزہ لے رہے ہیں۔

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۴۹ [۲] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۳۶۹ [۳] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۴۹

پہلی شرط

''مفکرقرآن'' کی پہلی شرط، ان الفاظ میں مذکور ہے۔

> ایک تو یہ نحر صرف اونٹ ذبح کرنے کو کہتے ہیں، کسی اور جانور کے ذبح کرنے کو نہیں، اس لیے قربانی صرف اونٹوں کی دی جائے گی۔ [1]

جائزہ

ہاں! یہ درست ہے کہ ''نحر'' اونٹ ذبح کرنے کو کہتے ہیں، لیکن ذبح اونٹ کا بطور خاص حکم دینے سے، دوسرے جانوروں کو ذبح کرنے کی نفی کیسے ہوگئی؟ اگر آپ کسی مہمان سے یہ فرمائیں کہ --- ''دودھ نوش فرمایئے'' --- تو کیا اس پر دودھ کی تخصیص سے پانی اور چائے وغیرہ پینے کی نفی لازم آئے گی؟ اب اگر ''نحر'' میں اونٹ کی قربانی، دیگر جانوروں کی قربانیوں کے لیے عدمِ جواز کی دلیل ٹھہرتی ہے، تو اسی بناء پر قرآن میں، ممانعت خمر کے حکم کو، دیگر اشیاء کی عدم ممانعت کی دلیل ہونا چاہئے، لیکن خود ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، ممانعتِ خمر اور حرمتِ شراب کے حکم میں وہ اشیاء بھی داخل کرتے ہیں، جن پر سرے سے ''پینے کے فعل'' کا اطلاق ہی نہیں ہوتا، چنانچہ حرمتِ خمر کے حکم میں، ''مفکر قرآن'' کی طرف سے یہ مضحکہ خیز تشریحات بھی ملاحظہ فرمایئے۔

> خمر وہ ہے جس سے انسان کی عقل وفکر، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، مسلوب و مضمحل ہو جائے، آپ سوچئے کہ اس میں کیا کیا باتیں نہیں آ جاتیں؟ سب سے پہلے تو ''مذہب'' ہے جس میں سوچنے سمجھنے کو گناہ اور ابلیس کی روش، قرار دیا جاتا ہے۔ [2]

لیکن یہ کس کی مجال تھی کہ ''مفکر قرآن'' سے یہ استفسار کرتا کہ --- ''جناب! جب نحر کی قربانی میں، اونٹ کے سوا، کوئی اور قربانی شامل نہیں ہے، تو ممانعت شراب میں ''مذہب پینے'' کی ممانعت کیسے داخل ہوگئی؟'' اور جس طرح آپ شراب پینے کی حرمت کے حکم میں ''مذہب پینے'' کی حرمت کو داخل کرتے ہیں، اسی طرح، اگر کوئی شخص، اونٹ کی قربانی کو نحر کی بناء پر، اور دیگر جانوروں کی قربانی کو ''نسک'' کی بناء پر اختیار کرتا ہے تو وہ موردِ الزام کیوں ہو؟

مصلحتِ ذبحِ اونٹ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سابقہ بحث کی روشنی میں، اگر ''نسک'' سے مراد مطلق قربانی ہے، تو آخر سورۃ الکوثر میں، خاص طور پر ''نحر'' کے لفظ سے اونٹ کی قربانی کا حکم کیوں دیا گیا؟ تو اس کا جواب، ہم اپنی طرف سے دینے کی بجائے، خود پرویز صاحب ہی کی ایک تحریر سے پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

> ہجرت کے بعد، جب رسول اللہؐ، مدینہ تشریف لائے، تو حالت یہ تھی، کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار و مہاجرین دونوں) غریب اور کمزور تھی، اور مدینہ میں یہود کا بڑا زور تھا، ایسے حالات میں کمزور جماعتیں، ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۵۰ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۳۲۱

ڈھونڈتی ہیں اور اس کے لیے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں، یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا، اور مسلمانوں کے ہاں حلال۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابل اعتراض سمجھتے تھے، وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بناء پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہیں گے، اور اونٹ ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے، قرآن کریم نے عین اس مقام پر حکم دیا کہ ''مدینہ میں اونٹ ذبح کرو''۔ یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو''۔ [۱]

یہ تھی وہ خاص مصلحت، جس کے پیشِ نظر، قرآن نے ''نحر'' کا لفظ بول کر، خاص طور پر ''اونٹ کی قربانی'' کا حکم دیا ہے، ورنہ ''نسک'' کے لفظ میں، دیگر جانوروں کی قربانی کا حکم پہلے ہی شامل ہے۔ اونٹ کے حکمِ ذبح کی مصلحت کو واضح کرتے ہوئے، خود ''مفکرِ قرآن'' نے یہاں ''وَانحر'' کا ترجمہ ''اونٹ ذبح کرو'' کیا ہے، یہاں ان کی یہ ثنویت بھی قابلِ غور ہے کہ جب چاہا تو وَانحر کا ترجمہ یہ کر دیا کہ --- ''اس پروگرام کے متعلق، تمام امور پر، علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری طرح حاوی ہو کر، ان پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا رہو'' --- اور جب جی چاہا تو ترجمہ یہ فرما دیا کہ ''اونٹ ذبح کرو'' اور اس حکم کی مصلحت بھی واضح کر دی کہ ذبحِ اونٹ سے یہود کی مخالفت مقصود ہے، تاکہ ان کے ساتھ مفاہمت کا خیال تک اہل ایمان کے دلوں میں نہ آنے پائے۔

پھر یہاں، یہ امر بھی واضح ہے کہ مدینہ میں ''اونٹ کی قربانی کرو'' کے حکم کا اتباع محض اِکّا دُکّا افراد، اپنی انفرادی حیثیت میں کرتے، تو اس سے وہ مقصد ہرگز پورا نہ ہو سکتا تھا، جس کے لیے یہ حکم دیا گیا تھا، مقصودِ پیشِ نظر کی روشنی میں، یہی بات تو قرینِ قیاس تھی، کہ اس حکم پر عمل، اجتماعی طور پر، جماعتی حیثیت میں، ایک ہی وقت میں کیا جاتا، تاکہ ایک طرف، یہ عمل یہود کی مخالفت کے باعث، اُن سے مفاہمت کے ہر خیال کو، اہل ایمان کے دل و دماغ سے نکال دیتا، تو دوسری طرف، ایک ہی وقت میں، انجام پانے والا یہی عمل، مسلمانوں کی شان و شوکت کا مظہر بھی قرار پاتا، اور اجتماعی قربانی کا ایک ہی وقت فطرتاً وہی ہو سکتا تھا، جب حرم میں، حج کے موقع پر، قربانیاں ہو رہی ہوں، اور یہی عملاً نبی کریم ﷺ کے زمانے میں کیا بھی گیا، پس اس صورتحال میں قربانی صرف کعبہ ہی میں نہیں بلکہ خارج از کعبہ بھی، ایک دینی شعار کی حیثیت سے مدینہ میں آغاز پذیر ہوئی اور پھر جوں جوں اسلام کا دائرہ پھیلتا چلا گیا، قربانی بھی اسی نسبت سے بیرونِ حرم، تواتر و تسلسل کے ساتھ پھیلتی چلی گئی۔

دوسری شرط

''مفکرِ قرآن'' نے قربانی کے جواز کو جس دوسری شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے، وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

قرآن کریم نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کا مقام، خانہ کعبہ کو قرار دیا ہے، اس لیے یہ قربانی، حج کے مقام پر کی جائے گی۔ [۲]

جائزہ

انتہائی مقامِ افسوس ہے کہ پرویز صاحب، بزعمِ خویش، عمر بھر قرآن کے تحقیقی مطالعہ میں مستغرق رہنے کے باوجود بھی، یہ نہ جان پائے کہ کعبہ میں کی جانے والی قربانیوں، اور خارج از کعبہ، دیگر مقامات پر کیجانے والی قربانیوں میں کیا فرق ہے؟ اول

[۱] لغات القرآن، صفحہ ۱۵۹۲ [۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۵۰

الذکر قربانیوں کے لیے، قرآن ''ہدی'' کا لفظ استعمال کرتا ہے خواہ یہ کسی جنایت کی پاداش میں ہو یا مناسکِ حج کے طور پر ہو۔

ہدی نسک اور نحر کا باہمی فرق

جبکہ ثانی الذکر قربانیوں کے لیے، وہ ''نسک'' اور ''نحر'' کا لفظ استعمال کرتا ہے، البتہ ''نسک'' کے لفظ کا اطلاق، خارج از حرم، قربانیوں کے علاوہ، اس ''خون'' پر بھی کیا جاتا ہے جو کسی مجبوری کے باعث، سر منڈوا دینے کی رعایت پانے پر، بطور شکرانہ کے واجب قرار پائے، اگر کوئی قربانی، مرض یا تکلیفِ رأس کے باعث، مجبوراً سر منڈوا دینے کے باعث لازم قرار نہیں پائی تو اس کا مقام و محل، خارج از حرم ہے جبکہ ''ہدی'' خاص طور پر، اس قربانی کو کہا گیا ہے، جس کا مقام و محل، بیت العتیق ہے، قرآن پاک کی درج ذیل آیات، اس پر شاہد ہیں۔

(۱) --- فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوا رُؤُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ (البقرہ-۱۹۶) اور اگر تم گھر جاؤ تو ''ہدی'' (حرم میں کی جانے والی قربانی) میسر آئے، اسے اللہ کے حضور پیش کر دو اور سر نہ منڈاؤ، یہاں تک کہ ''ہدی'' اپنے ٹھکانے پہنچ جائے۔

(۲) --- هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا أَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهُ (الفتح-۲۵) وہی لوگ تو ہیں، جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ''ہدی'' کے جانوروں کو قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔

(۳) --- هَدْيًا ۢ بَالِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ - ۹) یہ قربانی، کعبہ کو پہنچنے والی ہو۔

ان آیات میں، اس امر کی تصریح ہے کہ ''ہدی'' سے مراد، وہ ''قربانیاں'' ہیں جن کا مقام و محل، حرمِ کعبہ ہے۔ ان آیات کے علاوہ، یہ لفظ، جہاں بھی استعمال ہوا ہے، ''حرم کی قربانیوں'' ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

الغرض، قرآن کریم نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ''ہدی'' کا اطلاق، صرف ان ''قربانیوں'' پر ہوتا ہے، جو حدودِ حرم میں کی جائیں، جبکہ ''نسک'' و ''نحر'' مطلق قربانی کو کہتے ہیں۔ ''نسک'' کے کعبہ میں کیے جانے کی صورت، صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ یہ قربانی، اس رعایت کے شکریے کے نتیجہ میں واجب ہو جبکہ حالتِ مرض یا تکلیفِ رأس کے باعث، مُحرِم، سر نہ منڈوانے کی پابندی پر قائم نہ رہ سکے، (یہ بہر حال ایک ایسی مجبوری ہے جو اس کے ارادہ و اختیار سے، اس پر وارد نہیں ہوئی)۔

اب جبکہ، قرآن کریم، درونِ حدودِ حرم اور بیرونِ حرم کی جانے والی قربانیوں میں واضح فرق و امتیاز قائم کرتا ہے، تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان فروق و امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر، یہ حکم جاری کرے کہ --- ہدی کی قربانی ہو، یا نسک و نحر کی قربانی، ہر ایک کا مقام، کعبہ ہی ہے --- صرف قرآن ہی نہیں بلکہ لغاتِ عرب بھی، ان دونوں قسم کی قربانیوں میں فرق و امتیاز کرتے ہوئے، صرف ''ہدی'' کو مقامِ حرم سے وابستہ کرتی ہیں، جیسا کہ خود پرویز صاحب بھی لکھتے ہیں۔

> هَدْيٌ اور هَدِيٌّ اس جانور کو کہتے ہیں، جو حج کے موقع پر بیت اللہ پر ذبح کرنے کے لیے، لے جاتے ہیں۔[1]

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۷۵۶

اور یہ فرق، اتنا واضح ہے کہ عرف عام میں بھی اس کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''لِلّٰهِ عَلَيَّ الْهَدْیُ'' (مجھ پر اللہ کے لیے ''ہدی'' لازم ہے) تو ہر شخص یہی سمجھے گا کہ قائل پر ایسی قربانی لازم ہے، جو حرم کعبہ میں کی جائے گی، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''لِلّٰهِ عَلَيَّ النَّسِیْكَةُ'' (مجھ پر، اللہ کے لیے ذبیحہ یا خون لازم ہے) تو ہر شخص یہی سمجھے گا کہ جو ''خون'' ، ''ذبیحہ'' یا ''قربانی'' قائل پر لازم ہے، وہ جہاں چاہے کر دے، حرم کی حدود میں اس کا کرنا، لازم اور واجب نہیں ہے، لہٰذا، پرویز صاحب کا، ہر قسم کی قربانی کے متعلق، یہ شرط عائد کرنا کہ اسے حرم کعبہ ہی میں کیا جائے، نہ صرف یہ کہ خلافِ قرآن ہے، بلکہ لغاتِ عربیہ کے بھی خلاف ہے۔

''مفکرِ قرآن'' کے موقف کا باطل اور بے بنیاد ہونا، اس امر سے بھی واضح ہے کہ اگر ہر قسم کی قربانی کا مقام و محل، کعبہ ہی ہو، تو مدینہ میں، اہل ایمان کے لیے، عین یہودیوں کے گڑھ میں ''اونٹ ذبح کرو'' کا حکم بے معنٰی ہو کر رہ جاتا ہے، کیونکہ مدینہ میں یہودیوں کا زور تھا، اور مدینہ ہی میں، اونٹ ذبح کرنے سے، ان کی مخالفت لازم آتی تھی، مقام حرم میں تو ہر قسم کی قربانی، عہد جاہلیت ہی سے ہوتی آئی تھی، اس لیے مسلمان، وَانْحَرْ کی اطاعت میں، اونٹ کی قربانی، مدینہ میں، اگر نہیں کرتے تھے، اور صرف حدودِ حرم ہی میں کرتے تھے، تو ایسی مخالفت قطعی بے فائدہ اور بے اثر ہوتی۔ آپ خود سوچیے! کہ ہندوؤں کے ہاں گائے کی قربانی ممنوع ہے جبکہ مسلمانوں کے ہاں حلال و جائز ہے، اب اگر مسلمان، ہنود کی مخالفت میں، گائے کی قربانی، بھارت میں کرنے کی بجائے، بیرون ہند کرتے پھریں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟

''ہدیٰ'' اور پرویز صاحب

''ہدیٰ'' کا لفظ، جو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے، اس کے متعلق، پرویز صاحب ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

> ہدیٰ جمع ہے هَدِيَّةٌ کی، جس کے معنٰی ہیں تحفہ، خود قرآن میں ہے بَلْ أَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (۲۷/۳۶)۔ اس لیے ضروری نہیں کہ ہدیٰ صرف قربانی کے جانور ہی ہوں۔ [۱]

اس چھوٹے سے اقتباس میں ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے تین لغزشوں کا ارتکاب کیا ہے۔

(۱) ہدیٰ جمع ہے۔

(۲) هَدِيَّةٌ، جس کا معنیٰ تحفہ ہوتا ہے، اس کی ہی جمع ہدیٰ ہے۔

(۳) ضروری نہیں کہ ہدیٰ صرف قربانی ہی کے جانور ہوں۔

پہلی لغزش

پرویز صاحب کی پہلی لغزش یہ ہے کہ انھوں نے ہدیٰ کو جمع قرار دیا۔ افسوس کہ جو شخص، اٹھتے بیٹھتے، اپنے آپ کو قرآنی تحقیق میں، عمر کھپا دینے والا، محقق ظاہر کرتا رہا، اس نے ''ہدیٰ'' کے واحد یا جمع ہونے کا فیصلہ قرآنی اساس پر نہیں کیا بلکہ کسی

---

[۱] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۸۰

کتاب میں ایسا دیکھا اور مکھی پر مکھی مارتے ہوئے ''ھدیٰ'' کو جمع قرار دے ڈالا، حالانکہ کتاب اللہ نے، اُسے جمع نہیں بلکہ واحد قرار دیا ہے، قرآنی آیات، اس پر شاہد ہیں۔

۱ --- حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ یہاں تک کہ حرم کی قربانی، اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔

۲ --- هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ ''ہدیٰ'' کعبہ کو پہنچنے والی ....

۳ --- وَالْهَدْىَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ہدی جو اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے روکی گئی۔

ان آیات میں يَبْلُغَ، بَالِغَ، مَعْكُوفًا اور مَحِلَّهٗ میں ضمیر مُضاف اِلَیہ، یہ سب واحد کے صیغے ہیں، جو ''ہدیٰ'' کے واحد ہونے کی دلیل ہیں۔ اگر ھدیٰ جمع ہوتی، تو يَبْلُغَ کی بجائے تَبْلُغَ، بَالِغَ کی بجائے بَالِغَةً، مَعْكُوفًا کی بجائے مَعْكُوفَةً اور مَحِلَّهٗ کی بجائے مَحِلَّهَا کے الفاظ ہوتے۔ لہٰذا، پرویز صاحب کا ''ہدیٰ'' کو محض کسی کتاب کی بناء پر، جمع قرار دینا، اسی تقلیدی روش اور ''اندھے کی لاٹھی کا سہارا لینے'' کا نتیجہ ہے، جس کی تردید کرتے ہوئے وہ فخر محسوس کیا کرتے تھے۔

دوسری لغزش

''مفکرِ قرآن'' کی دوسری لغزش یہ ہے کہ وہ هَدِيَّةٌ کی جمع ''هَدْىٌ'' کو سمجھتے ہیں، هَدِيَّةٌ کی جمع، قرآن پاک میں استعمال نہیں ہوئی، لہٰذا اس کے لیے کتبِ لغت کی طرف رجوع ناگزیر ہے، اور کتبِ لغت میں هَدِيَّةٌ کی جمع، تین طرح وارد ہوئی ہے، هَدَايَا - هَدَاوِى اور هَدَاوٍ

پھر ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر هَدْىٌ واقعتاً هَدِيَّةٌ ہی کی جمع ہوتی، تو اس کی یاء مشدّد ہوتی، یعنی وہ هَدْىٌ کی بجائے هَدِىٌّ ہوتی۔ لیکن قرآن کریم میں، یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے، بغیر کسرۂ دال اور بغیر یائے مشدّد کے آیا ہے، ہر جگہ، ''سکونِ دال'' اور ''تخفیفِ یا'' ہی کے ساتھ (هَدْىٌ) مذکور ہے۔ اس لیے هَدِيَّةٌ اور هَدْىٌ کو محض مشابہتِ لفظی کی بناء پر، واحد جمع کے رشتے میں منسلک کرنا، نری کوتاہ نظری اور جہالت ہے، ہاں، البتہ هَدْىٌ کا ترجمہ، اسم جنس کے طور پر، جمع کی صورت میں بھی ممکن ہے، اہلِ علم نے بھی، اسے اس طرح استعمال کیا ہے، لیکن بجائے خود، لفظ هَدْىٌ ، کتاب اللہ کی روشنی میں جمع نہیں بلکہ واحد ہے۔

تیسری لغزش

''مفکرِ قرآن'' کی تیسری لغزش یہ ہے کہ ان کے نزدیک --- ''یہ ضروری نہیں کہ هَدْىٌ صرف قربانی کے جانور ہی ہوں'' --- حالانکہ هَدْىٌ کا اطلاق، لُغۃً، عُرفاً اور شرعاً ہوتا ہی قربانیوں کے اُن جانوروں پر ہے، جو حرم میں ذبح کیے جائیں، اس پر پہلے تفصیل سے بحث ہو چکی ہے، حتّٰی کہ خود، پرویز صاحب کی لغات القرآن میں بھی، هَدْىٌ سے مراد، ''بیت اللہ میں ذبح ہونے والے، قربانی کے جانور'' ہی لیے گئے ہیں، یہی معنٰی دورِ نزولِ قرآن میں متداول تھے، ہم موصوف کا یہ اقتباس، تکرار کی کوفت کے باوجود، دوبارہ ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔

هَدْیٌ اور هَدِیٌّ اس جانور کو کہتے ہیں، جو حج کے موقع پر بیت اللہ پر ذبح کرنے کے لیے، لے جاتے ہیں۔ [۱]

اس کے بعد بھی، یہی رٹ لگائے جانا، کہ ''ضروری نہیں کہ ہدی صرف قربانی کے جانور ہی ہوں'' ایک بیجا ہٹ دھرمی ہے، جس کی پشت پر، تحقیق حق کا کوئی مخلصانہ جذبہ نہیں، بلکہ مخالفتِ قربانی کا معاندانہ جذبہ کام کر رہا ہے۔

اب چونکہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب کا ذہن، قربانی کے خلاف ہو گیا ہے، اور وہ قربانی کا خون بہانا پسند نہیں کرتے، اس لیے ان کی کوشش یہ ہے کہ ان کے ذہنی تغیر کے ساتھ، خود قرآن بھی بدل جائے، اس نظریہ ضرورت کے تحت، اب ھدی سے قربانی کاؤ ہ جانور مراد لینے کی بجائے، جس کا مقامِ ذبح، حدودِ حرم ہے، وہ ''کوئی سا تحفہ'' مراد لے رہے ہیں، جسے حرم میں بھیجا جا سکے، اب هَدْیٌ کی ایک ''نئی تحقیق'' ان الفاظ میں سامنے آ رہی ہے۔

> ضروری نہیں کہ ھدی صرف قربانی کے جانور ہی ہوں، فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے، یعنی تحائف میں سے جو کچھ بھی میسر آ جائے، اسے کعبہ بھیج دے تاکہ وہاں جمع ہونے والوں کے کام آئیں، عربوں کے ہاں بہترین تحائف ان کے جانور تھے، اس لیے وہ جانوروں کو بطور تحائف پیش کرتے تھے، لیکن ضروری نہیں کہ تحائف، صرف جانور ہی ہوں۔ [۲]

یوں ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اپنے بدلتے ہوئے ذہن کے مطابق، قرآن کو تغیر و تبدّل اور ترمیم و تحریف کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔

قربانی کی تیسری شرط اور اس کا جائزہ

قربانی کو ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے، جس تیسری شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے، وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

> قرآن کریم نے بالتصریح کہا ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کا گوشت، تم خود بھی کھاؤ اور وہاں کے محتاجوں کو بھی کھلاؤ، لہٰذا صرف اتنے اونٹ ذبح کیے جائیں، جن کا گوشت کھانے کے کام آ سکے، بنابریں، جس طرح، آجکل، حج کی تقریب پر، لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں ذبح کر کے زمین میں دبا دی جاتی ہیں اور تمام دنیا میں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جانور ذبح کیے جاتے ہیں، قرآن کریم سے اس کی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔ [۳]

پرویز صاحب کی اس شرط کا جائزہ ہم کئی پہلوؤں سے لے رہے ہیں۔

جائزے کا اولین پہلو

سب سے پہلی بات تو یہ غور طلب ہے کہ انھوں نے حج کے عالمگیر اجتماع میں قربانیوں کا مقصد محض ''ضیافت خوری'' قرار دیا ہے، چنانچہ ان کی ساری گفتگو کا مرکزی نقطہ یہی قرار پاتا ہے کہ ''اجتماعِ حج''، محض ''گوشت خوری'' کی ایک پارٹی ہے، تو اس پارٹی میں، اتنے ہی جانور ذبح کیے جانے چاہیں جو افرادِ اجتماع کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوں، انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کی کئی جگہ وضاحت کی ہے۔

---

[۱] لغات القرآن، صفحہ ۱۷۵۶ [۲] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۸۰ [۳] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۵۰

نمایندگانِ ملتِ اسلامیہ کے عالمگیر اجتماع میں، ہدی کی قربانی اس لیے ہے کہ وہاں لوگ ایک دوسرے کی دعوت کریں۔ [1]

ایک اور مقام پر مشعرحرام کی تشریح کرتے ہوئے، لکھتے ہیں کہ:

مشعر کے معنیٰ ہیں وہ مقام جہاں عقل وشعور کی رو سے معاملات پر بحث وتمحیص کی جائے، اور چونکہ ان معاملات کا تعلق نظامِ خداوندی سے ہوگا، اس لیے اسے حرام یعنی واجب الاحترام بھی قرار دیا، یہاں یہ نمایندگان حسبِ ضرورت دو یا تین دن قیام کریں گے، اس پروگرام کی عملی جزئیات اور ان کے سلسلہ میں باہمی تعاون وتناصر کے سلسلے میں، بحث وتمحیص بھی ہوگی، اور ایک دوسرے کی ضیافتیں بھی --- آج دوپہر کا کھانا نمایندگانِ پاکستان کی طرف سے، رات کا کھانا، اہل افغانستان کی طرف سے (وقس علے ذالک)، اِن ضیافتوں کے لیے، وہ جانور ذبح ہوں گے جنھیں یہ لوگ، اس مقصد کے لیے، ساتھ لائے تھے، یا جو دوسرے لوگوں نے تحفۃً بھیجے تھے۔ [2]

قربانی کی حیثیت کے بارے میں، علماءِ امت اور ہمارے ''مفکرِ قرآن'' کے نقطۂ نظر میں، یہ بنیادی اختلاف ہے کہ علماءِ کرام کے نزدیک، یہ اجتماع سراسر ایک تعبّدی امر ہے جس کی انجام دہی کے لیے، دنیا بھر کے مسلمان، بیت اللہ کا قصد کر کے آتے ہیں، جبکہ ''مفکرِ قرآن'' کے نزدیک حج کا اجتماع، ''گوشت خوری'' کی ایک بین الاقوامی پکنک پارٹی ہے، فریضۂ حج کا مقصد ہی دراصل، ان تعبدی امور کو بجالانا ہے، جنھیں قرآن نے مناسکِ حج کہا ہے لیکن ''مفکرِ قرآن'' کے نقشۂ حج میں، سوائے گوشت خوری اور پروگرام سازی کے اور کوئی ایسی بات نہیں جسے مناسک حج کہا جا سکے، حالانکہ قرآن نے حج کو، خدا کا ایک ایسا حق قرار دیا ہے، جو بندوں پر عائد کیا گیا ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران-۹۷) اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے، وہ اس کا حج کرے۔

پھر مشرکین کے برعکس، جو غیر اللہ کے استھانوں پر جانوروں کی قربانی دیتے ہیں، اہل ایمان کو یہ حکم ہے کہ وہ آستانۂ خداوندی پر آ کر، ان جانوروں کی قربانی دیں، جو کسی غیر اللہ کی نہیں، بلکہ خود خدا ہی کی پیدا کردہ مخلوق ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی یا طریقۂ قربانی مقرر کیا تاکہ لوگ اپنے جانوروں (بہیمۃ الانعام) پر اللہ کا نام لیں (اور انھیں ذبح کریں)۔

اور جب یہ قربانی دے لیں، تو اس میں سے خود بھی کھائیں اور تنگدست فقراء کو بھی کھلائیں، --- الغرض، قربانیوں کا اصل مقصد، رضائے الٰہی کی طلب میں، خدا کی عطا کردہ حیوانی دولت کو، اسی کے نام پر ذبح کرنا ہے۔ کھانا اور کھلانا وہ اولین مقصد نہیں ہے جس کے لیے، یہ قربانی لازم کی گئی ہے، جیسا کہ ہمارے ''مفکرِ قرآن'' نے سمجھا ہے، پس جب قربانی وحج کی یہ حیثیت واضح ہوگئی کہ یہ کوئی ''اکلِ لحم'' کا بین الاقوامی ''جشنِ ضیافت'' نہیں ہے جس میں شرکت کے لیے چار دانگ عالم سے ''گوشت خوروں'' کی ٹولیاں، سوئے حرم آ رہی ہیں، بلکہ یہ زائرینِ بیت اللہ کا وہ اجتماع ہے، جس میں بیت اللہ کا قصدِ زیارت

---

[1] قرآنی فیصلے، جلد ۱، صفحہ ۱۰۳
[2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۴۱

کرنا، سوئے حرم روانہ ہونا، مناسک حج ادا کرنا، اور قربانیاں کرنا بجائے خود عبادت ہے، جس کا مقصد حصولِ رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی ہے، جب حج اور قربانی کا اصل مقصد یہ قرار پایا تو اس بات کی کوئی اہمیت نہ رہ گئی کہ اس سے کس کس کا پیٹ بھرا؟ بلکہ پیٹ بھرا بھی یا کہ نہیں؟ یہاں آنے کا مقصد ذبیحوں کے ذریعہ اور دیگر مناسکِ حج کی ادائیگی کے ذریعہ، رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی کا حصول ہے، لہٰذا یہاں اصل اور بنیادی حیثیت، اس بات کو حاصل نہیں ہے، کہ کتنے لوگوں کی خاطر، کام و دہن کی لذت کا سامان فراہم کیا گیا، بلکہ اس بات کو حاصل ہے کہ طلبِ رضائے الٰہی میں کتنی نُسک (قربانیاں) دی گئیں؟ اور کس خلوص و للہیت سے دی گئیں، اس لیے کہ:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج-۳۷) اللہ تعالیٰ کو، ان قربانیوں کے نہ گوشت پہنچتے ہیں اور نہ خون، مگر اسے تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

جائزے کا دوسرا پہلو

حج میں ہر شخص، قربانی کرتا ہے، عام حالات میں، اگر ہر شخص، ایک ایک قربانی بھی کرے تو بھی گوشت اس قدر ہو جاتا ہے کہ شکم سیری کے بعد بھی بچ جاتا ہے، اس بچے ہوئے گوشت کو دیکھ کر، خدا کے حکم میں ترمیم کرتے ہوئے، بعض لوگوں پر سے اس قربانی کو ساقط نہیں کیا جاسکتا جسے خدائے قدوس نے شعائر اللہ قرار دیا ہے، اور جسے توحید فی العبادت اور توحید فی الاعتقاد کا سبب قرار دیا ہے، لوگوں کے پیٹوں میں یہ گوشت جائے یا نہ جائے، خدا کے بندوں کو اُس جذبۂ تشکّر کے اظہار سے روکا نہیں جاسکتا، جو خدا کی بخشی ہوئی حیوانی دولت کو، اسی کے نام پر ذبح کرنے کے لیے، انھیں تہہِ دل سے شوق و رغبت دلاتا ہے، قربانی کے گوشت کو شکم سیری کی روشنی میں، معاشی ترازو میں تول کر نہیں دیکھا جائے گا، بلکہ اعتقاد و عبادت کے اس ترازو میں وزن کر کے دیکھا جائے گا، جو توحید ربوبیت اور توحید عبودیت کا سبب و ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے قربانی اور توحید کو مقرون و متحد کر کے پیش کیا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (الحج - ۳۴) ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ (اُس امت کے) لوگ، اُن جانوروں پر اللہ کے نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں، پس تمھارا خدا ایک ہی ہے اور اسی کے تم مطیع فرمان بنو۔

خود مفکرِ قرآن نے اس آیت کا ترجمہ بایں الفاظ پیش کیا ہے۔

> ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی (یا طریقِ عبادت و قربانی) کا ایک طور طریقہ ٹھہرایا تاکہ وہ ان چوپایوں پر، اللہ کا نام لے کر ذبح کریں جو اس نے ان کو عطا فرمائے ہیں، سو تمھارا اِلٰہ وہی ایک اِلٰہ ہے، سو تم اسی کے سامنے جھکو۔ [1]

[1] معارف القرآن، جلد ا، صفحہ ۱۶

جائزے کا تیسرا پہلو

عین حج کے موقع پر، حرم پاک میں، روئے زمین سے آنے والے حاجیوں کا مشغولِ عبادت ہونا، اور ان ہی دنوں میں، خارج از حدودِ حرم، پوری امتِ مسلمہ کا نسک ونحر کے ذریعہ، ان کا شریکِ حال ہونا، ان میں ایک ہی دین وملت اور ایک ہی تہذیب وثقافت کے علمبردار ہونے کا وہ جذبہ واحساس پیدا کرتا ہے، جس کے مقابلے میں، ہر مادی نقصان ہیچ ہے، صرف اسلام ہی نہیں، ہر قوم کے قومی تہوار، افرادِ قوم میں وحدت کا وہ شعور پیدا کرتے ہیں، جوان کے قومی تشخص کو اجاگر کرتا بلکہ نشوونما دیتا رہتا ہے، اس قیمتی شعور واحساس کو معاشی اخراجات کے گز سے نہیں ناپا جا سکتا۔ آج مسیحیت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، مسیحی افراد، وطنی، لونی، لسانی، اور معاشی طور پر کئی طبقوں اور حصوں میں بٹے ہوئے ہیں، شاید ان کے درمیان، (مسیحیت کے نام کے علاوہ) کوئی قدرِ مشترک عملاً باقی نہیں ہے، ماسواء، اس تہوار کے، جو وہ ''کرسمس'' کے نام پر مناتے ہیں، سال بھر کے بعد، یہ تہوار، اگر روئے زمین پر پھیلے ہوئے، تمام عیسائیوں میں، ایک مذہب وملت کے افراد ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے، تو ان کے ہاں، یہ احساس، ایسی نعمتِ گرانمایہ ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں، اس پر اٹھنے والے مصارف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اگر آپ کسی عیسائی سے یہ کہیں کہ --- ''جناب! اس تہوار پر جس قدر خرچ کرتے ہیں، اسے آپ رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف کر کے، اپنی قوم کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں، لہٰذا، اس تہوار کو منانا چھوڑ دیں'' --- تو وہ آپ کی معاشی میزان پر تلی ہوئی اس نصیحت کو آپ کے سر پر دے مارے گا، ہندوؤں سے بڑھ کر، زر پرست اور روپے پیسے پر، جان دینے والی قوم، اور کونسی ہو سکتی ہے؟ یہ لوگ بھی اپنے تہواروں پر اٹھنے والی رقوم کو، اقتصادیات کے ترازو میں تولنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں، کیونکہ یہ تہوار، ان میں یکجہتی کا احساس، اور وحدت کا شعور پیدا کرتے ہیں، لیکن ہمارے مہربان، یہ وعظ فرماتے نہیں تھکتے کہ --- ''ہر سال، جتنے جانور، عید الاضحیٰ کے موقع پر ذبح کیے جاتے ہیں، اگر ان کی قیمت، حکومت کے حوالہ کر دیجائے، تو سینکڑوں رفاہِ عامہ کے کام ہو سکتے ہیں'' ---

اقتصادی اعتراضات کا جائزہ

قربانی پر منکرینِ حدیث کے اعتراضات کا جائزہ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بڑے خوبصورت انداز میں لیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ

> اب ذرا اقتصادی اعتراضات کو بھی جانچ لیجئے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ اضاعتِ مال ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ اور فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ''اس میں تمھارے لیے بھلائی ہے'' اور ''اس میں سے خود بھی کھاؤ اور مانگنے والے سائل کو بھی کھلاؤ''۔ آج آپ کے اپنے ملک میں لاکھوں اللہ کے بندے ایسے ہیں، جن کو ہفتوں اور مہینوں اچھی قوت بخش غذا نصیب نہیں ہوتی، کیا ان کو صدقہ، ہدی اور نسک کے ذریعے سے گوشت بہم پہنچانا، آپ کی رائے میں اصولِ

معیشت کے خلاف ہے؟ لاکھوں انسان اور گلہ بان ہیں جو سال بھر تک جانور پالتے ہیں اور بقرعید کے موقع پر، ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، کیا ان کی روزی کا دروازہ بند کر دینا، آپ کے نزدیک بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا ہے؟ ہزار ہا غریب ہیں جن کو قربانی کی کھالیں مل جاتی ہیں اور ہزار ہا قصائی ہیں جن کو ذبح کرنے کی اجرت مل جاتی ہے، کیا یہ سب آپ کی قوم سے خارج ہیں کہ آپ، ان کی رزق رسانی کو فضول بلکہ مضر اور داخل اسراف سمجھتے ہیں؟

پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ کو تمام قومی ضروریات اور سارے فوائد و منافع، صرف اسی وقت یاد آتے ہیں، جب خدا کے کسی حکم کی پابندی میں روپیہ صرف ہو رہا ہو؟ گویا بینکوں کا قیام، اور قومی ادارات کا فروغ، اور اعتقاد و اخلاق کی اصلاح اور یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کا سارا کام، صرف قربانی ہی کی وجہ سے رکا پڑا ہے، اِدھر یہ بند ہوئی اور اُدھر قومی اداروں پر روپیہ برسنا شروع ہو جائے گا۔

اگر آپ کی قومی تنظیم ایسی ہی مکمل ہے کہ سارے ملک کا روپیہ جمع کر کے آپ ہر سال، ایک تجارتی بینک کھول سکتے ہیں تو ذرا سی تکلیف گوارا کر کے پہلے ملک بھر کے سینما ہالوں اور قحبہ خانوں اور بدکاری و اسراف کے دوسرے اڈوں پر تو اپنے ایجنٹ مقرر فرمایئے، تاکہ مسلمانوں کا جس قدر روپیہ وہاں ضائع ہوتا ہے وہ قومی فنڈ میں وصول ہونا شروع ہو جائے، اس طرح آپ ہر سال نہیں بلکہ ہر روز ایک تجارتی بینک کھول سکتے ہیں۔

پھر اگر آپ میں کچھ تعمیری قوت ہے تو قربانی کی تخریب کی بجائے، آپ اسے زکوٰۃ کی تعمیر ہی میں کیوں نہیں صرف فرماتے، کہ تنہا اسی ایک چیز سے آپ وہ تمام قومی ضروریات پوری کر سکتے ہیں جن کی خاطر، قربانی بند کرنے کی تبلیغ آپ نے شروع کی ہے۔[1]

جائزے کا چوتھا پہلو

قربانی کو ایمان و اعتقاد اور عبادت و اطاعتِ ایزدی کے ترازو میں تولنے کی بجائے، اقتصادیات کے ترازو میں وزن کرنے کی روش، فی الواقع، مادیت پر ایمان کا کرشمہ ہے، مادہ پرستی میں ڈوبے ہوئے ذہن، قربانی کو، قومی دولت کا ''ضیاع'' نہ سمجھیں تو کیا سمجھیں؟ مادیت یا مادہ پرستی کی یہ عینک، جس کی بھی آنکھوں پر چڑھی ہے، اس نے تمام اسلامی احکام و ہدایات کو اسی رنگ میں دیکھا ہے، انھیں صرف قربانی ہی پر اعتراض نہیں، اسلام کی ہر روایت اور دین کی ہر عبادت پر اعتراض ہے، انھیں جس طرح قربانی کی صورت میں، معاشی نقصان نظر آتا ہے اُسی طرح نماز کی صورت میں بھی معاشی مضرت نظر آتی ہے، ان کے نقطۂ نظر سے روزانہ پانچ نمازوں پر اگر اڑھائی گھنٹے بھی صرف ہوں تو بارہ کروڑ کی آبادی روزانہ تیس کروڑ گھنٹے ''ضائع'' کر دیتی ہے --- پھر سال بھر میں، جو وقت، نماز پڑھنے والے ''ضائع'' کرتے ہیں، اس کا حساب، خود لگا لیجئے! --- اسی معاشی منطق سے سوویٹ روس نے اشتراکی انقلاب کے بعد، تاخت و تاراج ہونے والے علاقوں کے مسلمانوں کو نماز کے ''معاشی نقصانات'' سمجھائے تھے، یہ وہی ذہنیت ہے، جس کے تحت، مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں پچیس سال تک حج پر پابندی عائد کیے رکھی، تاکہ حج کی نذر ہونے والے زرمبادلہ کے نقصان سے ملک کو بچایا جا سکے، اور یہی وہ ذہنیت تھی جس کے تحت حبیب بورقیبہ

[1] تفہیمات، جلد ۲، صفحہ ۲۴۲

نے روزوں کی مخالفت کی تھی، اِسے انتہائی پختہ ایمان کی نو مسلم خاتون، محترمہ مریم جمیلہ نے بایں الفاظ ذکر کیا ہے۔

The influence of Islam in the modern world has weakened to such an alarming extent that the President of Tunisia, Habib Bourguiba, in a nation-wide speech, delivered over radio, on February 18, 1960, dared publically to attack on the fasting of Ramzan, blaming it for hindering Tunisia's economic development "Fasting may be intended to purify the spirit by enfeebling the body, what I need are strong bodies to revolutionise this country and raise us to the western standard of living." President Bourguiba argued that the struggle for economic development excuses workers from the Ramazan fasting. He then bitterly denounced the Rector of Zaitonia University for refusing to consider the economic growth of Tunisia more important than the Ramazan.*

دورِ جدید میں اسلام کا اثر و رسوخ، اسقدر چونکا دینے کی حد تک کمزور پڑ گیا ہے، کہ تیونس کے صدر حبیب بورقیبہ نے اپنی ایک قومی سطح کی تقریر میں، جو ۱۸ فروری ۱۹۶۰ء کو ریڈیو پر نشر کی گئی تھی، رمضان کے روزوں پر کھلم کھلا حملہ کرنیکی جرأت کی، اس نے ماہ رمضان پر یہ الزام لگایا کہ روزے تیونس کی اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، اس نے کہا ''ہوسکتا ہے کہ روزوں کا مقصد، جسم کو کمزور بنا کر روح کو خالص اور طاقتور بنانا ہو، مگر مجھے جس چیز کی ضرورت ہے (وہ روحانی قوت نہیں بلکہ) ایسے مضبوط اور قوی جسم ہیں جو اس ملک میں انقلاب برپا کرسکیں اور ہمارے معیارزیست کو مغرب کی سطح پر بلند کرسکیں''۔ صدر حبیب بورقیبہ نے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ اقتصادی ترقی کی جدوجہد کارکنوں کو، رمضان کے روزوں سے سبکدوش کر دیتی ہے، اس کے بعد اس نے زیتونیہ یونیورسٹی کے سربراہ کو اپنی شدید لعنت ملامت کا نشانہ بنایا کیونکہ اس نے رمضان کی نسبت، تیونس کی معاشی ترقی کو زیادہ اہمیّت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ ہے وہ مادہ پرستانہ ذہنیّت، جس کے تحت، قربانی کی مخالفت کی جارہی ہے، اس ذہنیت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ دینِ اسلام کے ایک ایک حکم کو اقتصادی مصالح کے ترازو میں تولتی ہے، اور جو فرمانِ خداوندی، اس میزان میں پورا نہیں اترتا، یہ ذہنیت، اسے کالعدم قرار دینے کے لیے راہیں تلاش کرتی ہے، اگر قربانی کی مخالفت میں، اس مادہ پرستانہ ذہنیّت کو اختیار کرلیا جائے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آج قربانی کا انکار کیا تو کل، نماز کا انکار ہوگا، پرسوں روزوں کی باری آئے گی، اس کے بعد حج سے ہاتھ دھونے پڑیں گے، الغرض، پوری اسلامی تہذیب، اقتصادی مصلحتوں کے خراد پر چڑھ جائے گی، اور بالآخر چھل چھلا کر وہ ایسی شکل اختیار کرے گی کہ ماسوائے اسلام کے اسم کے، کوئی دینی روایت باقی نہ رہے گی اور پھر بالآخر، اسمِ اسلام بھی مٹ

*(Islam Versus west by Maryam Jameela. P.42)

جائے گا --- لیکن یہ ان لوگوں کی بھول ہے، وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ۔

آج کے اس دورِ انحطاط میں، اگر ہم اعمال صالحہ کی روح سے محروم ہیں، تو کم از کم، اعمال کے یہ قالب تو موجود ہیں، اور غنیمت بھی ۔ بقول اقبال

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے   وہ دل ، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج !   یہ سب باقی ہیں ، تو باقی نہیں ہے

مگر منکرینِ حدیث، جس ذہنیت کی آڑ میں، مخالفتِ قربانی کے نام پر، یہ کھیل کھیلنا چاہتے ہیں، اس سے ان کا مقصود، ان اعمال کی روح ہی نہیں، ان کا وجود بھی مٹا دینا ہے۔ اَعَاذَ نَا اللّٰهُ مِنْ ذَالِکَ ۔

جائزے کا پانچواں پہلو

رہا پرویز صاحب کا یہ فرمان کہ --- "جس طرح آج کل حج کی تقریب پر لاکھوں کی تعداد میں، بھیڑ بکریاں ذبح کر کے، زمین میں دبا دی جاتی ہیں .... " تو یہ بھی ان کی لاعلمی ہے، آج ہر شخص، حج پر جا کر، خود دیکھ سکتا ہے کہ پرویز صاحب کے اس بیان میں صداقت و حقیقت کا کتنا عنصر پایا جاتا ہے، تضییعِ لحم کے بارے میں، وہاں سرے سے یہ بات ہے ہی نہیں جو "مفکرِ قرآن" صاحب نے بیان کی ہے، ممکن ہے ماضی میں کبھی ایسا ہوا ہو، مگر اب تو دورِ حاضر کے جدید ترین وسائلِ نقل وحمل نے اس گوشت کو آن کی آن میں دنیا بھر کے مستحقین تک پہنچانے کا بندوبست کر ڈالا ہے۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر بالغرض، قربانی کا گوشت وہاں واقعی ضائع ہی ہو رہا ہو، تب بھی ایک مسلمان کے لیے --- بشرطیکہ وہ حقیقتاً مسلمان ہو --- یہ کہاں جائز ہے کہ وہ اس بات کو، قربانی کے عدمِ جواز کا بہانہ بنا لے اور اس قربانی کو ختم کر دینے کے درپے ہو جائے، جسے اللہ نے شعائر اللہ قرار دیا ہے، اور جس کے متعلق، قرآن کریم نے لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ کہا ہے اور جس کے کر ڈالنے کا حکم، ھدی، نسک اور نحر کے الفاظ میں دیا ہے، اسے تو چاہئے تھا کہ اس گوشت کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا، نہ یہ کہ الٹا قربانی ہی کو ختم کر ڈالنے پر اتر آتا۔

قربانی پر ایک اور اعتراض اور اس کا جائزہ

قربانی کے خلاف، پرویز صاحب نے اس اعتراض کو اپنی متفرق تحریروں میں بتکرار بسیار دہرایا ہے کہ عید الاضحیٰ کی قربانیوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، چنانچہ ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ

> عید الاضحیٰ کی تقریب پر جس طرح قربانیاں کی جاتی ہیں، ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ [1]

اس اعتراض کا جواب، اگرچہ تفصیل سے دیا جا چکا ہے، مگر یہاں پرویز صاحب کے مزاج کا ایک اور رنگ ملاحظہ

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۴۷

فرمایئے اور یہ بھی دیکھئے کہ قربانی کی مخالفت کا جذبہ، ان کے حواس ومشاعر پر کس قدر غلبہ پا چکا ہے؟ ورنہ وہ قرآنی نقطۂ نظر سے، ''قربانی'' کو ''عیدالاضحیٰ'' کے ساتھ وابستہ کرنے میں، ہم پر کیا اعتراض کرتے، بلکہ وہ خود اس اعتراض کی زد میں آ جاتے کہ آپ ''عیدالاضحیٰ'' کو تسلیم کر کے ''اضحیٰ'' کے وجود کا انکار کیسے کرتے ہیں؟

ذرا غور فرمایئے! پرویز صاحب ''قربانی'' کے تو قائل نہیں ہیں مگر نفسِ ''عیدالاضحیٰ'' کی تقریب کے قائل ہیں، وہ جب ہمیں یہ کہتے ہیں کہ --- آپ ''قربانی'' کو ''عیدالاضحیٰ'' کے ساتھ کیوں مقرون ومتحد کرتے ہیں؟ --- تو ان کو ''عید الاضحیٰ'' کے وجود پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، مگر ''اضحیٰ'' پر، وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسے ''قربانی کی عید'' کے ساتھ وابستہ کیوں کیا جاتا ہے؟ حالانکہ قرآن کریم میں نہ تو عیدالاضحیٰ ہی کا ذکر ہے اور نہ ہی عیدالفطر کا۔ لیکن عیدین کے مذکور فی القرآن نہ ہونے کے باوجود بھی، وہ عیدالفطر کو جشنِ نزولِ قرآن کے طور پر مانتے ہیں، اور عیدالاضحیٰ کے نفسِ وجود کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر اس مطالبہ کے ساتھ کہ اس میں قربانیاں نہ دی جائیں، کس قدر عجیب بات ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، عیدین کے نفسِ وجود کو تسلیم کر کے، ان سے وابستہ ایک عمل (قربانی) کا انکار کرتے ہیں، جبکہ دوسرے عمل (صدقۃ الفطر) کا اقرار کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اُسے عیدالفطر کہتے ہیں --- آخر اس ثنویت کی قرآنی دلیل کیا؟

فکر پرویز سے وابستہ افراد سے ہماری گذارش ہے کہ اگر آپ، قرآن کی بنیاد پر قربانی کا انکار کرتے ہیں، تو ''قربانی'' سے پہلے ''عیدالاضحیٰ'' کا انکار کیجئے، اس طرح عیدالفطر اور صدقۃ الفطر کا بھی انکار کیجئے، کیونکہ ان میں سے کوئی چیز بھی از روئے قرآن ثابت نہیں ہے، لیکن اگر آپ، ان کو، نومولود کے کان میں اذان دینے، عقیقہ کرنے، ختنہ کرنے، اور میت کو غسل دینے اور کفن پہنانے وغیرہ جیسے اعمال کی طرح ''معاشرتی امور'' قرار دے کر برقرار رکھتے ہیں (جیسا کہ قرآنی فیصلے، حصہ ا، صفحہ ۱۶۵ پر لکھا گیا ہے، حالانکہ ان میں سے کسی چیز کا وجود بھی قرآن سے ثابت نہیں ہے) تو اسی طرح ''قربانی'' کو بھی ایسا ''معاشرتی امر'' قرار دیکر برقرار رکھا جا سکتا ہے، جسے خود پیغمبرِ خدا ﷺ نے امت میں جاری فرمایا تھا، اور باوجود اس کے کہ اس عمل کا اجراء، دورِ نزولِ قرآن میں ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے کہیں اس کی تردید نہیں فرمائی۔

قربانی کی مخالفت میں مسخِ قرآن کی مثال

قربانی کے خلاف، ''مفکر قرآن'' کا جو ذہن بن چکا تھا، اس نے قرآن کریم کے ''ذبحِ اسماعیلؑ'' کے واقعہ کو بھی بُری طرح مسخ کر ڈالا ہے، حالانکہ یہ واقعہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی بہترین تصویر پیش کرتا ہے، اس واقعہ کا جس بُری طرح حُلیہ بگاڑا گیا ہے، اسے ہم پرویز صاحب ہی کے الفاظ میں پیش کر رہے ہیں۔ تاہم، اقتباسِ پرویز کے بعد، اس اقتباس کی تردید میں، جو کچھ ہم نے لکھا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمالیں۔

حضرت ابراہیم کے ہاں کبرسنی میں ایک لڑکا (حضرت اسماعیل) پیدا ہوا، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ (۱۰۲/۳۷) جب وہ

لڑکا، باپ کے ساتھ کام کاج (بھاگنے دوڑنے) کے قابل ہوا تو آپ نے اپنے ایک خواب کی رو سے سمجھا کہ خدا نے حکم دیا کہ اس بیٹے کو (اللہ کی راہ میں) قربان کر دیا جائے، آپ نے بیٹے سے کہا کہ یَا بُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی (۱۰۲/۳۷) ''اے میرے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، کہو تمھارا کیا خیال ہے'' بچے نے جواب میں عرض کیا یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (۱۰۲/۳۷) ''ابا جان! جس بات کا اشارہ آپ کو ملا ہے آپ (اسے حکم خداوندی سمجھتے ہیں تو) بلا تامل کر گزریئے، ان شاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے''، باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا، چھری ہاتھ میں لی فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ (۱۰۳/۳۷) تو نَادَیْنٰہُ ہم نے اسے آواز دی اور کہا یٰۤاِبْرٰہِیْمُ اے ابراہیم (۱۰۴/۳۷) قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ (۱۰۵،۱۰۴/۳۷) تُو نے اپنے بیٹے کو سچ مچ ذبح کرنے کے لیے لٹا دیا (یہ ہمارا حکم نہیں تھا، یونہی تمھارا خیال تھا، اس لیے ہم نے تمھیں اور تمھارے بیٹے کو اس نقصان سے بچا لیا)، اس لیے کہ جو لوگ ہمارے قوانین کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں، ہم انھیں اس قسم کے نقصانات سے بچا لیا کرتے ہیں۔ [1]

اس اقتباس میں، جو تحریف کی گئی ہے وہ کئی پہلوؤں پر مشتمل ہے، مثلاً

(۱) ''آپ نے خواب کی رو سے سمجھا'' --- گویا یہ کوئی قطعی حکم نہیں، جو آپ کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا اور جسے آپ نے جان لیا تھا بلکہ آپ نے خود ایسا سمجھ لیا۔ العیاذ باللہ ۔سوال یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' کو کیسے پتہ چلا کہ یہ کوئی قطعی حکم نہیں تھا۔ کیا انھیں وحی آئی یا وہ خود ''مزاج شناسِ خدا'' تھے؟

(۲) اِشارہ، نہ کہ قطعی حکم۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ !

(۳) ''آپ اسے حکم خدوندی سمجھتے ہیں تو ....'' گویا خدا خود کہہ رہا ہے کہ یہ میرا حکم نہ تھا اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو .... کیا بدترین تحریفِ قرآن ہے! خوب سمجھ لیجئے کہ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ کا قطعی مفہوم یہ ہے کہ --- ''ابا جان! جس چیز کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے، اسے کر گزریئے''۔

(۴) ''تو نے اپنے بیٹے کو سچ مچ ذبح کرنے کے لیے لٹا دیا ....'' یہ گویا اللہ میاں کا تبصرہ ہے جو وہ اپنے ''سادہ لوح'' نبی پر فرما رہا ہے جب کہ وہ بیچارہ، اپنی عقل کے اس امتحان میں بری طرح فیل ہو گیا جس میں بذریعہ خواب آزمایا گیا تھا۔

(۵) ''یہ ہمارا حکم نہیں تھا، یونہی تمھارا خیال تھا ....'' معلوم نہیں کہ ''مفکر قرآن'' کو کس آسمان سے یہ وحی آئی کہ یہ حکم خدا نہ تھا، محض ایک خواب تھا۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا۔ یہ ہے دراصل ''مفکر قرآن'' کی ''مزاج شناسیٔ خدا''۔

(۶) ''........... حسن کارانہ انداز ....'' یہ عجیب حسن کارانہ انداز ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، جو حکم خدا نہ تھا، اسے حکمِ خدا سمجھ بیٹھے، اور بیٹے کی جان لینے کے درپے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ، ان کی اس حسن کاری پر، انھیں داد دے رہے ہیں؟ سبحان اللہ! کیا خوب قرآن فہمی ہے۔

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۵۰

اس اقتباس کو پھر پڑھیے اور خود سوچیے کہ یہ کلام اللہ کی ''تفسیر و تشریح'' ہو رہی ہے؟ یا ''ترمیم و مرمت''؟ یا تغلیط و ابطال؟ سچ ہے۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند!

اب آخر میں، ان ہی آیات کا وہ صحیح ترجمہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے جو متحدہ ہندوستان میں، ''مفکر قرآن'' بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے۔ یہ اقتباس، مولانا مودودیؒ کے ترجمان القرآن میں، چھپنے والے، ان کے ایک مقالہ سے ماخوذ ہے۔

''اے بیٹا! میں نے خواب میں (حکم پایا ہے، اور) دیکھا ہے، کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمھارا کیا خیال ہے؟'' عرض کیا ''ابا جان! جو آپ کو حکم دیا گیا ہے، بلا تامّل کر گزریئے، ان شاء اللہ العزیز، آپ مجھے صابر پائیں گے''۔ جب وہ دونوں ''مسلم'' ہو گئے، اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے آواز دی کہ (صد مرحبا) اے ابراہیم! بیشک تو نے اپنے خواب کو سچا کر دیا۔ نیکوکاروں کو ہم اسی طرح اجر دیا کرتے ہیں۔ یقیناً یہ امتحان بہت بھاری تھا۔ اس کے بدلے میں ہم تمھیں بڑی قربانی دیتے ہیں، جو قیامت تک باقی رہے گی۔ سلام اور درود ہو ابراہیم پر۔ ہم اسی طرح اپنے نیک بندوں کو اجر دیتے ہیں۔ بیشک ابراہیم، ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔ [1]

[1] ترجمان القرآن، جلد ۲، شمارہ ۵، جمادی الاولی، ۱۳۵۲ھ، جولائی ۱۹۳۳ء، صفحہ ۳۰۴ تا ۳۰۵